۱۲ شمارہ ۱] لاہور [اپریل

اس شمارہ میں

ادارہ تحریر { پروفیسر سراج الدین
پروفیسر اے . ایم . مخدومی

معاونین { عبدالغفور چوھدری

تعلیمی ماہ نامہ

آموزش

لاہور

اپریل ۱۹۵۹ء

جلد ——— ۱۲

شمارہ ——— ۱

سالانہ چندہ

پاکستان کے لیے ۶ روپے

غیر ممالک کے لیے ۸ روپے

قیمت فی پرچہ دس آنے

پبلشرز

یونیورسٹی بک ایجنسی لاہور

آر۔ ایچ۔ ڈی خالد پرنٹر پبلشر نے دین محمدی پریس میں طبع کرا کے
یونی ورسٹی بک ایجنسی ۲ کچہری روڈ لاہور سے شائع کیا

تعلیم اور اخلاقی قدریں

ایم۔ اے۔ مخدومی

کچھ عرصہ ہوا صدر پاکستان نے ملک کے نظام تعلیم پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ یہ لڑکوں کو لکھنا پڑھنا سکھاتا ہے مگر کردار کی تربیت نہیں کرتا۔ حالاں کہ آزاد زندگی کی ذمہ داریاں انجام دینے کے لیے ملک کو زندگی کے ہر میدان میں ایسے رہنماؤں کی ضرورت ہے جو مضبوط کردار کے مالک ہوں۔ ملک کے فہمیدہ طبقے کو صدر کے ان خیالات سے پورا اتفاق ہے۔ انگریزوں کی آمد سے پہلے ہمارے یہاں تعلیم اور اخلاق کو لازم و ملزوم سمجھا جاتا تھا۔ معاشرہ تعلیم یافتہ لوگوں سے بلند تر کردار کی توقع رکھتا تھا اور یہ توقع عموماً پوری ہوتی تھی، مگر مغربی تعلیم کے رواج پانے سے یہ صورت حال رفتہ رفتہ بدلتی گئی تعلیم کو محض کسب معاش کا ذریعہ سمجھا جانے لگا اور اسے اخلاقی قدروں سے کچھ واسطہ نہ رہا۔ لیکن پچھلے دس گیارہ برس کے تجربے نے ثابت کر دیا ہے کہ یہ صورت حال خطرناک ہے۔ قومی زندگی کی باگ ڈور ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں سونپ دینا جو اعلیٰ تعلیم کے مالک مگر اخلاقی قدروں سے بیگانہ ہوں ملک کو تباہی کے گڑھے کی طرف دھکیلنا ہے۔ جس تعلیم کا محور اخلاقی قدریں نہ ہوں وہ آزاد زندگی کی ضرورتیں پوری نہیں کر سکتی۔

گورنر مغربی پاکستان مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے حال ہی میں کم عمر طلبہ کو تمباکو نوشی کی لعنت سے بچانے کے لیے ایک قانون نافذ کیا ہے۔ اس قانون کے مطابق چھوٹی عمر کے بچوں کے ہاتھ تمباکو یا سگریٹ فروخت کرنا ایک جرم قرار دیا گیا ہے۔ تمباکو نوشی سکولوں اور کالجوں کے طلبہ کی صحت اور ان کی عادات و اخلاق پر جو نیا کن اثرات پیدا کرتی ہے ان کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ کم عمر طلبہ دوسروں کی دیکھا دیکھی یہ بری عادت اختیار کر لیتے ہیں اور پھر اس کے طفیل نہ صرف طرح طرح کی بیماریوں کی زد میں آجاتے ہیں، بلکہ عمر بھر کے لیے اپنے اوپر ایک لعنت مسلط کر لیتے ہیں۔ پاکستان کے

ملک میں جہاں آبادی کی بھاری اکثریت مہذب زندگی کی بنیادی ضرورتوں سے محروم ہو، تمباکو نوشی کو جائز قرار دینا مشکل ہے۔ لیکن چھوٹی عمر اور ایام مدرسہ میں اس کا وجود خصوصیت سے قابل مواخذہ ہے کیوں کہ یہ وہ زمانہ ہے جب جسمانی صحت اور اخلاقی پاکیزگی ہر قیمت پر برقرار رہنی چاہیے۔

"تاہم والدین اور استادوں کو یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اخلاقی تربیت کا بھروسہ قانون کی بجائے ترغیب و تحریص پر ہوا کرتا ہے۔ بچوں اور نوجوانوں کو گھر اور مدرسے میں ایسا ماحول نصیب ہونا چاہیے جو مخرب اخلاق اثرات سے پاک ہو۔ اگر کم عمر پاکستانیوں میں تمباکو نوشی کا شوق بڑھ رہا ہے تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ ان کی تربیت مناسب ماحول میں نہیں ہو رہی۔ انھیں تمباکو نوشی سے بچانے کے لیے جو قانون بنایا گیا ہے وہ بھی اسی صورت میں کارگر ثابت ہوگا جب والدین اور اساتذہ اس قانون کے ہاتھ مضبوط بنائیں۔ اس کے بغیر یہ قانون بڑی حد تک بے اثر رہے گا۔

"آج ملک کو اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ اخلاقی قدریں پوری طرح بحال کی جائیں۔ بے شک مدرسے کو اس مہم میں ایک نمایاں کردار ادا کرنا ہوگا۔ مگر اس مہم میں والدین اور عوام پر بھی برابر کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ مدرسہ معاشرے کا آئینہ دار ہوتا ہے اور جو قدریں معاشرتی زندگی میں اچھی لگیں گی وہی قدریں تعلیم کا محور قرار پائیں گی۔ اگر ہم سچے دل سے چاہتے ہیں کہ اخلاقی قدریں از سر نو تعلیم کا مرکزی نقطہ بن جائیں تو ہمیں عام زندگی میں بھی ان قدروں کو بحال کرنا چاہیے ٭

امریکی اور یورپی تعلیم کا موازنہ

فضل احمد

ثقافتی پس منظر اور تعلیم

تعلیم فی الحقیقت ایک معاشرتی عمل ہے۔ ایک ایسا عمل جس میں معاشرے کے بالغ افراد نوخیز نسل کی نشوونما کو مناسب راہوں پر لگانے کی کوشش کرتے ہیں۔ چوں کہ ہر معاشرے کا اپنا جداگانہ مزاج ہوا کرتا ہے جو اس کی صدیوں پرانی روایات کی پیداوار ہوتا ہے۔ اس لیے کوئی معاشرہ اپنی نئی پود کے لیے جس قسم کی تعلیم مہیا کرے اسے اس کی مخصوص ضرورتوں اور اس کی مخصوص روائتوں کے ساتھ خاص مناسبت ہونی چاہیے۔ اگر ایسا نہ ہو تو تعلیم اپنے مقاصد میں ناکام رہے گی۔ وہ ایسے شہری پیدا کرے گی جو معاشرے کی توقعات کو پورا نہیں کریں گے۔ وہ زندگی کی آزمائشوں میں پورے نہیں اتریں گے اور تعلیم سے بے اطمینانی بڑھے گی۔

اس میں کلام نہیں کہ تعلیمی میدان میں قومیں ہمیشہ ایک دوسرے سے سبق حاصل کرتی رہیں۔ جو تعلیمی تجربہ ایک ملک میں غیر معمولی طور پر کامیاب ثابت ہو دوسرے ملک اسے اپنے ہاں رائج کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن دوسروں کے تعلیمی تجربے اسی صورت میں کام دیتے ہیں جب انھیں ملکی مزاج کے مطابق ڈھال لیا جائے۔ دوسرے ملکوں کے نظامِ تعلیم کا موازنہ ملکی نظامِ تعلیم سے کرتے وقت یہ نکتہ اچھی طرح یاد رکھنا چاہیے کہ غیر ملکی نظامِ تعلیم کے جو پہلو اس کی تقویت کا باعث ہیں عین ممکن ہے کہ وہ ایک مختلف ثقافتی ماحول میں نظامِ تعلیم کی کمزوری کا موجب بن جائیں۔ اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ ہمیں اپنے نظامِ تعلیم میں جو کوتاہیاں نظر آتی ہیں، دوسروں کی نگاہ میں وہ خوبیاں ہوں۔ اس نکتے کی وضاحت ایک مثال سے ہو جائے گی۔ حال ہی میں ایک امریکی ماہرِ تعلیم اپنے ملک کے ایک مدرسے میں گیا۔ پرنسپل نے اسے مدرسے کی کیمیائی تجربہ گاہ دکھائی اور بڑے فخر سے کہا کہ سازوسامان کے لحاظ سے ہماری تجربہ گاہ کسی روسی مدرسے سے کم نہیں۔ مدرسے کا پرنسپل فی الحقیقت یہ بات جتلانا چاہتا تھا کہ

امریکی مدرسے سائنس کی تعلیم کو اگر ماضی میں پوری توجہ نہیں دیتے رہے تو اس کا مدرسہ اس کوتاہی کا ازالہ کر چکا ہے۔ اس کے دو ہفتے بعد بھی ماہر تعلیم اسکو کے ایک ہائی سکول کو دیکھ رہا تھا۔ مدرسے کی دوسری سرگرمیاں دکھانے کے بعد پرنسپل اسے موٹر ڈرائیوری کی تعلیم دکھانے لے گیا۔ مدرسے کا ایک طالب علم کار میں ڈرائیور کی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ ڈرائیوری سکھانے والا استاد اس کے پہلو میں بیٹھا تھا۔ پرنسپل نے امریکی مہمان سے بڑے فخر سے کہا "میرا خیال ہے کہ اب ہم بھی امریکی مدرسوں کی طرح ترقی پسند بن گئے ہیں"۔ یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ امریکہ میں پچھلے دنوں اس بات پر بڑی لے دے ہوتی رہی ہے کہ ہمارے مدرسے کار ڈرائیوری جیسی چیزوں کو توجہ کا مرکز بنائے ہوئے ہیں۔ اور سائنس کی تعلیم نظر انداز ہو رہی ہے۔

امریکی اور یورپی نقطۂ نگاہ میں فرق

ہر ملک کے مخصوص حالات اس کے نظامِ تعلیم کو ایک خاص شکل دیتے ہیں۔ لہٰذا مختلف یورپی ملکوں کے نظامِ تعلیم میں یکسانیت کی تلاش بے کار ہے۔ تاہم برطانیہ، فرانس، روس اور دوسرے یورپی ملکوں کے نظامِ تعلیم میں ایک چیز مشترک نظر آتی ہے۔ جو امریکی نظامِ تعلیم میں مفقود ہے اور وہ چیز ہے یورپی تعلیم کا علمی مزاج۔ ان ملکوں میں نصاب تعلیم گنے چنے عالم تیار کرتے ہیں یہ لوگ تعلیمی معیار مقرر کرتے ہیں اور طلبہ کو ان معیاروں پر پورا اترنا پڑتا ہے۔ علمی معیاروں کو بلند سطح پر رکھنے کی دھن میں اساتذہ اور طلبہ دونوں کو علمی پہلو کو توجہ کا مرکز بنانا پڑتا ہے۔ تدریس کے لیے لیکچر کا طریق عام مستعمل ہے۔ عوام تعلیمی نصاب بنانے کے کام میں کوئی دخل نہیں دیتے۔ یہ ان چیدہ لوگوں کا کام سمجھا جاتا ہے، جو صاحب بصیرت قرار دیے جا چکے ہیں۔

امریکی نقطۂ نگاہ اس سے بہت مختلف ہے۔ وہاں تعلیم پر علمی کی بجائے عملی پہلو غالب ہے عوام نصاب تعلیم کی تشکیل میں سرگرم حصہ لیتے ہیں۔ وہ مطالبہ کرتے ہیں کہ مدرسے ایسی تعلیم دیں جو مدرسہ چھوڑتے ہی عملی طور پر کام دینے والی ہو۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ امریکہ میں گنے چنے عالم موجود نہیں یا ان کی رائے کو کوئی وزن حاصل نہیں۔ یہ لوگ تعلیمی معاملات میں رائے دیتے ہیں، مگر اس مطلب کے لیے

انھیں عوامی مجلسوں کا سامنا کرنا پڑتا اور عوامی نمائندوں کو اپنے نقطۂ نگاہ کا قائل کرنا پڑتا ہے۔ اس صورت حال کا نتیجہ یہ ہے کہ امریکی مدرسے کو اپنے نصاب میں ایسے مضامین اور ایسی سرگرمیاں بھی شامل کرنی پڑتی ہیں جو سراپا عملی افادیت رکھتی ہوں۔ امریکی ہائی سکولوں کے اکثر طلبہ طالب علمی کے زمانے میں ہی جز وقتی ملازمت بھی اختیار کر لیتے ہیں۔ تاکہ تعلیمی اخراجات کا بوجھ ہلکا کرنے کے ساتھ ہی وہ کسی خاص پیشے کی عملی تربیت بھی حاصل کر لیں اور مدرسے چھوڑنے پر بے کاری کا سوال پیدا نہ ہو۔

امریکی مدرسے کی اس عملیت پرستی نے نہ صرف اس کے نصاب میں بے اندازہ وسعت اور لچک پیدا کر دی ہے۔ بلکہ اس کی بدولت اس کے تعلیمی معیاروں میں وہ بلندی نظر نہیں آتی جو کسی انسانی مجبوری کے آگے جھکنا نہ جانتی ہو۔ یہ چیز غیر ملکی مبصروں کو عجیب اور بعض اوقات ناپسندیدہ نظر آتی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ہر معاشرہ اپنے مدرسوں کو اپنی مخصوص قدروں کا آلۂ کار بناتا ہے اور ان کے طفیل ان طور طریقوں کو زندہ رکھنا چاہتا ہے جو اس کی نگاہ میں بنیادی قدر و قیمت کے حامل ہوں۔ امریکی معاشرہ ان بلند ہمت اور باعزم انسانوں کا تعمیر کردہ ہے جنھوں نے لگاتار اور ان تھک محنت سے ایک بیابانی برِ اعظم کو تہذیب و تمدن کے گہوارے میں تبدیل کیا۔ یہ لوگ علوم و فنون اور تہذیب و شائستگی میں چوٹی کے لوگ ہرگز نہیں تھے۔ اکثر حالتوں میں انھوں نے پرانی دنیا کو چھوڑا ہی اس لیے تھا کہ ان پر آگے بڑھنے کے دروازے بند تھے۔ مگر اس علمی اور ثقافتی بلندی کی کمی ان کے بے پناہ جذبۂ عمل نے پوری کی۔ ان کا عزم اور جذبۂ عمل ہر قسم کی مشکلات پر غالب آیا۔ اور وہ ایک وسیع برِ اعظم کے لامحدود قدرتی خزانوں پر روز افزوں قدرت حاصل کرتے چلے گئے تا آنکہ امریکی قوم دنیا کی سب سے مالدار اور سب سے طاقت ور قوم بن گئی۔ یہ تاریخی پس منظر امریکی معاشرے کی نگاہ میں اوّلیت کا مقام نظری علم کی بجائے عملی مہارت کو دیتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ آج بھی اگر امریکی والدین سے یہ پوچھا جائے کہ سائنس کی نظری تعلیم اور باحتیاط ٹریفک کی عملی تربیت میں سے وہ اپنے بچوں کے لیے کس کو پسند کریں گے تو سائنس کا مطالبہ کرنے کے ساتھ ہی وہ باحتیاط ٹریفک کی عملی تربیت کو ناگزیر قرار دیں گے وجہ یہ کہ امریکہ میں جتنی جانیں ہر سال کاروں کے حادثوں کی نذر ہو جاتی ہیں اتنی کسی ایک بھی مرض کا

شکار نہیں ہوتیں۔ نقطہ نگاہ کا یہ فرق امریکی تعلیم کو پرانی دنیا کے تقریباً تمام ممالک سے جدا کر دیتا ہے کیوں کہ امریکی تعلیم کامیابی کے معیاروں کے مقابلے میں طلبہ کی استعداد اور ان کی عملی ضرورتوں کو مقدم خیال کرتی ہے۔

برطانیہ، فرانس، جرمنی، روس اور دوسرے یورپی ملکوں میں سے ہر ملک کا تاریخی پس منظر اور قومی مزاج جداگانہ ہے۔ اور اسی مناسبت سے ان میں سے ہر ایک کا تعلیمی نظام اپنی ہیئت ترکیبی اور نظام کار کے لحاظ سے جداگانہ خصوصیت رکھتا ہے۔ مگر ان اختلافات کے باوجود ان تمام کے تعلیمی نظاموں میں ایک چیز مشترک نظر آتی ہے۔ وہ یہ کہ ان کی تشکیل گنے چنے خصوصی ماہروں نے کی ہے عوامی آواز کو اس میں کچھ دخل حاصل نہیں۔ ہر چند کہ ہر ملک میں گنے چنے ماہروں کے انتخاب کا طریق الگ الگ ہے۔ مگر اس سے اس کی تعلیم کے بنیادی خد و خال میں کچھ فرق نہیں پڑتا۔ ہر یورپی ملک میں تعلیم کے بلند معیار مقرر ہیں، جن پر طلبہ کو پورا اترنا پڑتا ہے۔ گویا طلبہ تعلیمی معیاروں کے تابع ہیں۔ تعلیمی معیار ان کے تابع نہیں۔ اس سے نظری علوم کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہو جاتی ہے اور پڑھانے کے لیے تقریری طریق بہترین طریق بن جاتا ہے مگر جیسا اس مضمون کے آغاز میں کہا گیا تھا۔ امریکی اور یورپی تعلیمی نظاموں کے یہ خصائص جداگانہ ثقافتی عوامل کی پیداوار ہیں۔ لہٰذا ان خصائص کو عیوب و محاسن کا نام دینا درست نہیں۔ ہر نظام تعلیم کے خصائص اس طرز زندگی کے آئینہ دار ہوا کرتے ہیں جس کی یہ پیداوار ہو جس شخص کو یہ طرز زندگی پسند ہو، اسے اس کے بطن سے پیدا ہونے والا نظام تعلیم بھی بھلا معلوم ہو گا جسے یہ طرز زندگی ناپسند ہو اس کی رائے اس نظام تعلیم کے متعلق بھی اچھی نہیں ہو گی۔ اس تمہید کے بعد فرانس، برطانیہ اور روس کے تعلیمی نظاموں پر ایک مختصر سی نگاہ ڈالی جاتی ہے۔

فرانسیسی نظام تعلیم

فرانسیسی نظام حکومت کی طرح فرانس کے نظام تعلیم کی ساری باگ ڈور بھی پیرس کے مرکزی دفتروں کے ہاتھ میں ہے۔ فرانس ایک جمہوریت ہے اور یہاں وزارتی نظام حکومت رائج ہے۔ مگر سیاسی جماعتوں کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ ان میں سے کوئی بھی اکیلی ایک مضبوط وزارت قائم

ہ کہ سکتی۔ نتیجہ یہ ہے کہ فرانس میں آئے دن وزارتیں بنتی اور ٹوٹتی رہتی ہیں۔ ملک کی سیاسی
گی کا یہ عدم قرار انتظامی معاملات کو ڈگمگوں کر سکتا ہے، مگر فرانس میں ایسا نہیں ہوتا۔ مختلف محکموں
وزرا آتے جاتے رہتے ہیں مگر ان محکموں کی حقیقی باگ ڈور وزیروں کے ہاتھوں میں نہیں بلکہ ان
مستقل سول افسروں کے ہاتھ میں ہے جو ان محکموں میں کام کرتے ہیں۔ مرکز پرستی کی حد یہ ہے کہ
نس اپنے بیرونی مقبوضات کو بھی براہِ راست پیرس ہی کے ماتحت رکھنا پسند کرتا ہے۔ وہ اپنی
بادیوں کو مقامی معاملات میں بھی آزادی دینا پسند نہیں کرتا۔

فرانس کی سیاسی زندگی کا یہ عام خاصہ اس کے تعلیمی نظام میں بھی پوری طرح موجود ہے۔ سارے
کے تعلیمی معاملات پیرس میں واقع مرکزی نظامت تعلیم کے دفتر میں طے کیے جاتے ہیں۔ استادوں
تقرری، ترقی اور ان کے پیمانۂ تنخواہ سے لے کر نصاب تعلیم تک کی تفصیلات یہی مرکزی دفتر
طے کرتا ہے۔ مدرسے میں پڑھانے والے استادوں یا عوام کو ان معاملات سے کچھ سروکار
ہیں۔ وزارت تعلیمات کے یہ افسر محکمۂ تعلیم میں سے ہی چنے جاتے ہیں اور ان میں سے بہت سے
خود کسی زمانے میں سکولوں میں کام کر چکے ہوتے ہیں مگر پیرس کے مرکزی دفتر میں پہنچتے پہنچتے
وہ اپنی سابقہ ہمدردیوں کو تقریباً پوری طرح بھول جاتے ہیں۔ اور اپنے آپ کو استادوں سے
...... ایک الگ طبقہ خیال کرنے لگتے ہیں۔ تعلیم کے ڈائرکٹر، کالجوں کے پرنسپل، سکولوں کے
سپکٹر اور تعلیم کے دوسرے انتظامی افسر ایک ایسے کڑے انتظامی ضبط میں سے گذر کر اوپر آتے ہیں کہ اس
ندی پر پہنچ کر وہ انتظامی قابلیت اور ہمہ گیر ضبط کے شیدائی نظر آتے ہیں۔ ان کے ہاتھ میں وہ بے پناہ
ختیارات ہوتے ہیں۔ جو نپولین کے ذہن رسا نے مرکزی حکومت کے ہاتھ مضبوط کرنے کے لیے وضع
یے تھے۔ ان اختیارات کے بل بوتے پر یہ مرکزی تعلیمی افسر سارے ملک کی تعلیمی زندگی پر چھائے رہتے ہیں۔

اس صورت حال کا ایک واضح نتیجہ نصاب مدرسہ کا علمی مزاج ہے۔ پرائمری جماعتوں میں بھی
وشش یہ رہتی ہے کہ طلبہ کی ذہنی قوتیں ترقی پائیں۔ چنانچہ اس درجے پر ڈرائنگ، دست کاری
موسیقی، جمناسٹک اور تفریحی سرگرمیوں کو کل وقت کا صرف ایک تہائی حصہ ملتا ہے۔ ثانوی مدرسے میں

اِن مضامین کو اور بھی کم توجہ ملتی ہے۔ یہاں ان پر کل وقت کا کوئی پانچواں حصّہ صرف کیا جاتا ہے
ثانوی مدرسے کا نصاب سات سالہ ہے اور اس میں فرانسیسی زبان ایک غیر ملکی زبان، تاریخ
جغرافیہ، ریاضی اور طبیعیات شامل ہیں۔ طلبہ کو انتخاب مضامین کا جو حق حاصل ہے وہ یہ ہے کہ پہلی
دو جماعتوں میں وہ لاطینی کو بطور اختیاری مضمون کے لے سکتے ہیں۔ اور اوپر کی جماعتوں میں
یونانی زبان کی بجائے کوئی جدید غیر ملکی زبان لے سکتے ہیں۔ غرض ثانوی مدرسے کے طلبہ کو اختیار
ہے کہ کلاسیکی زبانوں، جدید علوم سائنس یا ماشیات کی طرف لے جانے والے مضامین میں سے کوئی
ایک مجموعہ مضامین اختیار کرلیں۔ ریاضی اور سائنس کے مطالعہ کو کل وقت کا کم از کم چھٹا حصہ ملتا
ہے لیکن جو طلبہ سائنس یا جدید علوم لیتے ہیں آخری تین جماعتوں میں ان کے وقت کا تقریبًا آدھا حصّہ
سائنس اور ریاضی کی نذر ہو جاتا ہے۔ غرض فرانسیسی مدرسے کلی طور پر مرکزی دفتر تعلیمات کے ہاتھ
میں ہیں اور وہ عام ثقافت" کے نصب العین کو پورا کرتے ہیں۔ یہ نصب العین ان
سرکاری افسروں کا معین کردہ ہے جو پیرس میں بیٹھے ملکی پالیسی وضع کرتے ہیں۔

روسی مدرسوں کا نصاب

روسی دستور اساسی کے مطابق اعلیٰ تعلیم مرکزی حکومت کی ذمہ داری ہے۔ لیکن ابتدائی
اور ثانوی تعلیم ایک مقامی معاملہ ہے۔ لیکن عملاً ابتدائی اور ثانوی تعلیم بھی مرکزی حکومت ہی کے
ہاتھ میں ہے۔ یہ درست ہے کہ ہر ری پبلک کے مدرسوں میں مقامی زبان میں تعلیم دی جاتی
ہے۔ اور تعلیم کے اخراجات بھی مقامی آبادی ہی کو برداشت کرنے پڑتے ہیں۔ مگر روسی مدرسے
سختی سے کمیونسٹ پارٹی کی زیر نگرانی چلتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ان مدرسوں کی زندگی عملاً مقامی
لوگوں کی بجائے چوٹی کے روسی رہنماؤں کے زیر ہدایت رہتی ہے۔

نام کو تو سوویٹ یونین کی ہر ری پبلک اپنے اندرونی معاملات میں خود مختار ہے۔ ہر
ری پبلک کی اپنی الگ وزارت تعلیم ہے۔ ہر ری پبلک آگے تعلیمی اضلاع وغیرہ میں منقسم ہے
مگر وزارت تعلیم کا قلمدان عمومًا کمیونسٹ پارٹی کے معتبر اراکین کو سونپا جاتا ہے۔ اس طرح

تعلیمی اضلاع اور شہروں کے تعلیمی بورڈوں کے افسر بھی کمیونسٹ پارٹی ہی سے مقرر کیے جاتے ہیں۔ اس صورت حال کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر ری پبلک کی وزارت تعلیم روسی فیڈرل ری پبلک کی تعلیمی پالیسی اختیار کرتی ہے۔ اور یوں تمام سویٹ یونین میں ایک ہی تعلیمی پالیسی مروج رہتی ہے۔ حاصل کلام یہ کہ گو نظری طور پر سویٹ یونین کے مدرسوں کو مقامی حالات سے اثر قبول کرنے کی آزادی حاصل ہے۔ عملاً یہ آزادی عمل موجود نہیں۔ ملک کی تعلیمی حکمت عملی حکمران سیاسی جماعت طے کرتی ہے اور ملک کے گوشے گوشے میں یہی حکمت عملی کارفرما نظر آتی ہے۔ تعلیمی تحقیق کے ادارے صرف روسی فیڈرل ری پبلک کی وزارت تعلیم ہی کے ساتھ وابستہ ہیں۔ لہذا دوسری سویٹ ری پبلکوں کو خواہ مخواہ اس مرکزی ادارے کی رہنمائی قبول کرنا پڑتی ہے۔

اس مرکز پرست تنظیم کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ روسی مدرسے کا نصاب روایت پرست اور علمی قسم کا ہے۔ نصاب کی توجہ کا مرکز علمی معیار ہیں۔ حالیہ سالوں میں روس نے ٹیکنیکل تعلیم کو جو ترقی دی ہے اس سے بیرونی دنیا کو یہ شبہ ہوا ہے کہ روسی مدرسے پرانی وضع کے علمی نصاب کو خیرباد کہہ کر سارا زور عملی تربیت پر دینے لگے ہیں۔ یہ درست ہے کہ پچھلے دس بارہ برس میں روسی مدرسے کے نصاب میں کافی تبدیلی آئی ہے۔ مگر اس کے باوجود یہ نصاب آج بھی زیادہ تر علمی قسم کا اور روایت پرست ہے۔ روسی ہائی سکول دس سالہ نصاب پیش کرتا ہے مگر علمی معیاروں کا لحاظ اس حد تک رکھا جاتا ہے کہ موسیقی اور رقص کے خصوصی مدرسوں، معذور بچوں کے مدرسوں اور شہری اور دیہی نوجوانوں کے شبینہ مدرسوں میں بھی عام تعلیمی معیاروں کو پورا کرنے کی بے حد کوشش کی جاتی ہے۔

۱۹۵۵ء تک روسی نصاب تعلیم جس حد تک روایت پرست تھا، اس کا اندازہ اسکی مندرجہ ذیل تفصیلوں سے ہو سکتا ہے :-

روسی بچوں کو اول اول روسی زبان اور ریاضی کی مبادیات سکھائی جاتی تھیں بعد ازاں ہائی سکول کی دسویں جماعت تک روسی زبان۔ روسی ادب اور ریاضی کا مطالعہ کرایا جاتا تھا۔

ان مضامین کو اور بھی کم توجہ ملتی ہے۔ یہاں ان پر کل وقت کا کوئی پانچواں حصہ صرف کیا جاتا ہے
ثانوی مدرسے کا نصاب سات سالہ ہے اور اس میں فرانسیسی زبان ایک غیر ملکی زبان، تاریخ
جغرافیہ، ریاضی اور طبیعیات شامل ہیں۔ طلبہ کو انتخاب مضامین کا جو حق حاصل ہے وہ یہ ہے کہ پہلی
دو جماعتوں میں وہ لاطینی کو بطور اختیاری مضمون کے لے سکتے ہیں۔ اور اوپر کی جماعتوں میں
یونانی زبان کی بجائے کوئی جدید غیر ملکی زبان لے سکتے ہیں۔ غرض ثانوی مدرسے کے طلبہ کو اختیار
ہے کہ کلاسیکی زبانوں، جدید علوم سائنس یا معاشیات کی طرف لے جانے والے مضامین میں سے کوئی
ایک مجموعہ مضامین اختیار کرلیں۔ ریاضی اور سائنس کے مطالعہ کو کل وقت کا کم از کم چھٹا حصہ ملتا
ہے لیکن جو طلبہ سائنس یا جدید علوم لیتے ہیں آخری تین جماعتوں میں ان کے وقت کا تقریباً آدھا حصہ
سائنس اور ریاضی کی نذر ہو جاتا ہے۔ غرض فرانسیسی مدرسے کلی طور پر مرکزی دفتر تعلیمات کے ہاتھ
میں ہیں اور وہ عام ثقافت کے نصب العین کو پورا کرتے ہیں۔ یہ نصب العین ان
سرکاری افسروں کا معین کردہ ہے جو پیرس میں بیٹھے ملکی پالیسی وضع کرتے ہیں۔

روسی مدرسوں کا نصاب

روسی دستور اساسی کے مطابق اعلیٰ تعلیم مرکزی حکومت کی ذمہ داری ہے۔ لیکن ابتدائی
اور ثانوی تعلیم ایک مقامی معاملہ ہے۔ لیکن عملاً ابتدائی اور ثانوی تعلیم بھی مرکزی حکومت ہی کے
ہاتھ میں ہے۔ یہ درست ہے کہ ہر ری پبلک کے مدرسوں میں مقامی زبان میں تعلیم دی جاتی
ہے۔ اور تعلیم کے اخراجات بھی مقامی آبادی ہی کو برداشت کرنے پڑتے ہیں۔ مگر روسی مدرسے
سختی سے کمیونسٹ پارٹی کی زیر نگرانی چلتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ان مدرسوں کی زندگی عملاً مقامی
لوگوں کی بجائے چوٹی کے روسی رہنماؤں کے زیر ہدایت رہتی ہے۔

نام کو تو سوویٹ یونین کی ہر ری پبلک اپنے اندرونی معاملات میں خود مختار ہے۔ ہر
ری پبلک کی اپنی الگ وزارت تعلیم ہے۔ ہر ری پبلک آگے تعلیمی اضلاع وغیرہ میں منقسم ہے
مگر وزارت تعلیم کا قلمدان عموماً کمیونسٹ پارٹی کے معتبر اراکین کو سونپا جاتا ہے۔ اس طرح

تعلیمی اضلاع اور شہروں کے تعلیمی بورڈوں کے افسر بھی کمیونسٹ پارٹی ہی سے مقرر کیے جاتے ہیں۔ اس صورت حال کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر رسی پبلک کی وزارت تعلیم روسی فیڈرل ری پبلک کی تعلیمی پالیسی اختیار کرتی ہے۔ اور یوں تمام سوویٹ یونین میں ایک ہی تعلیمی پالیسی مروج رہتی ہے۔ حاصل کلام یہ کہ گو نظری طور پر سوویٹ یونین کے مدرسوں کو مقامی حالات سے اثر قبول کرنے کی آزادی حاصل ہے۔ عملاً یہ آزادی عمل موجود نہیں۔ ملک کی تعلیمی حکمت عملی حکمران سیاسی جماعت طے کرتی ہے اور ملک کے گوشے گوشے میں یہی حکمت عملی کارفرما نظر آتی ہے۔ تعلیمی تحقیق کے ادارے صرف روسی فیڈرل ری پبلک کی وزارت تعلیم ہی کے ساتھ وابستہ ہیں۔ لہذا دوسری سوویٹ ری پبلکوں کو خواہ مخواہ اس مرکزی ادارے کی رہنمائی قبول کرنا پڑتی ہے۔

اس مرکز پرست تنظیم کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ روسی مدرسے کا نصاب روایت پرست اور علمی قسم کا ہے۔ نصاب کی توجہ کا مرکز علمی معیار ہیں۔ حالیہ سالوں میں روس نے ٹیکنیکل تعلیم کو جو ترقی دی ہے اس سے بیرونی دنیا کو یہ شبہ ہوا ہے کہ روسی مدرسے پرانی وضع کے علمی نصاب کو خیرباد کہہ کر سارا زور عملی تربیت پر دینے لگے ہیں۔ یہ درست ہے کہ پچھلے دس بارہ برس میں روسی مدرسے کے نصاب میں کافی تبدیلی آئی ہے۔ مگر اس کے باوجود یہ نصاب آج بھی زیادہ تر علمی قسم کا اور روایت پرست ہے۔ روسی ہائی سکول دس سالہ نصاب پیش کرتا ہے مگر علمی معیاروں کا لحاظ اس حد تک رکھا جاتا ہے کہ موسیقی اور رقص کے خصوصی مدرسوں، معذور بچوں کے مدرسوں اور شہری اور دیہی نوجوانوں کے شبینہ مدرسوں میں بھی عام تعلیمی معیاروں کو پورا کرنے کی بے حد کوشش کی جاتی ہے۔

۱۹۵۵ء تک روسی نصاب تعلیم جس حد تک روایت پرست تھا اس کا اندازہ اس کی مندرجہ ذیل تفصیلوں سے ہو سکتا ہے:-

روسی بچوں کو اوّل اوّل روسی زبان اور ریاضی کی مبادیات سکھائی جاتی تھیں بعد ازاں ہائی سکول کی دسویں جماعت تک روسی زبان۔ روسی ادب اور ریاضی کا مطالعہ کرایا جاتا تھا۔

انھیں پورے سات سال تک تاریخ کا مطالعہ کرنا پڑتا تھا۔ جغرافیے اور ایک غیر ملکی زبان کا مطالعہ چھے سال تک کرنا پڑتا تھا۔ طبیعات کا مطالعہ پانچ سال تک اور کیمیا کا مطالعہ چار سال تک کرنے کے علاوہ انھیں ایک سال تک فلکیات کا مطالعہ بھی کرنا پڑتا تھا۔ اسی طرح کل وقت کا ایک تہائی سے کچھ زیادہ حصہ سائنس اور ریاضی کی نذر ہو جاتا تھا۔ اور موسیقی، خطاطی، جسمانی تعلیم وغیرہ کو کل وقت کا صرف دس فی صد ملتا تھا۔ اب اس نصاب میں کچھ ترمیم ہو چکی ہے۔ مگر پھر بھی اس کی عام ہیئت میں زیادہ تبدیلی نہیں آئی۔

روسی نظام تعلیم کا مطالعہ کرتے وقت یہ بات نہ بھولنی چاہیے کہ روس میں نظام تعلیم کا صرف ایک ہی تصور قابل قبول ہے۔ اس تصور کو کمیونسٹ پارٹی کی تائید حاصل ہے جو روس کی حکمران جماعت ہے اور کمیونسٹ پارٹی اپنے نظریہ زندگی کو تمرف تاریخ کا بہترین نظریہ خیال کرتی ہے بلکہ اسے یہ جبر ساری دنیا پر ٹھونسنے کے خواب بھی دیکھ رہی ہے۔ چناں چہ روسی مدرسے کا نصاب بھی سختی سے اسی محور کے گرد گھومتا ہے۔ بہ الفاظ دیگر روسی تعلیم کلی طور پر سیاسی رہنماؤں کے ہاتھ میں ہے۔ لہٰذا ماسکو میں اس مرکزی انتظامی مشین کی ضرورت نہیں جو پیرس میں کام کرتی نظر آتی ہے کمیونسٹ پارٹی کا نظام ہی روسی نظام تعلیم کو یکسانیت اور یک رخی عطا کرنے کے لیے کافی ہے۔

روسی اور امریکی تعلیم کا موازنہ

بنیادی فلسفے اور نقطۂ نگاہ کے اعتبار سے امریکی اور روسی نظام تعلیم میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ امریکی فلسفہ انفرادیت کے احترام پر مبنی ہے۔ مگر روسی فلسفہ اجتماعی بہبود کو اولیت دیتا ہے نتیجہ یہ ہے کہ جہاں امریکہ میں نصاب سازی کا کام زیادہ تر عوامی تعاون اور مقامی ضرورتوں کے زیر اثر انجام پاتا ہے وہاں روس میں ہر جگہ ایک ہی نصاب مروج ہے جو کمیونسٹ رہنماؤں اور مرکزی تعلیمی تحقیق گاہ کے عالموں نے وضع کیا ہے۔

مگر اس بنیادی فرق کے ساتھ ہی روسی اور امریکی نظام تعلیم میں ایک نمایاں مماثلت بھی نظر ہے۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ تاریخ کی پہلی قوم ہے جس نے ثانوی درجے تک کی تعلیم کو تمام

لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے لازمی اور مفت قرار دیا۔ روس بھی اسی نصب العین کی طرف تیزی سے بڑھ رہا ہے۔ سنہ ۱۹۵۰ء کے آخر تک روس اس قابل ہو گیا تھا کہ اپنے ہر بچے کے لیے سات سالہ تعلیم کا بندوبست کر دے۔ اس سے آگے روسی منصوبہ یہ ہے کہ سنہ ۱۹۶۰ء کے آخر تک ثانوی تعلیم لازمی اور مفت کر دی جائے۔ لیکن دس سالہ ثانوی تعلیم کو سارے ملک میں لازمی اور مفت بنانے کے لیے ابھی روس کو کوئی بیس پچیس سال اور کوشش کرنا ہو گی۔ تاہم تعلیم کے عام کرنے میں روس کو جو غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی ہے، اس کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ پچھلے سال ان تمام روسی نوجوانوں میں سے جو اپنی عمر کے لحاظ سے ثانوی تعلیم ختم کرنے کے قابل تھے ایک تہائی نوجوانوں نے ثانوی مدرسے کا امتحان پاس کیا۔ اس کے مقابلے میں اسی سال ایسے امریکی نوجوانوں میں سے جو ثانوی تعلیم ختم کرنے کے قابل تھے نصف نے ثانوی مدرسے کا امتحان پاس کیا۔ تاہم ثانوی تعلیم ختم کرنے والے روسی نوجوانوں میں سے صرف دس فی صد آگے کالجوں میں داخل ہوئے جبکہ امریکہ میں ثانوی تعلیم ختم کرنے والوں میں سے تقریباً ایک تہائی اعلیٰ تعلیم کے لیے کالجوں میں داخل ہوئے۔

امریکہ میں ثانوی تعلیم مستقبل کے ہر شہری کے لیے لازمی اور مفت بنانے کا ایک بدیہی نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ثانوی نصاب کی وسعت زندگی کی وسعت کے تقریباً برابر ہو گئی ہے۔ ثانوی نصاب کے مضامین کی تعداد سینکڑوں کو جا پہنچی ہے۔ ان مضامین میں ٹائپ کرنا، کار چلانا، کھیتی باڑی کرنا، کھانے تیار کرنا، بال تراشنا اور اسی قسم کے بیسیوں عملی کام شامل ہیں جو نوجوان طلبہ اور طالبات کو عملی زندگی کے لیے تیار کرتے ہیں۔ اس صورت حال کی تہ میں یہ یقین کام کر رہا ہے کہ جہاں ثانوی درجے تک کی تعلیم ہر بچے کے لیے لازمی ہو، خواہ وہ بچہ ذہین ہو یا غبی، امیر ہو یا غریب، تندرست ہو یا معذور، وہاں نصاب میں اس قدر وسعت ہونی چاہیے کہ ہر بچے کے حسب حال کچھ نہ کچھ مضامین ضرور موجود ہوں، تاکہ ذہانت، استعداد اور دلچسپیوں کا فرق تعلیمی کامیابیوں کا راستہ نہ روکے۔ امریکی فلسفۂ تعلیم یہ ہے کہ ایک ہی قسم کے علمی نصاب کو تمام طلبہ اور طالبات پر مسلط کرنے کا مطلب ان کی مخصوص فطری صلاحیتوں اور خداداد دلچسپیوں سے آنکھیں بند کرنا اور رکھنا ہے ...

ں کو دعوت دیتا ہے۔ جو بچے تعلیم میں دل چسپی نہیں لیتے ان میں قصور ان بچوں کا نہیں بلکہ
ندون نصاب تعلیم کا ہوا کرتا ہے۔ اگر نصاب ان کی مخصوص صلاحیتوں اور دل چسپیوں کے
ب حال بنا دیا جائے تو یہی بچے تعلیم میں سرگرم دل چسپی لینے لگتے ہیں۔

روس کا تعلیمی فلسفہ اس سے مختلف ہے۔ روسی ماہرین تعلیم کا کہنا ہے کہ گو بچوں میں انفرادی
لاتات موجود رہتے ہیں۔ پھر بھی ان سب میں اتنی استعداد ہوتی ہے کہ وہ ایک مشترک
ی نصاب کو پورا کر لیں۔ اپنے اس دعوی کی تصدیق میں روسی ماہرین تعلیم اپنے ثانوی مدرسوں
، نتائج پیش کرتے ہیں۔ ثانوی امتحان میں شریک ہونے والے طلبہ اور طالبات میں سے تقریباً
فی صد کامیاب رہتے ہیں۔ یہ استدلال بڑی حد تک یقین دلانے والا معلوم ہوتا ہے۔ مگر اس
من میں چند باتیں خاصی معنی خیز ہیں۔ ان میں سے پہلی بات یہ ہے کہ پچھلے دو تین سالوں سے
س کے ثانوی نصاب میں عملی قسم کے مضامین کو بھی جگہ ملنے لگی ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے
جوں جوں ثانوی تعلیم کا دائرہ وسیع ہوتا جائے گا اس کی خالص علمی نوعیت عملی رنگ کی جھلک
بھی اختیار کرنے لگے گی۔ دوسری قابل لحاظ بات یہ ہے کہ روسی اساتذہ اور طلبہ امتحانی تیاری کا
بے حد توجہ صرف کرتے ہیں۔ خراب امتحانی نتائج کے لیے استادوں کو ذمہ دار ٹھہرایا جاتا ہے۔ اس لیے
معموماً اپنے طلبہ کو نرمی سے نمبر دیتے ہیں۔ تیسری قابل لحاظ بات یہ ہے کہ ثانوی مدرسے میں جو
علمی تعلیم حاصل کی جاتی ہے وہ بعض حالتوں میں عملی آزمائش میں کامیاب ثابت نہیں ہوتی۔ یہ چیز
غیر ملکی زبانوں کے متعلق خصوصیت سے صحیح ہے۔

ان ساری باتوں کو سامنے رکھ کر یہ کہنا غلط نہیں کہ روس کا ثانوی نصاب رفتہ رفتہ وہ
شکل اختیار کرے گا جو اس وقت امریکی ثانوی نصاب کی ہے۔ ثانوی تعلیم کو ہر ایک کے لیے قابل حصول
بنانے کے لیے امریکہ نے سابق اول کا کردار ادا کیا تھا۔ ایک وقت تھا جب امریکی ہائی سکول کا نصاب بھی
بالکل علمی قسم کا تھا۔ رفتہ رفتہ ثانوی تعلیم کا دائرہ وسیع ہونے لگا۔ اس پر جگہ جگہ سے آوازیں بلند
ہوئیں کہ یہ نصاب بہت سے طلبہ اور طالبات کی استعداد سے بالا ہے۔ بعض معترضوں نے یہ بھی کہا،

مقررہ علمی معیاروں کو کم ذہین طلبہ اور طالبات کے حسب حال بنانا دراصل ان معیاروں کی مٹی پلید کرنا ہے نتیجہ یہ ہوا کہ ثانوی نصاب میں علمی مضامین راہ پانے لگے۔ کم و بیش یہی صورت حال آج یورپی ملکوں میں نظر آرہی ہے۔ جب تک ثانوی تعلیم گنے چنے طلبہ کے لیے مخصوص تھی اس کے بلند علمی معیار برقرار رہے۔ مگر ثانوی تعلیم کی مانگ بڑھنے کے ساتھ اس کے معیاروں کو قائم رکھنا مشکل ہو گیا اب جگہ جگہ سے اعتراضات کی بوچھاڑ ہو رہی ہے۔ یہ صورت حال انجام کار ثانوی نصاب کو روز افزوں عملی شکل دینے کے لیے ذمہ دار ہو گی۔

اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپی طریق انتخاب

امریکہ میں ہر قسم کی تعلیم کے دروازے ہر شخص پر کھلے ہیں، ہر بچے کو ثانوی درجے تک تعلیم دینے کی ذمہ داری حکومت قبول کر چکی ہے۔ یہ تعلیم لازمی اور مفت ہے۔ عام حالتوں میں طلبہ کو کتابیں بھی مفت دی جاتی ہیں۔ ثانوی درجے سے آگے تعلیم حاصل کرنا ہر شخص کی اپنی پسند ہے۔ اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ امریکہ میں ثانوی تعلیم ختم کرنے والے نوجوان طلبہ اور طالبات میں سے تیس فی صد اعلیٰ تعلیم کے لیے کالجوں میں داخلہ لیتے ہیں۔ تعلیمی مواقع کی یہ یکسانیت اس بات کی ضامن ہے کہ اعلیٰ ذہانت اور غیر معمولی قابلیت رکھنے والے بچے از خود چوٹی پر آ جائیں گے اور اس طرح ملکی قیادت کی ضرورتیں خود پوری ہوتی رہیں گی۔ یقیناً یہ صورتِ حال بہت پسندیدہ ہے۔ مگر اس کے لیے ملکی معیشت کا استحکام ضروری شرط ہے۔ قومی خزانے میں اس قدر دولت ہونی چاہیے کہ ثانوی درجے تک ہر بچے کو تعلیم دی جا سکے اور ثانوی نصاب میں اتنی کشادگی پیدا کی جا سکے کہ ہر بچے کو اس میں اپنے حسب حال کوئی نہ کوئی مضامین ضرور مل جائیں۔

قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ روسی نصاب رفتہ رفتہ امریکی خطوط سے قریب تر آ رہا ہے خصوصی مہارت کے موجودہ دور میں غیر معمولی قابلیت کے بچوں کا پتہ لگانا اور انھیں موزوں تربیت دینا قومی بقا کے لیے اس قدر لازمی بن چکا ہے کہ کوئی قوم اس ناگزیر ضرورت سے آنکھیں بند نہیں کر سکتی۔ تاہم فرانس اور برطانیہ نے یہ ضرورت پوری کرنے کے لیے امریکہ سے مختلف طریق اختیار کیا ہے

یہاں اعلیٰ تعلیم کے دروازے ہر بچے پر کھلے نہیں بلکہ اعلیٰ تعلیم صرف ان کے لیے مخصوص ہے جو غیر معمولی ذہانت اور قابلیت کا ثبوت دیں چنانچہ فرانس میں ثانوی تعلیم گنے چنے بچوں کے لیے مخصوص ہے۔ تیرہ برس کی عمر کو پہنچنے سے پہلے ثانوی تعلیم کے لیے جو کڑا انتخاب کیا جاتا ہے اس میں سے صرف دس فی صد طلبہ نکل سکتے ہیں۔ کاٹ چھانٹ کا یہ عمل ثانوی درجے پر بھی جاری رہتا ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پانچ چھ سال کے عرصے میں آدھے سے زیادہ طلبہ مدرسہ چھوڑ دیتے ہیں اور انجام کار داخل ہونے والوں میں سے صرف کوئی بیس فی صد ثانوی تعلیم کامیابی سے ختم کرتے ہیں بیشتر فرانسیسی بچوں کی تعلیم چودہ برس کی عمر میں ختم ہو جاتی ہے۔ اور ثانوی مدرسہ اس ابتدائی تعلیم کو کسی گنتی میں نہیں سمجھتا۔

فرانسیسی ثانوی تعلیم جو بلند معیار قائم کیے ہوئے ہے اس کے لیے وہ بہت بھاری قیمت ادا کر رہی ہے۔ فرانس میں چودہ برس کی عمر تک مدرسے میں پڑھنا ہر بچے کے لیے لازمی ہے اس عمر کو پہنچنے تک تقریباً پچاس لاکھ بچے فرانسیسی مدرسوں میں پڑھتے نظر آتے ہیں۔ لیکن کالج میں داخل ہونے تک ان میں سے نوّے فی صد راستے ہی میں رہ جاتے ہیں۔ اور دس میں سے صرف ایک طالب علم یونیورسٹی تعلیم حاصل کرتا ہے۔ انتخاب کا یہ طریق لاکھوں دلوں میں جو تلخی اور احساس نامرادی پیدا کرتا ہے۔ اس کے مجموعی بوجھ کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ مزید برآں فرانسیسی عالم اپنے ملک کے ناقابل انکار بلند تعلیمی معیاروں کے باوجود نظری دنیا سے عملی دنیا میں قدم رکھتے وقت بڑی دشواری محسوس کرتے ہیں۔ ان حالات میں یہ کہنا غلط نہیں کہ فرانسیسی نظامِ تعلیم اپنے شہریوں کے لیے سراپا رحمت نہیں۔

برطانوی مدرسوں کے تعلیمی معیار فرانسیسی معیاروں سے کچھ کم ہیں۔ برطانیہ نے علمی رجحان رکھنے والے بچوں کی تلاش کے لیے گرامر سکولوں کا سلسلہ جاری کر رکھا ہے۔ ان میں سے بعض مدرسے سرکاری ہیں اور بعض غیر سرکاری۔ گرامر سکولوں میں داخلے کے لیے گیارہ برس کی عمر کے بچوں کا امتحان لیا جاتا ہے۔ برطانوی ابتدائی مدرسوں میں پڑھنے والے بچوں میں سے تقریباً آدھے اس امتحان میں

شریک ہوتے ہیں اور شریک ہونے والوں میں تقریباً آدھے کامیاب ہوتے ہیں گویا برطانوی پرائمری سکولوں کے طلبہ میں سے صرف پچیس فی صد گرامر سکول کی علمی قسم کی تعلیم کے لیے چنے جاتے ہیں۔ ان میں سے ۲ فی صد سے کم طلبہ یونیورسٹی میں داخلہ لیتے ہیں۔

برطانیہ میں لازمی تعلیم کی عمر پندرہ برس ہے۔ لازمی تعلیم کی حد سے صرف ایک برس پہلے برطانوی مدرسوں میں کوئی پچاس لاکھ بچے پڑھتے نظر آتے ہیں۔ ان میں سے جو طلبہ اور طالبات یونیورسٹی تک پہنچتے ہیں ان کا تناسب پانچ فی صد سے بھی کم بنتا ہے گویا برطانوی نظام تعلیم بھی فرانس کی طرح کڑی کاٹ چھانٹ سے کام لیتا ہے۔ جہاں طلبہ کی کاٹ چھانٹ اسی وسیع پیمانے پر اور اس سختی سے کی جائے وہاں اونچے تعلیمی معیار قائم رکھنا اور مقررہ تدریسی طریقوں سے کام لینا چنداں مشکل نہیں رہتا۔ اس کاٹ چھانٹ کے جواز میں خواہ لاکھ دلائل دیے جائیں یہ امکان ہمیشہ باقی رہتا ہے کہ بے ایک تعلیمی معیاروں کا شکار ہونے والوں میں سے یقیناً بعض ایسے بھی ہوں گے جو بصورت دیگر آگے زندگی میں چل کر غیر معمولی قابلیت کا ثبوت دیتے۔

برطانوی تجربے کے نتائج

برطانوی گرامر سکول اسی دور کی پیداوار ہیں جس نے بحر برطانیہ کو سمندروں کی رانی اور برطانوی قوم کو عالمی معیشت اور سیاست کا رہنما بنا دیا تھا۔ یہ سکول خالصتہ علمی تعلیم دیتے ہیں اور ان کی تربیت اور ان کے اونچے تعلیمی معیار لمبی روایات کے حامل ہیں۔ دوسری عالمی جنگ نے برطانیہ کی عالمی حیثیت میں جو نمایاں تبدیلی کی وہ اس کے نظام تعلیم پر بھی اثر انداز ہوئی۔ جنگ ختم ہونے سے پہلے ہی برطانوی قوم کو صاف طور پر نظر آنے لگا تھا کہ اب گرامر سکول کی تعلیم کفایت نہیں کرے گی۔ چنانچہ ملک کی تمام سیاسی جماعتوں نے مل کر ۱۹۴۴ء میں وہ تاریخی قانون تعلیم منظور کیا جس کی رو سے ثانوی تعلیم ملک کے تمام بچوں کے لیے لازمی اور مفت قرار دی گئی۔ جن طلبہ کو ابتدائی تعلیم ختم کرنے پر گرامر سکولوں میں داخلہ نہ ملتا تھا ان کے لیے سیکنڈری ماڈرن سکول کھولے گئے۔ ان نئے مدرسوں کے سامنے نصب العین یہ تھا کہ نوجوانوں کو عملی قسم کی تعلیم دیں۔ لیکن اب کوئی ڈیڑھ دہائی گزر جانے پر جو

نتائج سامنے آئے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ سیکنڈری ماڈرن سکول اپنے مقصد میں خاطر خواہ کامیاب نہیں رہے۔ دسمبر ۱۹۵۸ء میں برطانوی حکومت نے تعلیم کے متعلق جو قرطاس ابیض شائع کیا تھا اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ نظام تعلیم میں کوئی اور اہم تبدیلی آنے والی ہے۔

۱۹۴۴ء کے قانون تعلیم نے جس تعلیمی تجربے کی بنیاد رکھی تھی اس کے متعلق سب سے تکلیف دہ چیز یہ ہے کہ وہ گرامر سکولوں کی کشش کو ختم نہیں کر سکا۔ والدین، طلبہ اور اساتذہ سب کی لگاتار یہ کوشش رہی ہے کہ سیکنڈری ماڈرن سکولوں کے طلبہ پڑھائی میں اس حد تک ترقی کر جائیں کہ ان کے لیے گرامر سکولوں میں منتقل ہونا ممکن ہو جائے۔ یہ صورت حال برطانیہ کے اقتصادی مستقبل کے لیے حوصلہ افزا نہیں اس سے عہدہ برآ ہونے کے لیے دو تجویزیں پیش کی گئی ہیں۔ پہلی یہ کہ ٹیکنیکل تعلیم حاصل کرنے والوں کے لیے یونیورسٹی سطح پر اعلیٰ ٹیکنیکل ادارے قائم کیے جائیں جو گرامر سکولوں سے کامیابی کے ساتھ ٹکر لے سکیں۔ دوسری تجویز یہ ہے کہ برطانیہ میں امریکی نمونے پر ہمہ گیر مدرسے قائم کیے جائیں تاکہ گرامر سکولوں کا وجود ہی باقی نہ رہے۔

دوسرے یورپی ممالک

فرانسیسی تعلیم کو بھی کچھ اسی قسم کی صورت حال سے سابقہ پڑ رہا ہے۔ پچھلے چند سالوں میں ثانوی مدرسے میں داخلے کا امتحان اور ثانوی تعلیم کا آخری امتحان دو مرتبہ محض اس لیے دوبارہ لیے گئے کہ ان کی دشواری کے متعلق ملک بھر میں کہرام مچ گیا تھا۔ اب ثانوی مدرسے کے بلند معیار آہستہ آہستہ نرم کیے جا رہے ہیں۔ ابتدائی مدرسوں نے بچوں کو گھر پر کام دینا بند کر دیا ہے۔ پچھلی دہائی میں فرانسیسی ثانوی مدرسوں نے بھی یہ کوشش کی ہے کہ اپنے نصاب میں عملی قسم کے مضامین بھی شامل کریں۔ لیکن برطانوی ثانوی ماڈرن سکولوں کی طرح یہ کوشش بھی کامیاب ثابت نہیں ہوئی۔ اب ٹیکنیکل تعلیم کے اعلیٰ ادارے قائم کرنے کی تجویز ہے جو ثانوی مدرسوں کا کامیابی سے مقابلہ کر سکیں۔

روسی مدرسوں کا علمی نصاب بھی تیزی سے بدل رہا ہے۔ سوویٹ یونین کے کوئی آدھے

مدرسے علمی نصاب کی جگہ پولی ٹیکنیکل قسم کا نصاب رائج کر چکے ہیں۔ اس نصاب نے روسی تاریخ علم و ادب روسی زبان اور ریاضی کا وقت کاٹ کر ڈرائیوری کی تعلیم ورک شاپ کے کام اور کارخانوں میں کام کے لیے وقت نکالا ہے۔ اگلے سال سے خانہ داری کا مضمون بھی داخل نصاب ہونے والا ہے۔ روس کے پچاس مدرسوں میں ایک اور تعلیمی تجربہ آزمایا جا رہا ہے۔ ان مدرسوں کی گیارہ سالہ نصاب کے آخری تین سالوں میں ہفتے کے تین دن مدرسے میں پڑھائی ہوگی اور تین دن کسی کارخانے میں عملی کام کرتے گذریں گے۔ اسی قسم کا ایک اور تجربہ شروع ہونے والا ہے عملی کام کی اہمیت بڑھانے کے لیے روسی یونیورسٹیوں نے اعلان کیا ہے کہ آئندہ سال اسی فیصد ایسے امیدواروں کو داخلہ ملے گا جو عملی کام، کارخانے کے کام یا فوجی خدمت کا تجربہ رکھتے ہوں غرض دوسرے یوروپی ملکوں کی طرح روس میں عملی تربیت علمی معیاروں پر تیزی سے غالب آرہی ہے۔

فلسفہ زندگی کی عکاسی

بحث کے آخر میں یہ بات وثوق کے ساتھ دہرائی جا سکتی ہے کہ کسی ملک کا نظام تعلیم بجائے کار اس ملک کے فلسفہ زندگی کی ہی عکاسی کیا کرتا ہے۔ نصاب تعلیم کی نوعیت علمی ہو یا عملی اس سے اس کی روح میں کچھ فرق نہیں پڑتا۔ یہ سچ ہے کہ موجودہ دور کے مہذب ملکوں میں سے ہر ایک کا نظام تعلیم بلند اخلاقی قدروں کو اہمیت دیتا ہے لیکن ان کے درمیان فرق اس بات سے پیدا ہوتا ہے کہ کونسی اخلاقی قدروں کو اولیت دی جا رہی ہے۔ یہ فیصلہ کسی قوم کے نظام تعلیم کی مزاجی ساخت کا فیصلہ کر دیتا ہے۔

امریکی تعلیم فرد کی ہمہ جہتی نشو ونما کو اولیت دیتی ہے۔ کوئی دو سو سال گذرے۔ امریکی آبادکاروں نے برطانوی سیادت کے خلاف محض اس لیے بغاوت کا جھنڈا بلند کیا تھا کہ وہ اپنے معاملات خود طے کرنا چاہتے تھے۔ امریکی انقلاب کی یہ روح آج تک امریکی تعلیم میں لستی چلی آرہی ہے، امریکی مدرسہ مستقبل کے شہریوں کو ایک اجازت دہ ماحول میں تربیت دیتا ہے۔ تاکہ وہ خود اعتمادی اور

جرأت عمل کے اوصاف حاصل کریں۔

اسی طرح فرانسیسی مدرسہ انقلاب فرانس کی روح کو جاودانی بخشتے ہوئے ہے۔ فرانسیسی مدرسے کے سامنے سب سے اہم نصب العین ذہنی نشوونما ہے۔ وہ ایک ایسا صاف اور سلجھا ہوا ذہن پیدا کرنا چاہتا ہے جو ہر قسم کی گرمی اور اکساہٹ سے الگ ہو کر واقعات کا تجزیہ کرے اور اس تجربے کی روشنی میں کسی معقول نتیجے پر پہنچے۔

برطانوی تعلیم کے سامنے ہمیشہ تربیت کردار کا نصب العین رہا ہے۔ برطانیہ کے شہرۂ آفاق پبلک سکولوں نے ایسے افراد پیدا کرنے کی کوشش کی ہے جو متوازن مزاج ہوں اور جو رہنمائی کی بڑی بڑی ذمہ داریاں پورے ہوش اور فخر کے ساتھ انجام دے سکیں۔ متوازن سیرت کا یہ نصب العین ہیرو ریگن انقلاب کی پیداوار ہے۔ یہ نصب العین برطانیہ کو آج بھی اسی طرح عزیز ہے جس طرح کرامویل کے زمانے میں تھا۔

روسی تعلیم کے سامنے سب سے بڑا نصب العین اتحاد اور یک جہتی ہے۔ اکتوبر ۱۹۱۷ء کے انقلاب کے بعد روسی قوم کو یک دم یہ شدید احساس ہوا کہ اس نے اپنی نجات کے لیے جو جہاد لڑا ہے اس نے باقی دنیا کو اس کا دشمن بنا دیا ہے۔ اس احساس نے روسی قوم کو یک جان ہو جانے پر مجبور کیا۔ روسی انقلاب کے بعد سے روسی قوم نے اس نصب العین کو اس سختی سے اپنایا ہے کہ انفرادی آزادی کے کچلے جانے کا حقیقی خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔ تاہم جن لوگوں نے روسی مدرسوں کو دیکھا ہے وہ اس بے پناہ روحِ اتحاد سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے جو ان مدرسوں میں رچی بسی نظر آتی ہے۔

کیوبا کی سنسان یونیورسٹی

عزیز احمد

جہاں ہر طالب علم مشتبہ ہے

جدید دور تہذیب اور روشنی کا دور ہے۔ اس دور کی ریاست کے ذمے یہ فرض بھی عاید ہوتا ہے کہ وہ علوم و فنون کی سرپرستی کرے اور اپنے شہریوں کو معقول تعلیمی سہولتیں مہیا کرے۔ مگر تہذیب اور روشنی کے اس دور میں ایک ملک ایسا بھی جس کی حکومت علوم و فنون کی اشاعت کو ایک خطرناک چیز خیال کرتی ہے اور جس نے ملک کی ۲۳۰ سال پرانی یونیورسٹی کو پچھلے تین سال سے بند کر رکھا ہے۔ یہ ملک کیوبا ہے جو کہ کھانڈ کی پیداوار کے لیے دنیا بھر میں شہرت رکھتا ہے۔

چھے سال ہوئے کیوبا میں فوجی انقلاب برپا ہوا تھا جس کے نتیجے کے طور پر جنرل بتستا نے حکومت پر قبضہ کر لیا۔ اس وقت سے ملک میں آمریت قائم ہے۔ کیوبا کے طلبہ پہلے دن سے ہی اس آمریت کے خلاف تھے۔ کیوں کہ فوجی آمر نے اقتدار حاصل کرنے اور اسے برقرار رکھنے کے لیے غیر آئینی طریقے اختیار کیے تھے۔ اس نے فوجی قوت کے بل پر حکومت حاصل کی تھی اور وہ فوجی قوت کے سہارے ہی اس پر قابض رہنے پر تلا ہوا تھا۔ کیوبا کی عام آبادی فوجی آمریت سے مرعوب ہو گئی مگر یونیورسٹی طلبہ جو ذہنی آزادی کے علم بردار تھے اس دور دہشت کے سامنے سر نہ جھکا سکے۔ انھوں نے حکومت کے غیر آئینی طور طریقوں کے خلاف آواز اٹھائی۔ ہوانا کی اڑھائی سو سال پرانی یونیورسٹی ملکی ثقافت کا مرکز تھی۔ یہاں کوئی ستر ہزار طالب علم مختلف علوم و فنون کی اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ ملک پر دور دہشت مسلط ہو جانے سے ان پر تحصیل علم سے بھی زیادہ اہم ذمہ داری عاید ہو گئی۔ علوم و فنون کی ترقی اور نشر و اشاعت کے لیے آزادی خیال اور آزادی اظہار ضروری شرائط ہیں۔ کیوبا میں یہ شرائط ناپید ہو چکی تھیں۔ ملک میں پولیس کی حکومت تھی اور اخبارات پر کڑا احتساب قائم تھا۔ طلبہ کی قومی انجمن نے اس صورتِ حال کے خلاف جدوجہد شروع کی

آموزش

سنہ ۱۹۵۵-۵۶ء میں ہوانا یونیورسٹی کے طلبہ نے تین بار عظیم الشان مظاہرے کیے۔ پولیس نے ہر بار مظاہرین پر
حملہ کیا اور کئی طلبہ کو زخمی کر دیا۔
یونیورسٹی کے ریکٹر کو طلبہ کے نقطہ نگاہ سے پوری ہمدردی تھی۔ اس کا موقف یہ تھا کہ حکومت کو یونیورسٹی
کی سرگرمیوں میں مداخلت کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا، مگر حکومت یہ بات تسلیم کرنے کو تیار نہ تھی۔ پولیس کی
جمعیت نے کئی بار یونیورسٹی کے مختلف دفتروں اور سائنس کی تجربہ گاہوں پر چھاپے مارے۔ ان چھاپوں سے
ریکٹر کا دفتر بھی محفوظ نہ رہا۔ ۲۷ نومبر ۱۹۵۶ء کو ہوانا یونیورسٹی کے طلبہ ۱۸۷۱ء میں شہید ہونے والے طلبہ کا
دن منا رہے تھے۔ اس سے پہلے بھی یہ دن ہر سال منایا جاتا تھا، مگر اس دفعہ پولیس پوری جمعیت کے ساتھ
طلبہ پر حملہ آور ہوئی اور سولہ طلبہ کو زخمی کر دیا۔ اس سے اگلے روز یونیورسٹی کونسل نے ایک اجلاس منعقد کر کے
یونیورسٹی کی تمام سرگرمیاں بند کر دینے کا فیصلہ کیا۔ اس دن سے ہوانا کی یونیورسٹی بند پڑی ہے۔ پولیس نے
یونیورسٹی کو جانے والے تمام راستے بند کر رکھے ہیں اور کوئی طالب علم انکے پاس نہیں پھٹک سکتا۔ وہ کمرے
تجربہ گاہیں اور برآمدے جو کبھی طلبہ اور پروفیسروں کی آوازوں سے گونجا کرتے تھے آج بالکل سنسان پڑے
ہیں۔ ان کی دیواروں پر طلبہ کے خون اور پولیس کی گولیوں کے نشان موجود ہیں۔
لیکن حکومت کا تشدد کیوبا کے طلبہ کو بے بس بنانے میں ناکام رہا ہے، وہ یونیورسٹی سے نکالے
جا چکے ہیں۔ مگر اس سے ان کے جہاد آزادی کی رفتار مدھم نہیں پڑی۔ انھوں نے کتابیں رکھ کر بندوقیں
سنبھال لی ہیں۔ اور ملک میں کھلی خانہ جنگی جاری ہے۔ طلبہ کی انقلابی تحریک خفیہ شکل اختیار کر چکی ہے
اس تحریک کے کئی رہنما جلا وطنی کی زندگی گذار رہے ہیں۔ درجنوں پولیس کی گولی کا نشانہ بن چکے ہیں اور
ان گنت نوجوان جیلوں میں سڑ رہے ہیں۔ آج کیوبا میں ہر طالب علم حکومت کی نگاہوں میں مشتبہ ہے
حکومت کا سارا کارخانہ طلبہ کا سراغ لگانے اور انھیں ختم کر دینے کے درپے ہے۔ اس مطلب کے لیے
طلبہ کو باقاعدہ طور پر گرفتار کرنا اور ان پر مقدمہ چلانا ضروری نہیں سمجھا جاتا۔ پولیس طلبہ کی تحریک کے راہنماؤں
کی تلاش میں رہتی ہے۔ اور جہاں کہیں ان کا سراغ ملتا ہے اچانک چھاپہ مار کر انھیں گولی کا نشانہ بنا دیتی
ہے۔ بیرونی دنیا کو اس خونریزی کی کچھ خبر نہیں ہونے پائی کیوں کہ اخبارات میں چھپنے والی ہر خبر سرکار

احتساب کی چھلنی سے گذر کرآتی ہے۔

ایک عینی شاہد کا بیان

اس وقت دنیا کے ہر مہذب ملک میں طلبہ کی قومی انجمن موجود ہے۔ یہ تمام قومی انجمنیں ایک بین الاقوامی تنظیم کے ساتھ منسلک ہیں جس کا صدر دفتر ہالینڈ میں قائم ہے۔ پچھلے سال طلبہ کی اس بین الاقوامی تنظیم نے ایک کمیشن مقرر کیا تھا جس کا مقصد یہ تھا کہ مختلف ملکوں میں طلبہ کی جو قومی انجمنیں قائم ہیں ان کے متعلق قابل اعتماد معلومات فراہم کرے۔ اس کمیشن نے اپنی رپورٹ میں کہا کہ کیوبا میں طلبہ کو طرح طرح کی اذیتوں اور قتل کا شکار کیا جارہا ہے۔ اس کے چند ماہ بعد طلبہ کی بین الاقوامی تنظیم نے اپنے ایک نائب سکریٹری کی جو بولیویا کا رہنے والا تھا اس خدمت پر مامور کیا کہ وہ کیوبا میں جاکر سرکردہ طالب علموں سے ملاقاتیں کرے اور کیوبا کی صورت حال کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرے۔

مگر کیوبا کے سرکردہ طلبہ سے ملاقات کرنے کے لیے ضروری تھا کہ پہلے سے اس ملاقات کا خفیہ طور پر بندوبست کیا جائے کیوں کہ طلبا کی انقلابی تحریک اس وقت زیر زمین جاچکی ہے اور اس کے رہنما اپنی جانیں ہتھیلی پر رکھ کر اس تحریک کو چلا رہے ہیں۔ چناں چہ بین الاقوامی نمائندے نے پہلے اس تحریک کے سکریٹری سے ملاقات کی جو اس وقت جلا وطن ہے۔ اس نے تحریک کے ذمہ دار لوگوں کے نام اور پتے دیے۔ ساتھ ہی اس نے ان طلبہ کو بھی اطلاع بھیجی کہ وہ غیر ملکی مہمان سے ملیں۔ جب یہ نمائندہ ہوانا میں پہنچا تو اس نے شہر میں خوب چہل پہل دیکھی۔ غیر ملکی سیاحوں کے لیے سیر و تفریح کے انتظامات حسب معمول موجود تھے۔ مگر اس ظاہری چہل پہل کے پیچھے ایک ہلکی سی کھچاوٹ بھی محسوس ہوتی تھی۔

بین الاقوامی نمائندہ ہوانا کے پُررونق ترین چوراہے میں ادھر ادھر گھوم رہا تھا کہ ایک نوجوان لڑکی اس کے پاس آئی اور اس کی شناخت سے مطمئن ہونے کے بعد بولی کہ طلبہ کی قومی انجمن کے عہدیدار آپ کے منتظر بیٹھے ہیں، آئیے میرے ساتھ چلیے۔ تھوڑی دیر بعد بین الاقوامی نمائندہ شہر کے گنجان آباد حصے میں ایک مکان میں بیٹھا طلبہ کی قومی انجمن کے صدر اور اس کے دوسرے ذمے دار ساتھیوں کے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔ یہ ملاقات چند گھنٹے تک جاری رہی۔ دفعتاً یہ لوگ اٹھ کھڑے ہوئے

اور مہمان کو ساتھ لے کر کچھ فاصلے پر ایک اور مکان میں جا بیٹھے۔ یہ نقل مکانی اس لیے کی گئی تھی کہ طلبا کو کھٹکا تھا کہ پولیس کو ان کی موجودگی کی اطلاع مل جائے گی اور ان پر ناگہانی طور پر حملہ کر دیا جائے گا۔

اب اس نئے مکان میں بات چیت جاری رہی۔ چند طلبہ بندوقیں سنبھالے دروازے پر پہرہ دے رہے تھے۔ چند گھنٹوں بعد شام ہو گئی اور مہمان نے میزبانوں سے اجازت لی۔ اگلی صبح وہ ایک طالب علم رہنما کے ساتھ کیوبا کے پہاڑی علاقے کا دورہ کرنے والا تھا جہاں طلبہ نے باقاعدہ خانہ جنگی جاری کر رکھی تھی۔ لیکن اگلی صبح بین الاقوامی نمائندے کو یہ معلوم کر کے بہت دکھ ہوا کہ جس مکان میں وہ اپنے کیوبن دوستوں کو چھوڑ آیا تھا۔ اس کے چلے آنے کے چند گھنٹے بعد پولیس نے اس پر شبخون مارا اور تین طلبہ میں سے دو کو سوتے سوتے موت کی نیند سلا دیا۔ قتل ہونے والوں میں سے ایک وہ بھی تھا جسے اس کے ہمراہ پہاڑی علاقے میں جانا تھا۔ اس وحشت ناک واقعہ کے بعد بین الاقوامی نمائندے نے کیوبا میں مزید قیام کا ارادہ ترک کر دیا۔

کیوبا کے نوجوان طلبہ اور طالبات نے فوجی آمریت کی لاقانونی سینہ زوری کے خلاف جو جہاد جاری کر رکھا ہے وہ نوع انسانی کی جنگ آزادی کا ایک سنہری باب ہے۔ اب تک بیسیوں نوجوان گولیوں کا نشانہ بن چکے ہیں۔ اور سینکڑوں قید و بند کی سختیاں جھیل رہے ہیں۔ مگر اس تشدد نے طلبہ کے جذبۂ آزادی کو اور بھی تیز کر دیا ہے۔ جونہی ایک طالب علم رہنما قتل ہوتا ہے دوسرا فوراً اس کی جگہ سنبھال لیتا ہے۔ سینہ زوری اور علمی معقولیت کے درمیان یہ جنگ پچھلے تین سال سے جاری ہے اور دن بدن تیز تر ہوتی جا رہی ہے۔ کیوبا کے نوجوانوں کو یقین ہے کہ آخر جیت ان ہی کی ہو گی خواہ انھیں اس کے لیے کتنی ہی بھاری قیمت کیوں نہ ادا کرنی پڑے ؏

اُردو رسم الخط کی تبدیلی کا مسئلہ

شیخ اصغر علی

ماہرین لسانیات نے السنۂ عالم کو مختلف خاندانوں اور گروہوں میں تقسیم کر رکھا ہے اور ایک گروہ سے تعلق رکھنے والی زبانیں دوسرے قبیلے کی زبانوں سے اپنی ہیئت، ترکیب اور ساخت کے اعتبار سے اس قدر مختلف ہیں کہ بظاہر یہ یقین نہیں آتا کہ یہ سب زبانیں کبھی ایک ہی منبع سے نکلیں اور یہ سارے سوتے ایک ہی سرچشمے سے پھوٹے۔

جب انسان عالم وجود میں آیا تو قوت گویائی اور زبان ساتھ لایا۔ "عَلَّمَ آدَمَ الْاَسْمَاءَ کُلَّهَا" اور "عَلَّمَهُ الْبَيَانَ" کی مقدس آیاتِ قرآنی اسی حقیقت کا اعلان ہیں۔ انسان سے انسان کی نسل چلی اور زبان سے زبان کی۔ انسان دنیا کے مختلف خطوں میں پھیل گیا۔ اس کے توسل سے اس کی زبان بھی مختلف گوشوں اور کونوں میں جا پہنچی۔ ہر خطے کی مخصوص فضا تھی، مختلف آب و ہوا تھی۔ نئے حالات تھے اور نئے تقاضے، نئی مصیبتیں اور نئی ضرورتیں۔ ان سب چیزوں نے اس کی وضع قطع، اس کے لباس اور اس کے طرز بود و ماند پر اثر کیا۔ زبان ان اثرات سے کیوں کر بچ سکتی تھی؟ چنانچہ دنیا میں جتنے خطے، جتنے ملک اور جتنے علاقے بنے، اتنی زبانیں وجود میں آگئیں۔ پھر جب مختلف علاقوں کے لوگوں میں میل جول شروع ہوا تو تہذیبوں کے تصادم سے نئی تہذیبیں پیدا ہوئیں اور زبانوں کے ملاپ سے نئی زبانیں، یہاں تک کہ وہ وقت بھی آیا کہ پرانی زبانیں مردہ ہو کے رہ گئیں اور ان کی گدی نئی زبانوں نے سنبھال لی۔

جوں جوں انسان نے زندگی کے دوسرے شعبوں میں ترقی کی، رہن سہن کے طریقوں کو سنوارا، تہذیب و تمدن کو نکھارا، توں توں اس کی زبان سنورتی اور نکھرتی چلی گئی۔ پھر ایک دور آیا کہ اس نے لکھنے کا فن ایجاد کیا۔ اپنی زبان کے مختلف اسماء کے لیے مختلف تصویری علامات وضع کر لی گئیں۔ طبیعت ناصبور تھی اس پر قناعت نہ ہوئی۔ قدم آگے بڑھایا۔ تصویری علامات کو اس قدر جامع بنا دیا کہ یہ

مسلسل اور مربوط عبارات کے لیے کارآمد ہوگیا۔ جب یہ تصویری رسم الخط انسان کی روزافزوں ضروریات
کا ساتھ نہ دے سکا تو آوازوں پر مبنی علامات وضع کی گئیں یعنی مختلف آوازوں کو مختلف علامتوں میں
ظاہر کیا جانے لگا اور ہوتے ہوتے مکمل رسم الخط کی صورت پیدا ہوگئی۔ آج دنیا میں بیسیوں رسم الخط ہیں
زبانوں کے ماخذ کی طرح ان کا ماخذ بھی ایک ہی ہے۔ بدلی ہوئی صورتوں کے باوجود ابجد اور
ABCD کلمن اور KLMN قرشت اور QRST میں صوتی ہم آہنگی اور پھر ان کی ترتیب اس
بات کی غماز ہے کہ مختلف خطوں کے دھارے ایک ہی چشمے سے پھوٹے۔ لیکن بعد کی ترامیم و تغیرات
نے ان کے ڈھانچے بدل دیے۔ زبانوں کے میل جول کے ساتھ ساتھ خطوں کا ملاپ بھی جاری رہا۔ کبھی کسی
زبان نے اپنے خط کے لیے دوسری زبان کے خط کو اپنا لیا۔ اور کبھی اس کے اتباع میں اپنے خط میں
چند ایک ضروری تبدیلیاں کرلیں۔

موجودہ فارسی اور اس کے رسم الخط کو ہی لیجیے۔ جب عربی اور پہلوی کا میل جول ہوا تو اس
اختلاط نے ایک ایسی زبان کو جنم دیا جو پہلوی سے بہت مختلف ہوگئی۔ جب زبان وہ نہ رہی تو رسم الخط
کہاں تک ساتھ دیتا۔ اس لیے مجبوراً پہلوی کے مشکل اور پیچیدہ رسم خط کے بجائے عربی رسم خط کو
کچھ اضافوں اور ترامیم کے ساتھ اپنا لیا گیا۔

لاطینی کو دیکھیے۔ یہ زبان روم کے ایک قبیلہ لاطین کی ایک بولی تھی۔ سلطنت روما کے
عروج کے زمانے میں ملک ملک میں پھیلی، جہاں پہنچی وہاں کی بولی کو متاثر کیا۔ یہاں تک کہ اسے اپنے
قالب میں ڈھال لیا۔ آج دنیا کی بیسیوں زبانوں میں اس کے حروف اور الفاظ ہیں اور بیسیوں اس کے
رسم خط میں لکھی جاتی ہیں۔

عربی اور لاطینی کے علاوہ ایک تیسرا اہم رسم خط دیوناگری ہے، جو سنسکرت کے قدیم رسم خط کی
اصلاح شدہ صورت ہے۔ ہندوستان کی اکثر بولیوں اور زبانوں کے کام آیا۔ اردو جو فارسی اور برصغیر
پاک و ہند کی مقامی بولیوں کے ملاپ سے ظہور میں آئی۔ ناگری رسم خط کے سانچے میں نہ ڈھل سکی کہ مزاج پر
فارس کی گہری چھاپ تھی۔ چونکہ ہندی نژاد تھی۔ اس لیے ناگری سے بے اعتنائی بھی ممکن نہ تھی لہٰذا

اعتدال پسندی سے کام لیتے ہوئے کچھ علامات فارسی سے لیں کچھ عربی سے اور کچھ ہندی آوازوں کو اپنی علامات میں ڈھالا اور یوں اپنے فنکارانہ برتاؤ اور سلیقہ مندی سے ایسا خط وضع کر لیا جو اس کے اپنے مزاج کے عین موافق اور اپنی ضروریات کے عین مطابق تھا۔

اس تمہیدی گفتگو کا لب لباب یہ ہے کہ زبان کی تاریخ اور لسانیات کی دنیا میں یہ "ایجاب و قبول" کوئی نئی چیز نہیں۔ ایک ایک رسم خط مناسب اضافوں اور ترمیموں کے ساتھ دس دس بیس بیس زبانوں کے لیے رائج ہوا لیکن اس طرح کہ نئی زبان میں پہنچ کر وہ اسی کا ہو گیا۔ سامی خط سنسکرت میں آیا تو اور کا اور ہو گیا۔ یہی سنسکرت جب پالی کے لیے استعمال ہوا تو اس کی شکل پہلے سے مختلف ہو گئی۔ پھر جب پالی کو ترویج بھاشا کے لیے اپنایا گیا تو اس میں اور اضافے کر لیے گئے۔ رسم خط کی جڑیں اور بنیادیں یقیناً ایک رہیں لیکن شاخیں اور پتے وضع قطع کے اعتبار سے مختلف ہو گئے، اور اس پیوند سے پھلوں کا مزہ بھی یکسر بدل گیا۔

رسم الخط میں اصلاح و ترمیم کا حق ہر دور میں حاصل رہا، اور آج بھی کسی زبان کے ماہروں اور اس کے لکھنے پڑھنے والوں کو یہ حق حاصل ہے کہ اگر ان کا رائج الوقت رسم الخط بڑھتے ہوئے تقاضوں اور نت نئی ضروریات کا ساتھ دینے سے قاصر ہو تو اس کی مناسب اصلاح کریں۔ دوسرے رائج رسم الخطوں سے استفادہ کرتے ہوئے اسے ایک معیاری رسم خط کا مقام عطا کریں۔ لہٰذا اگر کسی طرف سے یہ تجویز پیش ہو کہ فلاں رسم خط چوں کہ اپنی ہیئت ترکیبی اور رنگ ڈھنگ کے اعتبار سے ناقص ہے۔ اور اس حد تک ناقص ہے کہ اس کی اصلاح بھی ممکن نہیں۔ اور زبان کی سلامتی کا راز اسی سے نجات اور فلاں رسم خط کے اپنانے میں مضمر ہے تو اس سے جھنجھلانے کا کوئی مقام نہیں۔ لیکن چوں کہ رسم خط کی تبدیلی زبان میں ایک عظیم انقلاب کی پیامبر ہوتی ہے اور ایک شدید تغیر کی ضامن ہوا کرتی ہے۔ بلکہ یوں کہیے کہ اس تبدیلی سے زبان ایک ایسی نئی دنیا میں قدم رکھتی ہے جہاں کے قاعدے جدا، اصول نئے اور اطوار نرالے ہوتے ہیں۔ اس لیے یہ دیکھنا ضروری ہوتا ہے کہ یہ ساری تبدیلیاں اس بچاری کے مزاج کو کہاں تک راس آئیں گی۔ کہیں نئی فضا کی گھٹن میں یہ اپنا دم تو نہیں توڑ بیٹھے گی؟ کیا یہ زندگی بھر کا نیا ساتھ نبھ سکے گا؟ کیا یہ ہوا اس کے من اور تن کی دنیا میں بہار لا سکے گی؟ کیا اس انتقال مکانی سے

ساری بیماریاں جاتی رہیں گی جو ہمارے لسانی نباضوں نے تشخیص کیں؟ کیا یہ نیا دارو اس کے سارے
موں کا مداوا بن سکے گا، جو دورِ حاضر کے حکیموں نے ڈھونڈ نکالے ہیں۔ پھر ایسے انقلاب آفرین علاج
نسخہ نویسی سے پہلے تشخیص کی صحت کے بارے میں ایک بار نہیں دس بار اطمینان کر لینا چاہیے۔ تشخیص
ہی غلط ہوئی تو دوا بجائے فائدہ پہنچانے کے الٹا نقصان کرے گی۔ تشخیص کے بعد نسخہ لکھتے اور دوا تجویز کرتے
وقت مریض کے مزاج کو پیش نظر رکھنا بھی بے حد ضروری ہوتا ہے۔

اب ان ساری باتوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے ہم اس مرض کا جائزہ لیتے ہیں جو ہمارے بعض اطبا
کے خیال میں اردو زبان کے قالب کو کھائے جا رہا ہے۔ اور اس کی جسمانی نشو و نما کی راہ میں روک بنا ہوا
ہے۔ اور یہ بھی دیکھتے ہیں کہ مجوزہ علاج اس کے مزاج کے پیش نظر اس کے لیے کہاں تک مفید ہے

رسم خط کا یہ "روگ" جس کا کھوج لگایا جا چکا ہے، آج سے پچاس سال پہلے بھی موجود تھا۔ مہاتما گاندھی اس
زبان سے اسی لیے ناراض تھے کہ یہ قرآن کے حروف یعنی عربی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے اور چاہتے یہ
تھے کہ فارسی اور عربی کے الفاظ چھانٹ دیے جائیں اور اسے ناگری کا لباس اوڑھا دیا جائے۔ یہ
تجویز رد کر دینے کے قابل تھی اس لیے رد کر دی گئی۔ یہی دور انگریز کے اقتدار کا دور تھا۔ انگریزی ہندوستانیوں
کے رگ و ریشے میں رس اور بس چکی تھی۔ اس زبان نے انگریزی کے تسلط کو قبول کر لیا تھا۔ اردو ادب پر انگریزی
ادب کا رنگ چڑھنے لگا تھا۔ زبان انگریزی الفاظ و محاورات کو اپنے آغوشِ محبت میں غیر شعوری طور پر
سمیٹتی چلی جا رہی تھی۔ جب ناگری پسند نہ آیا تو یار لوگوں نے لاطینی رسم خط کو آگے بڑھایا۔ چونکہ دلدادگانِ
زبان اور پرستارانِ اردو نے اسے بھی زبان کی فلاح و بہبود کے لیے منافی سمجھا اس لیے اسے بھی ٹھکرا دیا گیا۔

آزادی کا سورج نکلا۔ غلامی کے گھناؤنے بادل چھٹ گئے۔ تاریکی نور میں بدل گئی۔ اردو کا پھریرا لہرانے لگا
کبھی کبھی مشرق سے تیز ہوائیں چلیں۔ مغرب سے آندھیاں بھی اٹھیں۔ شمال و جنوب سے اپنے اپنے موسم
میں تیز طوفانی لہریں یلغار کرتی رہیں۔ لیکن یہ علم جو اس سے قبل ہندوستان کی بادِ سموم کے سامنے خم نہ ہوا تھا
ان کے آگے سرنگوں کیوں کر ہوتا، خدائے اعظم کی دعائیں اس کے ساتھ تھیں۔ ان کا نعرۂ حق اس کے لیے آبِ حیات
تھا۔ یہ اسی آن بان سے ہواؤں میں لہراتا رہا۔ اس دور میں محبوں اور مخلصوں نے اس کی ترویج و اشاعت کے لیے

کوششیں شروع کیں. زمانے کو آگے بڑھا اور زبان کو پیچھے رہا دیکھ کر پریشان ہو گئے. علوم و فنون اور ادب دونوں میں اسے آگے بڑھانا چاہا. لیکن طباعت کی مشکلات کو راستے میں حائل پایا. کاتب کا لکھنا پیٹ پر آتارنا. اسے "آتار چڑھاؤ" میں حروف کا کٹ جانا. پھر انھیں درست کرنا. داب میں پھر ان کا مٹنا پھر ٹھیک کرنا اور پھر دو چار ہزار دالیوں کے بعد دم توڑ دینا، یہ ساری باتیں راستہ رو کنے لگیں. طباعت کی ان مشکلات کا حل سوچا جانے لگا. کسی نے کہا، اس کا واحد حل "نسخ" ہے. دوسرے نے کہا نہیں اس کا علاج "لاطینی" ہے. تا حال یہ بحث چل رہی ہے. دونوں اس کے بہی خواہ، دونوں اس کے ہمدرد تشخیص نہ ہوئی کہ لیتھو کی موجودگی میں ہمارا پریس اور ہماری زبان ترقی نہیں کر سکتے اور ہزاروں کی تعداد میں لٹریچر فراہم نہیں ہو سکتا. لیکن علاج میں اختلاف پیدا ہو گیا ہے. لاطینی کے حامیوں نے یہ دعویٰ بھی کیا ہے کہ اس کے اپنانے سے نہ صرف :-

(۱) - طباعت کی مشکلات سے چھٹکارا ہو جائے گا بلکہ

(۲) - رومن رسم خط سے پڑھنا اور لکھنا بھی سہل ہو جائے گا۔ ہمارے بالغ اور بچے اسے جلد جلد سیکھ سکیں گے کیوں کہ اس خط میں حروف ہر حال میں اپنی انفرادی شکلیں برقرار رکھتے ہیں یعنی حرف الگ الگ لکھے جاتے ہیں اور حروف کی تعداد بھی کم ہے. اس طرح ملک میں خواندگی کا بول بالا ہو جائے گا، اور جہالت نابود ہو جائے گی۔

(۳) اس خط کو اگر اردو اور بنگلہ دونوں کے لیے اپنا لیا گیا تو ایک نئی قومی زبان ظہور میں آ سکے گی جو ملکی استحکام کی ضامن اور حقیقی وحدت و اتحاد کی ذمہ دار ہو گی۔

(۴) اس خط کو اختیار کر لینے کے بعد طلبہ کا دوسری زبانیں سیکھنے کا کام بھی بہت آسان ہو جائے گا.

(۵) ہماری زبان اس سانچے میں ڈھل کر جدید مغربی زبانوں کی ہم پلّہ ہو جائے گی اور یوں دنیائے مغرب میں اس کا وقار بلند اور نام اونچا ہو جائے گا ۔

(۶) اہل مغرب اور دوسرے غیر ملکی حضرات کو ہماری زبان سیکھنا سہل ہو جائے گا۔

آئیے ان دلائل کی صحت کو بڑی غیر جانب داری سے پرکھیں اور ان پر بے لاگ تنقید کے بعد یہ دیکھیں

آموزش

کہ اردو کی بہبودی کس رسم خط میں مضمر ہے؟ رومن میں یا نسخ میں، اور ان دونوں میں سے کونسا خط اس کے مزاج کے راس ہے۔

اگر بات طباعت ہی تک محدود رہتی تو لاطینی رسم خط کے رد میں صرف ایک ہی دلیل کافی تھی کہ جب موجودہ اردو رسم خط میں نستعلیق کے علاوہ نسخ کی بھی ایک صورت موجود ہے، اور اس کے اپنا لینے سے آوازوں اور تلفظ میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا، اور طباعت کی دشواریاں بھی جاتی رہتی ہیں، تو لاطینی کی کیا ضرورت؟ عربی اور فارسی میں نسخ نہایت کامیابی سے چل رہا ہے۔ بڑے بڑے ضخیم روزنامے ہزاروں کی تعداد میں اسی خط میں چھاپے جاتے ہیں۔ خود پاکستان میں بہت سی کتابیں اور رسائل اسی خط میں چھپ رہے ہیں۔ اگر اس کا معیاری ٹائپ رائٹر تا حال نہیں بن سکا، اور موجودہ ٹائپ رائٹروں میں کچھ تکنیکی خامیاں موجود ہیں تو وہ رفع ہو سکتی ہیں۔ چیزوں کی ایجاد میں صدیاں لگتی ہیں لیکن جب کوئی ایجاد معرض وجود میں آ جاتی ہے تو اس کی نوک پلک درست کرنے اور اسے معیاری بنانے میں چند سالوں کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔

"نسخ مہنگا ہے اور رومن سستا"! اوّل تو یہ بات کو الف۔ اکٹھے کیے بغیر ہی کہی جاتی ہے یہ بھی ٹائپ اور وہ بھی ٹائپ۔ نسخ میں اگر ٹکڑوں کی زیادتی کی وجہ سے قالب ساز (COMPOSITER) کو رومن کی نسبت زیادہ محنت کرنی پڑتی ہے اور وہ زیادہ معاوضہ مانگتا ہے تو کوئی مضائقہ نہیں۔ آخر رومن کے ایک صفحے کا مواد بھی تو نسخ کے نصف صفحے میں آ جاتا ہے۔ رومن میں حروف الگ الگ لکھے جاتے ہیں۔ نسخ ایک طرح کی مختصر نویسی ہے۔ اس لیے کاغذ کے مصارف میں بچت ہو جاتی ہے قالب ساز کا وقت اگر ضرورت سے زیادہ صرف ہوتا ہے تو اس کی وجہ مشق کی کمی اور ناتجربہ کاری ہے ایک مشاق قالب ساز اسی سہولت سے نسخ کی عبارات کا ڈھانچہ تیار کر سکتا ہے جس آسانی سے رومن کا۔ یہ کہنا کہ لوگوں کو نسخ پڑھنے میں دقت ہوتی ہے صحیح نہیں۔ نستعلیق میں چھپی ہوئی کتابیں پڑھنے والا انسان معمولی مشق سے یہ کتابیں بآسانی پڑھ سکتا ہے۔ نسخ کے تدریجی نفاذ سے یہ دقت آپ سے آپ رفع ہو جائے گی۔ اور اگر نسخ میں پڑھنا مشکل ہو گا تو رومن میں پڑھنا تو اور بھی مشکل ہو گا۔

اسی طرح یہ رائے کہ نسخ خوب صورت خط نہیں محل نظر ہے۔ ایک مشہور کہاوت ہے کہ "حسن دیکھنے والے کی آنکھ میں ہوتا ہے"۔ رومن کے حامیوں کو وہ خط حسین نظر آتا ہے اور نسخ کے حامیوں کو یہ زیادہ جاذبِ نظر معلوم ہوتا ہے۔ اور اگر نستعلیق کے معاملے میں نسخ اتنا خوب صورت نہیں تو نہ سہی۔ اس میں ان دقتوں کا حل تو موجود ہے جو ہماری زبان کی ترقی کی راہ میں سنگ گراں بنی ہوئی ہیں ایک ایسا حل جو زبان کی حدود اور اس کے رسم خط کی قیود میں رہتے ہوئے تلاش کیا جا سکتا ہے، ایک ایسا حل جس میں کوئی نقصان ہے نہ خامی۔ مزید برآں نستعلیق کا وجود اپنی جگہ پر قائم رہے گا۔ اعلیٰ اور نفیس چھپائی کے لیے عکسی قطعات اور رنگین کتابت کے لیے اس کا باقی رکھنا ضروری ہے۔ خطاطی ایک فن ہے۔ اور فن بھی بڑا لطیف اور پیارا۔ ہر دور میں ماہر خطاطوں نے اسے اپنے خونِ جگر سے سینچا اور اسے فن کی معراج سے روشناس کرایا۔ آج بھی ان کی خطاطی کے نمونے ہمارے لیے موجبِ فرحت اور باعثِ فخر ہیں۔ ان کا فن زندہ جاوید ہے اور آنے والی نسلوں کے لیے موجبِ افتخار۔ اس سے ہر دور میں کام لیا جائے گا اور دیوانِ غالب ایسی کتابیں جو ادب میں الہام کا مقام رکھتی ہیں اس میں پوری زیبائش اور رعنائی سے چھپتی رہیں گی۔ لیکن روز مرہ کی ضرورت کی کتابیں۔ علمی اور فنی کارنامے، رسائل اور اخبارات یہ سب تو نسخ ہی میں چھپیں گے۔ دفتری کاروبار بھی نسخ میں اسی سہولت سے ہو سکتا ہے جس آسانی سے رومن میں۔ ٹائپ رائٹرز موجود ہیں۔ ٹائپسٹ بڑی آسانی سے اس مشین پر کام کرنا بھی سیکھ سکتے ہیں اردو کا شارٹ ہینڈ رائج ہو چکا ہے۔ اسے اور بہتر بنایا جا سکتا ہے

لیکن طباعت کے علاوہ رومن کے حق میں جو دلائل اوپر مذکور ہوئے جب تک ان پر غور نہ کیا جائے، نسخ کی برتری ثابت نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا آئندہ سطور میں انھی دلائل کی جانچ پڑتال کی جائے گی

بادی النظر میں یہ دلیل کہ رومن رسم الخط کو جاننا اور اس کے وسیلے سے اردو زبان سیکھنا بہت سہل ہوگا، اور اس طرح پورے ملک کو خواندہ بنایا جا سکے گا، بڑی وزنی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن حقیقت اس کے برعکس نظر آتی ہے۔ موجودہ انگریزی ہجے جو اس وقت لاطینی رسم خط کی ایک نمائندہ کی حیثیت رکھتا ہے اور وہی موجودہ حالات میں ہمارے پیش نظر ہے۔ کل (۲۶) چھبیس حروف ہیں

(۲۱) اکیس حروف صحیح (۵) پانچ حروفِ علّت یعنی (VOWELS) لیکن آوازیں اکیس نہیں بلکہ (۴۴) چوالیس ہیں۔ باقی (۱۳) تیرہ آوازوں کے لیے مرکبات سے کام لیا جاتا ہے۔ مثلاً "ش" کے لیے (SH) "چ" (CH) وغیرہ۔ اور پھر یہ آوازیں دوسرے مرکبات سے بھی ادا ہو جاتی ہیں۔ مثلاً ش کے لیے SH کے علاوہ TIO اور CH کام دیتے ہیں۔ جیسے (SHARE) — (STATION) (DEBAUCH) ، چ کے لیے CH کے علاوہ "TU" مثلاً (TEACHER)

اور TINCTURE اور پھر یہی "CH" ک کی آواز کے لیے بھی کام آتا ہے مثلاً CHARACTER یا (PSYCHOLOGY) اسی ک کی آواز کے لیے کبھی K اور کبھی C جس میں ک کی آواز کا شائبہ بھی نظر نہیں آتا اور کبھی دونوں مل کر یعنی CK استعمال ہوتے ہیں مثلاً CAT - KITE AMOCK - "ز" کے لیے "S" اور "Z" دونوں کام آتے ہیں (REVISE) اور (ZEBRA) "ؤ" کے لیے "O" "OO" "U" "UO" "اَ" کے لیے "A" "AU" "AW" وغیرہ

"اِی" کے لیے E ، EE ، EA ، EI ، I ، IE ، اور Y وغیرہ

"ف" کے لیے F اور PH جیسے FAT اور PHYSICS میں ج کے لیے کبھی G اور کبھی J

ک، س کی مرکب آواز کے لیے X بھی ہے KS بھی

بعض حروف لکھنے میں آتے ہیں آواز نہیں دیتے۔ اردو میں بھی حروف شمسی وغیرہ میں یہ بات موجود ہے لیکن کسی قاعدے کے ساتھ۔ یہاں یہ چیز بڑی بے قاعدہ ہے، اور کسی ایک حرف تک محدود نہیں

مثالی رسم الخط میں یہ خوبی ہونی چاہیے کہ ہر آواز کے لیے ایک حرف موجود ہو اور ہر حرف کی ایک اور صرف ایک آواز ہو۔ تاکہ سیکھنے والا ابہام اور الجھن کا شکار نہ ہونے پائے۔ موجودہ اردو رسم الخط پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ ہم صوت یا قریب الصوت آوازوں کے لیے ایک سے زیادہ حروف ہیں مثلاً

ث۔ س، ص وغیرہ، تو یہ خامی تو رومن میں اس سے بھی بڑھ کر ہے۔ اس لیے اگر اس سہولت کے پیش نظر رومن کو اپنانا ہے تو یہ مشکل آسان نہیں ہوگی بلکہ اس میں اور پیچیدگی آ جائے گی۔
انگریزی تلفظ جس قدر بے قاعدہ اور بے ڈھب ہے اور اس کے ہجے جس قدر مشکل اور مبہم ہیں کسی سے مخفی نہیں مثلاً OFTEN TALK KNOWLEDGE PSYCHOLOGY HOUR

(۱) A کی آواز کبھی زیادہ کھلتی ہے کبھی کم لیکن اس کے لیے علامت کوئی نہیں

PAPA ، DADY ، LADY

(۲) 'E' کی آواز THE THERE THEN HERE

چاروں حروف میں اس کی مختلف اٹھان اور مختلف ادا ہے۔

(۳) 'I' کی آواز PIN TIDE MACHINE سب میں الگ الگ

(۴) 'O' کی آواز GOD GOLD GOOD TOOL SHOE

اور DOES سب میں جدا

(۵) U کی آواز BUT PUT TUBE سب میں الگ الگ ہے

اس بے قاعدہ تلفظ کی مثالیں کہاں تک پیش کی جائیں۔ بلاشبہ تلفظ ایک سماعی مسئلہ ہے۔ قیاسی نہیں۔ لیکن سماع میں بھی ایک ڈھب اور قرینہ تو ہونا چاہیے۔ اب خوامخواہ رومن کو اپنا کر اس کی جملہ بے قاعدگیوں کو دعوت دینا اور پھر ان کا علاج سوچنا ہے۔ انگریزی تلفظ اور املا کی دقتوں سے تو خود اہل زبان نالاں ہیں۔ یہاں تک کہ ایک انگریز نقاد نے کہا ہے کہ ہماری دو زبانیں ہیں۔ ایک تقریری انگریزی اور ایک تحریری۔ اگر بالفرض رومن کو اپنا لیا جائے تو حروف کی تعداد میں یقیناً اضافہ کرنا ہوگا۔ اس لیے کہ ان حروف سے کام نہیں چل سکے گا۔ آوازوں اور علامتوں کے قاعدے مقرر کرنے ہوں گے ت، خ، د، ڈ۔ ش۔ غ۔ جیسے حروف کا اضافہ تو لازم ہے۔ لیکن اس کے بعد بھی اردو کی تمام آوازیں اس سے ادا نہ ہو سکیں گی۔ الف مقصورہ اور ممدودہ کے اور سلے۔ نون اور نون غنہ میں امتیاز کرنے کے لیے علامات مقرر کرنا ہوں گی۔ اور اگر یہ علامات لکیروں اور نقطوں کی صورت میں ہوں گی تو اعراب سے چھٹکارا

تو حاصل نہ ہوا۔ بلکہ طلبہ اس چکر میں بدستور پھنسے رہے۔ اگر ہم رومن کے حروف تہجی میں C اور X کو
بے کار سمجھ کر خارج کر دیں اور چھ نئے مذکورہ بالا الفاظ بڑھا لیں اور ۱۷ حروف علت کے نشان
بڑھائیں، کہ ان کے بغیر نئی تہجی ہماری آوازوں کی ادائیگی سے قاصر رہے گی تو کل ۴۷ حروف بن جائیں گے
اب تحریری حروف الگ اور چھاپے کے حروف الگ۔ چھوٹے حروف جدا اور بڑے حروف جدا
پھر ان میں سے اکثر کی شکلیں ایک دوسرے سے مختلف۔ مثلاً

B ℬ b ℓ

G 𝒢 g g

ان سب کے سیکھنے میں سہولت کیسے ہو سکتی ہے۔ اردو کے ۵۰ حروف تہجی کو جن میں
قریب قریب آواز کی ادائیگی کی صلاحیت ہے، چھوڑ کر انگریزی کے اس سے دگنے بلکہ تگنے حروف
کی شکلیں سیکھیں اور سکھائیں۔ یہ کہاں کی دانش مندی ہے۔

اردو میں بلا شبہ ہر حرف کی عموماً دو یا تین ترکیبی صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ نسخ میں اس
تعداد کو بہت کم کر دیا گیا ہے ۔۔۔ لیکن یہ ترکیبی شکلیں اپنے اصل سے الگ نہیں ہوتیں، بلکہ
اصل حروف کی طرف فوراً اشارہ کرتی ہیں، اور جس طرح انسان اپنے چہرے سے پہچانا جاتا ہے
اسی طرح حروف اپنی ترکیبی صورتوں سے پہچان لیے جاتے ہیں، اور پڑھنے میں مطلقاً کوئی دقت
نہیں ہوتی۔ یہی ترکیبی صورتیں اردو کے خط کو جاذب نظر بناتی ہیں۔ انہی کی وجہ سے تیزی سے لکھا جا
سکتا ہے۔ اور انہی کے باعث عبارت تیزی سے پڑھی جاتی ہے۔ پھر موجودہ خط میں اعراب
حروف کا ضروری حصہ نہیں ہیں، بلکہ حسب ضرورت لگائے جا سکتے ہیں۔ اور بڑے بچوں کی کتابوں
میں انہیں بہت کم استعمال کیا جاتا ہے۔ اس لیے ٹائپ میں بھی اعراب شاذ و نادر ہی استعمال
ہوتے ہیں۔ حالاں کہ رومن کے اپنانے کی صورت میں ہمیں اعراب کو آواز کی تعیین کے لیے بعض حروف
میں شامل کرنا پڑے گا۔ اور اس علامت کو اس حرف سے جدا نہیں کیا جا سکے گا۔ (باقی آئندہ)

جرمنی کا نظامِ تعلیم

محمد شریف حافظ

۱۷ فروری [illegible] کو جناب ڈاکٹر اعجاز احمد صاحب قریشی ایم۔ اے (پنجاب) پی۔ ایچ۔ ڈی (جرمنی) نے سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور کے ہال میں جرمنی کے نظامِ تعلیم پر ایک مبسوط لیکچر دیا۔ یہ ایک ایسی قوم کا نظامِ تعلیم ہے جس کا ماضی جہاں علم و فن کے لحاظ سے جہالت و پستی کی ظلمت میں گم ہے۔ وہاں حال اور مستقبل علمی و فنی لحاظ سے درخشاں و تاباں۔ علم و فن کی پستی و بلندی کی درمیانی منازل طے کرانے والی چیز اُس قوم کا نظامِ تعلیم ہے جس کی برکت سے یہ قوم علمی و فنی لحاظ سے دنیا کی انتہائی ترقی یافتہ قوموں سے ایک ہے۔

صدیوں کی غلامی و پستی کے بعد آج جبکہ ہماری قوم بھی خوابِ غفلت سے بیدار ہونے کے لیے انگڑائیاں لے رہی ہے اور قومی اور ملکی تقاضوں اور ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے نظامِ تعلیم تشکیل دیا جا رہا ہے، مناسب سمجھا گیا کہ ڈاکٹر صاحب کے لیکچر کے تاثرات کو ترتیب دیکر قومی اور ملکی نا خداؤں کے سامنے ایسے حالات سے گزر کر ترقی کی بلندیوں تک پہنچنے والی قوم کے نظامِ تعلیم کی ایک جھلک پیش کر دی جائے۔ کیونکہ قومی اور ملکی مخصوص حالات کے تقاضوں کے علاوہ بعض ضرورتیں اور حالات قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتے ہیں جن کا مطالعہ فائدہ سے خالی نہیں۔

تاریخی پس منظر

مسیح علیہ السلام کی پیدائش سے چند سو سال پہلے یونان علم و حکمت کی روشنی کا مرکز تھا۔ اس زمانے میں یونانی فلسفیوں اور حکیموں نے فلسفہ و ادب اور طب پر ایسی کتابیں لکھیں جو آج تک عزت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں۔ یونان کے بعد یورپ کی رہنمائی اہلِ روما کے ہاتھ آئی، مگر وہ علم کی بجائے تلوار کے دھنی تھے۔ کچھ عرصہ بعد یہ شمع علم و دانش بجھ گئی اور یورپ ایک بار پھر تاریک

میں ڈوب گیا۔

قرونِ وسطیٰ میں جب یورپ پر جہالت و توہم پرستی کا گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ اسوقت اسلامی دنیا پر علم و حکمت اور تہذیب و شائستگی کا آفتاب عالم تاب نصف النہار پر تھا۔ آٹھویں صدی عیسوی میں مسلمان سپین پر بھی قابض ہو گئے تھے، اور اس کی سرپرستی میں قرطبہ اور غرناطہ کی یونیورسٹیاں دوایسے علم و ادب کے چشمے تھے جو تشنگانِ علم کی پیاس بجھانے کا سامان تھے۔ اس طرح روشنی کی کرنیں یورپ کے ظلمت کدوں میں بھی پہنچنے لگیں۔ صدیوں کے پیہم عمل سے ان کرنوں نے یورپ سے اندھیرے کو رخصت کیا اور صبحِ امید کا آغاز ہوتا نظر آیا۔

۱۴۵۳ء میں جب قسطنطنیہ ترکوں کے ہاتھوں ختم ہوا، تو اس شہر کے یہودی اور عیسائی اپنی کتابیں لے کر یورپ کے مختلف شہروں کو بھاگ نکلے۔ یونانی علم و ادب۔ لاطینی زبان اور روما کا علمی خزانہ عوام کے سامنے آیا۔ چھاپہ خانہ کی ایجاد سے یہ عمل اور تیز تر ہوا۔ ان علوم نے اُن کے سامنے روشنی اور تہذیب کی نئی راہیں کھول دیں۔ جدید علوم نے لوگوں کی روحوں کو گرمایا، اور ان علوم کی بدولت عوام کے دینی اعتقادات متزلزل ہونے لگے۔ بہت جلد ذہنی بیداری کی وجہ سے لوگوں کے دلوں میں تحقیق و تلاش کی لگن پیدا ہو گئی اور آگے چل کر یہ تحریک اصلاح کلیسا اور احیائے علوم کا باعث بن گئی۔

اصلاح کلیسا کی تحریک کی رہبری کا شرف جرمنی کو حاصل ہوا۔ جرمنی میں احیائے علوم کی تحریک نے عوام کو غور و فکر کی صلاحیت عطا کر دی اور چھاپہ خانہ کی ایجاد سے کتب نام اور سستی ہو گئیں۔ اس تحریک کے قوت بخشنے والا شخص "مارٹن لیوتھر" وٹن برگ یونیورسٹی میں فلسفہ و مذہب کا استاد تھا، جو اسلامی تعلیمات کی منصفانہ اور آزادانہ روح سے بہت زیادہ متاثر تھا۔ اس کی کوشش سے جرمنی میں بالخصوص اور پورے یورپ میں بالعموم علم و ادب اور تلاش و تفحص کی ایک لہر دوڑ گئی۔

اسی زمانے میں مذہبی میدان میں بھی تلاش و فکر کے دور کا آغاز ہوا تو بائیبل کا ترجمہ جرمن زبان میں کیا گیا۔ اس ذہنی بیداری نے بائبل کو جاننے کی خواہش پیدا کی تعلیمی ادارے گرجاؤں کے زیر اثر قائم کیے گئے اور نئے خیالات و معتقدات نے مشنری تحریک کو فروغ دیا۔ اولاً یکسانیت

مفقود تھی لیکن ۱۸۷۱ء میں سیاسی وحدت کے ساتھ ساتھ تعلیمی نظام میں بھی یکسانیت پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔

جب ہٹلر برسراقتدار آیا تو اس نے قومی ترقی کے لیے علمائے قوم کو ملکی بہبود کے لیے صلاح ومشورہ کی دعوت دی۔ آخر اس نے استادوں کے ذمہ ہی یہ فرض لگایا اور ان کی تنخواہیں ججوں کے برابر کر دیں کیوں کہ وہ سمجھتا تھا کہ قومی سربلندی وترقی آزادانہ اور عمدہ تعلیم ہی کی رہین منت ہے اور ایسی اچھی تعلیم سوائے آزاد ماحول، تربیت اور اعلیٰ فکر ونظر کے حامل اساتذہ ہی دے سکتے ہیں چنانچہ تمام تعلیمی ادارے حکومت کی تحویل میں لے لیے گئے۔ اور وحدت ویکسانیت کے ساتھ علمی منصوبہ کو بروئے عمل لایا گیا۔

موجودہ تعلیمی ڈھانچہ: ۔ تعلیمی میدان میں تحقیق وتجربہ نے جدید سائنسی تعلیمات کو جنم دیا طریقۂ تعلیم کو قومی، ملکی اور معاشرتی ضرورتوں سے ہم آہنگ کیا گیا۔ اور نفسیات واصول تعلیم طریق تدریس کا بنیادی ستون بنے۔

درجات تعلیم: ۔ ۴ سال کی عمر سے بچہ کی تعلیم کی ابتدا ہوتی ہے۔ پہلے دو سال کنڈرگارٹن اور ۶ سال کی عمر میں ۵ سال کے لیے عوامی سکول میں تعلیم دی جاتی ہے۔ یہاں تک تعلیم کا حصول مفت اور لازمی ہے۔

ازاں بعد مزید ۳ سال عام تعلیم دی جاتی ہے۔ اس دوران میں طلبہ اس قابل ہو جاتے ہیں، کہ آئندہ اپنی طبعی موزونیت کے مطابق مضامین کا انتخاب کر سکیں۔ نیز وہ یہ فیصلہ کرنے کے قابل بھی ہو جاتے ہیں کہ آیا وہ کسی فنی شعبہ میں جانے کے اہل ہیں یا آرٹس کے۔ لہٰذا اسی مناسبت سے مضامین کا انتخاب عمل میں آتا ہے۔ مزید پانچ سال تک ثانوی مدارس میں زیر تعلیم رہتے ہیں۔ اس دوران میں طلبہ اپنے تعلیمی اخراجات کا بار خود اٹھاتے ہیں۔ طلبہ ہفتہ میں دو دن کتابی تعلیم حاصل کرتے ہیں اور چار دن کارخانوں اور دکانوں میں عملی ٹریننگ حاصل کرتے ہیں۔ اس کے عوض انھیں معاوضہ بھی ملتا ہے تقریباً ۷۰ فی صد طلبہ عملی ٹریننگ حاصل کرتے ہیں اور ۳۰ فی صد ثانوی تعلیم کی طرف جاتے ہیں۔ یہ تقسیم ۱۱ سال

کے بعد ہی سے عمل میں آتی ہے۔
جب طلبہ کتاب زندگی کے ۱۹ ورق الٹ چکتے ہیں تو اس وقت وہ انٹرمیڈیٹ کا امتحان ۱۳ مضامین میں پاس کر چکے ہوتے ہیں جس میں ۶۰ فیصد تحریری اور ۴۰ فیصد تقریری دونوں طرح کا امتحان شامل ہے۔ یہاں سے مزید SPECIALIZATION یعنی خصوصی تعلیم کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جنہیں تعلیمات، عمرانیات، تاریخ و فلسفہ و جغرافیہ، نفسیات، اقتصادیات وغیرہ ایسے مضامین لینا ہوتے ہیں وہ یونی ورسٹی کی طرف جاتے ہیں اور انہیں ۳½ سے ۴½ سال تک مطالعہ و تحقیق میں سرگرم عمل رہنا پڑتا ہے۔ یہاں پر امتحان کا تناسب تقریری و تحریری دونوں ۵۰ فیصد ہوتا ہے جس کے لیے تعلیم کے خاتمہ پر ایک ڈپلوما ملتا ہے۔ دوسری راہ ۱۹ سال کی عمر کے بعد انجینیرنگ اور ٹیکنیکل تعلیم کی ہے۔ اس کے لیے الگ فنی تعلیم کی یونی ورسٹیاں ہیں۔ اس تعلیم کے حاصل کرنے والے ٹیکنیکل یونیورسٹیوں ہی میں جاتے ہیں۔
یونیورسٹی ڈپلوما کے بعد ڈاکٹریٹ کے لیے مزید ۱½ سال کا عرصہ درکار ہے۔ یہاں امتحان کے نمبروں کا تناسب پھر سے ۶۰ فی صد تحریری اور ۴۰ فی صد تقریری ہو جاتا ہے
اس کے علاوہ یونیورسٹی میں معلمی کے خواہاں حضرات کو ۴ سال مزید آزادانہ تحقیق کا کام کرنا ہوتا ہے۔

درجات کی خصوصیات تعلیم

مڈل سکول۔ — مڈل سکولوں میں جرمن زبان، ریاضی، معاشرتی علوم، میوزک اور مذہب کی تعلیم دی جاتی ہے۔ چوں کہ طلبا کی تعداد زیادہ ہوتی ہے، اس لیے ڈبل شفٹ کا نظام رائج ہے
سیکنڈری تعلیم کے لیے دو قسم کے اسکول ہیں (۱) آرٹس (۲) سائنس۔
— اولاً قسم کے اداروں میں پانچ قسم کی زبانیں سیکھنی ضروری ہیں۔ جرمنی، لاطینی اور یونانی لازمی ہیں فرانسیسی، انگریزی، اطالوی اور ہسپانوی میں سے کوئی دو زبانیں جاننا ضروری ہے۔
دوئم قسم کے اداروں میں جرمن زبان کے علاوہ صرف دو زبانیں جاننا کافی سمجھا جاتا ہے۔ اب انگریزی جاننے کا رواج عام ہو رہا ہے۔ سیکنڈری ادارے عام طور پر قصبات میں قائم ہیں۔ یہ امتحان پاس کر لینے کے بعد طلبہ مختلف پیشوں میں جا سکتے ہیں۔ جیسے معلمی وغیرہ۔ یہیں سے وہ اپنے پیشے سے متعلق

مضمون کا انتخاب کرتے ہیں (یہ امتحان ہمارے ہاں کے ایف اے کے معیار کے برابر ہے)

یونیورسٹی تعلیم :- طالب علم کو ایک مضمون خصوصی مطالعہ کے لیے منتخب کرنا ہوتا ہے۔ اور باقی تین متعلقہ مضامین لینا پڑتے ہیں۔ ان مضامین میں لیکچرز اور سیمینار منعقد ہوتے ہیں۔ لیکن خاص طور پر یہ ذکر کرنا ضروری ہے کہ لیکچرز کے لیے حاضری نہیں لی جاتی۔ شائقین کا ہجوم اس قدر زیادہ ہوتا ہے کہ غیر حاضری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ البتہ سیمینار میں شمولیت لازمی ہے۔ لیکچرز کی کامیابی اور افادیت اس لیے بھی بڑھ جاتی ہے کہ یونیورسٹی کے اساتذہ ایک تو اعلیٰ تعلیمیافتہ اور اپنے مضمون کے ماہر ہوتے ہیں۔ دوسرے یونیورسٹی کے اساتذہ کو تنخواہ بھی لیکچرز میں شامل ہونے والے طلبا کی فیس سے ہی ملتی ہے۔ اس لیے اساتذہ اپنے لیکچرز مفید، مؤثر اور دلچسپ بنانے کے لیے ہر ممکن کوشش کرتے ہیں۔ معیار کی بلندی بہت حد تک اسی انتظام کی وجہ سے ہے۔ یونیورسٹی ڈپلوما کے لیے تحریری امتحان میں ایک مقالہ بھی شامل ہے۔ جو ہر طالب علم کو لکھنا پڑتا ہے۔ یہ امتحان وزارت ثقافت کی طرف سے لیا جاتا ہے۔ کیوں کہ یونیورسٹی امتحانی ادارہ متصور نہیں ہوتی۔ علاوہ ازیں کالج سسٹم نہیں ہے۔ بلکہ یونیورسٹی کلاسز ہی ہوا کرتی ہیں۔ کل جرمنی میں سولہ یونیورسٹیاں ہیں، جن میں سے فرائی برگ (FREI BURG) وورز برگ (WURZ BURG) گوٹنگن (GOHIN GAN) ماینز (MAIN J) میونخ (MUNCHEN) ٹیوبنگن (TUEBINGEN) ہائیڈل برگ (HEIDELBURG) بون (BOWN) کولن (KOLN) ہمبرگ (HOMBURG) کیل (KIEL) برلن (BERLIN) اور ساربروکن (SARBRUCHEN) وغیرہ خاص طور پر مشہور ہیں۔ اور تقریباً اتنی ہی تعداد میں ٹیکنیکل یونیورسٹیاں علیحدہ ہیں۔ علاوہ ازیں چند مزید ادارے مختلف شعبوں میں تحقیقی کام کے لیے قائم ہیں۔ مثلاً زراعت، کان کنی، اقتصادیات

ڈپلوما حاصل کرنے کے بعد طلبہ مختلف شعبوں میں جاتے ہیں۔ مثلاً معلمی، قانون، طب، سائنس وغیرہ۔ سائنس کے طلبا، صنعت وحرفت کے مختلف اداروں میں ملازم ہو جاتے ہیں۔ ایسے طلبا کی تعداد تقریباً نصف کے قریب یا کچھ زیادہ ہے۔ یونیورسٹی تبدیل کرنا ہمارے ہاں کی طرح جوئے شیر لانے کے مترادف نہیں ہے۔ بلکہ بڑی آسانی سے تبدیلی کی جا سکتی ہے۔ مقصد لیکچرز پورے کرنا ہوتے ہیں

طلبہ جہاں چاہیں اپنے تعلیمی اوقات مکمل کر سکتے ہیں۔

لائبریریاں:۔ لائبریری کی اہمیت اور افادیت مسلّم ہے۔ جرمنی میں اس اہمیت اور افادیت کے پیش نظر لائبریریوں کی بڑی سہولتیں مہیا کی جاتی ہیں۔ ملک کی مختلف لائبریریوں سے استفادہ کے لیے کتب منگوائی جا سکتی ہیں اور غیر ملکی لائبریریوں سے بھی کتب حاصل کی جا سکتی ہیں۔ عملہ نہایت مستعد ہوتا ہے۔ کتب کی تلاش و فراہمی کا کام خوب ہوتا ہے۔ یونیورسٹی کے ہر شعبہ کی لائبریری وسیع اور مکمل ہوتی ہے۔

سیر و سیاحت کا پروگرام:۔ سکولوں اور یونیورسٹیوں میں سیر و سیاحت کا باقاعدہ پروگرام بنتا ہے۔ سکولوں میں طلبا ملکی جغرافیہ سے کماحقہٗ اور عملی طور پر واقف ہو جاتے ہیں۔ ان طلبا کی سیر و سیاحت کے لیے "یوتھ ہوسٹل" (YOUTH HOSTEL) ہر چھوٹے بڑے قصبے میں قائم ہیں۔ جہاں طلبا سستا کھانا اور بستر با آسانی حاصل کر سکتے ہیں۔ اس سے طلبا میں بلند حوصلگی، جرات اور ہمت پیدا ہوتی ہے۔ اور اپنے ملک سے واقفیت حاصل کر کے اس کی ہر ممکن ترقی و بہبودی کی تڑپ ان کے دل میں پیدا ہو جاتی ہے۔

اساتذہ کے لیے کورس:۔ ہر یونیورسٹی میں تعلیمات اور تعلیمی نفسیات کا مضمون ہوتا ہے۔ یونیورسٹی میں ابتداہی سے اس کی تعلیم ہوتی ہے۔ جو طلبا معلمی کا پیشہ اختیار کرنا چاہتے ہیں وہ ان مضامین کا انتخاب کر لیتے ہیں ان مضامین کے علاوہ دو اختیاری مضامین بھی لینے ہوتے ہیں۔

معلم یونیورسٹی کے لیے ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے بعد مزید ۲ سال آزادانہ تحقیقاتی کام کر کے یونیورسٹی کے ارباب بست و کشاد کو معلمی کی اجازت کے لیے درخواست دینا ہوتی ہے۔ جس کے لیے یونیورسٹی کی طرف سے کسی خاص عنوان پر اپنی تحقیقی و علمی قابلیت کا عملی ثبوت دینے کے لیے تاریخ مقرر ہوتی ہے۔ جس میں امیدوار معلم کو بڑے بڑے فضلا اور محققین کے سامنے تقریر کرنا ہوتی ہے۔ اگر جائزہ لینے والے حضرات معلم کو معیار کے مطابق تصور کریں تو پھر کہیں جا کر یونیورسٹی میں معلمی کی اجازت ملتی ہے۔

عوامی اور مڈل سکولوں کے لیے طلبا (ADITUR) کے بعد تربیتی اداروں میں معلمی کی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ ان معلمین کی تنخواہ کسی طرح بھی ۵۰۰ روپیے ماہوار یعنی ایک اوسط درجے کے انجینئر یا ڈاکٹر سے کم نہیں ہوتی۔ تاکہ معلم اپنا سماجی مرتبہ برقرار رکھنے کے ساتھ ساتھ معاشی الجھنوں سے آزاد

پراجیکٹ

ناصر علی

چھوٹے لڑکے اور لڑکیوں کو سہل الحصول طریقے سے تعلیم دینے کے لیئے پراجیکٹ تیار کیئے جاتے ہیں جن کی مدد سے استاد یا استانیاں بچوں میں علمی، فنی، تمدنی اور معاشرتی رجحانات کی ترویج کرتے ہیں۔

یہ طریقہ اگرچہ بہت پرانا ہے لیکن موجودہ زمانہ کی ذہنی اور دماغی کاوشوں نے اس کے نوک پلک نکھار کے بالکل جدید اور ضروریات زندگی کے مطابق بنالیا ہے۔ آپ پوچھیں گے کہ کیا اور کس طرح؟ تو اس سوال کا جواب یہ ہے کہ زمانہ ماسبق سے لے کر اب تک دنیا کے تمام ممالک میں گڑیاں کھیلنے کا رواج چلا آیا ہے خصوصاً برصغیر پاک و ہند میں اس کا رواج عام و خاص تمام گھرانوں میں ہے۔ پہلے مائیں روئی کپڑے اور دھاگے سے گڑیاں بناتی تھیں۔ صنعت و حرفت نے ترقی کی تو یہ گڑیاں ربڑ، دھات اور پلاسٹک کی بننے لگیں۔ لیکن اس کھیل کے مقصد میں کوئی فرق نہیں آیا۔ گویا مائیں اپنی بچیوں کے لئے ایک گھریلو پراجیکٹ تیار کرتی تھیں اور اس کھیل کے ذریعے وہ اپنی لڑکیوں کو خانہ داری، شادی و غمی کی رسوم اور معاشرت کی اصلاح کی تعلیم دیتی تھیں۔

موجودہ زمانہ خانہ داری، رسم و رواج اور معاشرت کی اصلاح تک محدود نہیں۔ اب ہمارے بچوں کو بہت کچھ سیکھنا پڑتا ہے جو ان کی ضروریات زندگی کے لیے از بس ضروری ہے۔ اس لیے اب ہمارے پراجیکٹ بھی اس زمانے کے مطابق ہونے لگے ہیں۔ آج کل انہیں اپنی ننھی نسل کو علم کے ساتھ ساتھ فنون، صنعت، معاشرت، صحت، دستکاری، اقتصادی امور اور رسل و رسائل کے طریقے وغیرہ تھوڑا تھوڑا سب کچھ سکھانا پڑتا ہے۔ بلکہ آگے چل کر انہیں کوئی چیز نئی معلوم نہ ہو، اور وہ بڑے ہو کر جو لائن اختیار کریں کم از کم

کم از کم اس کی مبادیات سے واقف ہوں۔ اوپر کی سطور سے میرا مطلب یہ ہے کہ پراجیکٹ طریقہ تعلیم کا ایک اچھا ذریعہ ہے۔ اور متمدن ممالک کے ماہرین تعلیم کا اس امر پر اتفاق ہے کہ بچوں کی تدریس سہل اور دلچسپ طریقوں سے کی جائے تاکہ ان کے ننھے منے دماغ اسے ہلکے پھلکے انداز میں قبول کریں۔ اور ایک ناگوار بوجھ سمجھ کر تحصیل علم سے گریزاں نہیں۔ پروجیکٹ کھیل کھیل میں بہت کچھ سکھاتے ہیں جو کتابیں نہیں سکھاتیں۔ اور یوں وہ ترقی کے وسیع میدان میں بڑھتے چلے جائیں۔

سنٹرل ٹریننگ کالج کی نمائش میں جونیر ماڈل سکول کی استانیوں نے اپنے اپنے پروجیکٹ پیش کیے ان میں سے ہر ایک نے ایک ایک کارآمد ماڈل کی صورت میں دھرایا تھا۔ یہ ماڈل ان کی دماغی کاوش، محنت، اور ہاتھ سے کام لینے کی صنعت کا ایک بولتا ہوا نمونہ تھے۔ انھوں نے انھیں جس افادی اور معلوماتی حیثیت سے ترتیب دیا تھا۔ وہ یقیناً بے حد اعلیٰ و ارفع تھی۔ کیوں کہ ان سے بچوں کی فنی، صنعتی اور تمدنی واقفیت میں قابل قدر اضافہ ہوتا ہے۔

غار سے مکان

مسز شاہ ملک سے جو سیکنڈ اے کی استانی ہیں۔ اپنے ماڈل میں غار سے مکان بنانے بتائے ہیں۔ انسان بہت پرانے زمانے سے خیموں میں رہتا چلا آیا ہے۔ یہ خیمے کھالوں یا پتوں کے ہوتے تھے۔ کھالوں اور پتوں کے بعد کپڑے کے خیمے بننے لگے۔ ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ چناں چہ جب انسان کو سر چھپانے کے لیے ایک ٹھکانا بنانے کی ضرورت لاحق ہوئی تو اس نے جھونپڑی کی طرح ڈالی جس کا رواج پرانے زمانے سے لے کر آج تک چلا آتا ہے کسی زمانے میں انسان غاروں اور درختوں پر رہ کر زندگی گذارتے تھے۔ تاکہ وہ جنگلی درندوں سے محفوظ رہیں۔ یہ مکان اس زمانے کی یاد دلاتا ہے جب ذرا انسانی ذہن نے ترقی کی۔ وہ پتھروں کے مکان بنانے لگا۔ یہ مکان بیچھے سے چوڑے اور آگے سے گاؤدم ہوتے تھے۔ آج کل بھی دنیا کے بعض حصوں میں لوگ گھاس۔ بید اور پتوں سے بنے ہوئے مکانوں میں رہتے ہیں۔ چین میں کئی علاقے ایسے ہیں جہاں ہمیشہ پانی جمع رہتا ہے۔ ان علاقوں میں کشتیوں کے اندر مکان بنائے جاتے ہیں۔ جن کی چھتیں گھاس پھوس کی ہوتی ہیں۔ ان مکانوں میں

رہنے والے کشتیوں کے ذریعے مکانوں سے اندر جاتے اور آتے ہیں۔ یہ ماڈل بڑی کاوش سے ترتیب دیا گیا ہے۔ اسے دیکھ کر دیکھنے والوں کے ذہن اس قدیم عہد کی جانب لوٹ جاتے ہیں جب انسان اینٹ، پتھر اور چونے گارے سے مکان بنانا نہیں جانتا تھا، حقیقتاً یہ ماڈل بچوں کی معلومات بڑھانے کے لیے نہایت کارآمد ثابت ہو سکتا ہے کیوں کہ بچے ایسی عجیب وغریب چیزیں دیکھنے اور بنانے میں دل چسپی لیتے ہیں۔ افادی طور پر اس ماڈل سے بچوں کی جغرافیائی اور تاریخی معلومات بڑھتی ہے۔ یہ ماڈل چھے حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا (۱) غار (۲) جنگلی جانوروں سے بچاؤ اور درخت پر رہائش (۳) درخت کے تنے کے اردگرد پتوں اور کھالوں کے مکان (۴) گھاس پھونس سے جھونپڑی (۵) کچے مکان (۶) پکے مکان۔

ننھے کا گھر

یہ ماڈل، کے، جی نونہالے کی استانی مسز قاسم نے مرتب کیا تھا۔ انھوں نے ننھے کے ننھے سے گھر میں وہ تمام حصے مختلف ماڈلوں سے دکھائے گئے ہیں، جو ایک خاندان کی ضروریات زندگی کے لیے بے حد ضروری ہیں۔ یہ عمارت جو گتہ، کاغذ، گوند اور کانوں وغیرہ کی مدد سے تیار کی گئی ہے۔ فن تعمیر کی تمام خوبیاں اپنے اندر رکھتی ہے۔ کروں کا رخ اور نشست، صحن، باغیچہ اور دوسرے ضروری حصوں کے لیے زمین کی تقسیم بڑے سلیقہ سے کی گئی ہے۔ اس پینٹنگ اور روغن نے اس عمارت کو اور بھی چمکا دیا ہے۔ سچ پوچھیے تو اس ماڈل کے لیے جو عنوان تجویز کیا ہے اس میں بھی بڑی جدت دکھائی گئی ہے۔ ننھے کے گھر سے ذہن ایک خوب صورت اور بھر پور گھر کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ جہاں خوشی ہی خوشی ہے افسردگی کا نام ونشان نہیں۔ ماں بیٹھی ہے۔ ننھا میز کرسی لگائے سبق یاد کر رہا ہے۔ کھانے پینے کے برتن سلیقے سے رکھے ہیں۔ پانی کا گھڑا رکھا ہے۔ ایک بچہ جھولا جھول رہا ہے۔ ماں ننھے کو سبق یاد کرتے دیکھ کر نہال ہو رہی ہے۔ غرض انھوں نے سارا ماحول پیدا کر دیا ہے۔

ہیڈ رسول

فرسٹ سٹینڈرڈ کی استانی محترمہ مس فوریٹ نے ہیڈ رسول کا ماڈل دکھا کر نئی انجینئرنگ اور

تعمیرات کی اہمیت کا اندازہ کرایا۔ پاکستانی انجینیروں نے دریائے جہلم کے بائیں کنارے سے رسول کے مقام تک
نہر نکالی ہے۔ اس نہر کو پل باندھ کر اوپر سے نیچے کر دیا گیا ہے۔ اس نہر کے پانی سے بجلی پیدا کی جاتی ہے۔ ہر ایک
مقام پر ایک جالی لگی ہوئی ہے جو پانی کو کوڑا کرکٹ سے صاف کر کے پائپ کے ذریعے نیچے گراتی ہے۔ پانی
کے گرنے سے پن بجلی پیدا ہو جاتی ہے جو سات ضلعوں کے مختلف کاموں میں لائی جاتی ہے۔ اس سے صنعت و حرفت
کے کارخانے اور ٹیوب ویل وغیرہ چلتے ہیں۔ شہروں، دیہاتوں کو روشن کیا جاتا ہے۔ اور نگر وال کو بقعۂ نور بنایا جاتا
ہے۔ بس ڈرینٹ نے مشینوں کے ماڈل، خوبصورت پل، پائپ اور پاور ہاؤس غرضیکہ ہیڈ رسول کی وہ تمام اہم چیزیں دکھایا
جنھیں انجینیرنگ کا کمال کہنا چاہیے۔ گتے اور کاغذ کے ماڈل بنا کر ٹوم کرافٹ کا حق ادا کر دیا گیا ہے جن لوگوں
کو یہ ہیڈ دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا ان کو اس ماڈل سے بہت قیمتی معلومات حاصل ہو سکتی ہیں۔

افریقہ کے بونے

اس سبق کو کے۔ جی۔ ایڈ کی استانی مسز میاں یار احمد نے پیش کیا۔ اس میں انھوں نے افریقہ کے ننھے ننھے
قد والے لوگ دکھائے ہیں جو ہماری طرح بولتے، کھاتے پیتے اور چلتے پھرتے ہیں۔ یہ لوگ جھونپڑیوں میں
رہتے ہیں۔ ان کی جھونپڑیاں کیسی ہوتی ہیں، ان کو مختلف ماڈلوں کے ذریعے دکھایا گیا ہے۔ ان کا پیشہ
شکار ہے۔ ماڈل میں اس پہلو کو بھی روشن کیا گیا ہے کہ یہ بونے مل کر شکار کھیل رہے ہیں۔ ان کا دل پسند
مشغلہ ناچنا ہے۔ چناں چہ ایک سٹال کے پیس میں انھیں ناچتا دکھایا گیا ہے۔ غرض اس خیالی ماڈل میں وہ سب کچھ
ظاہر کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو ایک جنگلی قوم کی خصوصیات ہو سکتی ہیں۔ ایسے لوگوں کے رہن سہن کا طریقہ
ان کا تمدن و معاشرت وغیرہ بچوں کے نزدیک اور بڑے بوڑھے بھی دنیا کے دور دراز گوشوں اور جنگلوں میں رہنے والی
قوموں کے عجیب و غریب حالات معلوم کرنے میں دلچسپی لیتے ہیں۔ اس لیے مسز میاں احمد نے بچوں اور
دوسرے ان جانوں کو اپنے ماڈل کے ذریعے ایک معلوماتی سبق پڑھا دیا ہے۔ ویسے فی الحقیقت بونا بھی
دیو جیسے کی طرح ایک خیالی اور فرضی چیز ہے۔ انھوں نے بونوں کی تشکیل جس انداز سے کی ہے انھیں
دیکھ کر یقین ہو جاتا ہے کہ واقعی بونوں کی صورتیں ایسی ہی ہوتی ہوں گی۔ اس پر ان کے لباس اور چال ڈھال
میں بھی مزاحیہ رنگ بھر دیا ہے۔

باغِ جناح

یہ ماڈل تھرڈ بی کی استانی مسز کرمانی نے پیش کیا ہے۔ باغ جناح لاہور کا وہ شاداب خطّہ ہے، جہاں بہار کی دیوی اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ یہاں کا چپہ چپہ خوش رنگ پھولوں، سبزی وطراوت اور بیل بوٹوں سے بھرپور ہے۔ کہیں بلند وبالا درخت جھوم رہے ہیں اور کہیں پھول دار پیڑ لدے پھندے کھڑے ہیں۔ اس باغ کے ایک خوب صورت حصے میں پاکستانی مالیوں نے اپنی ہنرمندی دکھائی ہے جہاں پھولوں کے تختے ہیں، کیاریاں اور روشیں ہیں۔ حوض اور فوّارے ہیں۔ مختصر یہ کہ یہ چمن زار قدرت کی حسین ترین رعنائیوں سے معمور ہے۔ آپ اس باغ کی کسی روش پر نکل جائیے۔ روح میں تازگی، آنکھوں میں طراوت اور دل ودماغ میں سرور پائیں گے۔ اگرچہ یہ ایک تفریح گاہ ہے، جہاں لوگ فرصت کے چند لمحے گزارنے چلے جاتے ہیں۔ لیکن وہ یہ نہیں جانتے کہ حدِ نظر تک پھیلی ہوئی دوب جسے وہ روندرہے ہیں۔ حوض وآبشار، سرسبز و پھولدار درخت اور ان کے پتّے معرفت خداوندی کے مظہر ہیں۔

اس ماڈل میں اصل کی نقل کو بڑی ذہانت وقابلیت سے واضح کیا گیا ہے۔ ایک باغ یا چمن کا منظر دکھانے کے لیے رنگوں کے استعمال میں بڑی احتیاط برتنی پڑتی ہے خصوصًا پھولوں کے رنگوں میں۔ انھوں نے اپنے کاغذی پھولوں اور کلیوں کے لیے جو رنگ منتخب کیے ان کی ملاوٹ میں وہی حسن پیدا کردیا جیسا قدرتی پھولوں میں ہوتا ہے۔ چمن کے تختے، روشیں، کیاریاں، بیلیں اور پودے بنانے میں بھی انھوں نے بڑی مہارت کا ثبوت دیا ہے۔ ہری بھری گھاس کا سبزہ زار بالکل مخملیں فرش معلوم ہوتا ہے۔ جابجا درخت اس خوبی سے کھڑے دکھائے ہیں کہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ اب ہوا کا جھونکا آیا اور پتّے تالیاں بجانے لگے اور ٹہنیاں جھومنے لگیں اگرچہ یہ ایک تفریحی پراجیکٹ ہے۔ پھر بھی اس کے بنانے میں افادیت مدِّنظر رکھی گئی ہے۔ بچوں میں پھولوں اور پودوں سے محبت۔ پھل اور پھولدار درخت اُگانے کا ذوق۔ پھولوں کے تختے اور کیاریاں۔ فوارے اور روشیں بنانے کے طریقے اور باغ لگانے کا شوق پیدا کیا گیا ہے ۔

افریقہ میں اعلیٰ تعلیم

شاہد اشرف

افریقہ کا براعظم پرانی دنیا کا ایک حصہ ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ موجودہ صدی کے آغاز تک دنیا کو اس وسیع براعظم کے اس حصہ کے متعلق کچھ معلوم نہ تھا جو صحرائے اعظم کے جنوب میں واقع ہے۔ بحیرہ روم اور بحیرۂ قلزم نے افریقہ کو یورپ اور ایشیا کے براعظموں سے الگ کر رکھا ہے۔ یہ دونوں سمندر پرانے زمانے سے تجارتی سرگرمی کے مرکز چلے آئے ہیں اور مشرق اور مغرب کے درمیان آبی شاہراہوں کا کام دیتے رہے ہیں۔ افریقہ کا شمالی کنارہ پرانی دنیا کی اس تجارتی اور سیاسی شاہ رگ کے ساتھ ساتھ پھیلتا چلا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پرانے زمانوں میں جن قوموں نے سیاسی اور تجارتی غلبہ حاصل کرنا چاہا انھوں نے شمالی افریقہ میں قدم جمانے کی بھی کوشش کی۔ اس طرح تاریک براعظم کا یہ حصہ پرانے زمانوں سے تاریخ کے پورے اجالے میں رہا ہے۔ فونیقیوں نے شمالی افریقہ میں نوآبادیاں قائم کیں۔ یونانیوں کے عروج کا زمانہ آیا تو انھوں نے فونیقی تسلط ختم کر کے اپنے قدم جما لیے۔ یونانی دور ختم ہوا تو شمالی افریقہ وسیع رومی سلطنت کا ایک حصہ بن گیا غرض صدیوں تک شمالی افریقہ کا علاقہ جنوبی یورپ کے زیر قدم رہا اور اس کی ایک توسیع بنا رہا۔

اسلام کی آمد نے اس صورت حال کا خاتمہ کر دیا۔ اسلام کی گود میں آنے کے بعد اہل افریقہ، یکایک انسانیت کے اس بلند ترین مقام پر جا پہنچے جس کی نوید اسلام نے زیر دستوں کو دی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شمالی افریقہ کے بربری قبائل جو لمبی صدیوں سے جنوبی یورپ کے پاؤں تلے روندے چلے آ رہے تھے دفعتہً آزاد ہو گئے اور غلامی کی جگہ آقائی کے خواب دیکھنے لگے۔ اس خواب کو پورا ہوتے زیادہ دیر نہ لگی۔ اسلام کی آغوش میں آنے کے چند دہائیوں بعد بربری قبائل موسیٰ بن نصیر اور طارق بن زیاد کی سرکردگی میں بحیرہ روم کو پار کر کے جنوبی یورپ پر چڑھ دوڑے اور ہسپانیہ پرتگال اور سسلی پر قابض ہو گئے آخر زمانے نے یہ ورق بھی الٹا۔ اسلامی تعلیمات سے رفتہ رفتہ بے گانہ ہو جانے کے سبب جنوبی یورپ

مسلمانوں کی گرفت ڈھیلی پڑنے لگی۔ بالآخر صدیوں کی حکمرانی کے بعد انہیں جنوبی یورپ سے دلیس نکالا ملا۔ اور وہ سمٹ سمٹا کر دوبارہ شمالی افریقہ میں آن بسے۔ مگر یورپ کے جسم میں ایک نئی زندگی کا خون اُبل رہا تھا، اور اس کا جوش اسے تسخیر عالم پر ابھار رہا تھا۔ ادھر عثمانی ترکوں کی لمبی چوڑی سلطنت دم توڑ رہی تھی چنانچہ موجودہ صدی کے آغاز میں شمالی افریقہ دوبارہ جنوبی یورپ کی ایڑی تلے آگیا، اور ہسپانیہ فرانس اور اطالیہ نے اس کے حصے بخرے کر لیے۔ یہ صورت حال اب تک باقی ہے۔ شمالی افریقہ کے بعض حصے آزادی حاصل کر چکے ہیں اور بعض آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ مگر فرانسیسی وزیراعظم نے لگی لپٹی رکھے بغیر صاف لفظوں میں کہہ دیا ہے کہ فرانس الجیریا کو کسی قیمت پر نہیں چھوڑے گا کیونکہ بحیرہ روم کے دونوں کناروں پر قبضہ قائم رکھے بغیر فرانس کا دفاع مکمل نہیں ہوتا۔

مصر اور رابی سینیا کے قدیم ملک بھی براعظم افریقہ ہی کا حصہ ہیں۔ ان دونوں ملکوں نے انسانی تہذیب کی تاریخ میں اہم کردار ادا کیا ہے مگر یہ ملک بھی براعظم کے شمالی حصہ میں ہی واقع ہیں افریقہ کا تاریک حصہ صحرائے اعظم کے جنوب سے شروع ہوتا ہے۔ اس سے آگے براعظم کے ہزاروں میل لمبے چوڑے علاقے واقع ہیں۔ بیسویں صدی کے آغاز تک دنیا کو ان کے متعلق بہت کم معلومات حاصل تھیں۔ اکّے دکّے سیاحوں نے ان علاقوں کے متعلق جو معلومات بہم پہنچائی تھیں ان کی نوعیت بھوتوں اور پریوں کے قصوں سے زیادہ نہ تھی۔

افریقہ کا تاریک ترین حصّہ

مغربی غلبے سے پہلے سمندروں پر عربوں کا قبضہ تھا۔ عرب جہازران بحیرہ روم، بحیرہ قلزم اور بحر ہند کے چپّے چپّے سے واقف تھے اور ان کے جہاز ان سمندروں کو رات دن کھنگالتے پھرتے تھے۔ مگر طبعی خدّوخال نے افریقہ کے گرد ایسی ناقابل عبور حفاظتی دیوار کھڑی کر رکھی تھی جس کو عبور کرنا انسانی بس سے باہر نظر آتا تھا شمال میں صحرائے اعظم سے آگے ناقابل عبور پہاڑ، آبشاریں اور جنگلات راستہ روکے ہوئے تھے۔ یہی کیفیت مشرقی اور مغربی ساحلوں کی تھی۔ یہ ان جغرافیائی حالات کا ہی نتیجہ تھا کہ وہ قوم بھی تاریک براعظم کے چہرے سے پردہ نہ اٹھا سکی جس کے جیالے سپوتوں نے بحر ظلمات میں گھوڑے

ڈال دیے تھے۔ مغربی قومیں بھی تسخیر عالم کے حوصلے نکالنے کے لیے نکلیں تو مغرب میں نئی دنیا اور مشرق میں جزائر شرق الہند تک جا پہنچیں۔ مگر افریقہ کے تاریک حصے نے انھیں بھی اپنے اندر قدم نہ رکھنے دیا تاہم اہل مغرب نے جنوبی افریقہ میں قدم جما لیے اور رفتہ رفتہ یہاں نوآبادیاں قائم کرلیں۔ مگر جنوبی افریقہ سے لے کر صحرائے اعظم تک جو وسیع و عریض علاقہ حائل ہے وہ بدستور پردے میں چھپا رہا اور یہ پردہ موجودہ صدی کے آغاز تک نہ اٹھ سکا۔

جب یورپ نے مغرب میں امریکہ تک اور مشرق میں آسٹریلیا تک کے تمام علاقوں میں پاؤں پھیلائے تو آخر اس کی نگاہ افریقہ کی طرف اٹھی۔ انیسویں صدی کے آخر تک یورپ میں بہت سی طاقتور صنعتی قومیں پیدا ہو چکی تھیں۔ ان میں سے ہر ایک کو تجارتی منڈیوں کی تلاش تھی۔ دوسرے راستے بند پا کر ان تیز یورپی قوموں نے افریقہ کا رخ کیا اور بیسویں صدی کے آغاز میں افریقہ کا تاریک ترین حصہ بھی بلجیم، پرتگال، برطانیہ، فرانس اور جرمنی کے درمیان تقسیم ہو گیا۔ دنیا کے دوسرے حصوں کی طرح یورپی فاتحین کے جھنڈے تلے پادریوں کی فوجیں بھی افریقہ میں داخل ہوئیں، اور اقتصادی لوٹ کھسوٹ کے ساتھ ہی افریقہ میں اشاعت مسیحیت کا کام بھی شروع ہوا۔ ان تبلیغی کوششوں نے بہت جلد تعلیم کو آلۂ کار کے طور پر استعمال کرنا شروع کیا۔ افریقہ کی لامحدود قدرتی دولت سے ہاتھ رنگنے کے لیے مقامی کارندوں کی ضرورت تھی۔ ان کارندوں کے لیے معمولی لکھے پڑھے ہونا ضروری تھا لکھائی پڑھائی سکھانے کا یہ کام پادریوں نے سنبھالا۔ معمولی لکھنا پڑھنا سیکھ کر ایک افریقی اپنے دوسرے ساتھیوں کے مقابلے میں زیادہ اجرت حاصل کرنے اور بہتر زندگی گزارنے کے قابل ہو جاتا تھا۔ اس طرح مسیحی مبلغ اپنے دین میں کشش پیدا کرنے کے قابل ہو گئے۔ غرض افریقہ میں اشاعت تعلیم اور اشاعت مسیحیت کے درمیان پہلے دن سے ایک گہرا رشتہ قائم رہا ہے۔ یہ کوئی اتفاقی امر نہیں کہ بلجیئن کانگو کی یونیورسٹی جو تاریک براعظم کی اہم ترین یونیورسٹیوں میں سے ہے کیتھولک یونیورسٹی ہے۔

اعلیٰ تعلیم کا آغاز

اہل مغرب کو افریقہ میں تسلط جمائے آدھی صدی سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے۔ اس

تسلط کے جواز میں بڑی شد و مد سے یہ اعلان ہوتے رہے ہیں کہ اس کا مقصد اہل افریقہ کو وحشت کی زندگی سے نجات دلانا اور انھیں اخروی نجات کی راہ دکھانا ہے۔ مگر حقائق ان دعووں کی تائید نہیں کرتے۔ محدود نوشت و خواند اور مسیحی دین کی اشاعت کے علاوہ یورپی قوموں نے اہل افریقہ کو کوئی اور چیز عطا کرنے کی مطلق کوئی کوشش نہیں کی۔ جنوبی افریقہ کی گوری نوآبادی میں کئی یونیورسٹیاں قائم ہیں۔ مگر باقی افریقہ میں پچاس ساٹھ سال کے عرصے میں اعلیٰ تعلیم کی سہولتیں مہیا کرنے کی کوئی قابل ذکر کوشش نہیں کی گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ افریقہ کے گورے حکمرانوں میں سے بہتوں کو یہ یقین تھا کہ کالے کلوٹے حبشی ذہنی طور پر اس قدر معذور ہیں کہ وہ اعلیٰ تعلیم سے استفادہ ہی نہیں کر سکتے۔ لہٰذا ان کے لیے یونیورسٹیاں کھولنا بے کار ہے۔ دراصل اس استدلال کے پیچھے یہ خوف کام کر رہا تھا کہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والے حبشی ملکی اقتدار میں حصہ دار بننا چاہیں گے۔ لہٰذا گورے حکمران اس دن کو زیادہ سے زیادہ پیچھے ڈال دینا چاہتے تھے۔ مگر دو عالمی جنگوں نے صورت حال میں تبدیلی پیدا کر دی۔ بالخصوص دوسری عالمی جنگ نے مغربی قوموں کو مجبور کر دیا کہ وہ جمہوری قدروں کے محافظوں کا روپ دھاریں۔ اس مجبوری نے انھیں چار و ناچار اس بات پر بھی آمادہ کیا کہ کالے کلوٹے حبشیوں کی اعلیٰ تعلیم کے لیے چند یونیورسٹیاں قائم کریں۔ چناں چہ جنوبی افریقہ اور شمالی افریقہ کو چھوڑ کے باقی افریقہ میں جو یونیورسٹیاں قائم ہیں وہ پچھلے چند برسوں کی پیداوار ہیں۔ اور ان کی تعداد بے حد محدود ہے۔ برطانیہ نے جن وسیع و عریض افریقی علاقوں پر قبضہ جما رکھا ہے ان میں صرف چار یونیورسٹی کالج قائم ہیں۔ سوڈان اور غنا میں جو حال ہی میں انگریزی غلامی سے آزاد ہوئے ہیں ایک ایک یونیورسٹی کالج قائم ہے۔ فرانس کے زیر نگیں جو لمبے چوڑے افریقی مقبوضات ہیں ان میں صرف ایک یونیورسٹی ڈاکر کے مقام پر قائم ہے۔ بلجیم نے اپنے افریقی مقبوضات میں اعلیٰ تعلیم کے تین مرکز قائم کیے ہیں۔ چھوٹے سے یورپی ملک پرتگال نے بھی افریقہ میں دو بڑی بڑی نوآبادیاں قائم کر رکھی ہیں۔ مگر ان میں سے کسی میں بھی کوئی اعلیٰ تعلیمی ادارہ موجود نہیں۔

مغربی قوموں نے با دل ناخواستہ افریقہ میں اعلیٰ تعلیم کے جو مرکز قائم بھی کیے ہیں ان کے

متعلق سب سے عجیب بات یہ ہے کہ انھیں مقامی حالات سے کچھ مناسبت نہیں۔ افریقہ ان گنت زبانوں اور ثقافتوں کے ایک مرکب کا نام ہے۔ شمالی افریقہ کو عربی زبان نے وحدت عطا کر رکھی ہے مگر صحرائے اعظم سے نیچے جغرافیائی دیواروں نے افریقی آبادی کو الگ الگ گروہوں میں بانٹ رکھا تھا۔ نتیجہ یہ ہے کہ مختلف افریقی بولیوں کے مابین کوئی باہمی رشتہ موجود نہیں۔ مغربی قوموں کی آمد نے اس لسانی اور ثقافتی کھچڑی میں اختلاف کا ایک نیا عنصر داخل کر دیا۔ اہل یورپ نے نوآبادیاں قائم کرتے وقت قبائلی یا لسانی وحدت کا کوئی لحاظ نہ رکھا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مصنوعی سیاسی حدوں نے قبیلوں اور لسانی گروہوں کو مختلف ٹکڑوں میں بانٹ دیا۔ اب افریقی یونیورسٹیاں اس ثقافتی پس منظر میں کام کر رہی ہیں۔

مقامی ضرورتوں سے بے اعتنائی

تاریک براعظم کی نوخیز یونیورسٹیوں کو دیکھ کر سب سے نمایاں تاثر یہ پیدا ہوتا ہے کہ اعلیٰ تعلیم کے ان مرکزوں کو مقامی آبادی سے کوئی سروکار نہیں۔ یونیورسٹی کالج کی جدید ترین وضع کی عمارت اور اس کا سازوسامان گردوپیش کی زندگی کے ساتھ جو تضاد پیش کرتے ہیں اس کی مثال دنیا کے کسی اور حصے میں نہیں ملتی۔ عمارتوں اور سازوسامان کی سہولتوں کے اعتبار سے افریقی یونیورسٹیاں دنیا کے ترقی یافتہ ملکوں کا مقابلہ کرتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ جو طالب علم ایک افریقی کسان گھر سے آتا ہے وہ ایک خاصے عرصے تک اس اجنبی ماحول میں کھویا کھویا رہتا ہے۔ اس صورت حال کے جواز میں غیر ملکی حکمرانوں کا استدلال یہ ہے کہ وہ اعلیٰ ترین تعلیمی معیار قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ تاکہ افریقی یونیورسٹیوں کے فارغ التحصیل طلبہ مغربی یونیورسٹیوں میں تعلیم پانے والوں کے ہم پلہ رہیں۔ اس میں کلام نہیں کہ افریقی یونیورسٹیاں معیار کے مقابلہ میں بیرونی یونیورسٹیوں کا مقابلہ کرتی ہیں۔ جو نوجوان ان سے تعلیم ختم کر کے نکلتے ہیں وہ بیرونی ملکوں میں تعلیم پانے والوں کے ہم پلہ ثابت ہوتے ہیں۔ مگر اس بات کے لیے افریقہ بہت بھاری قیمت ادا کر رہا ہے۔ یونیورسٹی زندگی کو اعلیٰ ترین معیاروں پر قائم رکھنے کا قدرتی نتیجہ یہ ہے کہ

ت کم نوجوان اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں اس سے اعلیٰ تعلیم کی اشاعت کی بے حد دھیمی پڑ گئی ہے۔

افریقہ ایک بہت بڑا براعظم ہے۔ اس کی کل آبادی تقریباً پچیس کروڑ ہے۔ رقبے کے اعتبار سے آبادی بہت تھوڑی ہے۔ مگر افریقی یونیورسٹیاں اس مختصر آبادی کی ضرورتیں بھی پوری نہیں کر سکتیں ہر دور کی زندگی میں یونیورسٹی درجے کے تربیت یافتہ رہنماؤں کی بھاری مانگ ہے۔ افریقی یونیورسٹیاں یہ مانگ پوری کرنے میں جس حد تک قاصر ہیں اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ کانگو ں سوا کروڑ کی آبادی میں صرف ایک افریقی گریجوایٹ موجود ہے۔ اس صورت حال کا ناگزیر نتیجہ ہے کہ ایسے حبشیوں کی تعداد بے حد تھوڑی ہے جو اعلیٰ انتظامی ذمہ داریاں سنبھالنے کا مطالبہ ر سکیں۔ اس صورت حال کا دوسرا نتیجہ یہ ہے کہ ہر سال ہزاروں افریقیوں کو اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ ہندوستان اور امریکہ کا رخ کرنا پڑتا ہے۔ مثلاً برطانوی مشرقی یا مغربی افریقہ کا جو طالب علم وکالت کا امتحان پاس کرنا چاہے اسے ہندوستان جانا پڑتا ہے۔ ڈاکر میں اگرچہ یونیورسٹی اور لا کالج موجود ہے مگر جو افریقی طالب علم لا کالج میں تعلیم حاصل کرے اس کے لیے لازمی ہے کہ آخری سال فرانس میں گذارے غیر ملکی تعلیم کے اخراجات لا محالہ اتنے کمر توڑ ہیں کہ بہت کم افریقی والدین اس کی استطاعت رکھتے ہیں

ٹیکنیکل تعلیم کے دروازے اہل افریقہ کے لیے تقریباً بند ہیں۔ نائیجیریا اور غنا میں ایک ایک ٹیکنیکل کالج موجود ہے۔ وسطی افریقہ میں ٹیکنیکل تعلیم کے اداروں اور تربیت گاہوں میں صرف گوروں کو داخلہ ملتا ہے۔ حبشی ٹیکنیکل تعلیم حاصل کرنا چاہیں تو ان کے لیے غیر ملکی یونیورسٹیوں کا رخ کیے بغیر چارہ نہیں۔

افریقی یونیورسٹیوں کا ایک اور افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ جہاں طلبہ کی اکثریت کالوں پر مشتمل ہے وہاں پڑھانے والے تقریباً تمام کے تمام گورے ہیں۔ صرف روڈیشیا میں گورے طلبا کی تعداد کالے طلبہ سے زیادہ ہے۔ اور صرف سوڈان میں ملکی اساتذہ کی تعداد غیر ملکی اساتذہ سے زیادہ ہے۔ یہ صورت حال بے حد غیر تسلی بخش ہے۔ یہ طلبہ اور اساتذہ کے درمیان اس ہمدردانہ فہم کا راستہ روکے ہوئے ہے۔ جس کے بغیر کوئی تعلیم صحیح معنوں میں موثر نہیں بن سکتی۔ افریقی اساتذہ کے یونیورسٹی میں ملازم ہونے کی راہ میں کوئی قانونی رکاوٹ موجود نہیں مگر گورے حکمرانوں نے اس چیز کی

حوصلہ افزائی نہیں کی گو ابھی کافی عرصے تک یورپی اساتذہ کا شاف پر رہنا ناگزیر ہوگا تاہم بظاہر کوئی وجہ نہیں کہ یونیورسٹی اساتذہ کے زمرے میں افریقیوں کو فوری طور پر کیوں جگہ نہ دی جائے۔

بے جا اسراف

افریقہ کی یونیورسٹی تعلیم پر سب سے کاری اعتراض یہ وارد ہوتا ہے کہ یہ بے حد منافہ ہے۔ یہ معدودے چند افراد کی تعلیم پر پانی کی طرح روپیہ بہاتی ہے۔ معاملے کا زیادہ افسوسناک پہلو یہ ہے کہ حکمران ممالک محکوم افریقی علاقوں کی تعلیمی ترقی پر تقریباً کچھ خرچ نہیں کر رہے۔ افریقی یونیورسٹیوں کی تعمیر اور توسیع پر جو کچھ خرچ ہو رہا ہے افریقی آبادی کی جیب سے خرچ ہو رہا ہے۔ برطانوی مقبوضات میں حالت قدرے بہتر ہے کیونکہ یہاں چالو اخراجات مقامی بجٹ سے ادا کیے جاتے ہیں لیکن عمارات کی توسیع کے لیے نوآبادیاتی دفتر کی طرف سے مدد دی جاتی ہے۔ اس کے برعکس بلجیم نے آج تک اپنے خزانے سے بلجین کانگو کی تعلیم پر پائی تک خرچ نہیں کی۔ حالانکہ بلجیم کی سالانہ آمدنی کا ایک بہت بڑا حصہ کانگو سے حاصل ہوتا ہے۔ فرانس کے افریقی مقبوضات کی حالت بھی کم و بیش یہی ہے۔ ڈاکر کی یونیورسٹی کے اخراجات فرانسیسی خزانے سے ادا کیے جاتے ہیں۔ مگر اس کی وجہ یہ ہے کہ فرانس نے اپنے مقبوضات میں محاصل کا ایک الگ طریق رائج کر رکھا ہے۔ یہ محاصل نوآبادی کے خزانے میں جانے کی بجائے پیرس میں جمع ہوتے ہیں۔ لہٰذا ہر قسم کے سرکاری اخراجات بھی پیرس سے ادا کیے جاتے ہیں فرانس نے اپنے وسیع استوائی مقبوضات کے لیے اعلیٰ تعلیم کا کوئی ادارہ جاری نہیں کیا۔ اس علاقے کے طلبہ سرکاری وظائف پر فرانس میں پڑھنے جاتے ہیں۔

افریقی یونیورسٹیوں کے بھاری اخراجات کا ایک منطقی نتیجہ یہ ہے کہ ان میں طلبہ کی تعداد بے حد کم ہے۔ کسی یونیورسٹی میں بھی طلبہ کی تعداد ایک ہزار سے زیادہ نہیں برطانوی علاقے کی مکریری یونیورسٹی میں اساتذہ اور طلبہ کے درمیان ۱ : ۷ کا تناسب ہے۔ دنیا کی کسی اور یونیورسٹی میں اساتذہ اور طلبہ کا تناسب اتنا تھوڑا نہیں امریکہ دنیا کا امیر ترین ملک ہے۔ مگر وہاں بھی اساتذہ اور اور طلبہ کے درمیان ۱ : ۱۰ کا تناسب بھی مالی طور پر ناقابل عمل سمجھا جاتا ہے۔ مگر افریقہ جیسے پسماندہ

براعظم پر یونیورسٹی تعلیم کا یہ کمر توڑ بوجھ مسلط ہے اور اسے ہلکا کرنے کی کوئی کوشش نظر نہیں آتی۔ یہ بوجھ اس لحاظ سے اور بھی زیادہ گردن توڑ ہے کہ پروفیسر تقریباً سب کے سب یوروپین ہیں۔ اور انھیں یوروپی شرح کے مقابلے میں کہیں زیادہ معاوضہ دیا جاتا ہے۔ اس کے باوجود گورے حکمرانوں کو اس بات کی چنداں فکر نہیں کہ گورے استادوں کی جگہ افریقی استاد مقرر کرکے یونیورسٹی تعلیم کے مالی بوجھ کو ہلکا کریں۔

گورے حکمران اعلیٰ تعلیم کے نام پر افریقہ کی قیمتی دولت جس انداز سے لٹا رہے ہیں۔ اس کا حال کانگو کی ایک مثال سے معلوم ہو جاتا ہے۔ الزبتھ ول کی یونیورسٹی میں صرف ایک بلجین طالب علم کی خاطر فلیمش زبان کی تدریس پر روپیہ ضائع کیا جا رہا ہے۔ اگر یہی روپیہ کسی بین الاقوامی زبان مثلاً انگریزی یا فرانسیسی کی تدریس پر صرف کیا جائے تو بھی کچھ بات ہے۔ مگر بلجیم اپنے سیاسی غلبہ کے طفیل افریقی طلبہ کے احساسات اور ان کی ضرورتوں سے آنکھیں بند کیے ہوئے ہیں۔

غرض افریقہ میں اعلیٰ تعلیم کے نام پر دولت بے دریغ لٹائی جا رہی ہے۔ اور اس تعلیم سے تھوڑے سے تھوڑے افریقیوں کو فائدہ پہنچ رہا ہے۔ یونیورسٹیوں کی موجودہ سہولتوں سے کام لے کر بھی تعداد طلبہ کو دو تین گنا بڑھا جا سکتا ہے۔ اس اضافے سے تعلیمی معیاروں کے گرنے کا کوئی احتمال نہیں۔ اس وقت اقامت گاہوں میں ہر طالب علم کو الگ کمرہ دیا جاتا ہے۔ اس کمرے میں آسانی سے دو طالب علم بھی گذارہ کر سکتے ہیں۔ مگر اس بات کی اجازت نہیں دی جاتی۔ اس قسم کے مطالبے تعلیمی معیاروں کے نام پر ٹھکرا دیے جاتے ہیں۔ ایک تو افریقہ جیسے براعظم میں موجودہ یونیورسٹیوں کی تعداد ہی برائے نام ہے۔ اس پر مستزاد ان یونیورسٹیوں کی حد سے زیادہ محدود گنجائش ہے۔ تعلیمی سہولتوں کا یہ قحط صرف یونیورسٹی سطح تک محدود نہیں۔ ثانوی تعلیم کا بھی کم و بیش یہی حال ہے۔ مثلاً بلجین کانگو کی ایک کروڑ تیس لاکھ کی آبادی کے لیے صرف تیس ثانوی مدرسے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ یونیورسٹی تعلیم کے امیدواروں کی تعداد ہی خوردبینی حدود کے اندر رہتی ہے۔ کانگو کی دو بڑی یونیورسٹیوں میں جہاں مطلوبہ قابلیت کے تمام افریقی امیدواروں کو داخل کر لیا گیا تھا۔ ان کی کل تعداد صرف ۰۰ ۲ کو پہنچی تھی۔

افریقی ثقافت کی کس مپرسی

افریقہ میں تعلیم کا چرچا کرنے کا سہرا بے شک مغربی قوموں کے سر ہے۔ مگر ان قوموں نے تعلیم کو مغربی روایات اور مغربی زبانوں کی نشر و اشاعت کا ذریعہ بنایا ہے۔ انھوں نے اس بات کی جان بوجھ کر مخالفت کی ہے کہ افریقی زبانیں یا افریقی روایات کی حوصلہ افزائی ہو۔ بیشتر افریقی زبانوں میں اتنی سکت نہیں کہ وہ تعلیمی ضرورتیں پوری کر سکیں۔ مگر سواحلی زبان جو مشرقی افریقہ، وسطی افریقہ اور کانگو میں ہر جگہ سمجھی جاتی ہے۔ ایک ترقی یافتہ زبان ہے کیوں کہ یہ زبان اُردو کی طرح عربی زبان کی ایک بیٹی ہے۔ سواحلی زبان کو آسانی سے ترقی دی جا سکتی ہے۔ اور یہ تعلیم کے ہر درجے پر درس و تدریس کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ مگر سواحلی کو ترقی دینے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ بلکہ مشرقی افریقہ میں اس کی تدریس کو جان بوجھ کر نظر انداز کیا گیا ہے۔

تاریک براعظم کو یورپی قوموں کو زیر سایہ آئے ابھی صرف پچاس ساٹھ برس گذرے ہیں۔ مگر ان پانچ چھے دہائیوں میں دو عالمی جنگوں نے دنیا کے سوئے ہوئے عوام کو اس شدت سے جھنجوڑا ہے کہ وہ بڑی تیزی سے اپنی اہمیت سے باخبر ہو رہے ہیں۔ افریقہ نے بھی اس عالم گیر تحریک سے پورا پورا اثر قبول کیا ہے اور اس براعظم میں آج ہر جگہ آزادی اور خود مختاری کے سلالیے گونج رہے ہیں۔ کچھ افریقی قومیں آزاد ہو چکی ہیں اور بیشتر آزادی کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہی ہیں۔ مگر آزاد زندگی کی ضرورتوں سے عہدہ برا ہونے کے لیے اعلیٰ تعلیم یافتہ رہنماؤں کی ضرورت ہے۔ افریقہ کے گورے حکمرانوں نے اس قسم کی تعلیمی حکمت عملی اختیار کر رکھی ہے جس کے طفیل ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کی رفتار بے حد مدہم رہے تاکہ کم از کم مستقبل قریب میں افریقی عوام کو تربیت یافتہ رہنما مل سکیں اور اس طرح وہ گورے آقاؤں کے دامن کے ساتھ چپٹے رہنے پر مجبور رہیں۔ مگر افریقی طلبہ اس صورت حال سے مطمئن نہیں، وہ اس کے خلاف آواز اٹھا رہے ہیں۔ اغلب یہ ہے کہ ان کا احتجاج بے نتیجہ نہیں رہے گا اور افریقہ میں تعلیمی ترقی کی رفتار تیز ہو کر رہے گی۔

افریقی طلبہ کی جدوجہد نے اب تک جو نتائج پیدا کیے ہیں وہ خاصے تسلی بخش ہیں۔ یہ

وہ خاصے تسلی بخش ہیں۔ یہ نتائج اس لحاظ سے اور بھی معنی خیز ہیں کہ افریقی طلبہ کو سخت مجبوریوں کے تحت کام کرنا پڑتا ہے۔ ہر یونیورسٹی میں گورے طلبہ کی ایک خاصی تعداد موجود ہے اگرچہ جنوبی افریقہ کے علاوہ افریقہ کے باقی حصوں میں نسلی علیحدگی کا قانون سرکاری طور پر رائج نہیں۔ اس لیے گورے اور کالے طلبہ ایک ساتھ تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ مگر گورے طلبہ کالوں سے مجلسی طور پر الگ رہتے ہیں۔ وہ افریقی طلبہ کے اس مطالبے کی سخت مخالفت کرتے ہیں کہ جب تک نوآبادیاتی نظام کا خاتمہ نہیں ہوجاتا اس وقت تک تمام طلبہ کو یکساں تعلیمی سہولتیں حاصل نہیں ہوسکتیں۔ گورے طلبہ کا یہ اختلاف افریقی طلبہ کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ ہے۔

اس کے علاوہ گورے حکمرانوں نے افریقی طلبہ کے جذبۂ آزادی کو دبانے کے لیے دوسرے حربے بھی وضع کر رکھے ہیں۔ مثلاً فرانسیسی مقبوضات میں ایسے طلبہ کو وظیفے نہیں دیے جاتے جن پر سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے کا الزام ہو۔ چوں کہ سرکاری وظیفے کے بغیر فرانس جاکر تعلیم حاصل کرنا ایک اوسط طالب علم کے لیے ناممکن ہے۔ اس لیے فرانس کا یہ حربہ افریقی طلبہ کو قابو میں رکھنے کے لیے خوب مؤثر ثابت ہوا ہے۔ برطانوی مقبوضات میں کوئی ایسا قانون نہیں جس کی آڑ میں سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے والے طلبہ کو وظائف سے محروم کردیا جائے۔ تاہم انگریز حکمران طلبہ پر حقیقت اچھی طرح واضح کردیتے ہیں کہ سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے والے طلبہ کو تعلیم ختم ہونے پر سرکاری نوکری نہیں ملے گی۔ یہ برطانوی حربہ بھی خوب کامیاب رہا ہے۔

مگر طلبہ کو دبانے کے یہ حربے دن بدن ڈھیلے پڑ رہے ہیں۔ افریقی یونیورسٹیوں کے طلبہ بین الاقوامی تنظیموں کے ساتھ منسلک ہوچکے ہیں اور ان کا جذبۂ آزادی اور جذبۂ عمل تیزی سے بڑھ رہا ہے۔

تعلیمی دُنیا پر ایک نظر

آکسفورڈ یونیورسٹی میں اسلامی علوم کے عروج وارتقا کی تاریخ

آکسفورڈ یونیورسٹی کب قائم ہوئی. یہ بتانا ذرا دِقت طلب ہے البتہ یہ یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ وہ ۱۱۶۳ء تک پوری طرح قائم ہو چکی تھی اور خوش اسلوبی سے اپنے فرائض انجام دے رہی تھی. اس کے علوم یونیورسٹی کے قیام کے وقت اور اس کے بعد کئی صدیوں تک دینیات اور فلسفہ تک محدود رہے تھے (ویسے بادل ناخواستہ طب اور قانون کے مضامین بھی غالبًا تسلیم کر لیے گئے تھے) مغربی عیسائیت کے لاطینی متن تسلیم کیے جا چکے تھے (ابن سینا اور ابن رشد فی الحقیقت تسلیم کیے جا چکے تھے. لیکن ان کا مطالعہ قرون وسطیٰ کے لاطینی ترجموں میں ہوتا تھا) انگلستان میں علوم وفنون کا احیا سولھویں صدی کے اول نصف میں ہوا. پھر اس کے بعد ۱۵۴۶ء میں آکسفورڈ میں متعدد صدر پروفیسروں کے تقرر کے بعد جن میں (یونانی اور عبرانی کے پروفیسر بھی شامل ہیں) قرون وسطیٰ کے محدود نظریہ سے باقاعدہ قطع تعلق کیا گیا. کوئی ستر سال کے بعد عربی کا شعبہ بھی قائم ہو گیا میتھا میں ہیسر نامی ایک جرمن جنھوں نے ۱۶۲۴-۲۵ء میں پیرس میں عربی کی تعلیم حاصل کی تھی. آکسفورڈ میں ۱۹۲۶ء میں، عربی، نجوم اور سریانی کے لیکچرار مقرر ہوئے. وہ تین سال تک اس عہدہ پر فائز رہے اور اس اثنا میں انھوں نے علم عربی کے فوائد پر ایک کتابچہ بھی تحریر کیا تھا۔

کامیابی: بے شک اس تجربہ کی کامیابی کی بنا پر ولیم لارڈ آرک بشپ آف کنٹربری آکسفورڈ یونیورسٹی کے چانسلر نے ۱۹۳۶ء میں عربی میں پروفیسر کا عہدہ قائم کیا. جسے ان کے اعزاز میں لاڈین پروفیسر شپ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

یہ بات ملحوظ رہے کہ مختلف موضوعات کے لیے یونیورسٹی میں جو شعبے قائم کیے گئے تھے. ان کا

مطلب نہیں تھا کہ انھیں انڈر گریجویٹوں کے لیے موزوں بھی تسلیم کر لیا گیا تھا اور نہ ہی یہ مضامین یونیورسٹی کے باقاعدہ نصاب میں شامل تھے۔ تعلیم میں مہارتِ خصوصی کا شعبہ جس سے ہم آج کل کے زمانہ میں مانوس ہوگئے ہیں، انیسویں صدی تک شروع نہیں ہوا تھا۔ سترھویں صدی کے طلبا جو لاڈین پروفیسر کے لیکچروں میں شرکت کرتے تھے۔ خاص طور پر وہ انڈر گریجویٹ تھے جو نئے اور ولولہ انگیز مضامین سے بھی واقفیت حاصل کرنے کے خواہشمند تھے۔ اگرچہ وہ اپنی زیادہ تر توجہ مغربی علم و ادب کی روایاتی تعلیم پر مرکوز رکھتے تھے۔ چناں چہ عربی لیکچروں کے لیے ابتدائی انتظامات میں یہ بھی شامل تھا کہ وہ لینٹ میں ہر بدھ کو نو بجے صبح ایک گھنٹہ اور تعطیلات میں بھی دیے جایا کریں۔ غرضیکہ عربی میں پروفیسری کے متعلق جو دستور اساسی ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ سامعین محض گریجویٹوں پر مشتمل ہوتے تھے۔

اسلامی علوم:۔ یہ بھی مسلمہ امر ہے کہ جن لوگوں نے عربی کی تعلیم شروع کر رکھی تھی انھیں شروع شروع میں اسلامی علوم و فنون سے کوئی خاص دلچسپی یا ہمدردی نہ تھی۔ البتہ وہ یہ سراہے بغیر نہ رہ سکے کہ تاریخ طب، تجربیات، نجوم، ریاضیات اور متعلقہ علوم کے میدان میں مسلمان عالموں نے ایک خاص کردار ادا کیا ہے۔ سترھویں صدی کے اوائل میں مذکورہ بالا علوم کے بیشتر نکات ایسے تھے جن میں مسلمان یورپ سے آگے تھے اور عربی زبان حاصل کرنے کے اس موقع سے کم از کم پرجوش محققین کی ایک مختصر سی جماعت نے پورا فائدہ اٹھایا۔

پہلے پروفیسر: ایڈورڈ پوکاک پہلے لاڈین پروفیسر تھے جو سنہ ۱۶۳۶ء میں شعبۂ عربی کے صدر مقرر ہوئے تھے۔ وہ پانچ سال حلب میں رہ کر عربی زبان میں فارغ التحصیل ہو چکے تھے۔ ویسے عربی سیکھنے کی ابتدا انھوں نے ولیم بیڈویل کے شاگرد کی حیثیت سے کی تھی جو عام طور پر انگلستان میں بانیٔ عربی کے نام سے مشہور رہے۔ اپنے عہدہ پر فائز ہو جانے کے بعد پوکاک نے مشرق قریب کا دوبارہ دورہ کیا اور سنہ ۱۶۵۰ء میں عربوں کی تاریخ پر ان کی تصنیف SPECMEN شائع ہوئی جس میں ابو الفرج کی تاریخ العالم کا ترجمہ اور متن اور اسلامی تاریخ سائنس اور ادب کے مختلف پہلوؤں پر مقالے شامل تھے۔ یہ عربی کی ان دو کتابوں میں سے ایک تھی جو پہلی بار انگلستان میں چھپی تھیں۔ جنتری کے سلسلہ میں جو تحقیقی کام

کیا ہے اس میں اسلامی ماخذات سے کافی مدد لی ہے۔ علاوہ ازیں انھوں نے ابوالفدا، نصیرالدین طوسی اور الغ بیگ کی جغرافیہ سے متعلق کتابوں سے انتخابات بھی شائع کیے تھے۔

پہلا قدم : سترھویں صدی کے دوران میں غالباً عربی کی اس کامیابی اور عظمت ہی کی بنا پر آکسفورڈ ۱۷۲۲ء کے لگ بھگ شعبۂ عربی میں ایک اور پروفیسر کی جگہ نکلی، اسی طرح کیمرج میں عربی کے دو پروفیسروں کا تقرر ہوا) یہ پروفیسری لارڈ المونرز پروفیسرشپ کے نام سے موسوم ہے۔ اس کی بنیاد کس طرح اور کن حالات میں پڑی۔ اس کے متعلق کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ کیوں کہ لارڈ المونر کے دفتر کے تمام ریکارڈ نذر آتش ہو گئے تھے۔ یہ پروفیسرشپ تقریباً دو صدی تک جاری رہنے کے بعد ۱۹۳۱ء میں ختم ہو گئی۔ اور اب آکسفورڈ میں شعبۂ عربی کی تمام ذمہ داری لاڈین پروفیسر کے سر آن پڑی۔ باوجود اس کے کہ شعبۂ عربی میں دو پروفیسر مامور تھے، اٹھارھویں صدی میں عربی علوم سے دلچسپی کم ہو گئی تھی۔ دونوں ہی پروفیسروں کا خیال تھا کہ ان کا عہدہ ترقی میں پہلے قدم کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس صدی میں سات افراد ان دونوں میں سے کسی نہ کسی عہدہ پر فائز رہے۔ بعد میں چار عبرانی زبان کے صدر پروفیسر ہو گئے اور ایک شعبہ عربی کی پروفیسری سے دست بردار ہو کر کالج کے پرنسپل ہو گئے تھے۔

اردو کی تعلیم : مشرقی زبانوں میں محض عربی اور عبرانی ہی یونیورسٹی کے نصاب میں شامل تھیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ دوسری اسلامی زبانوں کو نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ درحقیقت عربی کے پروفیسر بعض اوقات فارسی، بعض اوقات ترکی و اردو میں خاص استعداد رکھتے تھے اور لازمی طور پر وہ ان زبانوں کے طالبین کبھی ان زبانوں سے متعلق ضروری ہدایات دیتے رہے ہوں گے مثلاً تھامس ہائڈ (لاڈین پروفیسر ۱۷۰۳ - ۱۶۹۱ء) متعدد مشرقی زبانوں پر عبور رکھتے تھے۔ چناں چہ شطرنج کی تاریخ کے بارے میں انھوں نے اپنی جامع تصنیف میں مشرقی تصانیف سے استفادہ کیا ہے اور جوزف وہائٹ (لاڈین پروفیسر ۱۷۷۴ تا ۱۸۱۴ء) پہلے شخص تھے جنھوں نے تیمور کی تزکات فارسی سے انگریزی میں ترجمہ کیا تھا۔

انیسویں صدی کے اواخر میں آکسفورڈ اور دوسری یونیورسٹیوں کے تعلیمی ڈھرّے میں خاصی تبدیلی ہوگئی تھی تعلیم کے متعدد شعبوں میں علم کی ترقی و نشو و نما سے یہ احساس پیدا ہو چلا تھا کہ سترھویں اور اٹھارہویں صدی کے طالب کا یہ تصور کہ وہ تعلیم کے پورے میدان پر حاوی تھا۔ اب ممکن نہ تھا۔ اب اس کے لیے کسی ایک مضمون میں مہارت خصوصی ایک حد تک ناگزیر ہوگئی اور اس کا انڈر گریجویٹ کے معیار پر ہی شروع ہو جانا۔ بے حد ضروری تھا۔ چنانچہ اس زمانہ میں بی اے کے مضامین کے دائرہ کو وسعت دینے کا عمل جاری رہا۔ یہ تحریک مشرقی علوم تک ۱۸۸۶ء میں پہنچی، جب کہ مشرقی علوم کے سکول کا قیام عمل میں آچکا تھا۔ لہٰذا میں اس سکول کے مضامین میں، عربی، فارسی، اُردو، اور متعدد غیر اسلامی زبانیں شامل تھیں۔ اور امیدوار اس فہرست میں سے بیک وقت مضامین اختیار کر سکتے تھے۔ ۱۸۹۵ء میں غالباً تعلیمی سہولتوں کی کمی کی وجہ سے اردو کو فہرست سے خارج کر دیا گیا تھا۔ ۱۹۴۹ء میں ترکی زبان فہرست میں شامل کر لی گئی تھی۔ اگرچہ عالمی جنگوں کے درمیانی عرصہ میں آکسفورڈ میں اردو کا ایک لیکچرر موجود تھا۔ اور اس کا فریضہ ان لوگوں کو اردو کی ابتدائی تعلیم دینا تھا جو کہ انڈین سول سروس میں داخل ہونے کے خواہاں تھے۔

ایک غیر معمولی اسکول کا غیر معمولی نصاب

آرکیٹیکچرل ایسوسی ایشن کا تعمیراتی سکول جو لندن میں واقع ہے غالباً ایسا واحد ادارہ ہے جسے طلباء نے قائم کیا ہے جسے سابق طلباء نے مالی امداد دی اور جو طلبا کے تعاون سے چل بھی رہا ہے، ایک سو دس سال سے زیادہ عرصہ سے سکول کی ایک نمایاں حیثیت ہے۔ طلبا اور ممبر اسے اے اے سکول کے نام سے پکارتے ہیں۔ گرم ممالک کے لیے مخصوص نصاب تعلیم سب سے پہلے اسی سکول نے شروع کیا تھا۔

اے اے سکول میں اس نصاب سے متعلق اعلیٰ تعلیم ۱۹۵۳ء میں شروع ہوئی۔ متعلقہ شعبوں میں گرم ممالک کی مخصوص ضروریات کے پیش نظر کئی ششماہی کورس ہوتے ہیں جن کے ذریعے ایک بڑی ضرورت پوری ہوتی رہتی ہے۔

بہت سے گرم ممالک ایسے ہیں جن کا اپنا کوئی فن تعمیر کا ادارہ نہیں ہے۔ کچھ ایسے بھی ہیں جہاں اس قسم کے ادارے تو ہیں لیکن ان کا ڈھانچہ مغربی پیشہ ورانہ کالجوں کے طرز پر بنا ہے۔

گرم ممالک سے طلبہ یورپ اور امریکہ جا کر فن تعمیر کے سکولوں میں داخل ہوتے ہیں۔ لیکن وہاں ان کو ایسی تعلیم دی جاتی ہے جو مغرب کے سماجی اور جغرافیائی حالات کے مطابق ہوتی ہے یہ بات قابل ذکر ہے کہ سب سے پہلے ایک افریقی طالب علم نے ان غیر تسلی بخش حالات کی طرف توجہ مبذول کرائی اور ۱۹۵۳ء میں یونیورسٹی کالج لندن میں گرم ممالک کے فن تعمیر سے متعلق سب سے پہلی کانفرنس طلب کرنے میں مدد دی۔

اے۔ اے سکول میں گرم ممالک کے فن تعمیر کا شعبہ اس کانفرنس کے بعد ہی قائم کیا گیا۔ ابتداء میں اس شعبہ میں ان برطانوی انجینیروں کو تعلیم دی جاتی تھی جو گرم ممالک میں کام کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ بعد میں اس شعبہ کا دائرہ وسیع کر دیا گیا۔

اب یہ شعبہ گرم ممالک کے فن تعمیر کی تعلیم کا مرکز ہے۔ جہاں دنیا کے تمام ملکوں کے طلبا تجویز ان کے معاملے میں اپنے علم میں اضافہ کر کے متعلقہ ملکوں کی بود و باش تعمیر اور منصوبہ بندی میں تحقیقات کرنے کے خواہش مند ہیں۔

سکول کے اس شعبہ کی تعلیم کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ یہ تعلیم اس اصول کے تحت دی جاتی ہے جس کی بنیاد متعلقہ ملک کے لوگوں سے واقفیت کی بنا پر قائم ہو۔

نصاب کی ابتدا علم البدن کے لیکچروں سے ہوتی ہے جس میں زیر غور یہ مسئلہ ہوتا ہے کہ انسانی جسم اور دماغ گرمی سے کس حد تک متاثر ہوتے ہیں۔ گرم ممالک میں انسان کا سب سے بڑا دشمن سورج ہوتا ہے اور اس لیے سورج کے مطالعہ کو نصاب میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔ طلبا سورج کی نقل و حرکت اس کی تمازت اور روشنی اور دفاعی طریقوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔ گرمی سے بچاؤ کا تعلق آب و ہوا کے اور دوسرے مسائل کے علاوہ ان مصنوعی ذرائع سے بھی ہے جن کی مدد سے گرم ممالک کے شہروں میں انسان حرارت پر قابو پاتا ہے۔

نصاب میں ان قوانین کا مطالعہ بھی داخل ہے جو تعمیراتی سامان اور اجرام میں گرمی کی کمی یا زیادتی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ پھر حفظان صحت، صفائی اور وبائی کیڑوں کا مطالعہ بھی ہے۔ ان کے علاوہ گرم ممالک میں سماجی اور معاشی مسائل بھی اتنے ہی اہم ہیں جتنے فنی یا موسمی۔

اے اے سکول کے اس شعبہ میں گرم ممالک کی خانگی اور سماجی زندگی کی روایات، معاشی مسائل موجودہ فنی ترقی کے نتیجے میں پیدا ہونے والے معاشرتی مسائل اور ان کا بود و باش پر اثر۔ یہ وہ چیزیں ہیں جن پر غور و فکر کیا جاتا ہے۔ لندن میں ہونے سے فائدہ یہ بھی ہے کہ سکول میں دنیا کے تمام ممالک کے طلبہ جمع ہو سکتے ہیں۔ فلپائن، ہانگ کانگ، ویٹ نام، سنگاپور، ملایا، تھائی لینڈ، برما، پاکستان، ہندوستان، سیلون، انڈونیشیا، موریشس، ایران، عراق، مصر، کینیا، گھانا، نائیجیریا، پرتگالی افریقہ، جزائر غرب الہند، جنوبی افریقہ، رھوڈیشیا اور وسطی اور جنوبی افریقہ کے تعمیراتی انجینئر یہاں جمع ہوتے ہیں اور اساتذہ کے علاوہ طلباء ایک دوسرے سے بھی بہت کچھ سیکھتے ہیں۔

اس کورس میں داخلہ صرف انہی کو ملتا ہے جو سند یافتہ تعمیراتی انجینئر ہوں، البتہ لیکچر ہر شخص سن سکتا ہے۔ ہر سال داخلے کے لیے درخواستوں میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ لیکن جگہ کی قلت کی وجہ سے صرف ۲۵ طلبا کو داخل کیا جاتا ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ رفتہ رفتہ اس کورس میں توسیع کی جائے گی تاکہ گرم ممالک میں مکانات کی تعمیر اور ان کے ڈیزائن سے متعلق نہ صرف تعلیم حاصل کی جا سکے۔ بلکہ تحقیقاتی کام بھی کیا جا سکے۔

طالب علم کی زندگی میں کام اور کھیل کے دن

یوں تو لندن یونیورسٹی میں تعلیم اور رہائش کا بڑا خیال رکھا جاتا ہے، لیکن یونیورسٹی کے طالب علم کو جلد ہی اس بات کا احساس ہو جاتا ہے کہ برطانیہ کے دارالسلطنت میں اس کے آرام کا خیال نہیں رکھا گیا۔ وہ ایک آراستہ مکان میں رہتا ہے جو اس کے کالج سے چھ اور بعض اوقات دس میل کے فاصلہ پر ہے۔ لیکچر سننے کے لیے اسے روزانہ مزدوروں سے کھچا کھچ بھری ہوئی ریل گاڑیوں اور بسوں کے ذریعے لمبی مسافت طے کرنی پڑتی ہے، پھر اتنے اہم کتب خانوں اور تجربہ گاہوں میں مطالعہ کرنا پڑتا ہے۔ کالج کے

طعام خانہ میں اسے اپنے دوپہر کے کھانے کے لیے بے صبری کے ساتھ قطار میں کھڑا ہونا پڑتا ہے بستانے کے لیے عام کمرے میسر آتے ہیں جو آرام کے متلاشی طلبہ سے بھرے رہتے ہیں۔ کھیلنے کے لیے اسے کسی دوسری سمت، اپنے کالج یا یونیورسٹی کے کھیل کے میدان میں جانے کے لیے دس یا بارہ میل کا سفر کرنا پڑتا ہے اندرون خانہ کھیلوں میں اسے جو کچھ آسانیاں حاصل ہیں وہ ملک بھر میں بے مثل ہیں۔ یونیورسٹی یونین کی نئی تعمیر شدہ عمارت میں ایک دل کش ایک سو دس فٹ لمبا تیرنے کا تالاب بھی ہے جس میں ایک تین اور پانچ میٹر کے وہ تختے بھی ہیں جن پر سے تیراک ان میں کودتے ہیں۔ اس عمارت میں ایک آراستہ ورزش گاہ اور اسکوائش اور بیڈمنٹن کورٹ بھی ہیں۔

بیرون خانہ کھیلوں کے شائقین کو شہر کے نواح کے کھیل کے میدانوں تک جانے کے لیے لمبی مسافت طے کرنی پڑتی ہے۔ فٹ بال اور ہاکی، جاڑوں کے بہت مقبول کھیل ہیں۔ گرمی کے زمانے میں امتحانات کی وجہ سے کھیلنے کے کم مواقع ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود بھی یونیورسٹی میدان کے کھلاڑیوں کی ممتاز ٹیم تیار کر لیتی ہے۔ چنانچہ حالیہ سالوں میں راجر بینسٹر جی۔ ایم۔ ایلیٹ۔ جان پارلیٹ اور آرتھر ونٹ ایسے مشہور کھلاڑی اس ٹیم کے رکن رہے ہیں۔

عورتوں کے کھیل کے سلسلے میں بھی اسی قسم کے مسائل درپیش ہوتے ہیں۔ انیس ہزار طلبہ میں سے تقریباً چالیس فی صد عورتیں ہیں، جن کو کھیل کے میدانوں تک پہنچنے کے لیے اکثر کافی مسافت طے کرنی پڑتی ہے۔

تمام کالجوں میں خواہ وہ عورتوں کے ہوں، یا مخلوط، مختلف سماجی سرگرمیاں جاری رہتی ہیں جن میں طلبا اور طالبات بڑے انہماک سے حصہ لیتے ہیں اور اکثر اپنی مستقبل کی شادیوں کی داغ بیل بھی ڈال لیتے ہیں۔ شادی شدہ طلبا جنگ کے بعد کے شروع چند سال کی نسبت تعداد میں کم ہیں

لندن میں سمندر پار ممالک سے آئے ہوئے پانچ ہزار طلبا یونین کی سرگرمیوں میں پورا پورا حصہ لیتے ہیں اور یونین کی ممبری کی مراعات سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

اٹھارہ برس کے کام کاج کے بعد سکول واپسی

حکومتِ برما کے ڈاک وتار اور تجارتی جہاز رانی کے محکموں کے ایک وائرلیس ٹیلیگرافی انسپکٹر، او ٹن آنگ، جو ان محکموں میں اٹھارہ برس تک خدمات سرانجام دے چکے ہیں، سکول میں تعلیم کی غرض سے انگلستان گئے ہیں۔ وہ ۱۹۵۸ء سے لندن اکاؤنٹی کونسل کے نارووڈ فنی کالج میں ریڈیو سے متعلق ایک کورس میں شرکت کر رہے ہیں۔

گذشتہ مہینہ ان کا کورس پایۂ تکمیل کو پہنچا اور اب وہ برطانیہ کے جنرل پوسٹ آفس کے شعبۂ انجینیری درریڈیو سروسز میں دس ہفتے گذار رہے ہیں۔ مزید برآں وہ متعدد ریڈیو اسٹیشنوں کے خاصے گہرے مطالعہ و معائنہ کے بعد ان کارخانوں میں بھی جو برقی مواصلاتی سامان تیار کرتے ہیں، اپنا کچھ وقت صرف کریں گے۔

ٹن آنگ کو امید ہے کہ وہ اپنے برطانیہ کے دوران قیام میں خاصہ وسیع مطالعہ کریں گے اور ان کا یہ مطالعہ اور تجربہ برما واپسی پر ان کے نئے تقرر میں بڑا مفید ثابت ہوگا، دراصل حکومتِ برما نے انھیں ایک نئے فنی محکمہ میں، جو تعدادِ ارتعاش کے تعین اور ہم آہنگی پیدا کرنے سے متعلق ہے، اعلیٰ منصب کے لیے منتخب کر رکھا ہے۔

اس محکمہ کو اب سے ایک سال پہلے تمام برقی مواصلاتی معاملات کی نگرانی کی غرض سے قائم کیا گیا تھا۔ یہ محکمہ ریڈیو کی لہروں کے تعین، ریڈیو کے لائسنس اور آپریٹروں کو سند دینے اور مواصلاتی قاعدے قوانین کے نفاذ جیسے مسائل سے نمٹتا ہے۔ ٹن آنگ کو عرصہ، جہاز پر ریڈیو منصوبوں کے معائنہ اور وائرلیس اسٹیشن چلانے کا وسیع تجربہ ہے۔ البتہ اب تک انھیں تعدادِ ارتعاش کے تعین اور ان تمام دیگر مسائل کا جن سے اس نئے محکمے سے نمٹنا ہے، بہت کم تجربہ تھا کیونکہ اس سے قبل یہ کام برما میں نہیں ہوا تھا، چنانچہ ضروری معلومات حاصل کرنے کے مواقع ان کے لیے بے انتہا محدود تھے۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں یہ معلوم کرنا ضروری تھا کہ دیگر ممالک جنھیں طویل تجربہ ہے، کیوں کر ان معاملات سے نمٹتے ہیں۔ اس لیے ان کی

حکومت نے انھیں لندن بھیجنے کے انتظامات کیے۔

ان دنوں وہ جس کالج میں زیر تربیت ہیں اس میں وہ ریڈیو آپریشن کے تمام علمی اور عملی مسائل

کے بارے میں معلومات حاصل کر رہے ہیں۔ جنرل پوسٹ آفس میں دہ موقع پر یہ دیکھ سکے گے کہ ان معاملات

کے انتظامی پہلوؤں کو کیوں کیسے کیا جا رہا ہے۔ ادھر ریڈیو اسٹیشنوں کے معائنے سے وہ ایسی معلومات

حاصل کریں گے جو برما میں اسی قسم کے اداروں کی ترقی و ترویج میں ان کی رہنمائی کریں گی۔

برطانیہ میں شن آنگ کا قیام کولمبو منصوبہ کی فنی تعاون باہمی سکیم کا رہین منت ہے۔ اس

منصوبہ کی غرض وغایت جنوبی اور جنوب مشرقی ایشیا کے لوگوں کی مدد ہے، تاکہ وہ زراعتی

صنعتی، اور دیگر کارکنوں اور عہدیداروں کی فنی پائدستیوں کے معیار کو بلند کر سکیں۔ زیر تربیت

لوگوں کی تعلیم اور انتہائی اہم ذریعہ ہے جس سے ترقی یافتہ ممبر ممالک اس کام میں امداد و اعانت

بہم پہنچاتے ہیں۔ برطانیہ کو لیجیے تو کولمبو منصوبہ کے ایک بانی ممبر کی حیثیت سے اس نے اس سلسلہ میں

اور فنی امداد کے دیگر پہلوؤں پر شروع ہی سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔

فنی تعاون باہمی اسکیم سنہ ۱۹۵۱ء کے موسم خزاں میں شروع ہوئی تھی۔ اس وقت سے

اب تک تربیت پانے والوں کی تعداد میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ چنانچہ سنہ ۱۹۵۱-۵۲ء میں یہ تعداد

پچاس اور سنہ ۵۸ء میں ۴۵۳ تک جا پہنچی۔ مئی سنہ ۱۹۵۸ء کے آخر میں برطانیہ میں ۳۸۴ تربیت

یافتہ مندرجہ ذیل ملکوں سے آئے تھے۔ برما ۱۳۸، کمبوڈیا ۱، لنکا ۷۷، پاکستان ۴۷، ہندوستان

۱۵، انڈونیشیا ۱۱، فلپائن ۱۲، اور تھائی لینڈ ۱۳۔

ان اعداد و شمار میں وہ طلبا شامل نہیں جو یونیورسٹی اور دیگر اداروں میں تعلیم حاصل کرنے کی

غرض سے بہت بڑی تعداد میں برطانیہ آتے ہیں۔ نہ ہی ان اعداد و شمار سے اس فنی امداد کا پتہ

چلتا ہے، جو سنگاپور، ساراواک اور شمالی بورنیو کو دی جا رہی ہے۔ اس لیے کہ یہ علاقے دیگر ذرائع

سے برطانوی امداد حاصل کرنے کے حق دار ہیں۔ گو یہ ضرور ہے کہ دیگر ممبر ملکوں سے بھی فنی تعاون باہمی

اسکیم کے تحت امداد لیتے ہیں ۞

شمارہ ۲]　　　لاهور　　　[مئی ۵۹ء

اس شمارے میں

مدیران { پروفیسر سراج الدین
پروفیسر ایم۔ اے۔ مخدومی

معاونین { عبدالغفور چوھدری
فضل احمد

آموزش
لاہور
مئی سنہ ۱۹۵۹ء
سالانہ چندہ
جلد ——— ۱۲
شمارہ ——— ۲
پاکستان کے لیے ۶ روپے
غیر ممالک کے لیے ۸ روپے
قیمت فی پرچہ دس آنے
پبلشرز
یونی ورسٹی بک ایجنسی لاہور

آر۔ ایچ۔ ڈی۔ خالد پرنٹر پبلشر نے دین محمدی پریس لاہور میں طبع کرا کے
یونیورسٹی بک ایجنسی کچہری روڈ لاہور سے شائع کیا

تعلیم اور عوامی ذمہ داری

ایم۔ اے مخدومی

چند روز ہوئے پاکستان کے وزیر تعلیم جناب حبیب الرحمن نے کراچی کے ایک جلسے کو خطاب کرتے ہوئے لوگوں کی توجہ ایک بے حد اہم نکتے کی طرف مبذول کرائی۔ آپ نے کہا کہ تعلیم کو ضروری توجہ دینا بے شک حکومت کی ایک اہم ذمہ داری ہے۔ مگر اس سلسلے میں عوام کو بھی اپنا فرض پہچاننا چاہیے۔ بچوں اور نوجوانوں کو موزوں تعلیمی سہولتیں مہیا کرنے کے معاملے میں حکومت اکیلی سب کچھ نہیں کر سکتی۔ حکومت کے وسائل محدود ہیں۔ اس لیے وہ تعلیمی میدان میں جو کچھ کرے گی ان وسائل کے اندر رہ کر کرے گی لہٰذا صاحب نظر اور محب وطن شہریوں کا فرض ہے کہ تعلیم کی روشنی پھیلانے کے کام میں حکومت کا ہاتھ بٹائیں۔

وزیر تعلیم کا یہ مشورہ نہایت بروقت ہے۔ ملک میں تعلیم کی مانگ اس تیزی سے بڑھ رہی ہے کہ سرکاری وسائل اس کا ساتھ دینے سے قاصر ہیں۔ طلبہ اور طالبات کا ایک سیلاب ہے جو سکولوں اور کالجوں کی طرف امڈا چلا آ رہا ہے اور اس کی شدت ہر لحظہ بڑھتی جا رہی ہے۔ ملکی آبادی میں جس تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے، اسے دیکھتے ہوئے یہ بات بہ یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ طلبہ اور طالبات کی یہ بھیڑ اسی طرح بڑھتی چلی جائے گی۔ اس صورت حال کا نتیجہ یہ ہے کہ اکثر تعلیمی اداروں کو طلبہ کے ہجوم نے نیم مفلوج سا کر رکھا ہے۔ اساتذہ اور تعلیمی افسر حیران ہیں کہ اس بے پناہ ہجوم میں تعلیمی معیاروں کو کس طرح برقرار رکھیں اور والدین مارے مارے پھرتے ہیں کہ لڑکے یا لڑکی کو کسی نہ کسی طرح کسی سکول میں داخلہ مل جائے۔ اس صورت حال سے فائدہ اٹھا کر بعض لوگوں نے تعلیم کو خالص کاروباری رنگ دے دیا ہے۔ اور غیر منظور شدہ مدرسے اور کالج کھول دیے ہیں۔ والدین اور طلبہ مجبور ہیں کہ ان نام نہاد تعلیمی اداروں کی طرف رجوع کریں۔

یہ ہیں وہ مشکل تعلیمی مسائل جن سے ہم آج دوچار ہیں۔ مگر ہمیں یاد رکھنا چاہیے۔ حکومت کے پاس ان مسائل کے کوئی خانی حل موجود نہیں۔ یہ مسائل بڑی حد تک ہمیں خود حل کرنے ہوں گے۔ قوم کے بچے اس کی بہترین متاع ہیں۔ اس لیے قومی دولت کا سب سے اچھا مصرف اسے بچوں کی موزوں تعلیم وتربیت پر صرف کرنا ہے، پاکستان میں ایسے افراد کی کمی نہیں جنھوں نے پچھلے گیارہ برس میں بے اندازہ دولت کمائی ہے۔ رائے عامہ کو اس طور پر منظم ہو جانا چاہیے کہ عوامی زندگی میں بلندی اور احترام کا مقام زیادہ تر ان لوگوں کو ملے جو نئی پود کی تعلیم وتربیت پر دولت خرچ کرنا جانتے ہوں مغربی ملکوں کی تعلیمی ترقی بڑی حد تک اسی قسم کے مخیّر لوگوں کی مرہون منت ہے۔ وقت آگیا ہے کہ پاکستان کی رائے عامہ بھی اپنے اہل ثروت لوگوں سے اس چیز کا مطالبہ کرے ؛

نئی تعلیم کی تحریک

فضل احمد

تعلیم کی ضرورت

تعلیم انسان کی ایک ابدی ضرورت ہے۔ تعلیم کا وجود اتنا ہی قدیم ہے جتنا انسانی معاشرے کا۔ اگرچہ ابتدائی انسانی معاشروں میں تعلیم دینے کے لیے مدرسے قائم نہ تھے۔ تاہم یہ معاشرے بھی نئی پود کو تھوڑی بہت تربیت دینا ضروری سمجھتے تھے۔ دورِ وحشت میں بھی انسان کو یہ فکر دامن گیر تھی کہ اس کے بچے بڑے ہو کر کم از کم زندگی کی وہ سہولتیں ضرور حاصل کریں جو خود اسے حاصل رہیں۔ اس خیال سے وحشی انسان بھی اپنی اولاد کو پیٹ پالنے اور ناموافق ماحول پر قابو پانے کے طور طریقے سکھاتا تھا اور یہ عمل واضح طور پر تعلیم و تربیت کی ذیل میں آتا ہے۔ اس اعتبار سے تعلیم بھی انسان کی ایسی ہی بنیادی ضرورت ہے جیسے روٹی، کپڑا، مکان وغیرہ۔ تعلیم ہمیشہ انسان کی ایک ناگزیر ضرورت رہی ہے۔ کیوں کہ اس کے بغیر یہ یقین کرنا ممکن نہیں کہ نئی نسل اس سطح پر زندگی گذار سکے گی جس پر زندگی پہلے پہنچ چکی ہے۔

انسان اپنے آپ کو اشرف المخلوقات کہہ کر جی خوش کیا کرتا ہے اور حقیقتاً وہ اس لقب کا مستحق بھی ہے۔ مگر یہ استحقاق اسے محض تعلیم ہی کے ذریعے نصیب ہوتا ہے۔ اگر کسی بچے کو پیدائش کے فوراً بعد کلّی طور پر اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے اور اسے کسی قسم کی تربیت دینے کی کوشش نہ کی جائے تو وہ حیوانی سطح سے بھی نیچے رہتا ہے۔ چہ جائیکہ اشرف المخلوقات کا درجہ حاصل کرے۔ اس اعتبار سے انسانی بچہ ہر دوسرے حیوان کے بچے سے مختلف ہے۔ دوسرے حیوانوں کے بچے پیدا ہوتے ہی حیرت انگیز مہارت اور استعداد کا مظاہرہ کرنے لگتے ہیں۔ مثلاً ناگ کا بچہ انڈے میں سے باہر نکلتے ہی دشمن پر وار کرنے کے لیے تن کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ مگرمچھ کا بچہ انڈے میں سے باہر نکلتے ہی ہر متحرک چیز پر اپنے سوئی کے سے تیز دانت گاڑنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ کم و بیش یہی کیفیت دوسرے

حیوانوں کی ہے بعض حیوانوں کے بچے پیدائش کے وقت قدرے بے بس نظر آتے ہیں. مگر یہ بے بسی بہت جلد ختم ہو جاتی ہے، اور یہ بچے حیرت انگیز تیزی کے ساتھ اپنے جبلّی تقاضے پھرتی کے ساتھ انجام دینا سیکھ لیتے ہیں. ان کے والدین کو تربیت کے معاملے میں کوئی لمبی کاوش نہیں کرنی پڑتی۔

دوسرے حیوانوں کے مقابلے میں قدرت نے انسان کو ایک بے حد پیچیدہ اور بے حد لچکدار نظامِ اعصاب عطا کیا ہے. مگر اس کے ساتھ ہی لطف یہ ہے کہ یہ نظام اعصاب از خود کسی بندھے ٹکے اسلوب پر کام کرنا شروع نہیں کرتا. دوسرے حیوانوں کے برخلاف انسانی نظام ان گنت اسلوبوں پر کام کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے، جہاں دوسرے حیوانوں کے بچے اپنے حال پر چھوڑ دیے جانے پر بھی اپنی نوع کی مخصوص حرکات و سکنات سیکھ جاتے ہیں، انسانی نظام کسی مخصوص ردِ عمل کے لیے نہیں بنایا گیا. اس نکتے کی بہترین وضاحت ان دو لڑکیوں کے حال سے ہو جاتی ہے جو دوسری عالمی جنگ کے زمانے میں وسطی ہند کے جنگلی علاقے میں ایک بھیڑیے کی غار سے ملی تھیں. ان میں سے بڑی نو برس کے لگ بھگ تھی اور چھوٹی دو برس کے لگ بھگ. انسانی بچے ہونے کے باوجود یہ دونوں لڑکیاں چوپاؤں کی طرح ہاتھوں پاؤں پر چلتی تھیں. گویا سیدھے کھڑا ہونا جو عموماً امتیازی انسانی اطوار میں شامل ہے وہ سرے سے غائب تھا. اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ انسانی نظامِ اعصاب میں کتنی لچک موجود ہے اور کس طرح یہ نظامِ اعصاب ہر ماحول کے تقاضے آسانی سے پورے کرنے کے قابل ہے، دوسرے حیوانوں میں یہ لچک تقریباً ناپید ہے. لمبی تربیت سے دوسرے حیوانوں کو بھی بعض کرتب سکھائے جا سکتے ہیں. مگر ان کے فطری تقاضوں کے رُخ کو نہیں بدلا جا سکتا. مثلاً کتے یا بلی کے بچے کو سیدھے کھڑے ہو کر چلنے کا عادی نہیں بنایا جا سکتا. چار پاؤں پر چلنا ان کی جبلت میں شامل ہے. اس جبلّی تقاضے کو ختم نہیں کیا جا سکتا. لیکن حیوانوں کے مقابلے میں انسانی نظامِ اعصاب لامحدود صورتیں اخذ کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے. اور اس کی یہی لچک اس بات کا مطالبہ کرتی ہے کہ اسے موزوں قسم کی تربیت ملے. غیر موزوں قسم کی تربیت ایسے عادات و اطوار پیدا کر سکتی ہے جو معاشرے کے لیے قابلِ قبول نہ ہوں گے.

اس تجزیے کی روشنی میں یہ نکتہ صاف ہو جاتا ہے کہ انسانیت اور تعلیم و تربیت آپس میں لازم و ملزوم ہیں۔ کوئی انسانی بچہ تعلیم و تربیت سے کورا رہ کر انسانیت کے دائرے میں داخل ہونے کی امید نہیں کر سکتا۔

انسانی تربیت کے معاملے میں ایک اور نکتہ بھی قابل لحاظ ہے۔ بعض حیوانات بھی اپنے بچوں کو تھوڑی بہت تربیت دیتے ہیں۔ مثلاً مرغی ننھے چوزوں کو زمین سے دانے چگنے کا ڈھنگ سکھاتی ہے لیکن دوسرے حیوانات اپنے بچوں کو جو تربیت دیتے ہیں اس کا دائرہ والدین کے ذاتی تجربے تک ہی محدود رہتا ہے۔ مرغی ننھے چوزے کو دانے چگنے کا وہی طریق سکھا سکتی ہے جو اسے خود معلوم ہے، مرغی کو اس بات کی کچھ خبر نہیں کہ مرغیوں کی پہلی نسلیں کون سے طریق استعمال کرتی تھیں۔ اس کے برعکس انسان نے سینکڑوں ہزاروں پشتوں کے قیمتی تجربے جمع کر رکھے ہیں۔ یہ قیمتی تجربے مختلف علوم کے نام سے موسوم ہیں۔ انسان اپنے بچوں کی تربیت محض ذاتی تجربے اور مشاہدے کے دائرے کے اندر محدود نہیں رکھنا چاہتا۔ وہ اپنی اولاد کو نوع انسان کے مجموعی تجربے سے مستفید کرنا چاہتا ہے نتیجہ یہ ہے کہ انسانی بچوں کی تعلیم و تربیت ایک خاصا لمبا، توجہ طلب اور مشکل کام بن جاتا ہے

نئی تعلیم کیا ہے؟

اوپر کی بحث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ تعلیم سے مراد نئی پود کو معاشرتی ترکہ منتقل کرنا ہے۔ ہر بچہ کسی انسانی معاشرے میں پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ معاشرہ ایک مخصوص طرز زندگی اور بعض مخصوص روایات کا حامل ہوتا ہے اور اپنے ہر فرد سے توقع رکھتا ہے کہ وہ اس طرز زندگی اور ان روایات کا حامل ہو۔ والدین کو قدرتی طور پر یہ فکر دامن گیر رہتی ہے کہ اپنی اولاد کو معاشرے کے اچھے اور قابل افراد بنائیں۔ تاکہ انھیں معاشرتی زندگی میں بامعنی مقام حاصل ہو سکے۔ اس اعتبار سے تعلیم کا عمل بالکل اتنا ہی پرانا ہے جتنا کہ انسانی معاشرہ۔ کوئی انسانی معاشرہ خواہ وہ مہذب ہو یا نیم مہذب یا وحشی، اس کے بالغ افراد کو یہ فکر دامن گیر رہتی ہے کہ نئی نسل کو مؤثر زندگی گذارنے کے طور طریقے سکھا دیے جائیں۔ انسان دورِ وحشت میں بھی اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت سے غافل نہیں رہا جب

تعلیم کی اہمیت اور اس کی ضرورت کا یہ حال رہا ہو تو نئی تعلیم کا ذکر کرنے سے کیا مطلب؟ تعلیم اگر ایک ناگزیر انسانی ضرورت ہے اور یہ ضرورت ہمیشہ سے چلی آئی ہے اور ہمیشہ باقی رہنے والی ہے تو اس کے نئے پرانے ہونے کے کیا معنی؟

حقیقت یہ ہے کہ صاحب نظر لوگوں نے تاریخ کے مختلف ادوار میں تعلیم کا جو مفہوم لیا ہے وہ مفہوم کبھی نہیں بدلا۔ ان کے نزدیک تعلیم سے مراد ایسا اجازت دہ اور مواقع سے بھرپور ماحول رہا ہے جو فرد کی سوئی ہوئی صلاحیتوں کو تھپکیاں دے کر جگائے اور انھیں لامحدود بالیدگیوں کی راہ پر لگا دے۔ مگر تعلیم کا یہ بالیدگی خیز مفہوم صرف صاحب بصیرت لوگوں نے ہی لیا ہے۔ بے بصیرت لوگوں نے تاریخ کے مختلف ادوار میں تعلیم کو روایت پرستی کے ہم معنی بنانے کی کوشش کی ہے ان کے نزدیک تعلیم سے مراد یہ رہی ہے کہ نئی نسل کو مروجہ طور طریقوں کا مقلد بنایا جائے خواہ یہ طور طریقے وقتی ضرورتوں کے لیے بیکار ہو چکے ہوں۔ قرون وسطیٰ کی طویل صدیوں میں مغرب اور مشرق دونوں میں میں تعلیم کا یہی مفہوم لیا جاتا رہا۔ یورپ میں تو خیر قرون وسطیٰ کا زمانہ جہالت اور اندھیرے کا زمانہ تھا۔ مگر اسلامی دنیا میں قرون وسطیٰ کا زمانہ جہالت اور اندھیرے کا زمانہ تھا مگر اسلامی دنیا میں قرون وسطیٰ کا ایک بڑا حصہ روشنی اور ترقی پسندی کا زمانہ تھا۔ مسلمانوں نے اپنے دور عروج میں تعلیم کا وہی متحرک تصور اپنے سامنے رکھا جس کی تشریح پیچھے گزری ہے۔ مگر انحطاط شروع ہو جانے کے ساتھ ہی تعلیم کا یہ متحرک تصور بھی آہستہ آہستہ جامد شکل اختیار کرنے لگا اور بالآخر اسلامی دنیا میں بھی تعلیم تقلید اور روایت پرستی کے ہم معنی ہو کر رہ گئی۔ غرض جدید سائنسی زمانے کے آغاز تک مغرب اور مشرق دونوں میں تعلیم کا مقصد نئی پود کو سختی سے پرانی روایات کا مقلد اور پابند بنانا تھا۔

تعلیمی میدان میں یہ جمود انیسویں صدی کے آخر تک باقی رہا۔ مگر موجودہ صدی کے شروع ہونے سے پہلے ہی بعض صاحب نظر مغربی عالم اس صورت حال کا جائزہ لے کر اس پر کڑی تنقید کرنے لگے تھے۔ ان عالموں میں مشہور امریکی ماہر تعلیم جان ڈیوئی پیش پیش تھا جسن اتفاق سے بیسویں صدی کے شروع ہوتے ہی مختلف معاشرتی سائنسوں کے میدان میں ایسے معرکۃ الآرا انکشافات ہوئے

جنھوں نے ترقی پسند ماہرینِ تعلیم کے ہاتھ بے حد مضبوط کر دیے۔ نفسیات اور عمرانیات کے میدانوں میں جو تجربے اور تحقیقی مطالعے ہوئے، انھوں نے ثابت کر دیا کہ تعلم ہمیشہ با مقصد سرگرمی کا نتیجہ ہوا کرتا ہے۔ جبر و اکراہ اور تعلم دو متضاد چیزیں ہیں۔ جبر و اکراہ سے انسانوں کے کسی گروہ پر کیفیات ٹھونسی تو جا سکتی ہے۔ لیکن ان لوگوں کے فکری قوٰی کی نشو و نما نہیں کی جا سکتی۔ ان علمی انکشافات نے تعلیمی دنیا میں ایک ہل چل سی ڈال دی جس پر اتفاق سے موجودہ صدی کی پہلی دہائی میں بنے نامی ایک فرانسیسی طبیب نے تجربوں سے ثابت کر دکھایا ہے کہ ہم عمر بچے ذہنی لحاظ سے ایک سے نہیں ہوتے بلکہ ہم عمر بچوں کے کسی غیر منتخب گروہ میں ذہنی استعداد کے لحاظ سے بین اختلافات موجود ہوتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی بنے نے ذہنی استعداد کی جانچ تول کے لیے ایک ترازو بھی ڈھونڈ نکالا۔ ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ پہلی عالمی جنگ کے آغاز تک صاحب نظر مغربی عالم تعلیم کے عمل کو ایک یکسر بدلے ہوئے نقطہ نگاہ سے دیکھنے لگے اور اس کی اصلاح کے طریقے سوچنے لگے۔

پہلی عالمی جنگ نے تعلیمی اصلاح کی ضرورت کو بڑے واشگاف انداز میں واضح کیا۔ امریکہ اس جنگ میں اس لیے کودا تھا کہ "دنیا کو جمہوریت کے لیے محفوظ بنایا جائے" مگر خود اس ملک کے اپنے بچے جمہوریت کی برکتوں سے محروم تھے۔ کمرۂ جماعت میں عموماً تحکم پسندی اور جبر و اکراہ کی حکمرانی تھی۔ بچوں اور نوجوانوں کی خداداد صلاحیتوں اور ان کے فطری میلانات کا خیال کیے بغیر ان پر طرح طرح کے نام نہاد مضامین ٹھونسے جاتے تھے۔ اور انھیں ان مضامین پر ایک مقررہ درجے تک قدرت حاصل کرنا پڑتی تھی۔ دیکھنے والی آنکھوں کو صاف نظر آ رہا تھا کہ قوم کے سیاسی فلسفے اور اس کے تعلیمی نظریے کے درمیان ایک بہت بڑی خلیج حائل ہے۔ چناں چہ انھوں نے اس خلیج کو پاٹنے کی ٹھان لی۔ اس جہاد میں اولیت کا شرف غالباً کرنل پارکر کو حاصل ہے۔ یہ شخص پہلی عالمی جنگ میں شریک تھا۔ جنگ سے واپسی پر اس نے امریکہ کی نئی نسل کو سچی جمہوری قدروں سے بھرپور فائدہ پہنچانے کا عزم کر لیا اور ایک ایسا مدرسہ جاری کر دیا جہاں مختلف مضامین کی بجائے بچوں کے فطری میلانات اور ان کی دلچسپیوں کو

اولیت دی جاتی تھی، یہ مدرسہ بچوں کو ایک محبت بھرے اور اجانت وہ ماحول میں مختلف قسم کی دلچسپ سرگرمیوں میں لگائے رکھتا تھا، اور ان عملی سرگرمیوں کے ضمن میں ہی انھیں تعلیم دیتا تھا۔ اس تعلیمی تجربے کے نتائج نے رفتہ رفتہ اثر پیدا کرنا شروع کیا۔ ان نتائج کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے لیے کئی لوگ امریکہ کے مختلف حصوں سے کرنل پارکر کے مدرسے میں آئے اور اس کی حیرت انگیز کارکردگی سے گہرا اثر قبول کرکے واپس گئے۔ اثر قبول کرنے والوں میں سے ایک شخص سپرنٹنڈنٹ مدارس بھی تھے انھوں نے یہ تعلیمی تجربہ اپنے تعلیمی ضلع میں جاری کر دیا۔ قدرتی طور پر اس نئے تجربے کی مخالفت بھی ہوئی۔ مگر رفتہ رفتہ مخالفت ماند پڑتی گئی اور والدین اور عوام نئے تعلیمی طریقوں کے قائل ہو گئے۔

رفتہ رفتہ ان نئے تعلیمی طریقوں نے ایک تحریک کی شکل اختیار کر لی اور دیکھتے ہی دیکھتے اس تحریک نے نہ صرف امریکہ بلکہ مغربی یورپ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ دونوں جنگوں کا درمیانی وقفہ ترقی پسند تعلیم یا نئی تعلیم کی تحریک کے شباب کا زمانہ ہے۔ اس تحریک نے دنیا کے ہر حصے میں تعلیمی فکر کو شدید طور پر متاثر کیا اور ہر جگہ پرانے، فرسودہ، اور روایت پرست طریقہ ہائے تدریس کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھا جانے لگا۔

دوسری عالمی جنگ نے جمہوری تصورات کو اور فروغ دیا، اور یہ تصورات ان پسماندہ اور محکوم ملکوں میں بھی عام ہونے لگے، جہاں کے عوام بھی صدیوں سے استبداد اور استحصال کا نشانہ بنے چلے آ رہے تھے۔ اس سیاسی بیداری کے ساتھ ہی ان ملکوں نے نئی تعلیم کو بھی اپنے ہاں خوش آمدید کہا اور اس تحریک کی عالمگیر مقبولیت پہلے سے بھی دوچند ہو گئی۔

نئی تعلیم کی تاریخ پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالنے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ نئی تعلیم فی الحقیقت کوئی ایسی چیز نہیں جس سے دنیا نے پہلے کبھی کام نہ لیا ہو۔ اس تعلیم کے بنیادی اصول نفسیاتی حقائق سے عبارت ہیں، اور دنیا کے عظیم معلموں نے انسانوں کی توجہ بار بار ان حقائق کی طرف مبذول کرائی ہے۔ تاہم جیسا ہم اوپر کہہ آئے ہیں قرون وسطیٰ میں یہ حقائق ایک لمبے عرصے تک دنیا کی نگاہوں سے اوجھل رہے۔ تاآں کہ جدید سائنسی تحقیق نے ان کے چہرے سے

پردہ اٹھا کر انھیں از سر نو زندگی کی تروتازگی بخشی۔

نئی تعلیم اور ہم

نئی تعلیم کی تحریک نے مغرب کے نظام تعلیم میں انقلابی تبدیلی پیدا کر کے رکھ دی ہے۔ بالکل حال ہی تک انگلستان، فرانس، روس اور کئی دوسرے مغربی ملکوں میں بالکل علمی قسم کے نصاب رائج تھے۔ نئی تعلیم کی تحریک امریکہ میں پیدا ہوئی اور اس ملک میں سب سے پہلے پروان چڑھی۔ مگر امریکی مثال نے یورپ کے تعلیمی فکر کو بھی شدید طور پر متاثر کیا اور سائنس اور ٹکنالوجی کی برق رفتار ترقی نے بالآخر برطانیہ، فرانس اور جرمنی جیسے قدامت پسند ملکوں کو بھی مجبور کر دیا کہ اپنے مدرسوں میں خالص علمی نصاب کے پہلو بہ پہلو عملی سرگرمیاں بھی رائج کریں۔

دنیا کے دوسرے ملک بھی نئی تعلیم کی تحریک سے کسی نہ کسی حد تک متاثر ضرور ہوئے ہیں مگر پسماندہ ملکوں میں اس تحریک نے وہ زندہ شکل اختیار نہیں کی جو اس نے مغربی ممالک میں اختیار کی ہے۔ تاہم پسماندہ ملکوں میں بھی یہ احساس بڑھ رہا ہے کہ قومی سربلندی کی منزلیں طے کرنے کے لیے تعلیم کی اشاعت پہلی ضرورت ہے، اور تعلیم مطلوبہ نتائج اسی صورت میں پیدا کر سکتی ہے جب یہ حقیقی معنوں میں ذہن اور فکری قوتوں کی پرورش کرے، دوسرے الفاظ میں نئی تعلیم ہی فی الحقیقت تعلیم کہلانے کی مستحق ہے۔ لیکن نئی تعلیم استادوں، طالب علموں، تعلیمی افسروں، والدین اور عوام سے جس نقطۂ نگاہ اور جس ذہنی کاوش کا مطالبہ کرتی ہے، اس کا پیدا ہونا کوئی آسان کام نہیں۔ پسماندہ معاشروں کی پسماندگی کا اصل سبب ہمیشہ جدوجہد کا فقدان اور جمود ہی ہوا کرتا ہے۔ جہاں یہ معاشرتی امراض صدیوں پرانے ہوں وہاں فکر و عمل کی نئی راہوں کو اپنانا اور انھیں عام کرنا ایک طویل اور صبر آزما کام ہے۔

پاکستان کو وجود میں آئے بارہ سال ہونے کو آئے ہیں، اس عرصے میں یہ شکایت بڑی شدت اور بڑی بلند آوازسے دہرائی گئی ہے کہ ہمارا نظام تعلیم ناقص ہے، اس کی فوری اصلاح ہونی چاہیے شکایت کرنے والوں میں مرکزی وزیروں سے لے کر عام اساتذہ اور والدین تک شامل رہے ہیں

مگر آج تک کوئی شخص یہ نہیں بتا سکا کہ اصلاح کرے کون؟ عوام کا خیال ہے کہ تعلیمی اصلاح کا کام حکومت کو انجام دینا چاہیے۔ بہت سے اساتذہ بھی یہی بات کہتے سنائی دیتے ہیں۔ ادھر حکومت کے ترجمان بار ہا یہ نکتہ دہرا چکے ہیں کہ حکومت کے وسائل محدود ہیں، لہٰذا حکومت تعلیمی میدان میں جو کچھ کرے گی ان محدود وسائل کے اندر رہ کر ہی کرے گی۔ مگر ملک کی تعلیمی ضرورتیں بے شمار ہیں اور ان میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ ان حالات میں عوام اور بالخصوص صاحب ثروت لوگوں کا فرض ہے کہ آگے بڑھیں اور نئی پود کی تعلیم و تربیت کے کام میں حکومت کا ہاتھ بٹائیں۔

اس ضمن میں ایک بے حد قابل لحاظ نکتہ یہ ہے کہ مغرب کے تجربے سے اگر کوئی سبق سیکھا جا سکتا ہے تو یہ کہ نئی تعلیم ایک خود رو تحریک کے طور پر ہی کامیاب ہو سکتی ہے۔ اسے سرکاری دباؤ سے ملک پر ٹھونسا نہیں جا سکتا۔ کوئی چیز تحریک کی شکل اسی وقت حاصل کرتی ہے، جب اسے عوامی پسند کی تائید حاصل ہو۔ حکومت کا حکم عوامی پسند کا بدل نہیں ہو سکتا۔

پرائیویٹ مدارس کے لیے مواقع

قیام پاکستان کے بعد تعلیم کی مانگ اس تیزی سے بڑھی ہے کہ سرکاری مدرسے اس کا ساتھ نہیں دے سکے۔ اس طرح تعلیمی میدان میں جو خلا پیدا ہوا، اسے ایک حد تک پرائیویٹ مدرسوں نے پُر کیا ہے۔ اس میں کلام نہیں کہ ان میں سے بعض مدرسے خالصتہً کاروباری ادارے ہیں جن کا مقصد روپیہ کمانے کے سوا اور کچھ نہیں۔ ان نام نہاد مدرسوں نے تعلیمی معیاروں اور تعلیم کے پاکیزہ تصور کی بڑی مٹی پلید کی ہے۔ اسی لیے بعض لوگوں نے یہاں تک مطالبہ کیا ہے کہ پرائیویٹ مدرسے قانوناً بند کر دیے جائیں اور تمام مدرسے حکومت کے اپنے مدرسے ہوں۔

پرائیویٹ مدرسوں کی بدعنوانیوں کی یقیناً اصلاح ہونی چاہیے۔ لیکن ان کا بند کر دینا بہترین قومی مصالح کے خلاف ہوگا۔ اس لیے نہیں کہ ان کے بند ہو جانے سے ملک کی تعلیمی زندگی میں ایک ایسا خلا پیدا ہو جائے گا جس کا پُر کرنا آسان نہیں۔ بلکہ اس لیے کہ یہ مدرسے بعض ایسی خدمات انجام دے سکتے ہیں جو سرکاری مدرسوں کے بس کی بات نہیں۔ مثلاً نئے تعلیمی تجربے آزمانا ایسا

جراءت عمل کا مطالبہ کرتا ہے، جو سرکاری قواعد و ضوابط کی کڑی حد بندیوں کی تاب نہیں لا سکتی۔ کم از کم مغرب کے تعلیمی تجربے سے یہی سبق ملتا ہے۔ تعلیمی میدان میں نئے تجربے آزمانے اور نئی راہیں ڈھونڈنے کے لیے تعلیمی مقاصد کے ساتھ ایسے لگاؤ کی ضرورت ہے جو جنون کی حد تک پہنچ رہا ہو۔ اس قسم کی وارفتگی سرکاری ملازموں کی بجائے زیادہ تر پرائیویٹ افراد میں ہی تلاش کرنی چاہیے۔ کرنل پارکر اور دوسرے لوگ جنھوں نے امریکہ میں نئی تعلیم کی تحریک کو جنم دیا پرائیویٹ افراد ہی تھے۔ لیکن انھیں جمہوری قدروں کے ساتھ والہانہ عشق تھا وہ اس بات پر تلے ہوئے تھے کہ ان قدروں کی حکمرانی مدرسے کی دنیا میں بھی ہو۔ انھیں یقین تھا کہ ایسا کرنے سے تعلیمی دنیا میں ایک خوشگوار انقلاب پیدا کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اس یقین کے ماتحت انھوں نے خود مدرسے قائم کیے اور اپنے یقین کی معقولیت کا دوسروں کو بھی اس حد تک قائل کر لیا کہ وہ بھی نئے تعلیمی طریقے اپنانے پر رضامند ہو گئے۔

اس قسم کی تعلیمی اصلاح کا دروازہ ہمارے ملک میں بھی کھلا رہنا چاہیے۔ شاید اس سلسلے میں بعض اصحاب کو یہ خیال ہو کہ جو تعلیمی طریقے مغرب میں سودمند ثابت ہو چکے ہیں ان کے متعلق تجربے کرنے کا سوال کہاں پیدا ہوتا ہے۔ ہمیں یہ طریقے مستعار لے کر اپنے مدرسوں میں رائج کر دینے چاہئیں۔ یہ استدلال فی الحقیقت درست نہیں۔ مغرب کے رواج دادہ تعلیمی طریقے بے شک ناقابل انکار نفسیاتی حقائق اور انسانی نشو و نما کے بنیادی اصولوں پر مبنی ہیں۔ مگر ان حقائق اور ان اصولوں کی بنیاد پر تدریسی طریقوں کی جو عمارت مغرب میں کھڑی کی گئی ہے، اس کا سارا ساز و سامان مغربی ماحول سے لیا گیا ہے۔ لہٰذا ہم ان طریقوں کو آنکھیں بند کر کے اپنے یہاں رائج نہیں کر سکتے۔ ہمیں ان کی روح کو یقیناً اپنانا چاہیے، لیکن ان کے لوازمات کی تلاش خود اپنے ماحول میں کرنی چاہیے۔ یہ سلسلے کا سارا کام ابھی کرنا باقی ہے۔ اس کام میں سرکاری مدرسوں کو بھی ضرور حصہ لینا چاہیے۔ مگر جیسا پہلے کہا جا چکا ہے پرائیویٹ مدرسے اس میدان میں زیادہ تیزی سے آگے بڑھ سکتے ہیں۔ چوں کہ تعمیر ملت کے کام میں وقت ایک اہم عنصر ہے، اس لیے پرائیویٹ افراد کی کوششیں اس کام میں خصوصی اہمیت حاصل

کرجاتی ہیں۔

یہ خدمت ملک کا وہ سنہری موقع ہے جو آج اس ملک میں کام کرنے والے پرائیویٹ مدرسوں کو حاصل ہے۔ اس خیال سے ہر محبت وطن شہری کو دکھ ہوتا ہے کہ ہمارے بہت سے پرائیویٹ مدرسوں کو نہ صرف اس سنہری موقع کا کوئی تصوّر ہی نہیں بلکہ وہ بعض اوقات ایسے حربوں پر اتر آتے ہیں جو تعلیم کی صریح ضد ہیں۔ یہ امر بے حد افسوس ناک ہے۔ اس صورت حال کی اصلاح کے لیے حکومت کو ضرور مناسب کاکوئی معیار قائم کرنا چاہیے لیکن اس سے کہیں زیادہ ضروری چیز یہ ہے کہ جو پرائیویٹ مدرسے فی الواقع کوئی بلند نصب العین سامنے رکھتے ہوں، وہ نئی تعلیم کی تحریک کو اپنائیں اور جدید نفسیات اور عمرانیات نے جن حقائق کو سائنسی مسلمات کا درجہ عطا کیا ہے انھیں اپنے کام کی بنیادیں قرار دیں۔ ایسا کرنے سے وہ نئی تعلیم کو ایک تحریک کی شکل دے سکتے ہیں ایک ایسی تحریک جو بہت سے قومی مسائل حل کرنے کا ذریعہ بن سکتی ہیں۔

عملی راہ کیا ہو؟

اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ملک کا سمجھدار طبقہ دیر سے نظام تعلیم کی اصلاح کا خواہاں ہے۔ جوں جوں تعلیم کی مانگ بڑھی ہے۔ اسی شدت سے یہ احساس بھی بڑھتا گیا ہے کہ نظام تعلیم میں بنیادی ردوبدل کیے بغیر اسے قومی مزاج اور آزاد زندگی کی ضرورتوں سے ہم آہنگ نہیں کیا جا سکتا۔ ایسے باعمل افراد بھی ناپید نہیں جو اس میدان میں عملی قدم اٹھانا چاہتے ہیں۔ مگر عوامی ذہن اور باہمت ۔ دونوں اب تک یہ معلوم نہیں کر سکے کہ کام کا آغاز کس طرح ہو۔ دیکھنے والی آنکھ کو نظام تعلیم میں جگہ جگہ خامیاں نظر آتی ہیں اور اصلاح کی راہ قدم قدم پر مشکلوں سے اٹی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ اس صورت حال سے بددل ہو کر اصلاح کا ہر مطالبہ عموماً تان اس بات پر توڑ دیتا ہے کہ تعلیمی اصلاح کا عظیم الشان کام صرف حکومت ہی انجام دے سکتی ہے، عوام اس بارے میں تقریباً کچھ نہیں کر سکتے۔

اس قسم کا خیال دراصل جمہوری معاشرے کے بنیادی اصولوں کے منافی ہے۔ تعلیم کا کا

نئی نسل کو معاشرتی زندگی سے ہم آہنگ کرنا ہے۔ بے شک ملکی حکومت معاشرے کی نمائندہ ہوا کرتی ہے۔ مگر ایک رفاہی ریاست میں بھی حکومت کے ذمے زیادہ تر وہی امور ہوتے ہیں۔ جو سرکاری اہتمام کے بغیر انجام نہ پا سکتے ہوں۔ جمہوری معاشروں میں تعلیم ایسے امور کی فہرست میں شامل نہیں۔ وجہ یہ کہ مؤثر تعلیم وہی ہے جو گردو پیش کی زندگی سے لگاتار اثر قبول کرتی ہے۔ جو امور سرکاری ہاتھوں میں چلے جائیں ان کے متعلق کھٹکا پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ گردو پیش کے حالات سے بے تعلق نہ ہو جائیں۔ جمہوری معاشرے اس خطرے سے ہر قیمت پہ بچنا چاہتے ہیں۔ لہٰذا وہ تعلیم کی باگ ڈور سرکاری ہاتھوں میں دیکھنا پسند نہیں کرتے وہ تعلیمی میدان میں سرکاری امداد اور رہنمائی کی توقع ضرور رکھتے ہیں۔ مگر تعلیم کو کلی طور پہ ایک سرکاری ذمہ داری نہیں بننے دیتے۔

غلامی کے دور نے جو بہت سی ناپسندیدہ روایات باقی چھوڑی ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ تعلیم پورے طور پہ حکومت کی ذمہ داری ہے۔ آزاد جمہوری زندگی میں اس روایت کا خاتمہ ہو جانا چاہیے۔

اس کی ایک مفید اور قابل عمل صورت یہ ہے کہ وہ پرائیویٹ مدرسے جو تعلیمی اصلاح میں یقین رکھتے ہیں باہم مل کر باہم مل کر ایک وفاق کی صورت اختیار کر لیں۔ وہ اپنی اپنی جگہ آزاد ہوں، مگر تعلیمی تجربے کرنے اور ان کے نتائج سے فائدہ اٹھانے کے لیے ان کے درمیان یگانگت کا رشتہ موجود ہو۔ تاکہ یہ اہم تعلیمی خدمت انجام دینے کے لیے ان کے وسائل بڑی حد تک یکجا ہو سکیں اور وہ خود اعتمادی کی فضا میں نصاب اور طریقہ ہائے تدریس میں ایسی تبدیلیاں پیدا کر سکیں جو انہیں قومی مزاج اور ملکی ضرورتوں سے قریب تر لانے کے ضامن ہوں۔ اس قسم کا وفاق نئی تعلیم کو ایک زندہ تحریک کی شکل دے سکتا ہے۔ وہ اسے ایک نظری شے کی بجائے ایک مفید اور موزوں لائحہ عمل کی شکل دے سکتا ہے۔

ترقی یافتہ جمہوری ملکوں کی تاریخ پہ نگاہ ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ ان ملکوں میں پرائیویٹ

ی اداروں نے سابقین اولین کا کردار ادا کیا ہے۔ انگلستان کے پبلک سکول جنھوں نے سالہا سال
سے اس ملک کو راہنما مہیا کیے پرائیویٹ مدرسے ہی ہیں۔ صرف یہی نہیں، انگلستان کی شہرہ آفاق
یونیورسٹیوں کا آغاز بھی پرائیویٹ تعلیمی اداروں کے طور پر ہوا تھا۔ بالکل یہی حال امریکہ کی مشہور
یونیورسٹیوں کا ہے۔ امریکہ میں اس وقت بیسیوں یونیورسٹیاں ہیں، مگر کولمبیا، ہارورڈ، پرنسٹن
یل، وغیرہ، ان میں سرفہرست ہیں۔ اور یہ تمام پرائیویٹ یونیورسٹیاں ہیں۔ ان کی ابتدا معمولی
تعلیمی اداروں کے طور پر ہوئی۔ مگر انھوں نے قرب وجوار کے تعلیمی اداروں کے اشتراک عمل سے اپنے
دائرہ کار کو وسیع کرنا شروع کیا اور رفتہ رفتہ ملک کی تعلیمی زندگی میں وہ مقام حاصل کر لیا جو سرکاری تعلیمی
اداروں کو بھی نصیب نہ ہو سکا۔

یہ درست ہے کہ ہمارے پرائیویٹ مدرسے عام طور پر سخت مشکلات سے دوچار ہیں، ان کے
وسائل محدود ہیں جس کے باعث ان کی کئی ضرورتیں عموماً تشنہ رہ جاتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ان میں بعض
مدرسے اگر تعلیمی اصلاح کا آغاز کرنا بھی چاہیں تو اپنے آپ کو بڑی حد تک بے بس پاتے ہیں۔ مگر باہمی
تعاون سے ان دشواریوں پر کافی حد تک قابو پایا جا سکتا ہے۔ ایک ہی نواح میں واقع پرائیویٹ مدرسے
اپنے وسائل یکجا کر کے اپنی تدریس کی تاثیر کئی گنا بڑھا سکتے ہیں۔ وہ اساتذہ کے باہمی تبادلے
کر سکتے ہیں، اور ایک دوسرے کی تعلیمی سہولتوں سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ غرض پرائیویٹ مدرسوں
کی وفاقی تنظیم اپنے اندر بہت سے امکانات رکھتی ہے جن سے بآسانی فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

اُردو رسم الخط کی تبدیلی کا مسئلہ

(مسلسل نمبر۲)

شیخ اصغر علی

رومن کے سہل ہونے میں اس کے حروف کا الگ الگ لکھے جانا دلیل کے طور پر پیش کیا جاتا ہے حالاں کہ اس کے پڑھنے میں وقت زیادہ لگتا ہے اور پڑھنے میں دقت بھی ہوتی ہے۔ اردو کا موجودہ خط ان دونوں عیوب سے پاک و مبرا ہے۔ حروف اور الفاظ کا وصل اسی حد تک روا رکھا جاتا ہے جہاں تک پڑھنے میں سہولت باقی رہتی ہے۔ لفظ کا ایک سرا اور اس کا جوڑ فوراً پورے لفظ کی طرف اشارہ کر دیتا ہے۔ تجربہ شاہد ہے کہ اردو کی کتابیں۔ سلائڈیں اور اشتہارات ہم انگریزی یا رومن کی نسبت جلد پڑھ جاتے ہیں۔ اس سے حافظے پر بار کم پڑتا ہے اور قرأت میں روانی پیدا ہوتی ہے۔

رومن رسم خط اپنانے سے تعلیم میں بعض لاینحل دقتوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ہم صوت لیکن مختلف المعانی الفاظ کو ایک ہی طرح لکھنا پڑے گا۔ پھر الم اور علم "ALAM" بن کے رہ جائیں گے اور پڑھنے والا غلطی سے اسے عالم بھی پڑھ لے گا۔ ثواب، اور صواب۔ آم اور عام، سہی اور صحیح۔ سدا، اور صدا، سینکڑوں ہی ایسے الفاظ ہوں گے جن کے معانی سیاق و سباق کی مدد کے بغیر سمجھ میں نہیں آئیں گے اور اس رہنمائی کے بعد بھی شاید یہ مشکل حل نہ ہو سکے۔ اردو کے مختلف ہجوں سے لکھے جانے والے الفاظ فوراً اپنے مادوں کا پتہ دیتے ہیں اور معانی کا بھید یک لخت کھل جاتا ہے۔ موجودہ خط افہام و تفہیم کی منزل کا راستہ ہموار کر دیتا ہے۔ رومن میں صدہا الفاظ اپنا اصل لفظ کھو بیٹھیں گے۔ انگریزی ہی کے اثر سے تانگہ ٹانگہ ہو گیا ہے اور تاتا۔ ٹاٹا۔

اب رہا خواندگی اور ناخواندگی کا مسئلہ۔ جب یہی ثابت نہیں ہو سکا کہ رومن کا سیکھنا اردو کے سیکھنے سے سہل ہے تو خواندگی کیسے عام ہو گی۔ ہاں یہ ضرور ہو گا کہ اس خط کے اپنانے سے خواندہ حضرات (وہ پڑھے لکھے جو صرف اردو رسم خط سے واقف ہیں) ناخواندہ افراد کی

صف میں شامل ہو جائیں گے۔ اور جب تک یہ رسم خط نہ سیکھ پائیں گے ناخواندہ ہی رہیں گے گویا اس اقدام سے خواندگی کی ترقی، ترقی معکوس ہوگی۔ موجودہ اُردو خط، رومن کی نسبت خواندگی کی اشاعت میں زیادہ مفید ہے۔ اس لیے کہ یہ خط اور قرآن مجید کا خط تقریباً ایک ہے۔ قرآن مجید پڑھنا مسلمانوں پر فرض ہے۔ اور اس کی تعلیم کا گاؤں گاؤں انتظام ہے۔ وہ مرد اور عورتیں جو ناظرہ قرآن مجید پڑھ سکتے ہیں بآسانی اردو پڑھنا سیکھ سکتے ہیں۔ اور پڑھنے کے ساتھ ساتھ لکھنا بھی رومن کے نفاذ کے بعد یا انھیں دونوں رسم خط سیکھنے ہوں گے۔ یا پھر ایک زبان کی قرارت سے بے بہرہ رہنا ہوگا۔ ناخواندگی رسم خط کے بدلنے سے نہیں بڑھے گی۔ جہالت کا تعلق محض رسم خط سے نہیں ہے بلکہ اس کے انسداد کے لیے ہمیں تعلیم بالغاں کے مراکز میں اضافہ کرنا ہوگا۔ مفت اور لازمی تعلیم کا انتظام کرنا ہوگا۔ سستی اور عمدہ کتابیں فراہم کرنا ہوں گی۔ بنیادی ذخیرہ الفاظ کی فہرست تیار کرنا ہوگی، تعلیم کو دلچسپ بنانا ہوگا اور اشاعت تعلیم کے مرغوب حربے یعنی فلم، ریڈیو اور سلائیڈوں کو کام میں لانا ہوگا۔ ترکی کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ آج بھی اس کی خواندگی کی شرح ۳۶ فی صد سے زائد نہیں، اور اس شرح میں بھی جو اضافہ ہوا وہ رسم خط کا مرہون نہیں بلکہ اس میں دوسری کوششوں کو دخل ہے، جو اشاعت تعلیم کے سلسلے میں کی گئیں۔ ترکی کے عوام پر ایک اثر ضرور ہوا کہ وہ دین کے سرچشمے عربی سے بہت دور ہو گئے۔ ان کی اذانیں اور ان کی نمازیں بھی ترکی میں ہونے لگیں۔ وہ ترکی میں قرآن مجید کے تراجم تو پڑھ لیتے ہیں، لیکن اصل متن سے جس کا پڑھنا مسلمانوں کے لیے موجب ثواب اور باعث برکت بلکہ لازمی اور ضروری ہے، محروم ہو گئے۔

دوسری دلیل جس کا اوپر ذکر ہوا، علم اللسان کے نقطہ نظر سے بھی اس کے نقصان پر دلالت کرتی ہے۔ بنگالی اور اردو دونوں کو رومن میں لکھنے سے نئی زبان پیدا نہ ہوگی۔ فارسی اور عربی کا نہ صرف ایک رسم خط ہے بلکہ فارسی میں عربی کے بے شمار الفاظ بھی موجود ہیں۔ لیکن دونوں زبانیں اپنے تاریخی، مذہبی اور ثقافتی روابط کے باوجود دو الگ الگ زبانیں ہیں۔ اور ایک کی تحصیل سے دوسری زبان خود بخود نہیں آجاتی۔ فارسی کا عالم عربی بول اور لکھ نہیں سکتا۔ اسی طرح عربی کا عالم فارسی سے ناآشنا

رہتا ہے۔ تاآں کہ وہ فارسی کو بحیثیت ایک زبان نہ پڑھے۔ انگریزی اور فرانسیسی کا رسم خط ایک ہے لیکن ان دونوں کے اتحاد سے کوئی نئی زبان پیدا نہیں ہوئی۔ دور کیوں جائیں انگلستان ہی میں ویلز کی زبان انگریزی سے مختلف ہے۔ اردو اور بنگالی نئے رسم خط کو اپنانے کے بعد بھی دو الگ الگ زبانیں رہیں گی۔ نئی زبان کی پیدائش کا عمل غیر شعوری اور فطری ہوتا ہے اور اس عمل میں صدیاں گزر جاتی ہیں۔ زبانیں محض رسم الخط کے اتحاد سے نہیں بلکہ مختلف بولیاں بولنے والے افراد کے میل جول سے پیدا ہوتی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ مختلف بولیوں کے ملاپ سے ہر بولی کچھ اثرات تو قبول کر لے لیکن نئی زبان جنم نہ لے۔ زبان کی تخلیق کے معاملے میں انسان کی شعوری کوششیں کارگر ہوئی ہیں نہ ہو سکتی ہیں۔ انگریزی، فرانسیسی اور عربی کا سکہ ہر جگہ چلتا ہے۔ لیکن بچاری اسپرانٹو کو اب کوئی جانتا بھی نہیں۔ جو انسان سنگترے کی بجائے رنگترہ رائج نہ کر سکے وہ نئی زبان کیوں کر معرض وجود میں لا سکتا ہے؟ نئی زبان پیدا کرنے کی نسبت بنگالیوں کے لیے اردو سیکھنا اور مغربی پاکستان کے باشندوں کے لیے بنگلہ سیکھنا یقیناً سہل کام ہے۔ اردو اور بنگلہ کو ویسے قریب لانا چاہیے۔ رسم الخط کے ذریعے انہیں قریب لانے کا سمجھوتہ تو ایسا ہے جیسا ہندی اور اردو کے لیے پیش کیا گیا تھا۔ یعنی اگر ہندی کو اردو اور اردو کو ناگری رسم خط میں لکھنا گوارا نہیں تو چلو دونوں کو لاطینی میں لکھیے۔

تیسری دلیل یہ کہ اس کے اختیار کرنے سے طلبہ کا دوسری زبانیں سیکھنے کا کام آسان ہو جائے گا محل نظر ہے۔ اس دلیل کے پیش کرنے والے دوستوں کے ذہن میں یقیناً تیسری زبان اگر فارسی یا عربی یا کوئی اور ایسی زبان ہو جو رومن خط میں نہیں لکھی جاتی تو اس سے کام میں سہولت تو کجا دقت پیدا ہو گی۔ اور یہ بات بھی سند کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی کہ اس ملک میں انگریزی کا سکہ تا ابد چلتا رہے گا۔ اور یہ مدارس میں اسی طور رائج رہے گی جس طرح کہ آج ہے۔ ہو سکتا ہے کہ رومن رسم خط میں اردو پڑھا لکھا انسان انگریزی نسبتاً سہولت سے سیکھ لے۔ لیکن یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ جب ایک رسم خط دوسری زبان کے لیے اختیار کیا جاتا ہے تو اس میں اس قدر تبدیلیاں واقع ہو جاتی ہیں کہ اس سے اس خط میں لکھی جانے والی زبان کی تحصیل میں کوئی خاص

فائدہ نہیں ہوتا۔ ماسوائے اس کے کہ دونوں زبانوں میں رسم خط کے علاوہ ذخیرہ الفاظ، گرامر کے اصولوں اور دوسری جزئیات میں اشتراک ہو۔ اس تبدیلی میں کچھ حروف بے فائدہ سمجھ کر چھوڑ دیے جاتے ہیں۔ کچھ نئے حروف اختراع کر لیے جاتے ہیں۔ کچھ حروف اپنی آواز بدل لیتے ہیں کچھ آوازیں نئے سانچوں میں ڈھل جاتی ہیں۔ لب ولہجہ۔ صوتی تغیرات۔ علاقائی اثرات یہ سب مل کر زبان اور اس کے رسم خط کو وہ رنگ بخشتے ہیں کہ اسی رسم خط میں لکھی جانے والی زبان کا اپنی دوسری ہم خط زبانوں سے کوئی خاص علاقہ اور تعلق نہیں رہتا۔ آج انگریزی فرانسیسی، اطالوی، ترکی، جرمن، روسی لاطینی سب ایک ہی رسم خط میں لکھی جاتی ہیں۔ لیکن کیا ان کے تلفظ میں، حروف تہجی میں، آوازوں میں اختلاف نہیں۔ لفظ 'V' کو دیکھیے، انگریزی میں 'و' اور جرمن اور روسی میں 'ف' کی آواز دیتا ہے۔ R فرانسیسی میں 'غ' کی طرح بولا جاتا ہے اور G اسی زبان میں 'ی' کی طرح۔ T انگریزی میں 'ٹ' لیکن فرانسیسی میں 'ت' کی آواز دیتا ہے۔ H اطالوی میں 'ک' کی آواز پیدا کرتا ہے حالاں کہ انگریزی میں کبھی ساکن اور کبھی 'ح' کی طرح بولا جاتا ہے۔ علیٰ ہذالقیاس 'C' اطالوی میں 'چ' اور ترکی میں ک کی آواز دیتا ہے۔

ماہرین لسانیات کی متفقہ رائے ہے کہ تحصیل زبان۔ عادات لسانی پیدا کرنے سے عبارت ہے اور ہر زبان آوازوں، تلفظ، بول چال اور روزمرہ کے اعتبار سے ایک دوسرے سے اتنی مختلف ہوتی ہے کہ ہر زبان کے سیکھنے کے لیے نئی عادات لسانی پیدا کرنی پڑتی ہیں۔ مادری زبان میں سیکھی ہوئی عادات کو بھولنا اور نئی زبان کی عادات پیدا کرنا، اسی میں کامیابی کا راز ہے۔ انگریزی اور اردو رسم الخط کی وحدت کے باوجود بھی دوسرے تمام اعتبارات سے ایک دوسرے سے اس قدر مختلف ہیں کہ تحصیل اردو کے بعد تحصیل انگریزی آنا ہی کٹھن کام رہے گا جتنا آج ہے۔ بلکہ ہماری ناقص رائے تو یہ ہے کہ یہ مہارت جو رومن اردو میں حاصل ہوگی تحصیل انگریزی کے راستے کو ناہموار کردے گی۔ اس لیے کہ انگریزی پڑھتے وقت اسی انداز میں لکھے اور پڑھے ہوئے اردو الفاظ غیر شعوری طور پر ذہن میں آتے رہیں گے۔ اردو الفاظ کا بصری تصور ذہن میں اس قدر راسخ ہوگا

کہ شروع شروع میں مبتدی کو ان کا بولنا اور نئے لفظ اور ان کا تلفظ سیکھنا مشکل ہو جائے گا۔ ایک فائدہ جو نظر آتا ہے وہ خط سے متعلق ہے۔ ہو سکتا ہے کہ لڑکے پہلے سے خوش خط لکھنے لگیں لیکن اس کا تعلق مشق، مہارت اور رجحان طبع سے ہے۔ یہ اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ جن کا اردو کا خط اچھا ہوتا ہے وہ انگریزی بھی خوب صورت لکھتے ہیں۔ اور بہتیرے جو انگریزی کے سوا کوئی دوسرا خط نہیں سیکھتے بہت بُرا لکھتے ہیں۔ لیکن اگر اس فائدے کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو پھر بھی یہ سودا مہنگا پڑے گا۔ سو نقائص کے عوض ایک فائدہ حاصل کرنا خلاف عقل اقدام ہے۔ ثانوی زبان کی تحصیل میں آسانی پیدا کرنے کے لیے قومی زبان کے فوائد کی قربانی قرین مصلحت نہیں۔ ثانوی زبان ایک فی صد افراد بھی نہیں سیکھتے۔ جبکہ قومی زبان کا سیکھنا سب پر لازم آتا ہے۔ اقلیت کی خاطر اکثریت کو مشکلات میں پھنسانا ناروا ہے۔

چوتھی دلیل کہ رومن کے اپنانے سے اردو کا وقار بڑھ جائے گا اور یہ مغربی زبانوں کے ہم پلہ ہو جائے گی خوش فہمی پر مبنی ہے۔ کسی زبان کا وقار صرف اس کے رسم خط میں پوشیدہ نہیں ہوتا۔ بہتیری زبانیں لاطینی ہی میں لکھی جاتی ہیں لیکن لوگ سیکھتے ہیں تو انگریزی یا فرانسیسی یا جرمن۔ زبان کے وقار کو بلند کرنے کے اور ذرائع ہیں۔ اردو کے ادب العالیہ کو دوسری زبانوں میں ترجمہ کے ذریعے پہنچائیے۔ اپنی زبان کے کارناموں اور شاہکاروں سے دوسروں کو متعارف کرائیے علمی و ادبی شہ پارے تخلیق کیجیے۔ اس زبان میں وہ بات پیدا کیجیے کہ لوگ خود کھنچے چلے آئیں عربوں نے یونانی کیوں سیکھی؟ اہل فارس کو عربی پڑھنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ یورپ والے عربی اور فارسی کے کیوں مرہون منت رہے۔ آج سعدی۔ حافظ اور عمر خیام کے کارنامے یورپ کی کس زبان میں موجود نہیں؟ کلیلہ و دمنہ سنسکرت سے نکل کر ہر زبان میں کیسے جا پہنچی۔ انگریزی کا ابن ہالا کیوں کر ہوا؟ اردو کے محسن و مربی گارساں دتاسی اور ڈاکٹر گلکرائسٹ کہاں سے آئے؟ میجر ظفر اللہ کرنل ہالرائڈ کو اردو سے لگاؤ کیوں کر پیدا ہوا؟ اس وقت بھی اردو اسی خط میں لکھی جاتی تھی۔ یہ زبان آج بھی مؤقر ہے۔ آج بھی باہر والوں کی نظر میں یہ کچھ کم رتبہ نہیں ہے۔ یو۔ این او کی زبانوں کی

فہرست میں اس کا پانچواں نمبر ہے۔ آج بھی کلامِ اقبال کے دوسری زبانوں میں تراجم ہو رہے ہیں انگریزی، عربی، اطالوی وغیرہ میں علامہ کی بعض کتابوں کے ترجمے ہو چکے ہیں۔ اگر ہم مزید کوشش کریں تو اس کی قدر و منزلت میں اور بھی اضافہ ہو سکتا ہے بشرطیکہ ہم ان راہوں پر چلیں جو زبان کو بامِ عروج تک لے جانے کی راہیں ہیں۔ اور زبان کو ان خطوط پر چلائیں جو اس کے معراج کی ضامن ہیں۔ زبان کی تو تیر اس کو بولنے والی قوم کی تو تیر سے وابستہ ہوا کرتی ہے۔ زبانیں قوموں سے بنتی ہیں اور قومیں زبانوں سے، جو قوم مر جاتی ہے ان کی زبان، ثقافت، ان کا ادب سب تعرِ گمنامی میں چلے جاتے ہیں۔ چینی آج زندہ ہے۔ اس کی زبان اپنی خامیوں اور کوتاہیوں کے باوجود زندہ ہے۔ اسرائیل نے جب سے جنم لیا ہے، عبرانی کے قالب مردہ میں نئی روح دوڑ گئی ہے جاپانی رسم الخط کی خرابیوں کے باوجود زندہ ہے۔

ہندوستان کی آزادی کے بعد بھاشا اور سنسکرت ایسی بھولی بسری زبانیں پھر اپنی اصلی حالت پر لوٹ آئی ہیں۔ اور پھر اردو کو صرف مغرب میں زندہ کرنا مقصود نہیں، اسے مشرق میں بھی مقبول بنانا ہے۔ اور مشرق اس وقت نسخ کی لپیٹ میں ہے نہ کہ رومن کی۔

آخری دلیل جو ہم اوپر نقل کر آئے ہیں کہ رسمِ خط کی تبدیلی غیر ملکیوں کو اردو سیکھنے پر آمادہ کرے گی، قابلِ التفات نہیں۔ کون سے غیر ملکی؟ کیا افغان بھائی اور ایرانی دوست اسے رومن میں لکھا دیکھ کر خوش آمدید کہیں گے؟ کیا بھارت اسے نئے روپ میں دیکھ کر اسے پھر سے سینے سے لگالے گا؟ کیا برمی، سیامی، چینی، تبتی، ملائی، انڈونیشی سب رومن کے دلدادہ ہیں، جو انھیں رومن کے ذریعے اردو سیکھنے کی تشویق ہو گی؟ باقی رہے اہلِ مغرب، تو جب انگلستان والوں کو اردو سیکھنا تھی تو وہ استاد رکھ کر اسے باقاعدہ پڑھا کرتے تھے۔ بعض انگریزوں نے تو یہاں تک مشق بہم پہنچائی کہ اردو میں شعر و شاعری کا بھی شوق فرمانے لگے۔ اب بھی جو اردو سیکھنے کا متمنی ہے وہ اسے ہر حال میں سیکھے گا۔ اہلِ انگلستان نے ہندوستانیوں کو انگریزی سکھانے کے لیے اپنا رسمِ خط نہ بدلا۔ ہم انھیں اردو سکھانے کے لیے اپنا خط بھلا دیں۔ یہ کیوں کر ممکن ہے؟

یہ تھے دلائل اور ان کے جوابات۔ اب کچھ حقائق ملاحظہ فرمائیے۔ رسم خط کی اس تبدیلی کا سب سے بڑا اور سب سے بُرا اثر ہمارے ادبی، علمی، مذہبی اور ثقافتی سرمائے پر ہوگا۔ نئی کتابیں تو ہم رومن میں چھاپ ہی لیں گے۔ پرانی کتابوں کا کیا ہوگا؟ کیا وہ نئی نسل کے لیے ایک چیستان یا معمے سے کچھ زیادہ وقعت کی مالک ہوں گی؟ قرآن مجید کے تراجم اور تفسیریں، فلسفے اور منطق پر ضخیم کتابیں، شعرا کے دواوین اور کلیات۔ داستان گوؤں کی داستانیں۔ نقادوں کے تنقیدی کارنامے۔ تذکرہ نگاروں کے تذکرے۔ مؤرخوں کی تاریخیں۔ تمام علوم و فنون پر لکھی ہوئی کتابیں۔ انجمن ترقی اردو، دارالترجمہ حیدرآباد، دارالمصنفین اعظم گڑھ اور ادارۂ ثقافت اسلامیہ، ایسے اداروں کی علمی و ادبی تحقیقات کیا الماریوں کی زینت بن کر رہ جائیں گی۔ کیا ہماری نسل ان سے بیگانہ ہو جائے گی، اور یہ سب کچھ ان کے لیے گلدستہ طاق نسیان بن جائے گا۔ یہ سارا سرمایہ رومن میں کیوں کر منتقل ہوگا؟ آج ایک شاعر کا دیوان چھاپنے کو کوئی ناشر تیار نہیں ہوتا۔ سینکڑوں دیوان اور کلیات کون چھاپے گا؟ جہاں محقق کو اپنا تحقیقی مقالہ اپنے مصارف سے چھپوانا پڑے وہاں نایاب کتابوں کو کون شائع کرے گا؟ اس میں تو ترکی کو بھی ناکامی ہوئی۔ پاکستان کیوں کر کامیاب ہوگا؟ اور اگر ان سب تک رسائی کے لیے اردو رسم خط بھی سیکھنا پڑا تو خط کی تبدیلی کا فائدہ؟

اردو کا عربی اور فارسی سے صدیوں کا ساتھ ہے۔ اردو کا تغذیہ انہی دو زبانوں سے ہوا ہے علوم کے سارے سوتے انہی دو زبانوں سے پھوٹے۔

کیا تبدیلی خط سے یہ رشتہ تو نہ چھوٹ جائے گا؟ اگر دریا اپنے سرچشموں سے کٹ جائے تو اس کا سوکھ جانا یقینی ہے۔ آج اصطلاحات سازی۔ نئے الفاظ ڈھالنے۔ اصول مرتب کرنے غرض ہر معاملے میں ہم فارسی اور عربی سے استمداد کرتے ہیں۔ اردو ہر قدم پر فارسی کی مرہون رہتی ہے۔ اس کی شاعری اُس کی شاعری کی۔ اس کا ادب اس کے ادب کا غرض کہ اس کا انگ انگ اور اس کی رگ رگ اس کی احسان مند ہے۔ رسم الخط کی تبدیلی کے بعد اگر ہم فارسی اور عربی سے بے بہرہ ہو گئے تو اپنی زبان کا کیا حشر ہوگا؟

عربی ہماری مذہبی ضرورت ہے۔ اگر رومن کے بعد عربی رسم خط نہ سیکھا تو مذہب کا خدا حافظ! قرآن مجید کا پڑھنا ناممکن۔ اور اگر رومن کے ساتھ ساتھ عربی خط بھی سیکھا تو پھر خط بدلنے سے سراسر نقصان کہ ہر وہ شخص بھی جس کا مقصد انگریزی سیکھنا نہیں۔ دو خطوں میں الجھ جائے گا، اور دو گونہ بوجھ تلے دب جائے گا۔ تعلیم میں سہولت کیا ہوئی مصیبت بن گئی۔

رسم خط کی تبدیلی تعلیمی دنیا میں انحطاط کا موجب ہوگی۔ علمی ترقی کے میدان میں ہمیں اسوقت تک رکے رہنا ہوگا، جب تک ہم اس خط کے تمام معائب کو دور نہ کرلیں، اور اس میں اپنے کام کو چلانے کے لیے ضروری سرمایۂ کتب بہم نہ پہنچالیں۔ اور ایک غریب ملک کے لیے اتنا بڑا انقلاب برپا کرنا سہل نہیں۔

آج جبکہ ہم ذریعہ تعلیم بدل دینے کا ارادہ رکھتے ہیں ہماری قومی زندگی میں اردو کا عمل دخل معمولی بالا چاہتے ہیں۔ دفتروں اور عدالتوں میں اردو کو لانا چاہتے ہیں۔ اس تبدیلی سے یہ سارے کام رک جائیں گے۔ ہماری توجہ اس کام سے ہٹ کر رسم خط میں لگ جائے گی اور یہ سارے تعلیمی منصوبے دھرے کے دھرے رہ جائیں گے۔

اردو شاعری میں تاریخی قطعات کا ایک خاص مقام ہے۔ شاعروں، ادیبوں، قومی رہنماؤں کے سن وفات کی ابدی یادگاریں، تاریخی عمارات کے سن تعمیر کے جاودانی نقوش حروف ابجد کے مٹتے ہی معدوم ہو جائیں گے۔ نہ حروف رہیں گے نہ حساب جمل۔ انشاء اللہ خیر صلّا! اردو شاعری میں کبھی سہی اور ٹھیک کے قافیے کو درست مان لیتے تھے۔ اور کبھی اس قسم کی بے اعتدالیاں ہمارے ابتدائی دور میں جائز سمجھی جاتی تھیں۔ ہمارے اسلاف نے بڑی محنت اور بڑے ریاض سے زبان کو تراش خراش کے صاف کیا۔ زبان کی ثقالت کو دور کیا۔ ردیف و قافیے کے قاعدے مقرر کیے۔ رومن خط اس سارے کیے پر پانی پھیر دے گا۔ پھر سے وہی نقائص جلوہ نما ہوں گے۔ لفظی صنعتوں کا کمال جو ہمارے شعرا کے فن کی معراج سمجھا جاتا رہا ہے۔ اب کوڑیوں کے مول بکے گا۔ فارسی! عربی کی تمی اور پرانی کتابوں، رسائل اور اخبارات سے کوئی تعلق باقی نہ رہے گا۔ عیسائی شہ

تبلیغ کے لیے رومن رسم الخط کو اپنایا لیکن کامیابی نہ ہو سکی۔ آخر اسے غیر مفید پا کر ترک کیا اور اس کے بجائے اردو رسم خط میں اپنا تبلیغی لٹریچر شائع کیا۔ اور آج اسی رسم خط میں ان کی تمام مذہبی کتب شائع کی جاتی ہیں۔ اس تجربے کو دہرانے کا فائدہ ؟

ہمسایہ ممالک سے روابط استوار کرنا، دور حاضر کی سیاست کا اہم تقاضہ ہے۔ ہمسایہ ممالک سے مادی، معنوی، تجارتی، اقتصادی تعلقات بڑھانا قومی زندگی کی بقا کے لیے ضروری ہے۔ قریب ترین ہمسایوں میں سے ایک طرف بھارت ہے جہاں رسم خط ناگری ہے یا پھر اردو۔ افغانستان اور ایران میں نسخ رائج ہے۔ سعودی عرب، شام، عراق، لبنان، سواحل خلیج، فارس، تبت، چین، جاپان، افریقہ کہیں بھی لاطینی خط رائج نہیں ہے۔ خود پاکستان مختلف بولیوں اور زبانوں کا گھر ہے پشتو، پنجابی، سندھی، بلوچی، بنگالی کوئی ایک بھی رومن میں نہیں لکھی جاتی۔ اردو کے لیے اگر رومن خط اختیار کر لیا گیا تو یہ زبان اپنی زبانوں سے دور ہو جائے گی۔ یا تو ان زبانوں کے لیے رومن اختیار کرنا ہوگا ورنہ دونوں رسم خط سیکھنے ہوں گے۔

ملک کے پڑھے لکھے لوگوں کی رائے اگر کچھ وقعت رکھ سکتی ہے تو یقیناً موجودہ رسم خط کو نسخ اور نستعلیق دونوں صورتوں میں بحال رکھنا ہوگا۔ بنگال سے جو خبریں آ رہی ہیں وہ رومن کے لیے حوصلہ افزا نہیں ہیں۔ مغربی پاکستان کے لوگ بھی موجودہ خط ہی کے حامی ہیں۔ اردو کانفرنس لاہور میں منظور شدہ واضح قرارداد میں اسی خط کی حمایت کی گئی ہے۔ یہی صورت حال کراچی اور دوسرے بڑے شہروں میں ہے کیا عوام اور کیا خواص سب نسخ کے دلدادہ اور اسی خط کے متمنی نظر آتے ہیں۔

اردو ایک مخلوط زبان ہے۔ اس کا موجودہ رسم خط بھی مخلوط ہے جس میں فارسی۔ عربی۔ ہندی، تمام زبانوں کے حروف اور آوازیں موجود ہیں۔ اور ان تمام زبانوں کے الفاظ ادا کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ تبدیلی خط سے زبان کی ماہیت بدل جائے گی۔ شیرینی و لطافت کی بجائے ثقالت جگہ پائے گی۔ قاعدے اور قانون بے راہروی کا شکار ہو جائیں گے تحقیق و تجسس کی راہیں مسدود ہو جائیں گی۔ الفاظ کے مادوں سے ہم دور ہو جائیں گے یا الفاظ کے اصل معانی سے لاعلم ہو جائیں گے۔ یہاں شرقیت کی

برطانیہ کا نظامِ تعلیم

محمد عبدالعزیز

تاریخی پس منظر

برطانیہ کا موجودہ نظامِ تعلیم صدیوں کی شکست وریخت کا نتیجہ ہے تعلیمی تجربوں کا جو سلسلہ سنہ ۱۸۷۰ء میں شروع ہوا، ہنوز جاری ہے۔ اور اگرچہ قانونِ تعلیم مجریہ سنہ ۱۹۴۴ء کو اس سلسلے کی آخری کڑی سمجھا جاتا ہے لیکن اسے آخری کڑی کہنا اس لیے درست نہیں کہ قومی ضروریات کے پیشِ نظر، اس میں بہت سی تبدیلیاں ہو چکی ہیں اور نئے تجربات کی روشنی میں ترمیم و اضافے ہوتے رہیں گے۔ تجربہ کرنا انگریز کی سرشت میں ہے، اور اس کی یہی سرشت اس کے زندہ رہنے کی بہت بڑی ضمانت ہے۔ اس کے دوسرے سماجی اداروں کی طرح اس کے اپنے نظامِ تعلیم کا پرانا ڈھانچا قائم ہے لیکن حسبِ ضرورت اس میں وہ ایسی ترمیم کر لیتا ہے جو وقت کے رجحانات کا ساتھ دے سکے۔

برطانوی نظامِ تعلیم غیر مرکزی ہے۔ وزارتِ معارف کا حلقۂ اثر محض عمومی تعلیمی حکمتِ عملی تک محدود ہے۔ تعلیم کے اہتمام و انصرام کی ساری ذمہ داری مقامی تعلیمی حکومتوں (LOCAL EDUCATION AUTHORITIES) کی ہے جو اپنے اپنے حلقوں میں مصروفِ عمل رہتی ہیں۔ لیکن اس غیر مرکزی نظام کے باوصف عمومی تعلیمی کاموں میں جو اشتراک و یگانگت برطانوی مدرسوں میں نظر آتی ہے، اس کی مثال بڑے سے بڑے مرکزی نظامِ تعلیم میں بھی مشکل سے مل سکے گی۔

انیسویں صدی کے اوائل میں برطانیہ کی فوجی کامرانیوں نے اسے عالمی سیادت کا تاج پہنا دیا تھا لیکن یہ سیادت محض عسکری اور سیاسی تھی تعلیمی لحاظ سے ہنوز اسے یورپ کے دوسرے ملکوں پر کوئی فوقیت حاصل نہ تھی۔ بلکہ اس وقت جو نظامِ تعلیم برطانیہ میں رائج تھا اس پر لفظ نظام کا اطلاق بھی صحیح نہیں۔ انتظامی لحاظ سے مدرسے تین حصوں میں منقسم تھے۔ پبلک اسکول، نجی اسکول،

کلیسائی اسکول - مدرسوں کی یہ تینوں قسمیں ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھیں۔ پبلک اسکولوں کا رہائشی انتظام۔ جسمانی ذہنی اور اخلاقی تربیت۔ اس سے طلبہ کی شخصیتوں کو زیادہ سے زیادہ متنوع بنایا جا سکتا تھا۔ لیکن ایسے اسکولوں کی سب سے بڑی خامی یہ تھی کہ ان میں صرف ان لوگوں کے بچے تعلیم حاصل کر سکتے تھے جن کے پاس دولت کی فراوانی ہو۔ معمولی بلکہ متوسط طبقے کے لیے اتنی گراں تعلیم کا بار اٹھانا ممکن نہ تھا۔ مدرسوں کی دوسری قسم ذاتی، عارضی اور تجارتی تھی۔ ان اداروں کی تعمیر میں جو جذبہ کارفرما تھا، اس میں بچوں کو تعلیم سے بہرہ ور کرنے کا سودا نہ تھا، بلکہ اس کا تمام تر مقصد جلب منفعت اور زر اندوزی تھی۔ ڈکنس نے نکلس کل بی میں بارک خانے کے جس ادارے کا نقشہ کھینچا ہے وہ اسی قبیل کا ایک نجی ادارہ ہوگا۔ مدرسوں کی تیسری قسم کلیسائی تھی۔ مغربی ممالک میں تعلیم کی ذمہ داری حکومت کی نہیں کلیسا کی تھی۔ اس لیے بچوں کی ابتدائی تعلیم اور ان کی اخلاقی اصلاح کے لیے ہر کلیسائی حلقے میں ایک دو اسکول ضرور تھے۔ لیکن ان اسکولوں میں جو تعلیم دی جاتی تھی، اس کا معیار اتنا بلند نہ تھا۔ ان اداروں میں تعلیم کا مقصد مفلس اور نادار بچوں کو علوم کے مبادیات سے روشناس کرانا تھا۔ یعنی یہ کہ بچوں کو صرف لکھنا، پڑھنا اور معمولی حساب سکھا دیا جاتا تھا۔

طلبہ کی بہت بڑی اکثریت بالعموم ابتدائی مدارج ہی میں اسکول سے دست کش ہو جاتی تھی اور جو چند طالب علم ابتدائی سے اعلیٰ مدارج تک پہنچ جاتے تھے۔ ان کا مقصد یونیورسٹی میں تعلیم مزید حاصل کر کے کلیسائی مبلغ بننا ہوتا تھا۔

اس طرح تعلیم اونچے طبقے کی اجارہ داری تھی۔ ان کے بچے پبلک اسکولوں اور یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کر کے، ملک کی سیاست، تجارت اور اقتصادیات پر چھا جاتے تھے۔ متوسط یا محنت کش مفلس طبقہ کے حصے میں محض امرا کی خدمت کا جذبہ تھا۔ اب اس وقت تعلیم کو عام کرنے کی جو کوششیں ہو رہی تھیں۔ ان کا تمام تر مقصد اسی مفلس طبقے کی تعلیم و تربیت کا اہتمام تھا۔

حکومت کی مداخلت

۱۸۲۰ء میں لارڈ بروہیم BROUGHAM نے دارالعوام میں ایک تعلیمی بل پیش کیا۔ اس بل کا

مقصد ان علاقوں میں اسکول قائم کرنا تھا جہاں اس وقت نہ صرف یہ کہ اسکولوں کی کمی ہے، بلکہ یہ کہ سرے سے اسکول ہی نہیں ہیں۔ بل کی بعض دفعات پر مختلف مذہبی فرقوں نے اعتراضات کیے۔ بالخصوص نان کنفارمسٹ (NONCONFORMIST) اس سلسلے میں پیش پیش تھے۔ اختلاف میں شدت پیدا ہوئی تو بل واپس لیا گیا۔ اور پھر کم و بیش دس برس تک پارلیمان میں کوئی دوسرا بل پیش نہ ہو سکا۔ ۱۸۲۵ء میں بروہم نے ایک کتابچے میں اپنے تعلیمی نظریات کا خاکہ پیش کیا۔ اس کی افادیت اور قبول عام کا اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ایک سال میں اس کے بیس ایڈیشن شائع ہوئے۔ اس کا دوسرا براہ راست فائدہ انجمن ترویج علوم مفیدہ (SOCIETY FOR THE DIFFUSION OF USEFUL KNOWLEDGE) کی تشکیل ہے۔ ۱۸۳۲ء میں پارلیمان کی از سر نو تشکیل ہوئی اور ریفارم بل قانون بن گیا۔ یہ نئی تشکیل ایک نئے دور کے آغاز کی تمہید تھی۔ چناں چہ پارلیمان کے اراکین کے اصلاحی رجحانات کے پیش نظر ملک کے مختلف حصوں سے اصلاح تعلیم کی آوازیں آنے لگیں۔ اگرچہ بروہم کی کوششوں کا کوئی ٹھوس نتیجہ برآمد نہیں ہوا لیکن اس نے جس کام کا آغاز کیا، مسٹر جے۔ اے روبک نے اسے اور آگے بڑھایا۔ اسے اس بات کا احساس تھا کہ تعلیم اس وقت تک عام نہیں ہو سکتی جب تک حکومت خود اس طرف توجہ نہ دے۔ چناں چہ پارلیمان میں تعلیم کو عام کرنے کی تحریک پیش کرتے ہوئے اس نے کہا :-

> عمومی طور پر میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں برطانیہ کے ہر بچے کو جس کی عمر چھ سال کی ہو چکی ہے، اسے اسکول جانے کے لیے قانوناً مجبور کروں گا۔ اگر والدین اپنے بچوں کو تعلیم دلا سکتے ہیں اور فی الواقع وہ انھیں کسی دوسری جگہ تعلیم دلاتے ہیں تو انھیں اپنے بچوں کو قومی مدرسوں میں بھیجنے کے لیے مجبور نہیں کیا جائے گا۔ لیکن بالفرض اگر وہ انھیں تعلیم دلانے سے قاصر ہیں یا عمداً تعلیم دلانے سے گریز کرتے ہیں۔ اس وقت حکومت کی مداخلت لازمی ہو گی۔ تاکہ ایسے والدین مجبور ہو کر اپنے بچوں کو قومی اسکولوں میں بھیجیں۔

پارلیمان میں روبک کی اس تحریک سے ایک بھرپور بحث پیدا ہوئی۔ بعض دوسرے اراکین نے بھی قومی تعلیم کی حمایت میں تقریریں کیں۔ روبک نے اپنے مجوزہ نظام تعلیم میں مدرسوں کو تین حصوں میں

تقسیم کیا۔ اول ابتدائی مدارس۔ دوم صنعتی مدارس اور سوم تربیت اساتذہ کے لیے نارمل اسکول ہر کاؤنٹی میں مختلف اسکول ڈسٹرکٹ ہوں گے اور ہر ڈسٹرکٹ میں علاقائی نظم ونسق کے لیے ایک اسکول کمیٹی ہوگی، مجموعی طور پر اس قومی نظامِ تعلیم کی نگرانی کابینہ کے ایک رکن کے سپرد ہوگی۔

نئے نظامِ تعلیم کا یہ خاکہ برحق لیکن بعض معترضین اسے مالی لحاظ سے ناقابلِ عمل کہہ کر اس کی کامیابی پر پانی پھیر سکتے تھے لیکن روبک کی دوررس نگاہیں ان مالی دشواریوں کو دیکھ رہی تھیں جو سارے نظامِ تعلیم کو ایک مرکز کے تابع لانے پر پیش آسکتی تھیں۔ چنانچہ اس نے اس مجوزہ نظام کے مالی استحکام کے لیے تین تجویزیں پیش کیں۔ اول یہ کہ اُن بچوں سے فیس لی جائے جو فیس ادا کر سکتے ہیں۔ دوم مزید ٹیکس لگائے جائیں اور سوم یہ کہ تعلیمی اوقاف کی آمدنی کی ازسرِنو تنظیم کی جائے اور اس کی آمدنی کی تقسیم ضرورت کے مطابق ہو۔

حکومت روبک بل کی حمایت کے لیے آمادہ نہ تھی لیکن پارلیمان میں اس موضوع پر جو بحثیں ہوئیں اس سے یہ اندازہ ہوا کہ اب عوامی تعلیم کا مسئلہ ایک قومی مسئلہ بن رہا ہے۔ بلحاظ روبک یا کسی ایک فرد کا مسئلہ نہیں ہے۔ اور اب یہ توقع بھی ہو چلی تھی کہ مستقبل قریب میں اس کی اصلاح کی بھی کوئی صورت پیدا ہو جائے گی ۱۸۳۳ء میں لارڈ التھارپ کی تجویز پر پارلیمان نے بیس ہزار پونڈ عوامی تعلیم کے لیے منظور کیے جو اسکول کی عمارتوں کی تعمیر اور مفلس بچوں کی تعلیم پر خرچ کی جاسکتی تھی اگرچہ یہ رقم جو برطانوی پارلیمان نے اس وقت توسیع تعلیم کے لیے منظور کی، کوئی ایسی بڑی رقم نہ تھی کہ اس سے ساری تعلیمی ضروریات پوری ہو جائیں لیکن اس کی اہمیت اس لیے بڑھ جاتی ہے کہ یہ پہلی رقم ہے جو حکومت نے عوامی تعلیم کے لیے منظور کی۔ گویا اس طرح یہ قلیل سی رقم عوامی تعلیم کے ایک وسیع نظام کی خشتِ اول تھی۔

فیکٹری ایکٹ ۱۸۳۳ء

برطانیہ کو اس وقت جو تفوق حاصل ہو گیا تھا، اس کے پیشِ نظر اس کی اپنی صنعتیں تیزی سے فروغ پا رہی تھیں، مصنوعات کی بڑھتی ہوئی مانگ کی وجہ سے کارخانوں کی موجودہ رفتار کو بھی تیز کرنا تھا۔

جس کے لیے خام اشیاء کے علاوہ اچھے اور سستے کام کرنے والوں کی بھی ضرورت تھی۔ تجارتی نقطۂ نگاہ سے کارخانوں میں بچوں کو کم تنخواہ پر ملازم رکھ لینے میں کارخانہ داروں کو فائدہ ہی فائدہ تھا، اس لیے بچوں کی بہت بڑی تعداد، مدرسوں میں حروف ابجد سیکھنے کی بجائے کارخانوں میں کام کرکے چند شلنگ کما لیتی تھی والدین کو بھی قدرے اطمینان ہو جاتا تھا کہ بچے اپنی کفالت کے خود ذمہ دار بن گئے۔

اپنی روزی کما لینا یا اپنے گھر کی آمدنی میں اضافہ کرنا جرم نہیں۔ لیکن ان کارخانوں میں بچوں کو جس طرح کام کرنا پڑتا تھا وہ یقیناً ایک جرم تھا۔ پانچ پانچ چھے چھے سال کے بچوں کا کانوں میں کام کرنا دس دس گیارہ گیارہ سال کی لڑکیوں کا گھنٹوں بھٹیوں میں کوئلہ جھونکنا۔ سردی سے ٹھٹھرتا ہوا جسم، دھنسی ہوئی آنکھیں، اور ہاتھوں میں آبلے۔ ان کی یہ حالت قابلِ رحم تھی، اور ۱۸۳۳ء کا فیکٹری ایکٹ اس غیرانسانی سلوک کے خلاف ملک کے سمجھ دار طبقے کا احتجاج تھا۔ اس قانون کے مطابق تیرہ سے اٹھارہ سال کی عمر کے لڑکے اور لڑکیوں سے بارہ گھنٹے روزانہ اور ہفتے کے روز نو گھنٹے سے زیادہ کام نہیں لیا جا سکتا تھا۔ جن بچوں کی عمریں نو اور تیرہ کے درمیان ہیں، ان سے آٹھ گھنٹے روزانہ سے زیادہ کام لینا جرم ہوگا، اور جو بچے نو سال سے کم عمر کے ہیں انھیں کارخانوں میں ملازم رکھنا ممنوع ہوگا۔

صنعتی انقلاب اور تعلیم

صنعتی انقلاب کی بدولت برطانیہ کی زرعی اقتصادیات۔ صنعتی اقتصادیات میں تبدیل ہو رہی تھی، گاؤں کے رہنے والے تلاشِ روزگار میں نئے صنعتی مرکزوں کی طرف کھنچے چلے آتے اور پھر وہیں کے ہو کر رہ جاتے۔ اس طرح ان شہروں میں ایسے لوگ جمع ہو گئے جو اپنی سماجی روایات، اخلاق آداب زبان اور رجحاناتِ فکر میں ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ ان سب کو ایک شہری سماج میں مدغم کرنا آسان کام نہ تھا۔ مزاجی ہم آہنگی تو بڑی بات ہے۔ مختلف بولیوں کو ایک بولی کی شکل دینا اور اخلاق و آداب کے ضوابط مقرر کرنا اس صورت میں ممکن تھا کہ بچوں کی تعلیم کا کوئی معقول انتظام کیا جائے تاکہ مدرسوں میں رہ کر وہ ایک مشترکہ سماج کے رکن کی حیثیت سے اٹھنا بیٹھنا، سوچنا اور عمل کرنا سیکھ جائیں۔

یہ صحیح ہے کہ بچوں کی تعلیم کا اہتمام ہی اس کا مناسب حل ہو سکتا تھا لیکن اُس وقت کا برطانیہ آج کے برطانیہ سے مختلف تھا۔ جو کام آج اصولاً اور عملاً آسان معلوم ہوتے ہیں اُس وقت آسان نہ تھے۔ والدین کی معاشی بدحالی بچوں کو کسب معاش کے لیے مجبور کر دیتی تھی اور وہ کارخانوں، کانوں، دکانوں اور بڑے بڑے اسٹوروں میں اپنی روزی کمانے کے لیے ملازم ہو جاتے تھے۔ بچوں کے یہ آجر، انسان کم، تاجر زیادہ تھے۔ انھیں اپنی مالی منفعت اور زراندوزی سے سروکار تھا۔ بچوں کی فلاح نہ ان کا مقصد تھا اور نہ اس کے متعلق وہ کچھ سوچ سکتے تھے، بلکہ بچوں کی زندگی کو بہتر بنانے کے لیے جو اصلاحی تحریکیں منظر عام پر آئیں ان کی بھی وہ مخالفت کرتے تھے۔ اس پس منظر میں ۱۸۳۳ء کا فیکٹری ایکٹ اپنی نوعیت کی پہلی کوشش تھی جس کے نتائج کافی دور رس ثابت ہوئے۔

۱۸۳۳ء میں قومی تعلیم کی تحریک کو مزید تقویت حاصل ہوئی۔ ایک رکن نے پارلیمان میں ایک قومی نظام تعلیم کے قیام کے سلسلے میں ایک تعلیمی تحقیقاتی کمیشن کے تقرر کی تحریک پیش کی۔ اس تحریک نے ایک مرتبہ پھر قومی تعلیم کے حامیوں میں زندگی کی لہر دوڑا دی۔ تعلیم کے مختلف پہلو زیر بحث آئے۔ موجودہ تعلیم کے نقائص، اس کا ناکافی ہونا، وغیرہ وغیرہ، لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس مباحثے کا نادر پہلو یہ تھا کہ اس میں اساتذہ کی تربیت، قومی تقاضے اور ٹریننگ کالج کے حالیہ رول کے مطابق بہت سی باتیں زیر بحث آئیں۔ اساتذہ کی تربیت کے سلسلے میں اس وقت انگلستان میں دو انجمنیں مصروف کار تھیں، ایک نیشنل سوسائٹی NATIONAL SOCIETY اور دوسری برٹش اسکول سوسائٹی۔ اس بحث و تمحیص کا نتیجہ یہ نکلا کہ پارلیمان نے دس ہزار پونڈ کی مزید رقم منظور کی جو ان دونوں انجمنوں میں اس شرط پر تقسیم کی گئی کہ انجمنیں اسی قدر رقم اور جمع کر کے اساتذہ کی تربیت کا انتظام کریں۔

۱۸۳۴ء میں مسٹر وائز (WYSE) نے ملکۂ معظمہ کے نام ایک عرضداشت بھیجی۔ اس عرضداشت میں وائز نے بورڈ آف کمشنرز ان ایجوکیشن کی تشکیل کی درخواست کی تھی۔ اس بورڈ کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ اساتذہ کے مزید تربیتی ادارے کھولے جائیں، تاکہ اچھے اساتذہ کی جو کمی ہے وہ پوری ہو جائے۔ لیکن کلیسا اور نان کن فارمسٹ دونوں نے اس کی مخالفت کی۔ اس مخالفت کی نظری

توجیہہ یہ ہے کہ کلیسا کو یہ اصرار تھا کہ تعلیم کا انتظام و انصرام ان کا اپنا اجارہ ہے۔ حکومت کی مخالفت کسی طرح جائز نہیں۔ اس کے برعکس نان کن فارمسٹ کلیسا کے اس حق کے سخت ترین مخالف تھے۔ دونو گروہوں کے اس اختلاف رائے سے ایک تیسرا طبقہ منظر عام پر آرہا تھا، جو لادینی کے حق میں تھا۔ اگرچہ تعلیم کے اس مدو بینی نظریے کے حامیوں کی تعداد اس وقت بہت مختصر سی تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ یہی مختصر سی تعداد ملک کے تعلیمی رجحانات کو موڑنے میں کامیاب ہوئی۔

کمیٹی آف کونسل

۱۸۳۹ء میں پارلیمان نے سلیکٹ کمیٹی آف دی پریوی کونسل کے قیام کا اعلان کیا۔ یہ کمیٹی چار اراکین پر مشتمل تھی۔ لارڈ پریذیڈنٹ۔ لارڈ پریوی سیل۔ ہوم سیکریٹری اور چانسلر آف دی ایکس چیکر۔ اس کمیٹی کی تشکیل کا کام اس رقم کے مصرف کی نگرانی تھا۔ جو پارلیمان وقتاً فوقتاً منظور کرے۔ بعض حلقوں میں اس کمیٹی کے قیام کی مخالفت بھی ہوئی۔ اس میں زیادہ تر وہ لوگ شامل تھے جو اصولاً حکومت کی مداخلت کے خلاف تھے۔ لیکن ان مخالفتوں کے باوجود حکومت رفتہ رفتہ احاطۂ کار کو وسیع کررہی تھی۔ چنانچہ اس سال ترویج تعلیم کے لیے تیس ہزار پونڈ کی رقم منظور کی۔

۱۸۳۹ء ہی میں کمیٹی نے ایک تحریری یادداشت جاری کی۔ یہ یادداشت دراصل کمیٹی کے احاطۂ کار کی تصریح تھی۔ اس کے اہم پہلو یہ تھے۔

(ا) کمیٹی خود فیصلہ کرے گی کہ جو زر امداد وقتاً فوقتاً پارلیمان منظور کرے، اسے کس طرح تقسیم کیا جائے۔

(ب) کمیٹی کو امدادی اسکولوں کے معائنہ کا حق ہوگا۔

(ج) حکومت وقتاً فوقتاً انسپکٹر مقرر کرے گی جو اسکولوں کا معائنہ کریں گے۔ لیکن انھیں مذہبی تعلیم نظم و ضبط اور مدرسے کے انتظام و انصرام میں مداخلت کا کوئی حق نہ ہوگا۔

(د) ان کا کام اطلاعات کا جمع کرنا اور اپنے معائنے کی رپورٹ کمیٹی آف کونسل کو بھیج دینا ہوگا۔

کے شٹل ورتھ

کمیٹی کے ان اختیارات پر عجیب قسم کے تبصرے ہوئے۔ کلیسائی مخالفت ایک ہنگامہ بن گئی

نیشنل سوسائٹی کی نکتہ چینی بھی کم شدید نہ تھی۔ یہ حالات ایسے تھے کہ حکومت کی ذراسی غفلت معاملات کو اور پیچیدہ بنا سکتی تھی۔ لیکن یہ برطانیہ کی خوش قسمتی تھی کہ اس وقت ڈاکٹر کے نشل ورتھ کمیٹی آف کونسل کا سکرٹری تھا۔ نشل ورتھ مین چسٹر میں طبیب تھا۔ ۱۸۳۲ء میں جو ہیضہ پھیلا اس میں اسے شہر کے گندے گھر، لوگوں کی صحت اور بچوں کی عدم توجہی کا جائزہ لینے کا موقع ملا۔ گندے سے گندے غیر صحت مند گھر، خوراک کی کمی، حفظان صحت کے اصولوں سے ناواقفیت۔ یہ باتیں ایسی تھیں کہ جن کا نشل ورتھ کے دل پر بہت گہرا اثر ہوا، اور اس کے بعد اس نے اپنی زندگی کا بہت بڑا حصّہ تعلیم کے انتظام والصرام میں گذار دیا۔

کے نشل ورتھ نے ان مخالفتوں کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کیا۔ اگر کسی نے برا کہا تو اسے بُرا کہنے کا موقع دیا اور کبھی تعرض نہ کیا، یا یہ کوشش نہ کی کہ اسکی مخالفت کی جائے۔ بلکہ اس نے ہمیشہ یہی چاہا کہ جو مخالف ہیں انھیں سمجھایا جائے۔ ممکن ہے وہ اسے صحیح سمجھ کر مان ہی جائیں۔ یا کوئی مصالحت کی صورت ہی پیدا ہو جائے۔ کلیسا، نان کن فارمسٹ یا کسی اور مذہبی گروہ نے اگر مخالفت کی تو اس نے ان کے نظریات اور انداز فکر کو سمجھنے کی کوشش کی۔ یہ کش مکش تقریبًا دو سال تک جاری رہی اور وہ ہر بات کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کرتا رہا۔ بالآخر اس کی کوششوں سے مصالحت کی ایک صورت پیدا ہو گئی۔ یہ مصالحت معاہدۂ ۱۸۴۰ء کے نام سے مشہور ہے۔ اس مصالحت کے مطابق۔

(۱) آرک بشپ کو کلیسائی اسکولوں کے انسپکٹر مقرر کرنے کا حق ہوگا۔ اور وہ

(۲) انھیں مذہبی تعلیم کے معائنے کے متعلق ہدایات دے گا۔

(۳) کمیٹی آف کونسل کی ہدایات آرک بشپ کو دکھائی جائیں گی۔

(۴) معائنے کی رپورٹ کی دو نقلیں۔ ایک آرک بشپ اور ایک علاقائی پادری کے پاس بھیجی جائیں گی۔

حکومت کی یہ پہلی مداخلت تھی، اگرچہ مختلف تعلیمی ایجنسیوں نے خیر مقدم نہیں کیا۔ لیکن اس تھوڑی بہت مداخلت کو تسلیم ضرور کرلیا۔ اس سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ قومی تعلیم کا مسئلہ

محض دو چار اشیڈ ملیسٹ کی نظری باتوں تک محدود نہیں رہا۔ بلکہ اس کے عملی امکانات کا جائزہ لینے کی بھی پوری پوری کوششیں ہونے لگیں۔

انیسویں صدی میں برطانیہ میں ابتدائی تعلیم کا مسئلہ کارخانہ دارانہ نظام سے اس قدر وابستہ تھا کہ ایک نئے نظام تعلیم کے بروئے کار لانے میں اس کے اثرات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ سنہ ۱۸۴۳ء میں سر جیمز گراہم نے دارالعوام میں فیکٹری کا بل پیش کیا۔ اس بل کی جو دفعات تعلیم سے متعلق تھیں ان پر دراصل کے نسل ور تھ کے مشوروں کی چھاپ تھی۔ اس بل کے مشمولات سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ سر جیمز کا مدعا صنعتی علاقوں میں تعلیم کو عام کرنا تھا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے بل میں بچوں کے کام کے اوقات اور مدرسے کے متعلق کئی دفعات شامل کی گئیں۔ اول یہ کہ جن بچوں کی عمریں آٹھ اور تیرہ سال کے درمیان ہیں۔ ان سے ساڑھے چھے گھنٹے روزانہ سے زیادہ کام نہیں لیا جا سکتا۔ اور جن کی عمریں ۱۳ سال کی ہیں ان کے لیے بھی مدت بارہ گھنٹے ہو گی۔

بچوں کے مجوزہ کام کے اوقات کو ہر گروہ نے تسلیم کر لیا۔ لیکن اسکولوں کے انتظام کے متعلق سات اراکین پر مشتمل جس بورڈ کی تشکیل کی تجویز اس بل میں پیش کی گئی اس کی ہر طرف سے مخالفت ہوئی۔ اس بورڈ کے اختیارات اور اس کے احاطہ کار کے سلسلے میں کلیسائے انگلستان اور نان کن فارمسٹ دونوں میں اختلاف تھا۔ نان کن فارمسٹ فرقہ وارانہ مذہبی تعلیم کے مخالف تھے اور اہل کلیسا کو سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ حکومت مذہبی تعلیم اور اس کے انتظام میں کوئی مداخلت نہیں کر سکتی۔ اس کشاکش سے ایک ناگوار صورت پیدا ہو گئی اور بالآخر حکومت نے بل واپس لے لیا اور یہ وعدہ کیا کہ پارلیمان کے اگلے سیشن میں دوسرا بل پیش کیا جائے گا۔

فیکٹری ایکٹ سنہ ۱۸۴۴ء

سنہ ۱۸۴۴ء میں سر جیمز گراہم نے دوسرا فیکٹری بل پیش کیا جو اس سال قانون بن گیا

اس ایکٹ میں تعلیم کی ساری دفعات حذف کر دی گئیں، اور قانون کا دائرہ صرف کام کے اوقات کی مدت
کی تعیین تک محدود ہو کر رہ گیا، اس قانون کے مطابق اب ۔

(۱) ہر بچہ جس کی عمر آٹھ اور تیرہ سال کے درمیان ہوگی، تین دن مکمل یا چھ نصف روز اسکول
میں صرف کرے گا ۔

(۲) اس عمر کے بچے دوپہر کے کھانے سے پہلے یا بعد ساڑھے چھ گھنٹے تک کام کر سکتے ہیں

(۳) ہر کارخانہ دار آجر کا یہ فرض ہوگا کہ وہ اس امر کی تحقیق کرے کہ ہر بچہ جو اس کے کارخانے میں
کام کر رہا ہے، اس نے مقررہ مدت تک مدرسے میں تعلیم پائی ہے۔ اور اس کے پاس اس کا
سرٹیفکیٹ ہے ۔

(۴) فیکٹری انسپکٹروں کو یہ حق ہوگا کہ وہ نااہل اساتذہ کو سرٹیفکیٹ جاری کرنے کی اجازت نہ دیں۔

(۵) دو پنس فی ہفتہ فیس ہوگی، جو بچے کی روزانہ مزدوری میں سے کاٹ لی جائے گی ۔

تربیت اساتذہ

تعلیم کے عمومی انتظام سے فراغت ہوئی تو اس نے طالب علموں کی تہذیب و تربیت کے ساتھ ساتھ
اساتذہ کی تعلیم و تربیت کی طرف بھی توجہ دی ۔ چناں چہ ۱۸۴۶ء میں اس نے جو یادداشت شائع
کی اس میں اساتذہ کی تربیت کی ضرورت اور تربیت کے طریقوں پر مفصل بحث کی ۔ کے نشل ورتھ
نے جس بنیاد پر اساتذہ کی تربیت کا یہ نظام قائم کیا، وہ دور حاضر کے تربیتی طریقوں سے
مختلف تھا۔ اس وقت برطانیہ میں اساتذہ کے ایسے تربیتی ادارے موجود نہ تھے ۔ جہاں انھیں
اصول تعلیم، طریق تدریس اور نفسیات کی تعلیم دی جاتی اور اگر اکا دکا تھے بھی تو ان کی تعداد اتنی
نہ تھی کہ وہ وقت کی ضروریات کو پورا کر سکتے ۔ چناں چہ اس نے یہ محسوس کیا کہ جو لوگ آگے چل کر
تعلیم و تدریس کو اپنا پیشہ بنانے والے ہیں، انھیں اور پیشوں کی طرح پیشہ ورانہ تربیت دی جائے
اس احساس کے پیش نظر اس نے متعلم، مدرس سسٹم کا تصور پیش کیا ۔

متعلم مدرس تیرہ سال کی عمر سے اٹھارہ سال کی عمر تک مختلف اسکولوں میں زیر تربیت

بن کی حیثیت سے کام کرتے تھے، دوران تربیت انھیں دس سے بیس پونڈ تک سالانہ وظیفہ ملتا
پہلے سال دس پونڈ اور دوسرے سال ڈھائی پونڈ سالانہ ترقی۔ اس طرح پانچویں سال کے اختتام
ایک متعلم مدرس کا یہ وظیفہ بیس پونڈ بن جاتا تھا۔ ہر پچیس طالب علموں کے لیے ایک متعلم مدرس
جاتا تھا۔ اور جو اسکول انسپکٹروں کی سفارش پر اس کام کے لیے انتخاب کیے جاتے تھے۔ ان
طلبا میں یہ متعلم مدرس، بہ حیثیت مدرس کام کرتے تھے۔ دوسرے اساتذہ اور ان میں فرق
تھا کہ پڑھانے کے ساتھ ساتھ انھیں پڑھنا بھی پڑتا تھا۔ ہیڈ ماسٹر انھیں روزانہ ڈیڑھ گھنٹے تک
اصول تعلیم اور طریق تعلیم پر لکچر دیتا تھا۔ پانچ سال بعد یہ زیر تربیت مدرس (QUEEN'S SCHO—
LARSHIP EXAMINATION میں شریک ہوتے، جو اس امتحان میں کامیاب ہو جاتے
انھیں بیس یا پچیس پونڈ کا وظیفہ ملتا، اور وہ تعلیم مزید کے لیے کسی ٹریننگ کالج میں داخل ہو جاتا تین
سال کی مزید تربیت کے بعد انھیں اسکولوں میں مستقل جگہ مل جاتی تھی

محکمہ تعلیم

کمیٹی آف کونسل کی تشکیل کے بعد تعلیم و تعلم کے جملہ اختیارات کمیٹی کے اراکین کے ہاتھ میں دے دیے
اور کمیٹی وقتاً فوقتاً تعلیمی یادداشتیں جاری کرتی رہتی۔ ان یادداشتوں کا مقصد تعلیم کے سلسلے میں حکومت کو
زیادہ با اختیار بنانا تھا۔ ۱۸۳۹ء سے ۱۸۵۶ء تک کمیٹی کا انداز کار یہی رہا اور وہ اپنے اختیارات کو
وسیع کرتی رہی چوں کہ اس کی تشکیل خصوصی شاہی اختیارات کے قانون کے مطابق ہوئی تھی اس لیے.
اس کی یادداشتیں بالعموم کسی پارلیمانی منظوری کے بغیر ہی شائع ہوتی رہیں۔ کمیٹی کے کام کا محاسبہ صرف
سالانہ زر امداد کے ووٹ ہی کے وقت ہو سکتا تھا۔ پارلیمان کے اراکین کو اس کا احساس تھا، ملکہ ۱۸۵۲ء
میں جب کمیٹی نے یہ حکم نامہ جاری کیا کہ وہ مدرسے جنھیں حکومت سے امداد ملتی ہے اپنے اوقاف میں
ضمیر کی دفعہ Conscience Clause بھی شامل کرلیں تو نیشنل سوسائٹی نے اس کی سخت مخالفت کی اور ارباب
نے تو دارالامرا میں یہاں تک کہہ دیا کہ کمیٹی اپنے حکم نامے بالعموم اس وقت جاری کرتی ہے جب پارلیمان
تعطیل کے سلسلے میں بند ہو۔

اسی طرح ایک حکم نامے کے ذریعے سنہ ۱۸۵۶ء میں کمیٹی آف کونسل کو محکمۂ تعلیم کا درجہ
مل گیا۔ محکمے کی اس نئی تشکیل کے مطابق۔

۱) لارڈ پریذیڈنٹ بدستور اس محکمے کا صدر رہے گا۔

۲) نائب صدر، دارالعوام میں لارڈ پریذیڈنٹ کی نمائندگی کرے گا۔

۳) نائب صدر کا تقرر، وزیراعظم اپنی کابینہ کی تشکیل کے وقت کرے گا۔

محکمے کی اس تنظیم کے بعد تعلیم کی ترقی و تنزل کا انحصار سیاسی پارٹیوں کے عروج و زوال سے
منسلک ہوگیا۔ نائب صدر حکمران پارٹی کے عہد اقتدار ہی تک نائب صدر رہ سکتا تھا، اگر دوسری
پارٹی کو سیاسی غلبہ حاصل ہوا تو کسی دوسرے شخص کا نائب صدر مقرر ہونا یقینی ہو جاتا تھا، اور اس طرح
گویا تعلیم سیاسیات کے تابع ہوگئی یا کم از کم پارٹی کے سیاسی رجحانات کی مناسبت ضروری تھی۔

نیو کاسل کمیشن

حکومت کے بڑھتے ہوئے کنٹرول پر بعض حلقوں میں بڑی نکتہ چینی ہوئی۔ دینی اور لادینی
تعلیم کے مویدین سے قطع نظر، پارلیمان کے بعض اراکین بھی معترض تھے۔ سنہ ۱۸۵۸ء میں حکومت نے
تعلیم پر ڈیڑھ لاکھ پونڈ صرف کیے۔ سنہ ۱۸۵۸ء میں یہی رقم ساڑھے پانچ کروڑ کے لگ بھگ پہنچ
گئی تھی۔ بعض اراکین اسے اسراف سمجھتے تھے اور بعض جنگ کریمیا کے بڑھتے ہوئے اخراجات کے
پیش نظر اتنی بڑی رقم تعلیم پر خرچ کرنا صحیح تصور نہیں کرتے تھے۔ بعض کا یہ خیال تھا کہ جتنی رقم
پارلیمان تعلیم کی ترقی و توسیع کے لیے خرچ کرتی ہے۔ نتائج مقابلتاً اتنے اچھے نہیں تھے۔ چنانچہ انہیں
نظری مباحث کے پیش نظر سنہ ۱۸۵۸ء میں ڈیوک آف نیو کاسل کی صدارت میں ایک شاہی تعلیمی کمیشن کا
تقرر ہوا۔ اس کمیشن کے تقرر کا مقصد انگلستان کی موجودہ تعلیمی حالت کا جائزہ لینا، اور یہ غور کرنا اور مشورہ دینا
ہے کہ ہر طبقے کے لوگوں کے لیے سستی اور متوازن تعلیم کی فراہمی کے لیے کون سے اقدام کیے جائیں۔

کمیشن نے اپنی رپورٹ سنہ ۱۸۶۱ء میں پیش کی۔ اس وقت برطانیہ کا تعلیم یافتہ طبقہ لازمی اور مفت تعلیم
کے حق میں تھا لیکن کمیشن نے جس رائے کا اظہار کیا، اسے محض رجعت پسندانہ کہہ سکتے ہیں۔ یہ لازمی و مفت

رعالم گیر تعلیم کے متعلق اس کا یہ حتمی اور آخری فیصلہ تھا کہ اس قسم کی تعلیم ان حالات میں ناممکن الحصول ہے۔ اور اگر بالفرض ناممکن الحصول نہ بھی ہو تو اس کی اتنی ضرورت بھی نہیں۔

اس کی سفارشات یہ ہیں۔

(۱) مختلف مذہبی فرقوں کی مذہبی تعلیم میں مداخلت نہ کی جائے۔

(۲) امدادی رقم اسکول کے منیجروں کو دی جائے گی۔ اور منیجر اسکول کے اساتذہ کو تنخواہیں دیں۔

(ا) جو امدادی رقم عمومی محصولات سے دی جائے اس کا انحصار طلبہ کی حاضری۔ منیجر کی تکمیل شرائط، اور انسپکٹر کی اطمینان بخش رپورٹ پر ہوگا۔

(ب) جو امدادی رقم کاؤنٹی کے محصولات سے ادا کی جائے۔ ان کا انحصار قرات، نوشتن اور ابتدائی حساب دانی پر ہوگا۔ اس حساب کا انتظام کاؤنٹی کونسل یا بروکونسل (COUNTY OR BOROUGH COUNCIL) کے اپنے اپنے بورڈ آف ایجوکیشن کریں گے۔

(ج) زر امداد کا حساب اوسط حاضری کے مطابق ہوگا۔ ان اسکولوں میں جن کی تعداد ۰۴ یا اس سے کم ہوگی فی طالب علم چھ شلنگ سے زیادہ اور ساڑھے پانچ شلنگ سے کم نہیں ہوگا۔ اس سے بڑے اسکولوں میں اس کی شرح ساڑھے چار شلنگ فی طالب علم ہوگی۔

(د) تربیت یافتہ مدرس کے لیے ڈھائی شلنگ کی مزید امداد دی جائے گی۔

(ہ) کاؤنٹی محصولات سے ان بچوں کو امداد دی جاسکتی ہے جنھوں نے ۰۴۱ دن اسکول میں صرف کیے ہوں اور مبادیات کا امتحان بھی پاس کرلیا ہو۔ اس کی شرح ۲۱ شلنگ سے ۲۲ شلنگ تک ہوسکتی ہے۔ سات سال سے کم عمر کے بچوں کا کوئی امتحان نہیں ہوگا۔

(و) یہ امدادی رقم اسکولوں کو انسپکٹر کے سرٹیفکیٹ پر مل سکتی ہے اور انسپکٹر اپنے سرٹیفکیٹ میں حسب ذیل باتوں کا جائزہ لے گا۔

(۱) اسکول کی صفائی

(۲) پانی کی نکاسی

(۳) عمارت میں روشنی دان کا انتظام ۔

(۴) ہر طالب علم کے لیے ۸ مربع فٹ زمین ۔

نیوکاسل کمیشن رپورٹ میں معاملت کی جو کوشش کی گئی ہے اس سے ایک قسم کی یکسانیت ضرور پیدا ہو گئی لیکن دراصل اس سے مختلف تعلیمی خرابیوں پر کوئی روشنی نہیں پڑتی ۔ اگرچہ کمیشن کو یہ احساس تھا کہ طلبہ دس سال کی عمر میں اسکول چھوڑ جاتے ہیں لیکن اس سلسلے میں کوئی ایسی تجویز پیش نہیں کی جس سے تعلیم کی عمومی حالت کی اصلاح ہو سکتی ۔

کلیرنڈن کمیشن

اسی سال لارڈ کلیرنڈن کی صدارت میں ایک اور تعلیمی کمیشن مقرر ہوا ۔ اس کمیشن کے قیام کا مقصد پبلک اسکولوں کی تعلیمی حالت کا جائزہ لینا تھا ۔ چناں چہ کمیشن نے اپنی تحقیقات کے لیے نو پبلک اسکولوں کا انتخاب کیا لیکن یہ ایک عجیب بات ہے کہ ان اسکولوں نے کمیشن کے ممبروں کو اسکول میں داخل ہونے کی اجازت ہی نہ دی۔ اس مزاحمت سے کمیشن کے کام میں خاص دشواری پیدا ہو گئی، اور انھیں براہِ راست تحقیقات کی بجائے صرف سوال نامے کے جواب اور بہی خواہانِ تعلیم کی شہادتوں پر اکتفا کرنا پڑا ۔ کمیشن کی تحقیقات اور سفارشات کی رپورٹ ۱۸۶۴ء میں شائع ہوئی ۔

کمیشن کے اراکین پرشا (جرمنی) کے ہائی اسکولوں سے زیادہ متاثر ہوئے ۔ پرشا کے ان مدرسوں میں اونچے طبقے کے بچوں کی تعلیم و تربیت کا اہتمام تھا ۔ برطانیہ کے پبلک اسکولوں کا مقصد بھی اونچے طبقے کے بچوں کی تعلیم کا انتظام تھا ۔ اس وقت اسے اپنے نئے نئے مستعمراتی مقبوضات کے لیے اچھے انتظام کار اور عمدہ فوجی کارکنوں کی ضرورت تھی اور ان پبلک اسکول نے برطانیہ کی اس ضرورت کو پورا کیا ۔ چناں چہ کلیرنڈن کمیشن کا تمام تر مقصد محض انہی پبلک اسکولوں کی اصلاح تھی عوامی تعلیم سے اس کا براہِ راست یا بالواسطہ کوئی تعلق نہ تھا ۔

ٹاٹن کمیشن :۔ ۱۸۶۴ء میں تعلیمی اصلاح کی ایک دوسری کوشش ہوئی ۔ یہ کوشش ذاتی کمر

دونوں کوششوں سے قدرے مختلف تھی۔ کلیرنڈن کمیشن کا احاطہ تحقیقات پبلک اسکول تھا، اور نیوکاسل کمیشن کا مقصد مفت اور لازمی تعلیم کی نظری تحقیق تھی، لیکن ۱۸۶۴ء میں لارڈ ٹانٹن کی قیادت میں جو کمیشن مقرر ہوا، اس کا مقصد ثانوی تعلیم کی عمومی تحقیق تھی۔ اس سے پہلے کہ برطانوی تعلیم کی تعبیر نو کے لیے کمیشن اپنی سفارشات پیش کرے، یورپ کے دوسرے ملکوں کے نظام تعلیم کا جائزہ لینا ضروری سمجھا گیا۔ اس طرح میتھو آرنلڈ کو فرانس، جرمنی، سوئٹزرلینڈ، اور اٹلی بھیجا گیا۔ جیمز فریزر کو کینیڈا، اور یو۔ ایس۔ اے، اور فیرل کو اسکاٹ لینڈ۔ آرنلڈ، فریزر، اور فیرل نے اپنے اپنے حلقوں کی جو تعلیمی رپورٹ پیش کی، اس کی بنیاد پر کمیشن نے اپنی رپورٹ مرتب کی۔ یہ رپورٹ کمیشن کے قیام کے چار سال بعد ۱۸۶۸ء میں شائع ہوئی۔

آرنلڈ نے المانوی (جرمن) نظام تعلیم کا جو نقشہ اپنی رپورٹ میں کھینچا ہے۔ اس سے اس کی برتری اور برطانوی نظام کی پس ماندگی کی تصویر نمایاں ہو جاتی ہے، بالخصوص اس لیے کہ لکھنے والا آرنلڈ ہے۔ وہ لکھتا ہے۔

> پرشا میں محکمۂ تعلیم ایک ایسا ادارہ ہے جسے عوام اپنی خواہشات کے حصول کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ کلچر ان کا ایمان ہے اور اس تعلیمی کل کو جس نے بھی مرتب کیا ہو اب یہ تعلیمی کل عوام کے ہاتھ میں ہے ۔ ۔ ۔ چناں چہ آج ان کے یہاں اساتذہ کی ایک بے مثال جماعت اور ایسے عمدہ مدارس موجود ہیں جو ہر طبقے کی ضروریات کو پورا کرتے اور اس کے نتیجے کے طور پر لوگوں کی اعلیٰ تربیت یافتہ جماعت موجود ہے۔

جرمنی کا سب سے اونچے درجے کا مدرسہ ہائی اسکول (GYMNASIUM) ہے جو ہمارے پبلک اسکولوں کا بدل ہیں۔ دوسرے درجے کے مدارس کو (REALSCHULE) کہتے ہیں۔ اس اسکول کے درجۂ اول کی تعلیمی مدت نو سال ہے۔ ان میں یونانی زبان کی تعلیم کا اہتمام نہیں ہے، لیکن لاطینی لازمی ہے۔ اس کے علاوہ فرانسیسی، ریاضی اور علوم طبیعیہ پر بالخصوص زور دیا جاتا ہے۔ ان مضامین کے ساتھ ساتھ مادری زبان، دینیات اور ڈرائنگ کی تعلیم بھی لازمی ہے۔ اسکول کے آخری امتحان میں ہر مضمون میں کامیاب ہونا ضروری ہے

دوسرے درجے کے اسکولوں کا نصاب سات سال پر مشتمل ہے۔ تاکہ ایک طالب علم سولہ سال کی عمر میں اپنی تعلیم ختم کرلے۔ اس میں لاطینی کی تعلیم لازمی نہیں ہے۔ تیسرے درجے کے اسکول نسبتاً کم درجے کے ہوتے ہیں اور ان کا نصاب بھی غیر مکمل ہوتا ہے۔

—— ٹاؤنٹن کمیشن رپورٹ برطانیہ کی ثانوی تعلیم کا ایک مکمل جائزہ تھی جس میں قومی ضروریات اور وقت کے بدلتے ہوئے رجحانات کے پیش نظر انتظامی امور اور نصاب تعلیم کے متعلق سفارشات کی گئی تھیں۔ اگر اس رپورٹ پر عمل کیا جاتا تو اس وقت برطانوی ثانوی تعلیم کا انصرام کسی اور نہج پر ہوتا۔ لیکن چونکہ یہ سفارشات ایسی عظیم تبدیلیوں کی حامل تھیں کہ ان پر فوری عمل ممکن نہ ہوا۔ اول تو انگریزی کی فطری رعایت پسندی مانع آئی اور دوسری وجہ یہ بھی تھی کہ اس وقت تک تعلیم کو ایک مرکز کے تابع لانے کا تصور بھی ذہنوں میں پختہ نہ ہوا تھا۔

قانون اصلاح شدہ

سنہ ۱۸۵۹ء میں رابرٹ لو (ROBERT LOWE) کو محکمۂ تعلیم کا نائب صدر مقرر ہوا۔ اس نے کمیٹی آف کونسل کے مختلف حکم ناموں کو یکجا کر دیا۔ حکم ناموں کی یہ ترتیب سنہ ۱۸۶۰ء میں مرتب ہوئی۔ اس لیے اسے بالعموم قانونِ سنہ ۱۸۶۰ء کہتے ہیں۔ سنہ ۱۸۶۱ء میں لو نے اس قانون کو منسوخ کرنے کی تجویز پیش کی لیکن بعض وجوہ کی بنا پر اسے ملتوی کر دیا اور اس کو سنہ ۱۸۶۲ء میں پیش کیا۔ یہ نیا قانون "قانون اصلاح شدہ سنہ ۱۸۶۲ء" موسوم ہوا۔ اس قانون میں دو باتوں پر بالخصوص زور دیا گیا۔ ایک حاضری اور دوسرے امتحان کے نتائج۔ زرِ امداد کا تمام تر انحصار انھیں دو باتوں پر تھا۔

(۱) زرِ امداد

(الف) چار شلنگ فی طالب علم۔ صبح اور دوپہر کی حاضری پر۔ اور ڈھائی شلنگ شام کی میٹنگ میں حاضر ہونے پر۔

(ب) چھے سال سے کم عمر کے بچوں کے لیے انسپکٹر کی رپورٹ پر ساڑھے چھے شلنگ فی طالب علم۔

(ج) باقی زرِ امداد کا انحصار سالانہ نتیجے پر موقوف ہوگا

(ت) ہر وہ طالب علم جو صبح یا دوپہر کی دو سو میٹنگ میں حاضر رہا ہو اور سالانہ امتحان بھی پاس کر لیا ہو۔ اسے ۸ شلنگ امداد ملے گی۔

(ج) شام کی میٹنگ میں حاضر ہونے والے طلبہ میں جو ۲۴ میٹنگوں سے کم حاضر نہیں رہا اور سالانہ امتحان میں بھی کامیاب رہا۔ اسے ۵ شلنگ امداد ملے گی۔

(۲) لڑکیوں کے لیے سوزن کاری اور کشیدہ کاری لازمی ہوگی۔

(۳) مدرسے کی عمارت صاف ستھری ہو۔ پانی کی نکاسی کا معقول انتظام ہو۔ اور روشنی کے آنے کا اور ہوا کے خارج ہونے کا بھی اچھا بندوبست ہو۔

(۴) متعلم مدرسین اور نائب مدرسین کی تعداد مقرر ہو۔

(۵) ہر اسکول کا ایک معائنہ رجسٹر ہو جس میں انسپکٹر کے معائنے کی روداد مندرج ہو۔

(۶) غیر تربیت یافتہ مدرسین صرف ابتدائی مدرسوں میں رکھے جا سکیں گے۔

(۷) متعلم مدرسین کا وظیفہ اسکول کے منیجر زرِ امداد میں سے ادا کریں گے۔

قانون ۱۸۶۲ء کا مجموعی اثر کچھ اچھا نہ پڑا۔ زرِ امداد کے حصول کے لیے جو پابندیاں قائم کی گئی تھیں۔ انھیں پورا کرنے کے لیے ہیڈ ماسٹر اکثر رجسٹروں میں غلط اندراجات کر دیتے تھے اور تدریس بھی ایک ایسی ڈگر پر چل رہی تھی کہ اس میں ذاتی کاوش کو دخل نہ تھا۔ صرف بچوں کو امتحان پاس کرانا مقصد بن گیا تھا:

اسلامی فنِ تعمیر میں
مغلیہ عہد کا مقام

ڈاکٹر اعجاز حسین قریشی مسلسل نمبر ۲

مسلسل کے لیے آموزش مارچ ۸۵ء کا شمارہ ملاحظہ فرمائیے

حضرت امیر معاویہ اور عبدالملک کے علاوہ قریب قریب سارے اموی تاجداروں کو شام کے صحرا سے بے حد محبت تھی اور سخت گرمی کے دنوں کے سوا ان کا اکثر وقت صحرا میں کٹتا۔ انھیں صحرا کی ٹھنڈی اور تاروں بھری راتیں اور دریاں کی کھلی فضا بہت بھاتی۔ وہ اپنے مخصوص ندیموں، محبوب بیویوں اور لونڈیوں کی معیت میں صحرا میں خیمے ڈال دیتے۔ وہیں ان کے شعرا حاضر ہوتے اور شعر و نغمہ کی محفلیں جم جاتیں۔ پہلے پہل انھوں نے خیموں کی زندگی پسند کی۔ بعد میں محلات بھی تعمیر کرائے۔ ان صحرا میں مندرجہ ذیل مشہور محلات تعمیر کرائے گئے۔

رملہ کے محلات۔ دارالعباغین۔ رصافہ۔ قصر غزہ۔ قصر موقر۔ قصر مشتّی۔ قصیر عمرہ۔ حمام الصرخ۔ قصر خربجل قدر خرانہ۔ قصر خربہ مفجرؔ۔ قصیر طوبی۔

غرضیکہ اس اُموی دور میں جنگل میں منگل کا سماں تھا۔ اموی عہد کا فنِ تعمیر اپنے خلاق کے جمالیاتی ذوق کا اُجلا آئینہ ہے۔ اس امر میں کوئی شبہ نہیں کہ اُموی شام میں وارد ہوئے تھے تو انھیں پتھروں کو جوڑنے اور بیل بوٹے بنانے کا فن نہ آتا تھا۔ مگر ان کے پاس ایک تر و تازہ ذہن اور غیر معمولی ذوق تھا۔ وہ شعر کہہ نہ سکتے تھے مگر سخن فہم بلکہ شعر کے لیے تحریک پیدا کرنے والے تھے۔ دوسرے لفظوں میں وہ خود حسن تھے اور ان کے اندر خلاق کے تمام جوہر موجود تھے۔ یہی وجہ تھی کہ مسجد اموی۔ قبۃ الصخرہ۔ مسجد اقصیٰ اور ان کے عہد کی دوسری عمارات شام کی تمام عمارتوں سے حسن و خوب صورتی کے اعتبار سے بہت بڑھ گئی تھیں۔

(OMORICWS) ماہر فنِ تعمیرات نے اموی دور کے فنِ تعمیر کو رومی اور شامی فن کاروں کا مرہونِ منت قرار دیا ہے بے شک یہ درست ہے کہ ان عمارات کی تعمیر میں رومی اور شامی فن کاروں نے کام کیا ہے۔ لیکن ان فنکاروں

کو اُموی تاجداروں نے اپنی تخلیقات کو بروئے کار لانے کے لیے بطور آلہ استعمال کیا (CLASS MASAIF)

اُندلس کی سرزمین اُموی خاندان کے لیے سیاسی لحاظ سے بہت زیادہ زرخیز ثابت ہوا۔ چنانچہ اموی حکمرانوں نے اس ملک کو اپنے جمالیاتی ذوق سے زندہ جاوید عمارات عنایت کیں۔ انھوں نے یہاں فن تعمیر کو انتہائی بلندیوں تک پہنچانے کی سعی کی۔ یہ دعویٰ کرنا تو بہت مشکل ہے کہ اُندلس کے اُموی کسی ایسے فنِ تعمیر کے خالق تھے جس کی مثال دنیا میں پہلے سے موجود نہیں تھی۔ البتہ یہ قطعاً درست ہے کہ اُندلس کے امویوں نے جس فن تعمیر کو روشناس کرایا وہ بہت اونچا اور بہرا عتبار سے پسندیدہ تھا۔ اموی جب اُندلس میں آئے تو وہ فن تعمیر کا بہت اونچا ذوق رکھتے تھے۔ اُموی ہر چیز کا ذوق شام سے لے کر آئے تھے۔ وہ دمشق میں بہت خوب صورت محلات میں رہتے تھے۔ یہاں آکر بھی انھوں نے ایسے ہی خوب صورت محلات میں رہنا چاہا مگر چونکہ یہاں کا ماحول مختلف تھا۔ یہاں کی عمارات صدیوں سے ایک خاص ڈھب اور انداز سے بنتی تھیں۔ اس لیے لازمی طور پر یہاں کی اُموی عہد کی عمارات میں مقامی معماروں کا مخصوص انداز اثر پذیر رہا۔ چنانچہ سرزمین اُندلس میں اموی فن تعمیر ایک مخلوط قسم کا فن تعمیر تھا جس میں بازنطینی، اندلسی، شامی اور ایرانی فن تعمیر کی اچھائیوں کے ساتھ ساتھ اموی ذہن کی نفاست اور جدت بھی شامل تھی۔ اُندلس میں اُموی حکمرانوں نے کثیر تعداد میں محلات تعمیر کیے جن میں سے چار جو کہ شہرت دوام رکھتے ہیں کے نام یہ ہیں۔

جامع قرطبہ۔ قصر رصافہ۔ الزہرا۔ الزاہرہ۔

جب کوئی نئی اور جوان قوم برسر اقتدار آتی ہے تو وہ اپنے مخصوص فن تعمیر ایجاد کرتی ہے۔ اُندلس کے اُمویوں نے بھی فن تعمیر میں کئی عناصر ایجاد کیے۔ اندلس میں امویوں سے پہلے بھی صدیوں سے عمارتیں بن رہی تھیں لیکن جب اموی آئے تو ان کی عمارتوں کا ڈھب یا ترتیب اور انداز اُندلس کی قوطی اور رومی عمارتوں سے بے حد مختلف تھا۔ محراب، ستون، چھتیں گو کہیں کہیں مشترک تھیں لیکن اکثر عرب معماروں نے ان میں نئی نئی ایجادیں کیں۔ کہیں ستونوں کے پیمانے میں اضافے کیے، کہیں اوپر کے حصے کو بدل ڈالا، کہیں محراب دو اندازکی بنائی، کہیں اپنے علم ہندسہ اور حساب کے زور سے محراب کی ایک شکل نکال لی۔ جوں جوں عرب اس فن میں زیادہ ماہر ہوتے گئے، ان کی تعمیر پہلے سے بدلتی گئی۔

اس دور کی عمارات کی خصوصیت کتبات کی تحریر تھی اور یہ اس قدر مرغوب صورت ہوئی کہ مسلمانوں کے زوال کے بعد متقدمین یورپ نے بھی ان جانے بوجھے اسے اختیار کر لیا۔ اموی عمارات میں مساجد کے سوا جانوروں کی تصاویر اور مجسموں سے بھی زیبائش کا کام لیا گیا۔ الزاھرا کی دیواروں پر ایسی بے شمار تصویریں بنائی گئی تھیں

عہد بنو عباس

اموی عہد کے خاتمے کے بعد عنان حکومت خاندان بنو عباس میں منتقل ہو گئی۔ خاندان بنو عباس کو قائم کرنے میں ایرانی امرا کا بہت زیادہ ہاتھ تھا۔ چناں چہ نہ صرف سیاست کے میدان میں بلکہ اس دور کے علم۔ ادب اور جمالیات میں بھی ایرانی اثرات بہت مستحکم نظر آتے ہیں۔ اموی عہد میں خلفاء کا میدان عمل شام کے صحرا تھے لیکن اب بغداد خاندان بنو عباس کی سرگرمیوں کا مرکز قرار پایا۔ بغداد کو اس دور میں اعلیٰ عمارات کی فراوانی کا جو شرف حاصل ہوا، وہ ایک تاریخی یادگار ہے۔ اس شہر کے علاوہ سامرہ (سرّ من رای) میں جو محلات تعمیر ہوئے وہ اپنے حسن اور زیب و زینت کا ایک اعلیٰ نمونہ ہیں۔ اس دور کی چند اعلیٰ عمارات کے نام یہ ہیں۔ باب الذہب۔ قصر الخلد۔ قصر اصافہ۔ الثریا۔ التاج۔ دار الشجر۔

اس عہد میں جو عمارات بھی تعمیر ہوئیں ان میں ایرانی اثرات نمایاں ہیں۔ نصف قطری کمانیں، روغنی ٹائلیں۔ دھاتوں سے ڈھکی ہوئی چھتیں۔ ایرانی طرز تعمیر کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ اور یہ تمام خصوصیات بدرجہ اتم خاندان بنو العباس کی عمارات میں پائی جاتی ہیں۔ مسٹر فلپ کے ہٹی نے اس خصوصیت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

"A distinctive type of Persian architecture was developed with void or elliptical domes, semicircular arches, spiral towers, indented battlement, glazed wall-tiles and metal-covered roof. This type became one of the most

powerful factor in the formation of "Abbasid Art".

بنوامیہ نے ایرانیوں اور شامیوں سے شان و شوکت ہی اخذ کی تھی لیکن بنو العباس نے ان کا طرز تعمیر بھی اپنایا۔

خاندان بنو العباس کا ۱۲۵۸ء میں چنگیز خاں کے ہاتھوں خاتمہ ہوا۔ یہ قدرت کا عظیم انتظام ہے کہ ادھر یہ پانچ صدیوں پرانا خاندان جس کے ادبی، علمی اور فنی چرچے رہتی دنیا تک یادرہیں گے تباہ ہو رہا تھا عین اسی وقت وسط ایشیا میں ایسے خاندان ابھر رہے تھے، جنھوں نے علم وادب و فنون لطیفہ کی سرپرستی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت اٹھا نہ رکھا۔ خاندان تیموریہ ۱۳۷۰ء میں خراسان اور ماوراء النہر میں قائم ہوا۔ ان کے عہد حکومت میں سمرقند و بخارا کو بہت اہمیت حاصل ہوئی، اور یہ مسلمانوں کے علمی، سائنسی اور فنون لطیفہ کے مراکز بن گئے۔ بابر جو ۱۴۸۲ء میں فرغنہ میں پیدا ہوا، اسی خاندان کا چشم و چراغ تھا اسی نے ہندوستان میں ۱۵۲۶ء میں مغلیہ خاندان کی بنیاد ڈالی۔

نویں صدی عیسوی کے آخری حصے میں خلفائے بغداد کی قوت بسرعت انحطاط کی منازل تک پہنچ رہی تھی۔ المعتمد کے عہد (۸۷۰ تا ۸۹۱ء) میں مصر آزاد ہو گیا اور شمال میں بخارا کے والی نے بغداد کا طوق اطاعت اتار کر پھینک دیا۔ یہ والی ایک تاتاری سردار سامان نامی کا پوتا تھا جس نے خود مختاری کا اعلان کیا، اور سامانی خاندان کی بادشاہی کی بنیاد ڈالی۔ اس خاندان کی حکومت کو تقریباً سو برس ہوئے تھے جبکہ ایک سامانی سپہ سالار کے ترکی غلام سبکتگین نے بھی اپنے آقا سے انحراف کیا، اور غزنی میں جہاں وہ صوبہ دار تھا شہرۂ آفاق غزنوی سلطنت قائم کر لی اس کا جانشین بیٹا محمود ہندوستان کی تاریخ میں عظیم فاتح کی حیثیت سے مشہور ہے۔

فرشتہ کا بیان ہے کہ سلطان محمود نے متھرا کی فتح کے وقت وہاں کے مندروں کے فن تعمیر کو بہت ہی استعجاب و حیرت سے دیکھا تھا۔ چنانچہ واپس آ کر اس نے غزنی میں سنگ مرمر اور سنگ سماق کی ایک عالیشان مسجد بنانے کا حکم دیا جو بعد میں عروس فلک کے نام سے مشہور ہوئی۔ امرائے غزنی کو اپنے بادشاہ کا مذاق عمارت دیکھ کر تحریک پیدا ہوئی اور وہ اپنے محلات و قصور نیز رفاہ عام کی عمارات میں رفعت و شان کے

اعتبار سے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے لگے۔ اس طرح بقول فرشتہ تھوڑے ہی دنوں میں غزنی مساجد و محلات، چاہ و تالاب، حوض و نہر کی کثرت اور خوش نمائی سے ایشیا کے سب شہروں پہ بازی لے گیا خاندان غزنوی کے خاتمہ کے بعد غوریوں نے تخت غزنوی پر قبضہ کیا۔ ان میں ایک نوخیز نسل کی قوت و ہمت موجود تھی، اور شہاب الدین غوری نے ہندوستان کو فتح کرکے ایک مستحکم مسلمان حکومت کی بنیاد ڈالی۔

ترک سلاطین ہند کی تعمیری تاریخ کا آغاز جس طرح شان و شوکت میں اپنی نظیر نہیں رکھتا۔ اسی طرح ان کی قومی خصائص کا بھی بہترین مرقع ہے۔ جونہی انھیں اپنی فتوحات کی طرف سے ذرا اطمینان حاصل ہوا، اسی وقت انھوں نے اپنے دو صدر مقامات یعنی دہلی اور اجمیر میں دو وسیع مساجد کی بنا ڈالی۔ جن کی عظمت و شان سے ان کے دین کا جاہ و جلال ظاہر اور دہ بت پرستوں پہ اُن کے غلبہ و ظفر مندی کا نشان ہوں۔ یہ سب لوگ سپاہی پیشہ تھے اور صرف ملک فتح کرنے آئے تھے اور ظاہر ہے کہ اپنے ہمراہ صناع اور معمار نہیں لائے تھے۔ لیکن تاتاری نسل کو دوسری مسلمان قوموں کی مثل تعمیر کا فطری اور قومی شوق موجود تھا۔ اور چوں کہ اپنا طرز خاص بھی رکھتے تھے۔ لہٰذا یہ خدشہ نہ تھا کہ وہ جو عمارت بنانی چاہیں گے اس میں خلا کھائیں گے۔ دوسرے انھیں اپنی نئی رعایا میں بے شمار کاریگر ایسے مل گئے جو نئے فاتح کی ہدایت کے مطابق ہر قسم کے نقشے پر عمارت بنانے کی صلاحیت رکھتے تھے۔

ہندوستان میں مسلم تہذیب اور ہندو تہذیب کا تصادم بہت نمایاں ہے۔ باوجودیکہ جب مسلمان بحیثیت فاتح داخل ہوئے تو ان کی مذہبی اور معاشرتی قوت میں زوال آچکا تھا، ان کی مرکزی سیاسی قوت کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ مذہبی اعتقادات میں ایرانی آمیزش نے ان کے ذہنوں میں کافی پیچیدگیاں پیدا کردی تھیں اور تہذیب بھی صدیوں پرانی ہوگئی تھی۔ مرور ایام کا تہذیب و تمدن پر گہرا اثر پڑ چکا تھا۔ لیکن ان تمام کمزوریوں کے باوجود ہم جب ہندوستان میں مسلمانوں کی عمارات اور ہندوؤں کی عمارات کا مقابلہ کرتے ہیں تو دونوں تہذیبوں کے نظریہ ہائے حیات کا فرق اتنا واضح اور بین نظر آتا ہے کہ انسان آسانی کے ساتھ دونوں تہذیبوں کے نمایاں خد و خال آسانی کے ساتھ مرتب کر سکتا ہے۔

مساجد و منادر

اس فرق کو مسلمانوں اور ہندوؤں کے معابد یعنی مسجد اور مندر میں بدرجہ اتم دیکھا جا سکتا ہے۔ مسجد کی وسعت اور سادگی مسلمانوں کی سادہ زندگی اور کشادہ دلی کا پتہ دیتی ہے۔ مندروں کی تنگ داماں اور پیچیدگی ہندوؤں کی تنگ دلی اور ان کی ذہنی پیچیدگیوں سے روشناس کراتی ہے۔ مندر کے تنگ و تاریک راستے، پیچ در پیچ تہ خانے، ہندوؤں کی ذہنی اُفتاد کو واشگاف بیان کرتے ہیں۔ اس کے مقابل مسجد میں سادہ نقش و نگار، عبادت میں سادگی اور آسانی مسلمانوں کے مذہب کی آسانی اور سادگی پر روشنی ڈالتے ہیں۔ غرضیکہ ان عبادت کدوں کی جتنی تفصیلات پر نگاہ ڈالیں گے۔ دونوں تہذیبوں کا تضاد واضح ہوتا جائے گا۔

باوجودیکہ مسلم تہذیب اور ہندو تہذیب ایک دوسرے کے مخالف واقع ہیں اور اس ملک میں مسلمانوں کی آمد کے وقت مسلم فن تعمیر پختگی تک پہنچ چکا تھا۔ لیکن تاہم مسلمانوں نے ہندوؤں کے فن تعمیر کے کافی اجزا اپنی عمارات میں استعمال کیے اور اس طرح انڈو اسلامک فن تعمیر کو جنم دیا لیکن اس فلسفہ اور روح کو جو مسلمانوں کے جمالیات کی جان ہے اس کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ دونوں تہذیبوں کا امتزاج پٹھان عہد کی عمارات میں نمایاں ہے۔

پٹھان عہد کی سب سے پہلی عمارت مسجد قوت الاسلام شمار کی جاتی ہے۔ یہ عمارت افغانی اور ہندو فن تعمیر کے امتزاج کی حامل ہے۔ اس میں جو مسالہ استعمال کیا گیا ہے وہ ہندوؤں کے مندروں سے حاصل کیا گیا تھا۔ اور اس کی تعمیر میں مقامی ہندو کاریگروں کو استعمال کیا گیا تھا چنانچہ اس مسجد کی محرابیں اور گنبد کی کمانیں افغانی طرز تعمیر کو ظاہر کرتی ہیں اور اس کی نقاشی اور دالان کے تنوع وغیرہ ہندی طرز تعمیر کو نمایاں کرتے ہیں۔ دوسری عمارت اجمیر میں اڑھائی دن کا جھونپڑا ہے گو یہ عمارت زیادہ اہم نہیں ہے لیکن اس میں ہندوانی اثرات کم اور افغانی اثرات زیادہ ہیں۔ اس عمارت کا طرز تزئین جس میں کوفی اور طغرائی خطوں کو استعمال کیا گیا ہے۔ اس عمارت کی جان ہے۔ اس عمارت کی نقاشی کی نظیر ملنی ناممکن ہے حتیٰ کہ اسپین اور ایران میں بھی کوئی عمارت اتنی کامل الحسن نہیں ہے

یہ دونوں مساجد ہندوستان کی سب سے پہلی مساجد ہونے کے اعتبار سے تاریخی قدر و قیمت رکھتی ہیں، اور دو مختلف نسلوں کی ممتاز خصائص کو ایسے واضح اور نمایاں طور پر پیش کرتی ہیں کہ انھیں ایک نسلیاتی وقعت حاصل ہو گئی ہے۔

علاؤالدین خلجی کی وفات کے بعد عہد تغلق و سادات کے معماروں کی طبائع میں تبدیلی واقع ہوئی اور شیرشاہ افغان کے زمانہ تک عمارتوں سے نقشے کی انتہائی سادگی ٹپکتی ہے۔ خاندان تغلق کے عہد میں جو عمارات تعمیر ہوئیں وہ سب قلعہ نما ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں منگولوں کے حملوں اور اندرونی سیاسی انتشار نے ہندوستان کے سلاطین کے ذہن پر اتنا گہرا اثر کیا تھا کہ وہ قلعوں کے علاوہ اور کچھ سوچ نہیں سکتے تھے، چنانچہ اس عہد کے مقبرے مساجد اور محلات سب قلعہ نما ہیں۔ عمارات میں چھوٹی اینٹیں استعمال کی گئی ہیں اور بیرونی دیواریں سلامی دار ہیں۔ نقش و نگار بھی زیادہ خوبصورت اور جاذب نہیں ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ عہد تغلق کے فن تعمیر پر اس دور کے اقتصادی حالات کا شدید اثر پڑا ہے۔ محمد تغلق کی وجہ سے ملکی خزانے پر جو بار پڑا تھا، اس کی وجہ سے عمارات پر زیادہ خرچ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ فیروز شاہ تغلق نے رفاہ عامہ کے لیے جتنی عمارات تعمیر کرائیں وہ مضبوط تو کافی تھیں لیکن ان میں نفاست و نزاکت اور تزئین کا کچھ زیادہ اہتمام نہ تھا۔ لیکن اس کے باوجود انہی ہر عمارت میں خوبی پیدا کرنے کی کوشش کی اور وہ اس میں کافی حد تک کامیاب ہوئے سادگی اور پختگی کے لحاظ سے وہ بہت اعلیٰ وارفع نظر آتے ہیں اور کوئی قوم ان کا لگا نہیں کھا سکتی۔

اب تک کی بحث سے یہ اندازہ ہو چکا ہوگا کہ مغل جس وقت ہندوستان میں فاتح کی حیثیت سے داخل ہوئے اس وقت تک ہندوستان کے اندر اور ہندوستان سے باہر مسلم فن تعمیر بہت ترقی کر چکا تھا۔ مغل جس علاقے سے آئے تھے وہ علاقہ تعمیرات کے اعتبار سے بہت زرخیز تھا۔ بابر سے تقریباً ۱۰۰ سال قبل تیمور نے سمرقند میں جو عالی شان عمارات تعمیر کرائی تھیں ان کا اثر یقیناً مغلوں کے فن تعمیر پر پڑا۔ چنانچہ مغلوں کی عمارات میں ایرانی اثر بالکل واضح اور نمایاں نظر آتا ہے۔ مغلیہ عہد کی پہلی عمارت ہمایوں کے مقبرہ کے گنبد تیمور لنگ کے مقبرہ سے ماخوذ ہیں۔

مغلیہ عہد کی عمارات کو مسٹر فرگوسن نے اپنی کتاب میں ان الفاظ میں خراج تحسین ادا کیا ہے۔

"مغلیہ عمارات میں ایک ایسا تسلسل اور تاریخی طور پر تکمیل کی وہ شان پائی جاتی ہے جس نے ان کا مطالعہ بہت ہی دل کش ہو گیا ہے۔ دوسرے ان میں بعض عمارات اس پائے کی ہیں کہ دنیا کے کسی ملک کے کسی تعمیری کارنامے سے بھی ان کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے، بلکہ بعض اعتبار سے ان میں جو ندرت اور فن کے اعجاز نمایاں ہیں وہ انھیں سب سے ممتاز اور کچھ لاثانی بنا دیتے ہیں یہاں تک کہ کسی دوسری عمارات کو ان کے مقابلہ میں لانا بھی دشوار ہو جاتا ہے"۔

ہندوستان کا موسم مغلوں کے مزاج سے مطابقت نہ رکھتا تھا۔ انھوں نے موسم کا مقابلہ تعمیرات سے کیا۔ بابر نے ۱۵۲۶ء میں ہندوستان میں مغلیہ عہد کی ابتدا کی۔ بابر کو صرف چند سال ہندوستان پر حکومت کرنے کی مہلت ملی۔ اور یہ عرصہ بھی راجپوتوں سے لڑنے اور حکومت کو مضبوط کرنے میں گذر گیا۔ بابر اپنے جمالیاتی ذوق کی تسکین کے لیے کوئی قابل ذکر یادگار قائم نہ کر سکا۔ تاہم اس نے نئی طرز کے تہ خانے اور محلات بنائے، ان کے علاوہ تین مساجد، پانی پت، اجودھیا اور سنبھل میں تعمیر کرائیں۔ تزک سے پتہ چلتا ہے کہ اس نے ان عمارات کی تعمیر کے لیے ایران کے ماہر تعمیرات سنان کے شاگردوں کو ہندوستان بلایا اور ان سے ان تمام عمارات کی تعمیر میں مدد لی۔

بابر کا عہد حکومت بڑا مختصر رہا۔ ہمایوں کا دور انقلابات اور نشیب و فراز کا زمانہ تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسے دور میں کوئی بڑا فنی کارنامہ نہیں پیش کیا جا سکتا تھا۔ تاہم فرشتہ اور دوسرے ماخوذین سے پتہ چلتا ہے کہ ہمایوں نے بھی اپنے دارالسلطنت میں بہت سی شاندار عمارتیں بنوائیں جن میں سات ایوانوں یا کوشکوں کا محل تھا جس کا ہر ایوان سبع سیارے سے جو ہفتے کے ایک ایک دن پر حکمران تصور کیے جاتے ہیں، منسوب تھا۔ ایک مسجد کے بنانے کی بھی روایتیں سنی جاتی ہیں جو دریائے جمنا کے کنارے اس جگہ کے بالمقابل واقع تھی، جہاں اب روضہ تاج محل ہے۔ اسی طرح آگرہ اور دہلی کی بہت سی عمارتوں کے سلسلے میں ہم بار بار اس کا نام سنتے ہیں جس سے یقین ہوتا ہے کہ اس کے پریشان عہد حکومت میں جس حد تک مہلت

مل سکتی تھی، اس حد تک وہ بہار تعمیر میں مصروف تھا۔ ہمایوں علم نجوم کا بہت دلدادہ تھا، اس نے اپنے محل کے قریب ایک رصدگاہ تعمیر کرائی تھی جس پر بیٹھ کر وہ سیاروں کی گردشوں کا مطالعہ کیا کرتا تھا۔ یہ وہی رصدگاہ ہے جس سے اترتے وقت اس کا پاؤں پھسل گیا تھا اور جس کے صدمے سے اس کی موت واقع ہوئی۔

اکبر کا دور ہندوستان کی تاریخ میں کئی حیثیتوں سے بڑی اہمیت رکھتا ہے، یہ دور باہمی ربط اور اتحاد کا عہد ہے جب ہندی اثرات اسلامی اثرات سے ہم آہنگ ہوئے۔ اس نامور شخص نے اپنے ۴۹ سال کے طویل عہد حکومت میں جو عمارات بنوائیں وہ ہندی اور مسلم فن تعمیر کا ایک مرکب ہیں۔ اگر اکبر اس طرز کے تتبع پر قناعت کر لیتا جو ترک و افغان سلاطین ہند نے اختراع کیا اور شیر شاہ کے زمانے میں اس کی تکمیل ہوئی تھی اس کے نتائج کا سراغ آسانی سے لگایا جا سکتا تھا لیکن اکبر کے مزاج کی بڑی خصوصیت وہ بڑی مذہبی رواداری تھی جو اس کے جملہ افعال سے ثابت ہوتی ہے معلوم ہوتا ہے اس کے دل میں اپنی ہندو رعایا کی ایسی ہی سچی محبت و قدر تھی جیسی اپنے ہم مذہبوں کی۔ اور خواہ طبعی میلان سے خواہ مصلحت کی بنا پر وہ ہندو فنون کی بھی ایسی ہی سرپرستی کرتا تھا جیسی خالص اسلامی فنون کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے تمام آثار میں دو طرزوں کی آمیزش موجود ہے۔ یہ آمیزش اکثر خوش نما مگر خلاف اصول پائی جاتی ہے۔ البتہ امید تھی کہ اگر آدھی صدی اور یہی سلسلہ جاری رہتا تو یہ دورنگی گھل مل کے ایک جدید طرز کی صورت اختیار کر لیتی لیکن ہندو مسلم میل ملاپ کا یہ جذبہ اسی کے ساتھ دفن ہو گیا، اس لیے جہاں گیر و شاہ جہان کی عمارتوں میں ہندو پن کا مطلق اثر نہیں پایا جاتا۔

اکبر کے سب سے ابتدائی کارناموں میں وہ مقبرہ ہے جو اس نے اپنے باپ ہمایوں کی قبر پر تعمیر کرایا ہمایوں پہلا مغل بادشاہ ہے جو ہندوستان میں دفن ہوا۔ پرانی دہلی کے کھنڈروں میں یہ مقبرہ ابھی تک خاصی طرح صحیح سالم حالت میں ہے۔ یہ عمارت نہایت وسیع ۲۲ فٹ بلند اور مربع چبوترے پر بنی ہے جس کی خوش نما محرابوں کے پائے سنگ مرمر کی پچی کاری سے اور بھی خوب صورت ہو گئے ہیں، خود مقبرہ بیچ سے ہشت پہلو ایوان ہے جس کا عمود ۷۴ فٹ ہے اور اوپر سنگ مرمر کا گنبد بہت ہی دل کش ڈھلاؤ دے کر بنایا ہے

اسی مقبرے کے نقشے پر بعد میں روضۂ تاج محل تیار ہوا۔ اس مقبرہ کے گنبد تیمور کے مقبرہ سے ماخوذ ہیں۔

عہد اکبری کی ایک بہت ہی ممتاز اور خاص یادگار، قلعۂ آگرہ کا پرانا یا لال محل ہے۔ جو سنگ سرخ یا بھربھرے پتھر سے بنایا گیا تھا۔ جو افسوس ہے اچھا قسم کا نہ تھا اور اسی لیے اس کا بہت سا آرائشی کام فرسودہ ہو کے اتر گیا ہے۔ اس محل کی چھت چپٹی ہے اور سلوں سے پاٹ دی گئی ہے جس کی سلوں کے نیچے جو شہتیریاں لگائی گئی ہیں وہ بالکل ہندوانی وضع کی ہیں۔ صحن کے گرد ساری عمارت کی طرز ہندوانی ہے کہیں محرابوں سے کام نہیں لیا گیا، بلکہ عمودی ساخت اختیار کی گئی۔ چپٹی سطح پر ہر جگہ سنگ تراشی کی ہے اور یہ طرز آرائش خاص اکبری ہے۔

ماہر تعمیرات کی حیثیت سے اکبر کا رتبہ فتح پور سیکری میں متعین ہوتا ہے۔ اس شہر کو اکبر نے خود آباد کیا جہاں تک معلوم ہے اس کے خلاف کی بنائی ہوئی کوئی عمارت وہاں نہیں پائی گئی۔ یہاں محل خاص۔ دیوان خاص۔ دفتر خانہ۔ پانچ منزلی حویلی۔ تین ...ٹی چھوٹی حویلیاں ہیں جو خاص طور پر قابل ذکر عمارات ہیں ان تمام عمارات میں کمال تکلف سے نقاشی کی گئی ہے۔ یہاں کی عمارات میں پتھر پہ نادر کام اور نقش و نگار اس کثرت سے کیا گیا ہے کہ کسی دوسری عمارت میں نہیں مل سکتے۔ تینوں چھوٹی حویلیاں زیادہ منقش و مزین ہیں۔ لیکن فتح پور سیکری کی اصل شان و عظمت اس کی مسجد سے ہے۔ اور ہندوستان میں کوئی دوسری مسجد اس پر فوقیت نہیں رکھتی۔ اس مسجد کی عمارت کے اندر دو مقبرے ہیں جو تمام و کمال سنگ مرمر کی عمارات ہیں۔ ان کے روشن دان اور جالی میں بے مثل اشکال ہندسی تراشی گئی ہیں۔ مجموعی طور پر فتح پور سیکری کی یہ نفیس عمارات ایک شاعری ہے جو پتھر میں کی گئی ہے، اور جس کی نظیر بہ کم بلکہ بہت ہی کم کہیں مل سکتی ہیں۔ اکبر کے عہد کی سب سے خاص و ممتاز عمارت غالباً اس مقبرے کو سمجھنا چاہیے جو اس نے آگرے سے پانچ میل شمال مغرب میں بمقام سکندرہ اپنے لیے بنانا شروع کیا اور ہندوستان کے تمام مقبروں سے جو پہلے یا بعد میں بنے اس کا طرز جداگانہ رکھا۔ اس میں بودھوں کی تقلید اختیار کی گئی تھی۔ یہ مقبرہ بیس برس تک بنتا رہا اور ۱۶۱۳ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچا

جہانگیر نے بھی اپنے بزرگوں کی فنی روایات برقرار رکھیں لیکن اس کی افتاد طبع اپنے بزرگوں سے جداگانہ تھی

وہ قلعوں کی چار دیواریوں سے نکل کر فطرت کی آغوش اور مناظر قدرت کی گود میں پہنچتا چلا جاتا تھا۔ اسے دیوان، قلعہ اور محل سے زیادہ کشمیر اور باغات سے دلچسپی تھی۔ اس کا بنایا ہوا شالیمار باغ اپنی منصوبہ بندی اور سجاوٹ کی بنا پر شاہان مغلیہ کی تعمیر میں جداگانہ حیثیت رکھتا ہے۔ اس عہد کی عمارتوں میں سجاوٹ سے زیادہ وسعت ملتی ہے اور مناظر قدرت کا باقاعدہ التزام پایا جاتا ہے۔ جہاں گیر نے لاہور کو پایہ تخت بنالیا تھا اور ۱۶۲۲ء سے اپنی وفات ۱۶۲۸ء تک اس کا دربار دہلی و آگرہ کی بجائے زیادہ تر اسی شہر میں رہا۔ جہاں گیر نے قلعہ آگرہ میں جہاں گیری محل۔ نور محل (جالندھر) کی سرائے کا خوب صورت دروازہ شالامار باغ اور سری نگر کے قریب گرمائی مکانات ۱۶۲۳ء میں بنوائے۔ لاہور میں انار کلی کا مقبرہ تعمیر ہوا۔ لاہور کے قلعہ میں شرقی خواب گاہ اور تین گنبد والی سنگ مرمر کی وہ موتی مسجد بھی اسی نے بنوائی جو اگرچہ سیدھی سادھی ہے۔ لیکن فن تعمیر کے اعتبار سے دلچسپ ہے۔ جہاں گیر کے عہد حکومت کی ایک اور قابل ذکر عمارت آگرے میں اعتماد الدولہ کا مقبرہ ہے۔ جسے نورجہاں نے اپنے باپ کی یادگار میں تعمیر کرایا تھا۔ یہ مقبرہ ۱۶۲۸ء میں مکمل ہوا۔ اس عمارت کی اصل خوبی یہ ہے کہ سراپا سنگ مرمر کی ہے۔ اور اول سے آخر تک قیمتی نگینوں سے وہ پچی کاری کی گئی ہے جو بظاہر پہلے کبھی نہ ہوئی تھی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہندوستان بھر میں اس طرز آرائش کی ایک بہترین مثال مہیا کرتی ہے۔

فن عمارت کی ساری تاریخ میں یک بیک اتنے بڑے تغیر کی نظیر ملنی مشکل ہے۔ جتنا کہ اکبر اور اس کے پوتے شاہ جہاں کے طرز تعمیر کے درمیان واقع ہوا۔ نہ اتنا بڑا فرق کہیں نظر آسکتا ہے جتنا کہ پہلے بادشاہ کی تعمیر کی مردانہ قوت اور بے اندازہ جدت طرازی اور دوسرے کی انتہائی ملکہ قریب قریب نسائی نازکی اور نفاست میں نمایاں ہے۔ واقعہ میں کہ ایک ہی قوم کے افراد جو ایک ہی دین کے متبع تھے اور ایک ہی مقام پر انھوں نے اپنے معابد اور محلات بنائے، ان کے درمیان اتنا بڑا فرق، کسی ملک کی تاریخ میں کبھی نہیں واقع ہوا۔ یہ فرق بھی آگرے کے محل سے بڑھ کر نمایاں نہیں ہے، کہ ایک طرف تو اکبر یا جہانگیر کا بنوائی ہوئی سرخ پتھر کی حویلیاں کھڑی ہیں، جن میں کثرت سے پیکر تراشی اور چوکور ہندوانی ساخت نظر آتی ہے۔ اور دوسری طرف دروازہ کھلتے ہی شاہ جہانی حرم سرا کی سفید مرمریں چار دیواری سامنے

آجاتی ہے جس میں نسائی دلکشی کی پوری شان ہے۔ اور اسی کے ساتھ اس خاص نفاست کا نقش بھی موجود ہے جو سوائے مشرق کے اور کہیں نہیں ملتی۔

آگرہ کی عمارات میں دیوان خاص کا ایوان عہد شاہ جہانی کی جمیل ترین عمارات میں داخل ہے۔ یہ سرسے پاؤں تک سنگ مرمر سے بنایا اور رنگ برنگ کے جواہرات جڑے ہیں۔ پتھر کھود کر جو نقش کھودے ہیں وہ نہایت خوب ہیں۔ اور کچھ یاقوت سرخ جواہرات سفید مرمر میں جڑ کر جو پھول بنائے ہیں وہ دیکھنے کے قابل ہیں۔

دہلی کے لال قلعہ کو یہ اعتبار تنوع اور تاریخی اہمیت کے لحاظ سے آگرے کے قلعہ پر فوقیت حاصل نہیں ہے لیکن اس میں ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وقت واحد میں ایک ہی نقشے کے مطابق تعمیر ہوا۔ دوسرے یہ کہ فن تعمیر کے لحاظ سے اسے ہندوستان کے سب سے عالی رتبہ وتجمل پسند بادشاہ نے تعمیر کرایا۔ یہ قلعہ دریائے جمنا کے کنارے واقع ہے۔ تریب تریب متوازی شکل میں بنایا گیا ہے۔ اس کے ہر طرف سُرخ بھربھرے پتھر کی شاندار فصیل کھڑی ہے جس میں تھوڑے تھوڑے فصل سے قبہ دار برج آ کے اور تازہ لطف پیدا کر دیتے ہیں۔ اس قلعہ میں ایک مشہور دیوان خاص جو دریا پر سایہ افگن ہوتا تھا۔ شاہ جہان کی عمارتوں میں اگر سب سے خوب صورت نہیں تو سب سے زیادہ آراستہ وزرنگار عمارت ضرور تھا۔ یہ آگرے کے دیوان خاص سے وسیع تر اور زیادہ مزین ومرصع تھا۔ یہی ایوان ہے جس کی چھت کے گرد یہ مشہور کتبہ کندہ تھا ؎

اگر فردوس بر روئے زمیں است ٭ ہمیں است وہمیں است وہمیں است

اس ایوان کے متعلق اگر یہ دعویٰ کیا جائے کہ کسی محل میں جو اس وقت دنیا میں موجود ہیں اس بے نظیر حسن وخوبی کا کوئی ایوان نہیں تو کچھ مبالغہ آمیز نہ ہوگا۔ اب اس قلعہ میں سرکاری عمارتوں میں صرف چار چیزیں یعنی نوبت خانہ۔ دیوان عام۔ دیوان خاص اور رنگ محل باقی رہ گئے ہیں۔

لال قلعہ سے بھی بڑھ کر تاج محل کی عمارت عہد شاہجہانی کا شاہکار ہے۔ ہندوستان کی کسی عمارت کے اتنے نقشے اور تصویریں نہیں کھینچی ہوں گی جتنی اس کی، اور نہ کسی کی تفصیلی کیفیت اتنی بار قلم بند ہوئی ہوگی۔ مگر ان سب باتوں کے باوجود جن لوگوں نے اسے نہیں دیکھا ان کے ذہن میں اس کا صحیح

نقشہ از تا قریب قریب غیر ممکن ہے جس کا سبب یہ نہیں ہے کہ اس میں انتہا درجہ کی نازکی اور چابکدستی سے کام لیا گیا ہے، یا اس میں نہایت ہی نفیس و خوش نما مسالہ لگایا گیا ہے۔ بلکہ یہ کہ اس کے نقشۂ تعمیر میں کمال بوقلمونی اور ندرت صرف کی گئی ہے۔ اگر تاج محل صرف مقبرہ ہوتا تو بھی اس کی علیحدہ کیفیت بیان کرنے کے قابل ہوتی لیکن لمبے لمبے میناروں کے ساتھ اس کا چبوترہ بجائے خود فن تعمیر کا ایک کارنامہ ہے۔ علاوہ ازیں پہلوؤں میں ایک طرف وہ مسجد جو اور کہیں ہوتی تو بذات خود قابل ذکر عمارت سمجھی جاتی۔ عمارتوں کا یہ سلسلہ مقبرے کے باغ کے ایک ضلعے پر پھیلا ہوا ہے۔ غرض یہ کہ ہر چند یہ مقبرہ بذات خود بہت خوبصورت عمارت ہے لیکن اگر تنہا ہوتا تو اس کا آدھا حسن بھی باقی نہ رہتا۔ اتنی خوب صورتیوں کا اس طرح جمع ہونا اور پھر ان کا ایک دوسرے سے کامل طور پر ملائم وو ابستہ ہونا ہی یہ اسباب ہیں جنہوں نے روضہ تاج محل کو مجموعی اعتبار سے وہ چیز بنادیا ہے کہ دنیا اس کا مثل پیش کرنے سے عاجز ہے

یہ عمارت جواہرات کی نگینہ کاری کا بے مثل نمونہ پیش کرتی ہے۔ روضے کے ہر انپڈرل۔ ہر گوشے اور جلہ ممتاز اجزا کا عکس۔ سنگ ستارہ اور زبرجد وغیرہ قیمتی نگینوں کی ترصیع سے دو بالا ہو گیا ہے۔ اور سنگ مرمر کی سفیدی جن کے اندر وہ جڑے ہوئے ہیں ان کی رنگینی کو اور بھی نمایاں کرتی ہے۔ اور مجموعی طور پر دہ حسین و گرانبہا طرز آرائش بن گئی ہے کہ عمارات میں اس سے بہتر طرز کبھی اختیار نہ کیا گیا ہوگا سامنے جمنا اور پیچھے باغ فوارے اور نہایت ہی عمدہ منقش دروازہ۔ پھر اس کے مسالے کی خوبی اور تشکیل کا حسن یہ سب عناصر ہیں کہ دنیا بھر میں ایسی کسی عمارت کو بھی روضہ تاج محل کے مقابلے کے لیے ٹوک سکتے ہیں۔

دہلی کی جامع مسجد سنہ ۱۶۴۴ء میں بننی شروع ہوئی اور سنہ ۱۶۵۸ء میں پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ اس کا نقشہ موتی مسجد کے نقشے سے مشابہ ہے۔ اگرچہ پیمانہ بڑا ہے، اور دو مینار بھی اضافہ کیے ہیں۔ اسی کے ساتھ سنگ مرمر میں سنگ سرخ کی آمیزش نے وہ نفاست و پاکیزگی پیدا کی ہے جو اسی کا حصہ ہے۔ اسے بہت ہی بلند کرسی پر تعمیر کیا گیا ہے۔ اس مسجد کے باہر سے دیکھنے پر بہت زیادہ اثر پڑتا ہے۔

غرضیکہ شاہجہاں کا دور عہد مغلیہ کا زرّین دور ہے۔ فن تعمیر نے اس دور میں بے انتہا ترقی کی۔ شاہجہاں نے حسین و جمیل عمارتوں کا ایک جال بچھا دیا۔ جامع مسجد دنیا کی عظیم اور خوب صورت مسجدوں میں سے ایک ہے۔ شاہجہاں کا لال قلعہ صرف شاہی اقامت گاہ ہی نہیں تھا بلکہ ایک تہذیبی اور تمدنی مرکز بن گیا تھا۔ جہاں ہماری تہذیب اور پھر ہماری قومی زبان اردو معلّٰی نے تاب و توانائی حاصل کی۔ جہاں کی بولی اردو ئے معلّٰی بن گئی اور کوثر و تسنیم کی پاکیزگی کو شرمانے لگی۔ دیوان عام و خاص کی عظمت اور چمک آج بھی باقی ہے۔ اگرچہ فوجی تاجروں نے ہیروں اور جواہرات کی جگہ پتھر اور شیشے جڑ دیے اور تاج محل ــ اس تخلیق جمیل کے ذریعے شاہ جہاں نے دورِ مغلیہ کو ہمیشگی کی زندگی عطا کر دی۔ تاج محل انسانی جذبہ محبت کی طرح تابناک ہے۔

اورنگ زیب عالمگیر کا آدھا دورِ حکومت دکن کی وادیوں میں جنگ کرتے گذر گیا۔ اس لیے اسے فن تعمیر کو ترقی دینے کا موقع نہ مل سکا۔ ذاتی طور پر وہ فن تعمیر میں زیادہ دلچسپی نہ رکھتا تھا۔ وہ شاعر کم تھا فوجی زیادہ۔ اس کے عہد میں شاہی مسجد لاہور اور رابعہ دورانی کا مقبرہ دو اہم عمارتیں ہیں۔ لیکن ان دونوں عمارتوں کے نقش اور بیل بوٹے پکار پکار کر مغلیہ فن کے زوال کا پتہ دے رہے ہیں ان عمارات میں نفاست اور خوب صورتی کی بجائے تھکا دینے والے نقوش ہیں۔ اورنگ زیب کے بعد حکومت مغلیہ کا زوال شروع ہو گیا اور حکومت کے زوال کے ساتھ فن تعمیر کا زوال بھی۔

تعلیمی دنیا پر ایک نظر

تعلیم بالغاں

ایک سرکاری محکمے کے لیے چند ایسے افسروں کی اسامیوں کے لیے مقابلے کا امتحان تھا جنھیں دیہات میں جاکر کام کرنا تھا۔ انٹرویو کے لیے جن امیدواروں کو طلب کیا گیا تھا۔ ان میں سے ہر ایک سے ایک سوال مسلسل پوچھا گیا اور وہ یہ کہ ہمارے دیہات کی ترقی کے راستے میں کونسی بنیادی مشکل حائل تھی۔ اس کا جواب ہر اُس امیدوار نے جس کا تعلق دیہات سے تھا، یہی دیا کہ دیہات کا سب سے کٹھن مسئلہ تعلیم کی کمی ہے۔ ہمارے دیہاتی تعلیم سے بے بہرہ ہیں۔ اس لیے اکثر اوقات ان کے مسائل کو حل کرنے میں بڑی مشکلات کا سامنا ہوتا ہے۔

انٹرویو کے بعد بعض احباب سے اس مسئلے کا ذکر چھڑ گیا، اور بات تعلیم بالغاں پر جاکر رُکی ہم سوچنے لگے کہ ہمارے ملک میں جو اتنی بڑی تعداد ناخواندہ لوگوں کی ہے، ان کی تعلیم کا مسئلہ کس طرح حل کیا جائے۔ اسی بحث و تمحیص کے دوران میں میرا دھیان میکسیکو کی طرف گیا۔ جہاں یہ مسئلہ کئی برس پیشتر وہاں کے لوگوں کی توجہ کا مرکز رہا تھا۔

میکسیکو میں بھی ہمارے ملک کی طرح ناخواندہ لوگوں کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ ترقیٔ وطن کے تمام مسائل ادھورے پڑے تھے، آخر اس گتھی کو سلجھانے کے لیے حکومت نے ایک صاحب کمال فرزندِ وطن کو جن کا نام "بودیت" تھا، اس مسئلہ کو سلجھانے کا فرض سونپا۔

"بودیت" اس بات سے اچھی طرح آگاہ تھا، کہ کوئی ملک اس وقت تک مہذب نہیں کہلا سکتا جب تک ملک کے اس طبقے کو جو سکول میں جانے کی عمر سے تجاوز کر چکا ہے۔ جاہل اور علم سے بے بہرہ رہنے دیا جائے۔ چنانچہ اس نے حکومت کو مشورہ دیا کہ یہ بات لازمی قرار دی جائے کہ ہر پڑھا لکھا شخص ایک اَن پڑھ شخص کو ایک مقررہ میعاد کے اندر اندر پڑھانے کا ذمہ دار ہوگا۔

اس تحریک کے شروع ہونے سے قبل اس کے مقاصد اور اس کے فوائد سے ہر شخص کو آگاہ کرنے کے لیے ایک بہت بڑے پیمانے پر پبلسٹی کا اہتمام کیا گیا۔ ریڈیو، اخبارات، اشتہارات گھومنے والی سرکس، سفری تماشوں، ڈاک کے ٹکٹوں غرضیکہ ہر ممکن طریقے سے لوگوں کو اس تحریک کی اہمیت سے آگاہ کیا گیا۔ اس کے بعد جیسے ہی قانون نافذ ہوا، رجسٹروں میں ہر گھر کے پڑھے لکھے لوگوں کے ناموں کی فہرستیں بنا دی گئیں اور ان کے آگے ان لوگوں کے نام درج کیے گئے جنھیں پڑھانے کی ذمہ داری ان پر عائد ہوتی تھی۔ شرط یہ تھی کہ چھ ماہ کے اندر اندر ہر شخص اپنے شاگرد کو پڑھا لکھا کر تعلیم کے ایک مقررہ معیار تک پہنچا دے۔ قانون کے نافذ ہوتے ہی یوں معلوم ہوتا تھا جیسے میکسیکو ایک درس گاہ کا نام ہے۔ جہاں ہر وقت ہر جگہ کوئی نہ کوئی شخص کتاب کھولے بیٹھا یا پڑھ رہا ہے۔ دونوں جانتے ہیں کہ چھ ماہ کے بعد جو امتحان ہونے والا ہے، اس میں اگر طالب علم نے پڑھنے لکھنے کا کوئی ثبوت نہ دیا تو دونوں کی خیر نہیں۔ ایک مختصر سے عرصے میں اس کتاب کی ایک کروڑ کاپیاں چھپوا کر جو تعلیم بالغاں کے لیے خاص طور پر تیار کی گئی تھی۔ اس کے ساتھ ستر لاکھ نوٹ بک اور پچاس لاکھ کاپیاں اس ہدایت نامے کی تیار کی گئیں، جو پڑھانے والے کی رہنمائی کے لیے تصنیف کیا گیا تھا۔

تھوڑے عرصے کے بعد ایک بہت بڑی عملی مشکل نے اس تحریک میں ایک الجھن پیدا کر دی۔ اور وہ مشکل یہ تھی کہ شہروں میں تعلیم یافتہ آدمی مقابلتاً بہت قلیل تعداد میں تھے۔ اس مشکل کو حل کرنے کے لیے فیصلہ کیا گیا کہ رضاکاروں کی جماعتوں کو دیہاتوں میں بھیجا جائے۔ جو چھ ماہ کے لیے وہیں سکونت پذیر ہو کر لوگوں کی تعلیم کا اہتمام کریں۔ ان سفری سکولوں کے ساتھ ساتھ ایسے مشن بھی بھیجے جائیں جو لکھنے پڑھنے کے علاوہ دیہات کے لوگوں کو صفائی اور زراعت کے جدید اصولوں سے باخبر کریں۔ مکانوں کی تعمیر میں مشورہ دیں اور بیماریوں کا مقابلہ کرنے کے طریقوں سے آگاہ کریں۔

مگر یہ تحریک جو دراصل حکومت نے چلائی تھی ایسی نہ تھی کہ سرکاری چیز بن کر رہ جاتی

سارا ملک اس تحریک کے فوائد سے متاثر ہو کر اس میں شامل تھا۔ ناشرین کے ایک ادارہ نے دنیا کی مشہور کلاسیکی تصانیف کو طبع کر کے کوڑیوں کے مول سارے ملک میں بکھیر دیا۔ ایک ماچس بنانے والی کمپنی نے مصوری کے مشہور زمن شاہکاروں کو اپنی ماچسوں کے اوپر چھاپ کر عوام کو ان نوادر سے آشنا کرنے کی کوشش کی۔ ایک اور مالدار فرم نے باغیچوں اور سیرگاہوں میں لاؤڈ سپیکر لگوا کر کلاسیکی موسیقی کی ترویج کا اہتمام کیا۔

غرضیکہ چند برس میں یہ تحریک ملک کے لیے ایک ایسی نعمت ثابت ہوئی کہ جہالت کا بڑی حد تک صفایا ہو گیا اور ملک کی بہت بڑی آبادی تعلیم کی نعمت سے بہرہ ور ہو گئی ایسی تحریک شاید ہمارے ہاں آسانی سے نہ چل سکے۔ ہمارے ہاں کئی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ پنجابی، پشتو، سندھی، بنگالی، بلوچی، ہر علاقے میں اپنی اپنی زبان ہے۔ لیکن یہ مسئلہ ایسا ہے جس کا حل ہم سب کو سوچنا چاہیے۔ جب تک ہمارے ملک میں بالغوں کی تعلیم کا معاملہ صحیح طور پر طے نہیں ہو جاتا ہماری ترقی کی رفتار اتنی تیز نہیں ہو سکتی، جتنی ہم سب کی خواہش ہے

(ماخوذ از محکمۂ تعلقات عامہ)

برٹش میوزیم کے متعلق ایک پاکستانی کے تصورات

برٹش میوزیم لندن یونیورسٹی کے مرکزی علاقہ میں واقعہ ہے اور اپنے قیمتی خزانوں اور نادر اشیا کے لیے دنیا بھر میں مشہور ہے۔ برطانوی حکومت نے ۱۷۵۳ء میں اسے قائم کیا تھا۔ آج کل یہ دنیا بھر سے حاصل کی ہوئی نایاب اور نادر اشیا کا مخزن ہے۔

اس میوزیم پر ۵ لاکھ پونڈ سالانہ خرچ ہوتا ہے۔ جن لوگوں کو میوزیم کے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے وہ اس بات سے ضرور اتفاق کریں گے کہ اس کی دیکھ بھال اور نگرانی پر روپیہ جائز اور صحیح طور پر صرف ہوتا ہے۔ بحیثیت ایک مشرقی باشندہ کے مجھے ان آثار سے زیادہ دلچسپی تھی جو ہمارے خطے یا ان تہذیبوں سے متعلق ہیں جن کا میری تہذیب سے واسطہ رہا ہے۔ میں نے میوزیم میں چند ایسی دستاویز اور نادر اشیاء بھی دیکھی ہیں جن کا ثانی ملنا مشکل ہے

یہاں ایک خوب صورت گیلری میں کچھ ایسی کتابیں موجود ہیں جو جارج چہارم نے میوزیم کو پیش کی تھیں۔ وہیں شیشہ کے خانہ میں سات جلدوں پر مشتمل ایک قرآن شریف نظر آیا، جس کے عنوانات سنہرے اور نیلے جلی حروف میں لکھے ہوئے ہیں۔ یہ قرآن سنہ ۱۳۰۴ئ میں سلطان الناصر محمد بن قلاون کے حاجب نے بحر ملوک رکن الدین بیبرس کے لیے نقل کیا تھا۔ نیلے رنگ کی تحریر آج بھی اسی قدر پختہ ہے جس قدر تحریر کے وقت ہو گی۔

میں اس بات سے اور بھی متاثر ہوا کہ میوزیم کے ارباب اقتدار اسلامی دستاویزات کی مسلسل نگرانی کرتے ہیں۔ ان کی حالت کو خراب ہونے سے بچانے اور انھیں ہر طرح محفوظ رکھنے کے لیے ہر ممکن سائنسی طریقہ اختیار کیا جاتا ہے۔ یہ کتابیں عام لوگوں کی پہنچ سے باہر ہیں، البتہ یہ ان طلبا اور محققین کو دی جاتی ہیں جو میوزیم میں ان سے استفادہ کرتے ہیں۔ خود میوزیم کے کتب خانہ میں تقریباً ہر زبان کی ساٹھ لاکھ سے زائد کتابیں موجود ہیں۔ ہر مشرقی زبان کا ایک مخصوص شعبہ ہے، درازوں کی مجموعی لمبائی پچھتر میل ہے۔

قدیم کتابوں کو محفوظ رکھنے اور بوقت ضرورت حاصل کرنے کا جدید ترین طریقہ یہ ہے کہ بذریعہ رنگین فوٹو گرافی ان کی نقل کر لی جاتی ہے۔

نظامی کے قلم سے لکھے ہوئے ایک فارسی خمسہ کی نقل پر بھی نظر پڑی۔ جو شاہ محمود نیشاپوری نے سنہ ۱۵۳۹ء اور سنہ ۱۵۴۳ء کے لگ بھگ شاہ طہماسپ کے لیے لکھا تھا۔ اگر ایک طرف ایک قدیم نسخہ کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکا تو ساتھ ساتھ مجھے اس کا بھی احساس تھا کہ صناع کے قلمی نسخہ کا یہ حسین نمونہ متعدد برطانوی محققین کے زیر غور تھا، میں ان کے خیالات معلوم کرنے کا بے حد شائق تھا۔ رنگوں کی آمیزش اور تصاویر کے طرز کے بارے میں ان کے خیالات کا علم ہو کر خوشی ہوئی۔ اگرچہ اس فن سے وہ ناواقف تھے۔ البتہ میں نے یہ ضرور محسوس کیا کہ فن کار نے تین سال جو اس مخصوص کام پر صرف کیے وہ بے کار نہیں گئے۔ اس کی محنت و مشقت اور جگر کاری نے دنیا کی قوموں میں جو قبیلانہ مناقشات سے برسرپیکار ہیں ایک مشترکہ قدر پیدا کر دی ہے اور بھائی چارہ کا جذبہ ابھار دیا ہے۔

میں نے یہ بھی دیکھا کہ عربی و فارسی کے دستاویزات اور مسودات کی تعریف میں میوزیم اور عوام دونوں ہی ان کے حسن و جاذبیت کے علاوہ مختلف تہذیبوں کے نمائندہ ہونے کے سبب، رطب اللسان ہیں۔ وہ خاموشی کے ساتھ ایک تہذیب کا پیام دوسری تہذیب کو پہنچا رہے ہیں۔ علم آثارِ قدیمہ اور علم انسان کی گیلری میں دو ہزار سال قبل مسیح پرانی مشرق وسطیٰ کی تہذیبوں کے آثار موجود ہیں۔ سمیری۔ عکی بابلی اور کلدانی تہذیبوں کے بعد سلوس، پارتھیائی اور اسلامی تہذیبیں معرض وجود میں آئیں۔

یہ امر بھی باعثِ مسرت ہے کہ برطانوی سیاح ماضی کی عظیم تہذیبوں کے آثار کو بڑی گہری نظر سے دیکھتے اور ان کا مقابلہ کرتے ہیں۔ وہ ان کو محض تعجب یا تفریح طبع کے لیے نہیں بلکہ ان مرحوم ہستیوں کو جنہوں نے آرٹ اور ثقافت کی دنیا پر بڑا گہرا اثر ڈالا ہے۔ احترام اور عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

فارسی خوشنویسی اور خطاطی کا ایک دوسرا نادر نمونہ جس نے مجھے اپنی طرف متوجہ کیا صفوی دور کا لکھا ہوا کلیات شیخ سعدی تھا جو ۱۵۶۶ء میں لکھا گیا تھا۔ اس کے رنگ کا بجنسہٖ محفوظ رہنا کاتب کی مہارت فن اور میوزیم کے اربابِ اقتدار کی کارکردگی کا بین ثبوت ہے۔

نئے نئے سمندر

گزشتہ دس یا پندرہ سال کے عرصے میں سوویٹ یونین کے نقشے میں نیلے رنگ میں کافی اضافہ ہوگیا ہے۔ عظیم روسی والگا دریا کا ناک نقشہ بدل گیا۔ ایک پتلی سی لکیر کے بجائے اب نقشے پر بڑی اور چھوٹی جھیلوں کا ایک سلسلہ نظر آتا ہے۔ جو لینن شہر سے سرحد پار ہو کر بحیرۂ کیسپین تک جا پہنچتا ہے نیز اور کاما دریاؤں کی شکل و صورت بھی ایسی ہوگئی ہے۔ بیکال جھیل کے جنوب میں ایک نئی کھاڑی ہے اور دریائے انگارہ کا منبع ۵ کیلومیٹر مغرب کی جانب ہٹ گیا ہے۔ ارتش اور اوب دریاؤں پر بڑی بڑی نئی جھیلیں نمودار ہوگئی ہیں۔ یہ سب تبدیلیاں جس کے لیے قدرت کو لاکھوں کروڑوں برس درکار تھے بڑے تھوڑے وقفے میں انسان کے ہاتھوں ظہور میں آئی ہیں۔ کئی نئے آبی ذخیرے طول و عرض میں درجنوں بلکہ سینکڑوں کیلومیٹروں تک ہیں۔ جبکہ ان کی گہرائی درجن میٹر سے جا پہنچتی ہے۔

طوفانی موسم میں ان کی گہرائی ایک سے پانچ میٹر تک بلند ہوتی ہے۔ اس لیے صرف بیلوں میں سفر کے لیے خاص طور پر بنائے ہوئے یا سمندر میں سفر کے کرنے والے جہاز ان بڑے بی ذخائر کو سمندر کہیں تو بے جا نہ ہوگا۔

روس میں نسبتاً سب سے پہلا بڑا ذخیرہ ۲۵ برس پیشتر دریائے نیپیر پر مشہور نیپرو جس ڈیم باندھ کر بنایا گیا تھا۔ نیپیر کی ڈھلوان تلہٹی کو گھیرے میں لیے اس آبی ذخیرے نے نیپیر دریا کے آخری شمالی حصے سے لے کر اس کے دہانے تک جہاز رانی کے پرانے مسئلے کو حل کر دیا۔

دریائے والگا پر پہلا بڑا ذخیرہ یا ایوانکوانف یا بحیرہ ماسکو تھا جسے والگا ماسکو نہر تعمیر کرنے کے سلسلے میں ۱۹۳۷ء میں بھر دیا گیا تھا۔

طویل و عریض تزیمنک بحیرہ کا پانی گزشتہ جنگ حب وطن کے موقع پر شہر باکوف کے قریب کی وادی میں اچھل کود کر رہا تھا۔ یہ ذخیرہ آب جھیل ادیگا کے سائز کے نصف ہے۔ یہ جھیل یورپ دوسری بڑی جھیل ہے۔

جنگ کے بعد اس سے بڑے بڑے ذخیرے ملک کے نقشے پر ابھرے ہیں۔ ان میں سے سب سے پہلا تسلیا نکایا بحیرہ تھا، جو دریائے ڈان پر ۱۹۵۲ء میں مکمل کیا گیا تھا۔ اس بحیرہ سے جو والگا جہاز رانی کے لیے نہر اور تسلیا نکایا کے بجلی گھر کی تعمیر کے سلسلے میں تعمیر کیا گیا تھا۔ اس علاقہ میں بجلی کی سپلائی دریائے ڈان میں جہاز رانی جنوبی بنجر میدانوں میں آب پاشی کے مسائل کو حل کر دیا تھا۔ اور اس کے تھوڑے عرصے بعد قفقاز سے کیسپین تک بہنے والے دریا "کورا" کا پانی آذربائیجان میں منگیچور آبی ذخیرہ کو بھر رہا ہے۔ اس عظیم بند کی دیواریں اسی میٹر تک بلند ہیں اور اس کا پانی نہ صرف یہ کہ پن چکی کے پنکھوں کے پنکوں کو حرکت میں لاتا ہے۔ بلکہ اس نے کورالینڈ کے نیم صحرائی میدانوں کو نئی زندگی بخشی۔ اب یہ میدان ملک کے روئی پیدا کرنے والے عظیم علاقوں میں سے ایک ہے۔ لیکن جب رقبہ کے لحاظ سے ان ذخائر آب کا مقابلہ کیو بنیو بحیرہ دریائے والگا پر سے کرتے ہیں تو ان کی حیثیت معمولی سی رہ جاتی ہے۔ مذکورہ بحیرہ ۱۹۵۶-۵۷ء میں تعمیر ہوا تھا۔ ۵۸ء کے موسم گرما تک اس میں

پانی کی مقدار ۲۵ ارب کیوسک میٹر تک پہنچ گئی تھی۔ بحیرہ مارخوز کا رقبہ اس بحیرہ سے دگنا ہے ذخیرہ آب زنگولا سلسلہ کوہ سے لے کر وانگا کے ساتھ ۵۰۰ کیلومیٹر تک پھیلا ہوا ہے۔ بعض مقامات پر تقریباً چالیس کیلومیٹر چوڑا ہے۔ کیونکہ بحیرہ پر درجنوں نقشے اور بندرگاہیں نئے سرے سے تعمیر کی جا رہی ہیں۔

اس بحیرہ کا رقبہ اتنا بڑا ہے کہ دریائے وانگا کو بھی جس میں پانی کی بڑی مقدار رہتی ہے اس کو بھرنے کے لیے دو سال کا عرصہ لگا۔ لیکن بیشتر اس کے کہ دریائے وانگا اس آبی ذخیرہ کو بھرتے تعمیر کرنے والوں کو سخت محنت کرنی پڑی، ۲۵۰ سے زائد آبادیوں ہزاروں گھروں اور ہزاروں صنعتی اور روسی عمارات کو اس جگہ سے ہٹانا پڑا۔ جہاں آج نکرا بکیو بیتو بہتا ہے۔ ایک بڑے سے رقبہ میں سے جھاڑیوں اور جنگلی درختوں کو صاف کرنا پڑا۔ کیوں کہ جہاز رانی کے لیے یا مچھلی پکڑنے کے لیے جالوں کو کٹنے سے بچانے کے لیے ذخیرہ آب کا بند بالکل صاف ہونا چاہیے اور کچھ عرصہ بعد دریائے وانگا کا پانی شالن گراڈ ذخیرہ آب کو بھرنا شروع کر دے گا۔ اس میں مچھلیوں کی افزائش بڑی سرعت سے اور وسیع پیمانے پر ہو گی۔ انسانی ہاتھوں کے بنائے ہوئے سمندر رنحبلا کی تکمیل کے بعد بحر کا ایک آبی راستہ تیار ہو جائے گا۔ روسی نام ایجنسی کی اطلاع ہے کہ روسی ماہرین اس سمندر کی تکمیل کا کام اگلے سال شروع کر رہے ہیں۔ یہ سمندر ۳۰۷ میل لمبا ہو گا۔

تعلیم کا دوسرا عالمی جائزہ

اقوام متحدہ کے تعلیمی سائنسی اور ثقافتی ادارے (یونیسکو) نے ایک نیا تعلیمی جائزہ شائع کیا ہے جس کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ اگرچہ دنیا کی آبادی تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ تاہم دنیا بھر میں تعلیمی سہولتوں میں اس سے بھی زیادہ تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ لیکن ۵ سے ۱۴ سال کے درمیان عمر کے تقریباً نصف بچے اب بھی مدرسوں میں داخل نہیں ہیں۔

تعلیم کے دوسرے عالمی جائزہ کی ضخامت ۱۴۸۰ صفحات ہے۔ اس میں ۱۹۷ ملکوں اور علاقوں کے تعلیمی طریقوں کے اعداد و شمار اور ایسے تجزیئے شامل ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عمر والے

بچوں کی کل تعداد ۵۰ کروڑ ہے۔ ان میں سے ۲۵ کروڑ بچے مدرسوں میں داخل نہیں ہیں۔ بالفاظ دیگر دنیا کے نصف سے کچھ زیادہ بچے مدرسوں میں داخل ہو کر کسی نہ کسی قسم کی تعلیم پا رہے ہیں۔

جائزے میں یہ بھی لکھا ہے کہ ۱۹۵۴ء میں مدرسوں میں داخل ہونے والے تعلیم کے لائق بچوں کی تعداد ۵۵ فیصد تھی۔ جبکہ ۱۹۵۰ء میں ان کا تناسب ۴۸ فی صد تھا۔

اس قسم کے عام اعداد و شمار مرتب کرنے کے لیے جس احتیاط کی ضرورت ہے۔ اس کا پوری طرح لحاظ رکھتے ہوئے خاص نتیجہ یہ اخذ کیا گیا ہے کہ دنیا میں آبادی کے اضافے کی بہ نسبت تعلیمی سہولتیں زیادہ تیزی کے ساتھ بڑھ رہی ہیں اور یہ کہ زیر تبصرہ چند سال کے دوران میں ارباب تعلیمات آدھے راستے سے آگے بڑھنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔

تعلیم کے اس دوسرے عالمی جائزے میں جس کا وزن تقریباً ساڑھے تین سیر ہے۔ تعلیمی نظام کے تقریباً ہر پہلو پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مثلاً تعلیم کا معیار۔ مدرسوں میں داخل ہونے والے لڑکے اور لڑکیوں کی الگ الگ تعداد۔ تعلیم کے سرکاری اخراجات اور ایسی ہی بہت سی مفید باتیں درج ہیں۔ نفس مضمون کو زیادہ واضح کرنے کے لیے نقشے۔ خاکے اور جدولیں شریک اشاعت ہیں۔ اس جائزے کے دو بڑے مقصد ہیں، اول یہ کہ لوگوں کو ابتدائی تعلیم کا عالمی نظریہ معلوم ہو جائے اور دوسرے یہ کہ دنیا کے ہر ملک اور ہر علاقے کی درس گاہوں اور تعلیمی طریقوں کے بارے میں یہ جائزہ ایک بھرپور ذریعۂ معلومات ثابت ہو۔

ایسے جائزے ہر تیسرے سال شائع ہوا کریں گے۔ یہ اس سلسلے کا دوسرا جائزہ ہے۔ اس میں ابتدائی تعلیم کی اس ترقی پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے جو ۱۹۵۰ء سے اب تک ہوئی ہے۔ پہلی اشاعت میں تعلیم کے موضوع پر بحیثیت مجموعی روشنی ڈالی گئی تھی۔ تیسری جلد میں ثانوی اور پیشہ ورانہ مدرسوں کا بیان اور تیسری جلد میں یونیورسٹیوں کی تعلیم پر بحث کی جائے گی ۔
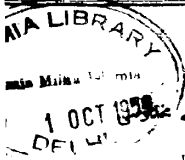
شمارہ ۳] لاھور [جون

اس شمارہ میں

مدیر { پروفیسر سراج الدین
پروفیسر ایم ۔ اے ۔ مخدومی }
معاونین { عبدالغفور چوہدری
فضل احمد }

تعلیمی ماہ نامہ

آموزش

لاہور

جون سنہ ۱۹۵۹ء

جلد ——— ۱۲

شمارہ ——— ۳

سالانہ چندہ

غیر ممالک کے لیے ۸ روپے

پاکستان کے لیے ۶ روپے

قیمت فی پرچہ دس آنے

پبلشرز

یونی ورسٹی بک ایجنسی لاہور

آر۔ ایچ۔ ڈی سی خالد پرنٹر پبلشر نے دین محمدی پریس لاہور میں طبع کرا کے
یونی ورسٹی بک ایجنسی ۲ کچہری روڈ لاہور سے شائع کیا

میٹرک کے نتائج

ایم۔ اے مخدومی

سنہ ۱۹۵۹ء کے امتحان میٹرک کے نتائج اس وقت ہمارے سامنے ہیں۔ ان پر سرسری نگاہ ڈالنے سے ذیل کے امور دعوت فکر دیتے معلوم ہوتے ہیں :-

(۱) پچھلے سال میٹرک کے امتحان میں ۵۷۲۹۱ امیدوار شریک ہوئے تھے اور مدرسوں کے طلبہ کے لیے کامیابی کا فی صد تناسب ۴۶ تھا۔ اس کے مقابلے میں اس سال امتحان میں شامل ہونے والوں کی تعداد ۶۴۰۵۷ تھی۔ ان میں سے صرف ۳۷۰۷۷ امیدوار کامیاب ہوئے اور مدرسوں کے طلبہ کے لیے کامیابی کا تناسب ۵۸ فی صد رہا۔ ان اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ صرف ایک سال میں امتحان میٹرک کے امیدواروں کی تعداد تقریباً سات ہزار بڑھ گئی۔ یہ اضافہ اس اعتبار سے خوش آیند ہے کہ ملک میں پڑھے لکھے نوجوانوں کی تعداد تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ مگر معاملے کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ کیا مدرسوں کی تعداد میں بھی اسی تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے جس تیزی سے طلبہ کی تعداد بڑھ رہی ہے؟ یہ بات تقریباً یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ اس سوال کا جواب نفی میں ہے۔ یہ ہمارا وہ مشکل تعلیمی مسئلہ ہے جس نے ہر ایک کے لیے دردِ سر پیدا کر رکھا ہے۔ سکولوں میں طلبہ اور طالبات کی تعداد عام حالتوں میں مدت ہوئی پسندیدہ حدود سے آگے بڑھ چکی ہے۔ اور اب اس میں مزید اضافے کی کوئی گنجائش نظر نہیں آتی۔ تمام سکولوں میں ہر جماعت میں ۷۰، ۸۰ طلبا ہوتے ہیں۔ بعض سکولوں میں تعداد اس سے بھی زیادہ ہے۔ اساتذہ والدین اور طلبا کو اس صورت حال نے پریشان کر رکھا ہے اس کے تعلیمی معیاروں پر بھی بہت برا اثر پڑ رہا ہے۔ اس مشکل مسئلے کا کوئی نہ کوئی تسلی بخش حل دریافت کرنا آج ہماری ایک اہم تعلیمی ضرورت ہے۔

(۲) اگرچہ کامیاب طلبہ کے فی صد تناسب میں پچھلے سال کے مقابلے میں تھوڑا سا اضافہ ہوا ہے پھر بھی ناکام رہنے والوں کی کل تعداد کوئی ستائیس ہزار یعنی پچھلے سال کے تمام امیدواروں کے تقریباً نصف کے برابر ہے۔ کسی ملک کے نوجوانوں کا دس سال کی محنت کے بعد اتنی بھاری تعداد میں ناکا

...ناکوئی اچھا فال نہیں۔ یہ اس بات کی کھلی ہوئی دلیل ہے کہ ہمارے طریقہ ہائے تدریس میں بنیادی
...یلی کی ضرورت ہے۔ ناکام رہنے والے نوجوان نہ صرف اپنے اور اپنے لواحقین کے لیے
...ح طرح کے مسائل پیدا کرتے ہیں، بلکہ طلبا کی بے پناہ بھیڑ میں ایک ناخوش گوار اضافے کا موجب
...ی بنتے ہیں۔ اس قومی ضیاع کو روکنے کی تدابیر پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے۔

(۳) میٹرک کے نتائج کا جو گزٹ ثانوی تعلیمی بورڈ کی طرف سے شائع ہوا ہے، اس میں یہ
...یں بتایا گیا کہ کامیاب امیدواروں میں سے کتنے فرسٹ ڈویژن میں پاس ہوئے کتنے سیکنڈ
...ڈویژن میں اور کتنے تھرڈ ڈویژن میں۔ تاہم یہ قیاس غالباً غلط نہیں کہ تھرڈ ڈویژن میں پاس
...ہونے والوں کی تعداد فرسٹ اور سیکنڈ ڈویژن میں پاس ہونے والوں کی مجموعی تعداد سے کچھ زیادہ
...ہی ہوگی۔ تھرڈ ڈویژن میں پاس ہونے کے معنی بجا طور پر یہ لیے جاتے ہیں کہ امیدوار اعلیٰ تعلیم سے
...ستفادہ کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ چناں چہ وہ اپنے اوپر کالجوں کے دروازے بند پاتا ہے
...ور اس کی یا اس کے والدین کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ اب اس کا مستقبل کیا ہو؟ دوسرے ملکوں
...کا تجربہ یہ بتاتا ہے کہ جو نوجوان علمی مضامین میں اچھے ثابت نہ ہوں وہ صنعتی اور ٹیکنیکل تعلیم میں
...خوب چل نکلتے ہیں۔ اور یوں ملک کے لیے بڑے مفید شہری بن جاتے ہیں۔ مگر ہمارے یہاں میٹرک
کے بعد کالج کی علمی تعلیم کے سوا اور کوئی راستہ ہی نظر نہیں آتا۔ یہ صورت حال تھرڈ ڈویژن
...میں پاس ہونے والے ہزاروں نوجوانوں کی زندگیاں تلخ بنائے ہوئے ہے۔ ہمیں اس مسئلے کا
...حل بھی جلد از جلد معلوم کرنا چاہیے۔

ہمارے مدارس میں سائنس اور اس کی تعلیم

محمد حفیظ

قیام پاکستان کے بعد سے ہمارے مدارس میں سائنس کے مضمون کو جو زبردست اور روزافزوں اہمیت دی جا رہی ہے، وہ یقیناً آپ سب کے لیے موجب حیرت ہوگی۔ آپ بجا طور پر محسوس کرتے ہوں گے کہ ارباب اختیار نے پاکستان کا نصاب تعلیم تجویز کرنے میں جہاں دوسرے مضامین کے محض معیار کو ذرا سخت و نرم کرنے پر ہی اکتفا کی ہے۔ وہاں سائنس کی ہیئت اور حیثیت مقدار اور معیار سب کچھ بدل ڈالا ہے

یہ وہ مضمون ہے کہ اغیار کے دور اقتدار میں، پرائمری میں تو اس کے نام تک سے واقف ہونا ضروری نہیں تھا۔ مڈل مدارس میں سے اکثر و بیشتر دیہاتی سکول اس سے بالکل معرا ہوتے تھے۔ صرف خال خال مدرسوں میں برائے نام پڑھائی جاتی تھی، اور شہری مدارس میں اسے ہفتہ بھر میں دو پیریڈ ملتے تھے امتحان کے نقطۂ نظر سے یہ لازمی نہیں ہوتی تھی۔ لہذا ان دیہاتی مڈل سکولوں میں انگریزی کے مقابلہ پر "دیہاتی سائنس" کے نام سے اسے رکھا گیا۔ مگر ایک تو سلیبس ہی نہایت ہلکا تھا۔ دوسرے مقابلہ پر انگریزی جیسا شاہ پسند اور اس لیے مقبول ترین مضمون۔ لہذا سائنس معدودے چند طلبہ ہی لیا کرتے۔ اور وہ بھی ذہن بیت کی خاطر۔ معیار امتحان کا یہ عالم تھا کہ مڈل مدارس کے ساتھ ایک طویل وابستگی کے باوصف مجھے معلوم نہ ہو سکا کہ میرے سکول کے ڈورل سائنس ماسٹر صاحب اس مضمون کو پڑھاتے کس وقت تھے، مجھے ہمیشہ اور سال کے ہر موسم میں یہی بتایا جاتا کہ کورس ختم ہے۔ پریکٹیکل کام سوائے سکول کی سڑکیں سیدھی کرنے کے کوئی دکھائی نہ دیتا۔ پھر بھی اس مضمون کا نتیجہ ہر سال اتنا اچھا ہوتا کہ میری ساری کاوشوں اور عرق ریزیوں کے باوجود انگریزی اس کی گرد کو بھی نہ پہنچ پاتی۔ عملی پرچہ۔ ڈاکٹری تھرمامیٹر کے استعمال اور چند سوائے جہاں بیجوں اور مٹیوں کی شناخت پر موقوف ہوتا لیکن درجہ ہائی میں یہ مضمون یکلخت

رہنما کوئی اچھا فال نہیں۔ یہ اس بات کی کھلی ہوئی دلیل ہے کہ ہمارے طریقہ ہائے تدریس میں بنیادی تبدیلی کی ضرورت ہے۔ ناکام رہنے والے نوجوان نہ صرف اپنے اور اپنے لواحقین کے لیے طرح طرح کے مسائل پیدا کرتے ہیں، بلکہ طلبا کی بے پناہ بھیڑ میں ایک ناخوش گوار اضافے کا موجب بھی بنتے ہیں۔ اس قومی ضیاع کو روکنے کی تدابیر پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے۔

(۳) میٹرک کے نتائج کا جو گزٹ ثانوی تعلیمی بورڈ کی طرف سے شائع ہوا ہے، اس میں یہ نہیں بتایا گیا کہ کامیاب امیدواروں میں سے کتنے فرسٹ ڈویژن میں پاس ہوئے کتنے سیکنڈ ڈویژن میں اور کتنے تھرڈ ڈویژن میں۔ تاہم یہ قیاس غالباً غلط نہیں کہ تھرڈ ڈویژن میں پاس ہونے والوں کی تعداد فرسٹ اور سیکنڈ ڈویژن میں پاس ہونے والوں کی مجموعی تعداد سے کچھ زیادہ ہی ہوگی۔ تھرڈ ڈویژن میں پاس ہونے کے معنی بالعموم یہ لیے جاتے ہیں کہ امیدوار اعلیٰ تعلیم سے استفادہ کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ چناں چہ وہ اپنے اوپر کالجوں کے دروازے بند پاتا ہے اور اس کی یا اس کے والدین کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ اب اس کا مستقبل کیا ہو؟ دوسرے ملکوں کا تجربہ یہ بتاتا ہے کہ جو نوجوان علمی مضامین میں اچھے ثابت نہ ہوں وہ صنعتی اور ٹیکنیکل تعلیم میں خوب چل نکلتے ہیں۔ اور یوں ملک کے لیے بڑے مفید شہری بن جاتے ہیں۔ مگر ہمارے یہاں میٹرک کے بعد کالج کی علمی تعلیم کے سوا اور کوئی راستہ ہی نظر نہیں آتا۔ یہ صورت حال تھرڈ ڈویژن میں پاس ہونے والے ہزاروں نوجوانوں کی زندگیاں تلخ بنائے ہوئے ہے۔ ہمیں اس مسئلے کا حل بھی جلد از جلد معلوم کرنا چاہیے۔

ہمارے مدارس میں سائنس اور اس کی تعلیم

محمد حفیظ

قیام پاکستان کے بعد سے ہمارے مدارس میں سائنس کے مضمون کو جو زبردست اور روز افزوں اہمیت دی جا رہی ہے، وہ یقیناً آپ سب کے لیے موجب حیرت ہوگی۔ آپ بجا طور پر محسوس کرتے ہوں گے کہ ارباب اختیار نے پاکستان کا نصاب تعلیم تجویز کرنے میں جہاں دوسرے مضامین کے محض معیار کو ذرا سخت و نرم کرنے پر ہی اکتفا کی ہے۔ وہاں سائنس کی ہیئت اور حیثیت مقدار اور معیار سب کچھ بدل ڈالا ہے یہ وہ مضمون ہے کہ اغیار کے دور اقتدار میں، پرائمری میں تو اس کے نام تک سے واقف ہونا ضروری نہیں تھا۔ مڈل مدارس میں سے اکثر و بیشتر دیہاتی سکول اس سے بالکل معرا ہوتے تھے۔ صرف خال خال مدرسوں میں برائے نام پڑھائی جاتی تھی، اور شہری مدارس میں اسے ہفتہ بھر میں دو پیریڈ ملتے تھے امتحان کے نقطۂ نظر سے یہ لازمی نہیں ہوتی تھی۔ بعد ازاں دیہاتی مڈل سکولوں میں انگریزی کے مقابلہ پہ "دیہاتی سائنس" کے نام سے اسے رکھا گیا۔ مگر ایک تو سلیبس ہی نہایت ہلکا تھا۔ دوسرے مقابلہ پر انگریزی جیسا شاہ پسند اور اس لیے مقبول ترین مضمون۔ لہٰذا سائنس محدود سے چند طلبہ ہی لیا کرتے۔ اور وہ بھی ذوق بیت کی خاطر۔ معیار امتحان کا یہ عالم تھا کہ مڈل مدارس کے ساتھ ایک طویل وابستگی کے باوصف مجھے معلوم نہ ہو سکا کہ میرے سکول کے ڈورل سائنس ماسٹر صاحب اس مضمون کو پڑھاتے کس وقت تھے، مجھے ہمیشہ اور سال کے ہر موسم میں یہی بتایا جاتا کہ کورس ختم ہے۔ پریکٹیکل کام سوائے سکول کی سڑکیں سیدھی کرنے کے کوئی دکھائی نہ دیتا۔ پھر بھی اس مضمون کا نتیجہ ہر سال اتنا اچھا ہوتا کہ میری ساری کاوشوں اور عرق ریزیوں کے باوجود انگریزی اس کی گرد کو بھی نہ پہنچ پاتی۔ عملی پرچہ۔ ڈاکٹری تھرمامیٹر کے استعمال اور چند سوائے جہاں پھولوں اور پتوں کی شناخت پر موقوف ہوتا۔ لیکن درجہ ہائی میں یہ مضمون یکلخت

اس قدر عالی وقار، پُراسرار اور ادق بن جاتا کہ اس کے لینے والوں کی تعداد بڑے بڑے ہائی سکولوں میں بھی انگلیوں پر گنی جاسکتی تھی۔ سائنس کا انتخاب جماعت کے بہترین طلبہ کا حق ہوتا اور وہاں مسلمان عنصر آٹے میں نمک سے زیادہ نہیں تھا بعض اوقات اسے عربی کے مقابلے میں رکھ کر مسلمان طلبہ کے لیے ایک اور آزمائش کا سامان پیدا کر دیا جاتا کیوں کہ پھر عربی کے مولوی صاحب فرماتے "آپ عربی شریف چھوڑ کر سائنس خبیث لیتا ہے۔ تجھے کونسی ماں کی کلیں چلانا ہے"؟

غرض مجموعی طور پر ہم مسلمانوں کو اپنی ساری تعلیمی زندگی میں سائنس سے دوچار ہونے کی نوبت نہیں آتی تھی۔ اور ہمیں اس صورت حال میں کوئی خامی یا خرابی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ ہم پھر بھی ماشاء اللہ بھلے چنگے رہتے تھے۔ لیکن اب کیا افتاد پڑی کہ یہ متروک و مطرود مضمون اچانک پیرِتسمہ پا ہو کر ہمارے مدارس اور مدرسین پر سوار ہو گیا ہے؟ یہ کیسی قلبِ ماہیت ہو گئی کہ سائنس تحت الثریٰ سے اُٹھ کر اوجِ ثریا پر جا پہنچی؟ حکم ہے کہ ابجد خوانوں کو بھی پہلی جماعت ہی سے سائنس پڑھائی جائے۔ پانچویں تک کے کورس میں وہ مسائل رکھ دیے گئے ہیں جو پہلے یونیورسٹی کلاس میں سامنے آتے تھے۔ اور آٹھویں تک تو سابقہ میٹرکولیشن کورس کی شاید ہی کوئی بات باقی رہ جاتی ہو۔ ستم یہ ہے کہ مڈل سکول امتحان میں یہ بے حد وسیع مشکل اور قطعاً اجنبی مضمون لازمی قرار دے دیا گیا ہے کہ اس میں فیل ہو جانا، اردو فارسی، عربی، ریاضی، تاریخ، جغرافیہ، شہریت حتیٰ کہ دینیات کی ساری لیاقت کالعدم کر دیتا ہے!

پاکستان بنتے ہی یکایک سائنس کو کون سے سرخاب کے پر لگ گئے کہ اس کا درجہ سب مضامین سے بلند ہو گیا؟ سائنس کی تعلیم پر آنا بے تحاشا زور دینے میں کونسی غرض پنہاں ہے؟ کیا تمام پاکستانی شہری ڈاکٹر اور انجینیر ہی بن جائیں گے۔ سائنس دانی کا یہ سیلابِ عظیم آخر کس مقصد کے لیے برپا کیا جا رہا ہے؟ کیا اربابِ اختیار کو ہماری مجبوریوں اور معذوریوں کا کچھ بھی احساس نہیں؟ ہمارے مدارس میں ماہرین سائنس اساتذہ کہاں ہیں؟ تجربات کے لیے سامان اور ادویہ کیوں کر مہیا ہوں گی؟ اور کیا مکمل تجربہ گاہوں کے بغیر تعلیم سائنس کا اس شدومد سے اجرا دیوانگی

کچھ کم ہے؟

دوستو! ہمارے سابق حکمرانوں اور موجودہ رہنماؤں کے تعلیمی نظریات میں اس زبردست تفاوت کو سمجھنا ضروری ہے۔

انگریز سے بہتر کون جانتا تھا کہ رب قدیر کے ارشادِ ازلی وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ کے پیشِ نظر ابنِ آدم کو خزائنِ ارضی سے کماحقہٗ تمتع حاصل کرنے کے لیے سائنس ہی کا سہارا لینا ہے۔ تسخیرِ قدرت کا واحد ذریعہ سائنس ہے، اور اسی کے طفیل وہ وَسَخَّرَ لَكُمُ الافلاک کی عملی تفسیر کر کے آج ہر میدان میں اشرف المخلوقات کا تاج پہنے کائنات پر حکمرانی کر رہا ہے آج انسان کی قوت و جبروت کا یہ عالم ہے کہ:۔

دو نیم اس کی ٹھوکر سے صحرا و دریا — سمٹ کر پہاڑ اس کی ہیبت سے رائی

اور کائنات اس کی یہاں تک فرماں پذیر ہے کہ ؎

بحر را گوید سرابے دہ دہد — دشت را گوید حبابے دہ دہد

ظاہر ہے کہ ایسے نقشِ سلیمانی اور اسمِ اعظم کی طرف محکوم قوم کو راہ دکھانا سراسر انگریز کے اپنے مفاد کے خلاف تھا۔ انگریز بہت زیرک صیاد تھا۔ دانائے رمزِ آیہ اِنَّ الملوک تھا۔ خوب خوب سمجھتا تھا کہ قوموں کی تخریب و تعمیر میں نصاب و نظامِ تعلیم کتنا اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔ چناں چہ اُو فرنگی کے مشورے پر کہ ؎

تعلیم کے تیزاب میں ڈال اس کی خودی کو — ہو جائے ملائم تو جدھر چاہے اسے پھیر

ایک ایسا نصابِ تعلیم ہمیں دیا کہ جس سے ہمارے جوانوں کی خداداد صلاحیتیں کبھی مردہ ہو کے رہ گئیں کیونکہ ؎

تاثیر میں اکسیر سے بڑھ کر ہے یہ تعلیم — سونے کا ہمالہ ہو تو ہے مٹی کا اک ڈھیر

انگریز کی پالیسی اتنی کامیاب ہوئی کہ ایک طرف ہماری ایک عظیم اکثریت سائنس کو نفرت اور شک کی نظر سے دیکھتے ہوئے اسے کفر و الحاد کا موجب سمجھنے لگی۔ اور دوسری طرف ہمارے

تعلیم زدہ نوجوانوں کی عقلی فرومائگی کا یہ عالم ہوا کہ ایم ایس سی سے فارغ التحصیل ہو کر بھی گھر میں بجلی کے سوئچ، بلب، پنکھے یا سلائی کی مشین کی درستی اور مرمت پر قادر نہ ہو سکتے۔ اور ملازمت کے سوا زندگی میں کوئی میدانِ عمل دکھائی نہ دیتا۔

اب جس طرح یہ ایک مسلمہ امر ہے کہ نصاب و نظامِ تعلیم کے ذریعہ کسی قوم کو ابدی نیند سلایا جاسکتا ہے۔ اسی طرح اس حقیقتِ نفس الامری سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ نصاب و نظامِ تعلیم کے ذریعہ کسی مردہ قوم کو از سرِ نو زندہ اور بیدار، معزز و سربلند اور کامیاب و پائندہ بنایا جاسکتا ہے۔ نازیوں نے جرمن قوم کو تسخیرِ عالم کا عزم بالجزم لے کر اٹھنے اور دنیا کی بڑی سے بڑی طاقتوں سے بے تامل ٹکرا جانے پر آمادہ کرنے کے لیے سب سے پہلے نصابِ تعلیم ہی بدلنے کی طرف رجوع کیا۔ روس نے کمیونزم کی اساس پر قوم کو تیار کرنے کی خاطر اولین قدم نصابِ تعلیم کی تجدید کا ہی اٹھایا۔ مصطفےٰ کمال نے ترکی کی حیاتِ نو کا ذریعہ ایک نئے نصابِ تعلیم کو ہی بنایا۔۔۔۔ اور اگر قائدین نے بھی اپنی اولین توجہ اصلاح و ترمیم نصاب و نظامِ تعلیم کی طرف مبذول کی ہے تو عین تقاضائے وقت ہے اور سائنس کے ساتھ جتنی سرد مہری برتی گئی تھی، اب اگر اتنی ہی گرم جوشی دکھائی ہے تو عین تقاضائے انصاف اور ایک بالکل فطری ردِ عمل ہے۔

لیکن اصلیت نری اتنی نہیں۔ ہم محض بغضِ انگریز کی خاطر اس کی نظر انداز کردہ سائنس کو پر نہیں بٹھا رہے، بلکہ حبِ سائنس، حبِ اسلام اور حبِ قوم کے باعث سائنس کو اس کا جائز حق دے رہے ہیں۔ حکیم الامت علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں ؎

بہ پورِ خویش دین و دانش آموز کہ تابد چوں مہ و انجم نگینش
بہ دستِ او اگر دادی ہنر را یدِ بیضا است اندر آستینش

گویا ہمارا نصابِ تعلیم دین، دانش اور ہنر پر مشتمل ہونا چاہیے۔ اب دیکھیے، سو انصاف سے کہیے کہ کیا سائنس سراپا دانش نہیں؟ کیا سائنس دین کو صحیح طور پر سمجھنے کا ذریعہ نہیں؟ کیا سائنس میں ہنر نہیں؟ پھر سائنس کے سوا یا سائنس سے بڑھ کر اور بھی کسی مضمون کو یہ حق

کہ وہ ہمارے نصاب تعلیم کا اہم ترین جزو بنے۔ لغت اٹھا کر دیکھیے "سائنس" کے معنی "علم" ہے "حکمت" ہے۔ طلب العلم فریضۃٌ علیٰ کل مسلمٍ و مسلمۃٍ؛ اور اطلبوا العلم و لو کان بالصین کے احکامِ گرامی کیا فارسی اور تاریخ یا شعر و سخن کی تحصیل کے متعلق ہیں، یا سائنس کی تعلیم کے واسطے؟ ومن یؤت الحکمۃ فقد اوتی خیراً کثیراً والی "حکمت" سائنس ہی تو ہے۔ یہ حکمت، یہ خیر کثیر ہمیں اپنے ماحول کو پوری طرح سمجھنے کے قابل بناتی ہے۔ مشاہدے اور تجربے کے بعد سبب اور نتیجہ کا تعلق دریافت کر کے غور و فکر کے ذریعے صحیح نتائج اخذ کرنا سکھاتی ہے۔ جس سے نہ صرف ہم زیادہ باسمجھ اور معقول طرز سے زندگی گزار سکتے ہیں، بلکہ اپنی حاصل کردہ معلومات اور قائم کردہ اصولوں کی بنا پر اپنی سہولت کے لیے مزید ایجادات و اختراعات پر قادر ہو سکتے ہیں۔ آج کی دنیا میں تو سائنس سے ناواقفیت انتہائی بدقسمتی اور پس ماندگی ہے۔ بلکہ آج کے تمدن کو تمام تر تخلیقِ سائنس کہا جائے گا۔ ذرا گرد و پیش پر نگاہ ڈالیے آپ خود محسوس کریں گے کہ ہمارے شب و روز کے چوبیس گھنٹوں میں ہر لمحہ ہمیں سائنس سے واقفیت کی ضرورت کا احساس دلاتا ہے، اور شاہراہِ حیات کے چپے چپے پر کرشمہ ہائے سائنس سے واسطہ پڑتا ہے۔ آج کیوں کر ممکن ہے کہ کوئی معاشرہ یا معاشرے کا کوئی فرد۔ ریل، موٹر، چکی، ڈائنمو، کرین، ٹریکٹر، ٹیوب ویل، سائیکل، پمپ، ٹیکہ، ایکس رے، برقی روشنی، گھنٹی، پنکھا، استری، الفٹ، ٹیلیفون، تار، ریڈیو، ہوائی جہاز، چھاپہ خانہ، ٹائپ رائٹر، سلائی کی مشین، گھڑی، بیٹری، فاؤنٹن پین وغیرہ وغیرہ سے سابقہ رکھے بغیر زندہ رہ سکے؟ آپ کب تک برداشت کر سکیں گے کہ ریلوے کو خرِ دجال کہہ کر سائنس ہی سے دنادار کی استوار رکھی جائے۔ گھڑی، ریڈیو اور ٹیلیفون کو غیر معتبر قرار دے کر سفید اور سیاہ دھاگے میں امتیاز اور عینی شہادت کے معیار پر اصرار کیا جائے، ہوائی جہاز دیکھ کر بس "ہذا عفریت" کا فتویٰ صادر کر دینے پر قناعت کر لی جائے، یا ریڈیو پر کوئی مانوس و مرغوب آواز سن کر ششدر رہ جائیں اور فرطِ حیرت سے بس کہہ دیں

خشک چوب و خشک نے و خشک پوست   از کجا می آید ایں آوازِ دوست!

کب تک ہماری قوم، مسلم قوم، "کنتم خیر امۃٍ اخرجت للناس" کے معزز لقب سے سرفراز قوم جس نے کل سائنس میں تحقیق و انکشاف کی دنیا کی امامت کی۔ آج سائنس سے روگردانی کے باعث قعرِ مذلت میں پڑی اغیار کے لیے سرمایۂ تفریح و تمسخر بنی رہے گی؟ ہم میں ایسے چشم و چراغِ ملت بزرگوں کی کمی نہیں جو بتی لیمپ دیکھیں تو تیل ڈالنے کی جگہ نہ پاکر موجد کی بے عقلی پر متاسف ہوتے ہیں۔ جو چھڑکاؤ والی لاری دیکھ کر نہایت دل سوزی سے کہتے ہیں کہ گھر تک کتنا پانی پہنچ سکے گا! جو متعلق پنکھے کو روکنے کے لیے لاٹھی کا استعمال کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں جو فلم بنانے والوں کو خدا کا شریک قرار دیتے ہیں۔ جو پڑھنے والی عینک خریدنے چل نکلتے ہیں جو ریڈیو پر پسندیدہ گانا ختم ہوتا دیکھ کر سوئی پیچھے کر دینے کی فرمائش کرتے ہیں، جو ایکس رے کو ہر مرض کا مداوا اور تھرمامیٹر کو بخار کا علاج شافی گردانتے ہیں۔ جو تار میں پارسل بھجوانے سے اظہار معذوری پر بابو سے ناراض ہو جاتے ہیں۔

اگر تعلیم کا اولین مقصد بچے کو زندگی کے لیے تیار کرنا ہے تو آپ کس طرح روزمرہ کے استعمال کی چیزوں کو سائنس کی تعلیم کے ذریعہ روشناس کرانے میں تاخیر برداشت کر سکتے ہیں؟ اگر تعلیم کا اولین مقصد بچے کی قوتِ مشاہدہ اور حسِ تجسس و جستجو کی صحیح تسکین، تربیت اور ترقی ہے تو آپ کب تک اسے اپنے گرد و پیش کے ہزارہا واقعات اور مظاہرِ فطرت، آلات و عجائبات کے کیف و کم سے محروم رکھ سکیں گے؟

یوں تو متذکرہ بالا ٹھوس اور مادی ضروریات کے پیشِ نظر ہی سائنس کی تعلیم اشد ضروری ہے۔ لیکن جب اس کے مذہبی، اخلاقی اور تربیتی محاسن اور فوائد پر نگاہ ڈالی جاتی ہے تو اس کی ہمہ گیر اہمیت اور بھی نمایاں ہو جاتی ہے اور ثابت ہو جاتا ہے کہ ایک سمجھدار مدرس اسے تعمیرِ سیرت اور بالیدگی کردار کے ہر پہلو میں نہایت عمدگی سے استعمال کر سکتا ہے۔ مثلاً :-

(۱) خداوند کریم کی شانِ ربوبیت۔ اس کی حکمتِ بالغہ۔ اس کی قدرتِ کاملہ۔ اس کی خلاقی اس کے الطاف و عنایات وغیرہ وغیرہ بے شمار باتیں سائنس کی تدریس کے دوران ذہن نشین بلکہ منقش

ذیل بحر کی جا سکتی ہیں:-

(د) چوتھی جماعت میں آپ آکسیجن اور نائٹروجن پڑھا چکے ہوں گے ان گیسوں کے خواص میں تضاد و تفاوت بتلانے کے بعد ہوا میں ان کے باہمی امتزاج کی حکمتوں کو واضح کر سکتے ہیں۔ اگر ہوا میں آکسیجن جیسا حیاتِ افروز اور جاں فزا جزو مقررہ تناسب سے زیادہ ہوتا تو دنیا کب کی بھسم ہو چکی ہوتی۔ انسانی زندگی مختصر سی مدت میں تمام مراحل طے کر کے ختم ہو جاتی۔ یہ اس قادر توانا کی حکمتِ بالغہ اور شانِ ربوبیت ہے کہ نائٹروجن آکسیجن کی تیزی پر لگام کا کام دیتی ہے۔ تنفسِ حیوانات میں آکسیجن کا خرچ ہو ہو کر کاربن ڈائی آکسائڈ کی مقدار میں مسلسل اضافہ کرتے رہنا کتنی جلدی دنیا کے اختتام پر منتج ہو جاتا اگر اس کا علاج اس عمدگی سے نہ کیا گیا ہوتا کہ جو چیز ہمارے لیے سم قاتل ہے، وہی نباتات کے واسطے آبِ حیات ہے۔ اس "تقدیرِ ازلی" نے کس کمال کامیابی سے ایک مستقل توازن قائم کر رکھا ہے۔

(ب) پانچویں جماعت میں پانی کی بہم رسانی اور تطہیر کا پُر حکمت نظام پڑھاؤ تو سمجھاؤ کہ تمام پانی کا سرچشمہ سمندر ہے۔ لیکن کس طرح وہاں سے کشید کر کے صفا ترین پانی اٹھایا جاتا ہے۔ اور کس طرح دوردراز دیہات اور شہروں تک کس طرح کس کس طریقے سے وہ رزاقِ کریم اپنی ہر قسم کی اور ہر جگہ کی مخلوق کے لیے پہنچاتا ہے۔ پھر اس کی حفاظت کے کیا کیا عمدہ انتظام ہیں کس طرح اس سے جہاں کی شست و شو، نشو و بالیدگی، نقل و حمل وغیرہ کا کام لیا جاتا ہے۔ یہ سارا بے عیب اور مستقل بندوبست ایک لاشریک خدائے وہاب کے سوا کون کر سکتا ہے؟

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون؟ — کون دریاؤں کی موجوں سے اٹھاتا ہے سحاب؟
کون لایا کھینچ کر پچھم سے بادِ سازگار؟ — خاک یہ کس کی ہے کس کا ہے یہ نورِ آفتاب؟
کس نے بھر دی موتیوں سے خوشۂ گندم کی جیب؟ — موسموں کو کس نے سکھلائی ہے خوئے انقلاب؟

(ج) چھٹی جماعت میں ہوا کے اندر آبی بخارات کا وجود ثابت کر دگے۔ بارش کا برسنا سمجھاؤ گے۔ رعد و برق۔ برف۔ اولوں کا ذکر آئے گا تو کیا کیا سنہری موقعے اور قدرت کی نیرنگیاں واضح کرنے کے لیے ملیں گی۔ بتا سکو گے کہ باراں رحمت کو وہ خدائے قہار آنِ واحد میں عذاب و زحمت میں تبدیل کر سکتا ہے۔

پانی کی بے قاعدہ والی خاصیت بظاہر یوں ہی سی بات معلوم ہوتی ہے۔ لیکن کس قدر گراں بہا فوائد اور معجز نما نتائج کی حامل ہے۔ چٹانیں اسی کے طفیل ٹوٹ ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جاتی ہیں۔ تصور کرو شبنم کے حقیر قطرے کا ایک کا ایک کوہ پیکر چٹان کو ریت میں مبدل کر دینا اس مالک کو ملا کل شیئٍ قدیر ثابت نہیں کرتا ؟ پانی کے اسی وصف کے باعث یخ بستہ سمندروں میں آبی مخلوق کی حفاظت ہوتی ہے۔ اگر بالفرض برف پانی سے بھاری ہوتی تو کیا کیا خوفناک نتائج رونما ہوتے۔ ہم اس مہربان کی کون کون سی نعمتوں کا شکر ادا کریں۔

(د) ساتویں جماعت میں انسان کے نظامِ انہضام پر نگاہ ڈالتے ہوئے من عرف نفسہٗ فقد عرف ربہٗ کی تفسیر کے لاتعداد مواقع ہیں۔ اسی طرح پودوں کے اگنے اور پھلنے پھولنے کی کیفیت پڑھ کر کون انسان بے ساختہ نہیں پکار اٹھتا فتبارک اللہ احسن الخالقین۔ ہمارے اعضائے جسمانی میں سے ہر ایک کی ساخت ہر ایک کا وظیفہ اور اس وظیفہ کی ادائگی میں کبھی سرمو فرق نہ آنا سمجھا کر پودوں کے اجزا اور ان کے مختلف فرائض کے مطالعہ کے بعد کس وثوق سے یہ چیلنج

ما تریٰ فی الخلق الرحمٰن من تفاوت؛ فارجع البصر ھل تریٰ من فطور ؟

انشعاعِ حرارت میں گرمی اگر سورج جیسے دور کے جسم سے بلا واسطہ ہم تک پہنچ سکتی ہے اور راستے کی فضا اور ہوا کو خبر ہوتے نہیں پاتی تو کیا خداوند قدیر کے لیے اپنے پیغمبروں اور رسولوں تک وحی و الہام پہنچانا کوئی مشکل امر ہے ؟

(س) آٹھویں جماعت میں نور اور برق کے اسباق میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی قدرت کاملہ کی وضاحت کے بے حساب مواقع موجود ہیں۔ ریڈیو، فلم اور ٹیلیویژن کی ایجادات زبانِ حال سے ہمیں پوچھتی ہیں کہ کیا اب بھی قیامت کے دن ہمارے اعمال ناموں کا پیش کیا جانا ناقابلِ فہم یا بعید از امکان معلوم ہو سکتا ہے ؟ پھیپھڑوں اور دل کے فعل کو غیر ارادی قرار دے کر ہمارے اوپر کتنا بڑا احسان کیا گیا ہے ! بھڑ بچھو یا شہد کی مکھی کے ڈسنے نے اگر ہمیں ٹیکے کا طریق ایجاد کرنا سکھا دیا تو کیا یہ تعلیم " ان ھٰذا سوا فیا ئٔ وتبواخیر لکم " کا مصداق نہیں۔

(۲) تعلیم سائنس تہذیب اخلاق کا مؤثر ترین ذریعہ بنائی جا سکتی ہے مثلاً :-

(الف) ایثار و قربانی :- ہر جماعت کے ہر سبق میں ہم دیکھتے ہیں کہ کیا عناصر کیا مرکبات۔ کیا نباتات اور کیا حشرات سب کے سب کا مقصدِ تخلیق یہی دوسروں کے کام آنا ہے۔ پھر انسان کیوں خود غرض بنے؟ اشرف المخلوقات کو تو اور بھی ایثار پیشہ ہونا چاہیے۔

(ب) عزم و استقلال :- آکسیجن کے عمل تکسید کو دیکھو اپنے کام میں کبھی سستی غفلت یا کوتاہی نہ ہوگی۔ جہاں بھی، جتنا بھی، جس طرح بھی ممکن ہو اکسائڈ بنا دے گی۔ ہوا کی مستعدی ملاحظہ کرو کہیں بھی کبھی بھی دباؤ کی کمی واقع نہیں ہونے دیتی۔ دابہ پذیر ہے لیکن بالآخر جب حد برداشت گذر جائے اور مقابلہ کی ٹھان لے تو اسی ہوا میں کس بلا کی سختی اور سخت جانی آ جاتی ہے۔ لاری کے ٹائر کی ہوا ہوا ہی تو ہوتی ہے۔ مگر زبردست دباؤ کا مقابلہ کر جاتی ہے۔

(ج) فرض منصبی کو پورا کرنا :- درخت کی جڑیں۔ پتے۔ انسان کے اعضا کس باقاعدگی اور دیانت سے اپنا کام کرتے ہیں۔ ان میں نہ تصادم ہوتا ہے نہ رشک وحسد۔ نہ تساہل ہے۔ نہ ناغہ۔ پھر ہم کیوں محنت و مستعدی کو ہاتھ سے دیں؟

(د) مکافاتِ عمل :- گندم از گندم بروید جو ز جو۔ کاربن اور آکسیجن کی کیمیائی ترکیب سے کاربن ڈائی اکسائڈ ہی بنے گی۔ پانی کی تحلیل پاتی سے ہائیڈروجن اور آکسیجن کے سوا کچھ نہیں نکل سکتا۔ آکسیجن اور نمی کی موجودگی میں ہم لوہے کو زنگ سے ہرگز نہیں بچا سکتے تو پھر انسان اپنے اعمال کے قدرتی نتائج و عواقب سے کیوں کر بچ سکتا ہے؟ اور بدی کا بیج بو کر نیکی کا پھل لینے کی توقع کیسے کر سکتا ہے؟

(ہ) جہد للبقا :- ٹہنیاں اور پتے سورج کی روشنی حاصل کرنے کے لیے کیا کیا ترکیبیں کرتے ہیں۔ جڑیں نمی اور نمکیات کی تلاش میں کہاں کہاں تک چلی جاتی ہیں! کٹنے یا ٹوٹنے والی شاخ کے بعد فوراً ہی کونپلوں اور شگوفوں کا بیدار ہو کر خلا کو پُر کرنے کی کوشش کرنا۔ پھل کی حفاظت کے طریقے۔ بیج بکھیرنے کے اسلوب کا مشاہدہ ہمیں کیوں نہ کاہلی اور سہل انگاری چھوڑ کر مستعد اور محنتی

بیٹنے پر مجبور کردے ؟

(۳) سائنس ہمارے بچوں کو ایک معقول با سمجھ اور صحت مندطرز زندگی اختیار کرادے گی۔

حفظان صحت اور بدنی صفائی کے اصول سکھانے کا ایک طریقہ تکرار و مشق کے ذریعہ عادت ڈال کر طبیعت ثانیہ بنا دینا ہے۔ لیکن اس میں جبر و کراہ کا عنصر بچے کے تحت الشعور میں نفرت و بغاوت کے جذبہ کو مضبوط کرتا رہتا ہے اور یہ نا پسندیدہ چیز ہے۔ اس لیے پہلی تین جیز ول میں جب کہ بچہ استدلال اور علت و معلول کا شعور نہیں رکھتا اور اس میں نقالی کا ملکہ زیادہ نمایاں ہوتا ہے مفید عادات و اطوار محض نمونے اور حکم و مشورہ ہی سے پیدا کیے جائیں گے ۔ مثلاً ہاتھ، منہ، ناک، دانت ناخن صاف رکھنا۔ سانس ناک سے لینا۔ کھانا بروقت اور چبا کر کھانا۔ گھر کپڑے صاف ستھرے رکھنا وغیرہ۔ لیکن جوں ہی وہ کیوں اور کس طرح کا ادراک کرنے لگے گا، اسے ان عادات کی لم معلوم ہوتی جائے گی اور وہ مزید عمدہ لائحہ زندگی اختیار کرتا جائے گا۔ مثلاً آکسیجن کی قدر و قیمت اور نائٹروجن اور کاربن ڈائی اکسائڈ کے مضرات سے واقف ہو کر وہ خود بخود ستھری ہوا کا متلاشی اور گندی فضا سے نفور رہے گا۔ جینے اور چلنے کے عمل اور ہوا کی ایصالی رووں سے روشناس ہو چکنے کے بعد وہ خود بخود صفائی پسند بنے گا۔ نظام انہضام کے مطالعہ کے بعد نوالے کو اچھی طرح چبانا۔ ورزش، خوراک اور اجابت میں باقاعدگی اور پابندی اوقات ترش اور مصالحہ دار اشیاء کے کھانے سے اجتناب وغیرہ اسے آپ سے آپ ہی آجائیں گے۔ ڈامن (حیاتین) اور دیگر اجزاء خوراک کی بابت سائنٹیفک معلومات اس امر کی خود بخود ضامن ہو جائیں گی کہ بچہ متوازن غذا کھایا کرے گا۔ محض فیشن کے لیے دال کا چھلکا پھینک دینا۔ میدے اور باریک چھنے ہوئے آٹے کی روٹی کھانا۔ کچی سبزیوں کا استعمال نفاست کے خلاف جاننا سب غلط دستور از خود ترک کر دے گا۔

(۴) سائنس کے مشاہدہ اور تجربہ سے حاصل کی ہوئی فراست کے ذریعے ہم اپنی مجبوریوں، کمیوں اور مشکلات پر قابو پا سکتے ہیں۔ اور زندگی میں سہولیات اور آسائشیں بہم پہنچانے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ اور یہی کوششیں ایجاد و اختراع پر منتج ہوا کرتی ہیں۔ بقول اقبال سے

تو شب آفریدی چراغ آفریدم — تو گِل آفریدی ایاغ آفریدم

انعکاس نور سے آئینہ مل گیا۔ انعطاف نور نے عینک بنیادی۔ ڈیوی کی قندیل امن نے ہزاروں کان کنوں کی جانیں محفوظ کردیں۔ ویسے بات کتنی معمولی نظر آتی ہے! کیرہ کا اصول کتنا سیدھا سادہ ہے! جہاز کی ایجاد کتنی معمولی چیز تھی جس نے آج ہوائی جہاز کی سینکڑوں قسموں کو منصہ شہود پر لا کھڑا کیا۔ تھرموس بوتل میں سیدھے سے اصول ہی برتے گئے ہیں۔ واٹر پمپ اور فاونٹن پین کی سادہ سی ایجاد نے کتنی سہولتیں پیدا کردیں۔ کاربن ڈائی آکسائڈ سے آگ بجھانے کا کام لینے کے کتنے عمدہ طریقے ڈھونڈ لیے گئے ہیں۔ جب دوسرے لوگ سائنس کے سادے اور آسان اصولوں کو کام میں لا کر نت نئی ایجاد کرتے رہتے ہیں تو تو بھی سہ

اُٹھ باندھ کمر کیا ڈرتا ہے — پھر دیکھ خدا کیا کرتا ہے

ہمت شرط ہے اور یقیناً ارباب ہمت کا حامی خدا ہے۔ ایجاد و اختراع اہل مغرب کا ہی اجارہ تو نہیں ہونا چاہیے! یہ تو تیری ہی اپنی گم شدہ میراث ہے اسے پھر سنبھال:۔

حکمت اشیاء فرنگی زاد نیست

اصل او جز لذت ایجاد نیست

ایں پری از شیشۂ اسلاف ماست

باز صیدش کن کہ ایں از قاف ماست

(۵) اور پھر سائنس میں ہنر و معاش بھی تو ہے۔ صرف مڈل تک کا نصاب ہی بہ بغیانہ سہی بہ طولہا ضرور بہم پہنچاتا ہے۔ مثلاً انسان (۱) عطاری کی دکان کھول سکتا ہے (۲) ویزلین تیل، کریم وغیرہ تیار کرسکتا ہے (۳) چاک بنا کر پیٹ پال سکتا ہے (۴) رنگ سازی کرسکتا ہے (۵) صابن یا روشنائی وغیرہ بنا کر بیچ سکتا ہے (۶) سائیکل مرمت کو ذریعہ معاش بنا سکتا ہے (۷) ملمع کاری سے روزی حاصل کرسکتا ہے (۸) فوٹوگرافی میں دسترس حاصل کرسکتا ہے۔ ایسے مسمریزم کے پروفیسر بھی دیکھے ہیں جو سکولوں اور کالجوں میں اپنا کمال دکھا کر باعزت طور پر خاصی رقم بٹور لے جاتے ہیں اور ان کا اثاثہ چند

کیمیائی کرتب اور سائنٹفک شعبدے ہی ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک صاحب نے (جن کے جادو سے ہم بہت محظوظ و متاثر ہوئے تھے۔ (۱) سگریٹ کا دھواں دور سے دو اوپر تلے رکھے ہوئے گلاسوں میں پہنچا دکھایا۔ دراز اس کا تیزاب نمک اور امونیا کے قرب سے نوشادر کے دخان کی پیدائش تھا (۲) نیلے شربت یا بنفشی شراب کو آن کی آن میں سرخ شربت یا شراب ارغوانی میں تبدیل کر دکھایا جاتا۔ حالاں کہ لٹمس پر الکلی یا ایسڈ کا اثر اس کی تہ میں تھا۔ (۳) بے رنگ پانی کے دو گلاسوں سے فوراً شوخ سرخ رنگ بنالیا تھا اگرچہ مبتدی جانتے ہیں کہ فینال فتھالین کو کوئی سی الکلی بے رنگ دے سکتی ہے۔ یہ سرخ رنگ سفید براق لباس پر چھینک دو۔ ذرا خشک ہوا، اور غائب وغیرہ وغیرہ میں پوچھتا ہوں کہ جب سائنس یہ کچھ ہے اور آتنا کچھ کرسکتی ہے تو کیا ہم اسے صرف ڈاکٹر اور انجینئر بنانے کے لیے ہی پڑھائیں گے؟ یا ہم اس کی امداد سے اپنے تمام نونہالوں کو اچھے اور راسخ العقیدہ مسلمان۔ عمدہ اور سلیم الطبع انسان، دانشمند اور معقول شہری۔ بیدار مغز اور تردماغ خود اعتماد اور جانکدست افراد بنانے کی طرف اپنی پوری توجہ کریں گے۔

اس میں شک نہیں کہ سائنس کی ٹھیک تعلیم میں مشکلات بہت سی حائل ہیں۔ مگر جہاں چاہ وہاں راہ کے مصداق سے ڈھونڈ لیں گے یا بنالیں گے ہم آپ اپنی راہ!

سامان کی کمی کا مداوا سوچ بچار اور سوجھ بوجھ والے مدرس کے لیے چنداں مشکل نہیں ہوگا سلنڈر کا کام عام گلاس سے لیا جاسکتا ہے۔ قرص پودری نہیں تو گتے کا کاٹ لیجیے۔ نکاس نلی ربڑ کی ٹین کی یا بانس کی کام دے سکتی ہے۔ لگن کا کام مٹی کے دورے اور حمال خانے کا پیالے کو سوراخ کرکے لیا جاسکتا ہے۔ کٹھالی چینی کی نہیں تو سفالی ہی کام سہی۔ تپائی اور پیلے دار تار خود بنائے جاسکتے ہیں۔ قیف شیشے کی نہ ہو تو ٹین کی میں حرج ہے؟ خوردبین، دوربین۔ محدب اور مجوف عدسے کا کام کسی شریف کی عینک سے نکال لو۔

بہرحال عملی کام ناگزیر ہے۔ اس کے لیے خوب اچھی طرح سوچ سمجھ کر پروگرام بنانا ہوگا۔ جو طلبہ خود کریں گے ان کی فہرست پیشگی تیار کی جائے۔ ان کے متعلق دوسری واقفیت کیوں اور

دوران سبق گذر چکی۔ عمل انھوں نے دیکھا بھی ہوا ہوگا۔ اس لیے ضروریات کا اندازہ اور طریقِ کار پہلے ہی سے متعین ہو۔ نوٹس ساتھ ساتھ لکھے جائیں۔ اشکال مطابق حقیقت اور سادہ ہوں۔ سٹینسل (STENCIL) کا استعمال اور ایک لکیری ڈرائنگ مفید رہے گی۔ استاد اس مرحلہ پر ایک مشفق نگراں اور ہمدرد مشیر ہو۔ نتائج حقیقی نوٹ کیے جائیں۔ تجربہ کے بعد سامان صاف اور خشک کرکے مقررہ جگہ پر رکھنا لازمی ہو۔ بچی کھچی اشیا اور مستعمل کیمیکل پھینکے نہ جائیں۔ فلٹر پیپر دھو کر خشک کرکے پھر قابل کار بنایا جائے۔ عمل کشید سے حاصل شدہ پانی محفوظ رکھا جانا چاہیے۔ قلمیں سنبھال کر رکھی جائیں۔ ہائیڈروجن تیار کرکے وولف بوتل میں سے زنک سلفیٹ جیسی قیمتی چیز پھینک دینا غلطی ہے۔ نائٹریشن سے حاصل شدہ مقطر طول (مثلاً چونے کا پانی) متعدد مفید مصارف میں آسکتا ہے۔ نلیوں کو کاٹنے۔ موڑنے اور جیٹ بنانے کے تجربات نلیوں کو ضائع کرنے کی بجائے سال بھر آئندہ ضروریات کے کفیل ہونے چاہئیں۔ اسی طرح کارک میں سوراخ کا مقصدی ہو۔ اسی طرح ٹوٹی پھوٹی اور مستعمل چیزیں مرمت یا مناسب رد و بدل سے پھر کار آمد بنا لیجیے۔

نیست در خشک و تر بیشۂ من کوتاہی چوب ہر نخل کہ منبر نشود دار کنم

استاد کو چاہیے کہ تجربات کی تقسیم کچھ اس طرح کر رکھے :-

(۱) جو لڑکے خود کریں گے۔

(۲) جو استاد دکھائے گا۔

(۳) جو چارٹ کے ذریعہ اور ادھورا سامان دکھا کر یا صرف سامان فٹ کرکے ہی سمجھا دیے جائیں گے

(۴) جن کی خاکہ کھینچ کر دکھا دی جائے گی۔

اس کے علاوہ طلبہ کی حوصلہ افزائی کی جائے کہ وہ سائنس کے اصولوں کے ماتحت کام کے کھلونے وغیرہ خود بنائیں۔ مثلاً سیریں، رفتہ رفتہ ایک اچھا خاصہ عجائب گھر بن جائے گا۔ لڑکوں کا تیار کردہ البم ایک عمدہ ذریعۂ تعلیم ہے، انھیں ان پر فخر بھی ہوگا۔ مدرسہ کے ادبی اجلاس میں نقد نظموں کے ساتھ سائنس کے کرتب اور دلچسپ کھیل دکھلانے کا موقع دیا جائے۔

تدریس میں کون سا طریق اختیار کیا جائے؟ اس کا انحصار سبق کی نوعیت پر ہوگا، اور اس کے مطابق استدلال سے کام لیا جائے گا۔ کبھی کوئی عجیب سا کرشمہ سب سے پہلے دکھا کر اشتیاق و تجسس کو ابھارا جائے گا۔ کبھی تحلیل کا طریقہ ٹھیک رہے گا تو کبھی ترکیب کا۔ کبھی اشیا اور واقعات کے مطالعہ اور مشاہدہ سے اصول کا استنباط کیا جائے گا۔ اور کبھی قانون کی تصدیق کے لیے مثالیں جمع کی جائیں گی۔ اکثر اوقات استاد کی حیثیت لڑکوں کے ساتھ محض ایک ہم سبق طالب علم کی ہوگی۔ اور وہ تجربات میں سرزد شدہ غلطیوں اور کوتاہیوں سے سبق لیتا ہوا ذرہ پیشتر ابدل کر حقیقت تک پہنچے گا۔

پھر یہ بھی ضروری ہے کہ سائنس کو نصاب کے دوسرے مضامین کے ساتھ مربوط کیا جائے ریاضی تو خیر سے ہی سائنس کی دختر نیک اختر اور سائنس میں ریاضی بار بار آئے گی ہی۔ جغرافیہ کا بھی سائنس سے گہرا تعلق ہے۔ ہوائیں۔ بارش کی کمی بیشی۔ روئیں۔ آتش فشاں پہاڑ وغیرہ بیسیوں ایسی جغرافیائی معلومات ہیں جو علم سائنس پر منحصر ہیں۔ اور تو اور ادب میں بھی سائنس کو کافی جگہ مل سکتی ہے۔ اس شعر کی تشریح جو سائنس کر سکتی ہے اور کس کی ہمت ہے:-

ہے شباب اپنے لہو کی آگ میں جلنے کا نام سخت کوشی سے ہے تلخ زندگانی انگبیں

تعلیم کا تقابلی مطالعہ

فضل احمد

تقابلی مطالعہ کی ضرورت

تعلیم میں انسانی دل چسپی اتنی ہی قدیم ہے جتنی قدر قدیم انسانی معاشرہ۔ تاہم موجودہ دور میں یہ دل چسپی بے حد بڑھ گئی ہے۔ وہ ملک اور معاشرے جو کبھی جہالت اور توہم پرستی کی چادریں اوڑھے غفلت کی نیند سوئے پڑے تھے آج اس بات کے درپے ہیں کہ اپنے یہاں تعلیم کی روشنی عام کر دیں۔ تاکہ زندگی کی دوڑ میں وہ بھی دوسروں کے شانہ بشانہ چل سکیں۔ اس عالمگیر بیداری کی بڑی وجہ دورِ حاضر کی ہوش رُبا سائنسی ترقی ہے۔ جدید سائنس نے آمد و رفت، رسل و رسائل اور تبادلۂ افکار کے ذرائع میں اس تیزی سے اضافہ کیا ہے کہ آج دنیا کے دور افتادہ اور گمنام گوشے بھی سائنسی تہذیب کی لپیٹ سے متاثر ہو رہے ہیں، اور ان کی پُرسکون آغوش میں بھی ایک نئی زندگی کروٹ لیتی دکھائی دیتی ہے۔

تعلیم کی اس عالمگیر امنگ نے قوموں اور ملکوں کو مجبور کیا ہے کہ وہ دوسروں کے نظامِ تعلیم سے سبق سیکھیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ نہ صرف ماہرینِ تعلیم، بلکہ تاجر، سیاح اور عام لوگ بھی جب دوسرے ملکوں میں جاتے ہیں تو وہاں کے مدرسوں اور دوسرے تعلیمی اداروں کا حال معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں، تاکہ واپسی پر اپنے ہم وطنوں کو بتا سکیں کہ فلاں ملک نے سیاسی اور معاشی قوت حاصل کرنے کے لیے اپنے مدرسوں اور کالجوں میں کس قسم کی تعلیم جاری کر رکھی ہے۔ اس قسم کا رجحان نہ صرف پسماندہ اور کم ترقی یافتہ ملکوں میں ہی دکھائی نہیں دیتا، بلکہ ترقی یافتہ ملکوں میں بھی کم و بیش یہی کیفیت نظر آتی ہے۔ وجہ یہ کہ سائنس اور ٹکنالوجی کی رفتار اتنی تیز ہے کہ اچھے سے اچھا نظامِ تعلیم بھی دیکھتے ہی دیکھتے فرسودہ اور اصلاح طلب نظر آنے لگتا ہے۔ اس نکتے کی وضاحت کے لیے ایک جمن

ادو کے حالیہ خط کا اقتباس ملاحظہ فرمائیے۔ یہ خط ایک امریکی دوست کو لکھا گیا ہے۔ اس خط میں جرمن ادو لکھتا ہے:۔

دس سال گذرے جب ہم جرمن استادوں نے پہلی بار امریکہ کو دیکھا تو آپ کے مدرسے ہمارے لیے مستقل حیرت کا سامان بن گئے۔ ہمیں زیادہ حیرت اس بات پر تھی کہ کس طرح ہر بچے کو اس کی استعداد اور دلچسپیوں کے حسب حال اپنی رفتار پر نشوونما حاصل کرنے کے مواقع مہیا کیے گئے ہیں، مجھے بڑی خوشی ہو اگر ہم بھی اپنے ملک میں ایسا کر سکیں ہمارے یہاں یہ حالت ہے کہ نصاب ہوشیار لڑکوں کے لیے ضرورت سے زیادہ آسان ہے، اور کند ذہن بچوں کے لیے ضرورت سے زیادہ مشکل۔ ہمارا سارا زور مشق اور رٹا دینے پر ہے۔ ہر قدم پر امتحان موجود ہے۔ اس قسم کی تعلیم کے فوائد دیرپا ثابت نہیں ہوتے امریکی قوم میں دولت پیدا کرنے کی جو بے پناہ قوت موجود ہے اس کا راز یہ ہے کہ آپ اپنے بچوں کو فطری انداز میں نشوونما اور تعلیم حاصل کرنے کی اجازت دیتے ہیں بڑے افسوس کا مقام ہو گا، اگر آپ لوگ اس نعمت کو کھو دیں اور اس کی جگہ تعلیم میں تاپ تول کے وہی طریقے رائج کر دیں جنھوں نے یورپ کو پریشان کر رکھا ہے"

امریکی نظام تعلیم کو خراج تحسین وصول کیے زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا کہ روس نے اپنا پہلا مصنوعی سیارہ چھوڑ کر سائنس کی دنیا میں تہلکہ ڈال دیا، اور امریکی نظام تعلیم پر ہر طرف سے لے دے ہونے لگی کہ اس نے مدرسے میں آزادی کی جو فضا قائم کر رکھی ہے وہ غیر فطری اور نقصان دہ ہے، اس کی جگہ نظم و ضبط کے اچھے معیار قائم ہونے چاہئیں، تاکہ بچے اور نوجوان وہ کچھ نہ سیکھیں جو ان کی پسند ہو بلکہ وہ علوم اور مہارتیں حاصل کریں جن کی ملک اور قوم کو ضرورت ہے۔

اس مثال سے ظاہر ہے کہ دنیا آج سائنسی ترقی کے ایک ایسے درجے پر پہنچ چکی ہے جہاں ہر قوم کو سب سے بڑی فکر یہ دامن گیر ہے کہ دوسرے کہیں اس سے آگے نہ نکل جائیں۔ یہ فکر ان قوموں کو زیادہ خصوصیت کے ساتھ لاحق ہے جنھیں عالمی قیادت کا مقام حاصل ہے، یا جو اس مقام کی متمنی

یں۔ یہی وجہ ہے کہ ترقی یافتہ ملکوں میں نہ صرف بڑی بڑی یونیورسٹیوں میں تعلیم کے تقابلی مطالعہ کے
نصاب پیش کیے جاتے ہیں۔ بلکہ ان ملکوں میں کئی کتابیں اور رسالے اسی موضوع سے بحث کرتے ہیں
تعلیم کے تقابلی مطالعہ کو اہمیت دینے کے پیچھے فی الحقیقت یہ احساس کام کار فرما ہے کہ دوسرے ملکوں کے
متعلق اس قسم کے سوالوں کے جواب معلوم کیے جائیں :-
کیا ان کے مدرسے ہمارے مدرسوں سے بہتر ہیں ؟ کیا وہ اپنے بچوں کو زیادہ کچھ سکھاتے ہیں ؟
کیا یہ مدرسے ہماری نسبت سائنس اور ریاضی کو زیادہ توجہ دیتے ہیں۔ ان ملکوں کے بچے غیر ملکی زبانوں میں
اتنی استعداد کس طرح حاصل کر لیتے ہیں ؟ وغیرہ وغیرہ۔

نظامِ تعلیم پوری زندگی کا آئینہ ہوتا ہے

یہ سمجھنا نسبتاً آسان ہے کہ جدید دور میں تعلیم کے تقابلی مطالعہ کو زیادہ اہمیت کیوں دی جا رہی ہے
مگر اس مطالعہ کے بڑے سے بڑے ماہر بھی اوپر دیے گئے سوالوں کے دو ٹوک جواب نہیں دے سکتے۔ وجہ
یہ کہ ہر قوم اور ہر ملک کا نظامِ تعلیم اس کی مروجہ معاشرتی زندگی کی بقا کے لیے وضع کیا جاتا ہے۔ وہ اس
زندگی کے معاشی، سیاسی اور معاشرتی پہلوؤں کی بیک وقت آئینہ داری کرتا ہے۔ لہٰذا کسی ملک کے
نظامِ تعلیم کو سمجھنے کے لیے پہلے اس کی ساری زندگی کا اچھی طرح جائزہ لینا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ
تعلیم کا تقابلی مطالعہ کرنے والے عالم اس میدان میں بہتر یا بہترین کے الفاظ استعمال کرتے ہوئے جھجکتے
ہیں۔ کسی نظامِ تعلیم یا اس کے کسی پہلو کو اچھا کہتے وقت فوراً سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ کس مقصد کو
بہتر یا بہترین طور پر پورا کرتا ہے۔ ضروری نہیں کہ وہ اس سے مختلف مقصد کو بھی اسی کامیابی سے پورا
کرے۔ مثلاً مغربی جمہوریتوں نے اپنے یہاں جمہوریت کی زندگی کی بلند ترین قدر قرار دے رکھا ہے اور
ان کا نظامِ تعلیم اسی قدر کی خدمت کے لیے وضع کیا گیا ہے۔ اس کے برعکس روس کا نظامِ تعلیم ایک مرکزی
آمریت کے ہاتھ مضبوط کرنے کے لیے تیار کیا گیا ہے۔ نہائی مقصد کے اس بین اختلاف کے ہوتے ہوئے
یہ کہنا قطعاً بے معنی ہوگا کہ امریکی نظامِ تعلیم کے فلاں فلاں پہلو روسی نظامِ تعلیم سے بہتر یا فروتر ہیں۔ اس
قسم کا مقابلہ اسی صورت میں با معنی ثابت ہو سکتا ہے، جب دونوں تعلیمی نظاموں کے سامنے

زندگی کی ایک ہی منزل ہو۔ ایک مغربی ماہر تعلیم نے اس نکتے کی وضاحت یوں کی ہے :-
کسی نظام تعلیم کے متعلق رائے قائم کرنے سے پہلے یہ معلوم کرنا چاہیے کہ وہ غیر مرئی روحانی قوت کونسی ہے جو اسے سہارا دیے ہوئے ہے اور اس کی کامیابی کا اصل سبب ہے کسی غیر ملکی نظام تعلیم کا مطالعہ کرتے وقت ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ مدرسے میں جو کچھ ہو رہا ہے اس سے زیادہ اہم مدرسے سے باہر کی زندگی ہے۔ یہ بیرونی زندگی ہی مدرسے کی اندرونی زندگی کی شرح بیان کر سکتی ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ ہم خراماں خراماں دنیا بھر کے تعلیمی نظاموں میں سے ٹہلتے ہوئے گذریں، جیسے کوئی بچہ باغ میں ٹہل رہا ہو۔ کوئی پھول یہاں سے توڑ لیں کوئی پتہ وہاں سے اور پھر گھر واپس آکر ان سب کو زمین میں گاڑ دیں اور یہ امید رکھیں کہ اسطرح ایک ہرا بھرا پودا تیار ہو جائے گا۔ قومی نظام تعلیم ایک جیتی جاگتی شے ہوا کرتا ہے۔ یہ ان شخصوں آویزشوں اور مشکلات کا نتیجہ ہوا کرتا ہے جو مدت ہوئی پیدا ہوئی تھیں اور اب ذہنوں سے محو ہو چکی ہیں۔ نظام تعلیم میں قومی زندگی کی کچھ نہ کچھ روح مخفی ہوا کرتی ہے۔ اگرچہ اس کا مقصد قومی کمزوریوں کا دفعیہ ہوا کرتا ہے تاہم ان کمزوریوں کی جھلک خود اس میں صاف نظر آیا کرتی ہے۔ قومی کردار کو جن چیزوں کی ضرورت ہو نظام تعلیم طبعًا ان پر خاص اقتضاء زور دیا کرتا ہے۔ اسی طرح یہ طبعًا ان چیزوں سے جھینپتا ہے جن کے بارے میں ماضی میں سخت جھگڑے کھڑے ہو چکے ہوں۔"

جن عالموں نے تعلیمی میدان میں اپنی توجہ تقابلی مطالعہ کی نذر کی ہے ان سب کے تاثرات بالکل اسی قسم کے ہیں۔ ان کی متفقہ رائے یہی ہے کہ نظام تعلیم قومی زندگی کے تانے بانے میں اس طرح پیوست ہوا کرتا ہے کہ اسے اس سے الگ کرنا کسی طرح ممکن نہیں۔ اس کی خوبیاں اور اس کی کمزوریاں اسی ثقافتی پس منظر میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ لہٰذا تقابلی مطالعہ میں مختلف تعلیمی نظاموں کے درمیان درجہ بندی کا سوال سرے سے پیدا نہیں ہوتا۔ اگر کوئی نظام تعلیم کسی معاشرے کی ضرورتیں بہت اچھی طرح پوری کر رہا ہے تو یہ خیال کرنا خود فریبی ہے کہ اس کے اچھے پہلوؤں کو اٹھا کر کسی اور معاشرے میں من وعن منتقل کرنے سے اسی قسم کی خوبیاں وہاں بھی پیدا

کی جا سکتی ہیں۔ اگر کوئی نظامِ تعلیم کسی خاص ملک یا قوم میں بہت کامیاب ہے تو اس کی بڑی وجہ وہ ثقافتی پس منظر ہے جس نے اسے جنم دیا اور جو اسے اب بھی سہارا دیے ہوئے ہے۔ اگر یہی نظامِ تعلیم کسی اجنبی ثقافتی پس منظر میں منتقل کر دیا جائے تو اس سے وہ نتائج ہرگز پیدا نہ ہوں گے جن کی خاطر اسے مستعار لیا گیا تھا۔ گویا نظامِ تعلیم کی مثال بالکل اُس درخت کی ہے جو اپنی نشوونما کے لیے ایک مخصوص آب و ہوا، اور مخصوص قسم کی زمین کا مطالبہ کرتا ہے۔ مثلاً آم کا ایک پیڑ اگر شمالک کی پہاڑیوں کے سایہ تلے خوب پھل پھول رہا ہے تو یہ خیال کرنا غلط ہے کہ اسے سطح مرتفع پوٹھوہار بھی اسی طرح راس آجائے گی۔ اپنے اصلی وطن سے دوسری جگہ منتقل ہو جانے کا اغلب نتیجہ یہ ہوگا کہ آم کا درخت بالکل ہی مرجھا جائے، اور اگر زندہ رہے بھی تو اس قسم کا پھل نہ دے جو وہ اپنے وطن میں دیا کرتا تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ سرے سے کوئی پھل ہی نہ دے۔

تعلیم کے لیے یہ نکتہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ تعلیم و تربیت بے شک کامیاب زندگی کی بنیادیں ہیں۔ لیکن جو تعلیم و تربیت کسی خاص معاشرے میں قابلِ رشک نتائج پیدا کر رہی ہو، اغلب یہ ہے کہ وہ دوسرے اجنبی معاشروں کے لیے حسبِ حال ثابت نہ ہوگی۔ لیکن ایک عام انسان کا ذہن یہ دھوکہ کھاتا ہے کہ جو تعلیم و تربیت انگلستان اور امریکہ میں حیرت انگیز نتائج پیدا کر رہی ہے کوئی وجہ نہیں کہ وہ پاکستان کے لیے تریاق ثابت نہ ہو۔ یہ اسی غلط فہمی کا نتیجہ ہے کہ ہم کوئی ایک صدی سے اپنے بہترین دماغوں کو یورپ اور امریکہ کے دانش کدوں میں بھیج رہے ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ ہم اپنے عام بچوں کے لیے بھی کم و بیش اسی قسم کی تعلیم و تربیت مہیا کرنے کی دُھن میں ہیں جو مغربی بچوں کو میسر ہے۔ یہاں تک تو خیر تھی، مگر مصیبت یہ ہے کہ اس مہنگے تجربے نے جو مایوس کن نتائج پیدا کیے ہیں ان کا تجزیہ کرنے میں بھی ہم نے سخت ٹھوکر کھائی ہے۔ جب مغربی تعلیم ہمارے لیے وہ نتائج پیدا نہیں کرتی جو اس نے اپنے اصلی وطن میں پیدا کیے ہیں تو ہم اس کی یہ وجہ قرار دیتے ہیں کہ ہم اپنے مدرسوں میں وہ تمام سہولتیں فراہم نہیں کر سکے جو یورپی مدرسوں کو حاصل ہیں۔ اس دُھن میں ہم اس بات کے درپے ہیں کہ ہمارے بچے پہلی جماعت سے انگریزی

پڑھنے لگیں اور ان کو پڑھانے والے حتی الامکان اہل زبان ہوں، مگر ان سارے جتنوں کے باوجود زندگی کے تقریباً ہر میدان میں ہماری نگاہیں رہ رہ کر غیر ملکی فنی ماہرین کی طرف ہی اٹھتی ہیں۔ ہمارے اپنے تعلیمی اداروں کے فارغ التحصیل نوجوان کسی نہ کسی طرح ایک بڑا سوالیہ نشان نظر آتے ہیں۔ صرف یہی نہیں ہمارے جو لوگ غیر ملکی تعلیمی اداروں سے فارغ التحصیل ہو کر آتے ہیں وہ بھی بسا اوقات ان توقعات کو پورا نہیں کرتے جو ان کے ساتھ وابستہ ہوتی ہیں۔ بعض حالتوں میں یہ لوگ غیر ملکی یونیورسٹیوں میں امتیازی کامیابی بھی حاصل کر لیتے ہیں اور غیر ممالک میں انھیں اچھی اچھی اسامیاں بھی مل جاتی ہیں۔ مگر گھر میں آ کر ان کی وہ علمی اور فنی تابانی ایک پُراسرار طریق پر گہنا جاتی ہے۔ یہ ایک بہت بڑا قومی المیہ ہے۔ مگر اس کے اسباب کا تجزیہ کرنے کی ہم نے کبھی کوئی کوشش نہیں کی۔

اصل بات غالباً یہ ہے کہ مغربی علوم و فنون اپنی جگہ ناقابل انکار افادیت کے حامل ہیں۔ مگر ان علوم و فنون نے مغربی ملکوں میں جنم لیا اور مغربی ثقافت کی گود میں پرورش پائی ہے۔ ہم نے ان علوم و فنون کو اپنے تعلیمی اداروں میں منتقل کرنے کی کوشش ضرور کی ہے۔ انھیں اپنی مخصوص ثقافتی روح عطا کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی اور جب تک یہ نہیں ہوتا اس وقت تک مغربی تعلیم کا پودا ہمارے ملک میں وہ پھل پھول پیدا نہیں کر سکتا جو وہ اپنے اصل وطن میں پیدا کر رہا ہے۔

ہمارے جو لوگ مغربی دانش گاہوں میں تعلیم و تربیت حاصل کرتے ہیں، ان کے ساتھ بھی کچھ اسی قسم کا ماجرا گزرتا ہے۔ وہ مغربی ملکوں میں پہنچ کر ان ملکوں کی ہمہ گیر ثقافتی فضا سے ہم آہنگ ہو جاتے ہیں اور اس فضا میں جنم لینے والی تعلیم میں خوب کامیاب دکھائی دیتے ہیں۔ مگر وطن میں واپسی پر وہ ایک مختلف قسم کی ثقافتی فضا سے دوچار ہوتے ہیں، جس میں وہ معاشرتی عناصر ناپید نظر آتے ہیں، جن کے بل بوتے پر مغربی تعلیم پھل پھول رہی ہے۔ اس چیز کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مغربی یونیورسٹیوں کے یہ فارغ التحصیل لوگ اپنی بہت کچھ افادیت کھو دیتے ہیں۔ وجہ یہ کہ ہر تعلیم ایک خاص ثقافتی روح کی حامل ہوا کرتی ہے اور یہ روح ان لوازمات کے ساتھ ہی زندہ رہ سکتی ہے جو پہلے دن سے اس کے ساتھ وابستہ رہے ہوں۔ ایک اجنبی ثقافتی ماحول میں اس روح کا زندہ

رہنا بہت مشکل ہے۔

تقابلی مطالعہ کی اصل قدر و قیمت

اس تجزیے کے بعد فوراً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا تعلیم کا تقابلی مطالعہ ایک بے کار شے ہے؟ اگر کسی کامیاب نظام تعلیم کے امتیازی پہلو اپنے مخصوص ثقافتی ماحول سے الگ برگ و بار پیدا نہیں کر سکتے تو غیر ملکیوں کو اس نظام تعلیم کے مطالعہ سے کیا حاصل؟

ہم دیکھ چکے ہیں کہ تقابلی مطالعہ کی اصطلاح ہی غلط ہے کیوں کہ دو مختلف نظام ہائے تعلیم کا باہمی موازنہ سرے سے ممکن نہیں۔ ان میں سے ہر ایک کی خوبیاں اور کمیاں اپنے معاشرتی ماحول کے تانے بانے کے اجزائے لاینفک ہیں، اس تانے بانے سے الگ ان کا کوئی وجود نہیں لہٰذا ان کا باہمی موازنہ ایک موہوم شے ہے۔ تاہم اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ دنیا کے مروجہ نظام ہائے تعلیم کا مطالعہ کرنا بے کار ہے۔ اس مطالعہ کو خواہ کوئی نام بھی دیا جائے مطالعہ کرنے والے کو جو ذہنی تربیت حاصل ہوتی ہے، اس کی قدر و قیمت مسلمہ ہے۔ یہ تربیت اسے اس قابل بنا دیتی ہے کہ اپنے نظام تعلیم پر زیادہ سوجھ بوجھ اور وسیع تر پس منظر کے ساتھ نگاہ ڈالے اور اس کی خوبیوں اور کمزوریوں کا ایسا جامع اور معنی خیز جائزہ لے جو بصورت دیگر ممکن نہ ہوتا۔ تعلیم کے تقابلی مطالعہ کی یہی وہ افادیت ہے جس نے اسے پرانے وقتوں سے قدر و قیمت عطا کر رکھی ہے۔ یہ قدر و قیمت آج بھی بدستور موجود ہے۔ دور حاضر میں علم التعلیم کا طالب علم اس مطالعہ سے جن فوائد کی توقع رکھ سکتا ہے، انھیں ذیل کے چار حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

اس مطالعہ کا پہلا فائدہ یہ ہے کہ جس غیر ملکی نظام تعلیم کا مطالعہ کیا جاتا ہے، اس کے ثقافتی پس منظر کا گہری نگاہ سے تجزیہ کیا جاتا ہے۔ پہلے وقتوں میں اس قسم کا تجزیہ بہت شاذ کیا جاتا تھا۔ مگر جدید علم التعلیم تقابلی مطالعہ میں توجہ کا مرکز غیر ملکی نظام تعلیم کی تفصیلوں کی بجائے ان ثقافتی عناصر کو قرار دیتا ہے جن کی بدولت یہ نظام تعلیم وجود میں آیا اور بعد میں اسے تقابلی مطالعے کا ذریعہ بنا مثلاً فرانسیسی نظام تعلیم کے متعلق اتنا کہہ دینا کافی نہیں سمجھا جاتا کہ یہ علمی قسم کے نصاب پر زور دیتا ہے

اس سے آگے بڑھ کر فرانس کی تاریخ میں ان اسباب کا کھوج لگایا جاتا ہے جنھوں نے علمی قسم
ھاب کو جنم دیا۔ اسی طرح برطانوی نظام تعلیم کے مطالعہ میں ان معاشی قوتوں کا سراغ لگایا جاتا
جن کی بدولت یہ نظام تعلیم مدتوں غیر جمہوری روح کا حامل رہا اور عوام کے لیے تعلیمی سہولتیں مہیا
ا سکا۔ جرمنی کے نظام تعلیم پر نگاہ ڈالتے وقت توجہ کا اصل مرکز وہ معاشرتی نظام بنتا ہے جس نے اس
ب جداگانہ تعلیمی سہولتوں کو مسلط کیا۔ ناروے سویڈن وغیرہ کے نظام تعلیم کا مطالعہ کرتے وقت
ا ہی ریاست کا وہ فلسفہ پیش نظر رہتا ہے جس نے ان ملکوں کی اجتماعی زندگی کا خاکہ تیار کیا ہے۔ غرض
علیم کا تقابلی مطالعہ فی الحقیقت ملکوں اور ملتوں کی اجتماعی روح کا مطالعہ ہوا کرتا ہے۔ یہ مطالعہ علم تعلیم
لے علاوہ معاشیات، عمرانیات اور سیاسیات کے اصولوں اور ان کی دور رس کار فرمائیوں پر بھی سبق آموز
روشنی ڈالتا ہے۔ اس طرح جو وسیع ذہنی پس منظر تیار ہو جاتا ہے وہ تعلیم کا مفہوم اور اس کے
امکانات سمجھنے میں بڑی مدد دیتا ہے۔

اس مطالعہ کا دوسرا بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس کی بدولت تعلیمی دنیا کی تبدیلیوں کے اصل
محرکات کا کھوج لگایا جا سکتا ہے۔ جو نگاہ اس حقیقت سے آگاہ ہو کہ نظام تعلیم کے تمام خدوخال
مختلف معاشرتی عوامل کی پیداوار ہوا کرتے ہیں۔ اس کے لیے کسی غیر ملکی نظام تعلیم میں پیدا ہونے والے
رد و بدل کو دیکھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں رہتا کہ اس ملک کی زندگی میں کون سے نئے محرکات مصروف
عمل ہیں۔

یہ نکتہ ایک مثال سے واضح ہو جائے گا۔ دسمبر ۱۹۵۸ء سے پہلے روس میں ساتویں جماعت
تک کی تعلیم ہر ایک کے لیے لازمی تھی اور ثانوی نصاب زیادہ تر علمی قسم کا تھا۔ دسمبر ۱۹۵۸ء میں
روسی وزیر اعظم خروشچیف نے اعلان کیا کہ آئندہ آٹھویں جماعت تک کی تعلیم ہر ایک کے لیے
لازمی ہو گی۔ اس سے آگے ثانوی جماعتوں میں جو تعلیم دی جائے گی وہ جز وقتی ہو گی اور ہائی جماعتوں
کا ہر طالب علم وقت کا زیادہ حصہ کارخانوں میں عملی تربیت حاصل کرنے میں گزارے گا۔ یہ تعلیمی
تبدیلی اس بات کی آئینہ دار تھی کہ روسی زندگی میں کوئی اہم تبدیلی پیدا کی جا رہی ہے۔ اس خیال کی

تصدیق بہت جلد روس کے سرکاری اخبار پراودا کے ایک مضمون سے ہو گئی۔ اس مضمون میں تعلیمی اکاڈیمی کے صدر کیراف نے لکھا تھا کہ :-

"۱۹۳۱ء میں روسی مدرسوں کے ذمہ یہ کام لگایا گیا تھا کہ روسی نوجوانوں کو ٹیکنیکل مدرسوں اور اعلیٰ تعلیمی اداروں کے لیے تیار کریں۔ چناں چہ مدرسوں نے ان نوجوانوں کو بنیادی سائنسوں (روسی زبان طبیعات۔ کیمیا۔ تاریخ۔ جغرافیہ وغیرہ) کی تعلیم دینی شروع کی۔ مدرسوں کے ذمے کام یہ تھا کہ قومی معیشت اور قومی ثقافت کے لیے ہزاروں نوجوان ماہر پیدا کریں۔ پچھلے پچیس تیس برس میں مدرسے اسی کام میں لگے رہے ہیں۔ اور مجموعی طور پر وہ اس مقصد میں کامیاب بھی رہے ہیں۔ اس وقت ملک میں ساٹھ لاکھ سے زیادہ نوجوان ماہر موجود ہیں جو ملکی معیشت اور قومی ثقافت کے لیے کام کر رہے ہیں ان نوجوانوں نے ثانوی درجے تک یا اس سے آگے اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہے۔ روسی مدرسے اس مقصد میں جس حد تک کامیاب رہے ہیں اس کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ زمانہ قبل از انقلاب کے مقابلے میں اس وقت روس میں ۴۲ گنا فنی ماہر موجود ہیں نتیجہ یہ ہے کہ ملک میں ایک حقیقی ثقافتی انقلاب پیدا ہو چکا ہے۔

تاہم ثانوی مدرسوں کے سامنے اب تک یہ مقصد تھا کہ اپنے طلبہ کو اعلیٰ تعلیم کے لیے تیار کریں چناں چہ وہ صنعتی تعلیم دینے سے قاصر رہے۔ اور مختلف الاطراف ٹیکنیکل تعلیم کے متعلق لینن نے جو خواب دیکھا تھا وہ پورا نہ ہو سکا۔ اس صورتِ حال نے مدرسے اور زندگی کے درمیان ایک بعد پیدا کر دیا۔ زمانۂ بعد از جنگ میں خوفناک طور پر نمایاں ہونے لگا۔ ثانوی مدرسوں کے فارغ التحصیل نوجوانوں کو جب صنعت اور زراعت میں داخل ہونا پڑا تو ان کی تعلیمی کمی خوفناک انداز میں ظاہر ہونے لگی۔ ثانوی مدرسوں سے نکلنے والے نوجوان عملی زندگی کی آزمائش میں افسوس ناک نااہلی کا ثبوت دینے لگے۔ ان میں سے بہتوں نے خیال کرنا شروع کیا کہ ثانوی مدرسے میں تعلیم حاصل کرنے کا صلہ کارخانوں اور کھیتوں میں محنت سے چھٹکارا پانا ہے۔ زندگی کے حالات اتنی تیزی سے بدلے کہ اپنے نصابِ تعلیم میں ان کے حسبِ حال تبدیلی نہ کر سکے۔"

روسی نظامِ تعلیم میں جس بنیادی تبدیلی کی خبر اوپر کے اقتباس سے ملتی ہے اس کو سامنے رکھ کر
حب نظر ماہرِ تعلیم روس کے اس سات سالہ معاشی منصوبے کا خاکہ تیار کر سکتا ہے جس کا اعلان کچھ عرصہ
بسی وزیر اعظم نے کیا۔ خروشچیف کے دسمبر کے اعلان نے روسی مدرسوں کے نصاب میں جس انقلابی
کی طرف اشارہ کیا تھا، اسے دیکھ کر یہ اندازہ کرنا مشکل نہ تھا کہ روسی معیشت میں کیا تبدیلی
ہونے والی ہے۔ اس قسم کی بصیرت انسان کو اس قابل بنا دیتی ہے کہ نظامِ تعلیم میں پیدا ہونے والی
یوں کے حسن و قبح پر معقولیت کے ساتھ رائے زنی کر سکے۔

تعلیمی امور میں اس قسم کی بصیرت انسان کو اس قابل بھی بنا سکتی ہے کہ وہ پسماندہ ملکوں
بی تجربوں کی ناکامی کے اسباب سمجھ سکے۔ ایشیا اور افریقہ کے متعدد ملکوں میں مغربی نظامِ تعلیم
ن کا توں درآمد کیا گیا ہے۔ لیکن اپنے اصلی وطن میں مسلّم کامیابی کا حامل ہونے کے باوجود
بی نظامِ تعلیم نے ان پسماندہ ملکوں میں کوئی قابلِ ذکر کارنامہ انجام نہیں دیا۔ مثلاً پاکستان
وستان اور بہت سے دوسرے ایشیائی ملکوں میں مغربی تعلیم کی آمد کے سالہا سال بعد آج بھی
ت ناخواندگی کا مسئلہ پوری شدت کے ساتھ موجود ہے۔ بلکہ ان ملکوں کے مدرسوں نے نوجوانوں
یسی فوج تیار کر دی ہے جو کلرکی یا دوسرے چھوٹے موٹے علمی کام کے علاوہ اور کچھ نہیں
۔ ان ملکوں کے مدرسے گویا تعلیم اور عملی زندگی کے درمیان روز افزوں فاصلہ پیدا کرنے کے
ب بنے ہیں۔

تقابلی تعلیم کا طالب علم ان اسباب کا کھوج لگا سکتا ہے جنھوں نے تعلیم اور ملکی ثقافت کے
بان بُعد پیدا کر رکھا ہے۔ مثلاً پاکستان کے امتحان میٹرک میں تاریخ انگلستان کو آج تک
ہم جگہ حاصل ہے۔ مگر تاریخ اسلام کے لیے کوئی گنجائش نہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ نویں اور دسویں
ں کے لاکھوں طالب علم ہر سال اپنا بہت سا قیمتی وقت انگریز تاجداروں اور ان کے کارناموں
العہ پر صرف کر دیتے ہیں۔ مگر انھیں اس بات کی کچھ خبر نہیں کہ جن اسلامی قدروں کی بقا و ترقی کے لیے
تان قائم کیا گیا ہے۔ ان کی آبیاری کرنے والے کون تھے۔ اور انھوں نے ان کی نشر و اشاعت

کے لیے کیا کچھ کیا ؟ مڈل اور ہائی جماعتوں کے لاکھوں طلبہ اپنا قیمتی وقت حساب کے اس قسم کے سوال حل کرنے میں ضائع کرتے ہیں ۔ ایک حوض کو ا نل دس گھنٹوں میں بھر سکتا ہے ۔ اور ب نل بارہ گھنٹوں میں ۔ دونوں نل صبح آٹھ بجے کھولے گئے ۔ ساڑھے دس بجے ا نل خراب ہوگیا ۔ بتاؤ ب نل اکیلا اب حوض کو کتنے بجے تک پُر کرے گا ؟ جو نوعمر طلبہ اور طالبات اس قسم کے بے معنی سوالات حل کرنے میں معروف رکھے جاتے ہیں ان کے اپنے گھروں کے پاس گندے پانی کے جوہڑ موجود ہوتے ہیں ، جہاں مچھر اور طرح طرح کے جراثیم پرورش پاتے ہیں ۔ ان کو پینے کے لیے جو پانی میسر آتا ہے وہ کئی حالتوں میں ناقسل بخش اور جراثیم سے لدا ہوتا ہے ۔ مگر نصاب تعلیم کی ستم ظریفی ملاحظہ ہو کہ وہ بچوں اور جوانوں کو زندگی کے ان عملی مسائل سے بے خبر رکھ کر انھیں عجیب و غریب قسم کے فرضی مسائل میں الجھائے رکھتا ہے ۔ مڈل اور ہائی جماعتوں کے لاکھوں طلبہ اور طالبات انگریزی سیکھنے کے لیے دن رات ایک کر دیتے ہیں ۔ مگر ان میں سے بیشتر قومی زبان پر اس قدر دسترس حاصل نہیں کر سکتے کہ اس زبان میں بلا تکلف اپنے خیالات اور احساسات بیان کر سکیں ۔

مڈل اور ہائی جماعتوں کے طلبہ اور طالبات کی اکثریت وقت کا ایک خاص حصہ فارسی زبان کے مطالعہ پر صرف کرتی ہے ، وہ محض اس لیے کہ انگریزی دور سے پہلے اس ملک کی سرکاری زبان فارسی تھی ۔ فارسی زبان کی حکمرانی کو ختم ہوئے صدیاں ہونے کو آئیں اور اب ہماری زندگی پر جدید سائنس اور ٹیکنالوجی کی حکمرانی ہے ۔ مگر نصاب تعلیم نے عملی زندگی کے اس انقلاب کو تسلیم نہیں کیا ۔ ہر سال ہزاروں نوجوان جو اعلیٰ تعلیم بلکہ ثانوی تعلیم کے مواقع سے محروم رہ گئے تھے ۔ فارسی زبان کے امتحان پاس کر کے زندگی کے مختلف شعبوں میں جگہ حاصل کر سکے ہیں ۔ مگر یونیورسٹی امتحانوں کا نصاب مرتب کرنے والوں کو اس بات سے کچھ غرض نہیں کہ فارسی زبان کے جن نصابوں کو وہ زندگی کے مختلف میدانوں میں داخلے کی شرط بنا چکے ہیں ۔ وہ طلبہ اور طالبات کو موجودہ زندگی کے لیے نہیں بلکہ قرونِ وسطیٰ کی زندگی کے لیے تیار کرتے ہیں ۔

نظامِ تعلیم کی یہ ستم ظریفیاں ہمارے بچوں اور نوجوانوں کو گرد و پیش کی زندگی اور جدید سائنسی حقائق

سے بے تجربہ رکھے ہوئے ہیں۔ تعلیم کا تقابلی مطالعہ اس صورت حال کی نوعیت کو پوری طرح آشکارا کر سکتا ہے۔ اس مطالعہ کی بدولت یہ بھی طے کیا جا سکتا ہے کہ نظام تعلیم میں کونسی ضروری تبدیلیاں ہونی چاہئیں تقابلی مطالعہ کا یہ پہلو بے حد اہم ہے۔ کیوں کہ اس کی بدولت اپنی خامیوں اور ان کے علاج کے متعلق عملی رہنمائی حاصل ہوتی ہے۔

تعلیم کے تقابلی مطالعہ کا تیسرا فائدہ یہ ہے کہ یہ عالم التعلیم کے طلبہ کو درسی کتابوں کے دائرے سے باہر نکل کر انھیں طرح طرح کے سبق آموز مشاہدوں اور تجربوں کی راہ پر ڈال دیتا ہے۔ جو شخص تقابلی مطالعہ کا ذوق پیدا کر لے وہ مقامی مدرسوں کو چھوڑ کر دوسرے مدرسوں کے متعلق رائے قائم کرنے کے لیے مختلف لوگوں کی رائے طلب کرے گا۔ ان کے رد عمل کا جائزہ لے گا۔ وہ سیاحت کی ضرورت محسوس کرے گا تعلیمی کانفرنسوں اور مذاکروں میں حصہ لے گا۔ اپنے مشاہدوں اور تاثرات کو سائنسی بنیاد عطا کرنے کے لیے قابل اعتماد اعداد و شمار جمع کرے گا۔ اور ان مطالعوں کے نتائج رپورٹوں اور رسالوں کی شکل میں شایع کرے گا۔ وہ غیر ملکوں کے ساتھ طلبہ اور اساتذہ کے تبادلے کے پروگراموں کا جائزہ لے گا۔ غرض وہ صرف درسی کتابوں پر بھروسہ نہیں کرے گا بلکہ ان تمام وسائل کی مدد تلاش کرے گا جو تقابلی مطالعہ کے لیے ذاتی تجربے اور مشاہدے کی بنیادیں فراہم کرتے ہیں۔

تقابلی مطالعہ کا چوتھا اور آخری فائدہ یہ ہے کہ یہ ایک ایسا آئینہ مہیا کر دیتا ہے جس میں قومی نظام تعلیم کے خدوخال کو بڑی وضاحت کے ساتھ دیکھا جا سکتا ہے۔ ہم پیچھے دیکھ چکے ہیں کہ اس سے یہ مراد ہرگز نہیں کہ تقابلی مطالعہ سے کسی نظام تعلیم کے اچھے برے پہلوؤں کے متعلق کوئی قطعی ترازو تیار کیا جا سکتا ہے۔ یہ بات کسی طرح ممکن نہیں۔ لیکن تقابلی مطالعہ سے مختلف ثقافتی پس منظروں اور معاشرتی نظاموں کے معنی خیز تجزیے کی ایسی مہارت ہاتھ لگ جاتی ہے جو ملکی ثقافت اور قومی معاشرت کے معنی خیز تجزیے میں بھی مدد دیتی ہے۔ یہ صلاحیت انسان کو اس قابل بنا دیتی ہے کہ وہ قومی روح اور قومی تعلیم کے باہمی رشتوں کو سمجھ لے۔ یہ فہم اسے اس قابل بنا سکتا ہے کہ وہ زمانے کی بدلتی ہوئی ضرورتوں کے حسب حال نظام تعلیم میں ضروری تبدیلیوں کا اندازہ کر سکے۔ اس قسم کی نگاہ

ملک و قوم کی بہبود کے لیے بڑا کام دے سکتی ہے۔ اس نکتہ کی وضاحت ایک امریکی ماہر عمرانیات کی زبانی سنیے :-

"جب ہم امریکی ثقافت کا مقابلہ ایک اجنبی ثقافت سے کرتے ہیں تو اس سے ہمارے اپنے مسائل میں سے بعض پر خوب جم کر روشنی پڑتی ہے اور بعض مسائل کے متعلق رد و بدل کے مفید اشارے ہاتھ لگتے ہیں۔ دوسری قوموں نے اپنے مسائل کے جو حل معلوم کیے ہیں ہم انھیں خواہ رشک کی نگاہ سے دیکھیں یا نہ دیکھیں۔ لیکن یہ بات یقینی ہے کہ جب ہم ان طور طریقوں سے باخبر ہوتے ہیں جن کی بدولت دوسرے لوگوں نے اپنے مسائل حل کیے ہیں تو اس سے ہمارا نقطۂ نگاہ وسیع تر اور عمیق تر ہو جاتا ہے۔ اگر ہم یہ نکتہ پیش نظر رکھیں کہ ہمارے اپنے طور طریقے نہ ہی اٹل ہیں اور نہ ہی خدا تعالیٰ کی طرف سے مقرر کیے گئے ہیں۔ بلکہ وہ ایک لمبی اور پُر آشوب تاریخ کی پیداوار ہیں تو اس سے ہم اس قابل ہو جاتے ہیں کہ اپنے طور طریقوں اور اداروں پر دوسری تہذیبوں کے پس منظر میں نگاہ ڈالیں اور اگر وہ اس ترازو میں پورے اترتے نظر آئیں تو اس بات سے ہرگز خائف نہ ہوں"

حرف آخر

ملکی یا غیر ملکی مدرسوں پر نگاہ ڈالتے وقت یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ مدرسہ مجموعی ثقافتی زندگی کا ایک بے حد اہم رُخ ہے۔ جب ہم یہ معلوم کر لیتے ہیں کہ غیر ملکی مدرسے اپنی اپنی تہذیبوں اور ثقافتوں کی ضرورتوں کو کس طرح پوری کر رہے ہیں تو اس سے ہم یہ اندازہ بھی کافی صحت کے ساتھ کرنے لگتے ہیں کہ ہمارے اپنے مدرسے قومی ضرورتوں کو کس خوبی سے پورا کر رہے ہیں۔ یہ علم قومی اور بین الاقوامی مقاصد اور تعلیم کے باہمی تعلق کو بڑی اچھی طرح واضح کر دیتا ہے۔

تعلیم کے تقابلی مطالعہ سے یہ غلط فہمی بھی دور ہو جاتی ہے کہ کوئی خاص نصاب تعلیم یا اسلوب تعلیم یا طریق تدریس ہر حالت میں بہترین نتائج کی ضمانت دے سکتا ہے۔ مختلف نظام ہائے تعلیم کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ قدیم اور جدید، ترقی پسند اور قدامت پسند، مشرقی اور مغربی، مذہبی اور لادینی غرض ہر قسم کے نظام تعلیم نے ایسے افراد پیدا کیے ہیں جنھیں انسانیت کی صف اوّل میں

جگہ مل سکتی ہے۔ پس کسی نظامِ تعلیم کی اچھائی یا برائی کا اندازہ اس کے پیدا کردہ گنے چنے افراد سے نہیں بلکہ اس روح سے کرنا چاہیے جو اس میں رچی بسی نظر آتی ہو۔ اس روح کے حامل وہ لوگ ہوا کرتے ہیں جو اس نظامِ تعلیم کو چلا رہے ہوں۔ جو نظامِ تعلیم پڑھنے اور پڑھانے والوں کی انفرادیت اور ان کے مقصدِ حیات کو ابھارنے والا اور تقویت دینے والا ہو وہ یقیناً تعریف کے قابل ہے۔ اس قسم کے نظامِ تعلیم کے لیے ضروری ہے کہ وہ گرد و پیش کی دنیا کے ساتھ پوری طرح مربوط ہو اور اساتذہ اور طلبہ دونوں کے دلوں میں اعتماد اور مسرت کے جذبات پیدا کرتا ہو۔

پسماندہ ملکوں کے لیے یہ نکتہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ترقی یافتہ قوموں کی صف میں جلد از جلد جگہ حاصل کرنے کی دھن میں پسماندہ ملک عموماً اپنے یہاں کسی غیر ملکی نظامِ تعلیم کو من و عن رائج کر لیتے ہیں۔ جو لوگ اس قسم کا فیصلہ کرتے ہیں، اگر وہ تعلیم کے تقابلی مطالعہ کی روح سے باخبر ہوں تو وہ اس قسم کی غلطی کبھی نہ کریں۔ بے شک دوسرے ملکوں سے نئے تصورات اور نئے طریقۂ کار مستعار لینا کوئی بری بات نہیں۔ پرانے وقتوں سے قومیں ایک دوسری کا سبق سیکھتی آئی ہیں مگر جو شخص تعلیم کے تقابلی مطالعہ میں ماہر ہوگا وہ کسی غیر ملکی نظامِ تعلیم کو اپنے ہاں جوں کا توں نہیں روا رکھے گا۔ وہ بدیسی نظامِ تعلیم کے معاشرتی پس منظر کا گہری نگاہ سے مطالعہ کرے گا۔ اس کے ساتھ ہی وہ اپنے معاشرتی اور ثقافتی پس منظر پر بھی نگاہ رکھے گا۔ اور بالآخر ان تمام باتوں کو ذہن میں رکھ کر غیر ملکی تعلیمی نظریوں اور طریقہ ہائے تدریس کو ایسی شکل دے گا جو انھیں اپنی قومی روح اور ملکی ثقافت سے پوری طرح ہم آہنگ کر دے۔

تعلیم کے تقابلی مطالعہ کا یہ پہلو پس ماندہ معاشروں کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔ جہاں کہیں بھی تعلیم کی تجدید یا تعمیر نو پیشِ نظر ہو، وہاں تقابلی مطالعہ ایک ناگزیر ضرورت بن جاتی ہے۔

برطانیہ کا نظام تعلیم

محمد عبدالعزیز مسلسل نمبر ۲

ابتدائی تعلیم

برطانیہ میں تعلیم کا جو ڈھانچہ اس وقت تک قائم ہوا ، اور کئی نسل نہ تھے جیسے مخلص کارکنوں کی کوششوں میں اس پر جو صیقل ہوئی اس سے یہ توقع ہو چلی تھی کہ اب یہ ملک بھی توسیع و ترقی کی منزلیں تیز گامی سے طے کرے گا لیکن نیوکاسل کمیشن کی اطمینان بخش رپورٹ نے ترقی کی رفتار کو روک دیا ۔ اطمینان ترقی کے لیے مہلک ہوتا ہے اور جب یہ سمجھا دیا جائے کہ ہماری تعلیمی حالت نہایت عمدہ ہے ۔ اس میں مزید کسی اصلاح کی گنجائش نہیں تو اسے بہتر بنانے کی یقیناً کوئی کاوش نہیں کی جائے گی ۔ تعلیم کی ترقی و توسیع کے سلسلے میں دوسری غلطی ۱۸۶۲ء کا اصلاح شدہ مجموعہ قوانین ہے ۔ اس سے کوئی تعلیمی اصلاح نہ ہو سکی بلکہ بعض ایسی انتظامی پیچیدگیاں پیدا ہو گئیں کہ ان کا سلجھانا آسان نہ رہا ۔ ۱۸۶۷ء اور ۱۸۶۸ء میں حکومت نے اصلاح حال کے دو تعلیمی بل پیش کیے لیکن مخالفت کی وجہ سے دونوں کو واپس لینا پڑا ۔

یہ کشمکش جاری ہی تھی کہ ۱۸۶۸ء میں ایک نئی تبدیلی رونما ہوئی ۔ اس سال کے پارلیمانی انتخابات میں لبرل پارٹی ایک معقول اکثریت سے کامیاب ہوئی ۔ نئی کابینہ میں ڈبلیو ای فورسٹر (W.E. FORSTER) ممبر بریڈ فورڈ کو محکمۂ تعلیم کا نائب صدر مقرر کیا گیا ۔ فورسٹر خود ایک متمول سوداگر تھا ۔ یہ کارلائل (CARLYLE) کا دوست اور ڈاکٹر آرنلڈ آف رگبی (DR. ARNOLD OF RUGBY) کا داماد تھا ۔ کارلائل کے مراسم نے اسے آزاد خیال اور لبرل بنا دیا تھا ، اور خاندان آرنلڈ سے جو اسے نسبت تھی اس کی بدولت اس میں تعلیم و تعلم اور ملک کی عمومی بہتری سے دلچسپی پیدا ہو گئی ۔ تعلیمی اصلاحات کے سلسلے میں اس نے جو سرگرمی دکھائی اس کا اندازہ لگانے کے لیے اس کے اس ذہنی پس منظر کو بھولنا نہیں چاہیے

جس وقت فورسٹر محکمۂ تعلیم کا نائب صدر مقرر ہوا۔ ملک میں دو قسم کے خیالات کار فرما تھے۔ ایک
ہ جو لازمی، مفت، اور عالمگیر ابتدائی تعلیم کے حامل تھے۔ ان تعلیمی رجحانات کو فروغ دینے
ے اس ترقی پسند گروہ نے برمنگھم ایجوکیشن لیگ قائم کی اور جارج ڈکسن (GEORGE DIXON)
کا صدر مقرر کیا۔ دوسرا گروہ فرقہ وارانہ طرز تعلیم کے حق میں تھا۔ اپنے نظریات کی ترویج کے لیے
روہ نے نیشنل ایجوکیشن یونین کی بنیاد ڈالی۔ لیکن ان دونوں گروہوں نے اپنے اصولوں کی
ری سد بندی قائم کی اس سے انھیں باہمی افہام و تفہیم کا بہت کم موقع ملا۔ تنازعات بڑھتے گئے
اختلافات شدید ہوتے گئے حتیٰ کہ بظاہر مفاہمت کی کوئی صورت باقی نہ رہی۔ یہ ذہنی ٹکراؤ ہوتا رہا۔ لیکن
وقت تک پارلیمان کی حیثیت ایک تماشائی کی رہی پارلیمان کے اراکین نے اس میں براہ راست
ہ نہیں لیا۔ اور حکومت بھی کسی ایسے الجھاؤ میں پھنسنے سے بچتی رہی۔ لیکن یہ صورت حال
ر قائم رہنے والی نہ تھی۔ تعلیم کا کوئی مستقل حل تلاش کرنے کے لیے حکومت کی مداخلت ضروری
ں۔ چنانچہ اس خیال کے پیش نظر حکومت نے مزید تحقیقات کا حکم دیا۔ تحقیقات کا یہ کام
یجے، فیچ اور فیران کے سپرد ہوا۔ اور انھوں نے بڑی محنت سے تعلیم کی منصوبہ بندی کا کام
روع کیا۔

منصوبہ بندی کا یہ کام اتنا آسان نہ تھا۔ تعلیم کس قسم کی ہوگی؟ یہ ایک ایسا پیچیدہ سوال تھا
س کے کئی جواب ہو سکتے تھے۔ لادینی تعلیم، دینی تعلیم اور اگر دینی تعلیم تو کس قسم کی دینی تعلیم۔ کیا
س سے مراد ہر فرقے کی تعلیم کا علاحدہ علاحدہ انتظام ہوگا، اور پھر یہ کہ تعلیم مرکزی ہوگی یا غیر مرکزی،
بائی اور نجی اداروں کی انتظامی شکل کیا ہوگی؟ عمارتوں کی فراہمی کی ذمہ داری کس پر عاید ہوگی؛ مالی امداد
اصول کیا ہوں گے؟ اس قسم کے متبائن نظریات کی روشنی میں ایک قومی نظام تعلیم کی طرح کیوں کر ڈالی
سکتی ہے۔ فیران اور فیچ نے ان مسائل پر بڑی سنجیدگی سے غور کیا اور اس سے پہلے کہ وہ اپنی رائے کا
طعی طور پر اظہار کرتے۔ انھوں نے لیورپول، مین چسٹر، لیڈز، اور برمنگھم کی تعلیمی حالت اور ان کی
ی ضروریات کا باقاعدہ مطالعہ کیا، اور پھر ان کی تفصیلات کی روشنی میں ایک عمومی نتیجہ اخذ کیا

ان نتائج کی تفصیل یہ ہے

(۱) عمارتیں

اسکول کی عمارتیں غیر صحت مند و نامکافی تھیں۔ مثلاً لیڈز کے ایک اسکول میں ۲۰×۱۴ کے کمرے میں ۳۴ بچے زیر تعلیم تھے۔ یہی حال دوسرے علاقوں کا تھا۔ بالعموم کمرے گندے غلیظ اور متعفن۔

(۲) تعلیم

تعلیم کا حال عمارتوں سے کم برا نہیں تھا۔ مثلاً لیورپول کے ایک نام نہاد اسکول کی استانی دستخط کرنا بھی نہیں جانتی تھی۔ تعلیم و تدریس کے اس کام میں اس کی لڑکی اس کی مددگار تھی جس کی تعلیمی حالت اتنی ہی ناقص تھی۔ یا مثلاً لیڈز کے ایک اسکول میں ایک گندے سے کمرے میں ۵۴ بچے زیر تعلیم تھے۔ ماسٹر صاحب کا مستقل پیشہ تعمیر میں کپڑے پہنانا تھا۔ لیکن چونکہ ان دنوں بازار ٹھنڈا تھا اس لیے یہ اسکول کھول لیا ہے

(۳) اسکولوں کی تقسیم:-

اس وقت منظور شدہ اسکولوں میں ۱۸,۷۸,۰۰۰ طلبہ کی گنجائش تھی۔ یہ گنجائش کل ضرورت کی نصف تھی۔ یہی وجہ ہے کہ طلبہ کی بہت بڑی تعداد غیر صحت مند اسکولوں میں تعلیم حاصل کرتی تھی۔ اس کے علاوہ اسکولوں کی تقسیم اتنی غلط تھی کہ بعض علاقوں میں اسکول ضرورت کے مطابق تھے اور بعض میں نام کو بھی نہیں۔

(۴) طلبہ کی حاضری

طلبہ کی حاضری بھی غیر یقینی تھی۔ روزانہ پابندی سے اسکول آنا ان بچوں کا شعار نہ تھا۔ جب جی چاہا اسکول آ گئے اور جب جی چاہا نہ آئے۔ اس عدم پابندی کے بہت سے اسباب تھے، جن میں ملک کے سماجی اور اقتصادی حالات اور والدین کی معاشی زبوں حالی اور تعلیم کی ضرورت کا احساس نہ ہونا بالخصوص قابل توجہ ہیں۔

(۵) اسکول چھوڑنے کی عمر

بالعموم طلبہ دس سال کی عمر میں اسکول چھوڑ کر مستقل طور پر کسی کارخانے میں ملازم ہو جاتے تھے، اور چوں کہ عمر کی کوئی قید نہ تھی اس لیے اپنی سہولت کے پیش نظر اسکول آتے یا نہ آتے۔ فیکٹری ایکٹ نے اس سلسلے میں جو پابندیاں عاید کی تھیں، ان پر کسی حد تک عمل ہوتا تھا، لیکن اس کے باوجود تدریس میں اور بچوں کی معلومات میں کوئی نمایاں تبدیلی نہ ہو سکی۔

ان نقائص کو دور کرنے کے لیے فورسٹر نے ۱۸۷۰ء میں ایک تعلیمی بل پیش کیا۔ اس کی آرزو ایک ایسا نظامِ تعلیم قائم کرنے کی تھی جو وقت کے بدلتے ہوئے رجحانات کا ساتھ بھی دے سکے اور اپنی قومی ضروریات کی بھی کفالت کرتی رہے چناں چہ اس نے بعض ایسی بنیادی تبدیلیوں کی تجویز پیش کی جو بعض حلقوں میں پسند نہیں کی گئیں۔ پارلیمان میں اپنا بل پیش کرتے ہوئے فورسٹر نے کہا:-

پہلا مسئلہ یہ ہے کہ ہم ملک میں کس طرح اچھے اسکول پھیلا سکتے ہیں؟ اول تو ہمیں ان فرائض کو فراموش نہیں کرنا چاہیے جو والدین سے متعلق ہیں، اس کے بعد ہمیں ان فرائض کو بھی نہیں بھولنا چاہیے جن کا تعلق ہمارے اپنے حلقۂ انتخاب اور محصول ادا کرنے والوں سے ہے۔ اور سوم یہ کہ ایک نظامِ نو کی تعمیر کی دھن میں موجودہ نظام کو یکسر ڈھانا غلط ہوگا۔ .... ہمارا مقصد دراصل رضاکارانہ اداروں کی تکمیل ہو۔ اگر کہیں کوئی خلا ہے تو اسے پُر کرنا ہے۔ قومی سرمائے سے ہر ممکن امداد حاصل کرنا اور ایسے صاحبِ دل حضرات سے اشتراک و تعاون کرنا جو اپنے مال و متاع سے اپنے پڑوسیوں کی امداد کرنا چاہتے ہیں۔

فورسٹر کو اپنی قوم کے ذہنی اتار چڑھاؤ کا علم تھا، اسے معلوم تھا کہ اگر کلیسائی اسکولوں کو قومی نظامِ تعلیم میں مدغم کرنے کی کوشش کی گئی تو اہلِ کلیسا نہ صرف یہ کہ اس کی مخالفت کریں گے بلکہ تعلیمی اصلاح کی اس کارآمد تحریک کو غیر ضروری قرار دے کر تضیعِ اوقات کا جرم بھی عاید کریں گے

ں لیے اس نے درمیانی راستہ تجویز کیا اور ایک عالمگیر قومی نظام میں کلیسائی مدرسوں کو بھی ایک مقام
ے دیا لیکن اس کے باوجود فورسٹر اپنے بل کے جملہ مشمولات کو قائم نہ رکھ سکا۔ کلیسائی مخالفت ایکٹ ن
ن کن فارمسٹ کی برہمی دوسری طرف۔ اس پر مستزاد لادینی تعلیم کے حامیوں کا عدم تعاون۔ حامیان کلیسا
اس بل میں لادینی تعلیم کی جھلک نظر آئی۔ اور اس کے برعکس لادینی تعلیم کے علمبرداروں کو دینی تعلیم کا
بز اور نان کن فارمسٹ کی ایسی تعلیم کے حق میں نہ تھے جس میں فرقہ وارانہ تعلیم کا اہتمام ہو۔

س بل کی چند اہم دفعات یہ ہیں۔

(١) سارا ملک تعلیمی حلقوں میں تقسیم کر دیا جائے گا۔ اگر کسی حلقے (DISTRCIT) میں اسکولوں کی کمی ہو گی، تو یہ کمی ایک سال میں پوری کی جائے گی لیکن اگر رضا کارانہ انجمنیں اس کمی کو پورا کرنے سے قاصر رہیں تو اسکول بورڈ نئے مدرسے کھولنے کا اہتمام کریں گے۔

(٢) ہر حلقے میں ایک اسکول بورڈ ہوگا۔ شہروں میں اس کے اراکین کا انتخاب مجلس بلدیہ TOWN COUNCIL) کرے گی اور دیہاتوں میں کلیسائی مجلس (VESTRIES)

(٣) اسکول بورڈ مقامی محصولوں سے نئے اسکول کھولیں گے۔

(٤) ہر اسکول بورڈ کم سے کم پانچ اور زیادہ سے زیادہ پندرہ اراکین پر مشتمل ہوگا۔

(٥) عورتیں بھی منتخب ہو سکیں گی۔

(٦) مجموعی ووٹ (CUMULATIVE VOTE) کا حق ہوگا [مثلاً اگر ایک اسکول بورڈ پندرہ اراکین پر مشتمل ہے تو مجلس بلدیہ کے ہر رکن کو پندرہ ووٹ دینے کا حق ہوگا۔ لیکن وہ اپنے سارے ووٹ کسی ایک امیدوار کو بھی دے سکتا ہے]

(٧) مذہبی تعلیم کس قسم کی ہو گی۔ ہر اسکول بورڈ دفعہ استثنائے ایمانی (CONSCIENCE CLAUSE) کے مطابق فیصلہ کرنے کا مجاز ہوگا۔

(٨) اسکول بورڈ کو لازمی حاضری کے متعلق ضمنی قانون بنانے اور نافذ کرنے کا اختیار ہوگا۔

(٩) اسکول بورڈ کو اسکول چھوڑنے کی عمر متعین کرنے کا حق ہوگا۔

(۱۰) اسکول بورڈ کلیسائی مدرسوں کو اپنی تحویل میں لے سکتا ہے۔
(۱۱) جو والدین اپنے بچوں کو اسکول نہ بھیجیں ان پر ۵ شلنگ جرمانہ کیا جا سکتا ہے۔
(۱۲) طلبہ کو فیس ادا کرنا ہوگی لیکن مفلس والدین مفت تعلیم کی درخواست کر سکیں گے۔

ایجوکیشن لیگ کی وجہ سے بل اپنی اصل شکل میں قانون نہ بن سکا ۱۶ جون سنہ ۱۸۷۰ء کو گلیڈسٹن نے بعض اہم ترمیموں کا اعلان کیا اور یہ بل اپنی ترمیم شدہ شکل میں ۹ اگست ۱۸۷۰ء کو قانون بن گیا۔ یہ قانون برطانیہ میں ابتدائی لازمی تعلیم کی خشت اول ہے۔ اگرچہ فورسٹر کی یہ خواہش کہ اس بل کا مقصد ہر گھر تک ابتدائی تعلیم کا پہنچا دینا ہے۔ بلکہ ان بچوں تک بھی جن کے کوئی گھر نہیں ہے، پوری نہ ہو سکی۔ لیکن پھر بھی ایک اچھے کام کی اچھی ابتدا تھی۔ اس قانون کی اہم دفعات یہ ہیں۔

(۱) اسکول بورڈ کا قیام (ل) ان کے قیام کا مقصد اسکولوں کا اہتمام اور انھیں بہتر بنانا ہوگا (ب) یہ اسکول بورڈ کسی اسکول کو بھی بورڈ اسکول بنا سکتے ہیں (ج) اسکول بورڈ صنعتی اسکول (ایک قسم کے اصلاحی اسکول) قائم کر سکتے ہیں (د) اسکول بورڈ لازمی حاضری کا صنعتی اسکول بنا سکتے ہیں۔

(۲) ہر طالب علم، ۹ پنس ہفتہ وار فیس دے گا۔

(۳) مفلس اور بے عنان بچوں کو صنعتی مدرسوں میں داخل کیا جا سکتا ہے۔

(۴) دفعہ استثنائے ایمانی۔

مذہبی تعلیم یا اسکول شروع ہوتے ہی دی جائے یا اسکول ختم ہوتے وقت تاکہ جو والدین اپنے بچوں کو مذہبی تعلیم یا کم از کم اس فرقے کی مذہبی تعلیم نہیں دلانا چاہتے وہ انھیں اس پیریڈ سے اٹھا سکیں۔

(۵) دفعہ کوپر ٹمپل

کسی مذہبی مکالمے یا کسی مذہبی عقیدے کے کسی مجموعے کا جو کسی مخصوص فرقے سے

متعلق ہو، اسکول میں لانا ممنوع ہے۔

(۲) رضاکارانہ مدارس کو مقامی محصول سے کوئی امداد نہیں دی جائے گی۔ اس کی بجائے اب انھیں مرکزی خزانہ سے اور زیادہ امداد ملے گی۔

فورسٹر کا ترمیم شدہ بل جو قانون بنا، قطع و برید کے بعد اس کی اصل اسپرٹ قائم نہ رہ سکی۔ حتیٰ کہ مصالحت کی کوشش میں اصلاح کا وہ جذبہ بھی مجروح ہو گیا۔ کلیسائی مدرسوں کو ایک قومی نظام میں ضم کرنے کی بجائے انھیں اس قومی نظام میں ایک مستقل جگہ دے دی گئی، اور زیر امداد کی دفعہ کا اضافہ کر کے، ان میں سے بعض جو مالی زبوں حالی کا شکار تھے، انھیں بظاہر ایک ابدی زندگی بخش دی۔ اس نے تعلیمی نظام میں جس دو عملی کا آغاز ہوا، وہ آج بھی کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے۔ اس دو عملی کی وجہ سے برطانیہ میں تادیر انتظامی معقولیت پیدا نہ ہو سکی۔ مفت اور لازمی تعلیم کی خواہش بعض ارباب فکر کو وقتاً فوقتاً اکساتی ضرور رہی۔ لیکن قانونِ تعلیم مجریہ ۱۸۷۰ء ان کی اس خواہش کی تکمیل نہ کر سکا۔ چنانچہ اگلے پچیس سال تک ترویج تعلیم کے سلسلے میں جو کوششیں ہوئیں ان کا مقصد حاضری میں باقاعدگی پیدا کرنا، تعلیم کو مفت بنانا اور اسکول چھوڑنے کی عمر کا متعین کرنا تھا۔ مذہبی تعلیم اور مقامی محصول سے رضاکارانہ اداروں کی امداد، یہ ایسے مسائل تھے جن کا کوئی ایک حل پیش نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اور انھیں حل کیے بغیر کوئی تعلیمی ترقی بھی ممکن نہ تھی۔ ایجوکیشن لیگ اور نان کن فارمسٹ دونوں مذہبی تعلیم کے موجودہ نظام کے مخالف تھے۔ بات بڑھتی گئی حتیٰ کہ بعض نان کن فارمسٹ لادینی تعلیم کے حق میں نہ تھے اور انھوں نے ایجوکیشن لیگ سے تعاون بھی نہیں کیا۔ لیکن اس کے باوجود دونوں کی مخالفت نے ایک عجیب الجھاؤ پیدا کر دیا تھا۔ حکومت کے اراکین خود اس سلسلے میں ہم خیال اور ہم زبان نہ تھے، اس لیے یہ الجھاؤ بڑھتا رہا اور اس کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۸۷۴ء کے انتخابات میں حکومت ہار گئی۔

قانون تعلیم مجریہ ۱۸۷۰ء کا کلیسائی اسکولوں پر ایک خوش گوار اثر پڑا، اور انھوں نے اس خیال سے کہ اگر مقررہ میعاد کے اندر اپنی خامیوں کی اصلاح نہ کی تو ہمارے اپنے علاقے میں اسکول بورڈ

قائم کردیے جائیں گے اور تعلیم ہمارے ہاتھوں سے نکل کر بورڈ کے ہاتھوں میں چلی جائے گی۔ نئی عمارتوں کی تعمیر کی کوشش کی، اور کلیسائے انگلستان، رومن کیتھولک اور دوسرے فرقوں نے اس میں پیش از بیش حصہ لیا۔ حتیٰ کہ دس سال کی مختصر سی مدت میں انھوں نے دس لاکھ طلبہ کی تعلیم کا مزید انتظام کیا۔ سنہ ۱۸۷۰ء سے ۱۸۹۳ء تک ارباب کلیسا نے تعلیم پر ۲۰۲۴۵۱۷ پونڈ صرف کیے اور بعض حالات میں اسکولوں کے انتظام و انصرام میں انھوں نے بڑی بڑی قربانیاں کیں۔ لیکن اب تعلیم اس قدر عام ہو رہی تھی اور اس کی مانگ اتنی بڑھتی جا رہی تھی کہ بعض حالات میں انھیں اپنی اپنی ضروریات کی کفالت کے لیے حکومت کی طرف رجوع کرنا پڑا۔ عمارتوں کا سامان بالخصوص گراں ہو رہا تھا۔ اس کے علاوہ فی طالب علم اخراجات بھی بڑھ رہے تھے۔ مثلاً فورسٹر کا تخمینہ یہ تھا کہ ۳ پنس مقامی محصول سے تعلیمی اخراجات پورے ہو جائیں گے۔ یہ مفروضہ اس بنا پر کیا گیا تھا کہ ایک طالب علم پر تیس شلنگ سے زیادہ صرف نہیں ہوگا۔ لیکن ۱۸۸۰ء میں یہی اخراجات پہلے دو پونڈ (ایک پونڈ چودہ شلنگ ساڑھے دس پنس) ہو گئے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ قانون تعلیم مجریہ ۱۸۷۰ء سے لازمی اور مفت تعلیم کا آغاز ہوا۔ لیکن بقول کرٹس (CURTIS) اس سے زیادہ اور کوئی بات حقیقت سے بعید نہیں ہو سکتی۔ قانون کا منظور ہو جانا اور بات ہے۔ لیکن اس کا نفاذ بالکل دوسری بات۔ لازمی اور مفت تعلیم کے حصول کے لیے برطانیہ کو ابھی بہت سی منزلیں طے کرنی تھیں۔

سینڈن ایکٹ ۱۸۷۶ء

ابتدائی تعلیم کے اس قانون میں بعض ایسی خامیاں رہ گئی تھیں جو اس کے کلی نفاذ کی راہ میں حائل رہیں۔ ان خامیوں کو سینڈن ایکٹ (LORD SANDON'S ACT, 1876) نے کسی حد تک دور کرنے کی کوشش کی، اس کی اہم دفعات یہ ہیں۔

(۱) والدین کا یہ فرض ہے کہ وہ دیکھیں کہ ان کے بچے معقول قسم کی ابتدائی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔

(۲) عدم توجہ کی صورت میں انھیں ۵ شلنگ جرمانہ ادا کرنا ہوگا۔

(۳) دس سال سے کم عمر بچوں کو ملازم نہیں رکھا جا سکتا، اور جو آج اس قانون کو توڑے گا اس پہ چالیس شلنگ جرمانہ ہوگا۔

(۴) دس سے چودہ سال کی عمر تک کے بچوں کو آدھے دن اسکول میں حاضر ہونا لازمی ہوگا۔

(۵) جن حلقوں میں اسکول بورڈ قائم نہیں ہو سکے۔ ان حلقوں میں "حاضری کمیٹی" قائم کی جائے گی اور انھیں وہی اختیارات حاصل ہوں گے جو اسکول بورڈ کو حاصل ہیں۔

(۶) جو بچے والدین کے اختیار سے باہر ہیں اور وہ اسکول نہیں جاتے انھیں صنعتی اسکولوں (اصلاحی مدرسے) میں بھیج دیا جائے۔

منڈیلا ایکٹ

قانون تعلیم ۱۸۷۶ء کے بعد اصلاح حال کی ایک اور کوشش منڈیلا ایکٹ ۱۸۸۰ء کی صورت میں ہوئی۔ اس کی حیثیت اگرچہ خالص اضافی ہے۔ لیکن مفت اور لازمی تعلیم کے نظریے کو اس سے خاصی تقویت پہنچی۔

(۱) منڈیلا ایکٹ نے ہر اسکول بورڈ اور ہر حاضری کمیٹی کے لیے لازمی حاضری کا ضمنی قانون بنانا لازمی قرار دیا۔

(۲) دس سال تک اسکول جانا لازمی ہوگا۔

(۳) تیرہ سال کی عمر تک اسکول جانا لازمی قرار دیا گیا۔ سال میں انھیں صرف ۲۵۰ میٹنگ میں حاضر ہونا لازمی ہوگا۔ اس کے بعد اگر وہ پروفی شنسی سرٹیفکیٹ پیش کریں تو انھیں مستثنیٰ کیا جائے۔ ۱۸۹۳ء میں اسکول چھوڑنے کی عمر دس سال سے بڑھا کر گیارہ سال کردی گئی اور ۱۸۹۹ء میں یہی عمر بارہ سال ہوگئی۔

کراس کمیشن

۱۸۸۰ء میں ابتدائی تعلیم کے قانون کا نفاذ ہوا۔ وقت کے ساتھ ساتھ تعلیمی ضروریات بھی بڑھیں۔ طلبہ کی تعداد کئی گنا بڑھ چکی تھی۔ تعلیمی اخراجات میں کافی اضافہ ہو چکا تھا۔ مقامی محصول سے جو

جمع ہو جاتی تھی۔ اس سے جملہ تعلیمی ضروریات کا پورا کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ پہلے یہ خیال تھا کہ معمولی مقامی محصول سے تعلیم کا فراہم کرنا آسان ہوگا۔ لیکن اس توسیع و ترقی کے بعد اب اس میں ترمیم کی ضرورت تھی۔ چنانچہ اس مقصد کے حصول کے لیے ۱۸۸۲ء میں لارڈ کراس کی سرکردگی میں ایک شاہی تعلیمی کمیشن کا تقرر ہوا۔

کراس کمیشن نے تقریباً دو سال تک ملک کے تعلیمی حالات کا جائزہ لیا اور ۱۸۸۴ء میں اپنی رپورٹ پیش کی۔ کمیشن کے اراکین بعض تعلیمی مسائل پر متفق تھے۔ لیکن بعض مسائل پر ان میں اختلافات رائے تھا۔ اس طرح ان کے دو گروہ بن گئے۔ ایک گروہ اکثریت جو پندرہ اراکین پر مشتمل تھا، اور دوسرا گروہ اقلیت جو آٹھ اراکین پر مشتمل تھا۔ ان دونوں گروہوں نے اپنی سفارشات علاحدہ علاحدہ پیش کیں اس طرح کمیشن کی رپورٹ کے تین حصے کیے جا سکتے ہیں، وہ مسائل جن پر دونوں کو اتفاق تھا اور وہ مسائل جن پر اکثریت یا دوسری صورت میں اقلیت کو اتفاق تھا۔

(ا) متفقہ نکات

جن نکات پر دونوں گروہوں کو اتفاق تھا درج ذیل ہیں۔

(۱) تربیت یافتہ اساتذہ کی ضرورت۔ تعلیمی حالت کو زیادہ سے زیادہ بہتر بنانے کے لیے اساتذہ کی تربیت پر بالخصوص توجہ دینا ضروری ہے

(۲) ابتدائی مدارس کے اساتذہ کو انسپکٹر مقرر کیا جائے۔

(۳) تعلیم کے مدارج متعین ہوں اور ہر درجے کے احاطہ کار اور مقام کی توضیح (ابتدائی، اعلیٰ اور ثانوی وغیرہ)

(۴) نصاب کی تدوینِ نو کی ضرورت۔ نصاب زیادہ سے زیادہ لبرل ہو، اس میں سائنس کی تدریس صنعتی دست کاری، اور ٹیکنیکل ایجوکیشن کی طرف بالخصوص توجہ دی جائے۔

(۵) صنعتی دست کاری ایک لازمی مضمون ہو، اور حکومت ورک شاپ قائم کرنے کے لیے امداد دے۔

(۶) حاضری کے ضمنی قوانین کا نفاذ سختی سے کیا جائے۔

(۷) امداد برنائے نتیجہ کا طریقہ صحیح نہیں ہے، اسے ختم کر کے ہر اسکول کو مستقل امداد

دی جائے۔ اس کے علاوہ ڈرائنگ۔ طباعتی اور ابتدائی سائنس کے لیے علاحدہ امداد ملنی چاہیے۔

(۸) ایوننگ اسکولوں کی طرف بالخصوص توجہ دی جائے اور ان میں مشاغل اور تفریحی کے انتظام کے ساتھ ساتھ، سائنس، آرٹ اور ٹکنالوجی کی تعلیم کا بھی اہتمام کیا جا!

(ب) گروہِ اکثریت

اکثریت رضاکارانہ مدرسوں کے حق میں تھی۔ ان اسکولوں کے لیے مزید سرکاری امداد کی سفارش کی لیکن اقلیت ایک قومی نظام کے قیام میں ان اسکولوں کو اس طرح قائم رکھنے کے حق میں نہ تھی۔ اس طرح گویا اکثریت ایک ایسی اصلاح کی آرزومند تھی جس میں پرانے پر نئی عمارت تعمیر کی جائے۔

(ج) گروہ اقلیت

اقلیت دراصل تعلیم کے موجودہ نظام میں ایک انقلابی تبدیلی لانا چاہتی تھی اور اس انھوں نے نصاب، طریقِ تدریس، انتظامی امور، غرض ہر چیز کو ایک نئے سانچے میں ڈھا سفارش کی۔ ان کی سفارشات یہ ہیں:-

(۱) ہمارے خیال میں عمدہ تدریس کی سب سے بڑی ضمانت موجودہ نظامِ تعلیم کی مقامی حکومتوں کے زیرِ اہتمام از سرِ نو تنظیم ہے۔ ان مقامی حکومتوں کا احاطۂ کار وسیع امور میں مکمل اختیارات ہوں، اس طرح وہ ایک تدریجی نصاب، اچھے تربیت یافتہ اساتذہ کا لبرل اسٹاف، اور ایسی صاف ستھری عمارتوں کا اہتمام کرسکیں جو مناسب ہوں، اور درسی سامان سے آراستہ بھی۔

(۲) کوئی طالب علم چودہ سال کی عمر سے پہلے اسکول نہ چھوڑے۔

مجموعۂ قوانین سنہ ۱۸۹۰ء

جس وقت یہ رپورٹ پیش ہوئی خوش قسمتی سے جی۔ ڈبلیو کے دور [illegible]

محکمہ تعلیم کا سیکریٹری تھا۔ وہ خود لبرل خیالات کا حامل تھا، اور اساتذہ سے اسے ہمدردی تھی
اس نے ان میں سے بعض سفارشات کو مجموعۂ قوانین سنہ ۱۸۹۰ء میں شامل کر لیا۔ اس طرح پہلی مرتبہ
امداد بر بنائے نتیجہ کا رواج ختم ہوا، اور اس کی بجائے اب ہر اسکول کو ایک مستقل امداد ملنے
لگی۔ اس کے علاوہ نصاب میں بہت سے مجوزہ مضامین بھی شامل کر لیے گئے ؛

ایک افریقی حکمراں قوم —— واتوسی

خداداد خاں

استوائی خطے کے دھندلے اور کہر آلود جنگلوں سے جہاں بونے بستے ہیں۔ موٹر کے ایک دن کے سفر کے بعد سیاح افریقی سوئٹزرلینڈ میں پہنچ جاتے ہیں۔ جہاں کی آب وہوا خوشگوار اور روح افزا ہے۔ دن کا درجۂ حرارت انتہائی صحت بخش ہے۔ البتہ رات ذرا زیادہ ٹھنڈی معلوم ہوتی ہے۔ اسی کیف پرور اور لطیف فضا میں واتوسی قوم بستی ہے۔ مسافروں کو اس حسین وادی میں پہنچنے تک خطِ استوا کو عبور کر کے چند گھنٹے برف آلود پہاڑوں کے دامن میں چلنا پڑتا ہے۔ اس سے کچھ آگے دیغنگا کا آتش فشاں سلسلۂ کوہ ہے جس کے دامن میں دنیا کی خوبصورت جھیل کیوو محوِ خرش پڑی ہے۔ اس جھیل کا پانی مگرمچھوں یا دوسرے تمام آبی خطرات سے بالکل پاک ہے۔ اور اس کے کناروں پر زہریلی مکھیوں کا نام ونشان تک بھی نہیں۔

واتوسی ریاست میں پہنچنے تک ایک تنگ اور پُر پیچ سڑک پر سفر کرنا پڑتا ہے جس میں کوئی ایک ہزار کے قریب موڑ ہیں، جو چار ہزار فٹ تک بتدریج بلند ہوتے چلے گئے ہیں۔ دورانِ سفر میں جب نگاہ نیچے کو جاتی ہے تو کیوو کا دُور دُور تک پھیلا ہوا نیلا پانی، اور اس کے کناروں پر دھواں چھوڑتے ہوئے آتش فشاں پہاڑ بڑا عجیب اور دلکش منظر پیدا کرتے ہیں۔ حدِ نظر تک کافی اور ربڑ کے سرسبز اور شاداب ذخیرے آنکھوں کو حرارت بخشتے ہیں۔ اور دریائے دودیو کی بپھری ہوئی لہریں چٹانوں سے لڑتی ہوئی جھیل ٹانگانیکا کی طرف صاف صاف نظر آتی ہیں۔ راستے میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر سڑک سے ہٹ کر ہر اونچی چٹان کے اوپر ایک مقامی باشندہ بیٹھا رہتا ہے۔ اس کے پاس ایک لمبا سا بانس ہوتا ہے جس کے سرے پر ایک سفید چمکدار کنستر بندھا ہوتا ہے۔ جونہی کوئی ٹرک یا موٹر ان کی حدود میں داخل ہوتی نظر آئے تو کنستر بجا کر تمام وادی میں میلوں تک اس کی خبر پہنچا دی جاتی ہے۔

اس تنگ اور دشوار گذار سڑک پر گوما کے قصبے میں ایک نہایت خوب صورت اور صاف ستھرا چھوٹا سا ہوٹل ہے جسے ایک روسی عورت چلا رہی ہے۔ اس ہوٹل پر لذیذ اور فرحت بخش کھانے ہر وقت تیار ملتے ہیں۔ استوائی خطے سے آئے ہوئے مسافر شام کے وقت کھانے کی میز پر تھوڑی دیر کے لیے یہ بھول جاتے ہیں کہ انھوں نے آج صبح بولوں کو سانپ اور چھپکلی کا ناشتہ کرتے دیکھا تھا۔

اب آپ واتوسی سرزمین میں پہنچ چکے ہیں۔ راستے کے دل فریب مناظر کے قطع نظر یہاں آپ قدیم مصر اور ابی سینیا کی تہذیب کے واضح آثار دیکھ کر دم بخود رہ جائیں گے۔ یعنی جس طرح افریقہ میں پتھر اور دھات کے دور کی تہذیب اب تک بعض مقامات پر محفوظ ہیں۔ اسی طرح کہیں کہیں قدیم مصری تمدن بھی ابھی تک موجود ہے۔ قدیم مصری مندروں کی دیواروں پر جن متبرک جانوروں کی تصاویر بنائی جاتی تھیں ان میں واتوسی مقدس گایوں کے نقوش سر فہرست ہیں۔ یہ گائیں آج تک واتوسیوں کے لیے مذہبی اور روحانی نشان ہیں، اور ہزاروں کی تعداد میں پائی جاتی ہیں۔ ان کو جواہرات اور زیورات سے آراستہ رکھا جاتا ہے اور ان کی پرستش کی جاتی ہے۔ ان گایوں کے سینگ برف کی طرح سفید اور خاصے لمبے اور نوکدار ہوتے ہیں۔

واتوسی ریاست کا رقبہ کوئی بیس ہزار مربع میل ہے جو رووینڈا یو رونڈی میں واقع ہے۔ اسے بلاشک افریقہ کا دل کہا جا سکتا ہے۔ اگرچہ بظاہر اس "دل" کی دھڑکنوں کا "جسم" سے کوئی تعلق نہیں معلوم ہوتا کیوں کہ بیس ہزار مربع میل کے اس چھوٹے سے ملک کی معاشرت تمام براعظم کے ممالک سے قطعاً مختلف ہے۔ یہ خطہ سوائے مصر کے افریقہ کا گنجان ترین حصہ ہے۔ جہاں فی مربع میل اوسط آبادی دو سو سے بھی اوپر ہے۔ لاکھوں کی تعداد میں گائیں بکریاں اور بھیڑیں اس کے علاوہ ہیں۔ یہاں کچھ جانور ایسے بھی ہیں جن کے نام ابھی تک کسی کو معلوم نہیں۔ بہرحال یہاں کے لوگ انتہائی مہذب سمجھے جاتے ہیں۔ اور افریقہ میں یہی وہ حصہ ہے جہاں بیرونی دنیا کے سیاح سب سے آخیر میں پہنچے ہیں۔ چناں چہ ایک جرمن سیاح کونٹ وون گوئٹن نے جھیل کیوو اور اس کے ساتھ کی وادیاں کو سنہ ۱۸۹۴ء میں دریافت کیا تھا۔

روانڈا کی ریاست کے بیٹھنے میں تمام افریقی تہذیب کے خدوخال دیکھنا ممکن نہیں۔ بلکہ اس

ظم کے کسی بھی مقام کے مطالعہ کے بعد یہ فیصلہ دشوار ہے کہ افریقہ کی تہذیب اور معاشرت کی صحیح علم کیا ہے۔
نی دنیا نے صدیوں سے افریقہ کو جو کچھ سمجھ رکھا ہے۔ اس میں تعصب یا غلط فہمی کا شائبہ اگر نہ بھی ہو تو اتنا
رہے کہ باہر کے لوگوں نے اس سیاہ سرزمین کے ایک ہی حصے کے معاشی اور ثقافتی مطالعہ کے بعد
ے تمام براعظم کی معاشرت اور تہذیب کی صورت میں دنیا کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ ورنہ فی الواقع
ں کا ہر خطہ دوسرے خطوں سے بلحاظ آب و ہوا، کیا بلحاظ معاشرت قطعاً مختلف ہے۔ گویا بجائے خود ایک
ا دنیا ہے اور یہ ممکن ہی نہیں کہ آپ کسی ایک مقام یا کسی خاص حصے کو ہی تمام افریقہ خیال کر سکیں
ں کہ یہاں قدم قدم پر جغرافیائی اختلافات کی رنگ آمیزی ہے۔ جگہ جگہ لوگوں کی زبان جدا جدا، اور رسومات
گی اور مذہبی نظریات الگ الگ ہیں۔ ایک سیاح کے لیے یہ تو ممکن نہیں کہ سارے براعظم کا مطالعہ
سکے۔ اس لیے ہوتا یہ ہے کہ وہ کسی ایک ہی علاقہ کی سیاحت کے بعد اپنی معلومات کو تمام براعظم سے
سوب کر دیتا ہے۔ جو انصاف اور حقیقت کے سراسر منافی ہے۔ عام طور پر افریقیوں کو غیر مہذب
یاہ فام، پست قد، بدصورت اور توہم پرست لوگ سمجھا جاتا ہے، اور ان کے طرز زندگی کے متعلق
ے عجیب عجیب قصے اور کہانیاں مشہور ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ بعض حصوں میں بونے حبشی
مردم خور قسم کے لوگ آباد ہیں، لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ تمام کا تمام براعظم ہی سیاہ فاموں کی دنیا ہو
ر یہاں تمام لوگ غیر مہذبانہ طور پر زندگی بسر کر رہے ہیں۔

روڈیشیا کے بعض اور رومان پرور مناظر کو دیکھ کر اور یہاں کے باشندوں کے معقول طرز زندگی کے
مطالعہ کے بعد افریقیوں کے متعلق تمام غلط نظریات کی صاف صاف تردید ہو جاتی ہے۔ جس طرح ہم فلوریڈا
کے جغرافیائی یا معاشی جائزے کے بعد اپنی تحقیق کا اطلاق سارے امریکہ پر نہیں کر سکتے۔ اسی طرح روڈیشیا
بھی تمام افریقہ خیال نہیں کیا جا سکتا۔ روڈیشیا کی حسین اور خوبصورت چھوٹی سی دنیا، قوی ہیکل اور
دلکش طاقتور حبشیوں کی بستی ہے۔ واقعی یہ جوان قدرت کا بہت بڑا شاہکار ہیں۔ یوں سمجھیے کہ روڈیشیا
کے یہ حبشی پر واقعی یہ جوان اداکاروں کی طرح آنکھوں کے سامنے جلوہ گر ہوتے ہیں۔ چار لاکھ کی
آبادی کا یہ حصہ واقعی یہی لوگ صرف بیس ہزار کی تعداد میں ہیں۔ "ماتو" اور "باموتو" قبیلوں کے لوگ

تعداد میں ان سے کئی گنا زیادہ ہیں۔ یہ لوگ بھی بلحاظ معاشرت غیر مہذب نہیں سمجھے جاتے ہیں۔ اگرچہ یہ واتوسیوں کی طرح خوب صورت اور وجیہہ نہیں ہوتے اور اوسط قد کے ہوتے ہیں، لیکن ان کے اطوار زندگی بھی نہایت پسندیدہ ہیں، اور نسلی وجاہت کے اعتبار سے انھیں دوسرے درجے کے جاگیردار سمجھا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ یہاں باتوا نسل کے بونے حبشی بھی ہیں، جن کی تعداد خاصی ہے لیکن صوائے اگوری کے بھوتی، حبشیوں کی طرح ان کی نسل بھی خالص نہیں رہی اور پست قامتی جو حبشیوں کی نمایاں خصوصیت ہے ان میں نہیں پائی جاتی۔ تاریخ بتاتی ہے کہ باتوا، یوگنوں میں باتو نسل کا اختلاط پایا جاتا ہے جس سے ان کے قد میں آٹھ دس انچ کا اضافہ ہوگیا ہے چناں چہ ایک عام باتوا کا قد ساڑھے چار فٹ سے پانچ فٹ تک کا ہے۔ باتوا لوگ روانڈا کی معاشرت میں پست اقوام کا درجہ رکھتے ہیں اور زمانۂ ماضی میں ان سے شاہی دربار میں جلادوں اور درباری مسخروں کی خدمات لی جاتی تھیں۔

واتوسی ہرچند اقلیت میں ہیں، لیکن یہ ملک بلاشرکت غیرے ان کا ہے۔ انھوں نے اس سرزمین میں نہ صرف معاشرتی اور اقتصادی انقلاب پیدا کیا ہے۔ بلکہ جغرافیائی طور پر بھی یہاں کا نقشہ تبدیل کر دیا ہے۔ انہوں نے ہزاروں مربع میل کے رقبے کو جنگلات سے پاک کرکے اپنی مقدس گایوں کی چراگاہیں بنادیا ہے۔ آج سے نصف صدی پہلے یہاں مسلسل طور پر قحط کی صورت رہا کرتی تھی کیوں کہ پہاڑی علاقہ ہونے کی وجہ سے چھوٹے چھوٹے کھیت بہت کم خوراک پیدا کرتے تھے۔ لیکن یہ قحط صرف باتوا، اور باہوتو، لوگوں کے مرگ انبوہ کے جشن کا ہوتا تھا۔ اور واتوسی لوگ اس سے بالکل محفوظ ہوتے تھے۔ لیکن اب یہاں کے جنگلات سے مفید قسم کی پیداوار حاصل کرنے کے انتظامات شروع ہوچکے ہیں، جس کے نتیجے میں یہاں دنیا میں سب سے زیادہ لذیذ قسم کی کافی پیدا ہونے لگی ہے اور وہ قحط جو مدتوں سے ملک پر مسلط رہتا تھا، قصۂ ماضی بن گیا ہے۔ رفتہ رفتہ واتوسی امرا کی ہمدردی اور شفقت بھی غریب باتوا، اور باہوتو، لوگوں پر عام ہوتی جارہی ہے اور یہ بات واتوسیوں کی نیک باطنی کے ساتھ ساتھ ان کی فراست اور معاملہ فہمی کا بھی پتہ دیتی ہے۔ کیوں کہ یہاں کے سیاسی حالات کا تقاضہ بھی

یہ ہے کہ واقوسی بدلتے ہوئے حالات میں ہوا کے رُخ کے مطابق چلیں۔

کسی واقوسی، مرد یا عورت سے گفتگو کے وقت یہ واضح ہو جاتا ہے کہ مخاطب انتہائی مہذب اور آدابِ معاشرت سے آگاہ ہے۔ ہرچند کہ انھیں ابھی بجلی اور پانی کی وہ سہولتیں میسر نہیں جو موجودہ ترقی یافتہ لوگوں کے ہاں موجود ہیں لیکن ان کے گھر دیکھنے سے ان کے سلجھے ہوئے مذاق اور نفاستِ طبع کا پتہ چلتا ہے۔ ان کی رفتار اور گفتار کا سلیقہ ہی ان کی خاندانی عظمت کی واضح دلیل ہے جس سے ایک اجنبی فوراً بھانپ لیتا ہے کہ واقوسی لامحالہ ملک کے سربراہ ہیں۔ واقوسی کردار صدیوں سے اپنی پاکیزگی کے لحاظ سے محفوظ چلا آرہا ہے۔ ہر واقوسی مرد یا عورت کو بچپن ہی سے اپنی عالی نسبی کا احساس ہونے لگتا ہے۔ اسی لیے ان کی تمام حرکات تصنع سے پاک ہوتی ہیں۔ انھوں نے کسی موقع پر بھی یہ ثابت نہیں ہونے دیا، بلکہ ثابت کرنے کی کبھی کوشش ہی نہیں کی کہ وہ باقیوں کی نسبت اونچے درجے کے لوگ ہیں، غرور اور نخوت جو عام طور پر چھوٹے وقار کا خاصہ ہے، ان میں نام تک بھی نہیں پایا جاتا۔ بلکہ اس کے برعکس انھوں نے اپنی عظمت اور وقار کا سکہ دوسروں سے حسنِ سلوک کی بنا پر ہر ایک دل میں بٹھا رکھا ہے۔ عام واقوسی کا قد ساڑھے چھے فٹ اور آٹھ فٹ تک ہوتا ہے ان کی رفتار سے ایک غیر شعوری جلال کا اظہار ہوتا ہے جو ان کے وقار کو فطری بنا دیتا ہے۔ ورزش ہو یا کھیل یا زندگی کا کوئی اور کام ہو۔ ان کا یہ قدرتی انداز برابر کارفرما رہتا ہے۔ ان کے لباس میں سب سے نمایاں چیز ان کا لمبا چغہ ہے، اور سچ پوچھیے تو یہی چغہ ان کی عظمت کا نشان ہے۔ جس کپڑے سے یہ چغے بنتے ہیں، وہ برف کی طرح سفید ہوتا ہے اور اس میں سنہری تار بھی استعمال ہوتے ہیں اس سفید اور شفاف کپڑے میں موٹی موٹی سرخ رنگ کی شوخ دھاریاں عجب بہار پیدا کرتی ہیں واقوسی جب یہ چغے پہنتے ہیں تو قدیم رومن امرا کی طرح معلوم ہوتے ہیں۔ واقوسی مرد اور عورتیں چھریرے بدن کے ہوتے ہیں اور ان میں موٹاپا ہرگز نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس ان کے بچے غیر معمولی طور پر موٹے ہوتے ہیں کیوں کہ بلوغت تک ان کی خوراک محض دودھ دہی اور مٹھائی ہوتی ہے۔ بلوغت کے آثار ظاہر ہوتے ہی ان کی خوراک میں تبدیلی پیدا کر دی جاتی ہے جس کے بعد ان میں جسمانی تغیر رونما

ہونے لگتا ہے اور موٹاپا زائل ہونے لگتا ہے۔ بچہ ہو یا جوان دودھ واتوسیوں کی خوراک اہم جزو ہے، جس کے ساتھ اُبلا ہوا شہد، گوشت اور سبزی بھی شامل ہوتی ہے۔ بلوغت کے بعد واتوسی لڑکوں کے قد بڑی سرعت کے ساتھ بڑھنے لگتے ہیں اور جسم کی تمام موٹائی ختم ہو جاتی ہے، مردوں کی انگلیاں نہایت لمبی لمبی اور نازک ہوتی ہیں اور ان کی نزاکت تمام عمر برقرار رہتی ہے کیوں کہ واتوسی مرد کوئی سخت کام نہیں کرتے۔ زراعت یا اور مشکل کام باہوتو اور باتو لوگ ہی سرانجام دیتے ہیں۔ واتوسی محض نگران کی حیثیت میں ہیں۔ زیادہ سے زیادہ مشکل کام جو یہ کرتے ہیں وہ مقدس گایوں کی دیکھ بھال ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ یہ لوگ نکمے اور کاہل ہیں، بلکہ وہ انتہائی چست اور تیز طرار ہوتے ہیں۔ ان کے بدن بلا کے پھرتیلے اور کسرتی ہوتے ہیں۔ نیزہ پھینکنا، اونچی چھلانگ اور تیر اندازی ان کی محبوب ورزشیں ہیں۔ واتوسی بچوں کو ابتدا سے ہی گھروں میں رقص کی تربیت دی جاتی ہے۔

یورپین اقوام نے واتوسی عظمت اور خاندانی عظمت کو بڑی ضرب لگائی ہے۔ روآنڈا میں بلجین حکومت نے آہستہ آہستہ واتوسی جاگیرداری اور فوقیت کو مردہ سا کر دیا ہے۔ اب پہلے کی طرح شخصی حکمرانی کا دور قصہ پارینہ بن گیا ہے۔ اور اس کے بجائے ملک میں ایک آئینی حکومت قائم ہو چکی ہے۔ اور روآنڈا میں یہ تبدیلی اتنی سرعت سے رونما ہوئی ہے کہ اسے دیکھ کر بلجیئموں کی ذہانت اور سیاست فہمی کی داد دینا پڑتی ہے۔ اور پچھلے چند سالوں کے اندر ہی واتوسی وقار کے محل متزلزل ہو گئے۔ لیکن جہاں سے دریا گزرتا ہے نمی باقی رہتی ہے۔ حاکم اقوام کی عظمت اگر حالات زمانہ کے ساتھ مٹ جائے تو بھی دو تین نسلوں تک اس کا سرور اور خمار ضرور باقی رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ واتوسی لوگ ابھی اپنی اسی پرانی وضع پر قائم ہیں اور ان کی معاشرت میں وہی پرانا رکھ رکھاؤ اور آن بان باقی ہے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ واتوسی معاشرت مغربی انداز اختیار کر رہی ہے اور عیسائیت اپنا مذہبی رنگ جما رہی ہے۔ آج سے کوئی بیس سال قبل نوجوان واتوسی بادشاہ روڈاگروا اپنے آبائی اور روایتی انداز (مقدس جھیرا) میں رہتا تھا۔

اندرو کی گنبد نما چھت بانس کی لکڑی سے بنی ہوئی تھی جس پر خوشبودار گھاس ڈالی گئی تھی۔ اس کے ایک جانب خوبصورت باغیچہ لگا ہوا تھا۔ اندرو کے اندر خواب گاہ، باورچی خانہ، ڈرائنگ روم اور ملاقات کے الگ کمرے تھے۔ ان کمروں کی دیواریں پھولدار چٹائیوں کی بنی ہوئی تھیں۔ بالکل آج جیسے عام جاپانی لوگوں کے گھر ہوتے ہیں۔ لیکن اب شاہ روڈانگوا سیمنٹ اور اینٹوں کے محل میں منتقل ہو چکا ہے جس میں نہایت خوب صورت ٹائلوں کے فرش پر نہایت قیمتی قالین بچھے ہوئے ہیں۔ دروازوں اور کھڑکیوں پر پھولدار ریشمی کپڑوں کے پردے گرے ہوئے ہیں۔ چھت پر شیروں اور چیتوں کی کھالیں جڑی ہوئی ہیں اور دیواروں پر واتوسی کاریگروں کے نقش و نگار بنے ہوئے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ محل کی آرائش اور ساز و سامان کی وہ قدیم دل کشی اور دلفریبی زائل ہو چکی ہے۔ جو اب سے چند سال پہلے تک پائی جاتی تھی۔ یعنی مغربی تہذیب کے قدم جاتے ہی افریقی صنعت گویا رخصت ہو چکی ہے۔

ہر بادشاہ کی تخت نشینی کے موقع پر ایک باقاعدہ کمیٹی بیٹھتی ہے جو نئے بادشاہ کا نیا نام انتخاب کرتی ہے۔ موجودہ بادشاہ کا اصل نام روڈانگوا ہے۔ تخت نشینی کے وقت اس کی عمر سولہ سال تھی اس کے باپ موسنگا کو بلجین حکومت نے معزول کر دیا تھا۔ کیوں اس نے بلجینوں کی سخت مخالفت کی تھی اور کئی بار ان سے جنگ بھی لڑی جس کے صلے میں اسے حکومت سے ہاتھ دھونا پڑا۔ جب روڈانگوا بادشاہ بنا تو اس کا نام تجویز کرنے کے لیے حسب معمول ایک مجلس قائم ہوئی جس میں تمام واتوسی سربراہ شامل تھے۔ اس مجلس نے کئی روز کے غور و خوض کے بعد بادشاہ کے نئے نام کا اعلان کیا عام طور پر نیا نام بادشاہ کے کسی ذاتی وصف کے ساتھ منسوب ہوتا ہے۔ مثلاً زمانہ ماضی میں ایک بادشاہ کا نام 'سوزم پاکا' یعنی صلح کا دیوتا تھا۔ ایک اور نام "لوابوگیری" یعنی فاتح اعظم تھا۔ اسی نسبت سے روڈانگوا کا نام 'موتارا' یعنی مصلح تجویز ہوا۔ مراد یہ کہ نئے بادشاہ نے اپنے آباؤ اجداد کی آمریت کو ختم کر دیا ہے۔ اور اس کے بجائے ایک نئی آئینی حکومت قائم کی ہے۔ موتارا روڈانگوا نے اب عیسائیت اختیار کر لی ہے۔ اور اس کے ساتھ اپنے لیے اور کئی نام تجویز کر رکھے ہیں۔ چناں چہ اب

اس کا نام ان الفاظ پر مشتمل ہے ۔

—— "نوامی ہوتانا سوم چاؤلس بیرے روڈ گھوا"

نئے بادشاہ کے لیے نئے نام تجویز کرنے کی یہ رسم چار صدیوں سے برابر چلی آرہی ہے۔ یورپین اثرات نے شاہی طرزِ زندگی کو قریب قریب کافی حد تک بدل ڈالا ہے۔ مثلاً روڈا گھوا۔ اب اپنے آباؤ اجداد کی طرح تیس شادیاں نہیں کرتا۔ بلکہ ایک اوسط طبقے کے داتو سی کی طرح اس کی بھی تین بیویاں ہی ہوتی ہیں۔ اس کے محل میں اب وہ "دوانتی کنواریاں" بھی نہیں ہوتیں، جو ملک بھر سے انتخاب ہو کر آتی تھیں۔ ان کنواریوں کے حسین لشکر میں بڑے بڑے امرا کی لڑکیاں شامل تھیں جنھیں ان کے والدین شاہی محل میں رہنے کے دستور اور آداب بچپن ہی سے سیکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ اس خوب صورت فوج میں چند لڑکیاں باری باری روزانہ سرد راتوں میں بادشاہ کے سونے سے کچھ وقت پہلے اس کے بستر پر بیٹھ کر گرماتی تھیں اور ان کو عوامی رقص کا مظاہرہ بھی ان کی خدمات میں شامل تھا۔ روڈا گھوا نے ان کنواریوں کو اب رخصت کر دیا ہے۔ اور ایک ایسا بستر استعمال کرتا ہے جو بجلی کے ذریعے گرم ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ مذہبی عقاید اور روایات میں بھی تبدریج تبدیلی ہو رہی ہے۔ عام لوگوں میں یہاں یہ عقیدہ تھا کہ دنیا میں پہلا آدمی جو آسمان سے اترا تھا، اس نے بہن سے شادی کی تھی۔ بالکل یہی عقیدہ قدیم مصر میں بھی تھا جس کے نتیجے میں بہنوں سے شادی کی رسم عام تھی۔ لیکن اب روونینڈا میں یہ مذموم رسم مٹ چکی ہے کیوں کہ آسمانی آدمی کی بہن سے شادی کا عقیدہ ختم ہو چکا ہے۔

روڈا گھوا، ایک خوب صورت، ذہین اور محنت کش آدمی ہے۔ اس نے بلجین کی حکومت کے تعاون سے اپنی حکومت کو عوام پسند بنالیا ہے۔ اور اپنے ذاتی کردار سے عوام پر یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ اپنے باپ دادا کی طرح محض "زندگی اور موت کا دیوتا" ہرگز نہیں ہے۔ بلکہ اس نے پرانی آمریت کو ختم کرکے اب ایک جمہوری قسم کی حکومت قائم کر دی ہے اور یہ سب کچھ جو اس نے کیا ہے۔ وہ بلجین حکام کے دباؤ کے بغیر کیا ہے۔ بادشاہ لوگوں کو نئی زندگی کی راہوں پر چلانے کے لیے خود ایک مکمل نمونہ

پچھلے بادشاہوں کی طرح اگرچہ وہ تمام ملک کی زمین کا واحد مالک ہے۔ لیکن اس نے اپنی حکمت کا دعویٰ کبھی بھی علی الاعلان نہیں کیا۔ تمام عمال حکومت کے تقرر اسی کے احکام سے ہوتے ہیں۔ وہ خود ہی قانون نافذ کرتا ہے اور چھوٹی چھوٹی پنچایتوں کے ذریعے ملکی قانون کی نگرانی کرتا ہے۔ مگر اس کے باوجود اس کی حیثیت خود مختار حکمران کی سی نہیں ہے۔ اسے ہر مرحلے پر بلجیم ریذیڈنٹ کے مشورے پر عمل کرنا پڑتا ہے۔ جیسے روونیڈا ایورنڈی، کی ریاست میں پورا پورا دخل حاصل ہے۔ ریاست سے قطع نظر روونڈا اگوا۔ قدیم واتوسی کلچر کا سچا محافظ ہے۔ اگرچہ وہ عیسائی مذہب اختیار کر چکا ہے۔ لیکن عام رسومات اور مذہبی عقاید پر مغربی اثرات پوری طرح کارفرما نہیں ہو سکے۔ عیسائی پادریوں کی تبلیغ کے باوجود پرانے رسم ورواج ابھی باقی ہیں۔ ذات پات کی تمیز اور کثرت ازدواج کی رسمیں اسی پرانے اسلوب سے جاری ہیں۔ قدیم واتوسی رقاصی اسی طرح دل فریبی کی حامل ہے۔ واتوسی کھیلوں میں وہی قدامت کا اثر اور دلچسپی ہے۔ مذہبی تہوار اسی التزام کے ساتھ منائے جاتے ہیں۔ مقدس گایوں کی تقدیس اسی طرح واتوسیوں کے دلوں میں قائم ہے۔ خود روونڈا اگوا۔ عیسائیت قبول کر لینے کے باوجود گایوں کا احترام اسی طرح کرتا ہے جیسا کہ وہ پہلے کیا کرتا تھا۔

معزول بادشاہ موسنگا ایک معمولی قسم کے انسرز میں رہتا ہے جسے اس کے بیٹے یعنی روونڈا اگوا کے سالانہ الاؤنس سے سجایا جاتا ہے۔ اس انسرز میں اسے رہائش کی تمام سہولتیں میسر ہیں۔ بادشاہ موسنگا کے چہرے پر ہر وقت مایوسی چھائی رہتی ہے، اور اس کا موڈ ہمیشہ تلخ سا رہتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ ہر ملاقاتی کو بڑے خلوص کے ساتھ خوش آمدید کہتا ہے۔ اور بڑی بے چینی سے پوچھتا ہے کہ کیا آپ میری آنکھوں کے لیے کوئی دوا تو نہیں لائے؟ وہ مغربی سیاحوں سے جرمن میں ٹوٹی پھوٹی گفتگو کرتا ہے غالباً اس سے وہ اپنی کھوئی ہوئی عظمت اور لٹے ہوئے وقار کی یاد ذہن میں تازہ کر لیتا ہے۔ پہلی جنگ عظیم تک روونیڈی جرمنوں کے زیر اثر تھے۔ اس جنگ کے دوران میں بلجین افواج نے یورپ میں جرمن حاکم کی معروفیت سے فائدہ اٹھانے کی ایک کامیاب کوشش کی اور کانگو کے جنگی مرکز سے اٹھ کر روینڈا پر اپنا تسلط جما لیا۔ بہر حال جرمن اثرات ابھی تک یہاں موجود ہیں جن میں

لیے تو یہ ہے کہ سوزول موشنگا جرمن زبان میں بے ربط گفتگو کا عادی ہے۔

جولائی کے مہینے میں ہر سال واتوسیوں کا نہایت ہی مقدس اور دل چسپ تہوار بڑی دھوم اور بڑی عقیدت سے منایا جاتا ہے۔ یہی تہوار ان کی ثقافت کا سچا آئینہ دار ہے۔ اور ایک غیر ملکی کے لیے ایک ناقابل فراموش واقعہ بن جاتا ہے۔ اس جشن کا تفصیلی ذکر بعد میں آئے گا۔

روونینڈا میں ہالینڈ سے آئے ہوئے نیلی آنکھوں والے پادری جگہ جگہ پھیلے ہوئے ہیں یہ پادری واتوسیوں کی طرح سُرخ دھاریوں والے سفید چغے پہنتے ہیں۔ انھوں نے واتوسیوں کے ساتھ بڑے گہرے مراسم پیدا کر لیے ہیں۔ لیکن انھیں اپنے ڈھب پر لانے کے لیے انھیں شاید ابھی اور کئی سال کی محنت صرف کرنا پڑے گی۔ بہرحال ان کی طبی اور تعلیمی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ ان کی مذہبی تبلیغ کا کام بدستور جاری ہے۔ یہ پادری بیرونی سیاحوں کا بڑی گرم جوشی سے استقبال کرتے اور ہر ممکن طریق سے ان کی رہنمائی کرتے ہیں۔ تمام مشکلات اور خطرات سے آگاہ کرتے ہیں۔ ان مبلغین کو اپنی تبلیغ میں خاصی دشواری سے دوچار ہونا پڑا ہے کیوں کہ مقامی لوگوں کے نظریات کو تبدیل کرنا کوئی ایسا آسان کام نہیں، جو مختصر سی مدت میں مکمل ہو سکے۔ ابھی تک جانوروں کی پرستش کا عقیدہ یہاں مضبوطی سے قائم ہے۔ اور شاید اسے تبدیل کرنے میں دو صدیاں اور لگ جائیں۔ واتوسی ہندوؤں کی طرح گائے کا احترام کرتے ہیں۔ گاؤ کشی ان کے نزدیک بہت بڑا گناہ ہے۔ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ گائے کا مقصد صرف بچھڑے جننا اور انھیں دودھ پلانا ہے۔ بعض تو دودھ پینے کے بھی خلاف ہیں۔ وہ بیل ناگر بیماری کے انسداد کے لیے عیسائی پادریوں کے بڑے احسان مند ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ عیسائی مبلغین جانوروں کی بیماریوں کے علاج کی بدولت ہی واتوسیوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں کامیاب ہو سکے ہیں

یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ واتوسی قوم کا تعلق قدیم مصری اقوام سے ہے۔ آج سے کئی صدیاں پہلے جبکہ مصر میں خوفناک قحط پڑا کرتے تھے۔ یہ قوم وہاں سے ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئی۔ ایک معزز واتوسی قبیلہ اپنے مویشیوں کے گلّے لے کر مصر سے چل کھڑا ہوا۔ ان لوگوں نے نئی چراگاہوں کی تلاش میں جنوب کا رُخ کیا، اور دشوار گذار صحراؤں اور خاردار وادیوں سے گذرتے ہوئے بالآخر روونینڈا کی وادی میں

میں آکر مقیم ہو گئے۔ اگرچہ ان کی تعداد قلیل تھی۔ لیکن اس کے باوجود انھوں نے یہاں کے اصل باشندوں یعنی باہونو، اور یانو قوموں کو زیر کر لیا، اور سارے ملک پر قابض۔ واتوسیوں کی ہجرت کی یہ کہانی وسط ایشیا سے ہندوستان میں وارد ہونے والے آریاؤں کی داستان معلوم ہوتی ہے جنھوں نے یہاں کے اصل باشندوں کو یا تو غلام بنا لیا تھا، اور یا پھر ملک کے دور دراز حصوں کی طرف بھاگنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس لحاظ سے یہ ماننا پڑتا ہے، کہ ہجرت، قانون قدرت کا ایک اٹل مسئلہ ہے جس کے ساتھ ساتھ قدیم زمانے میں کئی ملکوں کی تہذیب وابستہ رہی ہے۔ واتوسیوں کے مذہبی عقاید بالکل ہندوؤں جیسے ہیں۔ وہ بھی انھی کی طرح مسئلہ تناسخ کے قائل ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ مرنے کے بعد انسانی روح زندہ رہتی ہے۔ اور کسی جانور کے جسم میں داخل ہو جایا کرتی ہے۔ اس لیے ان کے ہاں اکثر جانوروں کو مذہبی حیثیت حاصل ہے، اور وہ روحانیت کا نشان سمجھے جاتے ہیں۔ کچھ قبیلوں میں یہ مذہبی نشان "گرگٹ" ہے۔ کچھ کے ہاں مینڈک کی پوجا ہوتی ہے۔ حکمران گروہ کا نشان سارس ہے۔ واتوسی ہندوؤں کی طرح بندر کو بھی متبرک جانور سمجھتے ہیں۔ ان میں یہ روایت چلی آ رہی ہے کہ زمانۂ ماضی میں ایک واتوسی بادشاہ کو اس کے دشمنوں نے کئی سال تک ایک غار میں قید رکھا۔ جہاں سے اسے ایک بندر کی مدد سے رہائی نصیب ہوئی۔ اس طرح یہ روایت بھی لنکا میں سیتا دیوی کی داستان سے ملتی جلتی ہے۔ اور ہنومان کی مدد سے رام چندر جی کے سیتا کو راون سے چھڑا لانے کے واقعہ کی یاد دلاتی ہے جس کی بنا پر ہندو بندروں کو مقدس جانور سمجھتے ہیں۔ واتوسی بادشاہ کی طرف سے ایک باقاعدہ محکمہ قائم ہے جس کے ذمے بندروں کی حفاظت اور پرورش کا کام ہے۔ واتوسیوں میں ایک فرقہ ایسا بھی ہے، جو آتش پرست ہے۔ یہ لوگ ہمیشہ آگ کو زندہ رکھتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ یہ آگ ایک واتوسی دیوتا کو قدرت کی طرف سے عطا ہوئی تھی۔

(باقی آئندہ)

معلومات عامہ

برطانیہ میں عدل وانصاف

پریکٹس شروع کرنے سے پہلے ایک بیرسٹر کو کم از کم چھ ماہ تک ایک دوسرے بیرسٹر کی شاگردی میں کام کرنا پڑتا ہے۔

بیرسٹر وکیلوں کے برعکس قانونی اداروں میں کام نہیں کرتے بلکہ ہوتا یہ ہے کہ بیرسٹروں کا ایک گروپ انز آف کورٹ میں کچھ کمروں میں ساجھے دار بن جاتا ہے۔ یہ کمرے چیمبرز کہلاتے ہیں۔ چیمبرز کے ایک اچھے سیٹ میں داخلے کے لیے سخت مقابلہ ہوتا ہے۔ اور کام حاصل کرنے کے لیے بیرسٹر کی لیاقت کا زیادہ تر انحصار اس کے کلرک کی صلاحیت پر ہوتا ہے۔

چوں کہ کلرک کو ہر بیرسٹر کی آمدنی میں سے ایک مقررہ شرح سے جزوی طور پر ایک رقم دی جاتی ہے، اس لیے اس کا فائدہ بھی اسی میں ہے کہ وہ اچھا کام کریں۔

انگلستان اور ویلز میں پانچ ہزار سے زائد بیرسٹر ہیں جن میں سے تقریباً دو ہزار پریکٹس کرتے ہیں۔ اگر کوئی بیرسٹر کئی سال سے بیرسٹری کر رہا ہے، اور اس کے پاس کام بھی ہے تو عدالت عالیہ کا وکیل بننے کے لیے لارڈ چانسلر سے درخواست کر سکتا ہے۔ یعنی وہ سینیئر بیرسٹروں کے گروپ میں آجاتا ہے۔ ان بیرسٹروں کو کوئینز کونسل (وکیل سرکار) کہا جاتا ہے۔ یہ بجائے معمولی کارروائی کا گاؤن پہننے کے جو عام طور پر ہائی کورٹ کے بیرسٹروں کی پوشاک ہے، ریشمی گاؤن زیب تن کر سکتے ہیں۔ وکیل سرکار عدالت میں مقدمہ کی سماعت سے قبل کسی بیان کا مسودہ تیار نہیں کرتا ہے وہ صرف اپنی رائے دیتا ہے اور عدالت میں پیروی کرتا ہے۔ اس کی فیس عام طور پر جونیئر بیرسٹروں سے زیادہ ہوتی ہے۔ تین بیرسٹر حکومت اور قانون کے درمیان رابطہ قائم کرتے ہیں۔

لارڈ چانسلر جو دارالامرا میں صدارت کے فرائض انجام دیتا ہے پورے قانونی پیشہ کا سربراہ

ہوتا ہے۔ اس کے زمانے کے وزیراعظم اس کا انتخاب کرتے ہیں۔ یہ ممتاز ترین بیرسٹر ہوتا ہے۔ برسر اقتدار جماعت کو جس کی تائید بالعموم حاصل ہوتی ہے۔ حکومت کے بدلنے پر اس کا عہدہ ختم ہوجاتا ہے اور وہ حکومت کے قانونی مشیر اور ملک کے چیف جج کی حیثیت سے کام کرتا ہے۔ کیوں کہ وہ دارالامرا میں بحیثیت جج کے کبھی تنہا اجلاس نہیں کرتا ہے۔ اس لیے اس کی رائے اقلیت کی رائے ہوتی ہے ان کا وزیر سیاسی نوعیت کا ہونے سے یہ مطلب نہیں ہے کہ قانونی فیصلوں میں حکومت کا فیصلہ ہی قطعی ہوتا ہے۔ درحقیقت وہ سیاسیات میں زیادہ حصہ نہیں لیتا کیوں کہ اس کی پہلی اور اولین حیثیت ایک وکیل کی ہوتی ہے اور اپنی قانونی تربیت اور کارمنصبی کی بنا پر وہ اس قدر غیرجانبدار ہوتا ہے کہ وہ حکومت اور ایک نجی شہری کے مابین تنازعہ میں حکومت کے خلاف بھی فیصلہ دے سکتا ہے۔ اگرچہ وہ خود حکومت کے ایک رکن کی حیثیت رکھتا ہے۔

حکومت کے دوسرے دو افسران قانون جج نہیں بلکہ ایڈووکیٹ ہوتے ہیں اور وہ بھی اُن بہترین بیرسٹروں میں سے چنے جاتے ہیں جو برسراقتدار حکومت کی تائید کرتے ہیں۔ وہ پارلیمنٹ کے رکن ہوتے ہیں اور وہ بھی حکومت کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوجاتے ہیں۔ اٹارنی جنرل عدالت میں حکومت کے ایڈووکیٹ کی حیثیت سے فوجداری اور دیوانی دونوں قسم کے مقدمات میں کام کرتا ہے لیکن وہ اہم مقدمات میں کام کرتا ہے۔ وہ حکومت کو قانون کی مسودہ سازی میں بھی مشورہ دیتا ہے اپنی حکومت کے برسراقتدار رہنے تک اٹارنی جنرل تمام بیرسٹروں کی جماعت کا سربراہ ہوتا ہے۔ لیکن اسے ان کو احکام دینے کا اختیار حاصل نہیں ہے۔

اس کے نائب کو سالی سٹر جنرل (حکومت کے اعلیٰ مشیر قانون) کہتے ہیں۔ سالی سٹر جنرل جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہوتا ہے۔ سالی سٹر (وکیل) نہیں ہوتا ہے وہ بیرسٹر ہوتا ہے۔ اس کے اختیارات و فرائض وہی ہیں جو اٹارنی جنرل کے ہوتے ہیں۔ البتہ وہ اٹارنی جنرل سے جونیئر ہوتے ہیں۔ اٹارنی جنرل کی علالت یا غیرموجودگی کے موقعہ پر سالی سٹر جنرل اس کی جگہ کام کرتا ہے۔

بیرسٹروں سے بہت سی روایات وابستہ ہیں۔ کیوں کہ انز آف کورٹ بہت سی قدیم رسوم کو محفوظ کیے ہوئے ہیں۔

بیرسٹر کی سند دینے کے سلسلہ میں بڑی دلآویز رسم منعقد ہوتی ہے۔ یہ رسم ان کے ہال میں منائی جاتی ہے۔ دارالامرا، ہائی کورٹ، اپیل کی عدالتوں، عدالتِ ضلع اور کوارٹر سیشن (سہ ماہی عدالتوں) میں بیرسٹر ایک سیاہ گون اور بالوں کا ٹوپ پہنتا ہے۔ اٹھارہویں صدی کا یہ لباس سب سے پہلے ۱۶۸۵ء میں ملکہ این کے سوگ میں پہنا گیا تھا۔

ہر بیرسٹر لندن کی عدالتوں یا ملک کی ماتحت عدالتوں میں پیروی کر سکتا ہے۔ لیکن کوارٹر سیشنز (سہ ماہی عدالتوں) یا خصوصی عدالتوں میں جج کے سامنے مقدمات کی پیروی کرنے سے قبل ان اضلاع کے بیرسٹروں کی جماعت کا رکن بننا لازمی ہے۔ جن میں خصوصی عدالت کا جج دورہ کرتا ہے۔

جن بیرسٹروں سے خلاف قانون حرکات سرزد ہوتی ہیں انھیں متعلقہ ان کی بنچ (مجلس عاملہ) پیشہ سے خارج کر دیتی ہے۔

قانون کو نہ صرف فوجداری امور بلکہ دیوانی امور سے بھی سروکار ہوتا ہے۔ اکثر ایک ہی عدالت اور جج کو فوجداری اور دیوانی مقدمات کی سماعت کرنی پڑتی ہے۔ کیوں کہ ہر انگریز وکیل کے لیے دیوانی اور فوجداری دونوں قوانین میں تربیت حاصل کرنی ضروری ہے۔ یہاں تک کہ مقامی مجسٹریٹوں کی ماتحت عدالتوں کے ذمہ بھی چند دیوانی امور ہوتے ہیں۔ حالاں کہ یہ مجسٹریٹ وکیل بھی نہیں ہوتے ہیں۔ دورے پر ہائی کورٹ کا جج دیوانی اور فوجداری مقدمات کی بھی سماعت کرتا ہے۔ لندن کا ہائی کورٹ کبھی کبھی فوجداری اپیل کی عدالت اور اولڈ بیلی، میں مرکزی فوجداری عدالت میں (جو لندن کے لیے خصوصی عدالت بھی ہے) اجلاس کرتے ہیں۔

دیوانی قانون کی دو شاخیں ہیں جن کے تحت ہائی کورٹ کی کوئنز۔ بنچ ڈویژن کے سامنے مقدمات پیش ہوتے ہیں اور اگر معمولی رقم الجھی ہوتی ہے تو ضلع کی عدالت کے سامنے۔

معاہدہ اور ٹارٹ سے متعلق مقدمات بھی ہوتے ہیں۔ معاہدہ ایک قسم کا اقرار نامہ ہوتا ہے تجارتی اقرار نامہ یا کسی دوسری قسم کا جس میں ایک فریق دوسرے کو بدلہ میں کوئی چیز دینے کا وعدہ کرتا ہے۔

ٹارٹ بے جا کام کو کہتے ہیں (ٹارٹ فرانسیسی لفظ ہے، جس کے معنی ہیں "خطا" یہ مجرمانہ فعل نہیں ہے)۔

اس نوع میں بہت سی حرکات آجاتی ہیں۔ مثلاً کسی شخص کو موٹر کی لپیٹ میں لے لینا، کسی ملازم کو بے انصافی سے برخاست کرنا یا کسی شخص کا ایک دوسرے شخص کے خلاف ایسی چیز شائع کرنا جس سے اس کی عزت پر حرف آتا ہو یا کسی تیسرے شخص کے نام ذلت آمیز خط لکھنا ہتک عزت یا تیسرے فریق کے بارے میں کسی سے غیبت کرنا (تہمت لگانا)

جب اس قسم کے واقعات رونما ہوں جیسا کہ ہر ملک میں آئے دن ہوتے رہتے ہیں، تو مظلوم شخص عدالتوں سے دادرسی چاہتا ہے۔ دادرسی یا تلافی کی مختلف قسمیں ہیں۔ عام طور پر معاوضہ میں روپیہ دے کر تلافی کی جاتی ہے۔ لیکن عدالت معاہدہ کے ایک فریق کو یہ حکم دے سکتی ہے کہ وہ اپنا وعدہ پورا کرے (مجوزہ تعمیل) یا ہتک عزت کے مجرم کو یہ حکم دے سکتی ہے کہ وہ باقاعدہ کھلم کھلا معذرت کرے۔ عدالت کا حکم نہ ماننے کی صورت میں دیوانی عدالت ملزم کو توہین عدالت کے جرم میں جیل بھیج سکتی ہے۔

قرض کی ادائیگی کے موقع پر اکثر ایسا ہوتا ہے، عدالت یہ فیصلہ کرتی ہے کہ مقروض ایک وقت میں کتنی رقم کی ادائیگی کر سکتا ہے۔ پھر اس کو اسی حساب سے قرضہ بے باق کرنے کا حکم دیتی ہے۔ مثلاً دو پونڈ ہر ہفتہ۔ اگر وہ بغیر کسی معقول وجہ کے ادائیگی میں کوتاہی کرتا ہے تو عدالت اسے توہین کے جرم میں جیل بھیج دے گی۔

تمام دیوانی مقدمات بھی اسی طریقہ سے فیصل کیے جاتے ہیں۔ مظلوم شخص قریب ترین ضلعی عدالت میں جاکر رجسٹرار سے ملتا ہے۔ یا زیادہ اہم مقدمات میں لندن ہائی کورٹ میں جاتا ہے اور دوسرے فریق کے خلاف عدالت کے حکم نامہ کے لیے درخواست کرتا ہے۔ جلد ہی عدالت کے حکم نامہ کے ذریعے الزام کا اعلان کر دیا جاتا ہے اور ملزم کو ملکہ کے نام سے عدالت میں حاضر ہونے کا حکم دیا جاتا ہے۔ تاکہ اس کے خلاف جو الزام لگایا گیا ہے۔ اس کی صفائی پیش کر سکے۔ عدالت کا حکم نامہ عدالت کا افسر خود ملزم کے حوالے کرتا ہے۔ بعض اوقات جب ملزم کا کھوج لگانا دشوار ہو جاتا ہے تو اسے یہ بذریعہ ڈاک بھیجا جاتا ہے۔ ملزم کو مقررہ وقفے کے اندر جو بالعموم آٹھ دن کا ہوتا ہے، عدالت میں حاضر ہونا پڑتا ہے۔ وہ خود عدالت میں حاضر ہو

اپنے بجائے اپنے وکیل کو بھیج دیتا ہے یا وہ عدالت کو خط کے ذریعہ سے مطلع کرتا ہے کہ وہ کہاں پر ہے مدعی کہ وہ عدالت میں حاضر ہونے کے لیے آمادہ ہے۔ علاوہ ازیں وہ اپنے وکیل کا نام بھی تحریر کر دیتا ہے۔ ایسے حالات میں جو اس کے قابو سے باہر ہوں مثلاً بیماری یا وطن سے غیر حاضری۔ اگر وہ صیغہ مدت کے اندر اندر جواب نہیں دیتا تو اس کے خلاف فیصلہ صادر کر دیا جاتا ہے۔

جب تنازعہ سے متعلق دونوں فریق عدالت میں حاضر ہوتے ہیں تو پہلے نجی طور پر ضلع عدالت کے رجسٹرار یا ہائی کورٹ میں ایک چھوٹے درجے کا جج ہوتا ہے۔ یہ سماعتیں چیمبرز میں ہوتی ہیں خود عدالت میں نہیں۔ اکثر مقدمات ماسٹر یا رجسٹرار کے سامنے فیصل ہو جاتے ہیں اور کسی شخص کو کانوں کان خبر بھی نہیں ہوتی۔

لیکن اگر چیمبرز میں ماسٹر یا ضلع عدالت کا رجسٹرار فریقین میں کوئی تصفیہ کرانے میں ناکام رہتا ہے تو وہ سمن جاری کر دیتا ہے۔ اور پھر باقاعدہ عدالتی کارروائی شروع ہو جاتی ہے۔ بہت سے لوگ مقدمہ کی پریشانی اور تشہیر سے بچنا چاہتے ہیں۔ اس لیے ماسٹر یا رجسٹرار کے ہاں ان کے مقدمات کا تصفیہ ان کے لیے خوشی کا باعث ہوتا ہے۔ قدرتی طور پر پبلک کے لیے اس میں کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ درحقیقت برطانیہ میں سوائے متعلقہ وکیلوں اور ان اشخاص کے جو مقدمہ میں ماخوذ ہیں کسی کو یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ مقدمہ کس مرحلہ میں ہے۔ یہ امر گویا زیادہ جاذب توجہ نہیں ہے لیکن بہت اہم ہے۔

الزام دینے والے کو جسے اصطلاحاً مدعی کہا جاتا ہے۔ ماسٹر یا رجسٹرار کچھ مہلت دیتا ہے جس میں وہ مقدمہ کے بارے میں تحریری بیان دیتا ہے۔ تاکہ ملزم جسے قانونی اصطلاح میں مدعا علیہ کہا جاتا ہے۔ اپنا جوابی بیان تیار کر سکے۔ اسے بیان دعویٰ جارحانہ کہتے ہیں جس میں نہ صرف جرم کی تفصیلات درج ہوتی ہیں بلکہ مدعی جو تلافی چاہتا ہے۔ اس کا بھی ذکر ہوتا ہے۔ اس میں اور بھی کچھ ہوتا ہے۔ ممکن ہے مدعا علیہ کو مدعی کے خلاف کوئی ذاتی رنجش بھی ہو۔ کیوں کہ عام طور پر جھگڑے کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ آدمی جو کار سے کچلا گیا ہے سڑک پر بے احتیاطی سے چل رہا ہو

دریہ بھی ممکن ہے کہ ڈرائیور اس قدر تیزی سے گاڑی چلا رہا ہو کہ اس کی ٹکر سے اس کے چوٹ آگئی ہو۔
برخاست شدہ ملازم نے ممکن ہے بعض ضروری فائلیں گم کردی ہوں، وہ شخص جس کے خلاف
ہتک عزت یا تہمت لگانے کا الزام ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس نے اپنے الزام دینے والے کے خلاف
کوئی چیز لکھی یا کہی ہو۔ چنانچہ جب عذرداری کا مسودہ تیار کیا جاتا ہے تو مدعا علیہ جوابی دعویٰ بھی
اس میں شامل کر دیتا ہے۔

ہر فریق بیان دعویٰ داری، اور عذرداری بمعہ جوابی دعویٰ کے مطالعہ کرتا ہے۔ یہ کاغذی لڑائی
بہت عرصہ تک جاری رہتی ہے۔ مدعی عذرداری کا جواب دعویٰ کی شکل میں دیتا ہے جس میں یہ
یہ بحث ہوتی ہے کہ کب اور کہاں عذرداری میں غلطی ہوئی ہے۔ پھر مدعا علیہ "تردیدی جواب" دیتا ہے
لیکن ایسا کبھی کبھی ہوتا ہے۔ محض بیان دعویٰ داری اور عذرداری کے کاغذات کا تبادلہ ہوتا ہو
لیکن کوئی فریق مزید تفصیلات چاہتا ہے یا اہم خطوط دیکھنے کا مطالبہ کرتا ہے۔

یہ تمام کاغذی کارروائی کھلی عدالت میں سماعت سے قبل ہوتی ہے۔ اس کی نگرانی ہائیکورٹ
کے مقدمہ میں "ماسٹر" اور ضلع عدالت کے مقدمہ میں رجسٹرار کرتا ہے۔ اکثر مقدمات میں بیرسٹر
کاغذی جنگ لڑتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی شخص چاہے تو وہ خود اپنے مقدمہ کی پیروی کر سکتا ہے۔
کاغذی جنگ میں کسی بھی منزل پر جھگڑے کا فیصلہ ہو سکتا ہے۔ لیکن عدالت میں اس کا
آنا ناگزیر ہے تو ہر فریق کا وکیل گواہوں کے بیانات لیتا ہے۔ پھر یہ بیانات بیرسٹر کو پیش کیے
جاتے ہیں۔ اس طرح وہ عدالت جانے سے پہلے صحیح طور پر سمجھ لیتا ہے کہ اس کے فریق کو کیا کہنا ہے۔

ان تمام تیاریوں کے بعد مقدمہ سماعت کے لیے پیش کر دیا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے
کہ یہ سماعت ہونے والے مقدمات کی فہرست میں شامل ہو جاتا ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اس
مقدمہ کی کس دن سماعت ہو گی۔ اس کا انحصار اس پر ہے کہ دوسرے مقدمات میں کتنا وقت لگتا ہے
لیکن آخر کار وہ دن آ جاتا ہے۔ عدالت کے کمرہ میں مقدمہ سے متعلق وکلا اور گواہوں کا
جمگھٹا لگ جاتا ہے۔ اخباری نمائندے بھی موجود رہتے ہیں کیونکہ فوجداری اور دیوانی کے تمام

مقدمات کی برسرِ عام سماعت ہوتی ہے۔ لاء کورٹس (لندن) میں جہاں ہائی کورٹ کی نشست ہوتی ہے، عام پبلک کے لیے ایک گیلری موجود ہے۔ کورٹ کی پہلی صف میں فریقین اور ان کے وکلا بیٹھتے ہیں۔ دوسری صف ملک کے قانونی مشیر کے لیے مخصوص ہے۔ کورٹ کے باقی حصے میں گواہ اور دوست احباب بیٹھتے ہیں۔ کمرہ کی ایک طرف گواہوں کی نشست گاہ ہے جہاں وہ گواہی دیتے ہیں اور دوسری جانب جیوری کی نشست گاہ ہے۔ کوئی بھی فریق جیوری کے لیے درخواست کر سکتا ہے۔ لیکن جیوری کے قیام کا فیصلہ ماسٹر یا رجسٹرار کرتا ہے۔ بعض دیوانی مقدمات میں ہمیشہ ہی جیوری بیٹھتی ہے اور وہ ہیں ہتک آمیز تحریری بیان۔ عزتِ ہتک (زبانی) عہد شکنی (شادی کے سلسلہ میں) اغوا نا جائز۔ قید اور معاندانہ فوجداری دعویٰ۔

پولیس کے نمائندوں کے لیے علیحدہ ایک مخصوص میز ہوتی ہے۔ عدالت کے کمرہ کے ایک سرے پر درمیان میں نمایاں جگہ جج کی نشست گاہ کے لیے مخصوص ہوتی ہے۔ جب سب لوگ آجاتے ہیں تو نقیب خاموش، خاموش کی آواز لگاتا ہے اور تب جج اپنے کمرہ سے عدالت میں آجاتا ہے جس کے احترام کے طور پر ہر شخص کھڑا ہو جاتا ہے۔ جج کی آمد پر سماعت شروع ہو جاتی ہے مدعی یا اس کا بیرسٹر توضیحی بیان کرتا ہے (ضلعی عدالتوں میں یہ فرائض وکیل انجام دیتا ہے) پھر وہ اپنے گواہوں کو بلاتا ہے تاکہ وہ اس کے بیان کی تصدیق کر سکیں۔ اس کے بعد وکیل صفائی اسی طریقہ سے اپنا مقدمہ پیش کرتا ہے۔ صفائی کے گواہ بلائے جاتے ہیں۔ جرح در جرح کی جاتی ہے۔ مدعا علیہ یا اس کا وکیل اپنے کیس کو مضبوط کرنے کے لیے دوسری تقریر کرتا ہے۔

پھر مدعی یا اس کا وکیل دوبارہ تقریر کرتا ہے۔ یہ بات ملحوظ خاطر رہے کہ تمام مقدمات میں خواہ دیوانی ہوں یا فوجداری، مدعی مقدمہ کو دو حصوں میں پیش کرتا ہے، وہی مقدمہ کا افتتاح اور اختتام کرتا ہے (صفائی) عذر داری تمام تر ایک حصہ پر مشتمل ہوتی ہے۔ گواہی کے بعد عذر داری کی جانب سے تقریر ہوتی ہے۔ گواہی کے بعد عذر داری کی جانب سے تقریر

ہوتی ہے اور اس کے بعد پھر ایک آخری تقریر ہوتی ہے۔

اس سے عذرداری کو کچھ فائدہ ہوتا ہے کیوں کہ اس کا تمام کیس یکجا ہوتا ہے جبکہ مدعی کا کیس دو حصوں میں ہو کر کچھ کمزور ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس مدعی کو حرف آخر کہنے کا موقع ملتا ہے۔

اگر دیوانی مقدمہ میں جیوری موجود ہے تو مدعی کی جانب سے آخری تقریر کے بعد جج اراکین جیوری سے خطاب کرتا ہے۔ بالکل فوجداری مقدمہ کی طرح وہ گواہی طلب کرتا، اہم حقائق پر زور دیتا اور پھر ان کو اپنے فیصلہ پر غور کرنے کے لیے بھیج دیتا ہے۔ واپسی پر جج ان سے پوچھتا ہے "اراکین جیوری کیا آپ اپنے فیصلہ پر متفق الرائے ہیں؟"

"ہم اتفاق رائے رکھتے ہیں حضور والا" "آپ مدعی کے حق میں ہیں یا مدعا علیہ کے؟"

اگر جواب ہے "مدعا علیہ کے حق میں" تو معاملہ ختم ہو جاتا ہے۔ بشرطیکہ جوابی دعویٰ نہ کیا گیا ہو لیکن اگر جوابی دعویٰ کر دیا گیا ہے یا جیوری نے مدعی کے حق میں فیصلہ دیا ہے تو جج معلوم کرتا ہے کس قدر رقم کا معاملہ ہے؟ اور پھر جیوری رقم بتاتی ہے۔ یہ فوجداری کے مقدمہ سے اسی قدر مختلف ہے کہ اس میں جیوری صرف یہ کہتی ہے "قصوروار" یا "قصوروار نہیں ہے" اور جج یا مجسٹریٹ سزا کا فیصلہ دیتا ہے۔ دیوانی مقدمہ میں جیوری کو دونوں باتوں کا فیصلہ کرنا پڑتا ہے۔ یعنی جرم کی نوعیت کیا ہے اور کیا سزا دینی چاہیے۔

اگر دیوانی مقدمہ میں جیوری موجود نہیں ہے تو جج فیصلہ صادر کرتا ہے۔ لیکن جج کو جیوری کے برعکس ان وجوہ کی مکمل تشریح کرنی پڑتی ہے جن پر اس کا فیصلہ مبنی ہے۔

انگریزی قانون میں ایک عام دستور یہ ہے کہ قانونی چارہ جوئی کے سلسلہ میں روپیہ صرف کرنا پڑتا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ ہارنے والے فریق کو مقدمہ کا پورا خرچہ برداشت کرنا پڑتا ہے اپنا بھی اور مقدمہ جیتنے والے کا بھی۔

ماسٹر یا رجسٹرار مناسب خرچہ کے بارے میں تصفیہ کرتا ہے۔ لیکن یہ سرکاری خرچے ۱۹۲

اخراجات کے مقابلہ میں بہت کم ہوتے ہیں۔ ممکن ہے کسی ایک فریق یا دونوں فریقوں نے بیرسٹر اور وکیل کو مقرر کر کے کافی اخراجات برداشت کیے ہوں۔ علاوہ ازیں اس نے گواہوں پر اور مقدمہ کے سلسلہ میں مواد فراہم کرنے پر بھی خاصی رقم صرف کی ہوگی۔ وہ شخص جسے اپنا تمام خرچہ واپس مل جاتا ہے۔ اپنے آپ کو بڑا خوش قسمت تصور کرتا ہے۔ برطانیہ میں انصاف فوری، آسان اور بے لاگ ہے۔ یہاں جج یا مجسٹریٹ کو نہ تو رشوت دی جا سکتی ہے اور نہ ہی حکومت کے زیر اثر ہوتے ہیں۔

ہائی کورٹ کے مقابلہ میں ضلعی عدالت کے اخراجات بہت کم ہوتے ہیں۔ چنانچہ لوگوں کی حتی الامکان یہی خواہش ہوتی ہے کہ ان کے مقدمات کی ضلعی عدالت میں سماعت ہو۔ برطانیہ بھر میں ضلعی عدالتیں موجود ہیں۔ دیوانی کے چھوٹے موٹے مقدمات کی ضلعی عدالتوں میں اور ان سے اہم مقدمات کی ہائی کورٹ میں سماعت ہوتی ہے۔ یعنی لندن میں یا خصوصی عدالتوں میں۔ اب ہم صحیح طور پر یہ بتانا چاہتے ہیں کہ چھوٹے موٹے مقدمات سے کیا مراد ہے۔ کوئی بھی مقدمہ جس میں دعویٰ کی رقم سو پونڈ سے کم ہو ضلعی عدالت میں آسکتا ہے۔ اگر سو پونڈ سے زائد اور دو سو پونڈ سے کم رقم کا دعویٰ ہو تو مدعا علیہ اسے ہائی کورٹ میں لے جانے کے لیے اصرار کر سکتا ہے۔ معاہدہ اور ٹارٹ دونوں میں اس کا اطلاق ہوتا ہے۔

البتہ ضلعی عدالت کو ہتک آمیز تحریری بیان یا ہتک عزت (زبانی) عہد شکنی یا اغوا کے مقدمات لینے کا اختیار نہیں ہے۔

اگرچہ اکثر و بیشتر حالات میں قانونی چارہ جوئی کرنے والے کو ہی اخراجات برداشت کرنے ہوتے ہیں لیکن جج اس سے مختلف بھی فیصلہ دے سکتا ہے۔ اور ہر ایک فریق کو اپنے اپنے اخراجات کی ادائیگی کا حکم دے سکتا ہے۔

گواہ کو قسم کھانی پڑتی ہے کہ وہ سچ بولے گا قطعی سچ۔ گواہ کی نشست گاہ میں جاتے ہوئے اسے اعلانیہ یہ قسم کھانی پڑتی ہے۔ اگر یہ معلوم ہو جائے کہ وہ دانستہ طور پر جھوٹی گواہی دے رہا ہے تو اس کا دروغ حلفی کے سنگین الزام میں مقدمہ چلتا ہے۔ مدعی اور مدعا علیہ دونوں گواہی دے سکتے ہیں۔ فوجداری مقدمات کی طرح اگر وہ گواہی نہ دیں تو اس سے برا گمان پیدا ہوتا ہے۔

[جولائی   **لاهور**   شمارہ ۴]

اس شمارہ میں

مدیر تحریر { پروفیسر سراج الدین / پروفیسر ایم۔ اے۔ مخدومی }

معاونین { عبدالغفور چوہدری / فضل احمد }

آموزش
لاہور

جولائی ۱۹۵۹ء

جلد ۱۲
شمارہ ۴

سالانہ چندہ
پاکستان کے لیے ۶ روپے
غیر ممالک کے لیے ۸ روپے

قیمت فی پرچہ دس آنے
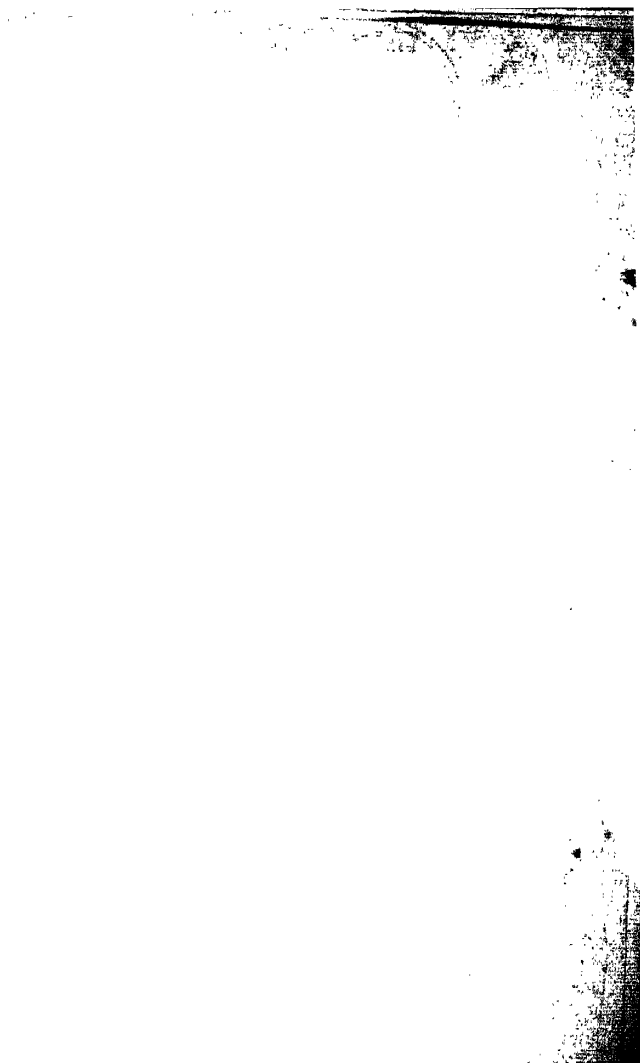
پبلشرز
یونیورسٹی بک ایجنسی۔ لاہور

آر۔ ایچ۔ ڈی خالد پرنٹر پبلشر نے دین محمدی پریس لاہور میں طبع کرا کے
یونی ورسٹی بک ایجنسی ۲ کچہری روڈ لاہور سے شائع کیا

بچوں کے لیے کتابیں

یم۔ اے مخدومی

محکمہ تعلیم مغربی پاکستان کے اس فیصلے کو بجا طور پر سراہا گیا ہے کہ پرائمری اور مڈل جماعتوں کے زائد مطالعہ کے لیے موزوں سائنسی موضوعات پر آسان اور دل چسپ کتابیں تیار کرائی جائیں اور انھیں ان مدرسوں کے کتب خانوں میں بے حد سستے داموں مہیا کیا جائے۔ سردست اس قسم کی دس کتابیں تجربتاً تیار کی جا رہی ہیں۔ یہ کتابیں آسان اُردو میں لکھی جائیں گی۔ اور کیمیا۔ طبیعات۔ علم الحیات اور غذائیات کو موضوع بنائیں گی۔

صاحب نظر عالموں نے تعلیم کو ہر زمانے میں صرف ایک آلہ کار خیال کیا ہے۔ خواندگی کی ضرورت محض اس لیے محسوس کی جاتی ہے کہ اس کی مدد سے نوع انسان کے علمی ترکے تک رسائی حاصل ہو جائے تاکہ انسان اپنی دنیا پر زیادہ سے زیادہ قدرت حاصل کر لے۔ ظاہر ہے کہ کوئی تعلیمی ادارہ اپنے طلبہ کو دنیا بھر کے علوم و فنون سے آگاہ نہیں کر سکتا۔ وہ زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتا ہے کہ طلبہ کو بنیادی مہارتوں میں پوری طرح تاک کر کے انھیں مطالعہ و جستجو کی راہ پر ڈال دے تاکہ وہ عمر بھر حسب ضرورت نوع انسان کی ذہنی میراث سے استفادہ کرتے رہیں۔ اسی لیے کامیاب تعلیم کی سب سے بڑی پرکھ یہ بتائی گئی ہے کہ اس نے طلبہ میں جذبہ جستجو اور ذاتی مطالعہ کے ذوق کو کس حد تک ترقی دی ہے۔ مدرسے کا بڑا کام بچوں اور نوجوانوں کو ذاتی مطالعہ کا ڈھنگ سکھانا اور ان کے دلوں میں اس کی پیاس پیدا کرنا ہے۔ جو مدرسہ یہ فرض اچھی طرح انجام دے دیتا ہے وہ گویا اپنی اہم ترین غایت پوری کر لیتا ہے۔

اس معیار پر جانچنے سے ہمارے بیشتر مدرسے اپنے اس بنیادی فرض کی بجاآوری میں

بڑی طرح قاصر نظر آتے ہیں۔ ان کا سارا زور امتحان میں آنے والے سوالوں کا اندازہ لگانے اور ان کے جواب رٹوانے پر صرف ہو جاتا ہے۔ انھیں اس بات کی کچھ پرواہ نہیں کہ آیا یہ جواب گھٹیا قسم کے بازاری خلاصوں سے رٹے جاتے ہیں یا استاد کے لکھائے ہوئے نوٹوں سے یا مقررہ درسی کتابوں سے۔ جو طلبہ یہ جوابات زبانی رٹ کر سنا دیں مدرسہ ان سے پوری طرح مطمئن ہو جاتا ہے۔ وہ اس بات کی کوئی کوشش نہیں کرتا کہ طلبہ کو ذاتی مطالعہ کی نوبت دے۔ مدرسے کا کتب خانہ کسی توجہ کا مستحق نہیں سمجھا جاتا۔ اس میں بری بھلی کتابیں یونہی جمع کر دی جاتی ہیں اور یہ کتابیں بھی عموماً الماریوں میں مقفل پڑی رہتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہمارے عام طلبہ اس پاکیزہ علمی ذوق سے محروم رہتے ہیں جو تعلیم کی اصل جان ہے۔ عام حالتوں میں ذہین سے ذہین طلبہ بھی اپنی ساری دوڑ دھوپ مقررہ درسی کتابوں پر ہی ختم کر دیتے ہیں۔ تعلیمی معیاروں کی روز افزوں پستی بڑی حد تک اسی افسوسناک صورت حال کی پیداوار ہے۔

لیکن اگر بچوں میں ذاتی مطالعہ کا ذوق پیدا کرنا مطلوب ہے تو اس کام کی طرف پرائمری اور مڈل جماعتوں سے ہی توجہ ہونی چاہیے۔ اس سلسلے میں ایک بہت بڑی دشواری موزوں کتابوں کی کمیابی بلکہ نایابی ہے۔ بچوں کے لیے موزوں کتابیں لکھنا ہر زمانے کے سائنس دانوں، جغرافیہ دانوں اور تاریخ دانوں کا فرض ہے۔ یہ کام ان عالموں کا ہے کہ وہ اپنے دور کی زندگی کی ایک جیتی جاگتی جھلک نئی پود کے سامنے ایسے انداز میں پیش کریں کہ ان کے دلوں میں اس زندگی کا پورا احوال معلوم کرنے کی ایک تیز لگن پیدا ہو جائے۔ موجودہ زمانے کی اہم ترین قوت جدید سائنس ہے۔ اردو میں اس موضوع پر بچوں کے لیے ابھی کچھ نہیں لکھا گیا۔ اس لیے محکمہ تعلیم کا مجوزہ تجربہ ایک حقیقی ضرورت پوری کرے گا۔ لیکن اس تجربے سے بہترین نتائج اسی صورت میں حاصل ہوں گے جب محکمہ تعلیم نہ صرف ایسے مصنفوں اور ادیبوں کی خدمات حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے جو جدید سائنس کو بچوں کے سامنے آسان اور دلکش پیرائے میں پیش کرنے کے قابل ہوں بلکہ استادوں کو بھی اس بات پر آمادہ کر سکے کہ وہ یہ کتابیں بچوں کے ہاتھوں میں دیں۔ اس کے لیے کلاس لائبریریوں کا اجرا ضروری ہے۔ نیز ایسے سکول لائبریرین کا تقرر

چند مشرقی ملکوں کا تعلیمی جائزہ

فضل احمد

تعلیم کا تقابلی مطالعہ ذہن و نگاہ میں جو وسعت اور باریکی پیدا کرتا ہے اس کی اہمیت کو ہر زمانے میں تسلیم کیا گیا ہے۔ لیکن موجودہ دور میں اس قسم کا مطالعہ اس وجہ سے اور بھی زیادہ اہم بن گیا ہے کہ آمد و رفت اور رسل و رسائل کی برق رفتار ترقی نے دنیا کے تمام ملکوں کو قریبی ہمسایوں کا درجہ دے دیا ہے جس سے زندگی کی دوڑ ہر جگہ بے حد تیز ہو گئی ہے۔ اس بات نے پس ماندہ اور گمنام قوموں کو بھی مجبور کیا ہے کہ وہ دوسروں کے شانہ بشانہ چلنے کے لیے جتن کریں۔ قدرتی طور پر اس جد و جہد میں پہلا قدم تعلیم کی نشر و اشاعت اور اس کی اصلاح و تجدید کا ہے۔ ایشیا اور افریقہ میں کئی ایسی قومیں موجود ہیں جن کے ہاں صدیوں سے تہذیب و تمدن کی روشنی چلی آتی ہے۔ بلکہ ان میں سے بعض پرانے زمانوں میں تہذیب و شائستگی کی علم بردار بھی رہ چکی ہیں۔ مگر جدید سائنسی تہذیب نے ان قوموں کو پسماندوں کی صف میں لا کھڑا کیا ہے۔ اور آج وہ اپنے آپ کو اس بات پر مجبور پاتی ہیں کہ جدید علوم و فنون کی نشر و اشاعت کا اہتمام کریں۔ یہ غایت حاصل کرنے کے لیے وہ اپنے پرانے نظام تعلیم کو تبدیل کر چکی یا تبدیل کر رہی ہیں بعض قومیں ایسی بھی ہیں جو کل تک کسی گنتی میں نہ تھیں۔ مگر بیسویں صدی کے بین الاقوامی دور نے انھیں یک دم چونکا کر اپنی خودی سے آگاہ کر دیا ہے اور اب وہ وحشت یا نیم وحشت کے دور سے یکدم کود کر تہذیب و شائستگی کی منزل پر پہنچنا چاہتی ہیں۔ اس قسم کی قومیں بھی اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے زیادہ تر تعلیم ہی پر بھروسہ کر رہی ہیں۔

قوموں کے یہ دونوں گروہ علم و حکمت کی روشنی حاصل کرنے کے لیے مغرب کی طرف جھک رہی ہیں۔ یہ امر ناگزیر ہے۔ مغرب پچھلی چند صدیوں سے جدید سائنس اور ٹکنالوجی کا امام چلا آ رہا ہے۔ جدید علوم و فنون نے مغرب کی عسکری، سیاسی اور معاشی قوت میں بے پناہ اضافہ کر کے اسے ساری

بنیاد پر سلا کر دکھایا ہے۔ مغرب کے اس عالمگیر غلبے کا نتیجہ یہ ہے کہ آج جو قوم بھی ترقی اور سربلندی حاصل کرنا چاہتی ہے وہ مغرب ہی کے نقش قدم کو راہ نما بناتی ہے۔ چناں چہ ایشیا اور افریقہ میں ہر جگہ مغربی نظامِ تعلیم درآمد کیا جارہا ہے۔ ہم خود ان قوموں کے زمرے میں شامل ہیں جو مغربی نظامِ تعلیم کو درآمد کر چکی ہیں۔ لیکن ماہرینِ تعلیم اس نکتے پر یک زبان ہیں کہ کوئی نظامِ تعلیم خواہ کتنا ہی کامیاب کیوں نہ ہو، اسے اس کے اصل وطن سے لے کر کسی اجنبی ثقافتی ماحول میں گاڑا نہیں جاسکتا۔ بے شک قوموں اور ملکوں نے تاریخ کے ہر دور میں دوسری قوموں سے تعلیمی سبق سیکھا ہے۔ مگر اپنی قومی ضرورتوں اور زمانے کی بدلتی ہوئی ضرورتوں کے مطابق نظامِ تعلیم میں ردوبدل کرنا اور چیز ہے اور باہر کسی نظامِ تعلیم کو درآمد کرنا بالکل دوسری چیز۔ موجودہ دور کے پسماندہ ملکوں نے زیادہ تر دوسری راہ اختیار کی ہے۔ اس سے ان ملکوں کی زندگی میں بعض عجیب وغریب مسائل پیدا ہوئے ہیں۔ چوں کہ ہر ملک کے اپنے جداگانہ حالات اور اپنی مخصوص روایات ہوتی ہیں، اس لیے اس کے تعلیمی مسائل کی نوعیت بھی ایک حد تک دوسروں سے مختلف قسم کی ہے۔ ذیل میں مشرق کے چند ملکوں کے نظامِ تعلیم پر ایک سرسری سی نظر ڈالی جارہی ہے۔ امید ہے یہ مطالعہ خود ہمارے لیے سبق آموز بھی ثابت ہوگا اور دل چسپ بھی۔

(۱) افغانستان

پچھلی چند دہائیوں میں افغانستان کی زندگی میں جو حیرت انگیز انقلاب آیا ہے اس نے اس کے نظامِ تعلیم کو شدید طور پر متاثر کیا ہے۔ دوسرے ملکوں کی طرح اس ملک کے تاریخی پس منظر کو سمجھے بغیر اس کے تعلیمی مسائل کو سمجھنا بھی ممکن نہیں۔ لمبی صدیوں تک یہ ملک فاتحین کے ریلوں کی گذرگاہ بنا رہا۔ ہندوستان میں آباد ہونے والے آریہ، سکندر اعظم، چنگیز خاں، امیر تیمور اور بابر نے افغانستان کی وادیوں اور اس کے شہروں کو روندا۔ ہندوستانی ریشمی کپڑے اور گرم مصالحوں کی جو تجارت صدیوں سے یورپ کے ساتھ جاری رہی وہ افغان سرحدوں میں سے گذرتی رہی۔ ان تمام باتوں نے افغانستان کو قدیم دنیا اور قرونِ وسطیٰ کا پورا پا بنائے رکھا۔ مگر جدید دور کے شروع ہونے کے ساتھ حالات یکدم بدل گئے۔

کسی زمانے میں افغانستان بدھ تہذیب کا مرکز تھا۔ مسلم فاتحین نے اسے اسلام کی دولت عطا کی۔ افغانستان ایک بلند پہاڑی ملک ہے جس کی دور افتادہ پہاڑی وادیاں باقی دنیا سے کٹی ہوئی نظر آتی ہیں۔ مگر ان وادیوں میں جو لوگ آباد ہیں ان کے خد و خال سابق فاتحین کے خون کی واضح نشاندہی کرتے ہیں ۱۷۴۷ء تک افغانستان کسی ایک حکومت کے ماتحت متحد نہ تھا۔ اس سن میں ایران کے بادشاہ نادر شاہ درانی نے اسے فتح کر کے اپنی سلطنت میں ملالیا۔ لیکن افغانستان کو ایک الگ اور خود مختار حکومت کا درجہ نادر شاہ کے جانشین احمد شاہ ابدالی نے دیا۔ وہ پہلا افغان تاجدار تھا۔ مگر مختلف افغان قبیلوں میں سرداروں کی سیادت بدستور باقی رہی۔ یہ صورت حال آج تک پوری طرح ختم نہیں ہو سکی۔ افغان پارلیمنٹ کا زیریں ایوان اب بھی قبائلی سرداروں پر مشتمل ہے۔

بیرونی دنیا سے بے تعلقی | یہ عجیب بات ہے کہ افغانستان جو قدیم زمانوں سے فاتحین کے ریلوں اور بین الاقوامی تجارت کی شاہراہ بنا رہا تھا، موجودہ دور کے آغاز میں بیرونی دنیا سے کٹ کر الگ تھلگ زندگی گذارنے لگا۔ اس چیز کی وجہ بالکل سیاسی تھی۔ ہندوستان پر برطانوی قبضے کے بعد برطانیہ اور اس کے پرانے حریف روس کے درمیان صرف افغانستان حائل رہ گیا تھا۔ انگریزوں کو شک گذرا کہ افغان حکمران روس کے ساتھ یارانہ گانٹھ رہے ہیں، اس کا مطلب برطانیہ کی ہندوستانی سلطنت کے لیے شدید خطرہ تھا۔ چناں چہ انگریز فوجیں افغانستان پر چڑھ دوڑیں تاکہ اس ملک کو بھی برطانوی سلطنت میں شامل کر لیا جائے۔

۱۸۴۲ء میں افغانستان نے انگریزوں کو مکمل طور پر شکست دے کر انھیں نکال باہر کیا یہ افغان تاریخ کا سنہری واقعہ تھا، اور افغان قوم کو آج تک اس پر فخر ہے۔ لیکن اس کے بعد انگریزوں کے ساتھ جو سرحدی جھڑپیں ہوئیں ان میں افغانستان کو نقصان اٹھانا پڑا، چوں کہ افغان قوم کو اپنی آزادی ہمیشہ عزیز رہی ہے۔ اس لیے اس نے سلامتی اس بات میں دیکھی کہ غیر ملکیوں کو اپنے ملک میں نہ آنے دیا جائے۔ مغربی قوموں کو شک و شبہ کی نگاہوں سے دیکھا جانے لگا۔ اور ان پر افغانستان کے دروازے کم و بیش بند کر دیے گئے۔ یہ صورت حال موجودہ

صدی کے آغاز تک باقی رہی۔ لیکن پہلی عالمی جنگ کے بعد جب عالمی سیاست کا رخ بدل گیا تو افغانستان نے رفتہ رفتہ بیرونی دنیا کے ساتھ مراسم بڑھانے شروع کیے۔ دوسری عالمی جنگ کے بعد سے یہ سلسلہ زیادہ تیز ہو گیا ہے۔ تاہم افغانستان مختلف مغربی ملکوں کے درمیان غیر جانبداری کی حکمت عملی پر سختی سے کاربند ہے۔

پرانی وضع کے مکتب دشوار گذار پہاڑی سطح نے نہ صرف افغانستان اور بیرونی دنیا کے میل جول کو مشکل بنا رکھا ہے۔ بلکہ خود ملک کے اندر بھی آمد و رفت کا کام بڑا کٹھن بنایا ہوا ہے۔ اونچے پہاڑوں کے درمیان تنگ وادیاں واقع ہیں، اور لوگوں کے عام پیشے کھیتی باڑی کرنا اور بھیڑ بکریاں چرانا ہیں۔ قابل کاشت زمین اور چراگاہوں کی قلت نے روزی کمانے کا کام بڑا مشکل بنا رکھا ہے۔ اس لیے عام والدین اپنے بچوں کو جلد از جلد کھیتی باڑی یا گلہ بانی کے کام میں لگا دینا چاہتے ہیں تاکہ ان کا اپنا بوجھ کچھ ہلکا ہو جائے۔ چوں کہ ملک کی عام معیشت ابھی قرون وسطیٰ کی تراقی کے نمونے سے زیادہ آگے نہیں بڑھی اس لیے ہر کسان کو اپنی کھیتی کے ہر انچ کے لیے دن رات چوکس رہنا پڑتا ہے اور بیا سانی کا یہ کام سارا کنبہ مل کر ہی انجام دے سکتا ہے۔ یہ معاشی نظام عام بچوں اور نوجوانوں کو پڑھنے لکھنے کے لیے زیادہ وقت نہیں دے سکتا۔

تاہم افغانستان کے طول و عرض میں پرانی وضع کے مکتبوں کا جال پھیلا ہوا ہے۔ ہر گاؤں کا ملا صرف امامت کے فرائض انجام نہیں دیتا بلکہ بچوں کو ناظرہ قرآن مجید بھی پڑھاتا ہے۔ عام بچوں کی تعلیم قرآن مجید ناظرہ پڑھنے پر ہی ختم ہو جاتی تھی۔ لیکن کھاتے پیتے والدین جو اپنے بچوں کو اس بات کی اجازت دے سکتے تھے کہ پڑھنا لکھنا سیکھنے پر وقت صرف کریں وہ گاؤں کے ملا سے پڑھنا لکھنا سیکھنے کے بعد پرانی وضع کے بڑے مکتبوں میں چلے جاتے تھے، جہاں انھیں دینی تعلیم کے علاوہ ریاضی، تاریخ، علم و ادب وغیرہ کی تعلیم ملتی تھی۔ حالیہ سالوں میں نئی وضع کے مدرسے کھلنے لگے ہیں۔ مگر دیہات میں ان کی تعداد اب بھی بہت کم ہے۔ دور افتادہ علاقوں کے افغان بچوں کے لیے آج بھی ملا کا مکتب ہی تعلیمی سہولتیں مہیا کرتا ہے۔ یہ مکتب سرکاری سرپرستی

نہیں بلکہ نجی طور پر چلائے جاتے ہیں۔ گاؤں کا ملا عام حالتوں میں امامت کے علاوہ لوگوں کے لیے لکھنے پڑھنے کا کام بھی انجام دیتا ہے اور طبیب کے فرائض بھی۔ ان فرائض کے علاوہ وہ گاؤں کا سکول ماسٹر بھی ہے۔ اس اعتبار سے افغان ملا یا دیہاتی مدرس اپنے معاشرے میں کافی اہم مقام رکھتا ہے۔ وہ دیہاتی عوام کی اہم خدمات انجام دیتا ہے اور اسی مناسبت سے عزت و احترام کا حق دار سمجھا جاتا ہے۔

جدید تعلیم | جوں جوں افغانستان کے مراسم بیرونی دنیا سے بڑھتے گئے اس ملک کے حکمران طبقے میں یہ احساس بھی ترقی پاتا گیا کہ جدید دور کے تقاضے پورے کرنے کے لیے اولاد کو مغربی تعلیم دلانا ضروری ہے۔ چناں چہ امیر افغان گھرانوں نے اپنے لڑکوں کو فرانس، جرمنی انگلستان اور بعد میں امریکہ میں اعلیٰ تعلیم کے لیے بھیجنا شروع کیا۔ ظاہر ہے کہ مغربی تعلیم کی مانگ محض ذاتی جاہ طلبی کی بنا پر پیدا ہوئی تھی۔ اس کے ذریعے قومی زندگی کے معیار کو بلند کرنا مقصود نہ تھا۔ چناں چہ مغربی تعلیم نے افغانستان میں ایک عجیب و غریب صورت اختیار کر لی۔ مغربی یونیورسٹیوں میں جانے سے پہلے ضروری خیال کیا گیا کہ نوجوان اپنے ملک میں کچھ تیاری کر لیں تاکہ غیر ملکی تعلیم سے پوری طرح فائدہ اٹھا سکیں۔ اس خیال سے کابل میں چار ثانوی مدرسے قائم ہو گئے۔ ان میں سے ایک مدرسہ فرانسیسی تھا۔ دوسرا جرمن اور تیسرا برطانوی۔ بعد میں ایک امریکی مدرسہ بھی قائم ہو گیا۔ ان میں سے ہر مدرسہ اپنے ملک کا تعلیمی نصاب پیش کرتا ہے مثلاً فرانسیسی مدرسے میں نہ صرف پڑھانے والے استاد فرانسیسی ہیں بلکہ پڑھائی جانے والی کتابیں بھی فرانس سے آتی ہیں۔ یہ مدرسہ افغان نوجوانوں کو فرانسیسی زبان۔ علم ادب۔ فرانسیسی تاریخ اور فرانسیسی ثقافت کی تعلیم دیتا ہے۔ یہی حال جرمن۔ برطانوی اور امریکی مدرسوں کا ہے گویا ان میں سے ہر مدرسے نے اپنی چار دیواری میں اپنی ملکی زندگی کا نمونہ قائم کر رکھا ہے۔ ان مدرسوں کو گرد و پیش کی افغان زندگی سے کچھ سروکار نہیں۔ دنیا کے کسی اور ملک میں ایسی مثال غالباً نہیں ملے گی کہ مستقبل کے رہنماؤں کو خود اپنی سرزمین میں بھی قومی ثقافت سے کاٹ کر چار

مختلف ثقافتوں کی گروہوں میں ڈال دیا جاتا ہو۔

اس افسوسناک صورت حال کا نتیجہ یہ ہے کہ افغان قوم کی باگ ڈور جن لوگوں کے ہاتھوں میں ہے وہ تعلیم کے معاملے میں مغربی نمونوں سے ذرا بھی ادھر ادھر ہٹنا پسند نہیں کرتے۔ چنانچہ مغربی علوم کی اشاعت کے لیے ملک میں نئی وضع کے جو ابتدائی اور ثانوی مدرسے قائم ہوئے ہیں وہ نصاب طریق تدریس، طریق امتحان، غرض ہر چیز میں یورپی نمونے کی تقلید کرتے ہیں۔ ان حالات میں یہ امر چنداں تعجب خیز نہیں کہ افغان عوام کے لیے یہ مدرسے چنداں کشش نہیں رکھتے۔ عوام ان مدرسوں میں اپنے بچے بھیجنا پسند نہیں کرتے۔

ایک ایسے ملک میں جہاں پیٹ پالنے کے لیے کنبے کے تمام افراد کو لگاتار محنت کرنی پڑتی ہو مدرسے میں غیر معمولی کشش موجود ہونی چاہیے۔ تاکہ والدین بچوں کو مدرسے بھیجنے پر آمادہ ہو جائیں لیکن افغان مدرسے ایسی اجنبی قدروں کو اچھالتے ہیں، جنھیں ملکی روایات اور قومی قدروں سے کچھ مناسبت نہیں۔ یہ زیادہ تر اسی بات کا نتیجہ ہے کہ حکومت کی کوششوں کے باوجود اب تک صرف کوئی دس فی صد افغان بچوں کو مدرسوں میں داخل کیا جا سکا ہے۔ صاحب نظر افغان رہنما اب یہ بات محسوس کرنے لگے ہیں کہ افغان مدرسوں کو ملکی روایات اور قومی ثقافت سے زندگی حاصل کرنی چاہیے۔ تاکہ افغان عوام انھیں ایک بے کار اجنبی چیز سمجھنے کی بجائے مفید قومی خادم سمجھنے لگیں۔ حال ہی میں کچھ افغان ماہرین تعلیم نے بعض امریکی مشیروں کے ساتھ مل کر ملک کی تعلیمی حالت کا جائزہ لینے کے بعد جو رپورٹ مرتب کی تھی اس میں دوسری باتوں کے علاوہ یہ بھی کہا گیا تھا کہ:۔

ہمارا خیال ہے کہ افغانستان کا نظام تعلیم آج جس ڈگر پر چل رہا ہے اس نے عملی طور پہ رسمی تعلیم کی منزل مزید رسمی تعلیم بنا دی ہے۔ کامیابی یا ناکامی کا معیار امتحان میں کامیابی ہے جس کی بنا پر اگلی جماعت میں داخلہ مل جائے۔ نتیجہ یہ ہے کہ تعلیم اپنی منزل خود بن کر رہ گئی ہے۔ مدرسے سے باہر جس قسم کی زندگی موجود ہے تعلیم کو اس سے کچھ واسطہ نہیں۔ ہمارا

یال ہے کہ تعلیم بیشتر صورتوں میں طلبہ کو اس زندگی سے بیگانہ بنا کر رکھ دیتی ہے جو افغانستان
جسب حال ہے۔

افغانستان میں لڑکیوں کی تعلیم کو چنداں اہمیت حاصل نہیں۔ ۱۹۵۶ء میں یونیسکو نے
یم کے متعلق جو عالمی اعداد و شمار جمع کیے تھے ان کے مطابق صرف ایک فی صد افغان لڑکیاں تعلیم یافتہ
ں۔ تاہم اب لڑکوں اور لڑکیوں دونوں کے مدرسوں کی تعداد بڑھ رہی ہے۔

بیس سالہ منصوبہ | یہ امر اطمینان کا موجب ہے کہ افغان رہنما اب تعلیمی اصلاح کی ضرورت
سوس کرنے لگے ہیں۔ عالمی حالات نے انھیں اس بات پر مجبور کر دیا ہے کہ ملکی معاملات کو بین الاقوامی
یمنے میں دیکھیں۔ وقت کے تقاضے شدت سے اس بات کا تقاضا کر رہے ہیں کہ قرون وسطیٰ کی معیشت
ی جگہ جدید معیشت کو ملے تاکہ افغان عوام کا معیار زندگی بلند ہو اور وہ دوسری قوموں کے پہلو بہ پہلو
یک آبرو مند مقام حاصل کریں۔ یہ غایت حاصل کرنے کے لیے تعلیمی نظام میں بنیادی اصلاح ضروری
ہے۔ لیکن یہ بات بھی اپنی جگہ درست ہے کہ تعلیمی اصلاح کی رفتار قدرتے مدھم ہی رہے گی
روایات سالہا سال سے جڑ پکڑ چکی ہیں۔ انھیں بدلنے کے لیے وقت چاہیے۔ چناں چہ ۱۹۵۶ء میں
فغان وزارت تعلیم نے ایک ۲۰ سالہ ترقیاتی منصوبہ تیار کیا تھا۔

یہ منصوبہ تعلیمی نظام میں دوررس تبدیلیاں کرے گا۔ اس کے ماتحت لڑکوں اور لڑکیوں کے
تدائی مدرسوں کی تعداد کافی بڑھ جائے گی۔ بیشتر لڑکے اور لڑکیاں ابتدائی مدرسے کے خاتمے پر
علیم سے فارغ ہو جائیں گے۔ کوشش یہ ہے کہ ابتدائی مدرسے کے نصاب کو افغان زندگی کے
ساتھ مربوط کیا جائے۔ اس غرض سے زراعت، گلہ بانی، دستکاری اور افغان تاریخ اور علم و ادب
پر زور دیا جا رہا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ تعلیم بچوں اور نوجوانوں کے دلوں میں افغان ثقافت کے لیے
فخر اور احترام کے جذبات بھر دے۔

اس وقت پرائمری مدرسے سے نکلنے والے طلبہ میں سے دس فی صد سے بھی کم ثانوی
مدرسوں میں جاتے ہیں۔ تعلیمی منصوبے کے ماتحت ثانوی تعلیم کی اصلاح اور توسیع کی جا رہی ہے۔ لڑکوں

اور لڑکیوں دونوں کے لیے نئے ہائی سکول قائم کیے جا رہے ہیں۔ غیر ملکی اساتذہ کی جگہ موزوں افغان استاد بھرتی کیے جا رہے ہیں۔ زراعت اور ٹکنالوجی کی تعلیم کے لیے بھی سکول قائم ہوئے ہیں۔ حال ہی میں کابل یونیورسٹی نے اپنے یہاں ٹکنالوجی کے شعبے کا اضافہ کیا ہے۔ لیکن ابھی وزارت تعلیم اس قابل نہیں ہو سکی کہ زراعتی اور ٹیکنیکل تعلیم کے لیے بھی وہی احترام اور وہی پیاس پیدا کر دے جو علمی قسم کی تعلیم کے لیے موجود ہے۔

نئے تعلیمی منصوبے کے سامنے ایک مقصد یہ بھی ہے کہ اعلیٰ تعلیم غیر ملکوں کی بجائے خود اپنے ملک میں ہی حاصل کی جائے۔ کابل یونیورسٹی میں پہلے صرف پانچ شعبے تھے۔ یعنی علم ادب، سائنس، قانون، طب اور مذہب۔ یہ پانچوں شعبے شہر کے مختلف حصوں میں ایک دوسرے سے الگ واقع تھے اور ان کے درمیان صرف اس قدر رشتہ موجود تھا کہ یونیورسٹی کونسل ان شعبوں کے صدروں پر مشتمل تھی۔ اب یونیورسٹی میں ٹکنالوجی اور علم التعلیم کے شعبوں کا اضافہ کیا جا رہا ہے اور اس کی تنظیم بھی بہتر طور پر کی جا رہی ہے۔

نئے تعلیمی منصوبے کی راہ میں کئی ایک دشواریاں موجود ہیں۔ ملک کے مالی وسائل محدود ہیں۔ اس لیے تعلیمی ترقی اور توسیع کو ان کے اندر ہی رہنا ہوگا۔ لیکن مالی دشواریوں سے زیادہ بڑی دشواری موزوں استادوں کی فراہمی ہے۔ حکومت جوں توں کر کے تعلیمی سہولتوں کا بندوبست کر سکتی ہے، مگر ان سہولتوں سے حقیقی خدمت لینے کے لیے صاحب عزم اور صاحب نگاہ استادوں کی ضرورت ہے۔ استادوں کی تربیت کے لیے اب تک صرف کابل میں ایک مدرسہ قائم تھا، جو پرائمری جماعتوں اور ساتویں آٹھویں جماعتوں کے لیے استاد تیار کرتا تھا۔ ہائی سکولوں میں کام کرنے کے لیے کابل یونیورسٹی کے شعبۂ ادب اور شعبۂ سائنس کے گریجوایٹوں سے کام لیا جاتا رہا ہے۔ اب استادوں کی تربیت کے لیے دو نئے مدرسے قائم کیے جا رہے ہیں۔ اس کے علاوہ انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن بھی قائم کی جا رہی ہے۔ جو نہ صرف استادوں کو تربیت دے گی، بلکہ پرانے استادوں کے لیے دوران ملازمت تربیت کا انتظام بھی کرے گی۔

تعلیمی اصلاح و اشاعت کی راہ میں ایک بڑی مشکل یہ ہے کہ قابل آدمیوں کو معلمی کے پیشے کی طرف کیوں کر راغب کیا جائے۔ ایک عام استاد کو ۶۰ سے ۷۵ پاکستانی روپیے کے برابر ماہانہ تنخواہ ملتی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اکثر استاد پڑھانے کے علاوہ کئی اور کام بھی کرتے ہیں تاکہ زندگی گذار سکیں افغانستان کو ان تمام تعلیمی مسائل کے تسلی بخش حل تلاش کرنے ہیں تاکہ قومی ترقی کی راہ صاف ہو جائے۔

(۲) ہندوستان

ہندوستان اور پاکستان کے تعلیمی مسائل بنیادی طور پر ایک سے ہیں۔ اس برصغیر کا نظام تعلیم ایک غیر ملکی پودا ہے، جو انگریز حکمرانوں نے انیسویں صدی کے وسط کے قریب انگلستان سے درآمد کیا تھا۔ ان کے پیش نظر یہ غایت تھی کہ انگریزی علمداری کو چلانے کے لیے چھوٹے موٹے کارندے مقامی آبادی میں سے تیار کیے جائیں۔ موجودہ صدی اور بالخصوص دوسری عالمی جنگ کے بعد خود انگلستان کے تعلیمی فلسفہ اور اس کے نظام تعلیم میں انقلابی تبدیلیاں آئی ہیں۔ مگر برصغیر پاک و ہند کے نظام تعلیم نے ان سے کوئی اثر قبول نہیں کیا۔ یہ آج بھی اسی طرح محدود اور تنگ قسم کا ہے جس طرح سو سال پہلے تھا۔

اس نظام تعلیم کی سب سے بڑی کمی یہ ہے کہ اس نے ملکی ثقافت اور مقامی روایات سے زندگی کی کوئی حرارت حاصل نہیں کی۔ اسے گرد و پیش کی زندگی سے کچھ واسطہ نہیں۔ ملک سالہا سال سے افلاس، جہالت، توہم پرستی، غلاظت، بیماری اور کثرت آبادی کے جاں گسل مسائل سے دوچار ہے ان مسائل نے چاروں طرف ہائے ہو کا عالم بپا کر رکھا ہے۔ مگر سکولوں اور یونیورسٹیوں میں پڑھنے پڑھانے والوں کو ان مسائل سے کچھ سروکار نہیں۔ وہ اپنی مصنوعی دنیا میں مگن ہیں اور غالباً اپنی خوش بختی پہ خوش ہیں کہ وہ اس درد آفات سے بچ گئے ہیں جس نے عوام کی زندگی کو بری طرح دبوچ رکھا ہے اس صورت حال کا نتیجہ یہ ہے کہ تعلیمی ادارے زندگی سے فرار کے اڈے بن کر رہ گئے ہیں، والدین اپنے گاڑھے پسینے کی کمائی بچوں کی پڑھائی پر اس لیے لٹاتے ہیں کہ کم از کم ان کی اولاد مصائب کے اس سمندر سے بچ جائے، جس میں وہ خود غوطے کھا رہے ہیں۔ تعلیم گویا زندگی کی مشکلات پر قابو پانے کا ذریعہ نہیں بلکہ ان مشکلات سے بچ نکلنے کا زینہ ہے۔

اس صورت حال کا نتیجہ یہ ہے کہ ۔۔ تعلیمی نصاب خالص علمی قسم کا ہے۔ پڑھانے کے طریقے ایسے ہیں جو انفرادیت کا گلا گھونٹ کر رکھ دیتے ہیں۔ اس تنگ اور نظری قسم کی تعلیم کے ہاتھ منضبط کرنے کے لیے ایک بے لچک قسم کا نظام امتحانات موجود ہے۔ یہ امتحانات خارجی ہیں یعنی پڑھانے والے استادوں کو اپنے طلبہ کی کارکردگی جانچنے کی ذمہ داری ہرگز نہیں سونپی جاتی۔ اس کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ امتحانوں میں فیل ہونے والوں کی تعداد خوفناک طور پر بھاری ہے۔ ہر سال ہزاروں لاکھوں طالبعلم طالبات مختلف امتحانوں میں ناکام رہتے ہیں۔ ناکامی کی مایوسی سے بچنے کے لیے والدین اور طلبہ پرائیویٹ ٹیوشن کا سہارا ڈھونڈتے ہیں۔ امتحانی امدادوں کے نام پر گھٹیا قسم کے خلاصے ہاتھوں ہاتھ بکتے ہیں۔ غیر ملکی اور ملکی لوگوں نے ان گنت پرائیویٹ تعلیمی ادارے کھول رکھے ہیں اور تعلیم کی تجارت پورے زوروں پر ہے۔

زبان کا مسئلہ | گو سارے ہندوستان میں ایک ہی ہندو ثقافت کی حکمرانی ہے۔ لیکن مشترکہ تہذیب کا ایک بے حد اہم عنصر یعنی مشترکہ زبان اس ثقافت سے غائب ہے۔ ملک میں درجنوں زبانیں بولی جاتی ہیں جن میں سے بعض کم از کم اتنی ہی ترقی یافتہ ہیں جتنی ملک کی سرکاری زبان ہندی۔ سچ یہ ہے کہ بعض زبانیں ہندی پر برتری رکھنے کی دعویدار ہیں۔ اس صورت حال نے تعلیمی میدان میں بڑی مشکل پیدا کر رکھی ہے۔

ہندوستانی دستور کے مطابق تعلیم مرکزی حکومت کی بجائے ہر ریاست کی اپنی ذمہ داری ہے، مرکزی حکومت محض تعلیمی راہنمائی کا فرض سنبھالے ہوئے ہے۔ ہر ریاست میں ایک نہ ایک غالب لسانی گروہ موجود ہے جس کی زبان ریاست کی زبان قرار دی گئی ہے۔ مگر یہ ضروری نہیں کہ ریاست کی زبان بچے کی مادری زبان بھی ہو۔ ابتدائی مدرسے کے شروع سے ہی ریاست کی زبان پڑھائی جانے لگتی ہے۔ ہندی چونکہ ملک کی سرکاری زبان ہے، اس لیے کچھ عرصہ بعد اس کی پڑھائی بھی شروع ہو جاتی ہے۔ اگر طالب علم ابتدائی مدرسے سے آگے ہائی سکول میں جاتا ہے تو اسے انگریزی بھی پڑھنی پڑتی ہے۔ غرض ایک اوسط ہندوستانی طالب علم مدرسے میں جاتا ہی زبانوں کے بوجھ تلے دب جاتا ہے

اور یہ بوجھ ختم ہونے کا نام نہیں لیتا۔ تعلیمی طور پر زبانیں محض آلہ ہائے کار کا درجہ رکھتی ہیں۔ یہ بذاتِ خود مقصود نہیں ہوتیں، بلکہ محض اس لیے پڑھی جاتی ہیں کہ آگے چل کر ان کی مدد سے مختلف علوم و فنون حاصل کیے جائیں۔ مگر ایک اوسط ہندوستانی طالب علم کے لیے یہ بعد کی منزل کبھی نہیں آتی۔ وہ زبانیں سیکھنے کے چکر میں ہی پڑا رہتا ہے۔

اصلاح کی مہم ہندوستان دنیا کے گنجان آباد ترین حصوں میں سے ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی درست ہے کہ قدرت نے اس ملک کو بڑی فیاضی سے قدرتی وسائل عطا کیے ہیں۔ یہی وسائل فی الحقیقت قدیم ہندو تہذیب کی ترقی کا باعث بنے تھے۔ مگر ان وسائل کو ترقی دینے کی گنجائش ابھی باقی ہے۔ آزادی کی آمد کے بعد ہندوستان نے جو ترقیاتی منصوبے تیار کیے ہیں، ان سب میں عوام کے معیارِ زندگی کو بلند کرنا پہلی چیز ہے۔ اس وقت ایک ہندوستانی کی اوسط سالانہ آمدنی تین سو روپے سے زیادہ نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ زندگی کی بہت سی نعمتوں سے محروم ہے۔ موجودہ حکومت اس محرومی کا علاج کرنے کے در پے ہے چناں چہ تعمیر و ترقی کے ہر منصوبے میں زراعت، خوراک کی پیداوار، بھاری اور مشینی آلات کی صنعتوں، توانائی کے وسائل اور وسائل آمد و رفت کو توجہ کا مرکز بنایا جاتا ہے۔ ہندوستانی رہنماؤں کا خیال ہے کہ ملکی معیشت کو اس طور پر ترقی دیے بغیر تمام بچوں کو ابتدائی تعلیم دینے کا وعدہ پورا کرنا ممکن نہیں۔ مگر یہ وعدہ پورا کرنے کے لیے جن مالی وسائل کی ضرورت ہے وہ ابھی میسر نہیں آسکے۔

آزادی کی آمد سے پہلے گاندھی جی کی قیادت میں تعلیم کی اصلاح کا کام شروع کیا گیا تھا۔ اس تحریک کا مقصد یہ تھا کہ پانچ سالہ ابتدائی تعلیم کو مقامی زندگی کے ساتھ اس طرح مربوط کیا جائے کہ تعلیم ایک بے معنی چیز رہنے کی بجائے ایک دلچسپ اور بامعنی تربیت کا مقام حاصل کرے۔ چناں چہ ابتدائی یعنی بنیادی تعلیم میں مقامی دست کاریوں اور سماجی زندگی کو نقطہ مرکز بنایا گیا تھا۔ چھوٹے بچے ٹوکریاں، چٹائیاں بنانے اور اس قسم کی دوسری دست کاریوں کے ضمن میں پڑھنا لکھنا اور باہم مل کر کام کرنا سیکھتے۔ ودیا مندر کی اس تحریک کو اب سرکاری سرپرستی حاصل ہے، اور اس نے ملک کے مختلف حصوں میں مختلف رفتاروں سے ترقی کی ہے۔ تاہم سارے ملک کا چکر لگانے پر

یہ تاثر بڑی شدت سے پیدا ہوتا ہے کہ ہندوستانی مدرسہ ملکی زندگی میں ایک نیا کردار ادا کرنیوالا ہے۔ تعلیم کو ایک نیا مفہوم دیا جا رہا ہے اور یہ کوشش خاصی کامیابی حاصل کر چکی ہے۔

اس وقت پچاس فی صد سے کچھ اوپر بچے ابتدائی مدرسوں میں داخل ہیں۔ تیسرے پنج سالہ منصوبے کے مطابق سنہ ۱۹۶۱ء تک ۶ سے ۱۱ برس کی عمر کے بچوں میں سے ۶۰ فی صد ابتدائی مدرسوں میں داخل ہو جائیں گے۔ مگر اس معاملے میں سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ ابتدائی مدرسے میں داخلے کے جلد بعد بچے مدرسہ چھوڑنے لگتے ہیں۔ اس ضیاع کو روکنے کے لیے بڑا جتن کیا جا رہا ہے۔

ابتدائی مدرسہ پانچ جماعتوں پر مشتمل ہے اور اس میں ۶ سے ۱۱ برس کے بچے پڑھتے ہیں۔ ابتدائی مدرسے میں داخل ہونے والے بچوں میں سے صرف ۲۰ فی صد مڈل جماعتوں میں پہنچے ہیں۔ گویا ۱۱ سے چودہ برس کی عمر کے بچوں میں سے صرف تقریباً پانچواں حصہ زیر تعلیم ہیں۔ نویں اور دسویں ہائی جماعتیں کہلاتی ہیں۔ ان تک پہنچتے پہنچتے طلبہ کی تعداد بقدر نصف کے اور گھٹ جاتی ہے۔ یعنی ۱۴ تا ۱۷ برس کی عمر کے نوخیز نوجوانوں میں سے صرف دسواں حصہ مدرسوں میں ہیں۔

ثانوی تعلیم کی اصلاح کے لیے مدلیار کمیشن نے جو رپورٹ پیش کی تھی اس کی روشنی میں ہائی سکول اور کالج دونوں کی ہیئت اور نصاب تعلیم میں تبدیلی زیر عمل ہے۔ ہائی سکول کا نصاب دس کی بجائے گیارہ سالہ کیا جا رہا ہے۔ اب تک یہ نصاب دس سالہ رہا ہے۔ اب منصوبہ یہ ہے کہ انٹرمیڈیٹ کی جماعت سرے سے ختم کر دی جائے۔ اس کا ایک سال ثانوی مدرسے میں ملا دیا جائے اور ایک سال ڈگری کے نصاب میں۔ اس طرح ثانوی مدرسہ گیارہ سالہ بن جائے گا، اور ڈگری کا نصاب تین سالہ بعض نمونے کے گیارہ سالہ ثانوی مدرسے جاری بھی ہو گئے ہیں۔

لیکن ثانوی مدرسے کی اصلاح محض ایک سال کے اضافے تک محدود نہیں۔ مدلیار کمیشن نے سفارش کی ہے کہ ثانوی نصاب میں بنیادی تبدیلی کر کے اسے زندگی کے ساتھ ہم آہنگ کیا جائے۔ اس سفارش کے عملی جامہ پہن لینے سے ثانوی مدرسہ امریکی مدرسے کی طرح کثیر الاغراض تعلیمی ادارہ بن جائے گا۔ اس کے علمی مضامین بھی عملی قسم کے مضامین مثلاً خانہ داری۔ زراعت۔ تجارت۔ عملی فنو

اور ٹکنالوجی کے گرد منظم کئے جائیں گے۔ ثانوی درجے پر ابھی ٹیکنیکل اور فنی مدرسوں کو ترقی نہیں ملی۔

ثانوی تعلیم کی طرح اعلیٰ تعلیم کی اصلاح و توسیع بھی زیر عمل ہے۔ قومی تعلیمی کمیشن نے اعلیٰ تعلیم کے مسائل کا تجزیہ بھی بڑی قابلیت کے ساتھ کیا ہے۔ عام تعلیم، طب اور انجینئرنگ کے نصابوں کو وسیع تر کیا گیا ہے۔ ثانوی درجے سے اوپر فنی کالج اور پولی ٹکنیک بھی کھولے گئے ہیں۔ دیہاتی زندگی کی ترقی کے لیے دیہی انسٹی ٹیوٹ قائم کیے گئے ہیں، جن کا مقصد دیہی زندگی کے مسائل کو تعلیم کا مرکز بنانا ہے۔ اعلیٰ تعلیم میں سب سے زیادہ توجہ انجینئرنگ کو ملی ہے۔ اس کی وجہ ہندوستان کا قومی منصوبہ ہے، جس میں سب سے زیادہ زور بھاری صنعتوں کی تعمیر پر دیا گیا ہے۔

آزادی کی آمد کے ساتھ ہندوستان میں تعلیم کی مانگ یکدم تیزی سے بڑھی ہے اسے پورا کرنے کے لیے استادوں کی مانگ کا بڑھنا بھی قدرتی تھا۔ یہ مانگ پوری کرنے کے لیے جگہ جگہ ٹریننگ کالج قائم کیے گئے ہیں، جن میں تربیت پانے والوں کی تعداد سو کے لگ بھگ ہے۔ یہ چھوٹے چھوٹے تربیتی ادارے سینکڑوں کی تعداد کو پہنچتے ہیں اور ملک بھر میں بکھرے ہوئے ہیں۔ اس کے باوجود ابھی غیر تربیت یافتہ استادوں کی تعداد بڑی کافی ہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ استادوں کی تنخواہیں بہت کم ہیں۔ اس لیے پڑھے لکھے نوجوان عام بیکاری کے باوجود معلمی کے پیشے کی طرف مائل نہیں ہوتے۔

ہندوستان میں تعلیم بالغاں کو معاشرتی تعلیم کا نام دیا گیا ہے۔ اس کا مقصد محض خواندگی کی اشاعت کرنا نہیں، بلکہ بالغوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو بہتر بنانا ہے۔ معاشرتی تعلیم کے لیے اب تک تقریباً چالیس ہزار مرکز قائم ہو چکے ہیں۔

غرض ہندوستان اپنے تعلیمی نظام کو صدر جمہوریہ پیش بینی اور عزم کے ساتھ ترقی دے رہا ہے، اس سے مقصد یہ ہے کہ ایک مدت الحیات میں ساری قوم کو احترام نفس اور ذمہ داری کی ایک نئی سطح پر پہنچایا جائے۔ اس کوشش میں اب تک جو کامیابی ہوئی ہے وہ بڑی حوصلہ افزا ہے۔

(۳) نیپال

نیپال کا پہاڑی ملک دنیا کے سب سے اونچے پہاڑی سلسلے ہمالیہ کی کمر پر واقع ہے۔ یہ مغرب میں کشمیر کی سرحد سے چل کر پانچ سو میل تک پھیلتا ہوا تقریباً مشرقی پاکستان سے جا ملتا ہے۔ اس کی چوڑائی کوئی سو میل کے لگ بھگ ہے۔ اور دشوار گذار برفانی چوٹیوں اور ناقابل گذر گھاٹیوں سے بھرے ہوئے یہ سو میل ہندوستان کو تبت سے الگ کرتے ہیں۔ تبت پر چینی قبضے کے بعد سے نیپال کی اہمیت اور بڑھ گئی ہے۔ کیونکہ اشتراکیت اور ہندوستان کے درمیان اب تبت کی چھوٹی سی پہاڑی سلطنت کے علاوہ اور کوئی شے حائل نہیں۔

جغرافیائی حالات نے نیپال کو باقی دنیا سے اور اس کے اکثر اندرونی حصوں کو ایک دوسرے سے الگ کر رکھا ہے۔ آج بھی کیفیت یہ ہے کہ ملک کے بعض اندرونی حصے مقامًا کھٹمنڈو سے ۷۰ سے ۲۰ دن کی مسافت پر واقع ہیں۔ یہ صورت حال ملک کی ترقی کی راہ میں بڑی طرح حائل ہے۔ اسی چیز نے ملک کو مدتوں اندرونی وحدت سے محروم کیے رکھا۔ نیپال سب سے پہلے اٹھارہویں صدی عیسوی میں تھوڑی بہت اندرونی وحدت نصیب ہوسکی تھی سنہ ۱۸۴۷ء سے سنہ ۱۹۵۱ء تک نیپال پر رانا خاندان کے وزرائے اعظم کی حکومت رہی وزیراعظم کی گدی اسی خاندان کے لیے مخصوص تھی۔ اور وزیراعظم ہی ملک کے سیاہ و سفید کا مالک ہوتا تھا۔ بادشاہ محض نام کو تھا۔ حکومتی کاروبار میں اسے کچھ دخل حاصل نہ تھا۔ رانا خاندان کی اپنی مصلحت اس بات میں تھی کہ نیپال میں غیر ملکی اثرات داخل نہ ہونے پائیں تاکہ ان کا اپنا اقتدار متزلزل نہ ہونے پائے۔ الگ تھلگ رہنے کی اس حکمت عملی نے نیپال کو اندرونی امن و سلامتی عطا ضرور کی۔ مگر اس کی بدولت ملک پر تقریباً ہر قسم کی ترقی کے دروازے بند رہے۔ تاہم دوسری عالمی جنگ کے بعد بیرونی اثرات کا راستہ بند کرنا ممکن نہ رہا۔ ہندوستان انگریزی جوا اتار چکا تھا۔ ہزاروں بہادر گورکھے سپاہی لڑائی کے مختلف محاذوں پر داد شجاعت دے کر گھر واپس آئے تھے۔ ادھر تبت کا ہمسایہ ملک اشتراکی لپیٹ میں آرہا تھا۔ ان تمام باتوں نے مل ملا کر سنہ ۱۹۵۰ء کا وہ انقلاب پیدا کیا جس نے رانا خاندان

کے اقتدار کا خاتمہ کر دیا۔ اس وقت سے نیپال میں بادشاہ اور اس کے حامی ایک جمہوری نظام حکومت رائج کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

جدید نظام تعلیم کا اجراء | ۱۹۵۱ء کے انقلاب سے پہلے نیپال میں تعلیمی سہولتیں تقریباً سرے سے ناپید تھیں۔ سارے ملک میں صرف چھ ہائی سکول تھے جن میں چار کھٹمنڈو کی مرکزی وادی میں واقع تھے۔ صرف کھٹمنڈو میں ایک چھوٹا سا کالج قائم تھا۔ سارے ملک میں کل ۱۰۰ کے قریب پرائمری سکول تھے۔ مگر ان میں سے اکثر محض برائے نام تھے۔ نیپال کی حکومت تعلیم پھیلانے کے حق میں نہ تھی۔ بلکہ وہ اعلیٰ سرکاری ملازموں کے بچوں کے علاوہ دوسرے بچوں کو تعلیم حاصل کرنے سے روکتی تھی۔ مگر حکومت کی یہ چال لوگوں کے دلوں سے علم کی پیاس مٹا نہ سکی۔ انقلاب کے بعد جب نئی حکومت نے عوام پر تعلیم کے دروازے کھولے تو ملک میں یکدم مدرسوں اور دوسرے تعلیمی اداروں کا ایک جال پھیل گیا۔ ۱۹۵۴ء تک ملک میں ۱۲۰۰ پرائمری سکول ۸۳ ہائی سکول اور ۱۴ نئے کالج کھل چکے تھے۔ یہ تعلیمی ادارے تقریباً کلی طور پر لوگوں کی اپنی کوشش اور ہمت کا نتیجہ تھے۔ انھیں نہ حکومت کی طرف سے کوئی قابل ذکر مالی مدد دی گئی تھی اور نہ ان کی نگرانی اور رہنمائی کے لیے کوئی پیشہ ور تعلیمی رہنما موجود تھے۔

نیا تعلیمی منصوبہ | یہ تعلیم کی خودرو نشوونما تھی۔ ۱۹۵۴ء میں حکومت نے ۴۶ آدمیوں پر مشتمل ایک تعلیمی کمیشن مقرر کیا جس نے پورے ایک سال کی چھان بین کے بعد ملک کی تعلیمی ترقی کے لیے ایک جامع منصوبہ پیش کیا۔ یہ منصوبہ چار اہم مقاصد پر مشتمل ہے:-

(۱) پچیس سال کے اندر اندر پانچ سالہ ابتدائی تعلیم ہر ایک کے لیے لازمی اور مفت کر دی جائے۔

(۲) دس سال کے اندر اندر ملک کے ۳۲ اضلاع میں سے ہر ضلع میں کم از کم ایک ہائی سکول قائم کر دیا جائے۔ یہ ہائی سکول اس قابل ہوں کہ ملک کے ۱۰ فی صد بچوں کو کثیر الاغراض قسم کی ثانوی تعلیم مہیا کر سکیں۔

(۳) پانچ سال کے اندر اندر ایک اقامتی قومی یونیورسٹی قائم کر دی جائے۔ دس سال کے اندر

یونیورسٹی اس قابل ہو جائے کہ ملک کے پانچ فی صد نوجوانوں کو کسی نہ کسی قسم کی اعلیٰ تعلیم دے سکے

(۴) پندرہ سال کے اندر اندر ہر اس بالغ کو تعلیمی سہولتیں مہیا کر دی جائیں جو تعلیم حاصل کرنا چاہتا ہو۔

پرائمری مدرسے لڑکوں اور لڑکیوں کو مخلوط تعلیم دیں گے۔ اس تعلیم کا مقصد کارآمد قسم کی خواندگی سکھانا، شہری شعور پیدا کرنا، اور فنی تعلیم حاصل کرنے کی استعداد بیدار کرنا ہوگا۔ کافی عرصے تک بیشتر نیپالی بچوں کے لیے ابتدائی مدرسہ ہی تعلیم کی آخری منزل رہے گا۔ ابتدائی مدرسے کا نصاب پورے طور پر نیپالی زندگی کے گرد گھومتا ہے۔ اس کے مرکزی مباحث سہ گانہ ہیں :-

(۱) ہم اپنے لیے خوراک کیوں کر حاصل کرتے ہیں۔

(۲) ہم تن ڈھانپنے کے لیے کپڑے کس طرح مہیا کرتے ہیں

(۳) ہر موسم کی شدت سے بچنے کے لیے مکانات کس طرح تیار کرتے ہیں؟

ان تین بنیادی مباحث کے ضمن میں مادری زبان کی نوشت وخواند، گنتی اور حساب، کتاب اور عام کاروبار کی مہارتیں سکھائی جاتی ہیں۔ نصاب اس طرح مرتب کیا گیا ہے کہ بچے گردوپیش کی زندگی سے شروع کرتے ہیں۔ مثلاً اگر مدرسہ کسی پہاڑی کے دامن میں واقع ہے تو بچے پہاڑی زندگی کا مطالعہ شروع کریں گے۔ اس ابتدائی نقطے سے بڑھتے بڑھتے وہ ملک کے دوسرے حصوں کی زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں۔ پھر اپنے براعظم کی زندگی کا حال معلوم کرتے ہیں اور بالآخر دنیا کی زندگی کا۔ مقامی زندگی کا مطالعہ کرتے ہی، سائنس، حفظان صحت۔ صفائی، اور قومی ثقافت یعنی قومی گیتوں۔ ناچوں مقامی قصوں، کہانیوں، علم ادب، آرٹ وغیرہ سے واقفیت حاصل کرتے ہیں

پانچ سالہ پرائمری مدرسے سے آگے پانچ سالہ ثانوی مدرسہ ہے۔ ثانوی تعلیم کے متعلق یہ اصول تسلیم کر لیا گیا ہے کہ یہ کثیر الاغراض قسم کی ہو گی، تاکہ یہ نوجوانوں کو زندگی کی ان ضرورتوں کے لیے تیار کرے جن کا انھیں آگے چل کر سامنا ہوگا۔ یہ غایت پوری کرنے کے لیے خانہ داری اور زراعت تمام ثانوی مدرسوں کے نصاب کے اہم ستون ہوں گے۔ تاہم کھٹمنڈو اور چند دوسرے شہروں میں ثانوی نصاب میں صنعتی اور کاروباری مضامین بھی پیش کیے جائیں گے۔ بعض ثانوی مدرسے استادوں

کے لیے تربیتی نصاب بھی پیش کریں گے۔ تاکہ اساتذہ کی بہم رسانی ان کی مانگ کا ساتھ دے سکے۔
غرض ثانوی تعلیم کالج کی تیاری نہیں بلکہ مقامی زندگی کے لیے تیاری کرائے گی۔ تاہم ثانوی مدرسے سے فارغ ہونے والے لڑکے اور لڑکیاں اپنے اپنے دائرہ عمل میں مؤثر اور مفید زندگیاں گزاریں۔ تاہم کالج کی ضروریات کو بالکل نظر انداز نہیں کیا گیا۔ ہائی سکول میں انگریزی ایک اختیاری مضمون کے طور پر رکھی گئی ہے۔ تاکہ جو طلبہ آگے اعلیٰ تعلیم جاری رکھنا چاہیں وہ انگریزی لے لیں۔

میٹرک امتحان کا خاتمہ | نیپالی تعلیم کمیشن نے جس حقیقت پسندی سے کام لیا ہے اس کا ثبوت نہ صرف انگریزی کو اختیاری مضمون بنا دینا ہے، بلکہ اس اصلاح کے ساتھ ہی اس نے نظام امتحان میں اصلاح کا مشورہ بھی دیا ہے۔ تجویز یہ ہے کہ ثانوی تعلیم کے خاتمے پر ہر مدرسہ اپنے طلبہ اور طالبات کی کارکردگی کا جائزہ خود لے۔ اس منزل کی طرف پہلا قدم یہ ہوگا کہ جو طلبہ کالج میں تعلیم جاری رکھنا چاہیں یونیورسٹی ان کے لیے داخلے کا امتحان جاری کرے۔ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا حق صرف ان طلبہ کو ہو جو اس امتحان میں کامیاب ہوں۔

استاد کا مقام | نیپال کے کئی حصوں میں موسم خاصا معتدل رہتا ہے۔ اس لیے ابتدائی مدرسے کی عمارت کے لیے کوئی لمبا چوڑا اہتمام نہیں کرنا پڑتا۔ کئی ابتدائی مدرسے مندر کی سیڑھیوں پر پیپل کے سائے تلے جماعتیں لگائے نظر آتے ہیں۔ ثانوی مدرسے عموماً بانس کے چھپروں سے کام چلا لیتے ہیں۔ جس جگہ کے لوگ اپنے لیے زیادہ ممتاز مقام حاصل کرنا چاہتے ہوں وہ مدرسے کے لیے پتھروں کی عمارت تعمیر کر لیتے ہیں۔

نیپال کے تمام حصوں میں استاد کو ایک سا مقام حاصل نہیں۔ بعض دور افتادہ علاقوں میں استاد پڑھانے کے علاوہ علاج معالجہ، منشی گری اور ہر قسم کے مشیر کا کام بھی کرتا ہے۔ اس لیے مقامی آبادی میں استاد بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ بعض اور مقامات میں استاد کو اس قسم کا کوئی خصوصی رسوخ حاصل نہیں لیکن ہر صورت میں استاد کی تنخواہ بہت کم ہے۔ ایک غیر تربیت یافتہ استاد کو ایک عام مزدور کے برابر بلکہ اس سے بھی کم تنخواہ ملتی ہے۔ تربیت یافتہ استاد کو اس سے دوگنا تنخواہ مل جاتی ہے۔ ثانوی مدرسے کے استادوں کو

اسی قابلیت کے سرکاری کلرکوں کے برابر تنخواہ ملتی ہے۔ ان حالات کا نتیجہ یہ ہے کہ عام استاد اپنی آمدنی بڑھانے کے لیے دوسرے کام کرتے ہیں۔ زیادہ استاد پرائیویٹ ٹیوشن کرتے ہیں جس سے ان کی آمدنی دو سے تین گنا تک ہو جاتی ہے۔

تعلیم اور مقامی ذمہ داری | نیپال میں تعلیمی اخراجات، انتظام اور نگرانی کی ذمہ داری مرکزی حکومت، علاقائی حکومت اور مقامی آبادی کے درمیان تقسیم ہے۔ انقلاب کے بعد تعلیم کی نشر و اشاعت کا آغاز مقامی لوگوں کی اپنی ہمت اور کوششوں سے ہوا تھا۔ بعد میں مرکزی حکومت نے بھی مدرسوں کو زر امداد دینا شروع کر دیا تعلیمی نظم و نسق کے لیے ملک کو سات حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ہر حصے میں ایک انسپکٹر مدارس کی نگرانی میں ہے۔ اس کے ماتحت نائب انسپکٹر کام کرتے ہیں۔ تعلیم کی مالی ذمہ داری کے متعلق اب یہ اصول طے کیا گیا ہے کہ ابتدائی تعلیم کے اخراجات خود مقامی آبادی ادا کرے ثانوی تعلیم کے اخراجات مقامی آبادی اور حکومت مل کر مہیا کریں۔ اور اعلیٰ تعلیم کے اخراجات پورے طور پر حکومت کے کندھوں پر ہوں۔ اسی طرح مدرسوں کی نگرانی اور رہنمائی کے لیے گو سرکاری انسپکٹر مقرر ہیں، علاقائی بنیادوں پر ہر تعلیمی ضلع میں ایک سکول بورڈ بھی قائم ہے۔ تاکہ عوام بھی مدرسوں کی تعلیمی پالیسی مرتب کرنے میں حصہ لیں۔ گویا مالی اور انتظامی ہر دو لحاظ سے نیپال کے مدرسے عوام اور حکومت کی مشترکہ ذمہ داری ہیں۔

حرف آخر | پچھلے آٹھ برس میں تعلیم نے نیپال میں جو ترقی کی ہے وہ حیرت انگیز بھی ہے اور قابل تعریف بھی سنہ ۱۹۵۱ء تک ملک میں منظم تعلیم کا نام و نشان نہ تھا۔ آج نہ صرف ہر قسم کے تعلیمی ادارے قومی ضرورتیں پوری کر رہے ہیں، بلکہ ملک کے سامنے ایک جامع تعلیمی منصوبہ ہے جسے ملکی رہنماؤں اور غیر ملکی تعلیمی ماہروں نے بڑی سوچ بچار کے بعد تیار کیا ہے۔ اس منصوبے کا امتیازی نشان اس کی حقیقت پسندی اور لچک ہے فرسودہ روایات کو مطلق یہ اجازت نہیں دی گئی کہ ملک کی تعمیر نو کا راستہ روکیں۔ نیا تعلیمی منصوبہ اس بات کا اہتمام کرتا ہے کہ جدید دور کی ضرورتیں ملکی ثقافت اور قومی روایات کے پس منظر میں پوری ہوں تاکہ نیپال موجودہ سائنسی دور میں اپنی مخصوص ثقافتی روح کو قوت اور تر و تازگی بخش سکے۔ یہ تعلیمی منصوبہ اس یقین کا نتیجہ ہے کہ جمہوری طرز زندگی متوازن قومی ترقی کے لیے بہترین شاہراہ ہے اور تعلیمی ترقی اس شاہراہ پر پہلا قدم ہے۔ (باقی آئندہ)

برطانیہ کا نظامِ تعلیم

(۳)

محمد عبدالعزیز

قومی نظامِ تعلیم

انیسویں صدی کے ربع ثانی میں تعلیم کو مفت، لازمی اور عالمگیر بنانے کی مہم کا آغاز ہوا لیکن نظامِ تعلیم کا جو ڈھانچہ ۱۸۷۰ء میں مرتب ہوا، اس سے تعلیمی یکسانیت نہ پیدا ہو سکی۔ مرکزی یا غیر مرکزی نظام، لازمی تعلیم، اسکول چھوڑنے کی عمر، کارخانہ داروں کا عدم تعاون، والدین کی معاشی بدحالی۔ انتظامی پیچیدگیاں یہ وہ مسائل تھے جن کا حل بظاہر اتنا مشکل نہ تھا۔ مرض معلوم ہو تو علاج میں آسانی ہو جاتی ہے۔ لیکن برطانیہ کو جو نظامِ تعلیم ورثے میں ملا تھا وہ جن سماجی اور معاشی تقاضوں کے تابع، ان میں تھوڑی بہت تبدیلیاں ہوتی رہیں، ان سے کسی ہمہ گیر فکری انقلاب کا نشان نہیں ملتا۔ اصلاح کی خواہش کے ساتھ ساتھ روایات سے وابستگی دراصل اس الجھاؤ کی سب سے بڑی وجہ تھی۔ یہ طے کرنا اتنا دشوار نہ تھا کہ ملک کی تعلیمی ضروریات کیا ہیں اور کس قسم کا نظامِ تعلیم ان ضروریات کو پورا کر سکتا ہے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے انگریز کے قومی شعور میں ایسی پختگی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ اس کی نگاہیں اپنے ان مسائل پر پھیلتی ہوئی محض اوپر کی سطح پر پڑتی رہیں، اور وہ ایک پختہ کار غواص کی طرح پانی کی تہ میں آب دار موتیوں کو نہ دیکھ سکیں۔

انیسویں صدی کے عشرِ آخر میں جو نظامِ تعلیم رائج تھا۔ نہ تو اسے مرکزی کہا جا سکتا ہے کہ مرکزی حکومت اس میں براہِ راست کوئی دخل نہیں دے سکتی تھی اور نہ اسے غیر مرکزی کہا جا سکتا ہے۔ اس لیے کہ اس وقت کوئی ایسی غیر مرکزی انتظامی کل صرف وجود میں نہیں آ سکی تھی جو اپنے حلقے میں تعلیم کے اہتمام و انصرام کی ذمہ دار ہوتی۔ اس نظامِ تعلیم کی تیسری خرابی انتظامی دو عملی تھی۔ بورڈ اسکول اور کلیسائی اسکول۔ بورڈ اسکول کی انتظامی اور مالی ذمہ داری اسکول بورڈ پر عاید ہوتی تھی۔ لیکن کلیسائی اسکول اپنے جملہ کاروبار میں خود مختار تھے۔ چوتھی خرابی یہ تھی کہ جن اسکولوں کے اوقاف سو پونڈ یا اس سے

زیادہ کے تھے۔ وہ بھی انتظامی امور میں خود مختار تھے۔ یا نچویں خرابی ایک ایسی انتظامی پیچیدگی تھی کہ اس سے روز مرہ کے کاروبار میں خلل پیدا ہو سکتا تھا۔ ابتدائی تعلیم کے اہتمام کی ذمہ داری اسکول کرڈ اور رضاکارانہ مدرسوں پر عاید ہوتی تھی اور دونوں براہ راست یا بالواسطہ محکمۂ تعلیم کی نگرانی میں کام کر رہے تھے لیکن اس کا ایک اور پیچیدہ اور الجھا ہوا پہلو یہ تھا کہ ہائی اسکول (ثانوی مدارس) ویسے تو محکمۂ تعلیم ہی کے ماتحت تھے لیکن ان کی کفالت کی ذمہ داری محکمۂ سائنس اور آرٹس کی تھی اس طرح مجموعی طور پر انتظامی اعتبار سے ۲۵۶۸ اسکول بورڈ ۸۳۲۳ دوسری تعلیمی ایجنسیاں مصروف کار تھیں جن کا ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اس سے قطع نظر ابتدائی تعلیم کا ثانوی سے کوئی تعلق نہ تھا اور ثانوی مدارس کے نصاب میں صنعتی اور پیشہ ورانہ تعلیم کا کوئی اہتمام نہ تھا۔

ان حالات کے پیش نظر حکومت کے ارباب اختیار نے ۱۸۹۴ء میں لارڈ برائس کی سرکردگی میں ایک شاہی تعلیمی کمیشن کے تقرر کا اعلان کیا۔ اس کمیشن کے تقرر کا مقصد انگلستان میں ایک عمدہ اور منظم ثانوی تعلیم کے قیام کا جائزہ لینا تھا۔ یہ کام برطانیہ کے الجھے ہوئے نظام تعلیم کے پیش نظر اتنا آسان نہ تھا۔ ابتدائی ثانوی اور صنعتی تعلیم کو ایک رشتے میں کس طرح منسلک کیا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے کمیشن نے کینیڈا، یو۔ ایس۔ اے اور یورپ کے دوسرے ملکوں کے نظام تعلیم کا مطالعہ کیا۔ اس سلسلے میں سر جے فیچ، پروفیسر فنڈلے اور سر مائیکل سیڈلر نے بالخصوص کمیشن کی امداد کی دوسرے ملکوں کے نظام تعلیم کے جائزے کے ساتھ ساتھ کمیشن نے انگلستان کے بعض علاقوں کی تعلیمی حالت کا بھی تجزیہ کیا۔ اس جائزے میں انھوں نے ڈیون شائر، لیڈز، بریڈ فورڈ، لیورپول اور مین چیسٹر کو شامل کیا، اس سے کمیشن کو اپنی موجودہ حالت کا بھی اندازہ ہو گیا۔ اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ دوسری قومیں ترقی کی کتنی منزلیں طے کر چکی ہیں۔ اور پھر یہ کہ ان حالات میں اصلاح کے لیے کون سا اقدام موزوں ہوگا کمیشن کی سفارشات یہ ہیں:۔

(۱) وزارت معارف کا قیام، ابتدائی ثانوی اور صنعتی تعلیم کی نگرانی ایک وزیر کے سپرد ہو، جو پارلیمان کو جواب دہ ہوگا۔ اور اس کا کام تعلیم کی عمومی پالیسی مرتب کرنا ہوگا۔

(۲) وزارت معارف کے لیے ایک مستقل سیکرٹری کا تقرر۔

(۳) بعض مخصوص پیشہ ورانہ مسائل ایسے ہیں کہ اس میں ماہرین کا مشورہ ضروری ہوتا ہے۔ اس لیے ایک تعلیمی مجلس مشاورت قائم کی جائے گی جو وزیر معارف کو وقتاً فوقتاً مشورہ دیتی رہے گی۔ یہ مجلس مشاورت بارہ اراکین پر مشتمل ہوگی جن میں سے ایک تہائی کا انتخاب آکسفورڈ، کیمرج، لندن اور وکٹوریہ یونیورسٹی کریں گی۔ ایک تہائی کا تقرر بادشاہ خود کرے گا، اور ایک تہائی کا انتخاب کونسل کے اراکین کریں گے۔

(۴) وزارت معارف یا مرکزی تعلیمی حکومت کا مدعا سارا علمی مرکزیت نہ ہوگا۔ بلکہ اس کے قیام کا تمام مقصد نئے نئے تعلیمی تجربوں کے مواقع فراہم کرنا ہوگا جس کا احاطہ کار وسیع اور لبرل ہوگا۔

(۵) تعلیم کا عمومی اہتمام مقامی تعلیمی حکومتوں کے ہاتھ میں ہوگا۔ ان مقامی تعلیمی حکومتوں کا انتخاب وہ کاؤنٹی کونسل یا برو کونسل کریں گی جن کی آبادی پچاس ہزار یا اس سے زیادہ ہوگی۔

(۶) ثانوی تعلیم اس وقت ایک بے معنی سی اصطلاح ہے، اس کی توضیح اور اس کے حدود کی تعیین ضروری ہے۔

(۷) صنعتی تعلیم ثانوی تعلیم ہی کا ایک حصہ ہو۔

حکومت نے ۱۸۹۶ء میں ایک تعلیمی بل پیش کیا۔ اس وقت سر جان گورسٹ نائب صدر اور سر کیکریج سکرٹری تھے۔ اس بل میں برائس کمیشن کی سفارشات کے پیش نظر کاؤنٹی یا کاؤنٹی برو کونسل کو مقامی تعلیمی حکومت بنانے کی سفارش کی گئی۔ لیکن مذہبی تعلیم کے متعلق جو دفعات شامل کی گئیں، ان سے یہ مفہوم نکلتا تھا کہ کوپر ٹمپل دفعہ کو منسوخ کر دیا جائے۔ اس سے ایک طوفان برپا ہو گیا۔ لبرل پارٹی اور نان کنفارمسٹ دونوں نے بل کی مخالفت کی۔ بالآخر ڈیوک آف ڈیوان شائر صدر محکمۂ تعلیم نے اس بل کو واپس لینے کا فیصلہ کر لیا۔ اس بل کے واپس لیے جانے کے بعد عمومی طور پر یہی خیال کیا جانے لگا کہ اب برائس کمیشن کی سفارشات پر دوبارہ غور و خوض نہیں ہو سکے گا۔ لیکن اگر اس پر دوبارہ غور و خوض ہوا تو اس کی وجہ سر رابرٹ مورانٹ کی انتھک کوشش تھی۔

رابرٹ مورانٹ

رابرٹ مورانٹ ۱۸۶۳ء میں ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوا۔ اس کے باپ کی خواہش اسے رگبی میں پڑھانے کی تھی۔ لیکن ابھی مورانٹ کی عمر دس سال ہی کی تھی کہ اس کے باپ کا انتقال ہوگیا۔ اب یہ ظاہر معلوم ہوتا تھا کہ اس کی تعلیم کا کوئی معقول انتظام نہیں ہو سکے گا۔ لیکن اس کی ذہانت اس کے کام آئی اور ون چیسٹر کے ہیڈ ماسٹر کے نامزد کی حیثیت سے وہ ون چیسٹر پبلک اسکول میں اور ۱۸۸۱ء میں نیو کالج آکسفورڈ میں داخل ہوا۔ اور دینیات میں ڈگری حاصل کی۔ آکسفورڈ کے دوران قیام میں اس کی مالی حالت اتنی سقیم تھی کہ اسے اپنی ضروریات پورا کرنے کے لیے کبھی کبھی کچھ کمانا بھی پڑتا تھا۔ ماں کی شدید بیماری نے آکسفورڈ چھڑوا دیا اور اپنی معاشی ضروریات کے پیش نظر اس نے کچھ دنوں تک ایک ابتدائی مدرسے میں کام کیا۔ ۱۸۸۶ء میں وہ سیامی سفیر متعینہ لندن کے بچوں کا اتالیق مقرر ہوا۔ اور ۱۸۸۸ء میں سیام کے ولی عہد کا اتالیق مقرر ہوا۔ ۱۸۹۲ء میں جب فرانس کی سیاسی فریب کاریاں ہند چینی سے بڑھ کر سیام کو بھی اپنے لپیٹ میں لینے کی کوششیں کرنے لگیں تو حکومت سیام نے بعض سیاسی مصالحہ کی بنا پر مورانٹ کو برخاست کر دیا۔

واپسی پر اسے محکمۂ تعلیم میں نائب ناظم تحقیقات اور رپورٹ مقرر کیا گیا۔ مورانٹ نے کراس اور برائس کمیشن کی رپورٹوں کا باقاعدہ مطالعہ کیا اور نہ صرف یہ کہ محکمے کے روزمرہ کے کاروبار سے واقفیت پیدا کی بلکہ ملک کی تعلیمی پس ماندگی کے پیش نظر اس کی بڑھتی ہوئی ضروریات کا بھی جائزہ لیا۔ اس نے ۱۸۹۶ء میں فرانس میں رہ کر فرانس کے نظام تعلیم کا مطالعہ کیا اور اس کی ایک مفصل رپورٹ مرتب کی جو ۱۸۹۷ء میں شائع ہوئی علہ

فرانس کے بعد مورانٹ نے سوئٹزرلینڈ کا دورہ کیا۔ سوئس نظام تعلیم میں کو جو مقامی آزادی حاصل تھی۔ اس نے اسے اس حد تک متاثر کیا کہ اس کے بعد اس کی تمام تر کوشش یہی رہی کہ انگلستان میں بھی اس قسم کی مقامی تعلیمی حکومتیں قائم کی جائیں۔

علہ SPECIAL REPORT AN EDUCATION SUBJECTS

کاکرٹن کا فیصلہ: مورانٹ ابھی اپنی انھیں کوششوں میں مصروف تھا کہ لندن اسکول بورڈ اور لندن ٹیکنیکل ایجوکیشن بورڈ کے مابین ثانوی تعلیم کے نظم و ضبط کے سلسلے میں ایک نزاعی صورت پیدا ہو گئی۔ ثانوی تعلیم کے انتظام کا اختیار کسے ہے۔ اسکول بورڈ کو یا ٹیکنیکل بورڈ کو اس کا فیصلہ اس لیے ضروری تھا کہ اسکول بورڈ نے لندن میں ابتدائی تعلیم کے اہتمام کے ساتھ ساتھ ثانوی تعلیم کو بھی اپنے احاطۂ اختیار میں لے لیا تھا۔ ٹیکنیکل بورڈ نے اسے اپنی حد و دمیں ڈاکا سمجھا۔ لندن کاؤنٹی کونسل نے ٹیکنیکل بورڈ کا ساتھ دیا اور ڈاکٹر گارنٹ (DR. GARNET) کو مقدمہ تیار کرنے کا اختیار دیا۔ مورانٹ نے گارنٹ کی امداد کی، اور اسے یہ سمجھایا کہ اسکول بورڈ مقامی محصول ثانوی تعلیم پر نہیں خرچ کر سکتا۔ سر جان گورسٹ نے ٹیکنیکل بورڈ کے حق میں فیصلہ دیا، اور گارنٹ کو اسکول بورڈ کے خلاف مقدمہ دائر کرنے پر اکسایا۔ گارنٹ نے محاسب سرکاری کاکرٹن سے رجوع کیا، اور اس نے اسکول بورڈ کے اس اقدام کو غیر قانونی قرار دے دیا۔ اسکول بورڈ نے عدالت میں اپیل کی۔ عدالت نے کاکرٹن کے فیصلے کو بحال رکھا۔

اس فیصلے سے ایک اور قانونی پیچیدگی پیدا ہو گئی۔ ایک لندن ہی کیا۔ مختلف اسکول بورڈ مقامی محصول ثانوی تعلیم کے انتظام پر خرچ کر رہے تھے۔ چناں چہ اس قانونی الجھاؤ سے بچنے کے لیے حکومت نے سنہ ۱۹۰۱ء میں اسکول بورڈ کو تا فیصلۂ ثانی، ثانوی تعلیم کے اہتمام کی اجازت دے دی۔

مارچ سنہ ۱۹۰۲ء میں حکومت نے ایک نیا تعلیمی بل پیش کیا۔ اس بل کی ترتیب و تدوین میں مورانٹ نے اس تن دہی اور تشفعت سے کام لیا کہ اس کی جدوجہد کی اعیان حکومت نے بھی تعریف کی۔ یہی بل سنہ ۱۹۰۲ء میں تھوڑی سی ترمیم و تنسیخ کے بعد قانون بن گیا، اور اگرچہ پارلیمانی بحث و تمحیص میں خاصی قطع و برید بھی ہوئی، لیکن بل کی اہم سفارشات اسی طرح قائم رہیں اور یہ مورانٹ کی بہت بڑی کامیابی تھی۔ اس سے نہ صرف یہ کہ تعلیمی الجھاؤ دور ہو گیا، بلکہ انگلستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ابتدائی، ثانوی، ٹیکنیکل اور اعلیٰ تعلیم کی حدود کی تعیین ہوئی۔

قانون تعلیم مجریہ ۱۹۰۲ء
اہم سفارشات

(۱) قانون تعلیم مجریہ ۱۹۰۲ء نے انتظامی الجھاؤ کو دور کیا اور ایک منظم ابتدائی، ثانوی اور ٹیکنیکل تعلیم کا اہتمام کیا۔

(۲) مقامی تعلیمی حکومت :- اس قانون کے مطابق اب تعلیم کے اہتمام کی تمام تر ذمہ داری مقامی حکومتوں پر عاید ہوگی۔ اسکول بورڈ اور حاضری کمیٹی کی بجائے اب کاؤنٹی اور بورو کونسل ہی جملہ تعلیمی انتظام کی ضامن ہوں گی۔

اس نئی تنظیم کی رو سے اب ڈھائی ہزار اسکول بورڈ اور آٹھ سو حاضری کمیٹی کی بجائے تین سو نئی تعلیمی حکومتیں معرض وجود میں آئیں۔

(۳) ہر مقامی تعلیمی حکومت کو یہ حق ہوگا کہ مقامی انتظامی امور کی دیکھ بھال کے لیے ایک مقامی تعلیمی کونسل کی تشکیل کرے۔ اس کونسل کو مقامی محصول لگانے یا قرض لینے کے علاوہ ہر قسم کے انتظامی حقوق ہوں گے۔

(۴) اس تعلیمی کونسل کے اراکین مقامی کونسل کے ممبر ہوں گے جنھیں مقامی کونسل خود مقرر کرے گی لیکن تعلیمی ضروریات کے پیش نظر وہ ایسے ماہرین کو بھی اس تعلیمی کونسل کا رکن مقرر کر سکتی ہے۔ جو اگرچہ کونسل کے ممبر نہیں ہیں مگر ان کی رائے سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے (اس طرح مدرسین بھی تعلیمی کونسل کے ممبر بن گئے)

(۵) مدرسوں کی حدود کا تعین :- اس قانون کے مطابق اسکول دو قسم کے ہوں گے۔ ایک PROVIDED اور دوسرے NON-PROVIDED اول الذکر سے مراد وہ اسکول ہیں جو براہ راست مقامی تعلیمی حکومت کے تابع ہوں گے۔ اور جن کی عمارتیں بھی مقامی تعلیمی حکومت ہی مہیا کرے گی۔ موخر الذکر سے مراد وہ اسکول ہیں جو تعلیمی اور بعض انتظامی معاملات میں مقامی تعلیمی حکومت کے ماتحت ہوں گے۔ لیکن ان کی عمارتیں فراہم کرنے کا کام مختلف انجمنوں کا ہوگا۔ کلیسائی اسکولوں کے سلسلے میں یہی کام کلیسائی انجمنوں کے سپرد ہوگا۔

(الف) PROVIDED SCHOOL

(۱) ان اسکولوں میں دینی تعلیم کوپرٹیپل دفعہ کے مطابق ہو گی۔

(۲) کسی ایک فرقے کو دوسرے فرقے پر ترجیح نہیں دی جائے گی۔ اور والدین کی درخواست پر طلبہ کو اسکول، کالج یا ہوسٹل میں کوئی دینی تعلیم دی جاسکتی ہے۔

(ب) NON PROVIDED SCHOOL

(۱) جہاں تک غیر دینی تعلیم کا تعلق ہے اسکولوں کے منیجر بہرصورت مقامی تعلیمی حکومت کی متابعت کریں گے۔

(۲) دینی تعلیم کوپرٹیپل دفعہ کے مطابق ہو گی۔

(۳) اساتذہ کی تعداد اور ان کی تعلیمی استعداد کے متعلق مقامی تعلیمی حکومت خود فیصلہ کرے گی۔

قانونِ تعلیم مجریہ سنہ ۱۹۰۲ء کا جائزہ

انگلستان کے دوسرے تعلیمی قوانین کی طرح قانونِ تعلیم مجریہ سنہ ۱۹۰۲ء میں بھی مختلف الخیال گروہوں کے درمیان مصالحت کی کوشش کی گئی۔ اگرچہ اس قانون کے مطابق مقامی تعلیمی حکومتوں کا قیام عمل میں آیا۔ اور ابتدائی اور ثانوی تعلیم کی حدود متعین کردی گئیں۔ لیکن اس کے باوصف بعض انتظامی معاملات میں ابھی کوئی ترقی پسندانہ اقدام ممکن نہ ہوا۔ کلیسائی مدرسوں کو ملک کے تعلیمی نظام میں ایک مستقل جگہ مل گئی۔ اس سے ایک فائدہ یہ ضرور ہوا کہ ملک کے مختلف حصوں میں بے شمار ثانوی مدارس کھل گئے، اور ان ثانوی مدارس کے ساتھ ہی ساتھ اساتذہ کے تربیتی دارالعلوم کی بھی ازسرِنو تنظیم کی گئی۔ اس قانون کے مطابق مقامی تعلیمی حکومت ثانوی اور ٹیکنیکل تعلیم کے علاوہ اساتذہ کی تربیت کا بھی اہتمام کرسکتی تھی۔

قانونِ تعلیم مجریہ سنہ ۱۹۰۲ء نے انگلستان میں ایک غیر مرکزی نظامِ تعلیم کو اتنا مستحکم بنادیا کہ اس کے بعد جو کوششیں ہوئیں، ان کی حیثیت محض اصلاحی رہی، وہ اس میں کوئی بنیادی تبدیلی پیدا نہ کرسکیں۔ اس غیر مرکزی نظام سے تعلیم کو عمومی طور پر یہ فائدہ پہنچا کہ ہر مقامی تعلیمی حکومت اپنے علاقے میں نئے تعلیمی تجربات کرسکتی ہے اور ان تجربوں سے دوسرے بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ یہ آزادی کارکنوں کو تجربات کا خوگر بناسکتی ہے جس سے عملِ تعلیم میں ایک خاص قسم کا رچاؤ پیدا ہوسکتا ہے، اور حق یہ ہے کہ یہ آزادی کار

اور تجربات کی یہ ندرت کسی مرکزی نظامِ تعلیم میں ممکن نہیں۔ اس قانون کے نفاذ سے ایک دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ انیسویں صدی میں ثانوی تعلیم محض ایک طبقے کی اجارہ داری تھی۔ ان سے کمتر درجے کے لوگ ثانوی تعلیم کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتے تھے لیکن ثانوی تعلیم کے اس طرح مقامی تعلیمی حکومت کے زیر اہتمام آجانے سے مفلس اور نادار طلبہ کو بھی آگے بڑھنے کا موقع ملا۔ گویا ایک قومی نظامِ تعلیم کے اہتمام کے سلسلے میں یہ بہت بڑا قدم تھا۔

اس قانون کی بعض حلقوں میں مخالفت بھی ہوئی ۔ لبرل پارٹی کو بالخصوص اس کی بعض دفعات سے اتفاق نہ تھا۔ نان کن فارمسٹ نے مقامی محصول کی ادائیگی سے انکار کیا تو حکومت نے ان کے خلاف چارہ جوئی کی۔ لیکن اس کے باوجود قانون کی مخالفت ہوتی رہی۔ سنہ ۱۹۰۶ء میں لبرل پارٹی پھر برسرِ اقتدار آئی۔ اور انھوں نے اس قانون کی تنسیخ کا عزم کیا۔ نئی حکومت میں محکمۂ تعلیم کی صدارت بیریل (BIRRELL) کے سپرد ہوئی۔ نان کن فارمسٹ کو خوش کرنے کے لیے اس نے ایک بل پیش کیا۔ لیکن دارالامرا میں اتنی ترمیمیں پیش کی گئیں کہ حکومت نے اس بل پر مزید اقدام مناسب نہ سمجھا سنہ ۱۹۰۸ء میں ایک کوشش اور ہوئی لیکن حکومت کو اس میں بھی ناکامی ہوئی۔ اس کے بعد قانونِ تعلیم مجریہ سنہ ۱۹۰۲ء کو مسترد کرنے کی کوئی اور کوشش نہیں ہوئی۔

ثانوی تعلیم کے قوانین سنہ ۱۹۰۲ء

قانونِ تعلیم سنہ ۱۹۰۲ء میں ثانوی تعلیم، اس تعلیم کو قرار دیا گیا تھا جو ابتدائی نہ ہو۔ لیکن بعد میں اس کے حدود کی تعیین کی کوشش کی گئی۔ اس طرح اب ثانوی تعلیم سے مراد ایسی تعلیم ہے جو اقامتی یا غیر اقامتی اداروں میں سولہ سال کی عمر یا اس سے زیادہ عمر تک دی جائے۔ یہ تعلیم عمومی ہوگی لیکن نصاب میں بچوں کی جسمانی، ذہنی اور اخلاقی اصلاح پر بالخصوص زور دیا جائے گا۔ یہ نصاب ابتدائی مدارس کے نصاب سے مختلف ہوگا۔

ثانوی مدارس کا نصاب چار سال کا ہوگا۔ ان میں سے بعض مضامین جن کا نصاب چار سال کا ہوگا یہ ہیں :-

(۱) انگریزی زبان اور ادب - جغرافیہ اور تاریخ۔
(۲) کم از کم ایک دوسری زبان
(۳) ریاضی، سائنس (نظری اور عملی)
(۴) ڈرائنگ۔

رفاہی خدمات

(ا) ۱۹۰۶ء میں حکومت نے رفاہی خدمت کا آغاز کیا اور اس سال کھانے کی فراہمی کا قانون پاس کیا۔

اس قانون کی اہم دفعات یہ ہیں۔

(۱) ان بچوں کے خورد نوش کا انتظام کرنا جو محض خوراک کی کمی کی وجہ سے حصول تعلیم سے معذور ہیں۔
(۲) اگر والدین صاحب استطاعت ہیں تو ان سے ایک معمولی سی رقم وصول کی جائے گی۔
(۳) مقامی تعلیمی حکومت اس کے لیے نصف پنس فی پونڈ محصول لگا سکتی ہے۔

(ب) طبی امداد۔

۱۹۰۷ء میں پہلی مرتبہ یہ اصول تسلیم کیا گیا کہ بچوں کا طبی معائنہ کیا جائے اور اگر وہ بیمار ہیں تو انہیں اس کے علاج کا مشورہ دیا جائے۔

(ج) قانون بچگان

۱۹۰۸ء میں قانون بچگان منظور ہوا۔ اس قانون کا مقصد امتناع تشدد، تمباکو نوشی کا بند کرنا اصلاحی مدرسے کھولنا، صنعتی مدارس اور بچوں کی عدالت کا قیام تھا۔

اس قسم کی اصلاحی کوششوں کا سلسلہ جاری تھا اور حکومت بقدر استطاعت بچوں کی فلاح و بہبود کی کوشش کرتی رہی، لیکن ۱۹۱۴ء میں عالمگیر لڑائی کا آغاز ہوا تو قومی تعمیری کاموں کا سلسلہ بھی منقطع ہو گیا اور کچھ دنوں کے لیے تعطل کی سی فضا قائم رہی۔ ۱۹۱۷ء میں اتحادیوں کو جنگ میں کامیاب ہونے کی توقع ہو چلی تو اس سال برطانیہ میں وزارت تعمیر کی تشکیل ہوئی۔ یہ دراصل مابعد جنگ کی تعمیری منصوبہ بندی کا پہلا قدم تھا۔ اس تعمیری منصوبہ بندی میں تعلیم کو بالخصوص بڑی اہمیت دی گئی۔ فشر کو بورڈ آف ایجوکیشن کا

صدر مقرر کیا گیا۔ چناں چہ اسی کی کوششوں سے قانونِ تعلیم مجریہ ۱۹۱۸ء منظور ہوا۔ اس کی اہم دفعات یہ ہیں۔

(۱) ایک قومی نظامِ تعلیم کا قیام جس سے ہر وہ شخص فائدہ اٹھا سکے جو اس کا اہل ہے۔

(۲) مقامی تعلیمی حکومتوں کا کام تعلیم کا اہتمام کرنا ہوگا۔

(۳) مدرسہ چھوڑنے کی عمر۔

(ا) کوئی طالب علم چودہ سال کی عمر سے پہلے مدرسہ نہیں چھوڑ سکتا۔

(ب) مقامی تعلیمی حکومتیں مدرسہ چھوڑنے کی عمر پندرہ سال مقرر کرسکتی ہیں۔

(ج) نصف وقت کی تدریس منسوخ کردی جائے گی۔

(د) مدرسۂ جاریہ ۔ جو طلبہ چودہ سال کی عمر میں مدرسہ چھوڑ دیں گے انھیں ۱۸ سال کی عمر تک ہر سال ۳۲۰ پیریڈ اسکول میں صرف کرنے ہوں گے۔

(۴) ابتدائی مدارس میں فیس ختم کردی گئی۔

(۵) مدرسہ جانے والی عمر کا کوئی بچہ کارخانوں، کانوں، یا پھیری والی تجارتوں میں ملازم نہیں رکھا جائے گا۔

(۶) مفلس اور نادار طلبہ کو زرِ امداد دیا جائے گا۔ (MAINTENANCE GRANT)

(۷) انتظامی دوعملی بدستور قائم رہی۔

(۸) مقامی تعلیمی حکومتیں ہر نجی ادارے کا معائنہ کریں گی۔

(۹) نصف تعلیمی اخراجات کی کفالت کی حکومت اور نصف کی مقامی تعلیمی حکومتیں ذمہ دار ہوں گی۔

قانونِ تعلیم مجریہ ۱۹۱۸ء کا نفاذ ابھی مکمل طور پر نہیں ہونے پایا تھا کہ ملک ایک اقتصادی بحران میں پھنس گیا۔ اس کی وجہ سے بعض نئے منصوبوں کو ملتوی کرنا پڑا۔ اس اقتصادی بحران کو رد کرنے کے لیے حکومت نے مسٹر گیڈس کی سرکردگی میں ایک کمیٹی مقرر کی۔ اس کمیٹی نے مختلف منصوبوں کو منسوخ کردیا بعض میں ترمیم کردی اور بعض کو کچھ دنوں کے لیے ملتوی کردیا۔

ہیڈو کی تنظیم نو

ہیڈو کی تنظیم نو

۱۹۲۴ء میں لیبر پارٹی پہلی مرتبہ برسرِ اقتدار آئی۔ اس کی حکومت کا یہ زمانہ اگرچہ بہت ہی مختصر تھا۔ لیکن اس مختصر سی مدت میں حکومت نے تعلیمی اصلاحات کی پوری پوری کوشش کی۔ ڈاکٹر ٹانی (TAWNEY) نے لیبر پارٹی کا منشورِ تعلیم تیار کیا۔ اس منشور کا مدعا ثانوی تعلیم کو عام کرنا تھا۔ بقول ڈاکٹر ٹانی

> لیبر پارٹی کو یہ تسلیم ہے کہ ایک جمہوری قوم کے لیے وہی تعلیمی پالیسی مفید اور تعلیمی لحاظ سے مناسب ہوگی جس میں ابتدائی اور ثانوی تعلیم کا انتظام اس نہج پر کیا جائے کہ دونوں ایک مسلسل عمل کے دو علاحدہ علاحدہ درجے ہوں۔ ثانوی تعلیم کا مقصد بالغوں کی تعلیم اور ابتدائی تعلیم کا مقصد اس کی تیاری۔

یہ نظریہ رفتہ رفتہ اس قدر عام ہوا کہ سرکاری حلقے میں بھی اس کے مؤید پیدا ہو گئے۔ ابتدائی ثانوی اور نجی مدرسوں میں جو عدم مطابقت تھی، اسے اب شدت سے محسوس کیا جا رہا تھا۔ جب تک تعلیم کے مختلف مدارج میں ہم آہنگی پیدا نہ ہو۔ اس وقت تک تعلیم و تربیت کا صحیح قومی نظام قائم کرنا مشکل ہے چنانچہ اس خامی کو دور کرنے کے لیے حکومت نے ۱۹۲۴ء میں ڈبلیو۔ ایچ۔ ہیڈو کی سرکردگی میں ایک تعلیمی مشاورتی کمیٹی مقرر ہوئی۔ اس کمیٹی کی تشکیل کا مدعا ان طلبہ کے لیے جو پندرہ سال کی عمر تک اسکولوں میں زیرِ تعلیم رہیں گے ایک ایسے نظام اور ایک ایسے تعلیمی مقصد اور نصاب کی ترتیب و تدوین تھا جو طلبہ کی اپنی ضروریات اور قومی تقاضوں کے مطابق ہو۔ اس کمیٹی کی رپورٹ ۱۹۲۶ء میں شائع ہوئی۔

ہیڈو کمیٹی کی سفارشات برطانوی تعلیم میں ایک نئے باب کا آغاز ثابت ہوئیں۔ اگرچہ سفارشات کئی سال تک بحث و تمحیص کے سوچنال سے باہر نہ نکل سکیں اور انھیں کلی طور پر قانونی شکل نہ دی جا سکی۔ لیکن رفتہ رفتہ قوم اور حکومت نے یہ محسوس کیا کہ تعلیم کو ان خطوط پر چلانے میں منفعت ہی منفعت ہے۔

سفارشات کمیٹی کے اراکین نے سب سے پہلے ابتدائی اور ثانوی مدارج کی تعیین کی طرف توجہ دی اس وقت تک ان دونوں مدارج کی حدود متعین نہ تھیں۔ بعض علاقوں میں ابتدائی تعلیم تیرہ چودہ سال کی عمر تک جاری رہتی اور بعض جگہ دس گیارہ سال کی عمر میں ختم ہو جاتی۔ کمیٹی کے اراکین نے یہ محسوس کیا

کہ گیارہ بارہ سال کی عمر میں طالب علم کی زندگی میں عضویاتی تبدیلی پیدا ہوتی ہے اور اس کی رگوں میں ایک مد و جزر امنڈنے لگتا ہے۔ اس عضویاتی تبدیلی کے چند نفسیاتی تقاضے ہیں جسے پورا کرنے کے لیے طالب علم کے ماحول، اس کے اساتذہ اور طریق تدریس کو بدلنا ضروری ہے۔ اس خیال کے پیش نظر انھوں نے ابتدائی اور ثانوی تعلیم کو اس طرح تقسیم کیا۔

(ا) ابتدائی تعلیم ۵ + سے لے کر ۱۱ + تک

(ب) ثانوی تعلیم ۱۱ + سے لے کر ۱۴ + تک

ابتدائی اور ثانوی تعلیم کی تقسیم کے بعد انھوں نے تعلیم کے تنظیمی امور کا جائزہ لیا۔ مروجہ تعلیمی نظام کی سب سے بڑی خامی یہ تھی کہ جو مضامین طلبہ کو پڑھائے جاتے تھے ان کی حیثیت خالص علمی تھی۔ عملی فنون اور ٹیکنیکل مضامین داخل نصاب نہ تھے اور نہ ان کی تدریس کی طرف کوئی توجہ دی جاتی تھی اور بالفرض جن مدرسوں میں ان کی تدریس کا اہتمام بھی تھا، تو اسے کوئی سماجی وقار حاصل نہ تھا۔ ہیڈو کمیٹی نے مروجہ طریقے کو غیر تعلیمی اور غیر جمہوری قرار دیا اور پہلی مرتبہ مختلف علوم کی افادیت کے پیش نظر انھیں ایک نظام میں منسلک کرنے کا مشورہ دیا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے انھوں نے دو قسم کے مدرسوں کے قیام کی سفارش کی۔

(ا) گرامر اسکول۔ برطانیہ کے روائتی مدارس جن کا نصاب خالص علمی اور غیر عملی ہوتا ہے جو طلبہ اس مدرسے میں داخل ہوں گے وہ سولہ سال کی عمر تک زیر تعلیم رہیں گے۔

(ب) سیکنڈری ماڈرن اسکول۔ یہ مدرسے تمام تر پیشہ ورانہ ہوں گے۔ ان میں جو طلبہ داخل ہوں گے ان کی مدرسہ چھوڑنے کی عمر ۱۴ + یا ۱۵ + ہوگی۔

سیکنڈری ماڈرن اسکولوں کی تنظیم اس انداز میں کی جائے کہ انھیں کسی طرح گرامر اسکولوں سے کم تر نہ سمجھا جائے، اور ان میں ان مضامین پر بالخصوص زور دیا جائے جن کی اقتصادی اہمیت ہے۔

تیسری اہم سفارش مدرسہ چھوڑنے کی عمر کا تعین تھا۔ قانونِ تعلیم مجریہ ۱۹۱۸ء کے مطابق کوئی طالب علم چودہ سال کی عمر سے پہلے اسکول نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ ہیڈو کمیٹی نے اس میں ایک سال کے مزید اضافے کی سفارش کی۔ یعنی اس طرح یہی عمر ۱۴ + کی بجائے ۱۵ + کر دی گئی۔

انتظامی لحاظ سے اس وقت برطانوی مدرسوں میں دو عملی قائم تھی۔ ایک طرف وہ مدارس جو مقامی تعلیمی حکومتوں کے ماتحت تھے، اور دوسری طرف وہ اسکول جو مختلف مذہبی انجمنوں کے زیر اہتمام تھے، یہ دو عملی بعض اوقات قومی تعلیمی ترقی کی راہ میں ایسے روڑے اٹکاتی کہ اس سے ترقی کی ساری راہیں مسدود ہو جاتیں۔ ہیڈو کمیٹی نے اس انتظامی نقص کو دور کرنے کے لیے اس دو عملی کو ختم کرنے کی سفارش کی اور واضح طور پر یہ تجویز کیا کہ کلیسائی مدرسوں کا انتظام مقامی تعلیمی حکومتوں کے سپرد کر دیا جائے۔

پانچویں سفارش یہ تھی کہ امتحان ختم کر دیے جائیں۔

ہیڈو کمیٹی کی یہ سفارشات اگرچہ قومی تعلیمی ترقی کا سنگ میل تھیں، لیکن ایک طویل مدت تک ان پر عمل نہ ہو سکا۔ مدرسہ چھوڑنے کی عمر اور کلیسائی مدرسوں کی انتظامی تبدیلی کی سفارشات تا دیر تنازعات کا باعث رہیں۔ بالخصوص کلیسائی حلقوں میں اس کے خلاف بڑا احتجاج ہوا۔ سر چارلس ٹریولین (TREVELYAN) نے ان مقاصد کے حصول کے لیے یکے بعد دیگرے تین بل پیش کیے لیکن ہر مرتبہ مخالفت کی رو کچھ اتنی شدید ہوئی کہ اسے اپنا بل واپس لینا پڑا۔ ممکن ہے اس سلسلے میں کچھ اور کوششیں ہوتیں لیکن ۱۹۳۱ء کے اقتصادی بحران نے ہر نئی تجویز کو التوا میں ڈال دیا۔ صنعت و حرفت، تجارت، ترقیاتی منصوبے غرض زندگی کے ہر شعبے پر ایک جمود طاری ہو گیا۔ تعلیم اور تعلیم کے ترقیاتی منصوبے بھی اس کی زد میں آ گئے۔ اس اقتصادی بحران کو روکنے کے لیے ۱۹۳۱ء ہی میں سر جارج مے (SIR GEORGE MAY) کی سرکردگی میں ایک اقتصادی کمیٹی مقرر ہوئی۔ اس کمیٹی نے مصارف بچانے کے لیے ہر اسکیم میں خاصی قطع برید کی۔ چنانچہ تعلیم کے بعض منصوبے یا تو تخفیف کی زد میں آ گئے یا انھیں ملتوی کر دیا گیا۔

قانونِ تعلیم مجریہ ۱۹۳۶ء

ہیڈو کمیٹی کی سفارشات ایک نئے تعلیمی نظام کا پیش خیمہ تھیں لیکن اس وقت ملک ذہنی طور پر اس کے لیے آمادہ نہ تھا۔ چنانچہ ۱۹۱۸ء سے ۱۹۴۴ء تک کا زمانہ ایک عبوری زمانہ ہے

بحث وتمحیص ہوتی رہی۔ بعض اوقات کشاکش اور الجھاؤ کی کیفیت بھی پیدا ہو جاتی۔ ہر گروہ اپنے اپنے نظریات کے مطابق نظامِ تعلیم میں تغیر لانے کا خواہاں تھا۔ لیکن تا دیر کوئی ایسی تبدیلی رونما نہ ہو سکی جس سے تعلیم کی تنظیمی پیچیدگیوں کا تناؤ ختم ہو جاتا۔ تنظیم کی دوعملی کی وجہ سے شہری اور دیہاتی حلقوں میں بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ ۱۹۳۶ء کا قانون انہیں پیچیدگیوں کا حل تھا۔ لیکن اس سے پہلے کہ یہ قانون نافذ ہوتا، برطانیہ دوسری عالمگیر لڑائی میں پھنس چکا تھا۔

سفارشات

(۱) مدرسہ چھوڑنے کی عمر اب ۱۴ + کی بجائے ۱۵ + ہو گی۔ اس دفعہ کا نفاذ یکم ستمبر ۱۹۳۹ء سے ہوگا۔

طالب علم کو اس پابندی سے اس وقت مستثنیٰ کیا جا سکتا ہے جب وہ یہ ثابت کر دے کہ وہ ایک مفید پیشے میں جا رہا ہے۔

(۲) مقامی تعلیمی محکمے NON-PROOSIDED اسکولوں کو ۷۵ فی صد تک عمارتی امداد دے سکتی ہے۔ یہ ادارے کہلائیں گے۔

(۳) دینی تعلیم۔

(ا) جن اسکولوں کو مقامی تعلیمی محکمے سے امداد ملتی ہے۔ ان اداروں کے طلبہ کے والدین منتظمین مدرسہ سے متفقہ نصاب کا مطالبہ کر سکتے ہیں۔

(ب) والدین فرقہ وارانہ دینی تعلیم کا مطالبہ بھی کر سکتے ہیں۔ یہ تعلیم مدرسے سے باہر دی جائے گی۔ یعنی طلبہ کو کسی قریب کے کلیسا میں لے جا کر ان کے عقاید کے مطابق تعلیم دی جا سکتی ہے۔

(ج) دینی تعلیم صرف RESEWED TEACHER ہی دے سکیں گے۔

(۴) مقامی تعلیمی حکومتوں کو ہر قسم کے مدرسوں میں اساتذہ کے تقرر کا اختیار ہوگا۔

اسپنس رپورٹ ۱۹۳۶ء

ہیڈو رپورٹ میں سکنڈری گرامر اور جونیئر ٹیکنیکل اسکولوں کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ لیکن چوں کہ

یہ مدرسے برطانوی نظامِ تعلیم کا ایک جزو تھے۔ انھیں اس طرح نظرانداز بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ چناں چہ ۱۹۳۸ء میں اس خامی کو اسپنس کمیٹی رپورٹ نے دور کیا۔ اس کمیٹی کا مدعا ملک میں جامع مدارس قائم کرنا تھا۔

اس کمیٹی کی سب سے اہم سفارش یہ ہے کہ بعد کی عمومی تعلیم ۱۳+ یا ۱۴+ تک جاری رہے۔ اس کے بعد انھیں ان کے پسندیدہ مضامین کے مطالعے کا موقع دیا جائے۔ تیرہ سال کی عمر سے پہلے مہارت خصوصی کا تصور نہ صرف یہ کہ غلط ہے بلکہ یہ اکثر طلبہ کے لیے غیر مفید اور بعض صورتوں میں تباہ کن ثابت ہوتا ہے۔ تیرہ یا چودہ برس کی عمر میں بچے کی ذہنی استعداد، اس کی پسند اور ناپسند اور اس کے طبعی میلانات کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ اس عمر میں اس کے مستقبل کی تعیین کی حد تک درست ہو سکتی ہے۔ لیکن اس سے پہلے اسے صحیح نہیں کہا جا سکتا۔

آیا برطانیہ میں جامع مدارس قائم کیے جائیں یا موجودہ نظام کو بحال رکھا جائے۔ یہ ایک ایسا مسئلہ تھا جس کے لیے اس کمیٹی کا تقرر عمل میں آیا تھا۔ اس کمیٹی کے اراکین نے جامع مدارس کے قیام کی مخالفت کی۔ ان کے خیال میں اس قسم کے ادارے بہت بڑے ہو جائیں گے۔ اور طلبہ کی تعداد میں اضافہ ہو جانے کی وجہ سے بعض انتظامی نقائص پیدا ہو جانے کا احتمال ہے۔ اس کے علاوہ نظامِ تعلیم میں صرف گرامر اسکول کے چند طلبہ رہ جائیں گے اور ان کی تعداد اتنی مختصر ہو گی کہ وہ اسکول کی عمومی زندگی پر کوئی اثر نہیں ڈال سکیں گے۔ اور بالفرض اعتراض کو نظرانداز بھی کر دیا جائے تو گرامر اسکول کی روایتی عظمت کا دوسرے طبقوں پر بہت برا اثر پڑے گا۔ مزید برآں اگر جونیئر ٹیکنیکل اسکول کو ٹیکنیکل کالج سے علاحدہ کر دیا گیا تو اس کی افادیت ختم ہو جائے گی۔ ان مفروضوں کے پیشِ نظر اسپنس کمیٹی نے ایک ایسے ٹیکنیکل اسکول کے قیام کی تجویز پیش کی جس کے دو مدارج ہوں۔ پہلے درجے میں گیارہ سال سے تیرہ سال کی عمر کے بچوں کی تعلیم کا اہتمام ہو اور دوسرے میں تیرہ سال سے سولہ سال کی عمر کے بچوں کا۔ پہلے درجے کا نصاب عمومی ہو اور دوسرے درجے کا نصاب خالص ٹیکنیکل۔ یہ اسکول ٹیکنیکل کالجوں سے متعلق ہوں اور اس احاطے میں قائم کیے جائیں جن میں ٹیکنیکل کالج موجود ہوں۔

لیکن وہ کسی ٹیکنیکل کالج کے تابع نہ ہوں بلکہ انھیں اپنے امتحانات کی ترتیب و تنظیم کی پوری آزادی ہو۔

نارووڈ رپورٹ

ابھی برطانیہ اپنے نظامِ تعلیم کی تنظیم نو کی منصوبہ بندی ہی میں مشغول تھا کہ اس کی فضا جنگ کے ہنگاموں سے معمور ہو گئی۔ برطانیہ اطالوی بم بار جہازوں کا نشانہ بن رہا تھا۔ اس انتشار میں کسی تعلیمی منصوبے پر عمل کرنا ممکن نہ تھا۔ چناں چہ مختلف منصوبوں کو التوا میں ڈال دیا گیا لیکن اس کے باوصف مستقبل کی منصوبہ بندی کے متعلق غور و خوض ہوتا رہا۔ ۱۹۴۱ء میں بورڈ آف ایجوکیشن نے ثانوی مدارس کے نصاب اور ان کے امتحان کے مسائل پر غور و خوض کرنے کے لیے سر سرل نارووڈ کی قیادت میں ایک کمیٹی مقرر کی۔

اس کمیٹی نے ثانوی مدارس کے مختلف پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد ثانوی مدارس کے چند مقاصد متعین کیے۔ وہ مقاصد یہ ہیں۔

(ا) ہر قسم کی تعلیم کا اہتمام کرنا جو طلبہ کے مختلف طبعی میلانات کے تقاضوں کو پورا کر سکے۔

(ب) مخصوص قسم کے ذہنوں کی تربیت کا اہتمام کرنا کہ وہ اپنی صلاحیتوں کو نمایاں کر سکیں۔

(ج) مخصوص دل چسپیوں اور رجحانات کی تہذیب و تربیت کرنا اور نصاب میں اس کا اہتمام کرنا۔

اگر ثانوی مدارس کے مقاصد کی تعیین اس نہج پر کی جائے تو اس کا مقصد یہ ہوگا کہ ملک میں تین قسم کے مدرسے قائم کیے جائیں۔ یعنی سیکنڈری گرامر، سیکنڈری ماڈرن اور سیکنڈری ٹیکنیکل۔ دراصل یہ تینوں مدرسے کسی نہ کسی شکل میں اس وقت بھی موجود تھے۔ لیکن گرامر اسکول کی روایتی عظمت کے سامنے سیکنڈری ماڈرن اور سیکنڈری ٹیکنیکل اسکول کی کوئی حیثیت نہ تھی۔ نارووڈ رپورٹ میں ان تینوں مدارس کو ایک درجے پر لانے کی سفارش کی گئی تاکہ ایک موہوم تاثر دوسرے کی حیثیت کو کم نہ کر سکے۔

نارووڈ کمیٹی نے پھر ہیڈو کمیٹی کی متابعت میں یہ اصول تسلیم کر لیا کہ ثانوی تعلیم کا آغاز گیارہ سال کی عمر سے ہونا چاہیے۔ بلکہ وہ تو اس حد تک آگے بڑھ گئے کہ گیارہ سال کی عمر سے پہلے بھی اس کا آغاز ہو سکتا ہے۔ گیارہ سال سے تیرہ سال تک تعلیم عمومی ہو۔ اور تیرہ سال سے سولہ سال کی عمر تک تعلیم طالب علم کے مزاج اور فطری رجحانات کے مطابق۔ سولہ سال کی لازمی تعلیم کے بعد طالب علم اٹھارہ سال

کی عمر تک اسکول میں رہ سکتا ہے۔ یا ملازم ہو کر پارٹ ٹائم تعلیم حاصل کر سکتا ہے۔ ثانوی تعلیم کی تکمیل کے بعد ہر طالب علم کو چھ مہینے تک پبلک سروس کرنی پڑے گی۔ یہ سروس سولہ سال یا اٹھارہ سال کی عمر میں کی جا سکتی ہے۔ ان سفارشات کے پیش نظر ناروڈ کمیٹی نے دو مختلف اسکولوں کو یک جا کرنے کی یا جامع مدارس قائم کرنے کی تجویز پیش کی۔

مدارس اور نصاب کی بحث کے بعد کمیٹی نے امتحانات کا مفصل جائزہ لیا۔ امتحان کے متعلق کمیٹی کی سفارشات یہ ہیں۔

(۱) بورڈ آف ایگزیمنیشن قائم کیا جائے جس کے اراکین کی تفصیل یہ ہو گی — ۳ ہیڈ مدرس، چار تعلیمی حکومت کے اراکین۔ چار یونیورسٹی کے ممبر اور چار انسپکٹر۔

(۲) ہر اسکول کی ہمت افزائی کی جائے کہ وہ اپنا نصاب خود ہی متعین کریں۔

(۳) مضامین کے انتخاب میں طلبہ پر کوئی پابندی عاید نہ کی جائے۔

(۴) سال میں دو مرتبہ امتحان ہو۔

(۵) یونیورسٹی اور مقامی تعلیمی حکومت کے وظیفوں کے لیے یونیورسٹیاں مارچ میں امتحان لیا کریں گی — جو رقم وظیفے کی صورت میں دی جائے اسے کافی ہونا چاہیے۔

ایک افریقی حکمران قوم۔ "واتوسی"

خداداد خان

مسلسل نمبر ۲

روینڈا کے دارالخلافہ نیانسزا میں بعض انگریز عورتیں دوکانداری کرتی ہیں جو سفید بھنوں کے نام سے مشہور رہیں۔ ان کی دکانوں پر یوروپین مال بکتا ہے۔ سب سے زیادہ توجہ یوروپین کپڑے کی طرف صرف کی جاتی ہے۔ ان کی دکانوں میں ملکی کپڑے کا نام و نشان تک نہیں جس سے واتوسی کپڑے کی صنعت کو سخت نقصان پہنچا ہے اور قدیم زمانے کے کپڑوں کے خوب صورت اور اعلیٰ نمونے رفتہ رفتہ ناپید ہو رہے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ اس میں شکایت کی کوئی وجہ نہیں ہونی چاہیے کیوں کہ اہل یورپ جہاں بھی گئے انھوں نے اپنی صنعت کو فروغ دینے کے لیے مقامی صنعت کو مٹانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ یہ کچھ روینڈا پر ہی منحصر نہیں بلکہ اہل مغرب نے دنیا میں جہاں بھی قدم رکھا، یہی کچھ کیا۔ بنگال میں ڈھاکے کی ململ کی طرح روینڈا کی چھینٹ بھی کسی وقت واتوسی صنعت کا شاہکار تھی۔ جو اب بالکل ہی ناپید ہو چکی ہے، البتہ مخروطی ٹوکریوں کی صنعت ابھی تک زندہ ہے۔ اور اس میں بدستور جدت طرازی سے کام لیا جا رہا ہے یہ ٹوکریاں اس انداز سے بنی جاتی ہیں کہ ان میں پانی رک سکتا ہے۔

واتوسی امرا کی بیگمات پردے کی سخت پابند ہیں۔ وہ ضرورت کے تحت دن کو اگر باہر آئیں، تو ماٹ شیلا میں نکلتی ہیں جسے چار باہو تو اٹھائے ہوئے ہوتے ہیں۔ ماٹ شیلا ایک مخروطی پالکی ہوتی ہے واتوسی عورتیں خاصی بلند قامت ہوتی ہیں اور اپنے سروں پر کلغی دار ٹوپیاں پہنتی ہیں۔ وہ گھروں سے بہت کم باہر نکلتی ہیں۔ اس لیے غیر ملکی لوگوں کو ان کے دیکھنے کے بہت کم مواقع ملتے ہیں۔

باہر سے آنے والے سیاحوں کو براہ راست واتوسی بادشاہ سے ملاقات کی اجازت نہیں حالاں کہ اب سے چند سال پہلے ہر ملکی بلا روک ٹوک بادشاہ کے پاس پہنچ جاتا تھا۔ لیکن اب اس پر کچھ پابندیاں عائد کر دی گئی ہیں۔ بادشاہ نے مخروطی محل میں ہر وقت متعدد اس کے لشکر میں گھرا رہتا ہے

اسے فرانسیسی زبان پر خاصہ عبور حاصل ہے اور وہ بڑی سلاست اور روانی کے ساتھ اس پر گفتگو کر سکتا ہے وہ اکثر سیاحوں سے تحفے بھی قبول کر لیتا ہے اور انھیں اپنی شیریں کلامی اور اعلیٰ کردار سے متاثر بھی کرتا ہے۔ یورپ سے آنے والے اکثر سیاح اہل افریقہ کو نمائشی اور چمکدار قسم کی چیزیں پیش کرتے ہیں۔ ایک سیاح جو روڈ انگوا کی تخت نشینی کے بعد نیا نیا یہاں آیا تھا دربار میں رسائی حاصل کی اور بادشاہ کی خدمت میں چھوٹے موتیوں کا ایک ہار پیش کیا۔ روڈ انگوا نے یہ نذرانہ قبول کرتے ہوئے سیاح کا اس انداز میں شکریہ ادا کیا جیسے اسے کوئی بیش بہا چیز پیش کی گئی ہے۔ لیکن اس سیاح کے چلے جانے کے بعد اس نے بڑی حقارت اور غصے سے ان موتیوں کو فرش پر پٹک دیا، اور وہ ادھر اُدھر بکھر گئے، اور بادشاہ کے خادموں نے انھیں چن لیا۔ غیر ملکیوں سے ملاقات کے وقت اگر بادشاہ اچھے موڈ میں ہو تو وہ انھیں اپنے متبرک روایتی ڈھول ضرور دکھاتا ہے۔ یہ ڈھول وا توسیوں کا بہت بڑا روحانی سرمایہ سمجھا جاتا ہے۔ بادشاہ جہاں کہیں جاتا ہے یہ ڈھول اس کے ساتھ جاتے ہیں۔ یہ کہنا بجا ہے کہ ڈھول ہی افریقہ کے دل کی آواز ہے۔ کیوں کہ کم و بیش تمام افریقہ میں ڈھول کو ایک مقدس چیز سمجھا جاتا ہے۔ یہ ڈھول تقریباً ہر سائز میں ہوتے ہیں بڑے، چھوٹے درمیانے سائز کے لیے۔ تکونے، سب طرح کے ڈھول ہر وقت موجود رکھے جاتے ہیں لمبے ڈھول ایک طرف سے باریک اور دوسری طرف سے بھاری آوازیں نکلتے ہیں۔ کچھ ڈھول کولہے سے بجائے جاتے ہیں۔ کچھ لکڑی کے ڈنڈوں اور باریک تیلیوں سے اور کچھ ہاتھوں کی رگڑ سے بجائے جاتے ہیں۔ بڑی بڑی دعوتوں میں مرد اور عورتیں انھی کی گت پر رقص کرتے ہیں۔ کسی اہم موقع پر اگر لوگوں کو ایک جگہ مشورے کے لیے جمع کرنا مقصود ہو۔ تو ڈھولوں سے ہی اس کا اعلان کیا جاتا ہے۔ دشمن سے جنگ کے وقت یا کسی اور خطرے کے وقت انھی سے منادی کی جاتی ہے۔ بادشاہ کی کسی دورے سے واپسی پر ڈھولوں سے شاہی آمد کا اعلان کیا جاتا ہے۔ اروینڈا میں شاہی ڈھولوں کے نام مختلف ہیں اور ان کی آواز میں جدا جدا ہیں۔ ان میں تین ڈھول نہایت ہی مقدس اور قابل تعظیم سمجھے جاتے ہیں۔ ان تینوں کے نام الینشیا کورے "اینا ہورا" اور ابوموگو ڈ ہیں۔ ہر صبح ان تینوں سے باری باری اعلان کیا جاتا ہے کہ بادشاہ بیدار ہو چکا ہے۔ اس لیے ہر واتوسی کو بستر سے اٹھ کر کھڑا ہونا چاہیے۔

ات کو پھر ان کے ذریعے اعلان ہوتا ہے کہ بادشاہ اب سو چکا ہے اس لیے سب واتوسی سو جائیں۔ یہ اعلانات پوری پابندی اور التزام کے ساتھ جاری رکھے جاتے ہیں۔ اور ہر روز بادشاہ کے حضور میں اطلاع پیش کی جاتی ہے کہ صبح و شام کے یہ اعلان حسب معمول ہو چکے ہیں۔

واتوسیوں کا سب سے بڑا مقدس ڈھول "کالنگاز" کانگا بادشاہ کے اختیار کا نشان ہے۔ اسے تاج یا عرصہ شاہی جیسی اہمیت حاصل ہے۔ بلجین حکومت نے سابق شاہ موسنگا کو جب معزول کیا تو کالنگا چھین کر ہی اس کی طاقت کو ختم کیا گیا تھا۔ یہ مقدس ڈھول بادشاہ سے چھین کر ایک محفوظ مقام پر رکھ دیا گیا تھا۔ ڈھول کے بغیر بادشاہ کی حیثیت میر بے کارواں کی سی ہے۔ اسے واتوسیوں پر کوئی حق نہیں رہتا اور اس کی کچھ تعلیم اور توقیر نہیں رہتی۔ یہی وجہ تھی کہ بے چارے موسنگا کو مجبوراً بلجین گورنمنٹ کے آگے جھکنا پڑا۔ اور ان کی تمام شرائط بلاچون وچرا مان لیں۔ اس کے بعد جب روڈا گوا، بادشاہ بنا تو کالنگا اس کو پھر واپس کر دیا گیا۔ اس پر ملک بھر میں خوشیاں منائی گئیں، اور تمام لوگوں کو بادشاہ کی طاقت اور عظمت کا پھر یقین ہو گیا۔

جولائی کے سالانہ جشن عظیم میں گایوں کی نمائش، قومی رقص اور جسمانی ورزش کے مظاہرے کیے جاتے ہیں۔ یہ جشن تین روز تک جاری رہتا ہے۔ دارالحکومت نیانزا کو دلھن کی طرح سجایا جاتا ہے تمام رسومات پورے احترام اور شان وشوکت سے منائی جاتی ہیں روڈا گوا، اس موقعے پر اپنا انتہائی قیمتی جغہ زیب تن کرتا ہے اور سر کو زرین تاج سے سجاتا ہے اور ہاتھی دانت کے ہوگھر، محل سے باہر نکلتا ہے۔ یہ خدام ہر موقع پر رسومات کی بجا آوری میں بادشاہ کے گرد معروف نظر آتے ہیں۔ دارالخلافہ کے باہر کھیتوں میں سینکڑوں کی تعداد میں گائیں جمع ہوتی ہیں ان کے لمبے لمبے سفید سینگ عجیب منظر پیدا کرتے ہیں۔ اس موقع پر بادشاہ کی اپنی ذاتی گایوں کو بھی نمائش کے لیے باہر لایا جاتا ہے۔ یہ شاہی گائیں ان یامبو کہلاتی ہیں اور عام واتوسیوں کی گایوں کو انسانگا کہا جاتا ہے۔ یہ تمام گائیں ایک جلوس کی صورت میں باہر لائی جاتی ہیں۔ اور اس جلوس کو دیکھنے کے لیے سڑک کے دو رویہ ہزاروں کی تعداد میں لوگ جمع ہو جاتے ہیں بچے اور

جوان دور دور تک درختوں کے اوپر چڑھ جاتے ہیں اور تمام شہر انسانوں سے خالی نظر آتا ہے
جشن کی ابتدا اونچی چھلانگ کے مظاہرے سے ہوتی ہے۔ دو نازک سرکنڈوں کو زمین میں
گاڑ کر تیسرے کو ان دونوں کے اوپر ٹکا دیا جاتا ہے۔ اکھاڑے سے ادھر کچھ فاصلے پر چند انچ
موٹی لکڑی کی رکاوٹ ڈال دی جاتی ہے۔ ایک واتوسی جوان اپنے خوبصورت چغے کو کمر کے
گرد لپیٹ کر بڑے دلکش انداز میں مٹیں پچیس لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہے اور اتنے لمبے کہ دیکھنے
والے کو بمشکل یہ یقین آسکتا ہے کہ کوئی انسان اتنا لمبا پھلانگ سکتا ہے۔ آخری ڈگ پر وہ لکڑی
کی رکاوٹ عبور کر کے اوپر اُبھرتا ہے اور سرکنڈوں کے اوپر سے گذر جاتا ہے۔ واتوسی جوانوں کی یہ
تکنیک بالکل امریکی کھلاڑیوں جیسی ہے۔ ایک واتوسی جوان ساڑھے آٹھ فٹ تک اونچی چھلانگ
لگا سکتا ہے۔ اگر ان جوانوں کو مناسب تربیت دی جائے تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ اونچی چھلانگ
میں عالمی ریکارڈ چند انچ اور بڑھا دیں۔

تیر اندازی میں واتوسی، باہوتو، اور باتوا، تمام جوان شریک ہوتے ہیں۔ عام طور پر باتوا،
اور باہوتو، تیر انداز واتوسیوں کی نسبت زیادہ ماہر سمجھے گئے ہیں۔ ان کی کمانیں بالکل چھوٹی چھوٹی ہوتی ہیں
اتنی چھوٹی جیسے بچے عام طور پر کھیل میں استعمال کرتے ہیں۔ لیکن ان چھوٹی چھوٹی کمانوں سے نکلے ہوئے
تیر کبھی خطا نہیں جا سکتے۔ اس کے برعکس واتوسیوں کی کمانیں بڑی ہوتی ہیں۔ باتوا تیر انداز جب تیر کا
نشان باندھتا ہے تو فخریہ انداز میں اپنی کمان پہ ہاتھ پھیرتا ہے۔ اسے تھپکی دیتا ہے، چومتا ہے
اور بڑے سکون اور رفتار کے ساتھ تیر چھوڑتا ہے۔ نشانہ بازی کے جلسے لکڑی کا ایک بیل بنا کر کھڑا کر کے
اس کی آنکھوں میں تیر مارنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ باری باری تمام تیر انداز اپنے کمال فن کی داد
وصول کرتے ہیں۔ آخر میں قبیلے کے ایک بزرگ سے درخواست کی جاتی ہے کہ وہ بھی ایک تیر چلائے
یہ بزرگ تیر کا تیر چلاتا ہے۔ آہستہ آہستہ کمان سنبھال لیتا ہے اور گرہ کرتا ہے۔ جب اس کا تیر سیدھا
بیل کی آنکھ میں پیوست ہوتا ہے تو تمام مجمع خوشی سے جھوم اٹھتا ہے۔ جوش مسرت میں تمام مجمع
بوڑھے، جوان ناچنے لگتے ہیں۔ تالیوں اور نعروں کے شور میں فضا گونج اٹھتی ہے۔

جشن کی سب سے اہم رسم مقدس گایوں کا چڑھاوا ہے۔ سفید سینگوں والی یہ گائیں ہزاروں کی تعداد میں میدان میں لاکر کھڑی کر دی جاتی ہیں۔ جدھر نگاہ اٹھتی ہے سفید اور نکیلے سینگ ہی نظر آتے ہیں۔ تمام گائیں خاموش اور پُروقار نظر آتی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاہزادیاں ہیں اور انھیں اپنی عالی نسبی کا پورا پورا احساس ہے۔ ہر گائے کا نگران الگ الگ ہوتا ہے جو اسے بادشاہ کے حضور میں لاتا ہے۔ بادشاہ کے پاس لانے سے پہلے وہ گائے سے باتیں کرتا ہے۔ اس کی پیٹھ اور سر پر ہاتھ پھیرتا ہے اس کی ماں اور اس کے باپ کا نسب بیان کرتا ہے۔ ان گایوں کا دودھ پینے کی کسی کو بھی اجازت نہیں۔ البتہ بعض رکھوالوں کو ان کا دودھ پینے پر کوئی پابندی نہیں۔ لیکن شاہی گایوں یعنی اِن یامبو کا دودھ سب پر حرام ہے۔ چڑھاوے کی گایوں کے جسم سورج کی روشنی میں آئینے کی طرح چمک رہے ہوتے ہیں۔ ان کی تمام جلد نرم نرم ہوتی ہے۔ روزانہ مکھن کی مالش انھیں روشن اور شفاف بنا دیتی ہے اور سفید سینگ ایسے معلوم ہوتے ہیں گویا ہاتھی دانت کے بنے ہوئے ہیں اور انھیں مصنوعی طور پر لگایا گیا ہے۔ ان کے ماتھوں پر خوب صورت اور پھولدار سہرے ہوتے ہیں جن میں قیمتی موتی ٹکے ہوئے ہوتے ہیں اور سینگوں کی نوکوں پر چمچماتی جوڑے ہوتے ہیں۔ ان گایوں کے رنگ یکساں نہیں ہوتے، بلکہ سفید، سیاہ، بھوری اور ملے جلے تمام رنگوں کی ہوتی ہیں۔ گائیں خاص قد آور ہوتی ہیں اور ان کی لمبائی بارہ فٹ تک ہوتی ہے۔ ٹانگیں حیرت ناک طور پر پتلی اور باریک ہوتی ہیں۔ گائے کو بادشاہ کے پاس لاتے وقت اس کا نگران نعرے لگاتا ہے اور گائے کے خاندانی اوصاف بیان کرتا ہے۔ ہاتھوں کو ہوا میں لہراتا ہوا رقص کرتا ہے۔ اپنی چھڑی کو زمین پر ٹپکتا ہوا جب لوگوں کے پاس سے گذرتا ہے تو تمام ایک ساتھ گائے کی نسل اور اس کی خوب صورتی کی تعریف کرتے ہیں۔ بادشاہ اپنے امرا کے ساتھ بڑی احتیاط اور سنجیدگی سے گائے کے تمام اوصاف کے متعلق تفصیلی گفتگو کرتا ہے بحث کے دوران بڑی دل فریب تشبیہات اور استعاروں سے کام لیا جاتا ہے۔ جن سے ان کے شاعرانہ مذاق کا پتہ چلتا ہے۔

جشن کا آخری دن رقص کے لیے وقف ہوتا ہے۔ قدرتی طور پر ہر ملک میں رقص عوامی جذبات

کی تصویر ہوتا ہے۔ ہر ملک میں لوک ناچ کے قواعد اور ضوابط نسلاً بعد نسلاً محفوظ چلے آتے ہیں۔ زبان کا اختلاف ایک اجنبی کو کسی ملک کے رقص سے لطف اندوز ہونے میں قطعاً حائل نہیں ہو سکتا۔ بلکہ کوئی غیر ملکی کسی دوسرے ملک میں رقص کے مظاہرے میں سرے سے اجنبیت محسوس ہی نہیں کرتا کیوں کہ رقص ایک وجدانی شے ہے۔ ریاضی، موسیقی اور فنون لطیفہ کی طرح اس کی زبان بھی بین الاقوامی ہوتی ہے۔ قدیم افریقی رقص کچھ ایسا جاذب اور دلآویز نظر نہیں۔ رقاص ڈھول کی متناسب گت پر تھپائی کی آواز پر پاؤں کو آگے پیچھے زمین پر مارتے اور رگڑتے جاتے ہیں اور ایک دائرے میں پھرتے ہیں۔ کبھی کبھی یہ لسانٹا یعنی سوانگ کا رنگ بھی جماتے ہیں جس پر پرانے وقتوں کی کوئی رومانی داستان پیش کی جاتی ہے۔ لسانٹا میں رقص کا مظاہرہ بھی شامل ہوتا ہے۔ سوانگ بھرنے والوں کو ماٹوگراسو کہتے ہیں جو سروں پر بڑی خوب صورت ٹوپیاں رکھتے ہیں۔ ان کا لباس فوق العبرناک اور جاذب ہوتا ہے۔ صحرائے اتوری کے پگمی جب شام کو ہاتھی کے کامیاب شکار کے بعد لوٹتے ہیں، تو نعرے لگاتے ہوئے۔ بھالوں اور کمانوں کو ہوا میں لہراتے ہوئے گاؤں میں داخل ہوتے ہیں۔ تمام عورتیں اور بچے ان کا استقبال کرتے ہیں۔ رات کو مردوں اور عورتوں کا اجتماعی رقص منعقد ہوتا ہے، جو رات بھر جاری رہتا ہے۔

لیکن داتوسی رقص افریقی آرٹ کی جان ہے جس کا قدیم افریقی رقص سے کچھ تعلق معلوم نہیں ہوتا۔ ماہرین فن کا بیان ہے کہ داتوسی رقص کے مقابلے میں پیرس۔ لندن اور ماسکو کی رقاصی کی کچھ حیثیت نہیں۔ داتوسی جوان کی رعنائی۔ قد کی لمبائی، اور ان کی متناسب حرکات کو اس فوقیت کا باعث سمجھا جاتا ہے جو یورپین فن کاروں کے ہاں ناپید ہے۔ داتوسی رقص کا امتیاز اس پر بھی منحصر ہے کہ ان کے ہاں بچوں کو ابتدا ہی سے اس کی تربیت دی جاتی ہے۔ اور غایت اس کی یہ ہوتی ہے کہ شاہی دربار میں نمایاں مقام حاصل ہو جو عزت اور شہرت کا سبب بنے۔ اسی طرح داتوسی رقص معاشی اور اقتصادی لحاظ سے بھی اہم سمجھا جاتا ہے اور اس پر اتنی توجہ صرف کی جاتی ہے کہ رقص ایک فطری حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ اس فن کو باقاعدہ اداروں کی صورت میں حکومت کی سرپرستی حاصل ہے۔ اس طرح رقاصی داتوسی زندگی کا ایک جزو ہے۔ لوگ روزانہ کھلی ہوا میں اپنے دن بھر کے کام سے فارغ ہو کر، سنگت ناچ کا رنگ جماتے ہیں

باہوتو، موزلوں کا ناچ خاصا دل فریب ہوتا ہے۔ یہ عورتیں ڈھول شہنائی اور جھنجھنے بجاتی ہوئی آہستہ آہستہ بڑے ناز و ادا کے ساتھ میدان میں جمع ہوتی ہیں۔ اس موقع پر اکثر مرد آلاتِ موسیقی استعمال کرتے ہیں عورتیں رقاصی کا خاص لباس پہنتی ہیں جو خوب صورت چھینٹ کا بنا ہوا ہوتا ہے۔ کبھی کبھی ان میں واتوسی عورتیں بھی آشامل ہوتی ہیں۔ جب یہ نیچے اوپر، دائیں بائیں اپنے حسین ہاتھوں کو حرکت دیتی ہیں تو ان کی نازک اور لمبی انگلیاں دیدہ و نگاہ کو ایک عجیب آسودگی عطا کرتی ہیں۔ ان کے اعضا کی لچک جادو کا سا اثر پیدا کر دیتی ہے۔ جوان لڑکیاں کولھوں پر ایک ڈوری باندھتی ہیں۔ اس ڈوری کے ساتھ سجاوٹ کی بٹی جھالر لٹکی ہوتی ہے۔ اور فنی لباس کا ایک ضروری جزو سمجھی جاتی ہے۔ لڑکیوں کی گردنوں میں موتیوں کے ہار پڑے ہوتے ہیں۔

باتوا، پگمی دل کش انداز میں سوانگ بھرتے ہیں۔ خشک گھاس کا ایک ڈھیر جمع کرکے یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ اس ڈھیر میں کوئی زہریلا سانپ چھپا بیٹھا ہے۔ ایک باتوا پگمی اپنا نیزہ سنبھالے جھومتا ہوا نمودار ہوتا ہے۔ اور اتنا جھک کا ہوا چلتا ہے جس سے یہ معلوم ہو کہ وہ بھاری بوجھ اٹھائے ہوئے ہے اچانک اس کی نگاہ سانپ پر پڑتی ہے اور وہ خوف زدہ ہو کر بجلی کی سی سرعت کے ساتھ پیچھے ہٹتا ہے اور بوجھ سر سے پھینک کر سنبھلتا ہے اور سانپ کا مقابلہ کرنے کا تہیہ کرتا ہے۔ اور نیزہ لے کر آگے بڑھتا ہے اور دشمن پر وار کرتا ہے اور معاً پیچھے کو چھلانگ لگاتا ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وار خالی گیا۔ اور سانپ نے اسے کاٹ کھایا ہے۔ حملہ آور زمین پر تڑپتا لوٹتا اور بل کھاتا ہے۔ کچھ وقفے کے بعد پھر نئے حملے کی تیاری کرتا ہے اور بھالا مارتا ہے۔ یہ حملہ بھی ناکام رہتا ہے۔ اس موقع پر دو تین اور پگمی اس کی مدد کو آپہنچتے ہیں اور مل کر سانپ کا خاتمہ کر دیتے ہیں اور اس کے گرد اجتماعی رقص کا پر لطف سماں باندھ دیتے ہیں۔ سانپ پر حملے کی یہ تمام حرکات اتنی مناسب، برجستہ اور قدرتی ہوتی ہیں کہ دیکھنے والوں کو مزہ آجاتا ہے۔ سب سے زیادہ جاذب اثر وہ رقص ہے جو کسی واتوسی شہزادے یا رہنما کی قیادت میں کیا جاتا ہے۔ کوئی پچاس ساٹھ کے قریب باہوتو، اور واتوسی، بگل اور شہنائیاں بجاتے ہوئے بڑے جوش و خروش میں میدان میں آکر جمع ہو جاتے ہیں۔ ان تمام کا ایک مخصوص لباس ہوتا ہے۔ ان کی چھاتیوں پر موتیوں اور پھولوں کے صلیبی نشان بنے ہوئے ہوتے ہیں۔ سب کی کمروں میں تیندوے کی کھال کی پیٹیاں بندھی ہوتی ہیں۔

جن کے ساتھ سمور کے فیتے لٹکے ہوئے ہیں ٹخنوں کے ساتھ چھوٹے چھوٹے گھنگروؤں کے گچھے اور سروں پر خوب صورت پروں کی کلغیاں بڑے دل فریب انداز میں جھوم رہی ہوتی ہیں۔ تمام رقاص قوس کی شکل میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔ رہنما آگے بڑھتا ہے۔ اس کے جسم پر نہایت شوخ اور چمکدار سرخ رنگ کا فرغل ہوتا ہے۔ اس کی ٹانگوں اور کمر کی حرکت کے ساتھ یہ فرغل آگ کے شعلوں کی طرح لہراتا ہے۔ عجیب انداز میں پھیلتا ہے اور سکڑتا ہے۔ تمام رقاص لیڈر کی تقلید میں اپنے ہاتھوں اور پاؤں کو حرکت میں لاتے ہیں رہنما غیر معمولی بلندی پر اُبھر کر جسم کو چکر دیتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا وہ ہوا میں تیر رہا ہے اس کے عضلات جسمانی اس کے اندرونی جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ اس کی لچکدار گردن روشن آنکھیں، عجیب مسرت کا پیغام بن جاتی ہیں۔ اس کا چہرہ۔ ہاتھوں کی چھڑی۔ سر کا پھندنا اس کے جسم کے اعضا معلوم ہوتے ہیں۔ وہ تیزی سے آگے بڑھتا ہے۔ یک لخت ایک جھٹکے سے جسم کو موڑتا اور اوپر اُبھر کر ہوا میں معلق ہو جاتا ہے۔ اور زمین پر آکر دائیں پاؤں کے انگوٹھے پر مسلسل دو دو منٹ تک گھومتا رہتا ہے۔ ڈھول اور شہنائیاں برابر بجتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زمین آسمان اور تمام کائنات رقص کر رہی ہے۔ کچھ وقت کے بعد وقفہ ہوتا ہے۔ اس وقفے میں تمام فن کار کورس کی صورت میں بادشاہ کی تعریف میں گیت گاتے ہیں۔

اور پھر سارس ناچ شروع ہوتا ہے۔ سارس حکمران خاندان کا مذہبی نشان ہے۔ سب کے سب فن کار سارس کا روپ دھار لیتے ہیں۔ ان کی گردنیں اور ٹانگیں سب سارس کے جذبات کی ترجمانی کرتی ہیں۔ سب سے آخر میں فوجی مارچ کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک فوجی دستہ جوش و خروش کے ساتھ آگے بڑھا چلا آرہا ہے اور اپنے سامنے حائل ہونے والی ہر چیز کو پاؤں کی ٹھوکر سے اڑاتا جا رہا ہے۔ ان کے قدم اس مضبوطی اور زور سے ایک ساتھ زمین پر پڑتے ہیں کہ زمین کانپتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ گرد کے بادل اُٹھ اُٹھ کر فضا میں تحلیل ہوتے گئے ہیں۔ سب مجاہد، تراتے گاتے ہوئے مارچ کرتے آگے بڑھتے ہیں۔ تماشائی تالیاں بجاتے اور نعرے لگاتے ہیں۔

داؤدسی عورتیں پردے کی سخت پابند ہیں۔ اس لیے ان کی تصویریں لینا کوئی آسان کام

نہیں۔ بہت کم غیر ملکی سیاح اس مقصد میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ لیکن پردے کی پابندی کے باوجود واتوسی عورتوں کو روونڈا میں بہت بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ ان کی حیثیت غلامانہ نہیں اور یہ شرف تمام براعظم میں صرف واتوسی بیگمات کو ہی حاصل ہے۔ انہیں ان کی مرضی کے خلاف شادی پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ انہیں طلاق کا بھی پورا پورا حق حاصل ہے۔ خاندانی معاملات میں ان کی رائے کا پورا پورا احترام کیا جاتا ہے اور کوئی فیصلہ ان کی رائے کے بغیر مکمل نہیں سمجھا جاتا۔ اسی سے واتوسی عورت کی ذہانت اور عقلمندی کا اندازہ ہو سکتا ہے ؎

والدین کو سخت ہونا چاہیے یا نرم؟

ادریس احمد

تادیب سے دست کشی

جدید نفسیاتی تحقیق نے بچوں کی تعلیم و تربیت کے عمل کو شدید طور پر متاثر کیا ہے۔ موجودہ صدی کے آغاز سے اب تک بچوں کی نشو و نما اور ان کے تعلم کے متعلق جو انکشاف ہوئے ہیں انھوں نے نہ صرف درس و تدریس کے تصور کو بدل دیا ہے بلکہ تربیت کے پرانے طور طریقوں کو بھی مشتبہ کر کے رکھ دیا ہے تاہم عملی تجربہ بتاتا ہے کہ ہر دوسرے انسانی معاملے کی طرح تعلیم و تربیت میں بھی اعتدال کی راہ ہی بہترین راہ ہے۔ جدید نفسیاتی تحقیق نے جن حقائق کے چہرے سے پردہ اٹھایا ہے ان میں بہت کچھ صداقت موجود ہے مگر بعض والدین اور اساتذہ ان نفسیاتی حقائق کو پُراسرار یا مقدس فطری قانون سمجھ کر تربیت کی بہترین راہ یہ خیال کرتے ہیں کہ بچوں اور نوجوانوں کو کسی بات سے نہ روکا جائے۔ وہ جو کچھ کرتے ہیں اپنے اندرونی تقاضوں کی وجہ سے کرتے ہیں۔ ان تقاضوں کو سختی سے دبا دینا انھیں ناپسندیدہ نکاسوں کی تلاش پہ مجبور کرتا ہے۔ اس سے طرح طرح کی ذہنی الجھنیں جنم لیتی ہیں جو عمر بھر انسان کا پیچھا نہیں چھوڑتیں اور اس کی شخصیت کو ایک روح کش بوجھ تلے دبائے رکھتی ہیں۔

اس خیال کے پیش نظر مغربی ملکوں کے بیشتر والدین اپنے بچوں کو ان کے اپنے حال پہ چھوڑنے لگے ہیں۔ انھیں یہ یقین ہے کہ بچے کو دانستہ طور پہ متاثر کرنے کی کوشش کرنا اسے زہر دینے کے برابر ہے عادات و اطوار، ذوق پسند، لباس، خوراک، اور عام طور طریقوں کے معاملے میں وہ بچوں کو کھلی چھوٹ دینے کے قائل ہیں۔ وہ نہ اس بات کو پسند کرتے ہیں کہ اپنی اولاد کو پسندیدہ معیاروں کا سبق دیں نہ اس بات کو کہ انھیں کسی چیز سے روکیں۔ اس طرز عمل کے پیچھے وہ سستے نفسیاتی نظریے کام کر رہے ہیں جو فرائیڈ اور اس کے چیلوں نے عام کیے ہیں۔ ان نظریوں کا لب لباب یہ ہے کہ انسانی جذبات میں جو

م پیدا ہوتے ہیں ان کا بیج عام طور پر بچپن میں بویا جاتا ہے۔ جب والدین جبر و اکراہ سے کام لیتے ہیں تو ہ اپنی بے بسی کے باعث ان کے سامنے سر جھکانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اس طرح بظاہر وہ معیاری طور طریقے ختیار کر لیتا ہے اور والدین خوش ہو جاتے ہیں۔ مگر اس ظاہری اطاعت گزاری کے نیچے جذباتی بغاوت پرورش ی رہتی ہے۔ جبر و اکراہ بغاوت کے ان جذبات کو کھل کر باہر آنے کی اجازت نہیں دیتے۔ اس لیے باغی جذبات کا تلاطم نہاں خانہ دل کے کسی اندھیرے گوشے میں چھپ جاتا ہے، والدین، اساتذہ اور خود بچہ اس جذباتی لاطم سے بے خبر ہو جاتا ہے۔ تاآں کہ مابعد کی زندگی میں جب بچہ بالغ ہو کر زندگی کی ذمہ داریاں سنبھالتا ہے یہ چھپا ہوا جذباتی تلاطم کسی دن ناگہانی طور پر جوالا مکھی لاوے کے پہاڑ کی طرح پھٹ کر باہر نکل آتا ہے اور سب کے لیے حیرت اور پریشانی کا موجب بنتا ہے۔ اگر جذبات کا یہ لاوا اس طرح پھوٹ کر باہر نہ نکلے تو بھی یہ پنے مالک کو جذباتی اور ذہنی طور پر بیمار رکھتا ہے اور اس کی تخلیقی قوتوں کو اپاہج کر کے رکھ دیتا ہے۔

فرائیڈ کے اس نظریے کو علم الحیات کے اس انکشاف نے اور سہارا دیا ہے کہ انسانی نشو و نما ایک مقررہ اسلوب اور پہلے سے طے شدہ رفتار پر جاری رہتی ہے: بچے کے اعضاء و قواء پیدائش کے وقت سے لے کر بختگی کی عمر کو پہنچنے تک خود بخود نشو و نما کی مقررہ منزلیں طے کرتے جاتے ہیں، بشرطیکہ کوئی موانع اس خود کار بالیدگی کا راستہ نہ روک دیں۔ اس علمی انکشاف سے عام طور پر مراد یہ لی جاتی ہے کہ جب بچہ کوئی ایسی حرکت کرتا ہے جو بالغوں کے نقطۂ نگاہ سے غیر پسندیدہ ہے تو بچہ فی الحقیقت اپنے کسی ناگزیر اندرونی تقاضے کو پورا کر رہا ہوتا ہے۔ لہٰذا بالغوں کو چاہیے کہ صبر و سکون سے کام لیں اور بچے کو اپنے حال پر چھوڑ دیں۔ رفتہ رفتہ ایسا وقت آئے گا جب بچہ نشو و نما کی ایسی منزل پر پہنچ جائے گا جہاں اسے یہ حرکت لغو اور بیہودہ دکھائی دے۔ اس طرح وہ اس ناشائستہ حرکت سے خود بخود باز رہنے لگے گا۔

افسوس ناک نتائج

اس نام نہاد نفسیاتی اور علمی استدلال نے عام امریکی والدین پر عجیب بے بسی مسلط کر دی ہے۔ اس کا اندازہ مندرجہ ذیل قسم کے واقعات سے ہو سکتا ہے جو آئے دن رونما ہوتے رہتے ہیں۔

بچہ ماں یا باپ کے منہ پر ایک چپت یا جسم پر ایک ضرب لگاتا ہے۔ اس کی یہ ناشدنی حرکت

قدرتی طور پر یہ ردّ عمل پیدا کرتی ہے کہ جواباً اس کی سرزنش کی جائے تاکہ وہ آئندہ اس حرکت سے باز رہے مگر نام نہاد نفسیاتی اور علمی استدلال فوراً والدین کے اس فطری ردّ عمل پر آن سوار ہوتا ہے اور وہ اس خیال سے کہ بچے کی یہ حرکت اس کے ناگزیر اندرونی تقاضوں کی پیداوار ہے۔ اپنے فطری ردّ عمل کو سختی سے لگام دے لیتے ہیں اور اپنی تسلی اس خیال سے کر لیتے ہیں کہ زود و دیر یہ بچہ از خود نشوونما کی ایسی منزل پر پہنچ جائے گا جہاں اسے والدین پر ہاتھ اُٹھانا سخت معیوب نظر آئے گا۔

یا ایک نو سالہ بچہ اصرار کرتا ہے کہ وہ فلاں فلم دیکھنے جائے گا جس کے متعلق والدین کو علم ہے کہ وہ قتل و غارت اور جرم و گناہ کے منظروں سے بھرپور ہے۔ والد بیوی کی طرف نظر اٹھا کر کہتا ہے "تمہارا کیا خیال ہے؟ اسے یہ فلم دیکھنی چاہیے؟

بیوی جواباً خاوند کی طرف نظر اٹھا کر کہتی ہے "آپ کا کیا خیال ہے؟ اسے یہ فلم دیکھنی چاہیے؟

بچہ ماں باپ کا یہ گومگو اور غیر یقینی رویہ دیکھ کر اور مچلتا ہے اور غصے بھرے لہجے میں کہتا ہے:۔ "آخر اس میں حرج کیا ہے؟ باقی سبھی یہ فلم دیکھتے ہیں"۔ یہ کہہ کر وہ چلتا بنتا ہے اور ماں باپ اس کا منہ تکتے رہ جاتے ہیں۔ اگرچہ وہ دونوں اس بات کو اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ یہ فلم بچے کے اخلاق پر بُرا اثر ڈالے گی۔ تاہم ان کے اس یقین کی راہ میں یہ چیز حائل ہے کہ اگر انھوں نے بہ جبر اپنی پسند بچے پر ٹھونسی تو اس کے نتائج اس مخرب اخلاق فلم سے بھی زیادہ نقصان دہ ثابت ہوں گے۔

ایک چار سالہ بچی اس بات کی عادی ہو چکی ہے کہ جب بھی وہ اپنے ننھے بھائی کو بوتل سے دودھ پیتے دیکھتی ہے جھٹ دودھ کی بوتل چھین کر اپنے منہ سے لگا لیتی ہے، مگر ماں اسے کچھ نہیں کہتی۔ اسے ڈر ہے کہ اگر بچی کو اس حرکت سے سختی سے روکا گیا تو اس سے اس کے نہاں خانہ دل میں مدافعت کے جذبات پیدا ہوں گے جو نہ معلوم آگے چل کر کیا کیا قباحتیں پیدا کریں گے۔ چناں چہ وہ اس بات کا اہتمام کرتی ہے کہ جب بھی بچے کو دودھ پلایا جائے اس کی بہن پاس موجود نہ ہو۔

ایک اور ماں دیکھتی ہے کہ اس کی چھوٹی لڑکی مدرسے کا کام کرتے وقت نہایت لاپرواہی سے لکھتی ہے۔ ماں اسے صفائی اور عمدگی سے لکھنے کو کہتی ہے۔ جواب ملتا ہے کہ سبھی اس طرح لکھ کر لاتے ہیں

ں اس کا منہ تکتی رہ جاتی ہے۔ وہ خوب جانتی ہے کہ لڑکی کا خط ہمیشہ کے لیے خراب ہو جائے گا۔ مگر اس کے
قابلے میں اسے یہ خوف بھی کھائے جا رہا ہے کہ اگر خوش خطی کی دھن میں اس نے لڑکی کو زیادہ احتیاط
تنے پر مجبور کیا تو اس سے اس کی جذباتی اور ذہنی نشوونما اس طرح مجروح ہو جائے گی کہ جس کے سامنے
خطی کی کوئی حقیقت نہیں۔

یر فطری طرز عمل

مغربی ملکوں کی تقلید میں ہمارے یہاں بھی بچوں کو رفتہ رفتہ ہر قسم کی روک ٹوک سے بالا سمجھا جانے لگا ہے
یشن خیال والدین عموماً فرائیڈ اور اس کے ہم خیال لوگوں کے نظریوں سے متاثر نظر آنے لگے ہیں۔ لیکن خود
غرب میں اس طرز عمل کے خلاف آوازیں اٹھنے لگی ہیں۔ مثلاً ایک انگریز ماں اس موضوع پر اپنے خیالات کا
یوں اظہار کرتی ہے :-

مجھے یہ یقین دلایا گیا تھا کہ اگر والدین بچوں کو ہر قسم کے ڈر، ناکامی کے احساس اور غصے کے اظہار سے
پا سکیں تو وہ بڑے ہو کر خود بخود نیک و بد، سچ اور جھوٹ، پسندیدہ اور ناپسندیدہ کے درمیان تمیز کرنے
لیں گے۔ میرا یہ عقیدہ تھا کہ ماں باپ کو بچے کے متعلق منفی جذبات کا اظہار کبھی نہ کرنا چاہیے۔ لیکن اب
ئی سال کے عملی تجربے کے بعد مجھ پر یہ راز کھلا ہے کہ اس قسم کا طرز عمل نہ صرف غیر فطری ہے بلکہ غیر انسانی
بھی۔ مجھے کم از کم ان ننھی انسانی ہستیوں کے متعلق یہ طرز عمل اختیار نہیں کرنا چاہیے جنھیں میں دنیا میں سب سے
یادہ عزیز رکھتی ہوں۔

والدین کو چاہیے کہ بچوں کے ساتھ معاملہ کرتے وقت نام نہاد سائنس کی حدود سے آگے دیکھیں۔
ہم ملکہ وکٹوریہ کے زمانے کی تحکم پسندی کو خیرباد کہہ چکے ہیں۔ یہاں تک تو خیر تھی مگر مصیبت یہ ہے کہ ہم
اس زمانے کی "فرسودہ" قدروں کو بھی چھوڑ چکے ہیں۔ مگر ان قدروں کے بدلے ہم نے کس چیز کا سہارا لیا ہے؟
ایک منحوس قسم کی بے یقینی کا ہمیں قطعی طور پر کچھ علم نہیں کہ بچوں کے لیے کونسی چیز اچھی ہے اور کونسی بری۔ ہم
ہم بچے کے آئندہ طرز عمل کی کوئی ذمہ داری بھی اپنے اوپر لیتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے
بچے اس فطری سلامتی سے بھی محروم ہو کر رہ گئے ہیں۔ جو دوسرے حیوان اپنے بچوں کو عطا کرتے ہیں"۔

اپنے نقطہ نگاہ کی وضاحت کے لیے یہ برطانوی خاتون ایک مثال پیش کرتی ہیں۔ ان کی ایک سہیلی نے ان سے بیان کیا کہ میرا دس سالہ لڑکا اپنے ایک ساتھی کے ساتھ مل کر معمولی قسم کی چوری کرنے لگا تھا۔ اس کے باپ نے ایک دراز میں کچھ رقم جمع کر رکھی تھی، وہ جب رات کو گھر آتا، اس دراز میں چند سکے ڈال دیتا۔ ایک دن دراز خالی نظر آیا۔ ادھر ادھر تلاش کرنے پر یہ رقم ایک جگہ چھپائی ہوئی مل گئی۔ یہ حرکت دونوں لڑکوں نے مل کر کی تھی۔ ماں نے جب بیٹے کے اس کارنامے کا ذکر اس سے کیا تو وہ ہنس کر کہنے لگا کہ میں یہ آزمانا چاہتا تھا۔ آیا میں ایک جرم مکمل طور پر انجام دینے میں کامیاب ہو سکتا ہوں یا نہیں۔ ماں اس جواب سے خوش ہوئی اور نرمی سے بولی: "بیٹا تمہیں اس طور پر قرضہ حاصل نہیں کرنا چاہیے"

اس مثال سے استدلال کرتے ہوئے یہ انگریز خاتون کہتی ہیں کہ ماں نے یقیناً اپنے بیٹے کے ساتھ بے انصافی کی۔ لڑکا اچھی طرح جانتا تھا کہ اس نے ایک جرم کیا ہے۔ وہ چوری اور قرض کے درمیان فرق بھی اچھی طرح سمجھتا تھا۔ اسے یہ بھی علم تھا کہ اس کے ماں باپ چوری اور قرض کے فرق کو اس کی نسبت بہتر طور پر سمجھتے ہیں۔ ان ساری باتوں کے باوجود ماں نے چوری کو قرض کا نام دیا۔ کیا یہ اس کی بددیانتی نہ تھی؟ کیا اس سے لڑکا یہ یقین کرنے میں حق بجانب نہ تھا کہ اس کے ماں باپ چوری کو برا نہیں سمجھتے؟ یا یہ کہ انہیں اس کے طرز عمل کی مطلق پرواہ نہیں؟ یا یہ کہ وہ اس سے ڈرتے ہیں؟ لڑکے نے ماں کے طرز عمل سے کچھ بھی نتیجہ نکالا ہو، یہ بات یقینی ہے کہ اس کا ذہن صاف ہونے کی بجائے گدلا ہوا ہوگا اس واقعہ نے اس کی زندگی کے راستے کو ہموار کرنے کی بجائے اسے گڑھوں سے بھر کر رکھ دیا ہوگا۔

اگر یہ کمزور اور راحت زادانہ رویہ اختیار کرنے کی بجائے ماں مضبوط لہجہ اختیار کرتی اور لڑکے کو صاف لفظوں میں کہتی کہ تو نے چوری کی ہے جو ایک بے حد سنگین اخلاقی جرم ہے اس کی سزا تجھے ضرور ملے گی تو زیادہ اغلب یہ ہے کہ لڑکا اپنے جرم کی نوعیت کو بہتر طور پر سمجھنے لگتا۔ بعد میں اسے سزا ملتی یا نہ ملتی لیکن اس کے دل میں افسوس کے جذبات ضرور پیدا ہوتے جو آئندہ اسے چوری کی طرف مائل ہونے سے روکتے۔ اگر ماں یہ آخری طریق اختیار کرتی تو وہ لڑکے پر یقیناً ایک احسان کرتی۔

بطور ماں اس کا یہ فرض تھا کہ اپنے جگر گوشہ کو برائی کے گڑھے میں گرنے سے بچائے۔ مگر اس نے نام نہاد نفسیاتی نظریوں کے زیر اثر جو وطیرہ اختیار کیا وہ صریحاً غیر فطری بھی تھا اور بچے کے لیے حد درجہ نقصان دہ بھی۔

بچوں کے متعلق اس قسم کا رویہ اتنا عام ہو گیا ہے کہ اب یہ ترقی پسندی اور روشن خیالی کی دلیل سمجھا جانے لگا ہے۔ بچے ماں باپ کے سامنے بلی کو گیند کی طرح زچ کرتے ہیں۔ اپنے کمزور ساتھیوں کو عجیب و غریب طریق پر پریشان کرتے ہیں مگر ماں باپ بھاگا نہ دیکھا ایک کر کے یوں چپ سادھے رکھتے ہیں جیسے ان کا بچہ کچھ کر ہی نہیں رہا۔ اس قسم کی مادر پدر آزادی پست حیوان بھی اپنے بچوں کو نہیں دیتے جب کسی حیوان کا بچہ ضرورت سے زیادہ شرارتی پر اتر آئے یا ماں باپ کے منہ آنے لگے تو اسے بڑی تیزی سے مناسب سبق سکھا دیا جاتا ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ جدید سائنسی دور کا انسان اپنے بچوں کو اتنا سہارا بھی نہیں دیتا جتنا دوسرے حیوان اپنے بچوں کو دیتے ہیں۔

مضبوط طرز عمل کی ضرورت

صاحب نظر مغربی عالم اب سنجیدگی سے یہ محسوس کرنے لگے ہیں کہ بد لگام آزادی بچوں کے لیے مفید نہیں مضر ہے۔ متبادل صورتوں میں سے کسی ایک صورت کے حق میں فیصلہ کرنا کافی مشکل کام ہے۔ یہ وہ ذمہ داری ہے جسے بہت سے بالغ بھی انجام نہیں دے سکتے۔ لہٰذا بچوں سے یہ مطالبہ کرنا کہ نیک و بد کے معاملے میں وہ کلی طور پر خود فیصلہ کریں ان کے ساتھ ظلم کرنا ہے۔ بچوں کو ایسے شفیق والدین کی ضرورت ہے جو انھیں نیک و بد کی حدود سے آگاہ کرتے رہیں۔ والدین کی طرف سے اس قسم کی دستگیری سلامتی کا احساس پیدا کرتی ہے۔ جو بچہ اس دستگیری سے محروم رکھا جاتا ہے وہ ذہنی طور پر حیران و پریشان رہتا ہے، وہ سمجھنے لگتا ہے کہ والدین اسے ضروری توجہ نہیں دے رہے۔ انھیں اس کے نفع نقصان کی کچھ پرواہ نہیں۔ اس قسم کا احساس یقینی طور پر عدم سلامتی کے جذبات کو جنم دیتا ہے جو شخصیت کی صحت مند نشوونما کے لیے زہر ہلاہل کا درجہ رکھتے ہیں۔

ایک عالم نے حال ہی میں سترہ سال کی عمر کی لڑکیوں کے ایک گروہ کا مطالعہ کیا۔ ان کو ایک سوالنامہ دیا گیا جس کا مقصد یہ معلوم کرنا تھا کہ آیا وہ سخت طبع والدین کو زیادہ پسند کرتی ہیں یا نرم طبع والدین کو

نرم طبع انھوں نے سخت طبع والدین کے حق میں فیصلہ دیا۔

ایک لڑکی نے اپنے فیصلے کی وضاحت کرتے ہوئے کہا میرے والدین بہت نرم طبع واقع ہوئے۔ جب میں ابھی چھوٹی تھی تو شام کے کھانے کے بعد گلی میں دوسرے بچوں کے ساتھ کھیلنے کے لیے آتی۔ جب ذرا اندھیرا چھانے لگتا تو میری ایک ننھی سہیلی کہتی بہن آٹھ بج رہے ہیں۔ مجھے اب جانا ہے۔ اگر ذرا اور دیر ہو گئی تو امی مجھے جان سے مار دیں گی۔ دوسری لڑکی کا والد اسے کھڑکی میں سے آواز دیتا اور وہ گھر کو بھاگ جاتی۔ اس طرح ایک ایک کرکے تمام لڑکیاں اپنے گھروں کی راہ لیتیں اور میں گلی میں بالکل اکیلی رہ جاتی۔ میرے دل میں رہ رہ کر خیال آتا کہ کاش میرے ماں باپ کو بھی میری پرواہ ہوتی اور وہ بھی مجھے گھر آنے کو کہتے۔ مگر یہ تمنا کبھی پوری نہ ہوتی اور آخر تھک ہار کر خود ہی اپنے گھر کی راہ لیتی۔"

ظاہر ہے کہ اس لڑکی کے والدین اس سے اسی طرح محبت کرتے تھے جس طرح دوسرے بچوں کے والدین۔ مگر وہ اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ بچی کو کھیل سے واپس بلانا اس کی آزادی پر بے جا ناگوار پابندی لگانا ہے۔ اس غلط خیال کے تحت وہ اپنے اس فطری میلان کو دبائے رکھتے تھے کہ اندھیرا ہو جانے کے بعد لڑکی کو گلی میں نہیں رہنا چاہیے۔ گویا وہ جان بوجھ کر اپنے فطری جذبات کو دباتے تھے جو کسی طرح ایک پسندیدہ شے نہیں۔ دیانت داری کا تقاضہ یہ ہے کہ انسان اپنے دلی جذبات کو بروئے کار آنے دے۔ کم از کم اپنی اولاد کے ساتھ معاملہ کرتے وقت تو انسان کو ایسا ہی کرنا چاہیے۔ اگر وہ کسی ماہر نفسیات یا ماہر تعلیم کے نام نہاد نظریوں سے متاثر ہو کر ایسا نہیں کرتا تو وہ سر یکاری یا کاری سے کام لے رہا ہے اور ریاکاری کبھی اچھے نتائج پیدا نہیں کرتی۔

جدید دور کے والدین کو یہ نکتہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔ نفسیات اور علم التعلیم نے جس آزادی اور محبت کی فضا پر زور دیا ہے وہ مؤثر تعلم کی ضروری شرط ہے۔ یعنی بچے کو کوئی چیز سکھانے کے لیے اس کی دلچسپیوں کو اپیل کرنی چاہیے، نہ کہ اسے ڈرا دھمکا کر یہ چیز سیکھنے پر مجبور کرنا چاہیے۔ لکھائی پڑھائی سکھانے کے معاملے میں یہ سنہری اصول بے شک ناقابل انکار ہے۔ صاحب بصیرت لوگوں نے

ہر زمانے میں یہ نکتہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ انسانوں کے دلوں کو جبر و اکراہ سے نہیں بلکہ محبت و دلیل ہی سے بدلا جا سکتا ہے۔ ادع الی سبیل ربك بالحكمة والموعظة الحسنة کا ارشاد اسی نکتے کی تشریح ہے۔ جادلهم بالتي هي احسن کا ارشاد بھی اسی نکتے کی طرف توجہ دلاتا ہے۔

مگر تعلیم اور چیز ہے اور اخلاقی اور ثقافتی قدروں کے ساتھ وابستگی بالکل دوسری چیز۔ بے شک یہ قدریں بھی محبت اور شفقت کے ساتھ پیش کرنی چاہئیں مگر جب ان کے خلاف بغاوت ہوتی نظر آئے تو تادیب و سرزنش کا ہاتھ فوراً مصروف عمل ہو جانا چاہیے۔ آخر والدین، اولاد اسی لیے جننے اور پالتے ہیں کہ ان کے بچے انھی قدروں کے لیے جئیں جن کے لیے وہ خود جی رہے ہیں۔ اگر والدین اپنی پسند اور ناپسند بچوں پر ظاہر ہی نہ کریں اور قدروں کے انتخاب کے بارے میں انھیں بالکل اپنے حال پر چھوڑ دیں تو اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ وہ انجام کار مطلوبہ قدریں اخذ کر لیں گے۔ لہٰذا اخلاقی قدروں کے معاملے میں والدین کو بالکل مثبت اور مضبوط طرز عمل اختیار کرنا چاہیے۔ اس طرز عمل کے خلاف زیادہ سے زیادہ یہی کہا جا سکتا ہے کہ عین ممکن ہے کہ بچہ بغاوت پر اتر آئے۔ اگر بعض صورتوں میں بچے کا ردِ عمل فی الواقع باغیانہ قسم کا بھی ہو تو اسے کم از کم یہ احساس تو ضرور ہوگا کہ وہ کس چیز اور کن اشخاص کے خلاف صف آرا ہو رہا ہے ✣

معلومات عامہ

دنیا کی آبادی میں ہر سال ساڑھے چار کروڑ کا اضافہ

دنیا کے چار بڑے ملکوں یعنی عوامی جمہوریت چین، بھارت، روس اور ریاست ہائے متحدہ کی مجموعی آبادی ایک ارب چالیس کروڑ کے قریب ہے۔ یعنی دنیا کی نصف آبادی سے کچھ زیادہ ہے دنیا کی آبادی کا تخمینہ اس وقت دو ارب اسی کروڑ ہے۔ یہ بیان اعداد و شمار سے متعلق ایک کتاب میں درج ہیں جسے اقوام متحدہ نے سالنامۂ "پیدائش و اموات" کے نام سے شائع کیا ہے۔

اس سالنامے میں دنیا کے دو سو ستر علاقوں کی اطلاعات الگ الگ درج ہیں جن میں آزاد اور غیر مختار علاقے شامل ہیں۔ مذکورہ بالا سب سے زیادہ آباد چار ملکوں کے باشندوں کی تعداد یہ ہے۔ سرزمین چین ۶۴ کروڑ۔ بھارت ۴۰ کروڑ۔ روس ۲۰ کروڑ سے زیادہ اور ریاست ہائے متحدہ ۱۷ کروڑ سے زیادہ۔

ان کے علاوہ پاکستان، جاپان، انڈونیشیا، برازیل، برطانیہ اور وفاقی جمہوریت جرمنی کا ذکر بھی خصوصیت سے کیا گیا ہے۔ ان میں سے ہر ملک کی آبادی پانچ کروڑ سے زیادہ ہے۔

سالنامے کی ضخامت بڑے سائز کے ۷۰۵ صفحات ہے۔ اس میں آبادی کے موجودہ رجحانات اعداد و شمار اور جملہ معلومات درج ہیں۔ اسے اقوام متحدہ کے محکمۂ اعداد و شمار نے مرتب کیا ہے۔ اور سرکاری اعداد و شمار کو بین الاقوامی صورتیں جمع کرنے اور دوسروں کو پہنچانے کا جو پروگرام بنایا گیا ہے، یہ کتاب اس کا ایک جزو ہے۔ اس میں رقبہ، آبادی، پیدائش و اموات، پیٹ میں مرنے والے بچوں کی تعداد، شادی اور طلاق کے اعداد و شمار علاقہ وار درج ہیں۔

عالمگیر بنیاد پر آبادی میں اضافے کی جو رفتار ۱۹۵۸ء میں رہی وہ اتنی تھی جتنی کہ پچھلے چند سال میں محسوب کی گئی تھی یعنی ۱۰۶ فی صد یا ساڑھے چار کروڑ نفوس سالانہ۔ یہ تعداد فرانس جیسے ایک

بڑے ملک کے کل باشندوں کے برابر ہے۔

یہ سالانہ اضافہ اس تخمینے پر مبنی ہے کہ دنیا میں رفتارِ پیدائش ۳۴ فی ہزار ہے جس کے مطابق ہر سال ساڑھے نو کروڑ بچے پیدا ہوتے ہیں۔ شرحِ اموات کا تخمینہ ۱۸ فی ہزار ہے جس کے مطابق میزان میں سے پانچ کروڑ کر دیے گئے ہیں۔ اس طرح آبادی میں خالص اضافے کی رفتار ساڑھے چار کروڑ اشخاص فی سال ہوتی ہے۔ بالفاظ دیگر ہر گھنٹے میں پانچ ہزار سے زیادہ یا ہر ایک منٹ میں تقریباً ۸۰ اشخاص دنیا کی آبادی میں بڑھ جاتے ہیں۔

دنیا کی نصف آبادی اس وقت ایشیا میں ہے۔ اور اندازہ ہے کہ سنہ ۲۰۰۰ء تک کل میزان میں اس براعظم کا حصہ تقریباً ساٹھ فی صد ہو جائے گا۔ اس وقت دنیا کے صرف ۱۳ فی صد باشندے یورپ میں رہتے ہیں۔ اگر موجودہ رجحانات بدستور قائم رہے تو اس صدی کے آخر تک وہاں دس فی صد کی کمی ہو جائے گی۔

چند ایشیائی ملکوں کی آبادی	
پاکستان	۸،۵۶،۳۵،۰۰۰
بھارت	۳۹،۷۵،۴۰،۰۰۰
سرزمین چین	۶۷،۰۰،۰۰،۰۰۰
انڈونیشیا	۸،۴۹،۰۰،۰۰۰
ایران	۱،۹۷،۲۳،۰۰۰
عراق	۶۵،۳۸،۰۰۰
جاپان	۹،۱۴،۰۰،۰۰۰
ترکی	۲،۵۵،۰۰،۰۰۰
لبنان	۱۵،۲۵،۰۰۰
برما	۲،۰۲،۵۵،۰۰۰

ایک شہری ریاستوں مثلاً موناکو، مکاؤ اور ہانگ کانگ میں آبادی کی گنجانی دو ہزار سے تیرہ ہزار اشخاص فی مربع کلومیٹر ہے۔ لیکن ان سے قطع نظر سب سے زیادہ گنجان آباد ملکوں اور علاقوں میں بعض جزیرے شامل ہیں۔ مثلاً مالٹا، گورنزے، برموڈا، اور جزائر رود بار۔ ان میں سے ہر ایک میں آبادی پانچ سو اشخاص فی مربع کلومیٹر سے زیادہ ہے۔ ان کے فوراً بعد نیدرلینڈز، ماریشس، بلجیم، چین اور پیورٹو ریکو کا نمبر ہے: ان سب میں اوسطاً ڈھائی سو اشخاص فی مربع کلومیٹر ہے۔

اس کے برعکس ترازو کے دوسرے پلڑے میں دیکھا جائے تو ہسپانوی صحرا، بیچوانالینڈ، گرین لینڈ، الاسکا، فرانسیسی گنی اور آسٹریلیا ہیں۔ جہاں گنجانی ایک شخص فی مربع کلومیٹر ہے۔ اور

کنیڈا، اور آئس لینڈ میں بھی صرف دو اشخاص فی مربع کلومیٹر ہے۔ بڑے ملکوں پر نظر ڈالی جائے تو ریاستہائے متحدہ کے ہر مربع کلومیٹر میں ۲۲ اشخاص ملیں گے جو بہت کم اوسط ہے۔

براعظموں کے اعتبار سے حساب لگایا جائے تو گنجانیٔ آبادی کے لحاظ سے یورپ کا نام سرِفہرست ہے۔ جہاں اوسط ۹۲ فی مربع کلومیٹر ہے۔ وسطی یورپ کی آبادی اتنی ہی ہے جتنی کہ شمال مغربی حصوں میں ہے۔ لیکن اوسط گنجانی دوگنی ہے یعنی ۶۲ کے مقابلے میں ۱۳۳، اشخاص فی مربع کلومیٹر ہے۔

چند یورپی ملکوں کی آبادی	
برطانیہ	۵،۱۶،۸۱،۰۰۰
اٹلی	۴،۸۶،۳۵،۰۰۰
فرانس	۴،۴۵،۰۰،۰۰۰
پولینڈ	۲،۸۳،۰۰،۰۰۰
اسپین	۲،۹۶،۷۷،۰۰۰
یوگوسلاویہ	۱،۸۳،۹۶،۰۰۰
سوئٹزرلینڈ	۵۱،۳۷،۰۰۰
سویڈن	۷۴،۱۳،۰۰۰
نیدرلینڈز	۱،۱۱،۷۳،۰۰۰
ناروے	۳۴،۹۴،۰۰۰

ایشیا کا بحیثیت مجموعی دوسرا نمبر ہے جہاں آبادی کا اوسط ۵۷ فی کلومیٹر ہے۔ لیکن جنوبی وسطی ایشیا میں ایک سو آدمی ایک مربع کلومیٹر کے رقبے میں آباد ہیں۔ یورپ اور ایشیا کی گنجانیوں کا مقابلہ کیا جائے تو اعداد و شمار سے پتہ چلے گا کہ یہ تفاوت محض عارضی ہے کیوں کہ ایشیا کی آبادی ۱ر۹ فی صد فی سال کے حساب سے بڑھ رہی ہے۔ جبکہ یورپ میں یہ رفتار صرف ۰ر۷ ہے اس طرح ایشیا میں اضافہ ہوگا اور یورپ میں نسبتاً کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ بلکہ جتنی اب ہے اتنی ہی رہے گی

ساری دنیا میں سنہ ۱۹۵۳ء اور سنہ ۱۹۵۸ء کی درمیانی مدت میں اوسط شرح پیدائش کا اندازہ تقریباً ۳۴ فی ہزار تھا۔ یہ تخمینہ پھیلانے کے وقت دو سو سے زیادہ درج شدہ پیدائش کی شرحیں مدنظر رکھی گئی تھیں۔ ان کے مطابق اس مدت میں سب سے کم رفتار پیدائش گیارہ فی ہزار (ارگوئے میں) اور ساٹھ فی ہزار (نئی جمہوریت گنی میں) تھی۔

اس زمانے میں جو اطلاعات موصول ہوئی ہیں ان کی بنیاد پر کہا جا سکتا ہے کہ افریقہ اور جنوبی اور وسطی امریکہ میں رفتار پیدائش سب سے زیادہ اور یورپ میں اور افریقہ اور اوشیانا میں رہنے والے

یورپی یا غیر مقامی باشندوں میں سب سے کم تھی۔ گنی، شمالی رہوڈیشیا، سوڈان اور روانڈا رنڈی میں رفتار پیدائش علی الترتیب ۶۰، ۵۷، ۵۲، ۵۱ اور ۵۰ فی ہزار تھی، جبکہ گوائی مالا، پیرا گوئے اور ال سلویڈور میں ۴۹ اور ایکویڈور اور میکسیکو میں ۴۷ تھی۔

ان کے برعکس ان ملکوں کی رفتار پیدائش میں نمایاں تفاوت محسوس ہوگا۔ جنوبی کوریا میں ۱۰ فی ہزار اور ناروے میں ۱۱ فی ہزار، سویڈن میں ۱۵ فی ہزار، مشرقی جرمنی میں ۱۶ فی ہزار اور انگلستان اور ویلز میں ۱۶ فی ہزار۔

سب سے زیادہ اور سب سے کم رفتار پیدائش کا اوسط نکالا جائے تو وہ ریاست ہائے متحدہ اور روس کی رفتار پیدائش کے برابر ہوگا۔ یعنی تقریباً ۲۵ فی ہزار۔ ایک سو ۴ ملکوں اور علاقوں کے اعداد و شمار پچھلے دو سال کے درج کیے گئے ہیں۔ ان پر نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۷ ملکوں میں رفتار پیدائش بڑھی اور ۵۷ میں گھٹی ہے۔ بالفاظ دیگر اوسط نکالی جائے تو معلوم ہوگا کہ رفتار زیادہ یا ایک حد تک استوار رہی جن ملکوں میں تبدیلیاں نمایاں ہیں ان کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ جہاں رفتار زیادہ تھی، اور زیادہ ہو گئی اور جہاں کم تھی زیادہ کم ہو گئی۔

۱۹۵۵ء اور ۱۹۵۸ء کے درمیان شرح اموات ۳۴ ملکوں میں بڑھتی اور ۵۷ ملکوں میں گھٹتی رہی اور اس طرح پیدائش و اموات سے متعلق اس نظریے کی تصدیق ہو گئی کہ ۱۹۳۰ء سے اب تک مرنے والوں کی رفتار تیزی سے گھٹ رہی ہے۔ اگرچہ یہ کمی عالمگیر نوعیت کی ہے اور بعض علاقوں میں تو حیرت انگیز ہے۔ تاہم ایشیا اور افریقہ میں مرنے والوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ مثلاً گنی میں یہ اوسط ۴۰ فی ہزار، نیپال میں ۳۰ فی ہزار، بھارت میں ۲۴ فی ہزار، بلجین کونگو میں ۲۲ فی ہزار اور برازیل میں ۲۱ فی ہزار ہے۔ اس کے برعکس غیر مختار علاقوں میں یورپی آبادی کا حال ہے۔ ان علاقوں میں یورپی لوگ نسبتاً نوجوان ہیں اور اس لیے ان کی شرح اموات کم ہے اس کے بعد اسرائیل کا نمبر ہے۔ ۱۹۵۸ء میں وہاں مرنے والوں کی رفتار ۶.۵ فی ہزار، آئس لینڈ میں ۷ فی ہزار، نیدرلینڈز میں ۷.۵ فی ہزار، روس میں ۷.۸ فی ہزار، کینیڈا میں ۸.۲ فی ہزار

اور جاپان میں ۲۲ء ۸ فی ہزار تھی۔ تقریباً دو سو ملکوں میں شرح اموات کا حساب لگایا گیا تھا۔ ان میں سے ۹۰ فی صد ملکوں میں شرح اموات ۲۰ فی ہزار سے کم تھی اور ۵۰ فی صد ملکوں میں ۱۰ فی ہزار سے بھی کم تھی۔ اس سے زیادہ کمی کا قیاس بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس رپورٹ سے ظاہر ہے کہ شرح اموات برابر اس طرح گھٹتی رہی ہے کہ اس کی مثال نہیں مل سکتی اور کمی کا سلسلہ جاری ہے۔

سالنامہ پیدائش و اموات میں لکھا ہے کہ وضع حمل کے وقت جو اموات واقع ہوتی ہیں انکی تعداد گھٹتی رہی ہے۔ حساب لگایا گیا ہے کہ ہر ایک ہزار زندہ پیدا ہونے والے بچوں میں سے چار وفات پا جاتے، برطانوی گنی، سیلون، چلی اور ریاست ہائے متحدہ میں تین سویڈن میں اور پانچ اسکاٹ لینڈ، اسرائیل، ڈنمارک اور کینیڈا میں مر جاتے ہیں۔ بیس سال پہلے کی حالت سے مقابلہ کیا جائے تو زبردست تفاوت پایا جائے گا۔ اس وقت مرنے والی ماؤں کی اوسط اب کے مقابلے میں دس گنی زیادہ تھی۔ اسی طرح ایسے شیر خوار بچوں کی تعداد بھی بڑھ رہی ہے جو عمر کے پہلے سال میں فوت ہو جاتے تھے۔ ۱۹۵۵ء اور ۱۹۵۶ء کے درمیان مرنے والے شیر خوار بچوں کی تعداد کا جائزہ ۱۲۶ ملکوں میں لیا گیا تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۹۵ ملکوں میں کمی ہو رہی ہے۔ پہلے کی طرح شیر خوار بچوں کی سب سے کم شرح اموات یورپ میں پائی جاتی ہے۔ اور وہاں بھی آئس لینڈ، نیدر لینڈز اور سویڈن میں سب سے ہی کم ہے۔ یعنی ہر ایک ہزار زندہ پیدا ہونے والے بچوں میں سے ۱۷ فوت ہوتے ہیں ۱۹۵۷ء کے ریکارڈ سے ۱۷۰ ملکوں کا جائزہ تیار کیا گیا تھا، ان میں سے ۴۲ ملکوں کی شرح اموات ۲۵ فی ہزار یا ۵ء ۲ فی صد سے کم تھی۔ یہ شرح اس زمانے میں بہت ہی کم سمجھی جاتی ہے۔ ان ۴۲ کے بعد ریاست ہائے متحدہ کا نمبر ہے۔ جہاں شرح اموات ۲۶ فی ہزار تھی۔

لیکن اگرچہ ان ملکوں میں بچوں کی وفات دنیا کے بہت سے ملکوں میں اس کم درجے کی سطح تک آ گئی ہے۔ تاہم بہت سے ملکوں میں شرح اب بھی بہت زیادہ ہے۔ ۴۳ علاقوں میں دس فی صد سے زیادہ نوزائیدہ بچے ایک سال کی عمر کو پہنچنے سے پہلے فوت ہو جاتے ہیں ان میں سے ایک تہائی افریقہ میں ہوتے ہیں۔ اور باقی دنیا کے دوسرے علاقوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اس

اس فہرست میں شمالی رہوڈیشیا کا نام سب سے اوپر ہے۔ جہاں ہر ایک ہزار زندہ پیدا ہونیوالے بچوں میں سے ۹۵ فوت ہو جاتے ہیں۔ بھارت، برازیل، برما، نیاسالینڈ، بلجین کونگو اور متحدہ عرب جمہوریت کے مصری علاقے میں شیر خوار بچوں کی شرح اموات ۱۴۰ فی ہزار سے بھی زیادہ ہے بچوں کی شرح اموات کا اندازہ لگا کر ہی یہ فیصلہ کیا جاتا ہے کہ معیار زندگی کیا ہے۔ اگر وہ مسلسل تخفیف کے بعد بہت کم درجے پر آجائے تو قدرتی طور پر اُسے معاشرتی ترقی منسوب کیا جائے گا۔

ناروے میں پیدا ہونے والی بچیوں کی توقع حیات اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ دنیا کا کوئی ملک اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اوسطاً ناروے کی ہر ایک لڑکی ۷۵ سال تک زندہ رہنے کی توقع کر سکتی ہے جب کہ اسی ملک کے لڑکوں کی اوسط توقع حیات ۷۱ سال ہے۔

اس موضوع پر ۷۶ ملکوں کا جائزہ لیا گیا تھا۔ ان میں سے ۲۷ ملکوں میں بچیوں کی توقع حیات ۷۰ سال سے زیادہ ہے۔ صرف تین ملکوں میں بچوں کی توقع حیات اتنی ہے۔ یہ نتیجہ موجودہ شرح حیات دیکھ کر نکالا گیا ہے۔

آج سے چند سال پیشتر ۷۰ سال کی اوسط توقع حیات بھی غیر معمولی کہی جا سکتی تھی۔ چنانچہ ۱۹۵۳ء میں اقوام متحدہ نے جو سالنامہ پیدائش و اموات شائع کیا تھا، اس سے ثابت کیا جا سکتا ہے کہ سب سے کم توقع حیات اب بھی بھارت میں محسوس کی جا سکتی ہے جہاں اس ضمن میں لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے اوسط ۳۲ سال ہے۔ گرین لینڈ میں بھی توقع حیات اتنی ہی ہے۔ لیکن صرف لڑکوں کے لیے۔ کیوں کہ لڑکیوں کے لیے توقع حیات کی اوسط بقدر ۴ سال زیادہ ہے۔ بھارت اور گرین لینڈ کے علاوہ گوئٹے مالا ایک ایسا ملک ہے جہاں توقع حیات لڑکیوں کے لیے ۴۰ سال سے کم ہے۔

جہاں تک لڑکوں کا تعلق ہے گوئٹے مالا میں اور اس کے علاوہ میکسیکو، بلجین کونگو اور متحدہ جمہوریت کے مصری علاقے میں لڑکوں کی توقع حیات کی اوسط لڑکیوں سے کم ہے۔ نصف سے زیادہ ملکوں میں لڑکے اوسطاً ۶۵ سال سے کچھ کم عمر تک زندہ رہنے کی توقع کر سکتے ہیں۔ لیکن لڑکیوں کے لیے یہ اوسط عمر ۷۰ سال ہے۔

فنی امداد ۔ ترقی کے لیے ایک مؤثر ذریعہ

اقوام متحدہ کی فنی امداد کے بورڈ نے اپنی سالانہ رپورٹ میں لکھا ہے کہ اقوام متحدہ اور مخصوص اداروں کا یہ پروگرام اپنے قیام کے بعد پہلے دس سال میں بے حد مفید ثابت ہوا ہے اور ضرورت مند ملکوں کو اپنی اقتصادی اور انسانی وسائل کی ترقی میں غیر معمولی امداد ملی ہے۔ لیکن یہ کام پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچا بلکہ بہت سی منزلیں ابھی باقی ہیں۔

رپورٹ کا سب سے بڑا موضوع، پروگرام شروع ہونے سے اب تک دس سال کی کارگذاری کا سیر حاصل خلاصہ پیش کرتا ہے۔ اس دوران میں ایک سو۔۴ ملکوں اور علاقوں نے امداد مانگی اور ان کو امداد دی گئی۔ اس ضمن میں آٹھ ہزار ماہرین نے خدمات انجام دیں اور چودہ ہزار طلبا اور سرکاری اہل کاروں کو موقع ملا کہ انھوں نے غیر ملکوں میں جا کر اعلیٰ تربیت حاصل کی۔

اقوام متحدہ کی یہ فنی امداد جن کاموں کے لیے دی گئی ان میں صنعت و حرفت، دستکاریاں زراعت تعلیم، پیشہ ورانہ تربیت، صحت، تعمیر مکانات، معاشرتی ترقی، شہری پرداز۔ برقی مواصلات پانی اور دوسرے وسائل کی ترقی، موسمیاتی خدمات، سرکاری نظم و نسق، اعداد و شمار کی خدمات اور اس سال کے شروع سے ایٹمی طاقت کے موضوعات شامل ہیں۔

پروگرام کو ممکن بنانے کے لیے ۸۵ حکومتیں اس سال کے آخر تک جو رضاکارانہ چندے دیں گی ان کا میزان ۳۴ کروڑ ۔ ۵ لاکھ ڈالر ہو جائے گا۔

رپورٹ میں لکھا ہے کہ ان پہلے دس سال میں بین الاقوامی امداد اور مخصوص اداروں کے درمیان تعاون کے طور پر یہ پروگرام ایک مؤثر آلہ ثابت ہوا ہے۔ علاوہ ازیں منصوبے مرتب کرنے، ماہرین کا انتخاب کرنے، کوششوں میں ربط و تعاون قائم رکھنے اور پیش آنے والی دقتوں کو دور کرنے کے لیے بڑے تجربات حاصل ہوئے ہیں۔ اور امکانی ترقیوں کے لیے بڑی راہیں کھول دی گئی ہیں۔ تاہم رپورٹ میں خبردار کر دیا ہے کہ ابھی اصل کام کا صرف آغاز ہوا ہے۔

رپورٹ میں یہ بھی لکھا ہے کہ ابھی کچھ عرصے تک غربت، بھوک، بیماری، جہالت اور معاشرتی

صعوبت کا دور دورہ رہے گا، اور یہ پریشانیاں قوموں کی ترقی کے لیے اور بین الاقوامی اداروں کے ذریعہ جو تعاون ممکن ہے، اس کی صلاحیتوں کے لیے زبردست چیلنج بنی رہیں گی۔ ان خرابیوں کو دور کرنے کے لیے جو طاقتیں بروئے کار لائی جا رہی ہیں وہ ایک دم کامیاب نہیں ہو سکیں گی۔ ضرورت ہے کہ ترقی پذیر ملکوں میں قومی کوششیں زیادہ وسیع پیمانے پر پروان چڑھائی جائیں۔

بہت سے علاقوں میں اس پروگرام کو فروغ دینا اس لیے ممکن ہوا ہے کہ ہر سال حکومتوں کی طرف سے ملنے والے چندوں میں اضافہ ہوتا رہا ہے۔ پروگرام کے پہلے اٹھارہ مہینوں میں (۱۹۵۰ء - ۱۹۵۱ء) صرف ۵۴ حکومتوں نے دو کروڑ ۲۶ ہزار ۲ سو ڈالر بطور چندہ ادا کیے تھے۔ سنہ ۱۹۵۶ء تک چندے دینے والی حکومتوں کی تعداد بڑھ کر ۸۵ ہو گئی اور اس سال چندوں کا میزان ۳ کروڑ ۱۲ لاکھ ۷ ہزار ۵ ۲ سو ڈالر ہو گیا۔

چونکہ سنہ ۱۹۵۹ء میں چندوں کی رقم اس سے پچھلے سال کی سطح سے کم رہی ہے اور پچھلے سال سے بچ کر جمع ہونے والی رقم بھی زیادہ نہیں تھی، اس لیے فنی امداد کے بورڈ نے طے کیا ہے کہ اگر ضرورت ہو تو سنہ ۱۹۶۰ء کے لیے بنائے ہوئے منصوبوں میں پانچ فی صد کی حد تک کمی کر دی جائے۔

تاہم رپورٹ میں امید ظاہر کی گئی ہے کہ اگر چندوں کی رقم بڑھ گئی تو منصوبوں میں کمی کرنے کی نوبت نہیں آئے گی، بلکہ کارگزاریوں میں تھوڑا سا اضافہ ممکن ہو جائے گا ؎

شمارہ ۵] لاهور [اگست

اس شمارہ میں

ادارہ تحریر { پروفیسر سراج الدین / پروفیسر ایم ۔ اے ۔ مخدومی }

معاونین { عبدالغفور چوہدری / فضل احمد }

علمی ماہنامہ
JAMIA LIBRARY
Jamia Millia Islamia.
DELHI
1 OCT 1959
آموزش
لاہور
اگست ۱۹۵۹ء
سالانہ چندہ
پاکستان کے لیے ۶ روپے
غیر ممالک کے لیے ۸ روپے
جلد ۱۲
شمارہ ۵
قیمت فی پرچہ دس آنے
پبلشرز
یونی ورسٹی بک ایجنسی لاہور

تعلیمی نگرانی کا نیا تصور

ایم۔ اے مخدومی

نئی تعلیم کی تحریک نے جہاں تدریس اور تعلّم کے پرانے نظریوں میں دور رس تبدیلیاں پیدا کی ہیں وہاں اس نے نگرانی کے پرانے تصور کو بھی بدل کر رکھ دیا ہے۔ یہ بات بالکل قدرتی تھی۔ جب تک تعلّم سے مراد بلا سوچے سمجھے رٹ کر دہرا دینا اور تدریس سے مراد بہ جبر علم ٹھونسنا تھا، اس وقت تک نگران کی ذمہ داری بھی صرف یہ سمجھی جاتی تھی کہ وہ ایک سخت گیر حاکم کی طرح استادوں پر چھایا رہے اور انھیں خوف و تہدید کے زور سے کام پر لگائے رکھے۔ ظاہر ہے کہ نگرانی کا یہ فرسودہ تصور تعلّم اور تدریس کے بدلے ہوئے مفہوم کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ جہاں تدریس کی پہلی دلچسپی بچوں کی انفرادی صلاحیتوں اور دلچسپیوں میں ہو وہاں اس کام کی رہنمائی کے لیے ایک مختلف قسم کے نگران کی ضرورت ہے یہی وجہ ہے کہ جدید تعلیمی لٹریچر میں نگرانی کی نوعیت کچھ اس قسم کی بیان کی جاتی ہے:-

قدروں کی وضاحت کرنا۔ طرز عمل میں تبدیلی پیدا کرنا۔ نصاب میں توازن پیدا کرنا تخلیقی تدریس کا اہتمام کرنا۔ اچھے مراسم کی آبیاری کرنا۔ نقطۂ نگاہ کو تبدیل کرنا وغیرہ۔

تعلیمی نگران خواہ ہیڈ ماسٹر ہو یا انسپکٹر وہ استادوں کے ووٹ سے نہیں چنا جاتا، بلکہ محکمۂ تعلیم یا انتظامی انجمن کی طرف سے مقرر کیا جاتا ہے۔ گویا اسے یہ عہدہ مدرسے کی انتظامیہ کی طرف سے عطا کیا جاتا ہے۔ ایسی صورت میں یہ خدشہ موجود رہتا ہے کہ وہ ماتحت استادوں کو تعلیمی منزل کی طرف ہانکنے کی کوشش کرے۔ مگر نئے تعلیمی نظریوں کا مطالبہ یہ ہے کہ وہ انھیں ہانکے نہیں بلکہ ان کے دلوں میں سلامتی، سرگرمی اور مسرت کے جذبات ابھارے اور ان کی نگاہوں کے سامنے نئے نئے افق پیدا کرے۔ یہ صورت حال نگران سے جس راہ پر چلنے کا مطالبہ کرتی ہے۔ اس کا خلاصہ ایک مشہور ماہر تعلیم نے

یوں بیان کیا ہے :-

اسے اس بات کی اجازت نہیں کہ	لیکن اسے چاہیے کہ
سینہ زور ہو	جوکس اور مشتاق کار ہو
اپنے خیالات دوسروں پر ٹھونسے	بہت سے تخلیقی تصورات کا مالک ہو
دوسروں پر چھا جائے	کام کو چلتا رکھے۔
دوسروں پر گرفت مضبوط کرے	بوقت ضرورت ماتحتوں کی مدد کرے۔
لائحہ عمل بہ جبر ٹھونسے	اصلاح کار تقلیبی بنائے۔
پوچھے کہ تم کیا کر رہے ہو	ماتحتوں کو محاسبہ نفس کے قابل بنائے
دوسروں کو ڈرائے دھمکائے	دوسروں کو کام کے سامنے سینہ سپر ہونے کے قابل بنائے
معمولی درجے کے کام سے مطمئن ہو	جو لوگ پیچھے رہ گئے ہوں ان کو سہارا دے[1]

نگرانی کا یہ تصور ابھی ہمارے لیے بالکل نیا ہے۔ ہم پشتوں سے نگرانی کے ان طور طریقوں کے خوگر چلے آ رہے ہیں۔ جو اجنبی حکمرانوں نے اس ملک میں رائج کیے تھے، مگر اب دنیا کے حالات اور ہمارے قومی تقاضے بالکل بدل چکے ہیں۔ آزاد زندگی کی ضرورتیں ایسی تخلیقی نگرانی کا مطالبہ کرتی ہیں جو اساتذہ اور طلبہ کی خداداد صلاحیتوں کو زیادہ سے زیادہ ابھارنے والی اور مدرسے اور عوام کے درمیان زیادہ سے زیادہ تعاون پیدا کرنے والی ہو۔ یہ ایک مانی ہوئی حقیقت ہے کہ تعلیم کی اصلاح استادوں کے ہاتھوں ہی انجام پا سکتی ہے۔ لیکن یہ کارنامہ وہی استاد انجام دے سکتے ہیں جنھیں تخلیقی رہنمائی میسر ہو جو نگران خود ٹھوس قابلیت کا مالک، جذبۂ عمل سے سرشار اور لگاتار فنی بالیدگی کا دلدادہ ہو وہ استادوں میں یقیناً احساس سلامتی اور جذبۂ عمل کی ایسی فراوانی پیدا کر سکتا ہے جو مدرسے کی چار دیواری کو پوری طرح سیراب کرنے کے بعد مقامی آبادی کو بھی متاثر کرے۔

1. KIMBALL WILES

چند مشرقی ملکوں کا تعلیمی جائزہ

فضل احمد

سلسلہ نمبر ۲

(۴) تھائی لینڈ

تھائی لینڈ جو بر و نمائے ہند چینی کا نہایت سرسبز و شاداب ملک ہے، جہاں درختوں سے ڈھکے ہوئے پہاڑوں اور سبزہ پوش میدانوں میں روپہلی ندیاں اور دریا پیچ و خم کھاتے ہوئے بہتے ہیں اور اس ملک کو جنت ارضی میں تبدیل کرتے ہیں۔ بنکاک اس ملک کا صدر مقام ہے۔ یہ شہر پانی اور کشتیوں کی وجہ سے مشرق کا وینس کہلاتا ہے۔ قدرتی دولت اور جغرافیائی محل وقوع ہر دو لحاظ سے تھائی لینڈ کو جنوب مشرقی ایشیا میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔

جدید تعلیم کی ابتداء پچھلی صدی کے وسط میں تھائی لینڈ کے بادشاہ کو یہ خیال پیدا ہوا کہ ملک کو مغربی استعمار سے بچائے رکھنے کی بہترین صورت یہ ہے کہ اپنے سرکاری افسروں کو مغربی تعلیم دی جائے اور اس تعلیم کے ذریعے عوام میں قومی شعور بیدار کیا جائے۔ چناں چہ بادشاہ نے ۱۸۵۵ء کے لگ بھگ شاہی خاندان کے افراد کو انگلستان، جرمنی، روس اور جاپان میں بھیجا تاکہ ان ملکوں کی زندگی کا مطالعہ کریں اور ان کے پسندیدہ طور طریقوں کو تھائی لینڈ میں رواج دینے کی راہیں سوچیں۔ بادشاہ کو یہ خیال اس لیے پیدا ہوا تھا کہ قرب و جوار کے ملک مغربی ملوکیت کی دبوچ میں آ چکے تھے۔ اور یہ خطرہ اب تھائی قوم کے سر پر منڈلا رہا تھا۔

مغربی تعلیم دینے کے لیے بادشاہ نے سب سے پہلے اپنے محل کے ایک حصے میں ایک مدرسہ کھولا۔ جلد ہی بنکاک کے دوسرے حصوں اور بعض دوسرے شہروں میں بھی اس قسم کے مدرسے جاری ہو گئے۔ تعلیم کی اشاعت کا یہ سلسلہ اس طرح رفتہ رفتہ جاری رہا۔ ۱۹۲۱ء میں ایک قانون کی رو سے ابتدائی تعلیم لازمی اور مفت قرار دے دی گئی۔ تاہم دیہی علاقوں میں اس

قانون پس ۱۹۳۲ء کے بعد عمل ہونا شروع ہوا۔

علمی ادبی قسم کا نصاب | تھائی نظام تعلیم نے یورپی نمونے اور بالخصوص برطانوی مثال سے گہرا اثر قبول کیا۔ تھائی مدرسوں نے اپنے سامنے مقصد یہ رکھا کہ فراغت کی زندگی گذارنے والے اور عالمانہ مزاج رکھنے والے شرفا تیار کیے جائیں۔ خود تھائی روایات یقین کر اس قوم کے بادشاہوں اور شہزادوں کی قدردانی نے مختلف فن کاروں کے شاہکاروں کو قومی میراث کا مقام دے رکھا تھا۔ چناں چہ ان میں سے بہت سے شاہکار مدرسے نصاب میں شامل کر لیے گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نصاب کی کوششوں کا خلاصہ ایسے صاحب ذوق عالموں کی تیاری بن کر رہ گیا جو نہ صرف غیر ملکوں میں اعلیٰ تعلیم سے استفادہ کر سکیں بلکہ خود تھائی لینڈ میں بھی خاندانی شرفا کی مجلسوں میں بیٹھ سکیں۔

اس نصب العین نے تھائی نظام تعلیم کو محدود درجہ تنگ قسم کی علمی شکل دے دی اور اس نظام تعلیم کی پہلی سیڑھی سے آخری سیڑھی تک لگاتار یہ کوشش رہی کہ بلند سے بلند علمی اور ادبی معیاروں کا مطالبہ کیا جائے۔ ابتدائی مدرسے میں بے شک نوشت و خواند کی تعلیم دی جاتی تھی۔ مگر یہ خواندگی کی تعلیم بھی بڑے کڑے معیاروں کا مطالبہ کرتی تھی۔ چناں چہ ہر جماعت کے خاتمے پر ترقی کا جو امتحان ہوتا تھا اس میں طلبہ کی بھاری تعداد ناکام رہتی تھی۔ بعض طالب علم ہر جماعت میں کئی کئی سال گذارتے تھے۔ اور بعض اوقات پندرہ پندرہ برس کی عمر کے لڑکے صرف تیسری یا چوتھی جماعت میں رکے ہوئے نظر آتے تھے۔ چار سالہ ابتدائی مدرسے کے خاتمے پر پچھے سالہ ثانوی مدرسے میں داخلے کے لیے جو امتحان ہوتا تھا وہ طلبہ کی ایک بھاری تعداد کو اس تعلیم کے ناقابل بنا کر رکھ دیتا تھا۔

جو طلبہ ان علمی امتحانوں میں پورے نہ اترتے تھے ان کے لیے فنی تعلیم کا بندوبست موجود تھا۔ مگر عوام کو اس تعلیم میں چنداں کشش نظر آتی تھی کیوں کہ علمی تعلیم ہی با اقتدار اور خاندانی امرا کے حلقے تک رسائی حاصل کرنے کا ذریعہ تھی، اس لیے والدین اور طلبہ کی سر توڑ کوشش یہ رہتی تھی کہ کسی نہ کسی طرح علمی تعلیم کی تکمیل ہو جائے۔ عام صنعت و حرفت سے پیٹ پالنا تو ممکن تھا۔ مگر اس کے لیے کوئی مجلسی وقار موجود نہ تھا۔ ثانوی تعلیم ختم کر لینے کے بعد مزید دو سال کی تعلیم یونیورسٹی

تعلیم کی تیاری کے طور پر حاصل کرنی پڑتی تھی تب کہیں جاکر کوئی طالب علم یونیورسٹی تعلیم کے زیور سے آراستہ ہونے اور معززین کے حلقے میں رسائی حاصل کرنے کی امید کر سکتا ہے ۔

اگرچہ تھائی نصاب تعلیم میں ہر قسم کے مضامین کو جگہ مل رہی ہے مگر بعض مضامین غیر معمولی توجہ کا مرکز چلے آرہے ہیں۔ مثلاً تھائی علم ادب کی اہمیت کا یہ حال ہے کہ ابتدائی مدرسے میں بھی بچوں کو محض لکھنا پڑھنا ہی نہیں سکھایا جاتا بلکہ کوشش یہ رہتی ہے کہ وہ شہری زبان پر قادر ہوجائیں یعنی وہ بولتے وقت چن چن کر ایسے الفاظ لائیں، جن میں شاعرانہ حسن و نزاکت اور لطیف طنز و مزاح موجود ہو یا جو تھائی روایات کے اہم اجزا کی طرف اشارہ کرتے ہوں۔ اس قسم کی زبان استعمال کرنا نجابت اور شرافت کی دلیل سمجھی جاتی ہے۔ اسی طرح بدھ مت کا مطالعہ ہر مدرسے کے نصاب کا ایک اہم ستون ہے۔ بدھ اخلاقیات کو بچوں اور نوجوانوں کے سامنے بار بار اس انداز پر پیش کیا جاتا ہے کہ وہ ان کی فطرت ثانیہ بن جائیں اور انھیں خودی اور وجدان نفس کی منزل تک پہنچادیں، ایک اور مضمون جس پر بے حد زور دیا جاتا ہے تھائی تاریخ ہے۔ اس کے ضمن میں ملکی جغرافیہ بھی پڑھایا جاتا ہے اور اسی کے ضمن میں بیرونی دنیا کا تھوڑا بہت حال بھی پڑھایا جاتا ہے۔ تھائی تاریخ کو پرانے بادشاہوں اور شاہسواروں کے عظیم الشان کارناموں کے رنگ میں پیش کیا جاتا ہے۔ تاکہ نئی پود اپنی قومی ثقافت پر فخر کرنا سیکھے اور اس میں شدید قومی شعور بیدار رہے۔ اب نصاب میں دستوری طرز حکومت کی تنظیم اور اس کا طریق کار بھی شامل ہے اور اسے دن بدن زیادہ توجہ مل رہی ہے ۔

حالیہ اصلاح دوسری عالمی جنگ کے بعد سے تھائی لینڈ اس بات پر مجبور ہوا ہے کہ زمانے کی بدلی ہوئی ضرورتوں کے پیش نظر اپنے نظام تعلیم میں ردو بدل کرے۔ چین پر اشتراکی قبضہ ہو جانے کے بعد تھائی بادشاہ کو یہ خطرہ بالکل یقینی نظر آنے لگا ہے کہ عوام کا پست معیار زندگی بادشاہت کے خاتمے کا سبب بن سکتا ہے۔ نیز یہ نمائے ہند چینی کے بعض حصوں میں اشتراکیوں نے جس آسانی سے عوام کو بہکا کر ان ملکوں کی حکومتوں کے لیے مصیبت کھڑی کر دی تھی۔ تھائی حکومت نے اس سے سبق لیا ہے ۔

چناں چہ اب حکومت اس کوشش میں ہے کہ ہر بستی اور لوگ کے لوگ مشترکہ کوشش سے اپنی زندگی خود بہتر بنانے کا ڈھنگ سیکھیں۔ انھیں ہر قسم کی تعلیمی سہولتیں مہیا کی جائیں تاکہ وہ مقامی وسائل سے پورا فائدہ اٹھا کر اپنے لیے اور ملک کے لیے زیادہ مفید ثابت ہوں۔

تعلیمی اصلاح کے کام کو قابل عمل بنانے کے لیے تھائی وزارت تعلیم نے ۱۹۵۰ء سے تجرباتی مطالعوں کا کام شروع کر رکھا ہے۔ سب سے پہلا تجرباتی مطالعہ چچرا انگساؤ کے صوبے میں شروع کیا گیا جو دارالحکومت بنکاک سے ساٹھ میل مشرق میں واقع ہے۔ اس تعلیمی تجربے میں یونیسکو، عالمی ادارہ صحت اور عالمی ادارۂ محنت کے علاوہ امریکی بین الاقوامی ادارۂ تعاون نے بھی ہاتھ بٹایا۔ تجربے کی نگرانی ایسے تھائی ماہرین تعلیم کے ہاتھ میں تھی جنھوں نے امریکہ، یورپ، جاپان اور فلپین میں تعلیم پائی تھی۔ اس تعلیمی تجربے کا مقصد یہ تھا کہ استادوں کو اس امر کی دوران ملازمت تربیت دی جائے کہ مقامی آبادی کا تعاون حاصل کر کے تعلیمی کام کو کس طرح عملی طور پر مفید بنایا جا سکتا ہے اور مقامی آبادی کی بہبود میں کیوں کر اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ تجربے میں حصہ لینے والے ۱۴۳ ابتدائی مدرسے ۳ ہائی سکول، فنی سکول اور استادوں کی ایک تربیت گاہ تھی۔

تجربے میں حصہ لینے والے استادوں اور انسپکٹروں کے سامنے سب سے پہلے یہ سوال آیا کہ ان کے مدرسے کو عملی رنگ کس طرح دیا جائے تاکہ بچے مدرسے میں جو کچھ کریں اس کا تعلق ان کی حقیقی ضرورتوں اور دلچسپیوں سے ہو۔ یہ غایت حاصل کرنے کے لیے مطالعہ کرنے والا گروہ بہت سی چھوٹی چھوٹی جماعتوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ ان ذیلی جماعتوں نے روائتی نصاب کے مختلف حصوں کی چھان بین اپنے ذمے لی اور بالآخر اس نصاب کو ایسی تدریسی اکائیوں کی شکل مل گئی جن کا تعلق براہ راست روزمرہ زندگی سے تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ روائتی قسم کے مقررہ نصاب کو دن رات رٹنے کی بجائے بچے اپنے استادوں کی رہنمائی میں گرد و پیش کی زندگی کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگے۔ انھوں نے اس قسم کے سوالوں کے جواب تلاش کرنے شروع کیے:۔

ہم اپنی صحت کو کیوں کر محفوظ رکھ سکتے ہیں؟ حکومت نے زراعت، امداد باہمی، صحت عامہ

اور تعلیم کے جو محکمے قائم کر رکھے ہیں ہم اور ہمارے والدین ان سے کس قسم کی عملی خدمت حاصل کر سکتے ہیں؛ ہوائی آمد و رفت کی جو سہولتیں ملک کو حاصل ہیں ان سے تھائی قوم کی زندگی پر کیا اثر پڑا ہے؛ اخبارات میں کون معاملات پر بحث چلتی رہتی ہے اور ان معاملات کا ہماری زندگیوں پر کیا اثر پڑ سکتا ہے؛ وغیرہ وغیرہ

اس نئے نصاب تعلیم نے بچوں کے ذاتی تجربوں اور مشاہدوں کو تعلیمی کام کی بنیاد قرار دیا۔ بچوں اور استادوں نے مل کر ملکی زندگی کے سرکاری اور غیر سرکاری شعبوں اور غیر ملکی امداد کے اداروں کی تنظیم اور ان کے طریق کار کا جائزہ لینا شروع کیا۔ وہ فرضی مسائل اور تصورات میں کھوئے رہنے کی بجائے موجودہ اور حقیقی مسائل سے ٹکر لینا سیکھ گئے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ انھوں نے نہ صرف زندگی کے حقیقی مسائل کا فہم حاصل کرنا شروع کیا بلکہ لکھنے پڑھنے میں انھیں لذت محسوس ہونے لگی۔ استادوں اور طلبہ دونوں نے اس طریق تدریس کو بے حد پسند کیا۔

تاہم اس تجربے کی کامیابی سارے ملک میں تعلیمی انقلاب کی ضامن نہ بن سکتی تھی۔ یہاں سے تھائی مدرسے زبانی تکرار اور فرفر رٹنے کو درس و تدریس کا خلاصہ سمجھتے آئے تھے۔ اس کے علاوہ ابتدائی مدرسے میں بھی بچوں سے لکھنے پڑھنے اور گنتی کے بلند معیاروں کا مطالبہ کیا جاتا تھا۔ مثلاً حساب میں انھیں تھائی ہندسے اور عربی ہندسے دونوں سیکھنے پڑتے تھے۔ لکھائی پڑھائی میں بھی ادبی چاشنی کو ملحوظ رکھنا ضروری تھا۔ تدریس کے نئے طریقوں کے ساتھ ان روایتی معیاروں کو برقرار رکھنا آسان نہ تھا۔ اب تک استاد کا طریق تدریس تقریری رہا تھا۔ استاد کے پاس اپنی رہنمائی کے لیے ایک کتابچہ ہوتا۔ اسے جو کچھ پڑھانا ہوتا وہ زبانی بیان کر دیا جاتا اور اس کے متعلق تختہ تحریر پر اشارے درج کر دیے جاتے۔ طلبہ ان اشاروں کو اپنی کاپیوں میں درج کر لیتے اور اچھی طرح رٹ لیتے۔ اس طریق تدریس کی پشت پر مشرق بعید کے مشہور اخلاقی معلم کنفیوشس کا یہ قول تھا کہ :-

"جب میں کسی شخص کے سامنے کسی مسئلے کا ایک گوشہ پیش کرتا ہوں اگر وہ اسکی مدد سے اس کے باقی ماندہ تینوں گوشوں کا فہم حاصل نہیں کر سکتا تو میں ایسے شخص کے سامنے اپنی بات کو دوبارہ پیش نہیں کرتا۔"

تاہم یونیسکو اور تھائی ماہرین تعلیم نے اس تجربے کے نتائج سے پورا فائدہ اٹھانے کی ٹھان لی ہے

نصاب مدرسہ کو جن تدریسی اکائیوں کی شکل دی گئی تھی انھیں دوسرے مدرسوں میں آزمایا گیا نوجوان استادوں کی حوصلہ افزائی کی گئی کہ وہ نئے طریقوں کو آزمائیں۔ انھیں ایسا کرنے میں چند ان تامل نہ تھا کیوں کہ تربیت کے زمانے میں انھوں نے ان طریقوں کے متعلق بہت کچھ پڑھا اور سنا تھا۔ ان کی راہ میں دشواری صرف یہ تھی کہ انھیں اپنے آپ پر یہ بھروسہ نہ تھا کہ آیا وہ خود بھی ان طریقوں سے کام لے سکتے ہیں یا نہیں۔ ملکی اور غیر ملکی ماہرین تعلیم کی رہ نمائی نے ان نوجوان استادوں کے دلوں میں بھروسہ پیدا کیا اور بالآخر نئے تعلیمی طریقے دن بدن زیادہ سکولوں میں رائج ہونے لگے۔ ان کے نتائج کی جانچ تول کے لیے بہت بڑے پیمانے پر کام شروع ہوگیا، اور تھائی وزارت تعلیم کی سرگرم دل چسپی کے باعث تعلیمی ناپ تول کے نئے پیمانے وضع ہونے لگے۔ سنہ ۱۹۵۴ء میں دارالحکومت بنکاک میں بچوں کے نفسیاتی مطالعہ کے لیے ایک بین الاقوامی انسٹی ٹیوٹ قائم ہوگیا۔

تعلیمی اصلاح کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ابتدائی تعلیم کو چار کی بجائے سات سالہ کر دیا جائے تاکہ بیشتر بچے جو ابتدائی مدرسے کے بعد تعلیم ختم کر دیتے ہیں زیادہ پائدار علم اور مہارتیں ساتھ لے کر جائیں چناں چہ بتجربتہً چند ابتدائی مدرسوں کے نصاب کو سات سالہ بنایا گیا۔ ان تین زائد سالوں میں عملی قسم کے مضامین مثلاً خانہ داری زراعت وغیرہ شامل کیے گئے اور بچوں کو ان مضامین کے ضمن میں عملی کام کرایا گیا جس کے لیے مقامی کسانوں اور کاری گروں کی خدمات سے فائدہ اٹھایا گیا۔ مگر اس معاملے میں پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑا۔ تاکہ نئے تعلیمی مقصد اور تھائی روایات کو باہم اس طور پر پیوست کیا جائے کہ ان کے درمیان کوئی ٹکراؤ نہ ہونے پائے۔

تھائی طرزِ زندگی میں بڑوں کے احترام، انکساری اور ضبطِ نفس کو بہت اہمیت حاصل ہے پرانے طریقہ ہائے تدریس جو نقریر اور زبانی رٹنے پر مبنی تھے یہ اوصاف پیدا کرنے کے ضامن سمجھے جاتے تھے۔ مگر جو طریقِ تدریس طالب علم کو بلا روک ٹوک سوال پوچھنے اور اپنی جگہ سے اٹھ کر ادھر اُدھر چلنے کی اجازت دے اس کے متعلق یہ یقین کس طرح ہو کہ وہ یہ پہلو بہ اوصاف پیدا کرے گا ہے شک یہ ایک کٹھن سوال تھا۔ مگر تھائی وزارتِ تعلیم کی ہوش مندی نے لوگوں کو یہ بات ذہن نشین کرادی

کہ موجودہ دور میں تھائی قوم کو ایسی ہی نئی عادتیں سیکھنے کی ضرورت ہے جو اسے تحقیق و تلاش کے بعد ان میں دوسروں کے ہم پلہ بنا دیں۔

غرض تھائی وزارتِ تعلیم اور غیر ملکی ماہرین کی مشترکہ کوششوں نے ملک میں ایک دوررس معاشرتی انقلاب کی داغ بیل ڈال دی ہے۔ مدرسوں میں پڑھنے والے بچے اور نوجوان تعلیم کی مدد سے اپنے حقیقی مسائل حل کرنے لگے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ عوام جو اب تک مدرسے سے بالکل بے تعلق تھے اب مدرسے میں گہری دلچسپی لینے اور اس کی سہولتوں سے ہر ممکن فائدہ اٹھانے لگے ہیں۔ کسان مدرسے کے زراعت ماسٹر سے مشورہ لینے آتے ہیں۔ وہ مدرسے کی ورک شاپ میں اپنے ہل اور اپنی کشتیاں مرمت کرنے کے لیے لاتے ہیں۔ مائیں بچوں کی صحت کے متعلق مشورہ کرنے کے لیے مدرسے کی نرس سے ملنے آتی ہیں۔ مدرسہ مکانوں کی آرائش، مچھلیوں کی افزائش اور خوراک بہتر طور پر پکانے کے جو طریقے سکھا رہا ہے وہ عام گھروں میں استعمال ہونے لگے ہیں۔ غرض تعلیمی اصلاح نے تھائی زندگی میں ایک تبدیلی کا آغاز کر دیا ہے۔

تھائی قوم کو بلند پایہ تعلیمی رہنما مہیا کرنے کے لیے بنکاک میں ایک ٹیچرز کالج کھولا گیا ہے بنکاک میں ایک فنی انسٹی ٹیوٹ بھی قائم کی گئی ہے جس کی شاخیں دوسرے شہروں میں بھی ہیں یہ انسٹی ٹیوٹ جو ان لڑکوں اور لڑکیوں کو مختلف قسم کی فنی تعلیم پیش کرتی ہے۔

(۵) جاپان

جاپان ایشیا کا واحد ملک ہے جس نے سب سے پہلے مغربی تعلیم اور مغربی نظامِ معیشت کی اہمیت کو پہچانا اور ان دونوں کو ایسی خوبی سے اپنایا کہ وہ موجودہ صدی کے آغاز میں یورپ کے طاقت ور ملکوں کی ٹکر کا مالک بن گیا۔ مگر مغربی تعلیم اور مشینی پیداوار جاپان کے معاشرتی نظام میں بال بھر فرق پیدا نہ کر سکی۔ یہ پرانا نظام آقا و بندہ کے تصور پر مبنی تھا۔ ساری طاقت امراء کے ایک چھوٹے سے گروہ کے ہاتھ میں تھی اور عوام اس گروہ کے پیچھے چلنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ اس معاشرتی نظام نے جس اخلاقی ضابطے کو جنم دیا تھا وہ امراء اور مشرفا سے وقار، وضعداری اور ضبطِ نفس کا مطالبہ کرتا تھا اور

عوام سے پاکبازی، احترام اور اطاعت کا۔ اس غیر جمہوری معاشرتی نظام نے یہ کارنامہ ضرور انجام دیا کہ ملکی قوت کو ایک مرکز پر جمع کر کے جدید نظام معیشت کو بہت تھوڑے عرصے میں ملک بھر میں رائج کر دیا۔ مگر اس کے طفیل حد سے بڑھی ہوئی قوم پرستی اور جنگجوئی کو بھی ترقی ملی اور بالآخر یہ چیزیں جاپان کی تباہی کا موجب بنیں۔ مشینی پیداوار کے میدان میں جاپان اتنا آگے بڑھ گیا کہ وہ اپنے مغربی گروؤں کے بھی کان کترنے لگا۔ اس کامیابی نے اسے جرمنی اور اطالیہ کی طرح تسخیر عالم کے منصوبے پر ابھارا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جاپان کو اپنی ساری تاریخ میں پہلی بار شکست ہوئی اور ایسی بری شکست ہوئی جس نے اس کا کچومر نکال کے رکھ دیا۔

مگر وقت گذرنے کے ساتھ حالات نے پھر کروٹ بدلی ہے۔ جاپان پر امریکی قبضہ ختم ہو چکا ہے مگر اپنے فوجی قبضے کے زمانے میں امریکہ نے اس بات کی ہر ممکن کوشش کی کہ جاپانی ذہن کو بدل دیا جائے۔ یہ غایت حاصل کرنے کے لیے جاپانی نظام تعلیم اور نصاب تعلیم میں بنیادی تبدیلیاں کی گئیں ولی عہد جاپان اور دوسرے جاپانی شہزادوں اور شہزادیوں کو انجیل پڑھانے کے لیے امریکہ سے خاص استاد ٹوکیو پہنچے۔ ٹوکیو میں ایک عظیم الشان عیسائی یونیورسٹی قائم کی گئی اور ملک کے نظام تعلیم کو جمہوری مزاج عطا کرنے کے لیے طرح طرح کی ترکیبوں سے کام لیا گیا۔

مغربی تعلیم کی ابتدا :- جاپان میں مغربی تعلیم رائج کرنے کا فیصلہ ۱۸۶۸ء میں وزیر اعظم میجی کی حکومت نے کیا تھا۔ چنانچہ ملک میں ایک نظام مدارس قائم کر دیا گیا جس میں تیسری جماعت تک کی پڑھائی ہر ایک کے لیے لازمی تھی۔

بعد میں لازمی تعلیم کی مدت تین سے چھ سال کر دی گئی۔ مدرسے کا نصاب طلبہ کے لیے انتخاب کی بڑی گنجائش رکھتا تھا تاکہ ہر طالب علم اپنی حسب استعداد مضامین چن لے لیکن ملک کے تمام مدرسوں کی باگ ڈور سختی سے مرکزی حکومت کے ہاتھ میں تھی۔

ابتدائی مدرسے میں لڑکے اور لڑکیاں اکٹھے پڑھتے تھے۔ اس سے آگے دونوں کے مدرسے الگ الگ ہو جاتے تھے۔ بہت کم لڑکیاں ابتدائی مدرسے سے آگے تعلیم حاصل کرتی تھیں۔ کیونکہ

عام خیال یہ تھا کہ لڑکیوں کو زیادہ تعلیم دینا انھیں اپنے روائتی فرائض انجام دینے کے ناقابل بنانا ہے
تاہم مغربی تعلیم نے جلد ایک ایسی روشن خیال اور آزاد منش جماعت پیدا کرنا شروع کی جو مغربی تصورات
کی دل دادہ اور ہر قسم کی تنگ نظری کے خلاف تھی۔ اس جماعت کی سرگرمیوں نے قدامت پسندوں کو
خوفزدہ کر دیا اور وہ سنہ ۱۸۹۰ء میں شہنشاہ سے ایک فرمان جاری کرانے میں کامیاب ہو گئے جس کی
رو سے تعلیم کو مکمل طور پر قدیم جاپانی روایات کے تابع کر دیا گیا۔ تعلیم کو ایک ایسی قوم پرستی کی ترقی کا
آلہ بنا دیا گیا جس میں شاہی خاندان کو مرکزی نقطہ کی حیثیت حاصل تھی۔ فرماں برداری، قانون کا
احترام، بڑوں اور صاحب اختیار لوگوں کا احترام، فرض کا احساس، جاپانی تعلیم کے اخلاقی عناصر قرار
دے دیے گئے۔

صاحب اقتدار لوگوں کا احترام جاپانی روایات میں شامل تھا۔ اسی طرح علم اور عالموں کو بھی
ہمیشہ عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ ان روایات کا نتیجہ یہ نکلا کہ جاپانی مدرسے اور جاپانی اساتذہ
کو لوگوں کی نظروں میں بڑا احترام حاصل ہو گیا۔ والدین یہ یقین رکھتے تھے کہ جب تک بچہ مدرسے
میں پڑھتا ہے اس کی تمام مالی ضرورتوں کی کفالت کرنا ان کا ایک مقدس فرض ہے۔ چناں چہ وہ دل کھول کر
مدرسے کے اخراجات میں حصہ دار بنتے تھے۔ ملک میں یہ روایت بھی بہت پرانی تھی کہ جب کوئی
شخص اپنے ذمے ایک کام لے لے تو اس میں کامیابی حاصل کرنا اس کا اخلاقی فرض ہے۔ اس روایت
کے زیر اثر جاپانی طلبہ ان تھک محنت سے پڑھائی کرتے تھے۔ ان روایات نے مل کر جاپانی نظام تعلیم
کو بڑا کامیاب بنا دیا۔

تاہم اس نظام تعلیم میں ایک واضح کمی موجود تھی۔ اس کی ساری باگ ڈور مرکزی قیادت کے ہاتھوں
میں تھی۔ عوام یا اساتذہ کو نصاب تعلیم یا طریقہ ہائے تدریس کے طے کرنے میں کوئی دخل حاصل نہ تھا۔ اس
صورت حال کا مطلب یہ تھا کہ قدامت پسند رہنما نظام تعلیم کو اپنے مقاصد کے حصول کا ذریعہ بنا سکتے تھے

انقلابی تبدیلیاں | جاپانی تعلیم کی اس مرکز پرستی نے بالآخر ملک کو دوسری عالمی جنگ کے شعلوں میں
جھونک دیا اور جاپانی قوم کو تباہی کے گڑھے میں ڈال دیا۔ جنگ کے خاتمہ پر جب قومی زندگی کی تجدید

شروع ہوئی ترسب سے پہلے نظامِ تعلیم کی اصلاح پر زور دیا گیا۔ اب جاپانی مدرسے امریکی مدرسوں کی طرح لڑکوں اور لڑکیوں کو ثانوی درجے پر بھی ایک ساتھ تعلیم دیتے ہیں۔ امریکی نمونے پر جاپانی ابتدائی مدرسہ بھی چھے سال نصاب پیش کرتا ہے۔ اس کے بعد تین سال جونیئر ہائی اسکول تعلیم دیتا ہے اور تین سال سینیئر ہائی سکول۔ مدرسوں کا نظم و نسق مرکز سے چھین کر مقامی سطح پر آ گیا ہے۔ نصاب تعلیم اور طریقہائے تدریس میں دور رس تبدیلیاں کر کے انھیں جمہوری تصورات سے قریب تر لایا گیا ہے۔ غرض جاپانی تعلیم کا سارا تانا بانا از سر نو تیار کیا گیا ہے۔ تاہم یہ انقلابی تبدیلی جاپانی قوم کی اپنی پسند سے نہیں بلکہ اس کی مجبوری کی وجہ سے عمل میں آئی ہے۔ جاپان شکست کھا جانے کے بعد امریکہ کے فوجی قبضہ میں چلا گیا تھا اس لیے اہل جاپان کو بچارو ناچار فاتح کی منشا پوری کرتے ہی بنی۔ مگر مجبوری کا یہ زمانہ اب ختم ہو چکا ہے۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ گو خود جاپانیوں میں ایسے رہنماؤں کی کمی نہیں جو جمہوری طرز زندگی اور جمہوری قدروں کے دل سے گرویدہ ہیں۔ یہ لوگ اپنے تعلیمی اداروں کو جمہوریت کے جیتے جاگتے نمونے دیکھنا چاہتے ہیں۔ مگر زمانہ قبل از جنگ کی قومی روح جو امریکی قبضے کے دوران دب گئی تھی اب پھر ابھر رہی ہے۔ قدامت پسند قوتیں پھر سے غلبہ حاصل کرنے کے لیے کوشاں ہیں۔ قدامت پسند اور ترقی پسند قوتوں کی یہ ٹکر مدرسے کو لپیٹ میں لے رہی ہے۔ اس وقت آثار یہ ہیں کہ قدامت پسندوں کو پھر سے مقبولیت حاصل ہو جائے گی۔

جاپانی مدرسوں کے نظم و نسق کو امریکی سانچے میں ڈھالنے کے لیے سنہ ۱۹۴۸ء میں ایک تعلیمی قانون منظور کیا گیا تھا جس کی رو سے ہر مدرسے کا نظم و نسق چلانے کے لیے ایک سکول بورڈ قائم کر دیا گیا تھا، ان سکول بورڈوں کے تقریباً تمام اراکین لوگوں نے خود چنے تھے۔ سنہ ۱۹۵۶ء میں اس قانون پر نظرِ ثانی کی گئی اور اب کیفیت یہ ہے کہ سکول بورڈ کے اراکین منتخب نہیں کیے جاتے بلکہ گورنر یا میئر انھیں نامزد کرتا ہے۔ لیکن ان نامزدگیوں کی منظوری منتخب شدہ مجلسِ قانون ساز سے حاصل کرنی پڑتی ہے۔ مدرسوں کے سپرنٹنڈنٹ کی تقرری وزارتِ تعلیم کی منظوری سے کی جاتی ہے۔

حالیہ تعلیمی تبدیلیوں کا ایک نتیجہ یہ نکلا ہے کہ والدین مدرسے کی سرگرمیوں میں پہلے سے بہت زیادہ

دل چسپی لینے لگے ہیں۔ وہ اکثر مدرسے میں آتے اور اپنے بچوں کی رفتار ترقی کا حال معلوم کرتے ہیں وہ بچوں کی صحت اور تفریح کے انتظامات فراہم کرنے میں مدرسے کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔ سکول میں تیرنے کا تالاب تعمیر کرنے اور دوپہر کے کھانے کا بندوبست کرنے میں مدرسے کی مدد کرتے ہیں۔ مدرسے کی تفریحوں اور استادوں کے اجتماعوں میں چائے وغیرہ کا بندوبست کرتے ہیں۔ غرض جاپانی والدین مدرسے کا بہت سا بوجھ اپنے کندھوں پر لینے لگے ہیں۔ مگر اس کے لیے کافی وقت صرف کرنا پڑتا ہے والدین کو مدرسے کی ضرورتوں سے آگاہ کرنے اور ان کی تائید کو منظم کرنے کے لیے باقاعدہ مہم چلائی پڑتی ہے۔ ۱۹۵۰ء میں اس مہم کے نتائج بڑے حوصلہ افزا ثابت ہوئے تھے۔ اس سال ابتدائی مدرسوں اور لوئر ثانوی مدرسوں پر کل جو خرچ ہوا۔ اس کا تہائی حصہ والدین نے ادا کیا۔ اور اعلیٰ ثانوی تعلیم پر جو خرچ ہوا، اس کا تہائی حصہ والدین نے ادا کیا۔ اکثر والدین اب بچوں سے متعلق ہر قسم کے مسائل کے حل کے لیے استادوں کی طرف رجوع کرنے لگے ہیں۔

جاپانی اساتذہ کا جذبۂ عمل جو شخص جاپانی مدرسوں کو دیکھے وہ استادوں کے غیر معمولی جذبہ عمل سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ جاپانی استاد بالعموم صبح سے شام تک کام کرتے ہیں۔ پڑھانے کے علاوہ وہ ہر قسم کی تفریحی اور تعلیمی سرگرمیوں میں بچوں کی رہنمائی کرتے ہیں۔ ایک غیر ملکی ماہر تعلیم نے حال ہی میں اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ میں نے ایک جاپانی استاد کو دیکھا کہ وہ جماعت میں پڑھاتا بھی تھا۔ مدرسہ ختم ہونے پر بچوں کی کھیلوں میں بھی شریک ہوتا تھا، بچوں کے کلب کا انتظام بھی کرتا تھا۔ تعلیمی سیاحتوں اور سیر و تفریح کا اہتمام بھی کرتا تھا۔ تیرنے اور برف پر دوڑنے کی مشق بھی کراتا تھا۔ گرمیوں میں بچوں کی انجمن کی سرگرمیوں کی رہنمائی بھی کرتا تھا۔ مدرسے عمارت کی رکھوالی کے لیے جس رات اس کی باری آتی اس باری کو بھی نبھاتا تھا۔ استادوں کی دوران ملازمت تعلیم کے لیے جو نصاب پیش کیے جاتے ان میں بھی کام کرتا تھا۔ والدین اور اساتذہ کی انجمن کا بھی سرگرم رکن تھا اور والدین کو یہ ترغیب دیتا تھا کہ اپنے بچوں کو مخرب اخلاق کتابوں اور فلموں سے بچائیں بے شک یہ استاد غیر معمولی قوت عمل اور سرگرمی کا مالک تھا مگر عام جاپانی استاد بھی پڑھانے کے علاوہ بچوں

اور مدرسے کی بہت سی اور خدمات بھی بجالاتے ہیں اور اس کام میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ یہ جذبۂ عمل اس لحاظ سے اور بھی قابل تعریف ہے کہ جاپانی مدرسوں میں طلبہ کی کافی بھیڑ ہے۔ کنڈرگارٹن جماعتوں میں طلبہ کی تعداد چالیس کو جا پہنچتی ہے۔ ابتدائی اور ثانوی مدرسوں میں یہ تعداد پچاس فی جماعت سے کم نہیں۔

ابتدائی مدرسوں میں عام دستور یہ ہے کہ ایک جماعت کو ایک ہی اُستاد پہلی سے چھٹی جماعت تک پڑھاتا چلا جائے۔ کنڈرگارٹن جماعتوں میں عورتیں پڑھاتی ہیں۔ اس سے اوپر کی جماعتوں میں مرد استادوں کی تعداد بڑھتی جاتی ہے۔ ابتدائی مدرسوں میں ان کی تعداد ۴۵ فی صد ہے۔ ادنیٰ ثانوی جماعتوں میں ۸۷ فی صد اور اعلیٰ ثانوی جماعتوں میں ۸۵ فی صد۔

استادوں کی تنخواہیں خاصی معقول ہیں۔ جاپانی وزارت تعلیم کے بیان کے مطابق ایک استاد کو کم و بیش اتنی ہی تنخواہ ملتی ہے جتنی کاروباری اداروں کے ملازموں کو۔ انھیں دوسرے سرکاری محکموں میں کام کرنے والے یکساں قابلیت کے ملازموں سے زیادہ اجرت ملتی ہے۔ ابتدائی مدرسے میں کام کرنے والے گریجوایٹ استادوں کو ۴۰۰ روپے ماہوار بنیادی تنخواہ ملتی ہے، دس سال کی ملازمت کے بعد وہ اس تنخواہ سے تقریباً چار گنا ماہوار حاصل کرنے لگتا ہے۔ اس بنیادی تنخواہ کے علاوہ تنخواہ کے پانچویں حصے کے برابر مختلف قسم کے الاؤنس مل جاتے ہیں۔

تنخواہ کے علاوہ جاپانی استادوں کو اور سہولتیں بھی حاصل ہیں۔ سرکاری مدرسوں میں کام کرنے والے تمام استاد پبلک سکول میوچل ایڈ ایسوسی ایشن کے رکن ہیں۔ ان کی تنخواہ میں سے ایک خاص فی صد تناسب اس انجمن کے خزانے میں جاتا ہے۔ اگر کوئی استاد بیمار پڑ جائے تو انجمن اس کے علاج کے پورے اخراجات ادا کرتی ہے۔ اس کے لواحقین کے علاج کے لیے انجمن آدھے اخراجات ادا کرتی ہے۔ اس کے علاوہ اس انجمن نے صحت افزا مقامات پر ہوسٹل کھول رکھے ہیں جن میں استاد رعایتی شرح پر ٹھہر سکتے ہیں۔ بیماری کی حالت میں استاد کو اصل تنخواہ کا ۸۰ فی صد مل جاتا ہے اگر وہ تپ دق کا مریض ہو تو پورے دو سال پوری تنخواہ پر چھٹی مل جاتی ہے۔ استانیوں کو زچگی کی حالت میں بارہ ہفتے

کی چھٹی ملتی ہے۔ ملازمت سے سبکدوش ہونے پر تمام استادوں کو پنشن ملتی ہے مگر اس کے لیے انہیں ملازمت کے دوران تنخواہ میں سے کچھ فی صد کٹوانا پڑتا ہے۔

جاپانی استاد اچھی طرح منظم ہیں ان کی انجمنیں دو قسم کی ہیں :-

(۱) پیشہ ورانہ انجمن جس کا مقصد نصاب تعلیم اور طریقہ ہائے تدریس کا لگاتار مطالعہ کرنا ہے۔

(۲) لیبر یونین جسے قانوناً یہ حق حاصل ہے کہ میونسپل کمیٹیوں یا مدرسوں کی دوسری انتظامی جماعتوں کے ساتھ مختلف امور پر بات چیت اور سمجھوتہ کرے۔ تاہم لیبر یونین کی سرگرمیاں صرف ان معاملات تک محدود نہیں۔ وہ تعلیمی معاملات میں بھی دلچسپی لیتی ہے اور اپنے اراکین کی پیشہ ورانہ قابلیت بڑھانے کی کوشش کرتی ہے۔

دوسرے ملکوں کی طرح جاپان میں بھی استادوں کی بڑی مانگ ہے۔ کیوں کہ طلبا کی تعداد ہر جگہ بے تحاشہ بڑھ رہی ہے۔ نویں جماعت تک تعلیم حاصل کرنا ہر ایک کے لیے لازمی ہے۔ لہٰذا اس عمر کے لڑکے اور لڑکیاں ملک کے ہر حصے میں مدرسوں میں داخل ہیں۔ معذور بچوں کے لیے خاص مدرسے جاری ہیں۔ لازمی تعلیم کی حد کے بعد پچاس فی صد سے زیادہ لڑکے اور لڑکیاں سینیر ہائی سکولوں میں تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ اس سے آگے تقریباً ۲۰ فی صد یونیورسٹی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ یونیورسٹیوں میں اب لڑکیوں کی تعداد بھی بڑھ رہی ہے۔ یونیورسٹی میں داخلے کے لیے جو امتحان لیا جاتا ہے اس میں نوجوانوں کی ایک بھاری تعداد ناکام رہتی ہے۔ مثلاً ۱۹۵۵ء میں اس امتحان میں صرف ۲۰.۷ فی صد امیدوار کامیاب ہوئے تھے۔

جاپانی مدرسوں میں سال بھر میں صرف نو چھٹیاں قومی تہواروں کے سلسلے میں ہوتی ہیں۔ ان کے علاوہ تین مرتبہ لمبی چھٹیاں آتی ہیں۔ یعنی گرمیوں میں چھ ہفتوں کی چھٹیاں۔ کرسمس کے موقع پر دو ہفتے کی چھٹیاں اور مارچ میں سکول کا سال ختم ہونے پر دو ہفتے کی چھٹیاں۔ امریکی قبضے کے دوران جاپانی مدرسوں میں امریکی نمونے پر پانچ دن کا ہفتہ رائج کر دیا گیا تھا۔ مگر اب بیشتر سکول دوبارہ سوموار سے ہفتہ کے دن تک لگنے لگے ہیں۔ جاپانی قوم کا ہمیشہ سے یہ عقیدہ چلا آیا ہے کہ بدنی اور ذہنی تربیت

خدا کی دی ہوئی امانت ہیں، ان سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا چاہیے۔ اس عقیدے کی بہترین شرح جاپانی مدرسے پیش کرتے ہیں۔

(۷) جزائر ہوائی

بحرالکاہل کے جزیروں کا یہ سلسلہ جو امریکہ اور پرانی دنیا کے درمیان پُل کا درجہ رکھتا ہے ۱۷۷۸ء میں کیپٹن کُک نے دریافت کیا تھا۔ اس وقت ان جزیروں میں تقریباً تین لاکھ نیم وحشی انسان بستے تھے جو بیرونی دنیا سے تقریباً بے خبر تھے۔ ان کا معاشرتی نظام جاگیردارانہ قسم کا تھا۔ کُک کی دریافت نے ان الگ تھلگ جزیروں اور ان کے باشندوں کو یکدم مغربی استعمار کی زد میں لا کھڑا کیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ بہت جلد مغربی تہذیب یہاں پہنچی اور اس کے جلو میں اس کے اچھے بُرے اثرات بھی آن موجود ہوئے۔

اہل ہوائی کی طرف سب سے پہلے امریکی پادریوں نے توجہ کی۔ نیوانگلینڈ سے مسیحی مبلغوں کی ایک کھیپ ۱۸۲۰ء میں ان جزیروں میں آن پہنچی۔ انھوں نے یہاں کے نیم وحشی باشندوں کو عیسائی بنایا اور ساتھ ہی لکھنا پڑھنا سکھایا۔ اس کے ساتھ ہی امریکی سرمایہ داروں کو ان جزیروں سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ انھوں نے یہاں گنے اور اناناس کی کاشت شروع کی۔ ان کھیتوں میں کام کرنے کے لیے دنیا کے مختلف حصوں سے مزدور درآمد کیے گئے۔ یہ سلسلہ ۱۹۲۵ء تک جاری رہا۔ ان تاریخی حالات نے نہ صرف ہوائی کی آبادی کو تقریباً دوگنا کر دیا بلکہ اسے مختلف قوموں کا ایک مرکب بنا کر رکھ دیا۔ آج حالت یہ ہے کہ چھے لاکھ سے زائد کی آبادی میں صرف پانچویں حصے سے کچھ زیادہ لوگ خالص ہوائی نسل کے ہیں۔ ان سے دوچند آبادی جاپانی نسل کی ہے۔ آبادی کا پانچواں حصہ سفید نسل سے تعلق رکھتا ہے۔ اور باقی آبادی مختلف نسلوں کا مرکب ہے۔

جزائر ہوائی کو اب ریاستہائے متحدہ کی ایک ریاست قرار دے دیا گیا ہے۔ اس کے باشندے اب امریکی شہری ہیں، لیکن انھیں یہ درجہ عطا کرنے کے لیے ہوائی کے مدرسوں کو زمین تیار کرنی پڑی۔ ان مدرسوں کے سامنے دو بڑے کام تھے:۔

(۱) ہوائی کے اصل باشندوں کو جو پتھر کے زمانے کی تہذیب رکھتے تھے نہ صرف پڑھنا لکھنا سکھایا جائے بلکہ انھیں جدید تہذیب کی پیچیدگیوں سے بھی واقف کیا جائے ۔

(۲) یورپ اور ایشیا سے جو کسان لوگ روزگار کی تلاش میں اس جگہ اُٹھ آئے ہیں انھیں اور ان کی اولاد کو پیچیدہ قسم کے امریکی طرز زندگی کا عادی بنایا جائے ۔

ان ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے دو قسم کے مدرسے وجود میں آئے :-

(۱) وہ مدرسے جن کا مقصد اونچے طبقے کے بچوں کو تعلیم دینا تھا ۔ اس طبقے میں پادری یورپ سے آنے والے گورے (جن میں سے اکثر نے ہوائی عورتوں سے شادیاں کر لی تھیں) اور ہوائی قوم کے سردار شامل تھے ۔ اس طبقے کے بچوں کو تعلیم دینے کے لیے ۱۸۳۰ء اور ۱۸۴۰ء کے درمیان بہت سے پرائیویٹ مدرسے قائم ہو گئے ۔ یہ مدرسے ہوائی کے اعلیٰ طبقے کے بچوں کو تعلیم دیتے تھے ۔

(۲) عام اہل ہوائی کے بچوں کو تعلیم دینے کے لیے پادریوں نے مدرسے جاری کیے ۔ یہ مدرسے اوّل اوّل پادریوں کے پیسے تھے مگر بعد میں یہ بچوں کو تعلیم دینے لگے ۔ ۱۸۵۰ء میں ان مدرسوں کو سرکاری امداد بھی ملنے لگی اور ۱۸۸۰ء تک یہ سرکاری مدرسے بن گئے ۔

مغربی تہذیب کا غلبہ | ہوائی مدرسے اوّل اوّل مقامی زبان میں تعلیم دیتے تھے مگر پچھلی صدی کی آخری دہائی میں انگریزی زبان کی مانگ بڑھنے لگی ۔ جزائر ہوائی کے صدر مقام ہونولولو میں ۱۸۹۰ء کے بعد امریکی طرز پر ایک مدرسہ کھلا جس میں انگریزی پڑھائی جاتی تھی ۔ اس مدرسے میں زیادہ تر یورپی والدین کے بچے داخل ہونے لگے ۔ اس وقت سے انگریزی کی مانگ برابر بڑھتی گئی ہے ۔ آج نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ ہوائی زبان قریب المرگ ہو رہی ہے ۔

سرکاری مدرسے بھی رفتہ رفتہ انگریزی مدرسے بن گئے ۔ ان میں غیر ملکی مزدوروں کے بچے پڑھتے تھے ۔ یہ بچے زیادہ تر ایشیائی والدین کے بچے تھے ۔ ان میں زیادہ تعداد چینی ، جاپانی کورین اور فلپائن بچوں کی تھی ۔ ۱۹۱۰ء تک سرکاری مدرسوں میں ان بچوں کی تعداد نصف کے لگ بھگ پہنچ گئی ۔ دس سال بعد یعنی ۱۹۲۰ء میں ان کی تعداد ۶۰ فی صد کو جا پہنچی ۔

باہر سے آنے والے مزدوروں کی تعداد برابر بڑھتی جا رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی مدرسے کے ایسے طلبہ کی تعداد بھی بڑھ رہی تھی جن کے گھروں میں انگریزی نہیں بولی جاتی تھی مگر سرکاری مدرسوں میں ساری پڑھائی انگریزی میں ہوتی تھی۔ اس سے ان بچوں کو شدید دشواریوں کا سامنا ہوتا تھا۔ انگریزی زبان کے علاوہ یہ بچے مغربی ادب آداب سے بھی نابلد ہوتے تھے۔ ان مشکلوں پر قابو پانے کے لیے مدرسے میں داخلے سے پہلے تیاری کرنے والی جماعتیں کھولی گئیں۔ یہ جماعتیں جزائر ہوائی کے سارے علاقے میں ۱۸۹۶ سے ۱۹۳۰ تک جاری رہیں۔

مگر اس اہتمام کے باوجود زبان کا مسئلہ ہوائی مدرسوں کے لیے بہت بڑا دردِ سر بنا رہا۔ جن بچوں کی مادری زبان انگریزی نہ تھی، مدرسے کو ان کے بارے میں سخت دشواری پیش آتی۔ چناں چہ ۱۹۲۰ء میں خالص انگریزی مدرسے گورے بچوں کے لیے جاری کیے گئے۔ یہ سرکاری مدرسے تھے دوسری عالمی جنگ کے آغاز تک ان مدرسوں کی تعداد نو تک جا پہنچی۔ مگر جنگ شروع ہوتے ہی گوری آبادی کو امریکہ میں منتقل کر دیا گیا۔ لہٰذا ان مدرسوں میں بھی ہوائی اور ایشیائی نسلوں کے بچے داخل ہو گئے۔

جاپان کی شکست کے بعد جب جزائر ہوائی دوبارہ پورے طور پر امریکی قبضہ میں آ گئے تو انگریزی مدرسوں میں نئے سرے سے گورے بچوں کا داخلہ شروع ہو گیا۔ اگرچہ اب ان مدرسوں کے دروازے ایشیائیوں پر پورے طور پر بند نہ تھے مگر پھر بھی گورے بچوں کو داخلے کے وقت ترجیح ملتی تھی۔ اس صورتِ حال نے ایک سیاسی بحث کا آغاز کر دیا۔ دوسری عالمی جنگ کے دوران اور اس کے بعد امریکہ نے جمہوری قدروں کا واسطہ جس شد و مد سے دیا تھا، اس سے دنیا باخبر تھی۔ ہوائی کے ایشیائی باشندوں نے آواز بلند کی کہ انگریزی مدرسوں کا انداز کار غیر جمہوری ہے۔ اس مسئلے نے یہاں تک اہمیت حاصل کی کہ جزائر ہوائی کی مجلس قانون ساز نے ایک قانون منظور کیا کہ انگریزی مدرسے رفتہ رفتہ ختم کر دیے جائیں۔ یہ قانون اب عملی جامہ پہن چکا ہے۔ اب صرف ایک انگریزی مدرسہ باقی رہ گیا ہے۔ سنہ ۱۹۶۱ء میں اس کا وجود بھی ختم ہو جائے گا۔

نسلی امتیاز کی ابتدا اگرچہ جزائر ہوائی کی حکومت نے سرکاری طور پر تعلیم میں نسلی امتیاز کو کبھی تسلیم نہیں کیا۔ تاہم یہ بات ناقابلِ انکار ہے کہ اس کے جاری کردہ انگریزی مدرسے بڑی حد تک نسلی امتیاز کو ہوا دینے کا موجب بنے۔ اسی بنا پر ہوائی گوری آبادی نے انگریزی مدرسوں کے خلاف آواز اٹھائی حقیقت یہ ہے کہ مدرسوں میں نسلی امتیاز کا آغاز سرکاری مدرسوں نے نہیں بلکہ پرائیویٹ مدرسوں نے کیا تھا۔ جو امریکی پادری ہوائی قوم کو عیسائی بنانے آئے تھے، انھیں اس بات کی بہت فکر تھی کہ ان کے بچے کہیں ہوائی زبان سے بھرشٹ نہ جائیں۔ اس کی ایک صورت یہ تھی کہ وہ انھیں تعلیم کے لیے امریکہ بھیجتے۔ دوسری صورت ان بچوں کے لیے جزائر ہوائی میں ایک اقامتی سکول قائم کرنا تھا۔ انھوں نے یہ دوسری صورت اختیار کی۔ ۱۸۴۱ء میں پوناہاؤ کے مقام پر پادریوں کے بچوں کے لیے ایک مدرسہ کھل گیا۔ جلد ہی اس میں پادریوں کے علاوہ دوسرے گوروں کے بچے بھی داخل ہونے لگے۔ کچھ بچے ہوائی امرا کے لیے جانے لگے۔ اس طرح پوناہاؤ ایک خاص طبقے کے بچوں کا مدرسہ بن گیا۔ بعد میں اسی نمونے پر کچھ اور مدرسے بھی قائم ہو گئے۔ بالآخر پوناہاؤ نے بھی اپنے ہاں دس فی صدی جگہیں ایشیائی بچوں کے لیے مخصوص کر دیں۔ اب نسلی تعصب کے سرکاری طور پر ختم ہو جانے پر پوناہاؤ نے دس فیصد کی تخصیص ختم کر دی ہے۔ اس میں داخلے کی صرف یہ شرط رہ گئی ہے کہ طالب علم داخلے کے امتحان میں معیار پر پورا اترے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ان معیاروں کو زیادہ تر گورے بچے ہی پورا کرتے ہیں۔

پوناہاؤ کے مقابلے میں ایک مدرسہ ایسا بھی ہے جس میں صرف وہ بچے داخل ہو سکتے ہیں جن کی رگوں میں کچھ نہ کچھ ہوائی خون ہو۔ یہ مدرسہ ۱۸۸۹ء میں ہوائی بادشاہ کمے ہمہا کی آخری وارثہ کی وصیت کے مطابق قائم ہوا تھا۔ اس وصیت کے مطابق اس شہزادی کی تمام زمینیں جو جزائر ہوائی کی کل زمینوں کا نو فی صد بنتی ہیں اس مدرسے کے نام وقف ہیں۔ اس وقت اس مدرسے میں پندرہ سو کے قریب طلبہ پڑھتے ہیں۔ اگرچہ ان تمام کی رگوں میں کچھ نہ کچھ ہوائی خون موجود ہے۔ مگر مدرسے کا چکر لگانے سے پتہ چلتا ہے کہ گو کچھ بچے بالکل ہوائی خدوخال رکھتے ہیں ان میں بہت سے چینی، جاپانی یا گوری نسل کے معلوم ہوتے ہیں اور بعض کے چہروں کو رنگا رنگ خون کی آمیزش نے عجیب قسم کے خدوخال عطا کر رکھے ہیں۔

حرفِ آخر جزائر ہوائی میں تعلیم نے جو کارنامے کیے ہیں وہ ناقابلِ انکار ہیں، صرف ۱۸۰ برس گذرے اس جزیرے میں پتھر کے زمانے کی تہذیب حکمران تھی۔ ۱۸۲۰ء میں امریکی پادریوں نے اس تہذیب کی جگہ مغربی تہذیب کو رواج دینے کا کام شروع کیا۔ سب سے پہلا کام ہوائی زبان کو ایک رسم الخط عطا کرنا تھا۔ کیوں کہ اس کے بغیر عیسائیت کی اشاعت ممکن نہ تھی۔ چناں چہ یہ کام انجام دیا گیا اور کوئی دس سال کے عرصے میں ہوائی بالغوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیا گیا۔ جب اس طرح ان جزائر میں مسیحی دین کے قدم گڑ گئے تو اہلِ ہوائی کو انگریزی زبان پڑھائی جانے لگی۔ تاکہ ہوائی طرزِ زندگی کی جگہ امریکی طرزِ زندگی کو مل جائے۔ جب جزائر ہوائی کی دولت سمیٹنے کے لیے ایشیائی مزدوروں کو بھاری تعداد میں درآمد کیا گیا تو تعلیم کے ذمے یہ کام لگایا گیا کہ وہ مختلف تہذیبوں کو ہموار کر کے انھیں مغربی تہذیب کے سانچے میں ڈھالے۔ اس وقت جب کہ جزائر ہوائی سیاسی طور پر ریاست ہائے متحدہ امریکہ کا ایک جزو بن چکے ہیں۔ تعلیم کے ذمے یہ خدمت لگائی گئی ہے کہ وہ امریکی زندگی کی قدروں کو جزائر ہوائی میں عام کرے۔ تعلیم نے ماضی میں اپنے فرائض بہت اچھی طرح انجام دیے ہیں۔ اس لیے امید ہے کہ وہ آئندہ بھی ایک مؤثر آلۂ کار کے طور پر کام دیتی رہے گی۔

(۷) مائکرونیشیا

بحرالکاہل کے انتہائی مغربی حصے میں چھوٹے چھوٹے جزیروں کا ایک سلسلہ پھیلا ہوا ہے جن کو مائکرونیشیا کا نام دیا جاتا ہے۔ دوسری عالمی جنگ کے خاتمے پر اقوامِ متحدہ کی سلامتی کونسل نے یہ جزیرے ایک غیر معین عرصے کے لیے امریکہ کے حوالے کر دیے تاکہ وہ سیاسی، معاشی، معاشرتی اور تعلیمی طور پر ان کو ترقی دے۔ ان جزیروں میں کوئی ستر ہزار لوگ بستے ہیں۔ یہ چھوٹے چھوٹے جزیرے ایک دوسرے سے کافی فاصلے پر واقع ہیں اور ان کے درمیان آمد و رفت کی سہولتیں اس قدر کم رہی ہیں کہ اس وقت ان جزیروں میں کم از کم نو زبانیں بولی جاتی ہیں اور نو ہی قسم کی ثقافتیں موجود ہیں۔ امریکہ پہلے دن سے یہ بات اچھی طرح سمجھتی تھی کہ مائکرونیشیا کا ہر ترقیاتی منصوبہ تعلیمی بنیاد کا محتاج ہے۔ مگر ایک ایسی آبادی میں جو اس طرح بکھری پڑی ہو تعلیم کو یکانگت اور یک جہتی پیدا کرنے کا ذریعہ بنانا کوئی آسان کام نہیں۔

ان جزائر کے نظم ونسق کے لیے کل ۷۷۵ امریکی متعین ہیں۔ ان میں ۷۴ ماہرین تعلیم ہیں۔ امریکی حکومت کو اس بات کا یقین ہے کہ تعلیم ہی اہل مائکرونیشیا کو اس قابل بنا سکتی ہے کہ اپنی مختلف ثقافتوں کے بہترین اجزا کو باہم ملاکر ایک قومی ثقافت تیار کریں اور اس ثقافت میں مغربی اور بالخصوص امریکی ثقافت کے ان اجزا کا اضافہ کریں جو حقیقی قدر وقیمت کے حامل ہوں۔ لیکن مختلف ثقافتوں کا باہم مل کر ایک ہو جانا فاصلہ کٹھن کام ہے۔ ماہرین علم انسانیات اس بات پر متفق ہیں کہ ثقافتیں بھی جانداروں کی طرح زندہ وحدتیں ہیں۔ کوئی ثقافت خواہ کتنی ہی پسماندہ یا فرسودہ قسم کی کیوں نہ ہو یہ ہرگز ممکن نہیں ہوتا کہ اس کے کسی ایک رسم یا رواج کو اٹھا کر اس کی جگہ کسی اور رسم یا رواج کو رکھ دیا جائے۔ اس قسم کی تبدیلی بہت گہری نظر اور مہارت کا مطالبہ کرتی ہے۔ یہ وہ مشکل کام ہے جو ۷۴ امریکی ماہرین تعلیم اور ان کے ۴۰۰ مائکرونیشی مددگاروں نے اپنے ذمہ لیا ہے۔

مدرسے کی آمد | جزائر مائکرونیشیا پہلے جاپانیوں کے قبضے میں تھے۔ انھوں نے چند ایک جزیروں میں کچھ مدرسے قائم ضرور کیے تھے، مگر تمام بچوں کے لیے تعلیم کا تصور اہل مائکرونیشیا کے لیے بالکل نیا ہے۔ یہ لوگ اپنے بچوں کو خود تربیت دینے کے عادی چلے آئے ہیں، وہ اپنے بچوں کو چھوٹی عمر میں ہی معمولی کام کاج کرنا۔ جھاڑو دینا۔ پانی لانا، اور ننھے بہن بھائی کی دیکھ بھال کرنا سکھا دیتے ہیں جب بچے ذرا سیانے ہو جاتے ہیں تو والدین اور بزرگ انھیں فصل بونا۔ فصل کاٹنا۔ کھانا پکانا۔ مچھلی پکڑنا۔ مکان بنانا۔ کشتی تیار کرنا اور چٹائیاں بنانا سکھا دیتے ہیں۔ یہی وہ عملی سرگرمیاں ہیں جن سے ان لوگوں کو عمر بھر سابقہ رہتا ہے۔ جب بچے بلوغت کی عمر کو پہنچتے ہیں تو بڑے بوڑھے انھیں قومی روایات اور قصے کہانیوں سے بھی آگاہ کر دیتے ہیں۔

مائکرونیشی بچے اس قسم کی غیر رسمی تعلیم کے عادی تھے جب ۱۹۴۷ء میں امریکی بحریہ کے افسروں نے جو اس وقت ان جزائر کے نظم ونسق کے ذمہ دار تھے یہ فیصلہ کیا کہ آٹھ اور چودہ برس کی درمیانی عمر کے تمام بچے لازمی طور پر تعلیم حاصل کریں۔ ایک ایسی قوم جسے پتھر کے زمانے کی تہذیب سے باہر نکلے زیادہ زمانہ نہ گزرا تھا ابھی لازمی تعلیم کا مفہوم یا اس کی اہمیت نہ سمجھ سکتی تھی۔

یہ بات بالکل قدرتی تھی۔ لازمی تعلیم کو نافذ ہوئے اب بارہ سال ہونے کو آئے ہیں۔ اس عرصے میں جزائر مائکرنیشیا میں جگہ جگہ مدرسے کھل چکے ہیں۔ مائکرونیشی استادوں کو پڑھانے کے نئے طریقوں کی تربیت دی جاچکی ہے۔ مگر اب بھی طلبہ کی حاضری بے قاعدہ اور کم ہے۔ عام استاد بھی مدرسے اس وقت لگاتے ہیں جب ان کا جی چاہے۔ یہ صورت حال بعض اوقات امریکی مبصروں کو حیرت میں ڈال دیتی ہے۔ مگر عمرانیات کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں۔ ایک اجنبی قوم کسی دوسری قوم کو اپنی ثقافت کے لوازمات ضرور عطا کر سکتی ہے۔ اپنی ثقافتی روح اس قوم میں نہیں پھونک سکتی۔ غیر ملکی ثقافتی روح کے اجزا اسی وقت اخذ کیے جا سکتے ہیں جب ان کے لیے پیاس پیدا ہو چکی ہو۔ مائکرونیشی اساتذہ اور طلبہ اسی ثقافتی روح کے حامل ہیں جو ان کے اردگرد رہتی بستی موجود ہے۔ جب امریکی رابطے کے زیر اثر مائکرونیشی زندگی میں تبدیلی پیدا ہو گی تو لوگ خود بخود اپنے بچوں کو مختلف قسم کی تربیت دینے کی ضرورت محسوس کریں گے۔ یہ احساس انھیں مدرسے کی طرف راغب کرے گا۔ وہ مدرسے کے نصاب کو ایسی شکل دینی چاہیں گے جو بچوں کو زندگی کی عملی ضرورتوں کے لیے تیار کر دے۔ جب یہ ہو جائے گا اس وقت مائکرونیشی ثقافت اور مدرسے کا وہ بعد دور ہو جائے گا جس نے اس وقت دونوں کے درمیان اجنبیت پیدا کر رکھی ہے۔

موزوں اساتذہ کی تیاری تعلیم کا یہ نیا تصور اس پرانے تصور سے بہت مختلف ہے جو یہ یقین کرتا تھا کہ تحکمانہ انداز میں کچھ بتا دینے اور انھیں جبر و اکراہ کے بل بوتے پر رٹوا دینے سے تعلم پیدا ہو جاتا۔ اس قسم کی تعلیم الفاظ کی تکرار پیدا کر سکتی ہے خیالات میں تبدیلی نہیں کر سکتی۔ خیالات اور جذبات میں تبدیلی پیدا کرنے کے لیے تعلیم کو عوامی زندگی کی سطح سے کام کا آغاز کرنا چاہیے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بنیادی تعلیم وہ ہے جو زندگی کے عملی مسائل کو توجہ کا مرکز بنائے۔ جو لوگوں کو اس قابل بنائے کہ اپنے روزمرہ مسائل پر مل کر غور و فکر کریں اور ان کے ایسے حل تلاش کریں جو انفرادی اور اجتماعی زندگی دونوں کی بہاریں اضافہ کریں۔

یہ ہے وہ بنیادی تعلیم جسے یونیسکو اور دوسرے انسانیت نواز ادارے آج دنیا کے

پسماندہ ملکوں میں عام کرنے کی فکر میں ہیں۔ اس قسم کی تعلیم دینے کے لیے تعلیمی رہنمائی ایسے لوگوں کے ہاتھ میں ہونی چاہیے جو خود بصیرت رکھتے ہوں اور دوسروں میں بصیرت پیدا کرسکتے ہوں، اس کے ساتھ ہی وہ اس قابل بھی ہوں کہ مجوزہ تعلیمی اصلاح کے نتائج کا اندازہ کافی پہلے سے کرسکیں یہ تمام شرائط اسی صورت میں پوری ہوسکتی ہیں جب پڑھانے والے اساتذہ کے جذبۂ عمل اور ان کی نگاہوں کو لگاتار تازہ رکھا جاسکے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ استادوں کو نہ صرف ملازمت میں داخل ہونے سے پہلے اچھی تربیت ملے بلکہ ملازمت میں داخل ہونے کے بعد بھی ان پر ترقی و بالیدگی کے دروازے مسلسل کھلے رہیں۔

یہ اغراض حاصل کرنے کے لیے مائکرونیشیا کو پانچ تعلیمی اضلاع میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ان میں سے ہر ضلع ایک انسپکٹر کی تحویل میں ہے۔ انسپکٹر کا کام محض استاد کو خوفزدہ کرنا نہیں بلکہ اس کا حقیقی فرض یہ ہے کہ استاد کے نقطۂ نگاہ کو لگاتار تازہ کرتا رہے۔ ہر تعلیمی ضلع میں ۲۳ سے ۸۲ تک ابتدائی مدرسے واقع ہیں۔ انسپکٹر ان مدرسوں میں چکر لگاتا اور مقامی آبادیوں سے رابطہ پیدا کرتا رہتا ہے یہ کام جس قدر دشوار ہے اس کا اندازہ اس بات سے ہوسکتا ہے کہ بعض مدرسے ضلعی صدر مقام سے چھ سو میل دور واقع ہیں، اور ان کے اور ضلعی صدر مقام کے درمیان سمندر کے چوڑے بازو حائل ہیں۔ انسپکٹر کے راستے میں دوسری بڑی دشواری مقامی زبانوں کی ہے۔ اسے استادوں کے علاوہ مقامی لوگوں کے ساتھ بھی رابطہ پیدا کرنا پڑتا ہے۔ لہٰذا اس کے لیے ان لوگوں کی زبان سیکھنا ضروری ہے، لیکن عام حالتوں میں ایک تعلیمی ضلع میں دو دو تین تین بولیاں بولی جاتی ہیں۔ انسپکٹر کو لامحالہ اپنے ضلع کی تمام بولیاں سیکھنی پڑتی ہیں۔

اس وقت مائکرونیشیا کے مدرسوں میں پڑھانے والے استاد عموماً نویں جماعت پاس ہیں اور انھوں نے ضلعی صدر مقام میں متعدد مختصر تربیتی نصابوں میں تربیت حاصل کی ہے۔ ان تمام جزائر میں صرف ایک ہی سینئر ہائی سکول ہے جو بارہویں جماعت تک تعلیم دیتا ہے۔ کہیں کہیں کوئی استاد اس سینئر ہائی سکول کا فارغ شدہ بھی نظر آجاتا ہے۔ بعض اوقات یوں بھی ہوتا ہے، کہ

قبائلی سردار کے کہنے پر ایک اچھے تجربہ کار استاد کی جگہ ایک نئے ناتجربہ کار استاد کو رکھنا پڑتا ہے یہ وہ مشکلات ہیں جن سے امریکی ماہرین تعلیم دوچار ہیں۔ وہ جزائر مائکرونیشیا پر وہ تعلیمی حل نہیں ٹھونس سکتے جو ان کے اپنے ملک میں کامیاب ثابت ہوئے ہیں۔ انہیں ان جزائر کے باشندوں کو اس قابل بنانا ہے کہ اپنے مسائل خود تلاش کریں اور خود ہی ان کے حل ڈھونڈیں۔ یہ کام جس قدر زیادہ دشوار اور صبر آزما ہے اتنا ہی اس کا حل زیادہ پر لذت اور طمانیت بخش ثابت ہونے والا ہے۔

مائکرونیشیا میں آج جو تعلیمی تجربہ جاری ہے وہ ایک لحاظ سے بالکل یگانہ ہے۔ ان جزیروں میں بسنے والے لوگ آج تک نہ صرف دنیا سے الگ تھلگ رہے ہیں بلکہ خود ان کے اپنے درمیان بھی اب تک کم میل جول رہا ہے۔ یہ چھوٹے چھوٹے جزیرے جن میں سے بعض بے حد چھوٹے ٹاپو ہیں لاکھوں مربع میل کے آبی رقبے میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اس لیے ان کے باشندوں کو مختلف ثقافتی دیواروں نے ایک دوسرے سے الگ کر رکھا ہے۔ جدید ذرائع آمدورفت نے فاصلے کے بُعد کو تقریباً ختم کر دیا ہے۔ مگر ثقافتی دیواروں نے جو بُعد پیدا کر رکھا ہے اسے ختم کرنا سائنس کے بس کی بات نہیں۔ یہ کارنامہ تعلیم ہی انجام دے سکتی ہے۔ آج جو امریکی ماہرین تعلیم ان جزیروں میں تعلیم کی روشنی پھیلا رہے ہیں ان میں بیشتر کو اس بات کا احساس ہے کہ اہل مائکرونیشیا حقیقی ترقی اسی صورت میں حاصل کریں گے جب وہ اپنے مسائل خود حل کرنا سیکھ جائیں۔ امریکہ سے بنے بنائے حل درآمد کر لینے سے ان کی ثقافتی روح میں کوئی بالیدگی پیدا نہیں ہو سکتی۔ تاہم اس مفروضے پر عمل کرنا بڑا کٹھن کام ہے۔ ایک پسماندہ قوم کو خود سوچنے کے قابل بنانا صبر و تحمل کا کڑا امتحان لیتا ہے کیوں کہ قدم قدم پر اکساہٹ یہ رہتی ہے کہ کیوں نہ یہ کام تھوڑے وقت اور تھوڑی محنت سے خود کر دیا جائے۔ لہٰذا اس بات کا فیصلہ آنے والا مؤرخ کرے گا کہ امریکہ نے جزائر مائکرونیشیا میں کس قدر کامیابی حاصل کی ٭

برطانیہ کا نظامِ تعلیم

محمد عبدالعزیز

(۴)

قانونِ تعلیم مجریہ ۱۹۴۴ء

۱۹۴۴ء میں جنگ ایک فیصلہ کن مرحلے پر پہنچ چکی تھی۔ اتحادی فوجیں مشرق و مغرب دونوں محاذوں پر کامیاب ہو رہی تھیں اور اب یہ توقع ہو چلی تھی کہ اس کا فیصلہ اتحادیوں کے حق میں ہوگا۔ اس سے ایک طرف تو امید و بیم کی وہ کیفیت ختم ہو گئی جو قومی تعمیر کی راہ میں حائل تھی اور دوسری طرف قومی تعمیر کی منصوبہ بندی میں واقعیت کا آب و رنگ بھی ابھرنے لگا۔ ۱۹۴۱ء میں مسٹر آر۔ اے۔ بٹلر کو قومی حکومت میں محکمۂ تعلیم کی سربراہی سپرد ہوئی۔ بٹلر نے اس انتخاب کا حق ادا کر دیا اور دو سال کی مسلسل محنت کے بعد تعلیم کی تعمیرِ نو کا جو منصوبہ پیش کیا، اس سے نہ صرف یہ کہ پرانے تنازعات ختم ہو گئے، بلکہ اس سے وہ ایک ایسے نظامِ نو کی طرح ڈالنے میں کامیاب ہوا جس نے برطانوی نظامِ تعلیم کی انتظامی پیچیدگی اور دینی تعلیم کے مسائل کو بطریقِ احسن حل کر دیا۔

مابعد جنگ کے تعمیراتی منصوبوں میں تعلیم کو فوقیت دی گئی۔ یہ محض حادثاتی نہ تھی بلکہ یہ فوقیت ایک سوچی سمجھی سکیم کے تابع تھی۔ جنگ کی ہنگامہ خیزیوں ہی میں برطانیہ کے ارباب بست و کشاد پر برطانوی نظامِ تعلیم کے نقائص واضح ہوتے جا رہے تھے، اور جن لوگوں کا حکومت کے کاروبار میں براہ راست دخل تھا انھوں نے قومی ضروریات کے پیش نظر اس کی تنظیم نو کا بیڑا اٹھایا۔ چرچل نے اپنے اسکول ہیڈ میں تعلیم کی تعمیر نو کے سلسلے میں جو تقریر کی دراصل وہ ایک نئے نظامِ تعلیم کا اعلان تھا۔ اس نے کہا "جنگ میں کامیابی کے بعد ہمارا سب سے بڑا مقصد ایک ایسی سوسائٹی کا قیام ہوگا جہاں وہ مواقع اور مراعات جو اب تک چند مخصوص لوگوں کے لیے مختص تھے، اب اس میں قوم کے ہر نوجوان کا زیادہ سے زیادہ حصہ ہوگا"۔ چناں چہ حکومت نے تعلیم کے ایک ایک پہلو کا جائزہ لیا۔ ملک کی اقتصادی حالت تعلیم کی فروغ۔

نصاب، طرزِ تعلیم، نوجوانوں کی جسمانی، اخلاقی اور فکری تہذیب و تربیت۔ روزگار کی سبیل۔ یہ اور اسی قسم کے بیسیوں مسائل تھے جن کے متعلق انھیں ایک حتمی اور آخری بات کہنی تھی۔ چنانچہ خاصے غور و فکر کے بعد جو منصوبہ تیار ہوا، اس نے مستقبل کے نظامِ تعلیم کی ایک راہ متعین کر دی۔

جون ۱۹۴۱ء میں حکومت نے گرین بک شائع کی اور مختلف تعلیمی حلقوں کی رائے معلوم کرنے کے لیے یہ کتاب مقامی تعلیمی حکومت کے نمائندوں، انجمنِ اساتذہ کے اراکین اور بعض دوسرے حضرات میں تقسیم کر دی گئی۔ یہ کتاب دراصل ایک ایسے سوال نامے پر مشتمل تھی جسے حکومت صیغۂ راز میں رکھنا چاہتی تھی لیکن یہ کچھ ایسی عام ہوئی کہ اس کا راز عوامی ملکیت بن گیا۔ بہرصورت اس کی اشاعت کا مقصد اہلِ رائے طبقے کو بیدار کرنا تھا کہ ان میں سے ہر شخص تعلیم کی تعمیرِ نو کے سلسلے میں اپنی اپنی رائے کا اظہار کرے۔

اس سوال نامے کے جواب میں جو مواد جمع ہوا، اس کے پیشِ نظر ٹیلر نے جولائی ۱۹۴۳ء میں ایک "قرطاس ابیض" شائع کیا۔ لوگوں نے اس قرطاس کا خیر مقدم کیا۔ اس سے ٹیلر کو اور تقویت حاصل ہوئی، اور اس نے انھیں خطوط پر ایک بل مرتب کیا۔ دسمبر ۱۹۴۳ء میں یہ بل دارالعوام میں پیش ہوا اور مختلف مدارج سے گزرتا ہوا ۳ اگست ۱۹۴۴ء کو قانون بن گیا۔

قانونِ تعلیم مجریہ ۱۹۴۴ء کی اہم سفارشات یہ ہیں :-

(۱) مرکزی انتظامیہ

محکمۂ تعلیم کی حیثیت ایک مکمل وزارت کی ہو گی جو وزارتِ معارف کہلائے گی۔ اور اس وزارت کا سربراہ کابینہ کا مکمل رکن ہو گا اور اس طرح پارلیمان کا جواب دہ۔ وزارتِ معارف کے عملے کا تقرر اس کی ذمہ داری ہو گی۔

(۲) مرکزی مشاورتی کونسل (THE CENTRAL ADVISORY COONCIL) کا قیام

انگلستان اور ویلز کے لیے دو مرکزی مشاورتی کونسل علاحدہ علاحدہ قائم کی جائیں گی۔ وزیر معارف خود ان دونوں کونسل کے صدر اور نائب صدر نامزد کرے گا، اور وزارتِ معارف ہی کا کوئی افسر ان کونسلوں کے سیکرٹری کی حیثیت سے کام کرے گا۔

ان دونوں کونسلوں کا کام طلا تائی ضروریات کے پیش نظر تعلیم کے عملی اور نظری دونوں پہلوؤں پر نگاہ رکھنا اور مشورہ دینا ہوگا۔

(۳) مقامی تعلیمی حکومتوں (LEAS) کی تعداد ۱۵۰ سے گھٹا کر ۱۰۴ کردی جائے گی۔ ہر مقامی تعلیمی حکومت، اپنی انتظامی ضروریات کے پیش نظر ایجوکیشن کمیٹی قائم کرے گی۔ اس کمیٹی کے ارکین کی اکثریت مقامی حکومت کی رکن ہو گی۔ لیکن اس میں ایسے لوگ بھی شامل کیے جا سکتے ہیں جن کا اس میدان میں خاصہ وسیع تجربہ ہو۔ مقامی تعلیمی حکومت کی اس کمیٹی کے اختیارات وسیع ہوں گے لیکن وہ بہر صورت نہ تو مقامی محصول لگا سکے گی اور نہ اس مقصد کے لیے کہیں سے قرض لینے کی مجاز ہو گی۔

(۴) بعض حالات میں ایک یا ایک سے زیادہ مقامی تعلیمی حکومتوں کو انتظامی لحاظ سے ایک مشترکہ نظام کے تابع لایا جا سکتا ہے۔ اس سے ایک تو کام کی رفتار بڑھ جائے گی اور مالی اعتبار سے بھی کوئی خسارہ نہیں ہو گا۔

(۵) ابتدائی اور ثانوی تعلیم کا اہتمام دو مختلف اداروں میں کیا جائے گا۔

(۶) ہر مقامی تعلیمی حکومت اپنے علاقے میں ضرورت کے مطابق کافی تعداد میں اسکول کھولے گی اور یہ اسکول نہ صرف یہ کہ تعداد میں کافی ہوں گے بلکہ اپنی نوعیت اور ساز و سامان کے لحاظ سے بھی منفرد ہوں گے۔ اس کے علاوہ ان مدرسوں میں تعلیم کا اہتمام اس انداز میں کیا جائے گا کہ ہر طالب علم کے انفرادی تقاضے پورے ہو سکیں گے، اور مختلف مدارج میں تعلیم انھیں قانون کے مطابق بدلتی رہے گی۔

(۷) ضرورت کے مطابق مقامی تعلیمی حکومتیں اپنے علاقے میں نرسری اسکول بھی کھول سکتی ہیں۔

(۸) جو بچے بعض ذہنی بیماریوں کے شکار ہیں ان کی تعلیم و تربیت کے لیے علاحدہ ادارے قائم کیے جائیں گے۔

(۹) ایسے طلبہ کے رہائشی انتظام کی ذمہ داری جن کے والدین انھیں گھر سے باہر رکھنا چاہتے ہیں۔

یا جن کے متعلق خود کونسل گھروں کے ماحول سے باہر رکھنے کا فیصلہ کرے، مقامی تعلیمی حکومت پر عاید ہوتی ہے۔

(۱۰) ہر مقامی تعلیمی حکومت اپنے علاقے کی تعلیمی ضروریات کا جائزہ لے کر ایک تعلیمی ترقیاتی منصوبہ بنانے کی مجاز ہوگی۔ یہ تعلیمی منصوبہ منظوری کے لیے وزیر معارف کے حضور پیش کیا جائے گا لیکن رضاکارانہ اسکولوں کے منصوبوں کے پیش کرنے سے پہلے مقامی تعلیمی حکومت کا فرض ہوگا کہ وہ اس سلسلے میں ادارے کے انتظام کاروں سے مشورہ کر لیں۔

(۱۱) دوعملی انتظام میں کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوگی۔ اب ان کا نیا نام کاؤنٹی اسکول یا رضاکارانہ اسکول ہوگا۔

ابتدائی اور ثانوی مدارس میں تعلیم کا انتظام

(۱) مقامی تعلیمی حکومتیں دو یا دو سے زیادہ کاؤنٹی یا رضاکارانہ مدرسوں کو انتظامی سہولت کے لیے ایک انجمن انتظامیہ کے سپرد کر سکتی ہیں۔

(۲) کوئی عورت محض اس لیے کہ عورت ہے اسے کسی کاؤنٹی یا رضاکارانہ اسکول میں ملازمت اختیار کرنے سے نہیں روکا جا سکتا اور نہ کسی عورت کو محض اس لیے کہ اس نے شادی کر لی ہے اسکول سے نکالا جا سکتا ہے۔

(۳) دینی تعلیم دفعہ ضمیر کے مطابق ہر کاؤنٹی اسکول میں لازمی ہوگی۔ ہر اسکول کا آغاز اجتماعی عبادت سے ہوگا۔ یہ اجتماعی عبادت ہال یا کلاس روم میں ہو سکتی ہے۔ کسی مدرسے میں فرقہ وارانہ دینی تعلیم نہیں دی جا سکتی، بلکہ اس کے برعکس جو دینی تعلیم طلبہ کو دی جائے گی وہ متفقہ نصاب (AGREED SYLLEBUS) سے ماخوذ ہوگی۔

(۴) یکم اپریل ۱۹۴۵ء سے ہر اسکول (MAINTAINED SCHOOL) میں فیس نہیں لی جائے گی۔

(۵) ہر مقامی تعلیمی حکومت کو ایک اچھے چیف افسر تعلیم (CHIEF EDUCATION OFFICER) کی تقرری کا حق ہوگا۔

صحت اور رفاہی خدمات

(۱) کھیل

عام طور پر مدرسوں میں کھیل کا انتظام نہیں ہوتا لیکن اس قانون کے مطابق اب ہر مقامی تعلیمی جماعت کا فرض کھیلوں کا اہتمام کرنا ہوگا۔ اس کے مختلف پہلو ہو سکتے ہیں۔ مثلاً: اسکول کیمپ، کھیل کے میدان تیراکی کا تالاب اور ورزش گاہ۔ اس طرح طلبہ میں کھیل سے رغبت پیدا ہو جائے گی۔ جو ان کی ذہنی اور جسمانی نشو و نما میں مد ثابت ہوگی۔

(۲) صحت

بیورج رپورٹ کی اشاعت کے بعد اسکول میڈیکل سروس کو عمومی میڈیکل سروس کا ایک حصہ بنا دیا گیا جو طلبہ کی جسمانی صحت کی نگرانی کرتی ہے۔ انگلستان میں میڈیکل سروس مفت ہے۔ بیمار کو دواؤں کے لیے ایک معمولی سی رقم ادا کرنی پڑتی ہے۔ مثلاً پہلے یہ تھا کہ اس نسخے پر دوا لینے والوں کو ایک شلنگ (دس آنے) قیمت ادا کرنی پڑتی تھی۔ قطع نظر اس سے کہ اس نسخے میں کتنی دوائیاں درج ہیں۔ لیکن اب یہ کر دیا گیا ہے کہ نسخے کی ہر دوا کے لیے ایک شلنگ ادا کرنی پڑتی ہے۔ اگر بیماری شدید ہوئی تو مریض کو شفاخانے بھیج دیا جاتا ہے۔ جہاں اسے دواؤں کی یہ معمولی قیمت بھی ادا نہیں کرنی پڑتی۔

طبی امداد کی اس تنظیم نے سے بچوں کو خاصہ فائدہ پہنچا اور قومی صحت کے تحفظ کا تقاضہ بھی یہی تھا کہ بچوں کی صحت کا شروع ہی سے خیال رکھا جائے۔

(۳) دودھ اور کھانا

قانونِ تعلیم مجریہ ۱۹۴۴ء کے مطابق ہر اسکول میں دودھ اور دوپہر کے کھانے کا انتظام لازمی ہے۔ ان دونوں سروسوں کے ارتقا کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ جنگ بویر سے قومی صحت کے تحفظ کا خیال پیدا ہوا، اور ۱۹۴۴ء کے قانون نے اسے موجودہ صورت میں متشکل کیا۔ اس وقت ہر اسکول میں تقریباً دس بجے نصف پائنٹ دودھ مہیا کیا جاتا ہے۔ یہ دودھ بوتلوں میں بند ہوتا ہے۔ تقسیم کرنے میں
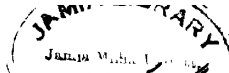
وقت نہیں ہوتی ۔ دودھ پی کر بچے بوتل کو اپنی جگہوں پر رکھ دیتے ہیں ۔
نصف چھٹی کے وقت اسکول کے حسب پروگرام کے مطابق ڈائننگ ہال میں کھانا کھانے کے لیے جمع ہو جاتے ہیں، بالعموم اس پروگرام میں بالالتزام چھوٹے بچوں کو پہلے اور بڑے بچوں کو بعد میں کھانا ملتا ہے۔ گھنٹی بجنے کے بعد طلبہ ڈائننگ ہال میں اپنی مخصوص نشستوں پر بیٹھ جاتے ہیں اور پھر ان میں سے دو طالب علم کھانا لاکر میز پر چن دیتے ہیں اور کھانا کھانے کے بعد برتن اٹھاکر میز صاف کر دیتے ہیں۔ کھانا لانے اور کھلانے کی یہ ڈیوٹی روزانہ بدلتی رہتی ہے۔ ایک میز پر بالعموم دس لڑکے ہوتے ہیں اور مدرس انچارج باری باری ہر گروہ کے ساتھ شریک طعام ہوتا رہتا ہے ایک کلاس میں چونکہ طلبہ کی مجموعی تعداد تیس کے لگ بھگ ہوتی ہے۔ اس طرح ایک مدرس ہفتے میں دو مرتبہ ایک گروہ کے ساتھ شریک ہو کر کھانا کھا لیتا ہے۔ لیکن اس کے باوصف ابھی بعض پرانے اسکول اس قسم کے ہیں جہاں نہ ڈائننگ ہال ہے نہ کھانے کا اور کوئی دوسرا معقول انتظام۔ ایسے مدارس میں کھانا کھلانے میں چند سینیر طلبہ مدد دیتے ہیں ۔
یہ کھانا جو بچوں کو دوپہر میں کھلایا جاتا ہے غذائیت کے اعتبار سے بہت ہی موزوں ہوتا ہے۔ اس سے نہ صرف یہ کہ دوپہر کے کھانے کا مسئلہ حل ہو گیا بلکہ اس سے بچوں میں آداب طعام اور مجلس میں گفتگو کرنے کا سلیقہ بھی پیدا ہو جاتا ہے ۔

اساتذہ کی تقرری اور برن ہم کمیٹی

اساتذہ کی تقرری کی ذمہ داری ناظم تعلیمات (DIRECTIR OF EDUCATION) کی ہوتی ہے اور وہ یہ فرض ابتدائً مقامی تعلیمی حکومت کے نمائندے کی حیثیت سے انجام دیتا ہے۔ چنانچہ مدرس کے معاہدہ پر مقامی تعلیمی حکومت کی طرف سے وہی دستخط کرتا ہے۔ رضاکارانہ اسکولوں میں اساتذہ کے انتخاب اور ان کی تقرری کی ذمہ داری مجلس منتظمین پر موقوف ہوتی ہے۔ لیکن اس صورت میں یہ ضروری ہے کہ ناظم تعلیمات اس تقرری پر اپنی مہر توثیق ثبت کرے ۔
اساتذہ کی تنخواہ کا مسئلہ اس صورت میں کہ ملک میں ایک نہیں بلکہ تین قسم کے مدرسے

موجود ہیں، اور بھی پیچیدہ ہو جاتا ہے۔ تنخواہوں کی شرح کیا ہو۔ کام کی نوعیت اور استاد کی اپنی تعلیمی حیثیت ہی اس شرح کو متعین کر سکتی ہے۔ اس کے لیے برن ہم کمیٹی کی تشکیل ہوئی۔ برن ہم کمیٹی این۔یو۔ ٹی (NATIONEL UNIAN OF TEACHRS) کے نمائندوں سے اس موضوع پر گفتگو کرتی ہے۔ اور بحث و تمحیص کے بعد تنخواہ کی شرح مقرر کر دیتی ہے۔ تقرری کے وقت وزارت معارف استاد کا درجہ مقرر کر دیتی ہے اور پھر وہ خواہ کہیں بھی ملازمت کرے اسے اسی شرح کے مطابق تنخواہ ملتی رہے گی۔

برطانیہ میں اساتذہ کی بنیادی تنخواہ ایک ہوتی ہے۔ موجودہ برن ہم اسکیل کے مطابق ہر استاد جو جی سی۔ای (GENERAL CERTIFICATE EDUCATION) کا امتحان دے کر کسی تومیتی ادارے میں تین سال کی ٹریننگ حاصل کرتا ہے تربیت کے بعد اسے ۵۲۵ پونڈ ملتے ہیں۔ سالانہ ترقی ۲۷½ پونڈ ہے۔ اس کے علاوہ ڈگری کی ذمہ داری اور اسی قسم کی دوسری چیزوں کے لیے علاحدہ علاحدہ رقمیں ملتی ہیں۔ تنخواہ کے سلسلے میں ابتدائی یا ثانوی مدارج میں گریمر یا سکنڈری ماڈرن کی کوئی تخصیص نہیں۔

مالیات

تعلیم کے اہتمام اور اسکولوں کے نظم و نسق کی تمام تر ذمہ داری مقامی تعلیمی حکومت کی ہوتی ہے۔ اس میں مرکزی حکومت کا کوئی دخل نہیں۔ مالی لحاظ سے بھی تعلیم کی یہ انتظامی کل مرکز کے تابع نہیں قطع نظر اس کے کہ مرکز کبھی کبھی ضرورت کے مطابق عمارتی منصوبوں کی تکمیل کے لیے گرانٹ دیتا رہتا ہے اس طرح تعلیم کی حکمت عملی کے علاوہ مقامی تعلیمی حکومتیں انتظامی اور مالی امور میں آزاد ہیں۔ یہ مقامی تعلیمی حکومتیں مقامی محصول لگا کر تعلیمی منصوبوں کی تکمیل کے لیے فنڈ مہیا کر سکتی ہیں۔

قانون تعلیم ۱۹۴۴ء کے مطابق تعلیم کی جو تنظیم نو ہوئی، اس سے تعلیمی مصارف اتنے زیادہ بڑھ گئے کہ بعض حالات میں مقامی تعلیمی حکومتوں کے لیے اتنی بڑی رقم مہیا کرنا مشکل ہو گیا۔ ایسی صورت میں انھیں مرکز کی طرف رجوع کرنا پڑا۔ اور مرکز ان کے خسارے کو پورا کرنے کے لیے وقتاً فوقتاً گرانٹ دیتا رہا۔ لیکن رفتہ رفتہ تعلیم کی توسیع کے ساتھ ساتھ قدرے مالدار مقامی حکومتوں کو بھی مرکزی امداد کی ضرورت پڑی۔ اور اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ کل اخراجات کا

۷۰ فی صد لاگت مرکزی حکومت پر ہے اور صرف چالیس فی صدی مقامی تعلیمی حکومتوں پر۔ اس کے علاوہ بھی ضرورت کے مطابق اور گرانٹ ملتی رہتی ہے۔ وزارت معارف ٹیکنیکل تعلیم کے ساز و سامان خریدنے کے لیے بھی امداد دیتی ہے۔

مرکزی حکومت جو گرانٹ مقامی تعلیمی حکومتوں کو دیتی ہے، اس کی تفصیل یہ ہے :

(۱) اصل زر امداد

(۲) اضافی زر امداد

(۳) دودھ اور خوراک کے لیے زر امداد

(۴) اساتذہ کے تربیتی اداروں کے لیے زر امداد

(۵) ہنگامی اساتذہ کی گرانٹ

اسکولوں کی قسمیں

مدارس کے قیام اور ان کے تاریخی ارتقا کے اس پس منظر میں اس امر کی وضاحت کی جا چکی ہے کہ برطانیہ میں اس وقت چار قسم کے مدرسے رائج ہیں۔ اول سکنڈری گرامر اسکول دوم سکنڈری ماڈرن اسکول اور سوم سکنڈری ٹیکنیکل اسکول۔ چہارم جامع مدارس۔

یہ تینوں ادارے اپنی نوعیت کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ سکنڈری گرامر اسکول برطانیہ کا روایتی مدرسہ ہے۔ جس میں تعلیم کی اساس خالصتًہ علمی ہوتی ہے۔ جو مضامین یہاں پڑھائے جاتے ہیں وہ علمی زیادہ اور عملی کم ہوتے ہیں۔ تعلیم کی تنظیم نو کے بعد بھی ان اداروں کی پرانی حیثیت قائم رہی اور اس وقت بھی ان مدارس میں ایسا نصاب رائج ہے جس کا تمام تر مقصد یونی ورسٹی میں داخل ہونے کی تیاری ہے۔ سکنڈری ماڈرن اسکول بنیادی طور پر پیشہ ورانہ اسکول ہیں۔ ان میں طلبہ کو علم کے مبادیات، لکھنے پڑھنے اور بولنے کے علاوہ ایسے کام سکھائے جاتے ہیں جو آگے چل کر اس کا پیشہ بن سکتے ہیں۔ بلکہ ان کے نصاب میں انھیں پیشہ ورانہ کاموں کو فوقیت حاصل ہے۔ ٹیکنیکل اسکولوں کو دراصل ٹیکنیکل کالجوں کا پیش رو کہا جا سکتا ہے یا

یوں سمجھیے کہ ٹیکنیکل تعلیم کی بلند و بالا عمارت کے لیے یہی اسکول بنیاد کا کام دیتے ہیں۔

تعلیم کے مروجہ نظام کے مطابق عمر کے لحاظ سے اداروں اور بچوں کی تقسیم حسب ذیل جدول سے واضح ہو جائے گی۔

مدارج تعلیم	قسم	داخل ہونے کی عمر	چھوڑنے کی عمر	تدریسی مدت
ابتدائی تعلیم	×	+۵	+۱۱	۶ سال
ثانوی تعلیم	سکنڈری گریمر	+۱۱	+۱۵	۴ سال
	سکنڈری ماڈرن	+۱۱	+۱۵	۴ سال
	سکنڈری ٹیکنیکل	+۱۲	+۱۵	۳ سال

ہیڈو کی یہ سفارش کہ ابتدائی تعلیم کی مدت ۵ سال کی عمر سے ۱۱ سال کی عمر تک متعین کر دی جائے قانون تعلیم مجریہ ۱۹۴۴ء میں من و عن شامل کی گئی اور اب برطانیہ کے سارے ابتدائی مدرسوں میں بچے پانچ سال کی عمر میں داخل ہوتے ہیں اور ۱۱ + تک پڑھتے رہتے ہیں۔ گیارہ پلس پر ایک عمومی امتحان ہوتا ہے۔ اس امتحان میں جو لڑکے علمی لحاظ سے بہتر ہوتے ہیں انھیں گریمر اسکول میں اور جو علمی لحاظ سے اتنے اچھے نہیں ہوتے انھیں سکنڈری ماڈرن اسکول میں بھیج دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد ۱۳ + کی عمر میں ایک اور انتخابی امتحان ہوتا ہے۔ جو بچے اس امتحان میں کامیاب ہو جاتے ہیں وہ سکنڈری ٹیکنیکل اسکول میں داخل ہو سکتے ہیں۔ ان تینوں اسکولوں میں ہر بچے کو جی۔سی۔ای (G.C.E) کا امتحان دینے کی اجازت ہوتی ہے۔

ان تینوں اداروں سے قطع نظر اس وقت برطانیہ میں ایک چوتھی قسم کا ادارہ منظر عام پر آرہا ہے اور اس آب و تاب کے ساتھ کہ پرانے اداروں کے چراغ بجھتے جاتے ہیں۔ یہ نیا ادارہ جامع مدرسہ (COMPREHENSIVE SCHOOL) کہلاتا ہے۔ جامع مدرسہ فی الحقیقت کوئی نیا ادارہ نہیں انتظامی لحاظ سے بھی اور تعلیم کے مندرجات کے لحاظ سے بھی۔ اس کی انفرادیت بھی اسی میں ہے کہ یہ برطانوی نظام کے تینوں دھاروں کو یکجا کر دیتا ہے۔ لیکن یہ سنگم عجیب قسم کا سنگم ہے۔ دو دریا

تینوں دریاؤں کا پانی باوجود ایک دوسرے سے ٹکر کھانے کے ایک نہیں ہوتا، بلکہ اس کے تینوں دھارے الگ الگ بہتے ہیں اور پہچانے جاتے ہیں۔

سکنڈری گریمر، سکنڈری ماڈرن اور سکنڈری ٹیکنیکل تینوں کے مجموعے کا نام جامع مدرسہ ہے اس میں یہ تینوں شاخیں ایک ہیڈ ماسٹر کی نگرانی میں کام کرتی ہیں، لیکن اس کے باوصف تینوں کی اپنی انفرادیت قائم رہتی ہے۔ اس سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ بعض اوقات آگے چل کر یہ محسوس کیا جاتا ہے کہ ۱۱+ کے امتحان میں جس طالب کو سکنڈری ماڈرن کے لیے انتخاب کیا گیا تھا درحقیقت وہ سکنڈری گریمر کے لائق تھا۔ عام حالات میں اس بچے کا ایک اسکول سے دوسرے اسکول میں منتقل ہونا بہت ہی دشوار ہوتا ہے۔ لیکن ایک ہی اسکول میں ایک شعبے سے دوسرے شعبے میں منتقل کر دینا اتنا ہی آسان ہے۔ انتظامی لحاظ سے تین ہیڈ ماسٹروں کی بجائے صرف ایک ہیڈ ماسٹر دو ہزار طلبہ کی نگرانی کے لیے کافی ہوتا ہے۔ اس سے اخراجات میں بھی بچت ہوتی ہے۔

برطانیہ کے جامع مدارس، امریکی جامع مدارس سے مختلف ہیں۔ امریکہ میں ایک ہی مدرسے میں مختلف قسم کے کورس کا اہتمام ہوتا ہے۔ اور طالب علم کو کورس اور پیشے کے انتخاب کی اجازت ہوتی ہے۔ اس کے برعکس برطانیہ میں طالب علم کو اپنے مخصوص حلقے میں تو اس کے انتخاب کی اجازت ہوتی ہے لیکن ۱۱+ کے امتحان کے بعد جو طالب علم سکنڈری ماڈرن کے لیے منتخب ہو اسے گریمر اسکول کا کورس لینے کی اجازت نہیں۔ اس طرح امریکی مدارس کا مزاج نسبتاً زیادہ جمہوری ہے گیارہ سال کی عمر میں بچے کے پیشے کی تعیین نفسیاتی لحاظ سے غلط ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ اس عمر میں بچہ اپنے تمام تر رجحانات کا اظہار کر سکے۔ بعض بچے ذہنی لحاظ سے جلد ترقی کر لیتے ہیں اور بعض اس درجے تک پہنچنے میں قدرے دیر لگاتے ہیں۔ اب یہ کہنا کہ موخر الذکر بچہ اس لیے قابلِ گردن زدنی ہے کہ وہ اپنے دوسرے ساتھی کی نسبت سست رفتار ہے، درست نہیں۔ ممکن ہے آگے چل کر اول الذکر بچہ اتنی سلامت روی سے نہ چل سکے۔ حال ہی میں خود برطانیہ کے بعض حلقوں میں ۱۱+ کے امتحان کے خلاف آوازیں اٹھائی گئیں حتیٰ کہ لیسٹر کاؤنٹی کونسل نے یہ امتحان ہی

ختم کر دیا۔ گیارہ سال کی عمر میں بچوں کو جامع مدرسے میں بھیج دیا جاتا ہے۔ اور تیرہ سال کی عمر میں ان کے رجحانات اور طبعی میلانات کے مطابق انھیں پیشے اور مضامین کے انتخاب میں مدد دی جاتی ہے۔ یہ طریقہ بہرصورت پہلے طریقے سے بہتر ہے۔ ان میں غلطی کے امکانات پہلے کی نسبت بہت ہی کم ہیں۔

نصاب تعلیم

نصاب تعلیم کے سلسلے میں برطانوی مدارس کو مکمل آزادی حاصل ہے۔ ہیڈ ماسٹر اور متعلقہ اساتذہ مل کر طلبہ کے فطری تقاضے اور مقامی حالات کے پیش نظر نصاب مقرر کر دیتے ہیں۔ اس میں مقامی تعلیمی حکومت یا وزارت معارف کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اگر ہیڈ ماسٹر چاہے تو علاقے کے ایچ۔ ایم آئی سے اس سلسلے میں مشورہ لے سکتا ہے۔ لیکن ضروری نہیں کہ وہ اس کے مشورے کو تسلیم کرے۔

ابتدائی مدرسہ

ابتدائی مدارس میں نصاب سازی کا سب سے اہم اصول یہ ہے کہ طلبہ کے لیے اس قسم کا ماحول اور ایسی کتابیں مہیا کی جائیں جن کی مدد سے انھیں گروہی زندگی بسر کرنے کا سلیقہ آجائے۔ وہ دوسروں کے ساتھ اس قسم کی ہم آہنگی پیدا کر سکیں کہ آپس میں زیادہ سے زیادہ مفاہمت ہو سکے اس کے بعد انھیں لکھنا پڑھنا اور ابتدائی حساب سکھایا جائے۔

ابتدائی مدارس کا نصاب یہ ہے۔

(۱) لکھنا پڑھنا اور ابتدائی حساب۔

(۲) تاریخ اور جغرافیہ

(۳) دینی تعلیم

(۴) جسمانی تعلیم

(۵) دست کاری۔ مثلاً بچوں کے لیے جلد سازی اور بچیوں کے لیے سوزن کاری وغیرہ

(۶) منظم کھیل

ثانوی مدارس

(۱) گرامر اسکول

گرامر اسکول کا نصاب بالعموم یونیورسٹی کی ضروریات کے مطابق ہوتا ہے۔ اس میں آرٹس اور سائنس کے جملہ مضامین شامل ہیں۔ گرامر اسکول میں زیادہ تر جی سی ای کے مقررہ نصاب کی پیروی کی جاتی ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے۔

(۱) زبانیں (قدیم وجدید)
(۲) تاریخ
(۳) جغرافیہ
(۴) سیاسیات
(۵) عمرانیات
(۶) معاشیات
(۷) طبیعات
(۸) کیمیا
(۹) نباتیات
(۱۰) حیوانیات
(۱۱) ریاضی

جی سی ای کے امتحان کے تین مدارج ہیں۔

(۱) معمولی معیار
(۲) اعلیٰ معیار
(۳) وظیفے کا معیار

یونی ورسٹی میں داخلہ لینے کے لیے ایک طالب علم کو چھ مضامین میں کام یاب ہونا ضروری ہے۔ ان میں سے کم از کم دو مضمون اعلیٰ معیار کے ہوں۔ گرامر اسکول میں طلبہ کی تعداد کل ۱۵ فی صد ہوتی ہے۔

(۲) سکنڈری ماڈرن اسکول

ان اسکولوں میں تعلیم کی اساس پیشہ ورانہ تربیت ہے۔ اس لیے اس کے نصاب میں ایسے مضامین شامل ہیں جو آگے چل کر طالب علموں کو پیشے کے انتخاب اور اس میں ایک خاص قسم

مہارت پیدا کرنے میں مدد دے سکیں۔
نصاب کی تفصیل یہ ہے۔
(۱) انگریزی اور سماجی علوم
(۲) نجاری (لکڑی کا کام
(۳) دھات کا کام
(۴) معماری
(۵) خشت سازی
(۶) صنعتی دست کاری
سکنڈری ماڈرن اسکولوں میں طلبہ کی تعداد کل تعداد کا ۷۰ فی صدی ہوتی ہے۔

ٹیکنیکل اسکول

ٹیکنیکل اسکول فی الحقیقت ٹیکنیکل کالجوں کا ابتدائیہ ہے اس لیے اس میں بالعموم ایسے مضامین کی تدریس اور ایسی تربیت کا اہتمام کیا جاتا ہے جو آگے چل کر مفید ہو سکے۔ مضامین کی تفصیل یہ ہے۔
(۱) انگریزی اور سماجی علوم
(۲) سائنس اور ریاضی
(۳) کامرس۔ معاشیات
(۴) تجارتی نظم ونسق وغیرہ

نئے نئے تجربے

برطانوی نظامِ تعلیم میں اتنی لچک ہے کہ وقت کے بدلتے ہوئے افکار و خیالات کا ساتھ دے سکے۔ یہ نہیں کہ ایک بنا بنایا نظام ہے جس میں وقت کے بدلتے ہوئے رجحانات کی کوئی گنجائش نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں آئے دن نئے نئے تجربے ہوتے رہتے ہیں، یہ ضروری نہیں کہ گریمر اسکول کا جو نصاب

آج ہے وہی کل بھی رہے گا۔ ممکن ہے اس میں ایسی بنیادی تبدیلیاں پیدا کر دی جائیں کہ گریمر اسکول روائتی گریمر اسکول نہ رہ جائے۔ یا اسے کسی اور قسم کے مدرسے میں اس طرح مدغم کیا جائے کہ اس کے اپنے خدوخال پہچانے نہ جا سکیں۔ اس قسم کے تجربے کسی جامد نظام تعلیم میں ممکن نہیں۔ اس کے لیے وہی فضا سازگار ہو سکتی ہے جو نئے نئے خیالات سے نامانوس نہ ہو اور جسے نئی نئی باتیں اجنبی نہ معلوم ہوتی ہوں تجربے میں کیا نقصان۔ ایک نئی بات کا تجربہ کر لیا جائے۔ اگر مزاج کے موافق اترتی ہے تو اس کے اختیار کرنے میں کیا مضائقہ۔

انگریز فطرتاً تجربہ شعار ہے۔ تجربہ کرنے میں اسے لطف آتا ہے۔ اور اس تجربے میں اکثر اسے ایسے نتائج تک پہنچنے میں امداد ملتی ہے۔ جن کی بدولت وہ ایک نظام نو کی طرح ڈالنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ قانون تعلیم مجریہ ۱۹۴۴ء کے بعد جو تجربے کیے گئے ان میں جامع مدارس کو فوقیت حاصل ہے۔ چناں چہ لندن کاؤنٹی کونسل نے اپنے جملہ مدرسوں کو جامع مدارس میں تبدیل کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے اس وقت تین قسم کے تجربے ہو رہے ہیں۔

(۱) گریمر اور سکنڈری ماڈرن

(۲) گریمر اور ٹیکنیکل

(۳) ٹیکنیکل اور ماڈرن

اس قسم کے تجربوں کی ایک وجہ تو تجربے کی خواہش ہے جو تجربہ کرنے پر اکساتی رہتی ہے اس کی دوسری وجہ یہ ہے کہ ایک بات کو قطعی اور حتمی تسلیم کر لینا تعلیمی ترقی کو مسدود کر دینا ہے۔ تجربہ ہو تو نئی نئی راہیں کھلتی ہیں۔

لیسٹر کے تجربے کی تفصیل اوپر آ چکی ہے۔ اس قسم کا ایک تجربہ ہیٹ فیلڈ میں بھی ہو رہا ہے اس اسکول میں گریمر اور ٹیکنیکل شاخوں کو مدغم کر دیا گیا ہے۔ گیارہ سال کی عمر میں جو طلبہ داخل ہوئے انھیں دو سال تک عمومی تعلیم دی گئی۔ اس کے بعد طلبہ اور طالبات کو اپنے مستقبل کے انتخاب کا مجاز قرار دیا گیا۔ اس انتخاب میں اساتذہ نے بھی ان کی امداد کی۔ اور یہ محض اس لیے کہ کم از کم

دو سال تک انھیں ایک دوسرے کے دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملے

میرے دوست مسٹر ہرڈ اس اسکول میں مدرس ہیں۔ ان کی وساطت سے مجھے اس اسکول میں دو مرتبہ جانے کا موقع ملا۔ اس اسکول کے ہیڈ ماسٹر ڈاکٹر ہٹن زندہ دل، وسیع النظر اور با عمل انسان ہیں۔ پچھلے دنوں انھوں نے نصاب تعلیم میں تبدیلی لانے کے سلسلے میں یہ تجویز پیش کی ہے کہ اب ہمیں اپنی تجارتی ضروریات کے پیش نظر اسکولوں میں عربی بھی پڑھانی چاہیے۔

تعلیم مزید

کم و بیش سولہ برس کی عمر تک تعلیم لازمی اور مفت ہے۔ لازمی تعلیم کی مدت ختم ہونے پر ضروری نہیں کہ طالب علم کسی امتحان میں شریک ہو۔ طلبہ کی بہت بڑی اکثریت یونیورسٹیوں میں داخل ہونے کی بجائے کارخانوں میں ملازمت کر لیتی ہے۔ اس کے بعد انھیں تعلیم حاصل کرنے کا بہت کم موقع ملتا ہے اس اکثریت کی عمومی تعلیم کو جاری رکھنے کے لیے مقامی تعلیمی حکومتیں تعلیم مزید کا اہتمام کرتی ہیں۔ تعلیم مزید کی مختلف صورتوں کی تفصیل یہ ہے۔

(ا) کاؤنٹی کالج

لازمی تعلیم ختم کرنے کے بعد طلبہ کارخانوں اور دوسرے تجارتی اور صنعتی اداروں میں ملازمت اختیار کر لیتے ہیں۔ لیکن اس عمومی تعلیم سے بالکل غیر متعلق ہو جانا موزوں نہیں سمجھا گیا۔ اس لیے لازمی طور پر انھیں کام کے ایام میں اٹھارہ سال کی عمر تک تعلیم مزید کے لیے کچھ وقت صرف کرنا ضروری قرار دیا گیا۔ انھیں چوالیس ہفتوں میں فی ہفتہ یومیہ یا دو نصف یومیہ کاؤنٹی کالج میں جانا لازمی ہے۔ اس ادارے کے تعلیم کے مندرجات یہ ہیں۔

اس قسم کی جسمانی، عملی اور پیشہ ورانہ تعلیم دینا کہ جس کی بدولت پڑھنے والوں میں ایسے خواص پیدا ہو جائیں جو انھیں ایک ذمہ دار شہری بنانے میں ان کی امداد کریں۔

(ب) دوسرے کورس

لازمی تعلیم کے بعد جو طلبہ ٹیکنیکل تجارتی یا آرٹس کی مزید تعلیم کے خواہاں ہوں انھیں کاؤنٹی کالج

کی حاضری سے مستثنیٰ کر دیا جاتا ہے۔ انھیں اٹھارہ سال تک مزید تعلیم حاصل کرنے کی اجازت ہوگی۔

(ج) تعلیم بالغان

برطانیہ میں تعلیم بالغان کا تصور قدرے مختلف ہے۔ ہمارے ملک میں اس سے یہ مراد لی جاتی ہے کہ ان پڑھ اور جاہل لوگوں کو تعلیم کے مبادیات سے روشناس کیا جائے۔ یعنی یہ کہ انھیں لکھنا پڑھنا آجائے اور بس۔ برطانیہ میں اس کے برعکس تعلیم بالغان سے مراد ایسی تعلیم ہے جو فرصت کے اوقات بسر کرنے کا مفید ترین وسیلہ بن جائے۔ اس میں صنعت و حرفت کی تعلیم، زراعتی تعلیم، تفریحی مشاغل شامل کیے جا سکتے ہیں۔ تعلیم بالغان کا مقصد لوگوں کے ذہنوں کو اور متنوع بنانا ہے تاکہ جو کچھ انھوں نے اب تک حاصل کیا ہے اس میں زنگ نہ لگ جائے۔ بلکہ اس پر صیقل ہوتی رہے۔ اور لوگوں کو مل کر مختلف موضوعات پر تبادلہ خیالات اور مباحث کا موقع ملے۔ اس سے ان کی زندگی میں ایک لابدی تنوع پیدا ہو جائے گا۔

برطانوی نظام کے اس مختصر سے خاکے میں اس کے اچھے اور برے پہلو کا جائزہ لینے کی کوشش کی گئی۔ اچھی بات اچھی ہوتی ہے اور بری بات بری۔ اس وقت انگریز ہمارا حاکم نہیں اور ہماری تعلیمی حکمت عملی اس کی سیاسی حکمت عملی کے تابع نہیں۔ ہم آزادی سے اس کے حسن و قبح کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ اس کی اچھائیوں کو مستعار لینا اور اس کی برائیوں سے بچنا ہماری قومی ترقی کے لیے ضروری ہے اس کے نظام تعلیم کے مطالعے سے جو سب سے بڑا سبق ملتا ہے وہ اس کا ذوق تجربہ ہے۔ وہ ہر باغ میں پھرتا ہے ہر کلی کی مسکراہٹ سے متاثر ہوتا۔ ہر پھول کو سونگھتا ہے اور جو اسے پسند آتا ہے اسے اپنی قبا میں ٹانک لیتا ہے۔ قطع نظر اس سے کہ یہ سوئٹزرلینڈ کا غیر مرکزی نظام ہے یا ہندوستان کا مانٹیوریل سسٹم یا امریکہ کا جامع یا کثیر الفروع مدرسہ۔

ہم آج قومی تعمیر و ترقی کے عبوری دور سے گذر رہے ہیں۔ ہمیں انگریزوں سے زیادہ تیز گام اور محتاط ہونا چاہیے کہ اسی پر ہماری ملی بقا کا استحکام ہے ؎

تدریسِ سائنس

محمد حسین

سائنس کیا ہے ؟

ہم روزمرہ زندگی میں اپنے اردگرد ہزاروں قسم کے تغیرات رونما ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ یہ کائنات ہمیشہ سے تغیر پذیر رہی ہے اور رہے گی سطحی نظروں سے ہٹ کر اگر عمیق نظروں سے مشاہدہ کیا جائے تو قدرت کے بے پناہ سربستہ سربستہ راز روشن حقیقت بن کر آنکھوں کو خیرہ کردیں۔

اگر تھوڑی سی بھی سوچنے سمجھنے اور غوروفکر کرنے کی عادت ڈال لی جائے تو بہت سی باتیں مظاہرات قدرت اور کائنات کے حیران کن اصولوں کا انکشاف ہو سکتا ہے۔ سال بھر کے موسم پہ نگاہ ڈالیں۔ کبھی گرم لوئیں چلتی ہیں تو کبھی کڑاکے کی سردی ہوتی ہے۔ دانت بجنے لگتے ہیں۔ آگ پیاری معلوم ہوتی ہے۔ لیکن گرمیوں میں یہی آگ دوزخ کا نمونہ پیش کرتی ہے خزاں میں درخت بے برگ ہو جاتے ہیں۔ پتے جھڑ کر ہوا میں اڑتے پھرتے ہیں۔ خزاں کا نوحہ پڑھتے ہیں۔ بہار آتی ہے۔ نئی کونپلیں پھوٹتی ہیں۔ باغوں میں پھولوں کے تختے بچھ جاتے ہیں تتلیاں ان پر لہراتی ہیں کبھی اس کونپل پر بیٹھ کبھی اس پھول پر جا۔

سورج نکلتا ہے، اپنی سنہری اور روپہلی کرنیں اطراف عالم میں بکھیر کر رات سے دن بناتا ہے۔ بادلوں پر ایک رنگ چڑھتا ہے اور ایک رنگ اترتا ہے۔ بادل روئی کے سفید۔ جامنی جیسی آسمانی۔ بلورین اور نرگسی گالوں کے مانند ہوا کے دوش پر محو خرام ہوتے ہیں۔ یہی وہ بادل ہیں جو دور سمندروں سے بنی نوع انسان کی کھیتیوں کے لیے پانی بھر کر لاتے ہیں۔ بارش ہوتی ہے۔ بجلی چمکتی ہے، رعد کڑکتی ہے۔ کائنات کی گہرائیوں سے واقف ہونے والے کی چشم بینا وا ہوتی ہے۔ جبکہ سہل انگار و توہم پرست آنکھیں بند کیے اور کانوں میں انگلی دیے کہیں تاریکی میں چھپا

ہوتا ہے۔ رات کی تاریکی میں ستاروں کا جھلملانا، تاروں کا ٹوٹنا، کہکشاں کا بننا، چاند کا گھٹنا اور بڑھنا گرہن کا واقع ہونا، آدمی کی توجہ کو اپنی طرف منعطف کرانے کے لیے کافی ہے۔ کائنات ایک قافلہ ہے۔ جس کا ہر رکن اجتماعیت اور انفرادیت کے مضبوط بندھن میں جکڑا ہوا، اپنے اپنے کام میں مشغول ہے۔ چناں چہ ماحول کو سمجھنا اور اس سے استفادہ حاصل کرنے کا نام ہی سائنس ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ آسمان کی طرف پھینکی جانے والی تمام اشیا واپس زمین کی طرف ہی آتی ہیں۔ اس سے اخذ کیا جاسکتا ہے کہ زمین تمام چیزوں کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ کلیہ تجاذب کشش ثقل، مرکز ثقل وغیرہ سمجھنا پھر بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ قوت مشاہدہ اپنے اردگرد کی چیزوں اور مختلف عملوں کو سمجھنے میں خضر راہ کا کام دیتی ہے۔ قوت مشاہدہ کی پختگی انتہائی لازم ہے۔ تب ہی ہم قدرت کے سربستہ رازوں سے پردہ اخفا اٹھانے میں کامیاب ہو سکیں گے۔

سائنس کی اہمیت

آج شاید ہی کوئی ذی ہوش ہو جو سائنس کی اہمیت سے انکار کرے۔ دنیا ایٹمی دور سے گزر کر خلاؤں میں جھانک رہی ہے۔ ایک طرف امریکہ اپنے دینگارڈ، ایکسپلورر، اٹلس جیسے مصنوعی سیاروں کی بدولت چاند پر کمند ڈالنے کی فکر میں ہے تو روس بھی اس دوڑ میں اس سے پیچھے نہیں روس کا مصنوعی سیارہ اسپتنک نمبر ۲ سورج سے بھی آگے نکل چکا ہے۔ اور خلائی شٹیشن کی تعمیر کے لیے پرواز معلومات نشریات مہیا کر رہا ہے۔ تاکہ روس اپنے حریف سے پہلے مریخ اور دوسرے سیاروں پر قبضہ کر سکے۔ فضائے بسیط کو خوب کھنگالا جا رہا ہے۔ اور آئے دن کوئی نہ کوئی راکٹ کا تجربہ دہرایا جا رہا ہے۔

قطع نظر اس ترقی کے انسان کے لیے سائنس کا مطالعہ از بس ضروری ہے۔ اس کے مطالعے سے انسان نہ صرف اپنی زندگی آرام و آسائش سے گزار سکتا ہے، بلکہ اپنی تحقیقات سے قدرت کے رازہائے سربستہ کو بھی بے نقاب کر سکتا ہے۔ جن قوموں نے بھی سائنس سے غفلت برتی وہ آج تہذیب و تمدن میں پست نظر آتی ہیں۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کہ مسلمانوں نے اپنے عروج کے وقت سائنس کا احیاء کیا۔ سائنس میں خوب ترقی کی۔ ابن الہیثم، رومی، الرازی، بوعلی سینا اور فارابی جیسے کیمیادان۔ ہئیت دان، طبیب اور ریاضی دان پیدا کیے جنھیں تاریخ آج تک فراموش نہیں کر سکی۔ بلکہ قدیم ایران و عرب کے سائنس دانوں نے صرف مشرق پر ہی احسان نہیں کیا، بلکہ مغرب بھی صدیوں تک ان کا مرہون منت رہا۔

لیکن مستقبل پر شاندار ماضی کی دلالت کرنا کیا اس گیدڑ کی بوم سے مشابہ نہیں جس کا تکیہ کلام تھا "پدرم سلطان بود"۔ ہمیں اب اس پدرم سلطان بود کی بھول بھلیوں سے باہر نکل آنا چاہیے۔ اور اپنے آپ کو حقیقت کے آئینے میں دیکھیں کہ ہم کیا ہیں۔ بین الاقوامی صفوں میں ہماری پوزیشن کیا ہے۔ اٹیمی ری ایکٹر۔ اٹیمی بجلی گھر بنانا اور مصنوعی سیارے چھوڑنا صرف امریکہ اور روس کا ہی حصہ نہیں ہے سائنس میں اس قدر پیچھے رہنا ہماری پست ہمتی کی نشانی ہے۔ اور ہم غور و فکر کو خیرباد کہہ چکے ہیں جب قرآن حکیم کتنے ہی مواقع پر واضح اور صاف الفاظ میں ہماری توجہ اور فکر کو دعوت دے چکا ہے لیکن ہم اس الہامی آواز پر لبیک نہیں کہتے۔ قرآن حکیم کی چند آیات ملاحظہ ہوں۔

اَوَلَمْ یَنْظُرُوْا فِیْ مَلَکُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا خَلَقَ اللّٰہُ مِنْ شَیْءٍ وَّ اَنْ عَسٰی اَنْ یَّکُوْنَ قَدِ اقْتَرَبَ اَجَلُھُمْ (اعراف ۱۸۵)

ترجمہ:- کیا یہ لوگ آسمان و زمین کی تخلیق وغیرہ پر غور نہیں کرتے؟ معلوم ہوتا ہے کہ ان کی مدت قریب آگئی ہے۔

ھوالذی خلق لکم ما فی الارض جمیعاً (بقرہ ۲۹)

ترجمہ: تمام کائنات و خزائن ارضی تمہارے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔

انّ فی خلق السمٰوٰتِ والارض واختلاف الّیل والنھار والفلک الّتی تجری فی البحر بما ینفع الناس وما انزل اللہ من السّماءِ من مّاءٍ فاحیا بہ الارض بعد موتھا وبثّ فیھا من کلّ دابۃٍ وّ تصریف الرّیٰح والسّحاب المسخّر بین السماءِ والارض لاٰیاتٍ لقومٍ

يَعقِلُونَ (بقرہ ۱۶۴)

ترجمہ: زمین و آسمان کی تخلیق۔ رات دن کے اختلاف۔ سطح سمندر پر تیرنے والے مفید جہاز۔ اور مُردہ زمین کی نس نس میں زندگی بھرنے والی بارشوں۔ پھر پھر کر چلنے والی ہواؤں اور ان بادلوں میں جو زمین اور آسمان کے درمیان چھا جاتے ہیں اہل دانش کے لیے کچھ اسباق موجود ہیں۔

وانزلنا الحدید فیہ باسٌ شدیدٌ ومنافعُ للناس (حدید ۲۵)

ترجمہ: ہم نے فولاد پیدا کیا جو پُرہیبت اور نہایت مفید دھات ہے۔

اگر ہم اقوام عالم میں سرخرو ہونا چاہتے ہیں تو ہمارے اساتذہ اور ہمارے طلبہ کو چاہیے کہ وہ سائنس کی درس و تدریس میں پوری طرح منہمک ہو جائیں اور اس مضمون میں زیادہ سے زیادہ دلچسپی پیدا کریں۔

سائنس بطور لازمی مضمون

سائنس کی روز افزوں مقبولیت اور طلباء کے عام رجحان کے پیش نظر اس مضمون کو بڑی جماعتوں میں ایک لازمی مضمون کی حیثیت دے دینی چاہیے کیونکہ بڑی جماعتوں تک سائنس کے صرف مبادیات کی ہی تعلیم دی جاتی ہے، جن سے آگاہ ہونا ہر انسان کے لیے ضروری ہے تاکہ وہ اپنے اردگرد کے ماحول کو جان سکے۔

ملک کی اقتصادی ضرورت بھی اس بات کی متقاضی ہے کہ ملک کا بیشتر طبقہ مبادیات سائنس سے واقفیت رکھتا ہو۔ تاکہ صنعتی ترقی میں روز بروز بڑھتی ہوئی مانگ کو فنی تعلیم سے آراستہ امیدواروں سے پُر کیا جا سکے جس سے سائنسی ترقی ہو۔ نئے سکول خصوصی طور پر کھولے جائیں۔

سائنس کی تدریس کے طریقے

سائنس کی تدریس کے مختلف طریقے جو ابتدا سے آج تک استعمال میں لائے جاتے رہے ہیں درج ذیل ہیں:۔

(۱) کتابی طریقہ (۲) تقریری طریقہ (۳) مانٹیسوری طریقہ (۴) انکشافی طریقہ (۵) ڈالٹن پلین۔

(۶) استدلالی یا مظاہراتی طریقہ۔

۱۔ کتابی طریقہ (BOOK METHOD)

پہلے پہل جب سائنس کا رواج ہوا تو تقریری طریقے کے بعد کتابی طریقہ کو فروغ حاصل ہوا۔ طلبا کو سائنسی معلومات کتابوں سے پڑھ کر بہم پہنچائی جاتی تھیں اور طلبا سست سامع کی حیثیت رکھتے تھے اہل یورپ آج اس طریقہ کو قطعی طور پر خیرباد کہہ چکے ہیں لیکن ہمارے ہاں اکثر و بیشتر خصوصاً مڈل سکولوں میں سائنس کی تدریس کتاب پڑھ کر ہی کی جاتی ہے۔ اساتذہ ایک لڑکے کو جو کتاب اچھی طرح پڑھنا جانتا ہو کھڑا کر دیتے ہیں اور دوران سبق مشکل الفاظ کی تشریح بھی کرتے جاتے ہیں۔ اس طریقہ میں تختہ سیاہ کو قطعاً استعمال میں نہیں لایا جاتا۔ بلکہ کتاب ہی وہ محور ہے جس کے گرد ساری سائنس کی تدریس کو چکر لگوایا جاتا ہے۔ بچوں میں صرف کتاب پڑھنے سے کوئی دلچسپی پیدا نہیں ہوتی جب تک کہ وہ دوران سبق کے تمام تجربات کو خود اپنے ہاتھوں سے سرانجام نہ دے لیں اس طریقے میں بچوں کے فطری تجسس کا گلا گھونٹ دیا جاتا ہے ان کے ذہن محض معلومات عامہ اور اعداد و شمار کے بوجھ تلے دبے ہوئے ہوتے ہیں کیونکہ عام مطمع نظر کتابیں رٹا کر امتحان پاس کرانا آج کے ترقی یافتہ دور میں اس طریقے کے لیے ہمارے یہاں بھی کوئی گنجائش نہیں رہنی چاہیے لیکن اس سے ہم ایک اچھی درسی کتاب کی افادیت سے منکر بھی نہیں ہونا چاہتے۔ پھر بھی چند در چند اسباب ایسے ہیں کہ اکثر اوقات یہ طریقہ تدریس اپنانا ناگزیر ہو جاتا ہے۔ مثلاً بعض سکولوں میں سائنس کے معلم کی بجائے کوئی ایسا معلم تعینات کر دیا جاتا ہے جو سرے سے سائنس سے کوئی شغف نہیں رکھتا سامان سائنس کی کمی ہونا، موزوں معمل کا نہ ہونا وغیرہ اس طریقہ کے بنیادی سبب ہیں۔

۲۔ تقریری طریقہ (LECTURE METHOD)

یہ طریقہ طلبا کو سائنسی معلومات یا دیگر مضامین کی تدریس میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اس میں معلم بذریعہ تقریر طلباء کے ذہنوں پر معلومات انکشافات اور مشاہدات کی بارش کرتا ہے، قطع نظر اس کے آیا طلباء اسی تیز رفتاری سے مقرر کی پیروی بھی کر رہے ہیں یا نہیں جس برق رفتاری سے وہ تقریر

کررہا ہے کبھی کبھی لیکچر کو عام فہم بنانے کے لیے تختہ سیاہ سے بھی فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ اس میں کتاب سے کوئی سروکار نہیں رکھا جاتا۔ بلکہ مقرر جو کچھ بھی گھر سے رٹ کر یا ذہن نشین کرکے آتا ہے۔ اسے طلبا کے سامنے اگل دیتا ہے۔ اس میں کوئی ندرت نہیں ہوتی۔ تخلیقی قوتیں پامال ہو جاتی ہیں۔ طلبا بہ سست سامع کی حیثیت سے کوئی دلچسپی محسوس نہیں کرتے۔

لیکن اس حقیقت سے بھی روگردانی نہیں کی جاسکتی کہ یہی وہ طریقہ ہے جس سے جاہل قومیں بہ سرعت تمام تعلیم یافتہ اور ترقی یافتہ قوموں کی صف میں شامل ہوئیں (MASS EDUCATION) کے لیے یہ ایک نادر طریقہ ہے اور کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ نتائج نکالتا ہے۔ پسماندہ قومیں ابجد سے واقف ہونے کے لیے اپنا سکتی ہیں۔ وعظ، پند و نصائح کے لیے ایک مثالی طریقہ ہے۔ چنانچہ اسلام نے مسجدوں میں اسے رواج دیا اور یورپین قوموں نے مسلمانوں کی دیکھا دیکھی اس سے اپنی جہالت کے پردوں کو چاک کیا۔

کالجوں میں آج کل زیادہ تر تقریری طریقہ ہی مستعمل ہے۔ طلبا کی روز افزوں بڑھتی ہوئی تعداد کے پیش نظر ہم ابھی اس سے سبکدوش نہیں ہو سکتے۔ البتہ اس کے ساتھ دوسرے طریقوں کی آمیزش کرکے بہتر قالب میں ڈھال سکتے ہیں۔

۴۔ مانٹیسوری طریقہ (MONTOSSERY METHOD)

یہ طریقہ اٹلی کی مشہور و معروف خاتون ڈاکٹر میریا مانٹیسوری نے ایجاد کیا۔ آپ نے اپنی ساری زندگی بچوں کی تعلیم و تربیت اور تحقیق میں بسر کی۔ دراصل یہ طریقۂ تعلیم بذریعہ کھیل پر مبنی ہے۔ اس میں مختلف کھلونوں سے بچوں کو بڑے چھوٹے میں تمیز کرنا۔ رنگ، وزن، حجم و تناسب کی عملی تربیت بھی دی جاتی ہے۔

اس طریقے کا مقصد بچوں کو تعلیمی ماحول میسر کرنا ہے جس میں وہ اپنی تخلیقی قوتوں کو پروان چڑھا سکیں اور حواس کی بہتر تربیت ہو سکے۔

ذہنی طور پر پسماندہ بچوں کے لیے تو یہ طریقہ بہت ہی سودمند ثابت ہوا ہے، اگرچہ سا آ

اور دوسرے مضامین کی تدریس میں آگے جاکر یہ طریقہ معیار پر پورا نہیں اترتا، اس لیے صرف مبتدی بچے ہی اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں کیونکہ یہ طریقہ بہت ہی محدود اور پابندیوں سے لبریز ہے اس کے اپنے جن کھلونوں سے ہی کھیلنے کی اجازت ہے۔ اس لیے اس کا اطلاق صرف زیادہ بہتر صورت میں ان بچوں پر ہوتا ہے جو ذہنی طور پر پسماندہ ہوں یا پیچھے رہ گئے ہوں اور جو نظریاتی، مجرد استدلالی طریقوں سے سبق کے سمجھنے کی صلاحیت نہ رکھتے ہوں۔ تاہم چھوٹے بچوں میں سائنس کا ذوق پیدا کرنے کے لیے ہم یہ طریقہ بخوبی استعمال کر سکتے ہیں۔

۴۔ ڈالٹن پلین (DALTON PLAN)

یہ طریقہ تمام طریقوں سے مختلف ہے اور اسے امریکہ میں آزمایا گیا ہے۔ اس سے صرف سائنس کی ہی تدریس ممکن نہیں بلکہ دوسرے تحقیقی مضامین کی تدریس بھی ہو سکتی ہے۔ اس طریقہ میں طلباء کو ذمہ داری اور خود اعتمادی سے ہم آہنگ کیا جاتا ہے۔ ان کو تعلیمی تجربہ گاہوں میں کام بتایا جاتا ہے جس کو وہ قسطوں کی صورت میں جن کو حوالہ جات بھی کہتے ہیں، بغیر استاد کی مدد کے خود ہی پایۂ تکمیل تک پہنچاتے ہیں۔ تعلیمی تجربہ گاہوں میں ضرورت پر پیش آنے والے تمام سامان و کتب و رسائل چارٹس وغیرہ بہم پہنچائے جاتے ہیں۔ طلبا خوش گوار ماحول میں اپنا کام مکمل کر کے جب استاد سے نمبر لینے جاتے ہیں تو بہت خوش ہوتے ہیں۔ لیکن یہاں یہ احتمال بھی ہے کہ بعض کام چور قسم کے طلباء ہفتوں استاد کے پاس بھی نہیں پھٹکتے اور دوسروں کے کام سے مدد لے کر جعلی نمبر حاصل کر لیتے ہیں۔ اس پر طرہ یہ کہ یہ طریقہ بہت مہنگا پڑتا ہے۔ ہمارے ہاں ابھی اتنی گنجائش نہیں کہ ہر طالب کے لیے ایسا ماحول پیدا کر سکیں۔ البتہ تجربے کے طور پر چند ایک تعلیمی تجربہ گاہیں تیار کر لینی چاہئیں۔

۵۔ انکشافی طریقہ

یہ سائنس کا خاص الخاص طریقہ ہے اور کافی تحقیق کے بعد ریاضی جغرافیہ جیسے مضامین کی تدریس بھی اس سے کی جانے لگی ہے۔ لیکن ادب، زبان اور تاریخ کی تدریس کے لیے موزوں نہیں۔

اس طریقہ کا مقصد بچوں میں اپنے ماحول میں رہ کر مشاہدہ کر کے اور غور و فکر سے کچھ کائناتی اصول

اخذ کرنے کی رغبت دلائی جاتی ہے۔ سائنس کے بنیادی مقاصد کے حصول میں نہایت کامیاب طریقہ ہے
اس میں طلبہ خود ہی سائنس کے اصول اور حقائق کو مشاہدہ کے ذریعے تلاش کرتے ہیں اور چونکہ خود
معلوم کرتے ہیں اس لیے کافی مہارت بھی رکھتے ہیں۔ مثلاً طلبا جب دیکھتے ہیں کہ مائعات ہمیشہ
ڈھلان کی طرف ہی بہتے ہیں۔ تو واقعات و مشاہدات کی روشنی میں ان پر یہ حقیقت از خود روشن
ہوجاتی ہے کہ مائعات ہمیشہ اپنی سطح ہموار رکھنا چاہتے ہیں۔ یا جب طلبا، عام چیزوں کو اوپر سے
نیچے گرتے دیکھتے ہیں تو تھوڑی سی غور و فکر سے وہ یہ اصول معلوم کرلیتے ہیں کہ تمام چیزیں
ایک کشش کے تحت زمین کی طرف گرنے پر مجبور ہیں اور وہ قوت کشش ثقل ہے۔ اس مشاہدہ
سے طلبا، اس قسم کے دوسرے مسائل کلیہ تجاذب و کلیات نیوٹن وغیرہ بخوبی اخذ کرسکتے ہیں۔
یہ طریقہ تقریری طریقے سے اور کتابوں سے حاصل کردہ معلومات کی سخت مخالفت کرتا ہے
بلکہ اس پر اہمیت دیتا ہے کہ تمام سائنسی اصول اور حقائق از خود اخذ کیے جائیں۔ ہمارے ہاں وہ
ماحول ابھی میسر نہیں جو اس طریقے کی اہمیت کے پیش نظر ضروری ہے۔ پھر اس سے طلبا، میں
تعلیمی رفتار بہت ماند پڑ جاتی ہے۔ سننے سنانے یا کتاب سے پڑھنے کی بھی مخالفت کرتا ہے
اس لیے دوسرے طریقوں کے ساتھ ہم آہنگی پیدا کرکے پھر ہی ہم اس کو قابل ذریعہ تدریس
بناسکتے ہیں۔

۴۔ مظاہراتی طریقہ

دوران تدریس سائنسی تجربے سرانجام دینا مظاہراتی طریقہ کہلاتا ہے۔ اسباق کو زیادہ عام فہم
زود اثر اور موثر بنانے کے لیے معلم تجربہ کا خود مظاہرہ کرتا ہے۔ یہ اس لیے اگر طلبا، خود تجربے
کریں تو وقت بہت زیادہ درکار ہو۔ طلبا تجربہ سے ناواقف ہوتے ہیں، اس لیے غلط تجربہ کریں گے
اور سامان کا صحیح استعمال نہ جاننے کی وجہ سے اکثر سامان ٹوٹنے کا خطرہ ہے۔ معلم کے مظاہرہ
کرنے سے طلبا قوت مشاہدہ سے سائنسی حقیقتیں اور اصول دریافت کرنا سیکھیں۔ قوت مشاہدہ
تیز ہوگی۔ دلچسپی بڑھے گی۔ مثلاً آکسیجن کی تیاری کے سبق کے دوران خاصیتیں معلوم کرنا ہیں

معلم آکسیجن گیس کے چند جار بھر کر طلبا، سے ہی مشاہدے کے بعد نتیجہ اخذ کرائے گا۔ معلم ہر طالب علم کو گیس سے بھرا ہوا جار دکھائے گا اور اس کا رنگ پوچھے گا۔ طلبا، اپنے مشاہدے کی بنا پر جواب دیں گے کہ اس گیس کا کوئی رنگ نہیں اور نتیجہ نکالیں گے

اس طریقہ سے معلم کو یہ بڑی سہولت ہوتی ہے کہ جو تجربہ طلبا، کو عملی طور پر کرنا ہوتا ہے سبق کے دوران معلم انھیں پہلے ہی کرکے دکھا چکا ہوتا ہے۔ اس طرح وہ زیادہ مؤثر طور پر کامیاب تجربہ کر سکتے ہیں۔

نئے مجوزہ طریقے

سائنس کی برق رفتار ترقی کے پیش نظر ہمیں بھی اپنے تدریسی طریقوں پر نظر ثانی کرنی چاہیے تاکہ ہم سائنسی ترقی کا ساتھ دے سکیں۔ اور سکولوں میں سائنس کی تعلیم کو ایک نئے سانچے میں ڈھالیں جو عہد حاضر کی تمام ضرورتوں کو پورا کر سکے۔

مندرجہ بالا تحریر کردہ کوئی ایک طریقہ بھی آج کی بڑھتی ہوئی سائنسی ترقی کا ساتھ نہیں دے رہا۔ ہمیں نئے طریقوں کی آزمائش کرنی چاہیے۔ گھسے پٹے سامان و کتب کی بجائے نیا سامان ایجاد کرنا چاہیے۔ مثالی نصاب جاکر نئی درسی کتابیں مرتب کریں۔ جو معمولی روزمرہ عملوں کے علاوہ ایٹمی بھٹی کی بناوٹ، تابکاری وغیرہ کے مبادیات پر بحث کرے۔ اسی طرح علم کیمیا بھی اپنی وسعت میں بڑھ چڑھ کر کہیں سے کہیں جا پہنچا ہے۔ پس بنیادی مقاصد کی تحصیل کے لیے نئے ساز و سامان اور نئی کتابوں کی اشد ضرورت ہے۔ ریڈیو، فلم، ٹیلی وژن، سائنس کی نشر و اشاعت میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ ان سے اور دیگر آلات سمعی و بصری کو تعلیمی افادیت کے لیے کام میں لانا چاہیے۔ معلموں کی ہدایت کے لیے مختلف رسائل اور تعلیمی کلاسوں میں نئے تجربے کرکے دکھانے کے لیے بہت سے آلات بنانے چاہئیں۔ یہ سب سامان بہ آسانی فراہم ہونے والے عام سامان سے تیار ہوں اور ان کی قیمت زیادہ نہ ہو تاکہ طلبا انھیں خود بھی آسانی کے ساتھ تیار کر سکیں۔

طلبا، میں زیادہ ذوق پیدا کرنے کے لیے ان کا اپنا گھریلو معمل بنانے میں سہولت دینے کی

غلط زیادہ آسان اور سستا سامان پیدا کرنے کی اشد ضرورت ہی نہیں، بلکہ عصر حاضر کا ایک سائنسی تقاضا ہے جس سے ہمیں عہدہ برآ ہونا چاہیے۔ تاکہ بچوں کی تخلیقی قوتوں کی نشوونما ہو سکے، اور ہمارے ہاں بھی نیوٹن، رودرفرڈ، ڈیوی، ایڈیسن جیسی اہم شخصیتیں جنم لے سکیں۔ نئے سامان کے ساتھ ہمیں موجودہ تدریسی نقائص کی بھی چھان بین کرنی چاہیے جو ایک مؤثر تدریس کی راہ میں حائل ہیں۔

تدریس سائنس میں عام نقائص

(۱) سائنس کا بطور اردو کتاب پڑھنا:- یہ عموماً دیکھا گیا ہے کہ بعض اساتذہ خصوصاً مڈل کلاسز میں اسی پرانے اور فرسودہ طریقے پر کاربند ہوتے ہیں۔ بچوں میں سبق سے متعلق کوئی دلچسپی پیدا نہیں کی جاتی۔ بلکہ سائنس کی درسی کتب کے کچھ صفحات پڑھا لیے جاتے ہیں، اور پھر انہیں زبانی رٹوا دیا جاتا ہے تاکہ امتحانی کامیابی نصیب ہو۔ اس طرح طلبا کی سوچ بچار، غور و فکر کو زنگ لگ جاتا ہے اور سوچنے کی ساری صلاحیتیں اس پڑھنے کی نذر ہو جاتی ہیں جو کچھ استاد نے پڑھا دیا۔ اس پر کوئی سوال وغیرہ نہیں پوچھا جاتا، اور طلبا میں جو سائنسی میلان قدرت کی طرف سے ودیعت ہوتا ہے، اسے بھی ختم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

(۲) معلم سائنس کا تجربے نہ کرانا:- ستم بالائے ستم معلم خود بھی سائنس کی تدریس میں دلچسپی نہیں لیتا اور دوران سبق جو تجربات اور مشاہدات آتے ہیں ان سے درگذر کرتا ہے۔

اس سلسلے میں معلم کی راہ میں بھی کئی ایک مشکلات ہوتی ہیں۔ سینیئر سائنس ٹیچر جو ہائی کلاسز کو پڑھاتا ہے بہت معروف ہوتا ہے۔ اور تجربہ گاہ بھی اسی کے چارج میں ہوتی ہے۔ جونیئر سائنس ٹیچر اگر پہلے سے کوئی وقت مقرر کر کے مطلوبہ سامان حاصل کرے تو پھر کوئی دقت نہیں ہوتی۔ لیکن عین وقت پر سامان سائنس کا مطالبہ کیا جائے جبکہ سینیئر سائنس ٹیچر خود بھی معروف کلاس ہو تو ایسے وقت میں سینیئر سائنس ٹیچر کلاس کا حرج کر کے سامان نہیں نکال سکتا۔ سامان کی ٹوٹ پھوٹ سے ڈر کر بھی کچھ اساتذہ تجربے کرانے سے گریز کرتے ہیں۔ زیادہ طلباء

اور کم وسعت تجربہ گاہ ہونے سے بھی طلبا عملی تجربوں سے محروم ہو جاتے ہیں ۔

(۳) تحریری کام کی پڑتال نہ کرنا :- اول تو سائنس میں تحریری کام کرایا ہی نہیں جاتا۔ اگر تھوڑا بہت (کی کلاس) میں عملی تجربے و نوٹس وغیرہ لکھوائے بھی جاتے ہیں تو ان کی بھی پڑتال پورے طور پر نہیں کی جاتی۔ سوائے چند ایک کے باقی سب نقل کرتے ہیں۔ ہفتہ میں ایک عملی تجربہ ہو۔ باقی چھے دن طلبا کے پڑھانے اور نوٹس کی درستگی میں صرف ہوں۔

(۴) طلبا کا خود عملی تجربوں سے جی چرانا :- اکثر عملی تجربے کا گھنٹہ آخر میں ہوتا ہے۔ کام سے جی چرانے والے طلبا کھسک جایا کرتے ہیں ویسے بھی اس کو اختیاری مضمون سمجھ کر چنداں پروا نہیں کرتے اور سائنس کے پیریڈ میں اسکول میں یا گراؤنڈ میں ٹہل کر گزارنے کے عادی ہوتے ہیں ایسے طلبا کی سرزنش کے لیے معلم سائنس پر لازم آتا ہے کہ وہ ایک علیحدہ رجسٹر رکھے اور ایسے طلبا پر کڑی نگرانی رکھے اور دل چسپی پیدا کر کے طلبا کو عملی تجربوں کی طرف مائل کرے ۔

(۵) حسابی سوالات کو نظر انداز کرنا :- سائنس کے اے پرچے میں ۳۰ فیصد کے قریب حسابی سوالات ہوتے ہیں اور اساتذہ و تلامذہ دونوں ان کی اہمیت کو درخور اعتنا نہیں سمجھتے ۔ چوں کہ حسابی سوالات چیدہ چیدہ ہوتے ہیں اور مختلف حصوں میں ہوتے ہیں۔ آپس میں کوئی ربط نہیں ہوتا چناں چہ طلبا انھیں اس قابل ہی نہیں گردانتے کہ انھیں حل کیا جائے۔ اس کمی کو دور کرنے کے لیے حسابی سوالات کی علیحدہ کتاب مرتب کی جائے جس میں ایک مثال کے ساتھ کم از کم اسی قسم کے پانچ سوال طلبا کے حل کرنے کو دیے جائیں۔ اس سے طلبا کی اس شکایت کا ازالہ ہو جائے گا کہ انھیں یہ قاعدہ سمجھایا نہ گیا یا اس قسم کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ علیحدہ کتاب ہونے کی صورت میں حسابی سوالات کی قدر و قیمت طلبا کی نظر میں بڑھ جائے گی۔

(۶) معلم سائنس :- تجربہ کار اور تربیت یافتہ استادوں کی ایک حد تک کمی ہے۔ کیوں کہ ایک سائنس گریجویٹ کے لیے دوسرے محکموں میں زیادہ کشش ہے۔ اور اب جبکہ ملک صنعتی طور پر ترقی کر رہا ہے۔ اور صنعتی میدانوں میں ترقی کے خاطر خواہ مواقع بھی زیادہ مل رہے ہیں تو پھر وہ اپنا شاندار

مستقبل چھوڑ کر محکمہ تعلیم کی طرف کیوں رجوع کرنے لگے۔ صرف وہی لوگ اس طرف کا رُخ کرتے ہیں جو فکر معاش میں سرگرداں پھرتے ہیں اور کوئی دوسرا محکمہ منہ نہیں لگاتا۔ سائنس کے اساتذہ کا ۵۰ روپے ماہوار سائنس الاؤنس بند ہو جانے سے یہ کشش اور بھی کم ہو گئی ہے چناں چہ ہائی کلاسز کی تعلیم کے لیے گورنمنٹ سکولوں میں بھی بہت کم سائنس گریجویٹ ہوتے ہیں، ورنہ ایف، ایس سی فیل یا پاس ہی اس تدریس کو سرانجام دیتے ہیں۔ لوکل باڈیز منظور شدہ اور غیر منظور شدہ پرائیویٹ اداروں میں حالت اس سے بھی خراب تر ہوتی ہے۔

ان اداروں کے تنخواہوں کے گریڈ گورنمنٹ سے بھی کم ہوتے ہیں اور صرف میٹرک پاس سائنس اساتذہ کو ہی قبول کرتے ہیں۔ اور اس طرح اساتذہ و طلبا کے درجے میں کوئی خاص فرق نہیں ہوتا۔ پھر ان اساتذہ کو کوئی ایسا موقع بھی ہاتھ نہیں آتا جس سے وہ اپنے آپ کو مزید سائنسی معلومات سے آگاہ رکھیں۔ کیوں کہ اول تو کوئی مخصوص رسائل شائع نہیں ہوتے۔ ثانیاً لائبریری میں سائنسی کتب کی نہ صرف قلت ہے، بلکہ نایابی ہے۔ سمعی و بصری لوازم سے ہماری تجربہ گاہیں خالی ہیں۔ اس قسم کے اساتذہ کنوئیں کا مینڈک بنے رہنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

اساتذہ کی یہ قلت اور کمیابی اور بھی افسوس ناک ہو جاتی ہے۔ جب مندرجہ بالا اساتذہ کو ہی سائنس کا اہم مرکزی نصاب پڑھانا پڑتا ہے جس میں بجلی، متعنا طیسیت کے علاوہ حیاتیات، ذراعت علم الصحت جیسے اہم موضوع بھی شریک ہوتے ہیں، جو میٹرک پاس معلم سائنس نے بھی اپنے زمانہ تعلیم میں نہیں پڑھے تھے، ایسے ماحول میں رہ کر جو طلبا تعلیم پائیں گے ان میں صحیح قدریں پیدا نہیں ہو سکیں گی۔

<u>(۷) امدادی کتب</u> :- امدادی کتب، نوٹس و خلاصے وغیرہ سائنس کی تدریس میں تبدریج انحطاط رونما کر رہی ہیں۔ یہ کتابیں کل نصاب میں سے اٹکل پچو سوالات پر مشتمل ہوتے ہیں۔ اور سالانہ امتحان سے تقریباً تین ماہ پیشتر انھیں شائع کر کے مارکیٹ کو بھر دیا جاتا ہے۔ پھر اشتہار بازی شروع ہوتی ہے پبلشرز ایک دوسرے پر سبقت لے جانے میں بڑی دوڑ دھوپ سے برسر پیکار ہوتے ہیں۔ طلبا اُردو اشتہار

کے سنہری جال میں پھنس جاتے ہیں، اور پاس ہونے کے لیے امدادی کتب کا سہارا ڈھونڈتے ہیں۔ طلبا کے ذہن پہلے ہی خام ہوتے ہیں اور اس خام مواد سے اور بھی ناقص ہو جاتے ہیں۔ صرف امتحانی نقطۂ نگاہ سے ایک چیز کو یاد کرتے ہیں اور بعد امتحان حرف غلط کی طرح دماغ سے محو کر دیتے ہیں چناں چہ محکمۂ تعلیم کی طرف سے اس خراب علت پر پابندی ہونی چاہیے۔

(۵) روزمرہ زندگی سے تطابق نہ رکھنا :- موجودہ سائنس کے نصاب کی ایک بڑی خامی یہ ہے کہ کئی شاخوں میں اس کا روزمرہ زندگی سے عملاً کوئی رابطہ نہیں، اور طلبا کو عام حقیقتیں مفروضے اور اصول سکھانے پر زور دیا جاتا ہے۔ اصول ارشمیدس سمجھانے کے لیے طلبا کو کسی نہر تالاب پر لے جایا جائے اور تیرنے کے عمل کے دوران اس اصول کو طلبا کے ذہن نشین کرایا جائے تو محض اصول یاد کرانے سے کہیں بہتر ہے۔ طلبا اس تجربہ شدہ چیز کو کبھی نہیں بھول سکتے۔

دیہاتی طلبا، اس لحاظ سے خوش قسمت ہیں۔ قدرت نے بڑی فراخدلی سے اس قسم کے سامان بہم پہنچائے ہوئے ہیں۔ کھیت اور نہریں ان کی اپنی ہیں۔ شہری طلبا ایک محدود ماحول میں گزران کرتے ہیں۔ یا زراعت میں بیج بونے سے اس کے ایک پودے کی صورت اختیار کرنے تک کے تمام مراحل زراعتی فارم میں سمجھانے چاہئیں۔ وائرلیس، ٹیلیفون اور ٹیلی گرافی کے لیے وائرلیس شیشن، ٹیلیفون ایکسچینج یا قریبی ڈاک خانے کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ پانی کا برف میں تبدیل ہونا کسی مقامی برف خانے میں طلبا کو لے جا کر اچھی طرح ذہن نشین کرایا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ تمام ایسے لوازم ہیں جن میں پیسے کی ضرورت اور اس سے بھی زیادہ پہلے سے طے شدہ پروگرام کی ضرورت ہے۔ کلاس روم کے گھٹے ہوئے ماحول سے باہر نکل کر تفریح بھی ہو اور طلبا کی تدریس بھی عملی طور پر ہو۔ چناں چہ طلبا کو تفریح ہی تفریح میں وہ کچھ سکھا دیا جائے جو وہ کلاس روم میں بیٹھ کر کئی دن میں نہ سیکھ سکتے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ جہاں کہیں کا پروگرام بنایا جائے یا جہاں کہیں کا معائنہ کرنا ہے، مثلاً کسی کپڑے کی مل کو دیکھنا ہے یا کھیوڑے کی نمک کی کان یا حیدرآباد کے شیشے کے کارخانے دیکھنے ہیں۔ ان مقامات پر جانے سے پہلے مل مالک یا فیکٹری مینیجر سے پہلے ہی تحریری اجازت نامہ

حاصل کرنا بہت ضروری ہے۔ ورنہ ضیاع وقت کا سخت اندیشہ ہے۔ معلم سائنس دوران سیاحت تمام قدرتی مناظر و مظاہرات کی تشریح کرکے طلباء کو سمجھادیں۔

(۹) کثرتِ طلباء:۔ تقسیم برصغیر کے بعد سے جماعتوں میں طلباء کی بھیڑ میں روز بروز اضافہ ہی ہو رہا ہے اور خصوصاً سائنس کی جماعتوں میں یہ اضافہ حیرت ناک حد تک تجاوز کرگیا ہے۔ سائنس ایک تو بذاتِ خود دلچسپ مضمون ہے، دوسرے سائنسی ترقی اور نئے نئے انکشافات وایجادات سے طلباء میں سائنس کا ذوق بہت زیادہ ہو رہا ہے۔ ہمیں کسی صورت میں بھی طلباء کی بڑھتی ہوئی تعداد کو کم کرنے کا خیال نہ کرنا چاہیے۔ بلکہ متبادل انتظام کرکے بہتر تدریس کے انعقاد کی کوشش کرنی چاہیے۔ مثلاً نئے فریق کھول کر، نئے اساتذہ تعینات کرکے اس روزافزوں اہمیت کی ضرورت کو پورا کرنا چاہیے۔ کثرتِ طلباء والی جماعت میں کوئی مؤثر تعلیم نہیں دی جاسکتی۔ مختصر وقفہ میں انفرادی توجہ بھی نہیں دی جاسکتی۔ سنز اسی طلبا کی جماعت میں نظم و ضبط کے ساتھ اگر کچھ کام ہو جائے تو وہی بہت کچھ ہے۔

(۱۰) تجربہ گاہ:۔ سائنس روم میں تجربہ گاہ انسانی جسم میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت کے مطابق ہے عملی تجربات کی تدریس کا تمام تر دارومدار ایک اچھی تجربہ گاہ پر منحصر ہوتا ہے۔ اپنی وسعت کے لحاظ سے تجربہ گاہ ایک علیحدہ عنوان ہے لیکن پھر بھی ایک اچھی تجربہ گاہ کی چند خصوصیات درج ذیل ہیں۔

(۱) تجربہ گاہ میں ایسا انتظام ہو کہ اگلی سیٹوں پر تدریسی کام کرچکنے کے بعد پچھلی طرف دس بڑی میزوں کی گنجائش ہو تاکہ عملی تجربات کرنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئے۔ تجربہ گاہ کافی کھلی ہو، تنگ نہ ہو مرکبات وادویات کی تمام الماریاں دیوار کے ساتھ ہوں۔

(۲) تجربہ گاہ میں روشنی، بجلی اور پانی کے نل کا انتظام ہونا چاہیے۔ پانی کا نل دیوار کے ساتھ ہو تو زیادہ بہتر ہے تاکہ میزوں پر صفائی رہ سکے یا پھر میزوں کے ایک طرف سوئچ لگے ہوں۔

(۳) تجربہ گاہ میں ایک سٹور روم ہو جس میں الماریاں ترتیب اور قرینے سے رکھی ہوئی ہوں۔ تمام سامان شیشے کی الماریوں میں رکھنا چاہیے۔ اور اس سامان ترتیب سے ہو کہ بوقت ضرورت عجلت کے ساتھ مطلوبہ سامان میسر آسکے۔ ایک کمرے والی تجربہ گاہیں حقیقت میں تجربہ گاہیں کہلانے کی مستحق

نہیں۔ نہ سامان رکھنے کا انتظام ہو، نہ تدریس کا کمرہ ہو۔ نہ عملی تجربوں کے لیے جگہ ہو۔ ایسی تجربہ گاہ کی افادیت صفر ہوتی ہے ۔

(۴) لیبارٹری اسسٹنٹ :۔ تجربہ گاہ کی فعالیت کو زیادہ مفید بنانے کے لیے مددگار عمل کی ضرورت انتہائی ضرورت ہے۔ جو مختلف تجربوں کے سامان نکالنے اور واپس رکھنے میں اور صفائی کا ذمہ دار ہو۔

(۵) تجربہ گاہ میں سلیبس اور طلباء کے لیے ہدایتیں ہونی چاہئیں، اور طلباء کا ایک ایسا چارٹ مرتب کر کے لگایا جائے، جس سے طلباء کی کارکردگی کا پتہ چل سکے ۔

(۶) تمام مرکبات دو بجز نمکات، ادویات کو شیشیوں میں رکھ کر لیبل لگا کر رکھنا چاہیے۔ دوسرے سامان پر بھی خوش خط لکھا ہوا لیبل چسپاں کر دینا چاہیے ۔

(۷) تمام الماریوں کو مختلف شعبوں میں تقسیم کر دینا چاہیے اور ہر الماری میں سامان شعبہ متعلقہ کا ہی ہونا چاہیے مثلاً روشنی سے متعلقہ سامان ایک ہی الماری میں ہونا چاہیے اور اس پہ الماری نمبر لگا ہو اور یہ نمبر سٹاک رجسٹر میں درج ہو

(۸) سامان کا خرچ و آمد کا ریکارڈ رکھنے کے لیے ایک سٹاک رجسٹر لازمی طور پر ہونا چاہیے جس میں سامان آنے پر اندراج ہو اور صدر معلم کے دستخط ثبت کروائے جائیں

سامان کی شکست و ریخت کے بعد و اخراج ہونے پر بھی صدر معلم کے دستخط ثبت کروائے جائیں۔

تجربہ گاہ میں روشنی اور ہوا کی آمد و رفت عین حفظان صحت کے اصولوں کے مطابق ہو۔ اندھیرا نہ ہو۔

(۱۰) فن فوٹوگرافی کے لیے تجربہ گاہ میں تاریک الحاق ہو جس میں کبھی کبھی سینما پروجیکٹر سے سائنسی فلم دکھائی جا سکے ۔

(۱۱) معلم سائنس کی اپنی استعداد میں اضافے کے لیے اور بچوں کو سائنس کی موجودہ ترقی سے باخبر رکھنے کے لیے سائنس کی علیحدہ لائبریری ہو جس میں سائنسی رسالہ جات ملکی و غیر ملکی ہوں ۔ اساتذہ اور طلباء دونوں کو پڑھنے کے لیے یہ رسالہ جات ملنے چاہئیں۔

سائنسی دنیا پر ایک نظر

پاکستان میں جوہری توانائی کے تعمیری امکانات

جب سے پاکستان معرضِ وجود میں آیا ہے یہاں سائنس کو ترقی دینے اور سائنس دانوں کی تعداد میں اضافہ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے حصولِ آزادی کے بعد ہمارے حصے میں بہت کم سائنسدان آئے۔ اسی طرح تجربہ گاہوں ٹیکنیکل اداروں اور متعلقہ ساز و سامان کی بھی قلت محسوس ہوئی۔ رفتہ رفتہ اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی گئی۔ ہر سال ایک کل پاکستان کانفرنس منعقد کی جانے لگی جس میں ملکی سائنس دانوں اور اہلِ علم کے علاوہ غیر ممالک کے مندوبین بھی مدعو کیے جاتے ہیں، تاکہ سب اپنی اپنی تحقیقات سے ایک دوسرے کو آگاہ کریں۔ ابھی کچھ عرصہ ہوا، کراچی میں کل پاکستان گیارھویں سائنس کانفرنس منعقد ہوئی۔

اٹومک انرجی کمیشن | پاکستان میں ایک اور ادارہ بھی سائنس کی ترویج و ترقی کے لیے کوشاں ہے اس کا تعلق جوہری توانائی سے ہے۔ اور اسی لیے اسے پاکستان اٹومک انرجی کمیشن کہتے ہیں اس کے صدر دفاتر تو کراچی میں ہیں لیکن تجربہ گاہیں وہاں کے علاوہ پاکستان کے دوسرے اہم شہروں میں بھی قائم کی جا رہی ہیں۔ تاکہ ایٹمی توانائی پر زیادہ سے زیادہ تحقیق کی جا سکے اور اس کے تعمیری امکانات سے کما حقہٗ استفادہ کیا جا سکے۔

اس وقت یہ موضوع بہت گہری اہمیت کا مالک ہے۔ دنیا کا ہر ملک اپنی اپنی بساط کے مطابق جوہری توانائی سے مستفید ہونے کی کوشش کر رہا ہے، ایٹم کے پُر امن استعمال کا صحیح اندازہ اس بین الاقوامی کانفرنس میں ہوا، جو اگست ۱۹۵۵ء میں جنیوا میں منعقد ہوئی تھی اور جس میں دنیا کے اسی ملکوں نے حصہ لیا تھا، اس میں پاکستان نے بھی شرکت کی تھی۔ سائنس دانوں نے بے تکلفانہ ایک دوسرے سے تبادلۂ خیال کیا، اور پہلی مرتبہ ایٹمی تحقیقات کو پردۂ راز سے نکال کر کسی حد تک منظر عام پر لایا گیا۔

قوت کا سرچشمہ | ہمیں جوہری قوت میں زیادہ دل چسپی اس وجہ سے ہے کہ وہ قوت کا بہت بڑا ماخذ ہے۔ ہمارے ملک میں کوئلے اور تیل کی قلت ہے، جن ملکوں کو قوت نے یہ دونوں چیزیں افراط سے بخشی ہیں وہاں بھی اب ان کی قلت ہے۔ جن ملکوں کو قدرت نے یہ دونوں چیزیں افراط سے بخشی ہیں وہاں بھی اب ان کی قلت محسوس کی جا رہی ہے کیونکہ زمین دنیا کی ضرورت کے سامنے تھکتی جا رہی ہے۔

کوئلہ اور تیل اب سے لاکھوں اور کروڑوں سال پہلے زمین کی رگوں میں معرض وجود میں آئے۔ اب ہم انھیں نکال نکال کر تیزی سے استعمال کر رہے ہیں۔ لیکن کسی کو آنا ہو نہ نہیں کہ آمدنی غائب اور خرچ زیادہ ہو تو انجام کیا ہوتا ہے۔ بہت جلد وہ دن آنے والا ہے جب دنیا سے کوئلہ اور تیل غائب ہو جائے گا۔ دانش مند اقوام ابھی سے اپنے تئیں اس دن کے لیے تیار کر رہی ہیں۔ وہ قوت کے نئے ذرائع کی تلاش میں ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ جوہری توانائی قوت کا نہایت زبردست خزانہ ہے۔ مادے کی تھوڑی سی مقدار چند مشینوں کی مدد سے غیر معمولی قوت فراہم کرتی ہے

عالمی ترقی | گذشتہ چند سال کے عرصے میں امریکہ اور برطانیہ جوہری قوت کے پرامن استعمال بہت سا کام ہوا ہے۔ جوہری قوت کی مدد سے بجلی پیدا کی جا چکی ہے۔ اور اسے بنی نوع انسان کی خدمت کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔ امریکہ نے اس نئی قوت کو ذرائع آمد و رفت کے بہتر ا تیز تر بنانے کے بھی استعمال کیا ہے۔ چناں چہ اس کی "ناٹیلس" "اور سکیٹ" نامی آبدوزوں نے بحری سا میں ایک نیا ریکارڈ قائم کیا۔ ناٹیلس مسلسل ۹۶ گھنٹے تک زیر آب رہی۔ وہ بحر منجمد شمالی کے برف کے نیچے ہی نیچے قطب شمالی سے گذرتی ہوئی زمین کے ایک طرف سے دوسری طرف پہنچی اور اس ط سفر و تجارت کے لیے ایک نئی راہ کھل جس نے فاصلے اور وقت میں زبردست کمی پیدا کر دی
اس وقت امریکہ میں "سوانہ" نامی ایک بحری جہاز زیر تعمیر ہے، جو ایٹمی توانائی سے چلے گا۔ اس کی رفتار زیادہ ہو گی۔ ایٹمی ایندھن کے لیے بہت کم جگہ درکار ہو گی۔ یہ ایندھن بھی اس قدر قوی ہو گا

ایک مرتبہ لینے کے بعد یہ جہاز مہینوں چلتا رہے گا۔ جب اسے ایندھن لینے کے لیے ہر بندرگاہ پر رکنا نہیں پڑے گا اور رفتار بھی زیادہ ہو گی تو وقت میں خاصی کفایت ہو گی۔

ہمارے مسائل | اس تعارف سے آپ کو جوہری توانائی کی ضرورت و اہمیت کا اندازہ ہو گیا ہو گا ہم بھی اسی قسم کے مسائل سے دوچار ہیں۔ اگر ہم نے قوت کے اس زبردست ماخذ سے استفادہ نہ کیا تو ہمارا مستقبل زیادہ خوش گوار نظر نہیں آتا۔ اس وقت ہمارے ملک میں کوئلے کی سالانہ پیداوار صرف پانچ لاکھ ٹن ہے جبکہ ہندوستان میں ساڑھے تین کروڑ ٹن۔ برطانیہ میں بیس کروڑ ٹن اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں ہر سال ۵۰ کروڑ ٹن کوئلہ نکالا جاتا ہے۔

اسی طرح ہمارے ملک میں ہر سال صرف پونے گیارہ لاکھ پیپے پٹرولیم نکلتا ہے۔ جو ہماری ضروریات کے صرف ایک قلیل حصے کو پورا کرتا ہے۔ اب سوئی گیس سے ہماری کچھ ڈھارس بندھی ہے جس کی مقدار چالیس کروڑ مکعب فٹ بتائی جاتی ہے۔ امریکہ میں قدرتی گیس کی مجموعی مقدار کا تخمینہ سات ہزار دو سو پچاس کروڑ مکعب فٹ بتایا جاتا ہے۔ اس لحاظ سے ہمارا سرمایہ کچھ بھی نہیں۔

کوئلے اور تیل کے بعد قوت کا اہم خزانہ بجلی ہے۔ ہم اپنے برقابی ذرائع کو ترقی دینے کی پوری کوشش کر رہے ہیں۔ جہاں کہیں بند باندھے جا سکتے ہیں وہاں آب پاشی کے علاوہ برقی قوت پیدا کرنے کے انتظامات بھی مکمل کیے جا رہے ہیں۔ بایں ہمہ ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ ہمارے ملک کی آبادی بڑھ رہی ہے۔ اس بڑھتی ہوئی آبادی کے لیے روزگار کی سبیل بھی پیدا کرنی ہے۔ آج نہیں تو کل ہمیں جوہری توانائی کی ضرورت پڑے گی۔

جوہری توانائی کے سلسلے میں یورینیم کی بڑی شہرت ہوئی ہے۔ یہ ایک تابکار دھات ہے اور دنیا کے بہت سے ملکوں میں ملتی ہے۔ چونکہ اس سے یہ قوت زیادہ مقدار میں خارج ہوتی ہے اس لیے اس کی اہمیت بڑھ رہی ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ قوت کسی اور دھات یا عنصر سے حاصل نہیں کی جاتی۔ مادے کی خواہ کوئی بھی شکل ہو وہ ایٹم سے بنی ہے، اس لیے وہ ایٹمی توانائی خارج کرنے کی پوری صلاحیت رکھتی ہے۔

اگر ہم فی الحال یورونیم پر ہی تکیہ کریں تب بھی خوش قسمتی سے دنیا میں اس کی اتنی مقدار موجود ہے کہ آئندہ دو ہزار سال تک عالمی ضروریات کو پورا کر سکتی ہے۔ پاکستان جیسے ملکوں کے لیے یہ حقیقت اور بھی زیادہ اہمیت رکھتی ہے کیوں کہ ہمارے ہاں قوت کے دوسرے ذرائع نسبتاً کم ہیں۔

تابکاری کے فوائد اب تک ہم نے جوہری توانائی کے اس پہلو کا ذکر کیا ہے جو بڑے بڑے کاموں کے لیے استعمال کیا جائے گا۔ اس نئی قوت کے کچھ پہلو ایسے بھی ہیں جو ہماری روزمرہ زندگی میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ زراعت، صنعت و حرفت، طب و جراحی اور غذا وغیرہ میں ایٹمی توانائی کا اطلاق بہتری و خوش حالی کا ضامن ہے۔

پاکستان ایک نیا ملک ہے یہاں اس قسم کی ترقی کی ضرورت دوسرے ملکوں سے بھی زیادہ ہے۔ ہمیں اپنی صنعت زراعت، صحتِ عامہ اور تعلیم کے معیار کو ابھی بہت اٹھانا ہے۔ خوش قسمتی سے اب ایسے ذرائع ایجاد ہو گئے ہیں جن کی مدد سے معمولی عناصر کو بھی تابکار بنایا جا سکتا ہے۔ تابکاری اور اشعاع زنی یوں تو خطرناک چیزیں ہیں لیکن جب انھیں صحیح مقدار میں انسان اپنے زیر اقتدار استعمال کرتا ہے تو وہی نفع بخش ثابت ہوتی ہیں۔

ایک ایسی مشین جو غیر تابکار اور متوازن قسم کے عناصر میں تابکاری یا اشعاع زنی کی صنعت پیدا کر دیتی ہے۔ ری ایکٹر کہلاتی ہے۔ اسے ہی ایٹم پائل بھی کہتے۔ یہ عناصر تابکار ہو جانے پر آئی سوٹوپ یا ہم جا کہلاتے ہیں۔ انھوں نے زندگی کے مختلف پہلوؤں پر ایک نئے انداز سے روشنی ڈالی ہے۔ ریڈیو کاربن، ریڈیو آیوڈین، ریڈیو فاسفورس۔ ریڈیو کوبالٹ جیسے ہم جاؤں کو متعدد النوع خدمات کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔ چند دلچسپ مثالوں سے آپ کو اس حقیقت کا صحیح اندازہ ہو سکے گا۔

تابکار ہم جاؤں کے استعمال سے غلے کی پیداوار میں اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ بیماریوں کی روک تھام کی جا سکتی ہے۔ معیار صحت بلند کیا جا سکتا ہے۔ صنعت و حرفت کو ترقی دی جا سکتی ہے اور اس طرح عام انسان کی خوش حالی میں اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ چوں کہ ہم نے یہ کام ذرا دیر سے شروع کیا ہے،

اس لیے دوسرے ملکوں کے برابر آنے کے لیے ہمیں اپنے کام کی رفتار تیز کرنی پڑے گی۔ ورنہ ہم اس دوڑ میں پیچھے رہ جائیں گے۔ اس طرح ہمارے سائنس دانوں، نوجوان کارکنوں اور طالب علموں پر ایک نئی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔

موجودہ صورتِ حال | پاکستان ایٹومک انرجی کمیشن ان تمام حقائق سے باخبر ہے۔ اسے ملک کی ضروریات کا پورا اندازہ ہے، اور وہ حتی المقدور جوہری توانائی کے حصول اور ترویج و ترقی کے لیے پوری کوشش کر رہا ہے۔ گذشتہ ڈھائی سال میں اس سلسلے میں جو کام ہوا ہے اس کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

ہمارے ملک میں ایسے تربیت یافتہ عملے کی بڑی کمی ہے جو ایٹمی توانائی کے مختلف پہلوؤں پر تحقیقات کر سکے۔ ہمیں اپنے ملک میں ری ایکٹر قائم کرنے ہیں۔ ایٹم پر تحقیقات کرنے کے لیے ہمیں سازوسامان اور جدید طرز کی تجربہ گاہوں کی ضرورت ہے۔ اسی طرح جدید کیمیا۔ دھات کاری۔ زراعت طب، صنعت اور ایسے ہی دوسرے میدانوں میں ہم جائزوں کو ترویج دینے کے لیے ہمیں ایسے سائنس دانوں۔ انجینیروں اور کارکنوں کی احتیاج ہے جو اس نئی سائنس کے عملی پہلو سے کماحقہ، واقف ہوں، اور عوام کو بھی ہم جائزوں کا استعمال سکھا سکیں۔

ایٹومک انرجی کمیشن نے ان ضروریات کے پیش نظر ملک کے کچھ ہونہار سائنس دانوں کو تربیت کے لیے غیر ممالک میں بھیجا ہے۔ اب تک ۳۳ نوجوان تابکار ہم جاؤں کے استعمال کی تربیت حاصل کر چکے ہیں۔ ری ایکٹر سے متعلقہ سائنس میں ۱۳ افراد ٹریننگ لے چکے ہیں۔ چند افراد نے ہم جاؤں کے دوسرے استعمال بھی سیکھے ہیں، اور اس طرح اب تربیت یافتہ اشخاص کی تعداد پچاس تک پہنچ گئی ہے۔ ان کے علاوہ ۷۰ سائنس دان دوسرے ملکوں میں جوہری توانائی کے مختلف شعبوں کی تربیت حاصل کر رہے ہیں۔

ہم اپنی بساط بھر پوری کوشش کر رہے ہیں لیکن ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ یہ عملہ بہت کم ہے۔ یہ موضوع کس درجہ اہم ہے۔ اس کا اندازہ آپ کو چند حقائق سے ہو سکتا ہے۔ ریاست ہائے

متحدہ امریکہ نے جوہری توانائی پر تحقیقات کرنے کے لیے اپنے بجٹ میں دو ارب ڈالر کی رقم مخصوص کی ہے۔ ہمارا ہمسایہ ملک ہندوستان بھی ان تحقیقات پر دو کروڑ روپے سالانہ خرچ کر رہا ہے۔ اس وقت امریکہ میں دو لاکھ اور انگلستان میں ساٹھ ہزار آدمی ایٹمی توانائی پر مصروف تحقیق ہیں۔ بھارت میں ایک ہزار افراد سے زیادہ عملہ اس کام میں لگا ہوا ہے جس میں تین سو سائنس داں اور انجینئر شامل ہیں۔

فوری ضرورت ہمارے پاس اس وقت ایک ری ایکٹر ہونا چاہیے۔ جو ہمارے نوجوان سائنس دانوں کو تربیت بھی دے سکے اور ضرورت کے مطابق تاب کار ہم جا بھی تیار کرتا رہے۔ اس کام پر بہت روپیہ صرف ہوگا۔ تاہم یہ منصوبہ مکمل ہو چکا ہے۔ اور توقع کی جاتی ہے کہ مستقبل قریب میں یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے گا۔ ہمیں کنیڈا اور امریکہ سے اس سلسلہ میں کافی مدد مل رہی ہے۔ ری ایکٹر کے نصب کرنے۔ فنی امداد و معلومات فراہم کرنے، ماہرین مامور کرنے۔ ایٹمی ایندھن دینے اور جزوی طور پر اخراجات برداشت کرنے میں یہ دونوں ملک ہمارے ساتھ تعاون کر رہے ہیں۔

اس کام میں کچھ عرصہ لگے گا۔ اس لیے فی الحال زراعت صنعت و حرفت اور طب کو ترقی دینے کے لیے ہم تابکار ہم جاؤں کی کچھ تعداد باہر سے درآمد کر رہے ہیں، جب پاکستان کا اپنا ری ایکٹر کام کرنے لگے گا تو حسب ضرورت ان ہم جاؤں کی تعداد میں اضافہ کیا جا سکتا ہے۔

زرعی و طبی مراکز ملک میں زراعت کو ترقی دینے اور معیار صحت کو بلند کرنے کے لیے ایسے مراکز کے قیام پر غور کیا جا رہا ہے، جہاں متعلقہ مسائل کو حل کیا جا سکے۔ چنانچہ یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ ملک میں چار زرعی اور آٹھ طبی مراکز قائم کیے جائیں وہاں تاب کار ہم جا استعمال کیے جائیں گے۔

معدنیات کی تلاش ان منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ہمیں ایٹمی ایندھن درکار ہوگا۔ پاکستان کا محکمہ ارضیات، یورینیم، تھوریم اور ایسی ہی دوسری تابکار معدنیات کے وجود کا پتہ لگانے کے لیے عملی قدم اٹھا رہا ہے۔ مغربی پاکستان کے شمالی حصوں میں جو تلاش ہوئی ہے اس کے نتیجے کافی تسلی بخش ہیں۔ ایسی معدنیات کے تجزیے اور درجہ بندی کے لیے ایک نیا شعبہ بھی قائم کیا گیا ہے

اور یہ احتیاط کی گئی ہے کہ تابکاری سے کسی کو کوئی نقصان نہ پہنچ سکے۔

ہماری یونی ورسٹیاں جوہری توانائی سے متعلقہ بنیادی مسائل پر تحقیقات کرنے کے لیے ہماری بعض یونیورسٹیوں میں پہلے ہی سے کچھ کام ہو رہا ہے۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں دس لاکھ روپے کا ایک سرعت گر کچھ عرصے سے مصروف تحقیقات ہے۔ بنیادی ذرات کی خصوصیات معلوم کرنے اور پاکستانی طلباء کو ضروری تربیت دینے میں اس ادارے نے اہم خدمات انجام دی ہیں۔ اس سلسلے میں ڈھاکہ میں بھی کچھ کام ہوا ہے اور کراچی یونیورسٹی میں بھی ایٹمی طبیعیات پر تحقیقات کا سلسلہ شروع کر دیا گیا ہے۔

اگر ہم اپنے گرد و پیش پر نظر ڈالیں تو آسانی سے اس حقیقت کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ جوہری قوت اور ریڈیو ہمجا کے استعمال کی جتنی ضرورت ہمارے ملک میں ہے، اتنی شاید دوسرے ممالک میں نہیں ہے، ہمارے عوام کی زیادہ تعداد زراعت پیشہ ہے۔ ہمیں غذا کے معاملے میں بہت جلد خود کفیل ہونا ہے۔ ہمیں اپنے کھیتوں کی پیداوار بڑھانی ہے۔ غذا اور منفعت بخش فصلوں کو نقصان دہ جراثیم سے محفوظ رکھنا ہے ہمارے ہاں صحت کا معیار پست ہے۔ جدید ہسپتالوں۔ بہتر دواؤں اور تیز تر طریق ہائے علاج کی مدد سے ہمیں یہ معیار بلند کرنا ہے۔ اسی طرح ہماری صنعتیں ابھی ابتدائی مراحل سے گذر رہی ہیں ہمارے کارخانوں کی رفتار سست ہے۔ یہ تمام پہلو ہماری توجہ کے طالب ہیں۔ اور جوہری توانائی ان سب کو بہتر بنانے میں ہماری مدد کر سکتی ہے۔

ہمارے سائنس داں اساتذہ اور انجینئر جوہری توانائی میں پوری دلچسپی لے رہے ہیں۔ حکومت بھی اس کی اہمیت سے پورے طور پر باخبر ہے۔ امید ہے اس سلسلے میں کچھ عرصہ بعد پاکستان بھی ترقی یافتہ ممالک کی صف میں شامل ہو جائے گا۔

(استقلال لاہور)

[شمارہ ٦]　　　لاهور

اس شمارہ میں

تعلیمی ماہنامہ

آموزش
لاہور

ستمبر ۱۹۵۹ء
جلد ــــــ ۱۲
شمارہ ــــــ ۶

سالانہ چندہ
پاکستان کے لیے ۶ روپے
غیر ممالک کے لیے ۸ روپے

قیمت فی پرچہ دس آنے

پبلشر
یونی ورسٹی بک ایجنسی لاہور

آر۔ ایچ۔ ڈی خالد پرنٹر پبلشر نے دین محمدی پریس میں طبع کرا کے
یونیورسٹی بک ایجنسی ۲ کچہری روڈ لاہور سے شائع کیا

مؤثر تدریس کا انتظامی پہلو

ایم۔ اے مخدومی

ایک مشہور ماہر نفسیات کا قول ہے کہ "علم الحیات کے مطالعہ سے ایک بنیادی کلیہ یہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ تمام جاندار گردوپیش کے ماحول کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ اپنی سرگرمیوں میں تبدیلی پیدا کرتے جاتے ہیں۔ جب تک کوئی حیوان اپنے طرز عمل میں اس قسم کی تبدیلی پیدا کرتا رہتا ہے وہ زندہ رہتا ہے۔ اگر وہ کسی حد تک ماحول کے ساتھ ہم آہنگی کرنے میں ناکام رہے تو اس کی ہستی خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ لیکن اگر وہ ہم آہنگی پیدا کرنے میں کلی طور پر ناکام رہے تو وہ موت کی نیند سو جاتا ہے"۔

اس میں کلام نہیں کہ مدرسے کی ایک بنیادی ذمہ داری بچوں اور نوخیز نوجوانوں کو اپنی دنیا کے ساتھ ہم آہنگ بنانا ہے لیکن انسان اپنے آپ کو جس دنیا میں پاتا ہے اسے کسی ایک حالت پر قرار نہیں۔ انسان کی اجتماعی زندگی ہمیشہ بدلتی چلی آئی ہے اور اسی مناسبت سے مدرسوں میں پڑھنے والے طلبا کی ضرورتیں ہمیشہ تبدیل ہوتی رہی ہیں۔ یہ صورت حال مدرسے کے لائحہ عمل میں لگاتار ردوبدل کا مطالبہ کرتی ہے۔ موجودہ سائنسی دور میں انسانی زندگی کا دھارا جس تیزی سے رخ بدلنے لگا ہے اس کی مثال تاریخ میں نہیں۔ لہٰذا آج مدرسے کو چاہیے کہ اپنے ہر طالب علم کی مخفی قابلیتوں کو پہلے سے زیادہ مؤثر طور پر بیدار کرے تاکہ اس کی کوئی خداداد صلاحیت بروئے کار آنے سے رہ نہ جائے۔ ہر طالب علم کو اس قسم کا بلند پایہ تعلیم عطا کرنے کے لیے مدرسوں کو ایسے ماہر استادوں کی ضرورت ہے جنہیں اپنی ذہانت، اپنے جذبۂ عمل اور اپنے تخیل سے کام لینے کے پورے مواقع میسر ہوں۔ جہاں استادوں میں یہ اوصاف موجود ہوں گے وہاں انتظامی شعبہ یقیناً ذیل کے اوصاف کا حامل ہوگا: ۔۔

(i) جمہوری اقدار کی کارفرمائی

(ii) حل مسائل کے عمل میں سب کے تعاون کا حصول۔

(iii) تعمیری قسم کے انسانی مراسم کا قیام

جمہوری قدروں کی اصل بنیاد افراد کی یکساں اخلاقی قدر و قیمت میں یقین ہے۔ اس یقین کا منطقی
نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ مسائل حل کرنے وقت ہر شخص کو رائے ظاہر کرنے کی پوری آزادی ہو۔ جو انتظامی شعبہ
مدرسہ کا اول سے قائل ہوگا، وہ اس بات کا پورا اہتمام کرے گا کہ مدرسے کے تمام استاد انتظامی مسائل
حل کرنے میں حصہ لیں یعنی ہر قسم کے منصوبے تیار کرنے، انھیں عملی جامہ پہنانے اور ان کی قدر و قیمت کا اندازہ
لگانے کا کام استادوں کے اشتراک عمل سے انجام پائے۔ جب اس طور پر انتظامی ذمہ داری استادوں کے
کندھوں پر منتقل ہو جاتی ہے تو ان میں سے ہر ایک کو احترام نفس کا ایک نیا احساس حاصل ہوتا ہے
جو اس کی تخلیقی قوتوں میں ناقابل تعین حد تک اضافہ کرتا ہے۔

مدرسے کے گوناگوں مسائل حل کرنے میں استادوں کا اشتراک عمل حاصل کرنا دراصل استادوں میں
معلمانہ صلاحیت پیدا کرنا ہے۔ جب استادوں سے یہ مطالبہ کیا جائے کہ وہ بلا سوچے سمجھے رٹوانے کی بجائے
طلبہ میں خود سوچنے کی صلاحیت پیدا کریں تو استاد یہ مطالبہ کرنے میں بالکل حق بجانب ہوں گے کہ خود
ان پر بھی سوجھ بوجھ سے کام لینے کے دروازے کھلے رہیں جس کی عملی صورت یہ ہے کہ انھیں انتظامی
ذمہ داری میں شریک کیا جائے۔ استادوں کی تخلیقی قوتوں کو کام پر لگائے رکھنے کی بہترین صورت یہی ہے کہ
ان میں سے ہر ایک کو کسی نہ کسی حد تک مشترکہ مسائل کے حل میں شریک کیا جائے۔ بعض ترقی پسند مدرسے
اس میدان میں اتنے آگے نکل گئے ہیں کہ وہ کسی نئے استاد کو ملازم رکھنے کے لیے بھی اپنے عملے کو مشورہ میں شریک کرتے ہیں۔

تعمیری انسانی مراسم اسی گروہ میں جڑ پکڑ سکتے ہیں جہاں گروہ کے ہر فرد کو اپنے آپ پر بھروسہ ہو۔ جہاں یہ بھروسا
ناپید ہو وہاں گروہ کے افراد دوسروں کو اور خود اپنے آپ کو فریب میں مبتلا کرنے پر اتر آتے ہیں۔ استادوں میں اعتماد نفس پیدا
کرنے کے لیے ضروری ہے کہ انھیں خود سوچنے، خود فیصلہ کرنے اور خود قدم اٹھانے کی آزادی ہو۔ جس مدرسے میں تعمیری
انسانی مراسم قائم کرنے مطلوب ہوں وہاں استادوں کو اس بات کا یقین دلانا چاہیے کہ مدرسہ تدریس کی بعض خاص
تکنیکوں کے ساتھ وابستہ نہیں بلکہ ہر استاد کو اس بات کی آزادی ہے کہ اپنی پسند کی تکنیکیں یا طریقے ...

ایبٹ آباد کی ورکشاپ

فضل احمد

استادوں کے لیے گرمائی نصاب

استادوں کے لیے گرمائی نصاب مہیا کرنا ترقی یافتہ ملکوں میں عرصے سے ایک رواج بن چکا ہے۔ گرمیوں کے موسم میں مدرسے عموماً ہر جگہ آٹھ نو ہفتوں کے لیے بند ہو جاتے ہیں لیکن چھٹیوں کی یہ مہلت تعلیمی طور پر بے فائدہ نہیں رہنے پاتی۔ اس زمانے میں مختلف تعلیمی اور مجلسی ادارے یہ کوشش کرتے ہیں کہ طلبہ اور اساتذہ دونوں ذہنی طور پر بیدار رہیں۔ اس مطلب کے لیے طلبا کے لیے گرمائی کیمپ قائم کیے جاتے ہیں۔ یہ کیمپ شہروں سے دور کھلے اور پرفضا مقامات پر قائم کیے جاتے ہیں تاکہ وہ طلبہ جو پرہجوم شہری زندگی سے گھرے رہتے ہیں سرسبز درختوں میدانوں، پہاڑوں، یا ساحلی مقاموں پر چند ہفتے فطرت کی دلکش اور روح افزا گود میں گذار کر دل و دماغ کو تازہ کر لیں۔ مغربی ملکوں میں یہ تحریک اب اس قدر زور پکڑ چکی ہے کہ گرمیوں کی چھٹیوں میں کئی مدرسے بچوں کو دوسرے ملکوں میں لے جاتے اور وہاں کی زندگی کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کی سہولتیں مہیا کرتے ہیں۔

اسی طرح استادوں کو یہ مواقع دیے جاتے ہیں کہ تعطیلات گرما کی فرصت کو اپنی علمی اور فنی بالیدگی کا ذریعہ بنائیں۔ یونیورسٹیوں میں مختصر تعلیمی نصاب پیش کیے جاتے ہیں۔ اساتذہ ان نصابوں میں حصہ لے کر نہ صرف اپنے آپ کو جدید ترین تعلیمی فکر اور طریقہ ہائے تدریس سے آگاہ رکھتے ہیں بلکہ اس طرح اپنی تعلیمی قابلیت میں اضافہ کر کے اپنے آپ کو ترقی کا مستحق بھی بنا لیتے ہیں۔ ہمارے ہاں اعلیٰ امتحانوں کے متعلق یہ دستور رائج ہے کہ امیدوار کو ہر امتحان کے مقررہ نصاب کی ایک ساتھ تیاری کرنی پڑتی ہے۔ اگر وہ مقررہ نصاب کے کسی حصے میں مطلوبہ دسترس حاصل نہ کر سکے تو وہ امتحان میں ناکام گردانا جاتا ہے اور اسے از سر نو سارے نصاب کی تیاری کرنی پڑتی ہے۔

اس صورتِ حال کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے یہاں جو استاد کوئی امتحان پرائیویٹ طور پر پاس کرنا چاہے اسے مدرسے سے چھٹی لے کر یا مدرسے کے کام کو کسی نہ کسی حد تک نظر انداز کر کے شبانہ روز تیاری کرنی پڑتی ہے۔ اس سے لمبا اوقات مدرسے کے کام میں ہرج واقع ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ محکمہ تعلیم نے پرائیویٹ طور پر امتحان دینے پر کچھ پابندیاں لگا رکھی ہیں۔ مگر مغربی ملکوں میں یہ صورتِ حال پیدا ہونے نہیں پاتی۔ یونیورسٹیاں امیدواروں کو اس بات کی اجازت دیتی ہیں کہ کسی امتحان کے مقررہ نصاب کو تھوڑا تھوڑا کر کے چند سالوں میں پورا کر لیں۔ چناں چہ استاد گرمائی نصابوں میں حصہ لے کر امتحان کے متعدد پرچوں میں سے ہر سال ایک یا دو پرچوں کی تیاری کر لیتے ہیں اور ان پرچوں کا امتحان دے لیتے ہیں۔ اس طرح چند سالوں میں وہ سارا مقررہ نصاب ختم کر لیتے ہیں۔ اس سے ان کی تعلیمی اور ذہنی بالیدگی بھی ایک خاصے لمبے عرصے پر پھیل جاتی ہے اور مدرسے کے کام میں بھی کوئی ہرج واقع نہیں ہونے پاتا۔

درس و تدریس کے فن میں نگاہ رکھنے والے لوگ اس بات پر متفق ہیں کہ تعلیم کی کامیابی اگر قومی بقا اور قومی ترقی کے لیے بنیاد کا درجہ رکھتی ہے تو نظامِ تعلیم میں استاد کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ اس نظام میں دوسرے لوگوں کو بظاہر خواہ کتنا ہی اونچا درجہ حاصل کیوں نہ ہو، اس کی اصل جان استاد ہے۔ کسی تہذیب یا کسی معاشرے کی اجتماعی زندگی استاد کی ذہنی سطح سے آگے نہیں جا سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ ترقی یافتہ قومیں اپنے استادوں کی ذہنی سطح کو بلند سے بلند تر کرنے کی کوشش میں لگی رہتی ہیں۔ استادوں کے گرمائی نصاب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہیں۔ ان کی بدولت استادوں کو آسانی سے اس بات کا موقع مل جاتا ہے کہ نہ صرف محکمانہ ترقی کے لیے سامان فراہم کر لیں بلکہ اپنے ذہنی افق کو بھی لگاتار کشادہ کرتے چلے جائیں۔

ہمارے ملک میں استادوں کے گرمائی نصابوں کا انتظام ابھی باقاعدہ طور پر نہیں ہوا۔ دوسرے ملکوں میں اس میدان میں یونیورسٹیوں نے رہنمائی کا مقام حاصل کر رکھا ہے۔ مگر ہمارے یہاں یہ کیفیت ہے کہ پنجاب یونیورسٹی جیسی پرانی اور بڑی یونیورسٹی بھی تا حال اپنے ہاں تعلیم کا شعبہ

کھول سکی۔ تاہم پچھلے چند سالوں میں امریکی ماہرین تعلیم نے ہمارے یہاں گرمائی نصابوں کو رواج دینے کی کوشش کی ہے۔ بالخصوص جب سے وانشگٹن سٹیٹ کالج اور پنجاب یونیورسٹی کے درمیان اساتذہ کے تبادلے کا پروگرام شروع ہوا ہے۔ اس وقت سے امریکی ماہرین تعلیم نے وقتاً فوقتاً استادوں کے لیے تجدیدی نصاب جاری کیے ہیں۔ ان مختصر نصابوں کی نوعیت اگرچہ گرمائی نصابوں کی نہیں تاہم ان کی بدولت ان نصابوں کے رواج پانے کے لیے زمین تیار ہو گئی ہے۔

۱۹۵۹ء کی ورک شاپ

سٹیٹ کالج آف واشنگٹن سے آئے ہوئے ماہرین تعلیم سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور کے تعاون سے پچھلے چند سالوں سے گرمیوں کی چھٹیوں میں ایک مختصر سے تجدیدی نصاب کا اہتمام کرتے چلے آئے ہیں۔ اساتذہ کے یہ تجدیدی نصاب بالعموم کسی صحت بخش پہاڑی مقام پر چلائے جاتے ہیں تاکہ شامل ہونے والوں کی تفریح طبع کا سامان بھی ہو جائے۔ امریکی اصطلاح میں اس قسم کے تجدیدی نصاب کو ورک شاپ کا نام دیا جاتا ہے کیوں کہ اساتذہ کے اس اجتماع میں کوشش یہ نہیں ہوتی کہ کوئی بھولے ہوئے سبق یاد دلائے جائیں بلکہ کوشش یہ ہوتی ہے کہ استاد باہم مل کر اپنے مسائل کے حل سوچیں۔

اس سال کی ورک شاپ پاکستان ریلویز پبلک سکول ایبٹ آباد کی پُرفضا عمارت میں منعقد کی گئی۔ اس ورک شاپ کا سب سے نمایاں خاصہ اس کے شرکاء کی ذمہ دارانہ حیثیت تھی یہ پہلی ورک شاپ تھی جس میں شریک ہونے والے تقریباً سب کے سب ہیڈ ماسٹر تھے، ان میں لاہور ریجن کے ہیڈ ماسٹروں کے علاوہ راولپنڈی ڈویژن اور کوئٹہ اور پشاور کے نمائندے بھی شامل تھے۔ ہیڈ ماسٹر صاحبان کو ورک شاپ میں جمع کرنے کی بڑی غایت یہ تھی کہ ایک استاد کی بجائے مدرسے کی ساری فضا میں تبدیلی پیدا کی جائے پچھلی ورک شاپوں میں جو استاد شریک ہوتے وہ عموماً یہ کہتے سنے جاتے تھے کہ صاحب ہمارے نقطۂ نگاہ میں تو تبدیلی پیدا ہو گئی ہے لیکن جب تک مدرسے کا صدر معلم اس نکتہ نگاہ کی معقولیت کا قائل نہ ہو اس وقت تک ہم اپنے طریق کار میں آسانی سے

کوئی بڑی تبدیلی پیدا نہیں کی سکتے۔ ورک شاپ کے منتظمین کو اس استدلال کے وزن کا احساس تھا۔ چناں چہ اس سال شروع ہی سے یہ فیصلہ کیا گیا کہ ایبٹ آباد کی ورک شاپ میں معلموں اور نگرانی کرنے والے دوسرے افسروں کو بلایا جائے۔ اس فیصلے کے ماتحت تقریباً اسی لوگوں کو دعوت نامے جاری کیے گئے، جن میں سے کوئی ساٹھ نے شرکت کی۔

ورک شاپ کے انتظامات کی ذمہ داری پیرزادہ ایم اے مخدومی پرنسپل سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور، اور مسٹر ای۔ ایل سٹینکلے امریکی ماہر تعلیم پر تھی۔ اس کام میں پروفیسر عبدالحق۔ پروفیسر فرحت اللہ خاں۔ پروفیسر امجد حسین ملک۔ پروفیسر شیخ معز الدین۔ پروفیسر انیس الدین انصاری اور پروفیسر فضل احمد ان دونوں اصحاب کا ہاتھ بٹانے کے لیے مقرر تھے۔ ٹریننگ کالج کے ان پروفیسروں کے علاوہ مغربی پاکستان کے کئی سربرآوردہ ماہرین تعلیم کو بھی ایبٹ آباد آنے اور ورک شاپ کے مباحث میں حصہ لینے کی دعوت دی گئی تھی۔ ان اصحاب میں سے میجر محمد رفیع اسسٹنٹ ڈائرکٹر تعلیم مغربی پاکستان۔ چوہدری نذیر احمد انسپکٹر مدارس ملتان ڈویژن اور جناب مختار صادق صاحب پبلیکیشنز آفیسر محکمہ تعلیم لاہور نے ورک شاپ کے پہلے ہفتے میں شرکت کی اور ڈاکٹر غلام یٰسین خاں نیازی انسپکٹر مدارس لاہور۔ پروفیسر تاج محمد خیال چیئرمین ثانوی بورڈ۔ پروفیسر کرامت حسین جعفری سیکرٹری ثانوی بورڈ اور جناب ایم آئی ربانی انسپکٹر ٹریننگ انسٹی ٹیوشنز لاہور نے ورک شاپ کے دوسرے اور آخری حصے میں شرکت کی۔ ان ملکی ماہرین تعلیم کے علاوہ ڈاکٹر ایلیس اور ڈاکٹر ٹومز دو امریکی ماہرین تعلیم اول سے آخر تک ورک شاپ میں شریک رہے۔ یہ دونوں اصحاب مشرقی پاکستان سے آئے تھے۔

ورک شاپ کا افتتاح ۱۹ جولائی ۱۹۵۹ء بروز اتوار ہوا۔ افتتاح کی رسم پشاور ڈویژن کے ڈائرکٹر تعلیم میاں مشتاق احمد صاحب نے ادا کی۔ حاضرین کا خیر مقدم کرتے ہوئے پیرزادہ ایم اے مخدومی نے اپنا استقبالیہ خطبہ پڑھا۔ اس میں آپ نے اس نکتے پر زور دیا کہ تعلیمی فکر قوت فکر کی ترقی کو تعلیم و تربیت کا خلاصہ قرار دیتا ہے۔ مگر ہمارے مدرسوں میں پڑھانے کے جو طریقے رائج ہیں

وہ بلا سوچے سمجھے رٹنے اور زبانی تکرار کو ہی سب کچھ سمجھتے ہیں۔ پاکستان ایک آزاد اور خود مختار ملک کے طور پر اقوام عالم کی برادری میں جو مقام حاصل کرنا چاہتا ہے، اسے قابل حصول بنانے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے شہری اپنے طور پر سوچنے، فیصلہ کرنے اور عملی قدم اٹھانے کے قابل ہوں۔ یہ ایک اہم قومی ذمہ داری ہے جو ہمارے مدرسوں پر عائد ہوتی ہے۔ لیکن ہمارے مدرسے امتحانوں اور سالانہ نتائج کے چکر میں کچھ اس طرح پھنسے ہوئے ہیں کہ وہ فکر انگیز طریقہ ہائے تدریس اختیار کرنے کی طرف مائل نہیں ہوتے۔ تاہم وقت کا تقاضا یہ ہے کہ مدرسوں کو اس دلدل سے باہر نکالا جائے۔ جب تک مدرسے میں یہ انقلاب پیدا نہیں ہوتا، اس وقت تک قومی ترقی کے نئے افق ظاہر نہیں ہو سکتے۔ بہت سے لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ تعلیمی دنیا میں یہ خوش گوار انقلاب پیدا کرنا حکومت کا فرض ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ حکومت اپنی بہترین کوششوں کے باوجود اس میدان میں بہت آگے نہیں جا سکتی۔ مدرسے میں ذہنی انقلاب پیدا کرنا اور بچوں اور نوجوانوں کو خود سوچنے، خود کام کرنے اور ذمہ داری سنبھالنے کا خوگر بنانا اساتذہ کا کام ہے اور اساتذہ کو اس تخلیقی راہ پر لگانا صدر معلم کی ذمہ داری ہے۔ صدر معلم مدرسے کی زندگی میں کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کا نقطۂ نگاہ اور اس کا جذبۂ عمل مدرسے کی ساری فضا کو شدید طور پر متاثر کرتا ہے۔ وقت آگیا ہے کہ ہمارے ہیڈ ماسٹر صاحبان اپنی ذمہ داری اور اپنے مواقع عمل کا احساس پیدا کریں اور قومی زندگی کی نہج بدلنے میں اپنا حقیقی کردار ادا کریں۔

طریق کار

سنٹرل ٹریننگ کالج اور سٹیٹ کالج آف واشنگٹن کی طرف سے اب تک جتنی ورکشاپیں منعقد ہوئی تھیں ان سب میں طریق کار یہ رہا تھا کہ شامل ہونے والوں کو ان کی دلچسپی کے مطابق مدرسوں میں پڑھائے جانے والے مختلف مضامین کے گروہوں میں تقسیم کر دیا جاتا۔ مثلاً انگریزی گروپ، ریاضی گروپ، معاشرتی علوم گروپ وغیرہ۔ مضامین کے ان مختلف گروہوں کے دائرۂ کار کے متعلق پہلے سے ایک پروگرام بنا لیا جاتا ہر گروہ کو متعلقہ مضمون کے ایک ماہر کی نگرانی میں

کام کرنے کا موقع دیا جاتا اور ورک شاپ کے خاتمہ تک ہر گروہ متعلقہ مضمون کی تدریس کو زیادہ مؤثر بنانے کے طریقوں کا مطالعہ ختم کر لیتا

ایبٹ آباد ورکشاپ کے ڈائرکٹر مسٹر شیلنگی نے شروع ہی سے یہ فیصلہ کیا تھا کہ اس سال پہلے سے مختلف طریق کار سے کام لیا جائے گا۔ مسٹر شیلنگی کا خیال یہ تھا کہ اساتذہ کی بالیدگی میں قوت فکر کی ترقی کو سب سے زیادہ دخل حاصل ہے۔ لہٰذا ورک شاپ سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے مباحث کے لیے پہلے سے کوئی لائحہ عمل طے نہ کیا جائے بلکہ شریک ہونے والوں سے پوچھا جائے کہ وہ کون سے مسائل ہیں جو ان کو زیادہ پریشان کیے ہوئے ہیں۔ ان مسائل کو یکجا کرنے کے بعد ان میں سے کوئی آٹھ دس مسائل ایسے چن لیے جائیں جو اکثریت کے نقطہ نگاہ سے زیادہ اہم ہوں۔ اس کے بعد ان احباب کو یہ موقع دیا جائے کہ جس مسئلہ کے حل میں شریک ہونا چاہتے ہوں اس کی نشان دہی کر دیں اس طرح یہ لوگ چند ایسے گروہوں میں بٹ جائیں گے جن کی فکری کوششوں کی منزل ایسے مسئلہ کا قابل عمل حل ہوگا جس میں انہیں خود صد در صد دلچسپی ہے۔ مسٹر شیلنگی اور ان کے رفقائے کار کا خیال یہ تھا کہ یہ طریق کار نہ صرف ورک شاپ میں شریک ہونے والوں کے لیے حقیقی طور پر فائدہ مند ثابت ہوگا۔ بلکہ اس کی بدولت مدرسوں کی علمی زندگی میں بھی ایک نئے دور کا آغاز کیا جا سکے گا۔

اس طریق کار پر عمل کرتے ہوئے ورک شاپ کے افتتاح کے بعد اس میں حصہ لینے والے ہیڈ ماسٹر صاحبان کو مندرجہ ذیل سات گروہوں میں تقسیم کر دیا گیا۔

(۱) مقاصد تعلیم اور تنظیم نصاب　　　(۴) تدریسی مواد اور وسائل

(۲) بچے کی ضرورتوں کا فہم　　　(۵) امتحانات

(۳) اساتذہ　　　(۶) نظم و نسق مدرسہ اور تعلیمی دہنمائی

مسائل کی تعداد کے اعتبار سے گروہوں کی تعداد چھ بنتی ہے۔ لیکن نظم و نسق مدرسہ

اور تعلیمی رہنمائی میں دل چسپی ظاہر کرنے والوں کی تعداد اس قدر بڑھ گئی کہ انھیں دو گروہوں میں تقسیم کرنا پڑا۔ اس طرح گروہوں کی کل تعداد سات بن گئی۔

گروہوں کی تشکیل کے بعد انہیں اپنے اپنے مسائل پر غور کرنے اور ان کے حل تلاش کرنے کو کہا گیا۔ جماعتی فکر اور جماعتی بحث وتمحیص کے اصولوں کی وضاحت کر دی گئی۔ ہر گروہ نے اپنے میں سے ایک کو صدر اور دوسرے کو محرر مقرر کر لیا۔ صدر کا کام جماعتی بات چیت کو درست راہ پر لگائے رکھنا اور محرر کا کام جماعتی فیصلوں اور سفارشوں کو قلمبند کرنا تھا۔ اس طرح ہر گروہ کو اس بات کا پورا موقع حاصل ہو گیا کہ کسی خارجی مداخلت کے بغیر اپنے مذاکرات کو مکمل آزادی کی فضا میں جاری رکھے۔

روزانہ نقشہ اوقات مندرجہ ذیل تھا۔ صبح آٹھ بجے تک تمام لوگ ضروریات سے فارغ ہو ناشتہ کر کے کام کے لیے تیار ہو جاتے۔ ٹھیک آٹھ بجے سب کے سب ریلوے سکول کے ہال میں جمع ہو جاتے۔ قرآن مجید کی تلاوت کے بعد ورک شاپ کے ڈائرکٹر، سیکرٹری یا دوسرے اصحاب میں سے بعض ذمہ دار لوگ حاضرین کی توجہ ضروری امور کی طرف مبذول کراتے اس کے بعد سب کے سب مل کر قومی ترانہ گاتے۔ کوئی ساڑھے آٹھ بجے تک یہ سب کچھ ختم ہو اور مختلف گروہ اپنے اپنے کمروں میں چلے جاتے۔ دو گھنٹے کے کام کے بعد ساڑھے دس بجے نصف گھنٹے کی تفریح کا وقفہ آتا۔ گیارہ بجے سب لوگ دوبارہ اپنے اپنے کام میں لگ جاتے ساڑھے بارہ بجے کام ختم ہو جاتا۔

پچھلی ورک شاپوں کے برخلاف اس ورک شاپ میں روزانہ تقریروں کو کوئی جگہ حاصل تھی۔ مسٹر شینکی، ان کے امریکی ساتھی، سنٹرل ٹریننگ کالج کے پروفیسر صاحبان اور دوسرے معزز مہمان محض مشیروں کی حیثیت رکھتے تھے۔ جب مختلف گروہ اپنے اپنے کمروں میں مصروف کار ہوتے مشیر حضرات چکر لگاتے ہوئے تھوڑی دیر کے لیے مختلف کمروں میں رک جاتے، زیر بحث مسائل اور بحث میں حصہ لینے والوں کے خیالات سنتے اور جہاں ضرورت محسوس ہوتی اپنے

خیالات ظاہر کر دیتے۔ اس طریق کار نے سو چنے اور طے کرنے کی ساری ذمہ داری ان لوگوں پر ڈالدی جو اپنے مسائل اور عملی مشکلات کے حل ڈھونڈتے آئے تھے۔ انھیں ان لوگوں کے پاس سے بنے بنائے حل نہ مل سکتے جو ان کی نگاہ میں علم و تجربہ کے رہنما تھے۔ ورکشاپ کے سارے عرصے میں پروفیسر تاج محمد خیال چیئرمین ثانوی بورڈ کی ایک تقریر کے سوا اور کوئی تقریر نہ ہوئی ہیڈ ماسٹر صاحبان نے خود ہی اپنے علم و تجربہ کو یکجا کیا اور اس کی روشنی میں چند در چند مسائل کے قابل عمل حل معلوم کیے۔

بعد دوپہر کے اوقات کسی مقررہ سرگرمی کے لیے وقف نہ تھے۔ یہ اوقات سیر و تفریح اور مطالعہ کتب کے لیے الگ کر دیے گئے تھے۔ تعلیمی کتابوں کی ایک اچھی خاصی لائبریری بہم پہنچائی گئی تھی۔ کتابوں کا اجرا کرنا دو تین اصحاب کے ذمے تھا۔ یہ باری باری کتب خانے میں حاضری دیتے۔ کتب خانہ بعد دوپہر سے شام تک کھلا رہتا۔ ایبٹ آباد کی سرسبز و شاداب وادی بھی اپنے دامن میں قلب و نگاہ کی کشش کے بہت سے سامان رکھتی ہے۔ عصر کی نماز کے بعد تھا اوقات سیر و تفریح کا سامان کر دیا جاتا۔ اس مطلب کے لیے لیڈی میکلیگن زنانہ ہائی سکول لاہور کی بس ہر وقت موجود رہتی تھی۔ مسٹر شینکل ہر روز شام کے چار بجے اپنے رفقائے کار کا اجلاس بلاتے جس میں صبح کی کارکردگی اور آئندہ لائحہ عمل پر نگاہ ڈالی جاتی۔

شام کے کھانے کے بعد روزانہ تعلیمی فلمیں دکھائی جاتیں۔ امریکی شعبۂ اطلاعات کی طرف سے کافی تعداد میں مفید تعلیمی فلمیں مہیا کی گئی تھیں۔ ہر شام دو تین فلمیں دکھائی جاتیں۔ پھر ان پر تبصرہ ہوتا۔ مسٹر شینکل نے شام کے اس اجتماع کو قومی ترانہ سکھانے کا ذریعہ بھی بنایا۔ بہتوں کو قومی ترانہ سرے سے یاد ہی نہ تھا جن کو یاد تھا وہ بھی اسے موزوں لے کے ساتھ نہیں گا سکتے تھے۔ پاکستان کا قومی ترانہ مغربی موسیقی کی ایک مخصوص دھن پر تیار کیا گیا ہے۔ اور گانے والے جب تک اس دھن کے اتار چڑھاؤ سے اچھی طرح واقف نہ ہوں اس وقت تک وہ اسے موزوں طور پر گا نہیں سکتے۔ مغربی موسیقی کا ایک خاصہ یہ ہے کہ اس کی ہر دھن کو تحریر میں لایا جا سکتا ہے۔ مشرقی موسیقی

تحریر کی قید سے تقریباً بالکل آزاد ہے۔ مسٹر شیفکی نے پاکستان کے قومی ترانے کو موسیقی کی زبان میں لکھ کر اس کی بہت سی نقلیں کرائیں اور ہر شخص کو اس کی ایک ایک نقل دیدی۔ ایک شام انھوں نے ان تحریری علامات کی وضاحت کی اور روزمرہ کی مشق سے بالآخر اساتذہ کو اتنی مشق کرادی کہ سب مل کر نہایت متوازن لہجے اور سُر کے ساتھ ترانہ گانے لگے۔

ایبٹ آباد کی وادی

ضلع ہزارہ مغربی پاکستان کا ایک نہایت سرسبز اور دلکش گوشہ ہے۔ مگر یہ عجیب بات ہے کہ اس ضلع میں ہزارہ نام کا کوئی قصبہ یا شہر موجود نہیں۔ ضلع کا صدر مقام ایبٹ آباد ہے مگر ضلع کو ہزارہ کا نام دیا گیا ہے۔ اس لحاظ سے یہ ضلع ملک بھر میں اپنی مثال غالباً آپ ہے ایبٹ آباد کو جانے کے لیے حسن ابدال (ضلع کیمبل پور) سے جرنیلی سڑک سے ایک شاخ پھوٹتی ہے۔ یہ سڑک شمال کا رخ کرتی ہوئی ہر قدم پر بلند ہوتی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ یہ ضلع کیمبل پور سے نکل کر ضلع ہزارہ میں داخل ہو جاتی ہے۔ راستے میں دو مشہور پہاڑی کھڈ پڑتے ہیں، جو مقامی طور پر دریائے ہرو اور دریائے دوڑ کے نام سے مشہور ہیں۔ اول الذکر ضلع کیمبل پور میں بہتا اور اپنے اردگرد کے رقبے کو شاداب بناتا ہے۔ ثانی الذکر ضلع ہزارہ کے ایک خاصے حصے کی شادابی کا سامان کرتا ہے۔ دریائے دوڑ کو عبور کرنے کے جلد ہی بعد سڑک کے دونوں طرف گھرے سبز پتوں کا ایک سائبان تنا نظر آنے لگتا ہے۔ گھنے باغوں اور سرسبز کھیتوں کی شادابی آنکھوں کو خیرہ کیے دیتی ہے۔ جلد ہی مسافر اپنے آپ کو ہری پور (ہزارہ) میں پاتا ہے، یہ قصبہ دریائے دوڑ کی بدولت پیدا ہونے والے پھلوں اور سبزیوں کی منڈی ہے۔ ہری پور میں ٹیلی فون کا سامان بنانے کا کارخانہ بھی قائم ہے۔ ہری پور سے آگے سڑک اسی طرح شاداب علاقے میں سے گذرتی ہوئی حویلیاں کے مقام پر آپہنچتی ہے جو ریلوے کا آخری اسٹیشن ہے۔ یہاں سے ایبٹ آباد صرف دس میل ہے، مگر دس میل کا یہ ٹکڑا بلندیوں اور نشیبوں سے اس طرح بھرپور ہے کہ یہاں ریل کی پٹڑی نہیں بچھائی جا سکی۔ حویلیاں پہنچ کر ایک اجنبی کو یہ خیال ہونے لگتا ہے کہ

اگلے دس میلوں سے آب و ہوا میں کون سا خاص فرق پڑ جائے گا۔ مگر یہ خیال غلط ثابت ہوتا ہے حویلیاں سے آگے سڑک عمیق چڑھائی اور گہرے کھڈوں سے لگاتار دوچار ہوتی ہے اور پانچ چھ میل طے کر لینے کے بعد چیڑ کے درختوں اور پُرکیف خنکی میں آن پہنچتی ہے۔

ایبٹ آباد کی بلندی چار سوا چار ہزار فٹ سے زیادہ نہیں۔ مگر اس کا درجہ حرارت جون اور جولائی کے مہینوں میں بھی اس حد تک اعتدال پر رہتا ہے کہ رات کو کبھی باہر سونے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ یہ وادی خاصی فراخ اور ہموار ہے۔ شہر سے لے کر پاکستان ریلوے پبلک سکول تک پانچ میل کا فاصلہ ہے۔ یہ سڑک جس کے دونوں کناروں پر مرمریں رنگ کے سرو سر اٹھائے کھڑے ہیں۔ ہاتھ کی ہتھیلی کی طرح ہموار ہے۔ ریلوے سکول سے آگے سڑک پھر بلندیوں اور پستیوں میں سے گذرنے لگتی ہے۔ وادی کے اردگرد کے پہاڑ بہت اونچے نہیں ان میں سے دو ایک پر چیل کے درخت سر اٹھائے دکھائی دیتے ہیں اور باقی سبزے کی چادر سے ڈھکے ہیں۔

آزادی کی آمد کے بعد سے ایبٹ آباد کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے۔ پہلے یہ صرف ایک مختصر سا پہاڑی مقام تھا جہاں سابق صوبہ سرحد کے گورے حاکم اور بعض امرا گرمیاں گذارنے چلے آتے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد اس جگہ ملٹری اکاڈمی یعنی فوجی افسروں کی تربیت گاہ قائم ہوئی اب اس جگہ مغربی پاکستان کا ذیلی صدر مقام بھی قائم کیا جا رہا ہے۔ اس بڑھتی ہوئی اہمیت کے پیش نظر ایبٹ آباد میں کئی اور ادارے بھی قائم ہو رہے ہیں۔ ادھر وادی کاغان کے کھل جانے سے ایبٹ آباد اس وادی کی پیداوار کے لیے قدرتی منڈی بن رہا ہے۔ یہ تمام باتیں اس دل کش پہاڑی مقام کی اہمیت کو تیزی سے بڑھا رہی ہیں۔

ریلوے پبلک سکول

پاکستان ریلویز پبلک سکول کا بورڈنگ ہاؤس ہماری قیام گاہ تھا اور سکول کی عمارت میں دن کے وقت تعلیمی مذاکرات ہوتے تھے۔ اس سکول کو قائم ہوئے ابھی دو سال ہوئے ہیں۔ یہ ادا

غرض سے قائم کیا گیا ہے کہ ریلوے ملازمین کے بچوں کو عمدہ فضا اور اُجلے ماحول میں تعلیم دی جائے تاکہ آگے چل کر یہ بچے ریلوے کو اچھے افسر مہیا کریں۔ یہ مدرسہ ایک ہائی اسکول ہے۔ جس کی ہر جماعت دو فریق رکھتی ہے۔ ہر فریق میں طلبہ کی تعداد پچیس مقرر ہے اور اس تعداد کا سختی سے لحاظ رکھا جاتا ہے۔ مدرسے کے تمام استاد کم از کم ایم اے۔ بی۔ ٹی ہیں۔ انھیں کالجوں کے لیکچرار کا گریڈ دیا گیا ہے اور رہنے کے لیے نہایت عمدہ مکانات مفت مہیا کیے گئے ہیں۔ یہ سارا اہتمام اس لیے ہوا ہے کہ استاد پوری دل جمعی کے ساتھ سارا وقت بچوں کی تعلیم و تربیت پر صرف کریں۔

سکول کی عمارت بالکل نئی وضع کی اور نہایت فراخ ہے۔ اس کے ساتھ کھیل کے میدان بھی موجود ہیں۔ اس طرح بورڈنگ ہاؤس کی عمارت بھی جدید سہولتوں سے پوری طرح لیس ہے باورچی خانے کے ساتھ ایک وسیع کھانے کا ہال ملحق ہے اور اس کے سامنے ایک اور ہال اندرونی کھیلوں کے لیے مخصوص ہے۔

مدرسے اور دارالاقامہ کی ساری سہولتوں کو دیکھ کر یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ یہاں فی طالب علم کس قدر خرچ اٹھتا ہوگا۔ ریلوے سکول سے دو میل کے فاصلہ پر برن ہال نامی ایک کلیسائی سکول قائم ہے جو ہر طالب علم سے پونے دو سو روپے ماہوار وصول کرتا ہے۔ ریلوے سکول کی فضا برن ہال سے یقیناً زیادہ اُجلی اور زیادہ کشادہ ہے۔ لہٰذا یہاں فی طالب علم خرچ برن ہال سے بھی زیادہ آنا چاہیے۔ مگر یہ خرچ طلبہ کے والدین کی جیبوں کی بجائے زیادہ تر ریلوے کے خزانے سے نکلتا ہے۔ اگرچہ ریلوے سکول میں داخلہ صرف ریلوے ملازمین کے بچوں ہی کو مل سکتا ہے، مگر اس کے لیے ریلوے ملازم کا کسی خاص درجے سے تعلق رکھنا ضروری نہیں۔ ریلوے کا چھوٹے سے چھوٹا ملازم بھی اس سکول میں بچہ داخل کرانے کا وہی حق رکھتا ہے جو ریلوے کے بڑے سے بڑے افسر کے بیٹے کو حاصل ہے۔ داخلہ مقابلے کے امتحان سے ہوتا ہے۔ جو بچہ اس امتحان میں سے نکل جائے اسے داخل کر لیا جاتا ہے۔ جس ریلوے ملازم کی تنخواہ سو روپے ماہوار تک ہو اس کے بچے کی پڑھائی اور رہائش کے لیے اس کی تنخواہ میں سے صرف پانچ روپے ماہوار وضع کیے جاتے ہیں۔

اسی طرح سو روپے سے زیادہ تنخواہ پانے والوں کے لیے بھی فیس کی ایک واجبی سی شرح مقرر ہے
اصل اخراجات کے تک بھگ صرف ان ریلوے افسروں کو ادا کرنا پڑتا ہے جن کی تنخواہ بہت زیادہ ہے
غرض پاکستان ریلویز پبلک سکول نہایت پُر فضا اور صحت بخش نواح میں قائم ہے۔ وہ ریلوے
ملازموں کے ذہین بچوں کو اس بات کا موقع پیش کرتا ہے کہ اپنی خداداد صلاحیتوں کو بہترین تعلیمی
ماحول میں ترقی دیں۔ یہ مدرسہ اس زمانے میں قائم کیا گیا تھا جب سردار بہادر خاں مرکزی کابینہ میں
وزیر مواصلات تھے۔ سردار صاحب موصوف کی کوٹھی سکول کے بالمقابل سڑک کے اس پار ایک پہاڑ
کی چوٹی پر قدم جمائے نظر آتی ہے۔ اس کے بالکل برابر ریلوے سکول کے پرنسپل کی کوٹھی ہے۔ یہ ساری
عمارتیں ایک ساتھ بنی ہیں۔

کھٹملوں کا حملہ

ریلوے پبلک سکول کی نئی نویلی عمارت۔ اس کا اجلا ماحول اور اس کے پُر فضا نواحات دن کی تپانے
میں شریک ہونے والوں کے دلوں کو موہ لینے کے لیے کافی تھے۔ ہر شخص فطرت کے نکھرے ہوئے حسن
ضلع ہزارہ کی معتدل ہوا، اور ریلوے سکول کی جدید وضع کی عمارت کی تعریف کرتا سنائی دیتا تھا میدانوں
کی گرمی اور پسینے کے بعد یہ نیا ماحول قدرتی طور پر دلوں میں کئی گنا تاثیر پیدا کر رہا تھا۔ یہ بات کسی کے وہم و گمان
میں بھی نہ تھی کہ چند گھنٹے بعد رات کی سیاہی چھا جانے پر سکون و مسرت کی اس موج میں ایک تکدر بھی
پیدا ہونے والا ہے۔

سفر کی تکان کے باعث سب لوگ رات کو جلد ہی چادریں تان کر سو گئے۔ کوئی آدھی رات
گذری ہو گی کہ کھٹا کھٹ کی آواز نے مجھے یک دم جگا دیا۔ دیکھا کہ پاس سونے والے صاحب
چارپائی کو ایک لکڑی سے جھاڑ رہے ہیں اور جھنجھلا کر اس کے پایوں کو فرش پر پٹخ رہے ہیں۔ اس کے
ساتھ ہی وہ بار بار کھٹملوں کو کوس رہے تھے۔ چارپائی کی جھاڑ پٹخ سے فارغ ہوئے تو انھوں نے
بستر کی ایک ایک چیز کو جھاڑنا ٹٹولنا شروع کیا۔ میں نے بہتیری کوشش کی کہ اس ہاؤ ہو کو سنا ان سنا
کر کے آنکھیں بند رکھوں اور پھر سے نیند میں کھو جاؤں۔ مگر ان صاحب کی چیخ و پکار کچھ ایسی شدت سے

جاری تھی کہ دماغ میں سکون کا پیدا ہونا آسان نہ تھا۔ خیر خدا خدا کر کے میری آنکھ دوبارہ لگنے کو تھی کہ ان صاحب نے اپنے بستر کی طرف سے خاطر جمع کر کے میری طرف توجہ فرمائی اور چلا کر بولے "اٹھا! آپ کے بستر پر بھی تو کچھ کم کھٹمل نہیں ہیں۔ یہ دیکھو کس طرح بھاگے پھرتے ہیں۔ اٹھو اپنا بستر جھاڑو۔"

نیند کی منڈاس میں مجھے ان کا یہ تلخ انتباہ اچھا معلوم نہ ہوا۔ اس خیال سے کہ یہ انتباہ معاملہ ختم کر دے گا میں نام بخود رہا۔ مگر میرے دوست کے دل میں کھٹملوں کے خلاف اتنا غصہ بھرا تھا کہ وہ اس طرح چپ نہ ہوئے بلکہ پہلے سے زیادہ چلا کر بولے۔ "عجیب آدمی ہو کہ کھٹمل خون چوس رہے ہیں اور تم ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ ذرا آنکھ کھول کر دیکھو تو سہی کہ بستر پر کھٹملوں نے کیسے میلہ لگا رکھا ہے۔ میں نے بات کو ٹالنے کے لیے کہا۔ "اس آگاہی کے لیے شکریہ۔ جو کھٹمل آپ کو نظر آتے ہیں انھیں مار دیجیے اگر نہیں تو بجلی گل کر دیجیے اور مجھے میرے حال پر چھوڑ دیجیے"۔

مگر یہ صاحب ایسی آسانی سے کھٹملوں کا پیچھا چھوڑنے والے نہیں تھے۔ انھوں نے مجھے جھنجوڑ کر جگا بیٹھایا اور بولے:۔ "جب بستر پر کھٹمل چیونٹیوں کی طرح چل رہے ہوں نیند بھلا کیسے آئے گی؟ ان موذیوں کو ختم کرو اور چین سے سوؤ۔" اب میں نے جو بستر پر نگاہ ڈالی تو دیکھا کہ وہ صاحب بجا فرماتے تھے۔ بستر پوش، تکیے، چادر غرض جدھر دیکھتا تھا کھٹملوں کو دوڑتے پاتا تھا۔ چناں چہ جی کڑا کر کے اٹھا اور ایک ایک چیز کو جھاڑ پٹخ کر کھٹملوں کا صفایا کیا۔ اس طرح کوئی دس پندرہ منٹ کے شب خون کے بعد میں دوبارہ بستر پر لیٹ گیا۔

صبح ہوئی تو ہر جگہ کھٹملوں کا چرچا تھا۔ بہتوں نے رات جاگ کر گذاری تھی۔ بعض میرے جیسے ایسے بھی تھے کہ انھیں رات بھر کسی چیز کی خبر نہ ہونے پائی تھی۔ مگر اکثریت کو اس موذی دشمن نے بڑا تنگ کیا تھا۔ سب سے زیادہ شکایت مسٹر شینکی اور ان کے امریکی ساتھیوں کو تھی۔ ان کا بیان تھا کہ بتی گل کرنے کی دیر تھی کہ کھٹملوں کی فوج نے چاروں طرف سے دھاوا بول دیا۔ بجلی روشن کر کے دیکھا کہ چارپائی کے ہر سوراخ سے دشمن کی فوج موج در موج بڑھی آرہی ہے۔ اس کے

بہت سے دستے فرش اور دیواروں پر گشت کر رہے تھے۔ امریکنوں نے جوابی حملے میں ڈی ڈی ٹی کا ہتھیار استعمال کیا۔ اس سے دشمن کے حملے کی شدت رک گئی لیکن جب یہ لوگ دوبارہ چارپائیوں پر بیٹھے تو کھٹملوں کی جماعت بردار فوج چھت سے نیچے اترنے لگی۔ غرض مسٹر شینکی اور ان کے امریکی ساتھیوں نے ساری رات کھٹملوں سے جنگ لڑتے گذاری۔

اگلے دن کام سے فارغ ہو کر ہر ایک نے کھٹملوں کا صفایا کرنے کی مہم میں بھرپور حصہ لیا۔ بستروں کو دھوپ میں ڈالا گیا۔ چارپائیوں پر ڈی، اڈی، ٹی کی موٹی تہ جمائی گئی پایوں کے سوراخوں میں کھولتا ہوا پانی ڈالا گیا۔ ان تدبیروں سے کھٹملوں کا زور ٹوٹ گیا۔ مگر پھر بھی اکا دکا حملے آخری دن تک جاری رہے۔ تاہم لوگ ان معمولی جھڑپوں کے بہت جلد عادی ہو گئے اور پھر کبھی پہلی رات کا سا معرکہ جدال و قتال دیکھنے میں نہیں آیا۔ بایں ہمہ تمام لوگوں کو اس بات پر تعجب تھا کہ ریلوے سکول والے اپنے سارے وسائل اور جدید سائنسی ہتھیاروں کے باوجود اب تک کھٹملوں پر قابو نہیں پا سکے۔ برن ہال کے کلیسائی سکول میں دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ لوگ کھٹملوں پر پوری طرح قابو پا چکے ہیں۔ تعطیلات کے بعد جب لڑکے گھروں سے واپس آتے ہیں تو ان میں سے بعض اپنے ساتھ کھٹملوں کے بیج بھی لیے آتے ہیں مگر مدرسے والے اس کے فوراً بعد تمام چارپائیوں کو مٹی کے تیل میں ڈبو دیتے ہیں جس سے کھٹملوں کا خطرہ جڑ سے اکھڑ جاتا ہے۔

شہدائے بالاکوٹ

ہندی مسلمانوں نے آزادی حاصل کرنے کے لیے ایک صدی تک جو جنگ لڑی ضلع ہزارہ میں اس کے بعض مشہور ترین معرکے لڑے گئے۔ اس زمانے میں موجودہ پاکستانی سرزمین ماسوائے سندھ سکھوں کے ہاتھ میں تھی۔ سکھ درندوں کے ہاتھوں مسلمانوں کی جان و آبرو محفوظ نہ تھی۔ ان دنوں شاہ ولی اللہؒ کے پوتے اور شاہ عبدالغنی کے بیٹے شاہ اسمٰعیلؒ تحریک آزادی کے علمبرداروں میں سے تھے۔ ان کو سکھوں کے مظالم کی خبریں پہنچیں تو وہ اور ان کے

پیرومرشد سید احمد بریلوی سکھوں کے خلاف جہاد کرنے نکل کھڑے ہوئے۔ ان کے جھنڈے تلے مجاہدوں کی ایک جماعت تھی جو ہندوستان کے طول و عرض سے جمع ہوئی تھی۔ یہ لوگ اپنی جانیں ہتھیلیوں پر رکھ کر دہلی سے چلے اور سندھ کے راستے قبائلی علاقے میں داخل ہو گئے۔

شاہ اسمٰعیل کو پٹھانوں سے جو امیدیں تھیں وہ پوری نہ ہوئیں۔ تاہم انھوں نے سکھوں کے خلاف جہاد جاری رکھا۔ مجاہدوں کی مٹھی بھر جماعت جب سکھ ٹڈی دل کے ساتھ جم کر لڑنے کے قابل نہ رہی تو شاہ صاحب نے چھاپے مارنے کا طریق اختیار کیا۔ ۱۸۳۱ء میں وہ ایک روز بالاکوٹ کے قریب ایک پہاڑی کے دامن میں پناہ لیے ہوئے تھے کہ کسی مقامی آدمی نے یہ خبر سکھوں کو پہنچا دی۔ چناں چہ سکھ فوج پہاڑی کو عبور کر کے بالاکوٹ آن پہنچی۔ سید احمدؒ بریلوی اور شاہ اسمٰعیلؒ نے مجاہدوں کی مٹھی بھر جماعت کے ساتھ مردانہ وار مقابلہ کیا اور دونوں جام شہادت پی کر دنیا و آخرت میں سرخرو ہوئے۔ بالاکوٹ کے یہ دونوں شہید بالاکوٹ میں ہی ابدی نیند سوئے پڑے ہیں۔

سید احمدؒ بریلوی کا مزار دریائے کنہار کے بالکل کنارے واقع ہے اور شاہ اسمٰعیلؒ کا مزار اس جگہ سے کوئی میل سوا میل شمال کو ایک کھڈ کے کنارے واقع ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ سید احمدؒ بریلوی کا جسم بالاکوٹ میں مدفون ہے۔ مگر ان کا سر بالاکوٹ سے گیارہ میل نیچے گڑھی حبیب اللہ میں دفن کیا گیا ہے۔ مقامی روایات اس کہانی کی تائید کرتی ہیں۔ سید احمد بریلوی کا مزار بالاکوٹ میں لب دریا موجود ہے۔ لوح تربت جو کسی صاحب دل بزرگ نے حال ہی میں نصب کرائی ہے سید صاحب کی تاریخ شہادت کا ذکر کرتی ہے۔ مگر گڑھی حبیب اللہ میں بھی لب دریا ایک مزار موجود ہے جس کے متعلق مشہور ہے کہ یہاں سید صاحب کا سر مدفون ہے۔ لوگ ان دونوں مزاروں پر خراج عقیدت ادا کرنے آتے ہیں۔

مقامی روایات اس واقعہ کی شرح یوں بیان کرتی ہیں کہ شہید ہو جانے کے بعد سکھوں نے سید صاحب کا سر کاٹ کر دریائے کنہار میں پھینک دیا تھا۔ گڑھی حبیب اللہ کے لوگوں نے یہ سر

پکڑ لیا اور دریا کے کنارے دفن کر دیا۔ مگر سید صاحب کا جسم بالاکوٹ میں ہی دفن ہوا۔
ایبٹ آباد سے گڑھی حبیب اللہ ۵۰ میل دور ہے اور بالاکوٹ اس سے ۱۱ میل آگے
۱۴ جولائی کی صبح کو درگشائی کے تمام افراد ان دونوں تاریخی مقاموں کو دیکھنے کے لیے روانہ ہوئے
ایبٹ آباد کی وادی ریلوے سکول پر ختم ہو جاتی ہے۔ اس سے آگے سڑک دوسری چھوٹی چھوٹی وادیوں
میں سے چکر لگاتی ہوئی مانسہرہ پہنچتی ہے جو ریلوے سکول سے صرف دس میل دور ہے۔ مانسہرہ
کی بلندی صرف تین ہزار فٹ ہے مگر ہوا کے اعتدال کے لحاظ سے یہ ایبٹ سے بہت پیچھے نہیں
مانسہرہ ایک اچھا بارونق قصبہ ہے اور اس کے پاس ہی اشوک کے زمانے کے کچھ تاریخی آثار
موجود ہیں۔

مانسہرہ سے آگے پھر بلندی شروع ہو جاتی ہے۔ پہاڑوں پر چیل کے جنگل نظر آنے لگتے ہیں حتیٰ
کہ سڑک بلندی پر چڑھتے چڑھتے بٹراسی کے مقام پر پہنچ جاتی ہے۔ اس پہاڑ کی عین چوٹی پہ
چیلوں کے جنگل میں محکمہ جنگلات کا آرام گھر واقع ہے۔ ہماری بسیں اس مقام پہ پہنچیں تو تھوڑی
دیر کے لیے سستانے کو رک گئیں۔ تمام لوگ بسوں سے نیچے اتر آئے اور چیلوں کے سائے میں ایک
محفل قائم ہو گئی اور تھوڑی دیر کے لیے شیخ معز الدین صاحب کی ستار کے نغموں نے اس پرسکون
فضا میں ایک پرکیف حرکت پیدا کر دی۔

بٹراسی سے آگے سڑک نیچے ہی نیچے اترنے لگتی ہے اور کئی میل تک نیچے گرنے کے بعد
بالآخر ایک وادی میں پہنچ جاتی ہے۔ یہ دریائے کنہار کی وادی ہے۔ سڑک سے ڈیڑھ میل ہٹ کر
دریا کے اس پار گڑھی حبیب اللہ واقع ہے۔ اس مقام سے تھوڑی دور آگے چل کر سڑک بالکل دریائے
کنہار کے کنارے کنارے چلنے لگتی ہے۔ حتیٰ کہ بالاکوٹ کا تاریخی مقام آ جاتا ہے۔

قرآن حکیم نے شہیدوں کو ابدی زندگی کی بشارت یوں دی ہے :-
"جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہو جائیں انھیں مردہ نہ کہو وہ تو زندہ ہیں مگر تم اس نکتے کو
نہیں سمجھتے۔"

اس آئیہ کریمہ کو بیسوں مرتبہ پڑھا اور سنا تھا۔ مگر اس کا صحیح مفہوم پہلی بار اس وقت کھلا جب شہدائے بالاکوٹ کے مزاروں کو دیکھا۔ میں نے برصغیر پاک و ہند میں مدفون بزرگوں میں سے اکثر کے مزاروں کی زیارت کی ہے۔ ان میں سے بعض پر بڑے بڑے عالی شان مقبرے تعمیر ہیں۔ ان مزاروں پر حاضر ہونے سے دل پر ایک خاص حالت طاری ہو جاتی ہے مگر جو جدا گانہ کیفیت سید احمدؒ بریلوی اور شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کے مزاروں نے پیدا کی وہ اپنی مثال آپ تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ ان کی روحیں ہر آنے والے کے قلب و دماغ میں زندگی کا ایک ایسا کیف آور ٹیکہ لگاتی ہیں جو یکدم اسے زندگی کے ابدی معانی سے آگاہ کر دیتا ہے۔ اسے حق الیقین ہو جاتا ہے کہ جس زندگی کے لیے میں اپنا سب کچھ نچھاور کر رہا ہوں وہ فی الحقیقت موت ہے۔ اصل زندگی وہ ہے جو اللہ کی راہ میں جان لٹا کر خرید ی جائے۔

سید احمدؒ بریلوی کا مزار دریائے کنہار کے کنارے سرسبز درختوں کے ایک جھنڈ میں واقع ہے۔ پاس ہی لب دریا جامع مسجد واقع ہے۔ دریا کا پانی بپھرتا اور شور مچاتا، مزار کو چھوتا ہوا گذرتا ہے۔ عین اسی جگہ دریا پر پل بنا ہوا ہے جس پر سے گذر کر وادی کاغان میں قدم رکھا جاتا ہے۔ پرانے پل پر سے صرف جیپ گاڑیاں گذر سکتی تھیں۔ مگر اب اس کے بالکل قریب دریا پر ایک نیا پل بنا ہے جس پر سے موٹریں اور لاریاں گذر سکیں گی۔ اس پل کا افتتاح گذشتہ جون میں صدر پاکستان محمد ایوب خاں نے کیا تھا۔

شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کے مزار تک پہنچنے کے لیے کوئی میل سوا میل تک پیدل چلنا پڑتا ہے یہ ایک پگ ڈنڈی سی ہے جو خاصی بڑی ہے۔ شاہ صاحب کا مزار کھڈ کے اُس پار اس کے اونچے کنارے پر واقع ہے۔ کھڈ کو عبور کرنے کا کوئی معقول انتظام نہیں۔ پتھروں اور پانی میں سے گذرے بغیر چارہ نہیں۔ مزار کے گرد چار دیواری کھینچ دی گئی ہے۔ مگر اس کے اندر کوئی درخت نہیں مگر اس کس مپرسی کے عالم میں بھی یہ مزار زندگی کا ایک ابلتا ہوا سرچشمہ ہے۔ صاحب نظر لوگ کھچے کھچے چلے آتے ہیں اور کیف و وجدان سے سرشار ہو کر واپس جاتے ہیں۔ اب جب کہ ملک میں ایک

حقیقی قومی حکومت قائم ہو چکی ہے۔ یہ توقع بے جا نہ ہو گی کہ شاہ اسمٰعیل شہید کے مزار کی مناسب تعمیر کی جائے اور اسے ایک اچھی سڑک کے ذریعے بالاکوٹ سے ملا دیا جائے۔

وادی کاغان کا دروازہ

بالاکوٹ کاغان کی حسین وادی کا دروازہ ہے۔ یہ وادی ان خوب صورت وادیوں میں سے ایک ہے جو ہمالیہ کی شاخوں کے درمیان پیدا ہو گئی ہیں۔ یہ وادی دریائے کنہار نے کاٹی ہے۔ مگر اس کے چٹانی کنارے اس قدر عمیق ہیں کہ برطانوی دور میں دریائے کنہار کے کنارے کوئی سڑک نہ بنائی جا سکی۔ کاغان میں آنے جانے کے لیے دشوار گزار پہاڑی راستوں سے ہی کام لیا جاتا تھا۔ مگر پاکستان کے قائم ہونے اور کشمیر کے بھارتی ہاتھوں میں چلے جانے سے وادی کاغان کی اہمیت بہت بڑھ گئی۔ کیوں کہ گلگت کو اب کاغان کے ذریعے ہی پاکستان سے ملایا جا سکتا تھا۔

قیام پاکستان کے جلد بعد ہمارے فوجی انجینیروں نے دریائے کنہار کے چٹانی پہلو کو کاٹ کر ایک سڑک بنائی۔ اس سڑک نے جو دریائے کنہار کے ساتھ ساتھ چلتی ہے، کاغان کو پہلی بار زندگی کی گہما گہمی کے ساتھ مربوط کیا۔ لوگ سیاحت کی غرض سے وادی کاغان میں جانے لگے۔ مگر اس سڑک پر صرف جیب گاڑیاں چل سکتی ہیں۔ بالاکوٹ سے پل عبور کر کے اس سڑک پر سفر کریں تو نیچے نگاہ ڈالنے سے سر چکرانے لگتا ہے۔ کیوں کہ سڑک کے کنارے اور دریا کے درمیان کوئی ایک ہزار فٹ کا فاصلہ ہے اور دونوں کے درمیان کوئی اور چیز حائل نظر نہیں آتی۔ بالاکوٹ سے آگے سڑک ہر قدم پر اونچی ہی اونچی ہوتی چلی جاتی ہے۔ اس سڑک پر کوئی اٹھارہ میل طے کر لینے کے بعد کوائی کا مقام آتا ہے۔ یہاں سے صرف چار میل کے فاصلہ پر شوگراں کا مقام کوئی آٹھ ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ کوائی سے شوگراں جانے کے لیے عمیق راستے پر سے گذرنا پڑتا ہے۔ ڈھلوان کے عمودی زاویے کا اندازہ صرف اس بات سے ہو سکتا ہے کہ چڑھنے والے کو صرف چار میل کے فاصلے میں کوئی چار ساڑھے چار ہزار فٹ بلندی طے کرنی پڑتی ہے۔ لیکن اس صبر آزما چڑھائی کے بعد شوگراں کی بلندی پر کھڑے ہو کر اِدھر اُدھر نظر دوڑانے سے فطرت کا جو چمکیلا حسن دکھائی دیتا ہے وہ

نگاہ میں کچا چوند پیدا کر دیتا ہے۔ برفانی چوٹیاں سبز جنگلوں سے ڈھکی ہوئی ڈھلوانیں اور گہری وادیاں نورانی حسن کا ایک ایسا مرقع پیش کرتی ہیں جس کی مثال بہت کم ملتی ہے۔

ہمارے فوجی انجینئر اب کاغان میں آنے جانے کے لیے ایک اور سڑک تیار کر رہے ہیں۔ یہ سڑک پہلی سڑک سے بہت نیچے دریائے کنہار کے کنارے کنارے کھودی جا رہی ہے۔ یہ زیادہ کشادہ سڑک ہے جس پر لاریاں اور بسیں بھی سفر کر سکیں گی۔ یہ سڑک کاغان کی تجارت کھولنے کے علاوہ گلگت کو بھی باقی ملک سے ملا دے گی۔ اس سڑک کے مکمل ہو جانے پر بالاکوٹ حقیقی معنوں میں وادی کاغان اور گلگت کا دروازہ بن جائے گا۔

ہم جس روز بالاکوٹ پہنچے جمعہ کا دن تھا۔ اکثر صاحبان نے دریا کے کنارے کے کنارے جامع مسجد میں جمعہ کی نماز ادا کی۔ نماز سے فارغ ہو کر مسجد سے متصل سید احمد بریلوی شہید کے مزار پر فاتحہ پڑھی گئی۔ پھر سب لوگ شاہ اسمٰعیل شہید کے مزار کی طرف چل دیے۔

یہاں سے واپس آ رہے تھے کہ ایک دوست نے ایک اہم نکتہ اٹھایا، وہ بولے اسلام دینِ حق اور دینِ فطرت ہے۔ وہ انسان کو خالص توحید کا سبق دیتا ہے اور اس کے قلب و ذہن کو انسانیت کی آخری بلندیوں تک پہنچا دیتا ہے، اس کے مقابلے میں سکھ قوم ایک نیم وحشی طالبہ حیات کی پیرو تھی۔ پھر کیا وجہ کہ یہ نیم وحشی قوم مسلمانوں پر غالب آ گئی اور ایک عرصے تک انھیں ناک چنے چبواتی رہی۔

اس کے جواب میں میں نے عرض کیا کہ بے شک اسلام انسان کو انسانیت کی انتہائی بلندیوں تک لے جانے کا ضامن ہے۔ مگر یہ اسی وقت ممکن ہے جب اسلام کا دعویٰ کرنے والے اسلام کے پیغام اور اس کی روح سے باخبر ہوں، ہندی مسلمانوں کی حالت یہ تھی کہ صدیوں تک قرآن حکیم کی عربی عبارت کو بلا سمجھے پڑھتے رہے۔ ان کی کج فہمی کا یہ عالم تھا کہ جب شاہ ولی اللہ نے پہلی بار قرآن حکیم کا ترجمہ فارسی زبان میں شائع کیا تو ان کے خلاف دہلی میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ اس صورتِ حال کا نتیجہ یہ تھا کہ قرآن کے الفاظ ہندی مسلمانوں کی زبانوں پر ضرور تھے مگر یہ لوگ قرآنی تعلیمات اور اسلام کی بے قرار انقلابی روح سے تقریباً ناآشنا تھے۔

اس کے برعکس سکھ قوم کو جنم دینے والے بابا نانک تھے جنھوں نے اسلامی توحید کا راگ پنجابی زبان میں گایا تھا۔ بابا نانک قرآن کے سرچشمہ حیات سے براہ راست فیض یاب تھے اور انھوں نے یہ فیض پنجابی زبان کے ذریعے پنجاب کے نیم وحشی جاٹوں، زمینداروں تک پہنچایا۔ خالص توحید کی اس لے نے ان نیم وحشی لوگوں کی روح میں ایک آگ سی لگا دی اور وہ یک دم وحشت اور گمنامی کی پستی سے کود کر حکومت اور اقتدار کی گدی پر جا بیٹھے۔ اسی بات نے انھیں نام کے مسلمانوں پر غلبہ عطا کیا۔

ورک شاپ کا اختتام

ورک شاپ کی میعاد ۹ جولائی سے ۱۳ جولائی تک مقرر کی گئی تھی۔ گیارہ جولائی کو جمعہ تھا جو تعطیل کا دن تھا، یہ فیصلہ پہلے سے ہو چکا تھا کہ تعطیل کا دن سیر و سیاحت کے لیے مخصوص رہے گا۔ چنانچہ ۱۳ جولائی کو شام کے چھ بجے ریلوے سکول کے ہال میں ایک مختصر سی تقریب منعقد ہوئی جس میں پیرزادہ ایم اے مخدومی نے شریک ہونے والے اساتذہ کو سندیں تقسیم کیں۔

اس موقع پر پیرزادہ ایم اے مخدومی کی اختتامی تقریر کے علاوہ پروفیسر تاج محمد خیال اور مسٹر شینکی نے بھی مختصر تقریریں کیں۔ پروفیسر خیال نے امید ظاہر کی کہ ہیڈ ماسٹر صاحبان نے جدید تعلیمی فکر تدریسی طریقوں اور اختلاقی تکنیکوں کے متعلق جو نئے زاویہ ہائے نگاہ اخذ کیے ہیں وہ مدرسوں میں جا کر ان سے عملی خدمت لیں گے۔ مسٹر شینکی نے اس امر پر اطمینان کا اظہار کیا کہ اساتذہ نے دو ہفتے تک مذاکرات کی تقریباً ساری ذمہ داری خود سنبھال کر یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ فکر انگیز مباحث میں حصہ لینے کی ایسی ہی صلاحیت رکھتے ہیں جیسے امریکہ یا کسی اور ملک کے اساتذہ۔

پیرزادہ ایم اے مخدومی نے حاضرین میں سے ہر ایک کا شکریہ ادا کیا۔ اور اساتذہ کو الوداع کہتے ہوئے اس نکتے پر زور دیا کہ درس و تدریس کی کامیابی کا انحصار ساز و سامان کی کامیابی پر نہیں بلکہ استاد کے جذبۂ عمل اور اس کی شخصیت پر ہے۔ مدرسے کی ساری فضا صدر معلم کے علم و عمل کی آئینہ داری کرتی ہے جس قسم کا صدر معلم ہوگا اسی قسم کی ذہنی فضا مدرسے میں رچی بسی نظر آئے گی۔ جو صدر معلم اپنے منصب سے آگاہ اور اپنا فرض پورا کرنے پر تلا ہوا ہو۔ وہ ناموافق حالات پر قابو پانے اور تعلیم کے حقیقی مقاصد حاصل کرنے پر قادر ہوتا ہے۔

تعلیم بطورِ تحریک

مسرت مرزا

ذیل کا مضمون جناب مسرت مرزا صاحب پرنسپل ملت ہائی سکول ملتان نے جون کے آغاز میں منٹگمری میں منعقد ہونے والی تعلیمی کانفرنس میں پڑھا تھا۔

(نائب مدیر)

اِنّی بُعِثْتُ مُعَلِّمًا (مجھے معلم بنا کر بھیجا گیا ہے) (حدیث)

کہا جاتا ہے کہ علم التعلیم ایک بہت قدیم اور پیچیدہ سائنس ہے۔ یہ نظریہ اپنی جگہ درست ہے۔ اس کے باوجود میں سمجھتا ہوں کہ علم التعلیم فطرت اور نفسیاتِ انسانی کے قریب تر ہے۔ کیوں کہ قرآن کی رو سے ہر انسان خدا کا شاگرد ہے "خلق الانسان وعلّمہ البیان" اور دوسری جگہ علم کی مقدار کو محدود کر کے فرمایا گیا ہے "وما اوتیتم من العلم الا قلیلا" (تمہیں بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے) یعنی تقاضائے کائنات کے مطابق جس قدر علم تمہیں باشعور زندگی بسر کرنے کے لیے ضروری ہے، وہ خدا نے بتا دیا ہے۔ یہ درست ہے کہ چوں کہ علم زندگی کی لامحدود وسعتوں پر حاوی ہے اسی لیے حیاتِ انسانی کے تغیرات کے ساتھ ساتھ علم کے اقدار اور اس کی حقیقت میں بھی تبدیلی رونما ہوتی رہتی ہے۔

زمانہ ماضی میں ہمارے بزرگوں نے تدریس و تعلیم کی جو قدریں متعین کی تھیں آج وہ مختلف صورتوں میں نظر آتی ہیں۔ لیکن اگر تخلیق آدم کا مقصد آج بھی وہی ہے جو صدیوں پہلے تھا تو ہمیں ماننا پڑے گا کہ تعلیم کی تحریک بھی اسی قوت سے اسی مقصد کے لیے چل رہی ہے۔ چناں چہ امام غزالی رحمتہ اللہ علیہ سے لے کر شاہ ولی اللہ دہلوی تک تمام بزرگ اسی تحریک کو لے کر چلے ہیں جو تعلیم کو زندگی کی حقیقت کے قریب کرنے والی اور انسان کو خدا کی بندگی سے روشناس کرنے والی ہے۔

پاکستان کا مقصد اگر قیام پاکستان کا مقصد اور داعیہ وہی ہے جو بار بار دہرایا جا چکا ہے، کہ

پاکستان مسلمانوں کے مذہب کلچر زبان اور ان کی تہذیب کی بقا اور ترقی کے لیے معرض وجود میں آیا ہے تو میں بلا تامل یہ کہوں گا کہ وہ تحریک تعلیم جو عہدِ زریں میں اپنے عروج کو پہنچی تھی آج ہمیں اس کی تجدید کرنی ہے اور اس میں نئی روح پھونکنا ہے تاکہ ہم جو افراد پیدا کریں وہ خدا شناس اور عصر حاضر کے فعال افراد ہوں تو دوسری طرف ملک کے صالح شہری بھی ہوں۔ ماہرین تعلیم کے اس اجتماع میں مجھے یہ بات دہرانے کی ضرورت نہیں ہے کہ پاکستان کی سب سے قیمتی متاع اس کی نئی پود ہے۔ ہم اپنے ملک کو مستقبل کی جن بلندیوں پر دیکھنا چاہتے ہیں ان تک پہنچنے والا نہ صرف ہی بچے اور نوجوان ہیں جو آج کل مدرسوں، کالجوں اور جامعات میں تعلیم پا رہے ہیں۔ ہم پاکستان کو نہ صرف طور پر مطمئن، معاشی طور پر خوش حال، سیاسی لحاظ سے مضبوط، سائنس اور ٹیکنالوجی کی دوڑ میں دوسروں کے برابر ہو جائیں۔

صحیح قسم کی تعلیم | ہم سب کو معلوم ہے کہ پچھلے گیارہ سال سے تعلیم کی مانگ بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ اگر محض پڑھے لکھے لوگوں کی گنتی بڑھ جانے سے ہماری تعلیمی اور اخلاقی حالت سدھر سکتی ہے تو آج ہم ۱۹۴۸ء کے مقابلہ میں کہیں زیادہ اور بہتر حالت میں ہوتے مگر نتائج اس کے برعکس تسلی بخش نہیں ہیں۔ یہ ہزاروں بچے جو ہر سال میٹرک کے سند یافتہ بن کر نکلتے ہیں کیا معاشرہ میں کوئی نیا کردار اور سوسائٹی میں کوئی قابلِ تحسین فرض ادا کرتے ہیں؟ اس کا جواب صریحاً نفی میں ہے۔

موجودہ دور میں آبرومندانہ زندگی بسر کرنے کے لیے سخت جدوجہد اور شدید مزاحمتوں کو برداشت کرنے کی ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور کے ہمہ گیر تقاضے پورے کرنے کے لیے دنیا کی ترقی یافتہ قوموں نے پچھلے دس سال میں اپنے نظام ہائے تعلیم میں انقلابی تبدیلیاں کی ہیں۔ امریکہ اور روس جیسا ملک بھی اس بات پر مجبور ہوا ہے کہ اپنے فوقانی مدارس کے نصاب میں بنیادی تبدیلی کر دے۔

مشکل کا حل | اپنے تعلیمی مسائل کا حل تلاش کرتے وقت ہمیں دوسرے ملکوں کی تاریخ پر نگاہ ڈالنی چاہیے۔ زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ دنیا کے دوسرے ملکوں میں بھی نصابِ تعلیم اسی طرح علمی قسم کا اور زندگی سے بیگانہ تھا جس طرح ہمارا نصاب ہے لیکن جب ان ملکوں کو اپنی تعلیمی کمی کا احساس ہوا تو وہاں اصلاحِ تعلیم کے لئے بڑی تحریکیں چل نکلیں۔ بالآخر تعلیم اور زندگی کے بُعد کو ختم کرکے ان دونوں کے

عناروں کو باہم ملا دیا۔

لیکن یہ تعلیمی کارنامہ ممکن کیسے بنا ؟ کیا ان ملکوں کی حکومتوں نے اصلاح تعلیم کے لیے کوئی قوانین وضع کیے جو بہ جبر نافذ کیے گئے ؟ نہیں! ایسا ہرگز نہیں ہوا۔ البتہ یہ درست ہے کہ ان ملکوں کے قانون ساز ادارے بھی اصلاح تعلیم کی تحریک میں حصہ لیا۔ مگر یہ اس وقت ہوا جبکہ یہ تحریکیں زور پکڑ گئیں۔ اور رائے عامہ نے حکومت کو مجبور کیا کہ وہ بھی اصلاحِ تعلیم میں اپنا کردار ادا کرے۔ تاریخ شاہد ہے کہ اصلاحی تحریک کا آغاز کبھی بھی حکومت کی طرف سے نہیں ہوا۔ مثلاً ریاست ہائے متحدہ میں اصلاح تحریک کا آغاز کرنیوالے رزمل پارکر تھے جو پہلی عالمی جنگ میں حصہ لے چکے تھے۔ جنگ سے واپسی پر انہیں اس امر کا شدید احساس ہوا کہ جمہوری اقدار کو محفوظ کرنے کے لیے امریکہ نے جس خون ریز جنگ میں حصہ لیا ہے اس کا فائدہ خود امریکہ کی نئی نسل کو بھی پہنچنا چاہیے اگر مدرسوں میں بدستور جبر و اکراہ اور تحکم کی حکم رانی رہے تو یہ خیال کرنا خود فریبی ہے کہ قیصر جرمنی کی شکست کے بعد جمہوریت دنیا میں محفوظ ہو گئی ہے۔ اس جمہوریت کے نصب العین کو سامنے رکھ کر انھوں نے ایک مدرسہ قائم کیا جہاں جبر و اکراہ کا مطلق گذر نہ تھا۔ بچوں کو حقیقی معنوں میں انسان سمجھا جاتا تھا۔ اس مدرسے نے حوصلہ افزا نتائج دکھلائے، ان کی وجہ سے تعلیمی حلقوں میں ہلچل پیدا ہو گئی ملک کے مختلف حصوں سے لوگ یہ مدرسہ دیکھنے آئے اور عام حالتوں میں بہت متاثر ہو کر گئے۔ واپسی پر انھوں نے اپنے اپنے دائرہ اثر میں نئے تعلیمی طریقوں کی تبلیغ کی۔ اس طرح بہت تھوڑے عرصے میں نئی تحریک تعلیم چل نکلی جس نے بالآخر امریکہ کے علاوہ پہلے یورپ اور پھر ساری دنیا کو بھی متاثر کیا۔

اگر ہم بھی دل سے چاہتے ہیں کہ ہماری تعلیم میں کوئی خوش گوار انقلاب نظر آئے تو اس کے لیے ہمیں تعلیمی اصلاح کی ایک تحریک چلانی چاہیے۔ تعلیمات کی پوری تاریخ اس پر شاہد ہے کہ جب تک ہم تعلیم کے سوء تصور کو خیرباد نہیں کہیں گے اور تعلیم کو بطور تحریک نہیں اپنائیں گے ملک میں کوئی بنیادی انقلاب کی توقع بے سود ہے۔ لیکن اس حقیقت کے ساتھ یہ بات بھی ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ یہ تحریک حکومت نہیں بلکہ پرائیویٹ ادارے ہی چلا سکتے ہیں۔ حکومت کا فرض یہ ہے کہ وہ اس قسم تحریک کی

یدکرے اور اس کی حوصلہ افزائی کرے۔ مگر کام کا آغاز ہمارا فرض ہے۔ جو احباب سالہا سال سے اسکولوں
ں کام کرتے آئے ہیں۔ یہ ذمہ داری ان کی ہے کہ تعلیم کی خامیوں کا جائزہ لیں اور انھیں دور کرنیکا
اریج سوچ کر اس پر عمل پیرا ہوں۔ مجھے اس امر کا اعتراف ہے کہ موجودہ معاشرے میں یہ پتہ ماری کا
م کو نابہت مشکل ہے اور اس بات کی مشکلات حوصلہ پست کر دیتی ہیں۔ لیکن اس تاریک اور ظلمت آگین
تورات کے باوجود میرا یقین ہے بلکہ ایمان ہے کہ ان تاریکیوں سے ہی امید کی روشن کرن نمودار ہوگی
ورت اس امر کی ہے کہ ہم اپنی ذمہ داریوں کا احساس کریں اور جو تدابیر سوچیں اس پر عمل پیرا ہوں
شاء اللہ اس کے نتائج توقع سے بڑھ کر حوصلہ افزا ثابت ہوں گے۔ ہر تحریک کی کامیابی کی اصل وجہ
قوت ہوا کرتی ہے جو اس کی پشت پر کام کر رہی ہو۔ یہ قوت یقین اور خلوص کی ہوتی ہے۔ جو تنہا دلوں کو
اثر کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ امریکہ میں اگر اس تعلیمی تحریک کی پشت پناہی جمہوریت کر سکتی ہے،
پاکستان میں بھی ایک قوت اس کی پشت پناہ بن سکتی ہے وہ قوت اسلام ہے۔

<u>صب العین کیا ہو</u> یہاں ایک نکتہ کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ مغرب کے تعلیمی تجربے
ہ ان کے نتائج ہمارے سامنے ہیں، جدید طریقہ ہائے تدریس ان تجربوں اور علمی انکشافات کی ہی
پیداوار ہیں۔ جب اصلاح تعلیم کے لیے بنے بنائے نسخے موجود ہیں تو کیا محکمۂ تعلیم اور اعلیٰ تعلیمی افسر
نھیں نافذ نہیں کر سکتے؟ ہمیں تعلیمی تحریک چلانے کی کیا ضرورت ہے۔ اس قسم کا سوال اگر کسی کے ذہن میں
پیدا ہو تو ایک شدید غلط فہمی کا نتیجہ ہوگا۔ بے شک مغرب کی تعلیمی اصلاح جدید نفسیاتی حقائق اور علمی
کشافات پر مبنی ہے۔ مگر ان نفسیاتی اور علمی اصولوں کے خاکے میں جس زندگی کا رنگ بھرا گیا ہے وہ قدرتی
ور پر مغربی زندگی ہے۔ تعلیم کی حیثیت آخر الامر ایک آلۂ کار کی ہے اور بس! اسے زندگی کی خدمت
نجام دینا ہوتا ہے اور معاشرے کو اسی زندگی کے قالب میں ڈھالنا ہوتا ہے۔ جو اس کے نزدیک
ثالی زندگی ہو۔ ظاہر ہے کہ اس اعتبار سے ہمارا پیمانہ مغرب کے پیمانہ سے مختلف ہے۔ لہٰذا جدید
نفسیاتی حقائق اور علمی انکشافات سے باخبر ہو جانے کے بعد ہمارے لیے اگلا قدم یہ ہے کہ ان اصولوں کے
اکے میں خالص پاکستانی زندگی کا رنگ بھریں جیسا کہ میں نے ابتدائی سطور میں عرض کیا ہے۔

غیر سرکاری مدرسوں کا فرض تعلیم کی اصلاحی تحریک کو جنم دینے اور اس کے لیے کام کرنے کا فرض یوں تو ہر استاد پر عاید ہوتا ہے۔ مگر میرا خیال ہے کہ یہ ذمہ داری ان اصحاب پر زیادہ شدت کے ساتھ عاید ہوتی ہے جن کے ہاتھ میں خانگی مدارس کی باگ ڈور ہے۔ سرکاری مدارس اپنی تمام خوبیوں کے باوجود آزادئی عمل کے معاملے میں عموماً ایک خاص حد سے آگے نہیں جا سکتے۔ اس کے برعکس غیر سرکاری مدارس تجربے اور آزمائش کی راہ پر کافی دور تک لے جا سکتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ پاکستانی نظریۂ حیات اور جدید طریقہ ہائے تدریس کو یکجا کرنے کا کام پہلے پرائیویٹ مدارس میں شروع ہونا چاہیے۔ پاکستان ایک اسلامی مملکت ہے اور اس ملک میں جو آئین بھی نافذ ہوگا وہ بھی اسلامی قدروں کو ہی زندگی کی آخری منزل قرار دے گا تاہم جو تعلیمی ادارے اسی لیے وجود میں آئے ہیں کہ اسلامی طرز حیات کو رواج دیں ان کی یہ خصوصی ذمہ داری ہے کہ وہ اسلامی طرز زندگی اور جدید علم وفن کو یکجا کر کے دکھائیں۔ اپنی درس گاہوں میں موجودہ نصاب تعلیم کے ساتھ ساتھ اس قسم کی تعلیم کا منصوبہ بنائیں کہ بچے اسلامی طرز حیات سے مانوس اور اس کے خوگر بن جائیں۔ یہ مقام کس طرح حاصل ہو کیا تدابیر اختیار کی جائیں۔ ایسے افراد کہاں سے ملیں اس قسم کے بہت سے سوال ذہن میں پیدا ہوتے ہیں اور عام طور پر انسان ان کا خاطر خواہ جواب نہ پا کر مایوس ہو جاتا ہے اور کسی قسم کی گفتگو کو نظری بحث تصور کرتا ہے۔ میں پوری شدت سے محسوس کرتا ہوں کہ اس معاشرے میں یہ کام کیا جا سکتا ہے۔ ہجوم مشکلات کا احساس رکھتے ہوئے میں مایوسی کی کوئی بھی جھلک اپنے ذہن میں نہیں پاتا۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہ باتیں ایک طوفان نادیدہ کی حیثیت سے نہیں کہہ رہا ہوں۔ میری کشتی حیات بھی اس بحر مواج کے رحم وکرم پر منزلیں طے کر رہی ہے۔ نہیں معلوم یہ ساحل مراد تک کب پہنچے گی۔ مگر میں پُر امید ہوں۔ یاس وقنوطیت سے خوفزدہ نہیں ہوں۔ مجھے امید ہے کہ ہر خیال کسی نہ کسی خاتمے اور تجربے پر منتج ہوگا اگر زندگی نے مہلت دی تو انشاء اللہ اگلی اشاعت میں اس کا پورا نقشہ قارئین کے سامنے رکھوں گا۔

ے نظامِ تعلیم میں بنیادی نقص

د اقبال

حقیقت بڑی دیر سے کھل کر سامنے آ چکی ہے کہ ہمارے موجودہ نظامِ تعلیم میں گوناگوں نقائص ہیں، اس لیے
لیم ہمارے قومی تقاضوں کو پورا کرنے سے قاصر ہے۔ چناں چہ ہمیں اس نظامِ تعلیم کو بدلنا پڑے گا
ر نہایت تسلی بخش ہے کہ موجودہ قیادت جہاں قومی زندگی کے دوسرے شعبوں میں اصلاح کے
شروع کر چکی ہے۔ وہاں اس نے تعلیم کی طرف بھی پوری توجہ دی ہے۔

ل کے ماہرینِ تعلیم اور دوسرے سوجھ بوجھ رکھنے والے لوگ وقتاً فوقتاً نظامِ تعلیم کی کمزوریوں
بیوں کی نشاندہی کر چکے ہیں۔ عام طور پر جن خرابیوں کا ذکر کیا جاتا ہے وہ یہ ہیں کہ موجودہ نصاب
ا ہے تدریس کے طریقے قدامت پسندانہ اور ناقص ہیں۔ اساتذہ مالی پریشانیوں کا شکار رہے
خان روی ہے۔ سکولوں کا ماحول گندہ ہے وغیرہ وغیرہ۔ فی الحقیقت یہ ساری باتیں اور ایسی ہی
بگر خرابیاں ہمارے موجودہ نظامِ تعلیم میں مدتوں سے چلی آ رہی ہیں اور جب تک ان خرابیوں کا
ہیں کیا جائے گا اس وقت تک ایک صحت مند اور مفید مطلب نظامِ تعلیم کی داغ بیل ڈالنا ناممکن ہوگا
ن گروہ چند ایک خرابیوں کے علاوہ ایک بہت بڑی خرابی جو میرے نزدیک بنیادی خرابی کا درجہ
، وہ ہے، ناقص استاد۔ غالباً نظامِ تعلیم کی خامیوں کے موضوع کا یہ ایک پہلو ہے جس پر کم اعتنا
دی گئی۔ لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ پر اٹل ہے کہ نا اہل استاد نظامِ تعلیم کی خرابیوں کی جڑ ہے۔ اس کے
بلا وجہ استاد اچھے نظامِ تعلیم کا روحِ رواں۔

غور سے دیکھا جائے تو ساری تعلیمی سرگرمی (Educational Activity)
ر سے تشکیل پذیر ہوتی ہے (۱) شاگرد (۲) استاد (۳) کتاب اور (۴) مدرسہ کتاب سے عبارت
م اور مدرسے سے مراد تعلیمی ماحول اور وہ تمام ضروری ساز و سامان ہے جو عمل تدریس میں کام

آتا ہے۔ ان چار عناصر میں سے پہلے عنصر کے ساتھ ہمارا اس بحث میں تھوڑا سروکار ہے۔ آخری تین عناصر ہی ہماری بحث کے دائرے میں شامل ہیں۔ اب یہ ایک واضح حقیقت کہ استاد کو باقی دونوں تعلیمی عناصر پر فوقیت حاصل ہے۔ ہر چند کہ کتاب اور مدرسے کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن اس امر کو بھی نہیں جھٹلایا جا سکتا کہ استاد کو باقی دونوں پر امتیازی اہمیت حاصل ہے، کیوں کہ استاد کے بغیر کتاب اور سکول کی موجودگی میں تعلیم کا عمل رو بہ پذیر ہی نہیں ہو سکتا اس کے برعکس صرف استاد اور شاگرد کے موجود ہو جانے سے سلسلۂ تعلیم شروع ہو جاتا ہے۔ اور استاد اگر صحیح استاد ہو تو وہ اس سادہ تعلیم سے بھی خاطر خواہ نتائج دکھا سکتا ہے۔ لیکن بہترین کتاب اور عمدہ سکول کے ہوتے ہوئے ایک ناقص استاد دونوں چیزوں کی عمدگی اور بہتری پر پانی پھیر دینے کے لیے کافی ہے۔ اس بات پر میرا ایمان ہے کہ اچھا اور بہترین استاد، اعلیٰ تعلیم یافتہ پاکیزہ سیرت اور زندگی کے متعلق روشن نظریہ رکھنے والا استاد ہی اچھے نظامِ تعلیم کی بنیاد ہو سکتا ہے۔

یہ ایک دل سوز حقیقت ہے کہ موجودہ نظامِ تعلیم میں استاد کو بہت حد تک نظر انداز کر دیا گیا ہے حالاں کہ یہی وہ عنصر ہے جس پر نظامِ تعلیم کے اچھے بُرے ہونے کا انحصار بہت زیادہ ہے۔ اس لیے یہ پہلی توجہ کا متقاضی ہے۔ موجودہ اساتذہ میں اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جن کی بنیادی تعلیم بالکل کس حد تک تھوڑی کی ہے۔ وہ صرف مڈل اور میٹرک پاس ہوتے ہیں اور تدریس کا لائسنس حاصل کر لیتے ہیں۔ بعض لوگ پرائیویٹ طور پر کتابیں رٹ رٹا کر اعلیٰ تعلیم کا پروانہ لے لیتے ہیں۔ جب دوسرے شعبے انھیں قبول کرنے سے انکار کرتے ہیں تو وہ تعلیم ہی میں گھس آتے ہیں۔ اس صورتِ حال کو برداشت کیا جا سکتا تھا کیوں کہ ماضی میں حالات ہی کچھ ایسے تھے۔ مگر رونا تو اس بات کا ہے کہ لوگ استاد بن جانے کے بعد بھی اپنی پوزیشن کو نہیں پہنچانتے اور اُن اوصاف سے عاری رہتے ہیں جو کہ ایک استاد میں ہونے لازمی ہیں۔ ایک استاد کے لیے یہ بات بہت ضروری ہے کہ وہ کتابوں اور رسالوں، اخبارات اور ریڈیو، سیر و تفریح اور دیگر ذرائع سے اپنے علم میں اضافہ کرتا رہے۔ استاد اپنی بنیادی تعلیمی قابلیت کی کمی کو مطالعے کے ذریعے پورا کر سکتا ہے اور اعلیٰ تعلیم یافتہ بن سکتا ہے۔ لیکن اساتذہ میں مطالعے کا شوق بہت کم پایا گیا ہے۔ ایسے لوگوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے

دہ ہوگی جو اپنے آپ کو ایک کامل استاد اور اپنے فن کا ماہر بنانے کی غرض سے اچھی اچھی کتابوں کا مطالعہ کرتے رہتے ہوں۔ دراصل بات یہ ہے کہ آج کل کے حالات میں اساتذہ کے پاس فارغ وقت کو مطالعے میں صرف کرنے یا دوسرے مفید مشاغل میں بانٹنے کے مواقع نہیں ہیں۔ استاد کا سارا وقت گھریلو پریشانیوں کی نذر ہو جاتا ہے لیکن اس کے باوجود اگر استاد چاہیں تو اپنے مطالعے اور اصلاح کے لیے کوئی نہ کوئی وقت ضرور نکال سکتے ہیں ایک چھوٹی سی بات کو لیجیے۔ روزانہ اخبار کا مطالعہ ایک پڑھے لکھے آدمی کے لیے ضروری ہے روزانہ اخبار دیکھنا ایک اچھے شہری کے اوصاف میں شمار کیا جاتا ہے۔ لیکن اساتذہ میں سے کتنے ایسے ہیں جو اخبار کا باقاعدہ مطالعہ کرتے ہیں، کتنے اساتذہ ایسے ہیں جو دوران سبق میں موقع اور محل کی مناسبت سے وقتی مسائل کو بچوں کے کتابی علم سے مربوط کرتے ہیں؟ دنیا اور اپنے ملک کے جدید جدید مسائل سے بچوں کو واقف رکھنا اور ان کے علم کے ساتھ روزانہ کی معلومات کا پیوند لگانا عین روح تعلیم ہے۔ وہ کیسی تعلیم ہو گی جو کہ گرد و پیش کے ماحول سے منقطع ہو۔ لیکن شاید ہی کوئی استاد ایسی دردسری میں پڑتا ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے اساتذہ کے سبق روکھے پھیکے بے مزہ اور غیر دلچسپ ہوتے ہیں۔ وہ صرف کتاب میں لکھا ہوا مواد پڑھا دیتے ہیں اور اپنے سبقوں میں رنگینی اور لطف پیدا نہیں کر سکتے۔

طالب علموں کا علم بھی ایک متحدہ کل United whole ہونے کی بجائے معلومات کے اَن میل اور بے جوڑ ٹکڑے بن کر رہ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ طالب علم سکول اور کتاب سے سچی محبت نہیں کرتا وہ علم کو ایک پابندی سمجھ کر حاصل کرتا ہے۔ طالب علم کی حالت ایک لیٹر بکس سے مختلف نہیں ہوتی جس میں ہر قسم کے خطوط ڈال دیئے جاتے ہیں۔

ان تباہ کن حالات کو بدلنے کے لیے اساتذہ کو خاطر خواہ آسانیاں بہم پہنچانی چاہئیں۔ تاکہ وہ کتابوں رسالوں اور دوسرے مفید ذرائع سے اپنے علم کو تر و تازہ کرتے رہیں۔ تاکہ ان کے سبقوں میں تازہ معلومات اور نئے تجربوں کی جھلک نظر آئے تاکہ وہ بدلتے ہوئے حالات کا ساتھ دیتے جائیں۔ تاکہ وہ اپنی جاذب شخصیت کی وجہ سے طالب علموں کو اپنی طرف کھینچ سکیں اور ان کے دل و دماغ پر اپنے اچھے کردار کے نقوش مرتسم کر سکیں۔ استاد کا کام کتاب پڑھا دینا نہیں بلکہ وہ طالب علم کو پڑھاتا ہے۔ استاد محض Taalee

نہیں کہ گراموفون ریکارڈ کی طرح بج جائے اور بس۔ بلکہ استاد ایک Educator ہے جس کے ذمے بننے والے شہریوں کی تربیت ہے۔ ظاہر ہے کہ استاد اس جذبے کے تحت کام نہیں کر سکتا۔ تاوقتیکہ یہ حقائق پہلے خود اس کے اپنے رگ و ریشے میں نہ اتر چکے ہوں۔ جب تک وہ اپنے فرض کو جان نہ چکا ہو، اور جب تک وہ اپنے آپ کو پہچان نہ لے اس سے اس کام کی توقع عبث ہے۔ جب تک استاد کا اپنا دل گرمایا جا چکا ہو وہ شاگردوں میں زندگی کی روح کیسے پھونک سکتا ہے؟ ہم کیوں کر کم علم بے حس اور قدامت پسند استاد سے یہ توقع رکھ سکتے ہیں کہ اس کے ہاتھوں ایک فرض شناس اور منور ذہن معاشرے کی تخلیق ہو گی۔

چاہیے کہ سکولوں میں اچھی اچھی لائبریریاں ہوں جن میں وقت کی بہترین کتابوں کا اضافہ ہوتا رہے۔ سکول کے سٹاف روم میں دو تین اخبار اور چند ایک معیاری رسالے آنے چاہئیں۔ اساتذہ کے لیے مطالعے کا موزوں ماحول پیدا کرنا چاہیے۔ ہیڈ ماسٹر صاحبان کو چاہیے کہ اساتذہ کی اس ذہنی اور فنی غذا کے سلسلے میں سستی اور بخل ہرگز نہ برتیں۔ بلکہ ایسی چیزوں کو رواج دیں اور ان کی ہمت افزائی کریں۔ انسان کلیجہ تھام کر رہ جاتا ہے جب ایسے مایوس کن اور دل شکن حالات سے واسطہ پڑتا ہے کہ بعض سکولوں میں سٹاف روم تک کا بندوبست نہیں ہوتا؛ اور بعض اچھے بھلے سکولوں میں دوسری چیزیں تو در کنار روزانہ اخبار تک بھی نہیں منگایا جاتا! تفاوت راہ ببیں!

ریڈیو ذریعہ تفریح کے ساتھ ساتھ ایک بہترین ذریعہ تعلیم بھی ہے۔ ریڈیو سے جو خبریں، تقریریں، اور مقالات اور حالات حاضرہ پر تبصرہ وغیرہ نشر ہوتا رہتا ہے اس کی معلوماتی اور تعلیمی افادیت سے کون انکار کر سکتا ہے۔ اور ایک استاد کے لیے ان ساری باتوں سے واقف رہنا کتنا ضروری ہے؛ مگر کتنے استاد ہیں جن کے پاس ریڈیو سیٹ ہیں اور وہ اس سے مستفید ہوتے ہیں۔ اگر کہیں کسی کے پاس کوئی ریڈیو سیٹ ہیں بھی تو اکثر اس کو ذریعہ تفریح ہی سمجھنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

محض تعلیمی نقطۂ نگاہ ہی سے استاد کے ذاتی کردار اور سیرت، اس کے طرز فکر اور نظریۂ زندگی کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ جیسی روح ویسے فرشتے۔ طالب علم کا کردار اساتذہ کے کردار کا آئینہ دار

ہوتا ہے۔ یہ عین فطری تقاضہ ہے کہ جہاں نوجوان طالب علم کا کردار دوسرے متعدد ذرائع سے تشکیل پاتا ہے۔ وہاں استاد کی ذات کا اثر بھی کچھ کم نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ استاد کو ایک مثالی کردار کا حامل ہونا چاہیے۔ میرا تو یہ خیال کہ استاد کو اس امر میں بڑی احتیاط برتنی چاہیے کہ اس سے کسی قسم کی اخلاقی گراوٹ اور کمزوری کا مظاہرہ کم از کم طالب علموں کے سامنے نہ ہونے پائے۔ سگریٹ پینے والا استاد طالب علموں کو کس طرح تمباکو نوشی سے منع کر سکتا ہے۔ اپنی کلاس میں دیر سے جانیوالا استاد کس منہ سے بچوں کو وقت کی پابندی کا سبق سکھلائے گا!

نہایت افسوس کے ساتھ اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ موجودہ اساتذہ کی اکثریت کے اپنے اخلاق بہت پست ہیں۔ ایسے لوگ خال خال ہی ہیں جن کی سیرت اور کردار طالب علموں کے سامنے پیش کرنے کی حق دار ہے۔

اچھی سیرت اور اعلیٰ کردار کی تعمیر ہمیشہ سے تعلیم کے مقاصد میں شامل رہے ہیں۔ آج کل کے حالات میں، جبکہ ہماری قومی زندگی کے ہر شعبے میں اصلاح اور تطہیر شروع ہو چکی ہے اور ہم ایک نئے معاشرے کی تخلیق کرنے کی جدوجہد کر رہے ہیں۔ ہمیں سب سے زیادہ اسی چیز کی ضرورت ہے کہ بچوں کے کردار کو سنوارا جائے۔ ان میں ابھی سے اچھی عادتیں ڈالی جائیں تاکہ وہ بڑے ہو کر دیانتدار اور محنتی، باضمیر اور فرض شناس شہری بن سکیں۔ اور اس طرح سے ایک پاکیزہ معاشرہ تعمیر ہو سکے۔ یہ کام بڑی حد تک یقیناً استادوں کے سر ہوگا۔ یہیں سے اس امر کی شدید ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ استادوں کی اپنی سیرت اور کردار مثالی ہونا چاہیے۔ قومی اصلاح کا پروگرام مدرسے ہی سے شروع ہوتا ہے۔ استاد اگر استاد ہے تو وہ بچے کو جس رخ پر چاہے موڑ سکتا ہے۔ وہ اس خاکے میں جو رنگ بھرنا چاہے بھر سکتا ہے۔ استاد کی سچی کوششیں معاشرتی برائیوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے میں سب سے زیادہ کارآمد ثابت ہو سکتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نظامِ تعلیم کے لیے اعلیٰ تعلیم یافتہ، بلند کردار اساتذہ کی ضرورت ہے، کہ علم، زندگی سے اکتائے ہوئے، کاہلی اور قدامت پسند استاد کے ہاتھوں یہ کام کبھی سرانجام نہیں پا سکتا۔ اگر ہم ناقص استاد سے اس عظیم الشان ذمہ داری کا ...

کی توقع رکھے بیٹھے ہیں تو ہمیں اپنی عقل کی خیر منانی چاہیے! بے حس اور مردہ دل استاد کبھی بھی بچوں میں زندگی کی روح نہیں پھونک سکتا۔ وہ تو الٹا اپنے غلط نظریات اور بھونڈی عادتوں کے زہریلے جراثیم قوموں کے نونہالوں پر چھوڑ دیتا ہے جو اسے عمر بھر ہرا نہیں ہونے دیتے۔ نااہل استادیوں میں وہ جذبہ پیدا نہیں کر سکتا جس کی آج اور ہمیشہ پاکستان کو ضرورت ہے۔

اگر نظامِ تعلیم میں انقلاب لانا ہے تو سب سے پہلے استاد اور استاد کے حالات کو بدلنا ہوگا۔ یہ ہے۔ استاد کی کرسی ایک بلند مقام ہے۔ اس مقدس مسند پر ہر سخرے کو اچھل بیٹھنے کی اجازت نہیں ہونی چاہیے۔ این کار ہر فرزانہ نیست۔ محکمہ تعلیم کو چاہیے کہ موزوں ترین اور اس پیشے کے مزاج کے مناسب افراد کو بھرتی کرے۔ سکولوں کے ماحول کو دل کش اور جاذبِ نظر بنائے تاکہ ذہین لوگ اس طرف مائل ہوں۔ قابل اور نیک نفس لوگوں کو ترغیب دے کر اس پیشے میں لانا چاہیے۔ ٹریننگ سکولوں اور کالجوں میں زیرِ تربیت اساتذہ کی تعلیم اور ان کے کردار کی تعمیر کا بہت زیادہ خیال رکھنا چاہیے۔ استاد بننے کے لیے صرف رسمی تربیت کافی نہیں ہے۔ بلکہ طبیعت اور مزاج کی موزونیت اور سچی تربیت حاصل کرنا ضروری ہے۔ پروفیسر مخدومی صاحب کے الفاظ میں "استاد کو چاہیے وہ اپنی شخصیت کو بحیثیت ایک استاد کے نشوونما دے" Develop a personality as a teacher۔

یہ نہایت دلچسپ امر ہے کہ تنخواہوں کی کمی اور مایوس کن حالات کار استاد کے راستے میں بڑی رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔ یہ حالات استاد کو ٹیچر نہیں بننے دیتے۔ بلکہ اس کو بھیچر بنا کر رکھ دیا ہے۔ ان رکاوٹوں کو دور کرنا نظامِ تعلیم کی اصلاح کا پہلا قدم ہونا چاہیے۔ ایسے حالات پیدا کرنے چاہئیں کہ استاد ایک جاذب اور دل کش پُر اثر اور باوقار شخصیت کا حامل ہو۔ اس کا براہِ راست اثر اس کے شاگردوں پر پڑے گا۔ جو آگے چل کر قومی کردار پر منتج ہوگا۔ اس بات پر میرا ایمان ہے کہ نظامِ تعلیم کی کوئی اصلاح کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک پاکستانی استاد کے نقطۂ نگاہ کو بدل نہ دیا جائے۔

تمباکو نوشی کے مہلک اثرات

ادیس احمد

روز افزوں شوق

جدید سائنسی تہذیب نے رسل و رسائل اور نشر و اشاعت کے ذرائع اور ان کی تاثیر میں بے پناہ اضافہ کر کے جہاں اچھی چیزوں کے عالمگیر پیمانے پر پھیلنے پھولنے کا سامان کر دیا ہے وہاں برائیوں کے بے ملا روک ٹوک پھیلنے کے مواقع بھی اسی نسبت سے بڑھا دیے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض لوگ نئی تہذیب کے سرے سے مخالف ہیں، وہ مثالوں سے ثابت کرتے ہیں کہ فلاں برائی پچھلے چند برس میں اتنی تیزی سے پھیل گئی، فلاں برائی اس سے بھی زیادہ تیزی سے جڑ پکڑ رہی ہے۔ اسی قسم کا استدلال یک طرفہ قسم کا ہوا کرتا ہے کیوں کہ وہ ان اچھی چیزوں کو نظر انداز کر دیتا ہے جنھوں نے سائنسی تہذیب کی بدولت ترقی پائی ہے۔ تاہم یہ اعتراض اپنی جگہ قائم رہتا ہے کہ موجودہ دور کی سائنسی تہذیب اپنے ہاتھ میں کوئی اخلاقی ترازو نہیں رکھتی جو بری چیزوں اور بری قدروں کو مضر سمجھ کر اٹھا پھینکے اور انھیں روز افزوں ترقی حاصل کرنے کا مطلق موقع نہ دے۔

تمباکو نوشی بھی ان برائیوں میں سے ایک ہے جس نے جدید تہذیب کے سہارے بڑا فروغ پایا ہے۔ گلی کوچوں، اخباروں، رسالوں، بسوں، ریلوے اسٹیشنوں، غرضیکہ ہر مقام پر سگرٹوں کے اشتہار نظر آتے ہیں۔ جہاں ریڈیو اور ٹیلی ویژن نجی ملکیت ہیں وہاں ان کے ذریعے بھی سگریٹ نوشی کا شوق دلایا جاتا ہے۔ الغرض نشر و اشاعت کے اکثر ہی وسائل پوری سرگرمی سے تمباکو نوشی کی خدمت پر مامور نظر آتے ہیں۔

صرف یہی نہیں بلکہ سگریٹ پینا فیشن میں داخل ہو چکا ہے۔ عام تقریبوں پر مشروبات کے ساتھ سگریٹ بھی پیش کیے جاتے ہیں۔ گھر ہو یا دفتر، بس ہو یا ریلوے گاڑی، گلی ہو یا بازار، مہذب

خوش پوش لوگ بڑے شوق سے سگریٹ کے کش لگاتے دیکھے جا سکتے ہیں۔ انھیں اس بات کی مطلق پرواہ نہیں کہ جو بچے اور نوجوان آس پاس بیٹھے ہیں وہ اس سے کیا اثر لیں گے یا سگریٹ پینے سے خود ان کی اپنی صحت پر کیا اثر پڑے گا۔ سگریٹ نوشی کے اس طرح فیشن میں داخل ہونے کا ناگزیر نتیجہ یہ ہے کہ بچے اور جوان بڑا جتن کر کے اور اپنے آپ کو تکلیف میں ڈال کر سگریٹ پینا سیکھتے ہیں اور بالآخر اس پر فخر کرنے لگتے ہیں کہ وہ اس میدان میں بڑوں کے بھی کان کترنے کے قابل ہو گئے ہیں۔

فیشن جس طرح اچھے خاصے سنجیدہ لوگوں کو بھی سگریٹ نوشی کا متوالا بنا سکتا ہے اس کا حال ایک مثال سے ظاہر ہو جائے گا۔ راقم کو ایک صاحب کا علم ہے جو قیام پاکستان سے پہلے وکیل ہونے کے باوجود سگریٹ یا حقے کو ہاتھ نہ لگاتے تھے۔ لیکن آزادی کی آمد کے بعد جب یہ صاحب صرف ایم۔ ایل۔ اے بلکہ وزیر با تدبیر بھی بن گئے تو ان کی سگریٹ نوشی انتہائی حد کو پہنچ گئی۔

ہمارے یہاں کوئی قابل اعتماد اعداد و شمار نہیں جن سے معلوم ہو سکے کہ سگریٹ نوشی کا شوق کس رفتار سے ترقی کر رہا ہے۔ لیکن مغربی ملکوں میں جو اعداد و شمار جمع کیے گئے ہیں۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ ۱۹۲۳ء سے ۱۹۵۱ء تک صرف ایک چوتھائی صدی کے عرصے میں ہالینڈ، انگلستان اور امریکہ میں سگریٹوں کی کھپت میں دس سے بیس گنا تک اضافہ ہوا ہے۔ مگر یہ اضافہ سگریٹ نوشی کے اضافے کے مقابلے میں بالکل کوئی معنی نہیں رکھتا۔

تباہ کن اثرات

سگریٹ نوشی انسانی صحت پر جو تباہ کن اثرات پیدا کرتی ہے، اس کے متعلق دنیا بھر کے طبیب یک زبان ہیں۔ پھیپھڑوں، دل اور آنکھوں پر اس کا اثر جلد نمایاں ہونے لگتا ہے۔ اس کے علاوہ ان گنت دوسری بیماریاں جو تمباکو نوشی سے پیدا ہوتی یا اس کی بدولت زور پکڑ جاتی ہے۔ حال ہی میں یورپ کے ایک مشہور ڈاکٹر نے یہ انکشاف کیا ہے کہ پھیپھڑوں کا سرطان کم و بیش براہ راست سگریٹ پینے کا نتیجہ ہے، وہ کہتا ہے۔

پھیپھڑوں کا سرطان پہلے ہی کافی عام ہو چکا ہے ۱۹۲۳ء اور ۱۹۵۱ء کے درمیان انگلینڈ میں

اس بیماری سے مرنے والوں کی تعداد بیس گنا بڑھی ہے۔ انگلستان اور ویلز میں اس مرض سے
مرنے والوں کی تعداد دس گنا ہو گئی ہے۔ تقریباً اسی قدر اضافہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں ہوا ہے
یہ امر معنی خیز ہے کہ پھیپھڑوں کے سرطان میں جو اضافہ ہے وہ براہ راست سگرٹوں کی بکری کے اضافے
کے متوازی ہے۔ مجھے اس بات کا یقین ہو چکا ہے کہ ہر شخص جو کثرت سے سگریٹ پیتا ہے، پھیپھڑوں کے
سرطان کا شکار ہو کر رہے گا۔ ہاں اگر دل کی کوئی بیماری یا کوئی اور مرض اگر اسے اس سے پہلے ہی موت کے
منہ میں دھکیل دے تو بات اور ہے۔

انگریزی کے مشہور طبی رسالے "لوڈ یرہیلتھ" میں حال ہی میں ایک مضمون شائع ہوا ہے جس میں
بتایا گیا ہے کہ "پھیپھڑوں کا سرطان" طبی لٹریچر میں سب سے زیادہ خوفناک الفاظ شمار ہوتے ہیں۔
یہ بیماری آسنی خاموشی سے جڑ پکڑتی اور آسنی تیزی سے بڑھتی ہے کہ ڈاکٹروں کے پاس پہنچنے والے
۱۰۰ مریضوں میں سے صرف پچپن اپریشن کے قابل ہوتے ہیں۔ باقی ۴۵ مریضوں کا سرطان اس قدر پھیل
چکا ہوتا ہے کہ اپریشن کچھ فائدہ نہیں دے سکتا۔ جن پچپن مریضوں کا سینہ چاک کیا جاتا ہے ان میں سے
گیارہ اپریشن کی میز پر ہی جان بحق ہو جاتے ہیں کیوں کہ یہ اپریشن بہت سخت ہے۔ باقی ۴۴ مریضوں میں سے
تقریباً بارہ ایسے نکل آتے ہیں جن کا سینہ چاک ہونے پر پتہ چلتا ہے کہ سرطان پھیپھڑے سے آگے
غالباً دل تک پھیل چکا ہے۔ ایسے مریضوں کے پھیپھڑوں کو چھوا نہیں جاتا اور ان کا زخم بند کر دیا جاتا ہے
وہ چند مہینوں میں اگلی دنیا کی راہ لیتے ہیں۔ اس طرح سو میں سے صرف بتیس مریض ایسے رہ جاتے ہیں
جن کے پھیپھڑوں کا اپریشن کیا جاتا ہے۔ سرجن بیمار پھیپھڑوں کے ضروری حصے یا اس سارے پھیپھڑے
کو باہر نکال پھینکتا ہے، اور خدا سے دعا مانگتا ہے کہ سرطان کی کوئی جڑ باقی نہ رہ گئی ہو۔ اکثر حالتوں میں یہ
جڑیں سرطان زدہ عضو کے ارد گرد دور تک نکل جاتی ہیں اور سرجن کی نظر سے بالکل چھپی رہتی ہیں
ایسے مریض آپریشن کے بعد پھر سرطان کا شکار ہو جاتے ہیں اور یہ حملہ جان لیوا ثابت ہوتا ہے۔ جن
۳۲ مریضوں کا اپریشن کیا جائے ان میں سے کوئی ۲۷ اس طور پر دوبارہ سرطان کے چنگل میں آجاتے
ہیں۔ گویا آخر کار ۱۰۰ میں سے صرف پانچ مریض ایسے نکلتے ہیں جو آپریشن کے پانچ سال بعد تک

رہتے ہیں اور صحت حاصل کر لیتے ہیں۔

یہ ہے وہ ہولناک قیمت جو مہذب انسان فیشن پرستی کی دھن میں سگریٹ نوشی کے لیے

ادا کر رہا ہے! فاعتبروا یا اولی الابصار

صحت اور اخلاق کی تباہی

افلاس زدہ اور پسماندہ معاشروں میں سگریٹ نوشی کے نقصانات کا اندازہ کرتے وقت ان اخلاقی برائیوں کو بھی شمار میں لانا چاہیے جو اس کی بدولت پیدا ہوتی ہیں۔ مغرب کے صنعتی ملکوں میں فی کس آمدنی کی اوسط اپنے اندر اتنی گنجائش رکھتی ہے کہ زندگی کی ابتدائی ضرورتیں پوری کرنے کے بعد کچھ رقم تعیشات پر بھی صرف کر دی جائے۔ مثلاً ہالینڈ، برطانیہ اور امریکہ ایسے ملک ہیں جو نہ صرف صنعت اور تجارت میں دنیا کے راہ نما ہیں بلکہ وسیع غیر ملکی مقبوضات کے بھی مالک ہیں۔ ان کے ہاں عوامی زندگی کا معیار کافی اونچا ہے۔ اس قسم کی مضبوط معیشت میں اگر قومی دولت کا کچھ حصہ جلا کر راکھ بھی کر دیا جائے تو اس سے قومی اخلاق کو کوئی قابل ذکر نقصان نہیں پہنچتا۔

لیکن پاکستان جیسے افلاس زدہ ملکوں کا معاملہ بہت مختلف قسم کا ہے۔ ہمارے یہاں فی کس ماہوار آمدنی کی اوسط ۲۵ روپے سے زیادہ نہیں۔ ہوش ربا گرانی کے اس زمانے میں یہ آمدنی زندگی کی ابتدائی ضرورتیں پوری کرنے کے بھی کفایت نہیں کرتی چہ جائیکہ اس کا کچھ حصہ سگرٹوں کی شکل میں جلانے کے لیے میسر آ سکے۔ نتیجہ یہ ہے کہ سکولوں اور کالجوں میں سے سگریٹ پینے کی عادت سے لے کر آنے والے نوجوان جب سو دو سو روپے ماہوار کی چھوٹی موٹی نوکری حاصل کر لیتے ہیں تو بہت جلد اپنے آپ کو ایک عجیب مجبوری سے دو چار پاتے ہیں۔ چند سالوں میں خانگی ذمہ داریاں تیزی سے بڑھ جاتی ہیں۔ مگر آمدنی کم و بیش ساکن رہتی ہے۔ سو ڈیڑھ سو روپے ماہوار میں سے کم از کم پچیس تیس روپے بابو جی کے سگرٹوں کی نذر ہو جاتے ہیں۔ معمولی آمدنی میں اتنا بڑا اخلاصہ پیدا ہو جانے سے بیوی بچوں کی ضرورتیں کس طرح پوری ہوں؟ بابو جی کو خواہ مخواہ رشوت کے ذریعے یا دوسرے ناپسندیدہ ذرائع سے آمدنی بڑھانے کی فکر کرنی پڑتی ہے۔ اور وہ اپنے آپ کو

اخلاقی گراوٹ کی ایک ایسی راہ پر ڈال دیتا ہے جو اسے نیچے ہی نیچے لیے جاتی ہے۔

تاہم بہت سے ایسے ہوتے ہیں جو آمدنی بڑھانے کی راہیں اپنے او پر تقریباً بند پاتے ہیں ان کو سگریٹ نوشی کے طفیل نا قہ مستی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ وہ خود اور ان کی اولاد غلیظ ماحول اور ناکافی غذا کے باعث طرح طرح کی بیماریوں کا شکار رہنے لگے ہیں۔ پچھلے دنوں لاہور کی ایک نواحی بستی کے رہنے والوں کی صحت کا جائزہ لیا گیا۔ اس بستی میں رہنے والوں کی اکثریت پڑھے لکھے بابوؤں پر مشتمل تھی۔ طبی معائنے نے ظاہر کیا کہ اس بستی کے باشندوں کی ایک بھاری تعداد تپ دق میں مبتلا تھی اس بات میں شک کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ دوسرے اسباب کے ساتھ تمباکو نوشی بھی اس چیز کی ذمہ دار تھی۔ جس معاشرے میں قومی پیداوار کی سطح اتنی پست اور قومی دولت کی تقسیم اس قدر ناہموار ہو کہ آبادی کا ایک بڑا حصہ زندگی کی ابتدائی ضرورتوں تک سے محروم ہو وہاں قومی دولت کے ایک خاصے حصے کو تمباکو نوشی کی شکل میں جلا کر راکھ کر دینا ایک قومی جرم کے سوا کچھ نہیں۔

طلبہ اور سگریٹ نوشی

حال ہی میں گورنر مغربی پاکستان نے اس مطلب کا ایک قانون نافذ کیا تھا کہ کم عمر بچوں کے ہاتھ سگریٹ یا تمباکو فروخت کرنا قابل سزا جرم ہے۔ یہ ایک نہایت خوش آئند اور بروقت اقدام ہے، تمباکو نوشی کی عادت عموماً نہایت معصومانہ انداز میں اخذ کی جاتی ہے۔ مگر اس کے نتائج نہایت تباہ کن ثابت ہوتے ہیں۔ مدرسوں کے بچے اسے اخذ کر لینے کے بعد طرح طرح کی اخلاقی برائیوں کا شکار ہونے لگتے ہیں۔ وہ یہ عادت عموماً بری صحبت کے طفیل حاصل کر لیتے ہیں اور کافی عرصے تک اسے گھر والوں سے چھپائے رکھنا چاہتے ہیں۔ لہٰذا وہ اس کی تشفی کا سامان بھی خود ہی پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے لیے انھیں چوری وغیرہ کی راہ اختیار کرنی پڑتی ہے۔ گویا سگریٹ نوشی انھیں براہ راست اخلاق برائی کے گڑھے میں دھکیل دیتی ہے۔

اخلاق کی تباہی کے ساتھ ساتھ صحت کی تباہی بھی کچھ کم نقصان دہ نہیں ہوتی۔ لڑکپن کے زمانے میں اچھی غذا اور صحت مند ماحول صحت مند جسمانی نشوونما کے لیے ازبس لازمی ہیں

وہ زمانہ ہے جب جسمانی اعضا پھلتے پھولتے ہیں۔ اگر اس زمانے میں مناسب غذا کی کمی رہے تو جسمانی نشو و نما رک جاتی ہے۔ جو بچے سگریٹ پینے لگتے ہیں وہ نہ صرف اپنے آپ کو غذا سے محروم کرنے لگتے ہیں بلکہ اپنے جسم میں ایک ایسا زہر بھی داخل کرنے لگتے ہیں جو نس نس میں سرایت کر کے اعضا کو کمزور اور نیم جان کرنے لگتا ہے۔ یہ ایسی صورت حال ہے جو قومی نقطہ نگاہ سے بے حد افسوسناک ہے۔ اسے برداشت کرنا گویا ملک و قوم کے مستقبل سے آنکھیں بند کرنا ہے۔ اس لحاظ سے ملکی حکومت کا یہ فرض ہو جاتا ہے کہ نئی پود کو تمباکو نوشی کے تباہ کن اثرات سے بچانے کے لیے ہر ممکن تدبیر اختیار کرے۔

لیکن جس قانون کا اوپر ذکر ہوا ہے۔ وہ ایک اہم قومی مسئلہ کے متعلق حکومت کی فکر مندی ضرور ظاہر کرتا ہے اس کا تسلی بخش حل پیش نہیں کرتا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان اکساہٹوں کا خاتمہ کیا جائے جو بچوں اور نوجوانوں کو تمباکو نوشی پر ابھارتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ جو شخص تمباکو پینے کا عادی نہ ہو اسے اس کا استعمال خالی اذیت پہنچاتا ہے۔ پھر بچے اور نوجوان اس اذیت کو بخوشی کیوں قبول کرتے ہیں۔ اس سوال کا جواب صریحاً وہ معاشرتی فضا ہے جس میں بچے اپنے آپ کو گھرا پاتے ہیں۔ وہ عموماً دیکھتے ہیں کہ ان کے والد اور دوسرے قابل احترام بزرگ فرصت اور کام کے اوقات میں بڑے مزے لے کر تمباکو پیتے ہیں۔ وہ مہمانوں کی تواضع سگریٹ اور حقے سے ہوتے دیکھتے ہیں۔ وہ بڑی بڑی محفلوں میں تمباکو نوشی کا اہتمام ہوتے دیکھتے ہیں۔ وہ اپنے استادوں اپنے انتظامی افسروں غرضیکہ ہر تقریباً قابل احترام آدمی کو تمباکو سے لطف اٹھاتے دیکھتے ہیں۔ اس ہمہ گیر معاشرتی ماحول میں اگر وہ اس بات پر مائل ہو جائیں کہ تکلیف اٹھا کر بھی تمباکو پینا سیکھیں تو اس میں کونسی حیرانی کی بات ہے! ایسے ماحول میں حیرانی ان معدودے چند لوگوں پر ہونی چاہیے جو اس ہمہ گیر اکساہٹ سے بچے رہے۔

بچوں کو تمباکو سے باز رکھنے کے لیے قانون کی مدد لینا ایک اچھی بات ہے۔ مگر اس سے زیادہ ضرورت اس چیز کی ہے کہ معاشرتی فضا تمباکو نوشی کو اچھالنے کی بجائے اسے ایک قابل نفرت چیز قرار دے۔ یعنی والدین یا دوسرے بڑے لوگ۔ اساتذہ اور تمام انتظامی افسروں کا فرض ہے کہ اگر وہ تمباکو نوشی چھوڑ نہیں سکتے تو کم از کم اس کی کھلی نمائش نہ کریں۔ یہ احتیاط قانونی پابندی سے بہتر نتائج پیدا کر سکتی ہے۔

خدا کو تمام زبانیں پیاری ہیں

انیس احمد

پتے کی بات

ولیم کیمرون ٹاؤن زاینڈ کو لڑکپن ہی سے مسیحی مبلغ بننے کا شوق تھا۔ اس امریکی نوجوان کو دہ دہ کر یہ خیال آتا تھا کہ ریاستہائے متحدہ کے جنوب میں ایک وسیع براعظم موجود ہے جس کے اصلی باشندے ابھی تک اپنے آبائی مذہب کے پیرو اور توہم پرستی کا شکار ہیں۔ وہ چاہتا تھا کہ ان لوگوں کو مسیحی تعلیمات سے واقف کیا جائے۔

۱۹۱۷ء میں جب ٹاؤن زاینڈ کی عمر ابھی صرف ۲۱ برس کی تھی اس نے سفر کی تیاری کی اور ہسپانوی زبان میں چھپی ہوئی انجیلوں سے ایک بڑا ٹرنک بھر کر جنوبی امریکہ کی ریاست گوات مالا کی راہ لی۔ اس کا خیال تھا کہ ہسپانوی زبان اس ریاست کی سرکاری زبان ہے۔ اس لیے اس کی مدد سے اس کے قدیم باشندوں کے دلوں تک رسائی حاصل کی جا سکے گی۔ مگر اس کا یہ خیال غلط ثابت ہوا۔ گوات مالا میں پہنچ کر پتہ چلا کہ ریاست کی دو تہائی سے زیادہ آبادی قدیم باشندوں پر مشتمل ہے۔ ان میں سے بہت تھوڑی آبادی کو ہسپانوی زبان آتی ہے۔ اور ان سے بھی تھوڑے لوگ اسے سیکھنے پر مائل کیے جا سکتے ہیں۔

تاہم اس نوجوان مبلغ کا جذبۂ عمل ٹھنڈا نہ پڑ سکا۔ وہ ریاست کے مختلف حصوں میں جاتا اور اس کے اصل باشندوں کو ہسپانوی انجیل پیش کرتا۔ ایک روز وہ ایک قدیم باشندے کو یہ سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ انجیل خدا کا پیغام ہے اور اسے یہ پیغام سمجھنے کے لیے ہسپانوی زبان سیکھنی چاہیے۔ اس شخص نے بلا تامل جواب دیا "اگر تمہارا خدا اتنا ہی حکیم و علیم ہے کہ دنیا کے تمام انسانوں کو ہدایت دے تو اسے ہماری زبان کیوں نہیں آتی؟"

ان پڑھ اور نیم وحشی آدمی کی یہ بات نوجوان مبلغ کے دل میں گھر کر گئی۔ اس نے اسی وقت یہ عہد کر لیا کہ گوا ٹے مالا کے اصل باشندوں میں انجیلیں بانٹنے سے پہلے میں اپنے خدا کو ان کی زبان سکھا لوں گا چنانچہ اس نے ان لوگوں میں سکونت اختیار کر لی۔ اور لگاتار پندرہ برس تک ان کے درمیان گذارے اس نے ان کا لباس اور ان کی غذا اختیار کی۔ جدید آرام و آسائش کی گود میں پلے ہوئے نوجوان کے لیے صرف روٹی اور چٹنیوں سے سالہا سال تک پیٹ بھرنا آسان نہ تھا۔ مگر ٹاؤنزاینڈ جہالت اور توہم پرستی کے اندھیرے میں مسیحی دین کی روشنی پھیلانے کا اتنا شوق رکھتا تھا کہ اس نے ہر محرومی کو مسکراہٹ کے ساتھ قبول کیا۔ اس پندرہ برس کے عرصے میں اس نے ان لوگوں کی زبان سیکھی۔ اس کی آوازوں کا تجزیہ کر کے اس کے لیے صوتی رسم الخط وضع کیا۔ اور بالآخر اس زبان کے پڑھنے بولنے کے طریقے وضع کیے۔

گرمائی مرکز لسانیات

۱۹۳۲ء میں تپ دق کے حملے نے ٹاؤنزاینڈ کو مجبور کیا کہ وہ دوبارہ اپنے مہذب ملک میں جائے۔ مگر جس وقت وہ خچر پر سوار ہو کر روانہ ہوا وہ اپنے پیچھے پانچ مدرسے۔ ایک چھاپہ خانہ ایک ہسپتال اور بیسیوں گرجے چھوڑ گیا۔ جن میں سینکڑوں نئے نئے پڑھے لکھے اصلی باشندے عیسائی مذہب کے مطابق عبادت کرنے آتے تھے۔ اس کے تھیلے میں عہدنامہ جدید کا ایک مکمل نسخہ ان لوگوں کی زبان میں طبع شدہ موجود تھا۔ اس نے پندرہ برس پہلے کا وہ طعنہ ختم کر دیا تھا کہ تمہارے خدا کو ہماری زبان کیوں نہیں آتی؟

امریکہ میں واپسی پر ٹاؤنزاینڈ کی ملاقات ایک پرانے پادری دوست سے ہوئی اس نے زور دیا کہ جس طرح تم نے انجیل کا پیغام گواٹے مالا کے اصلی باشندوں تک پہنچایا، اس طرح پیغام جنوبی امریکہ کے دوسرے اصلی باشندوں تک بھی پہنچاؤ۔ ٹاؤنزاینڈ نے اس کام کا بیڑہ اٹھایا مگر ساتھ ہی اپنے پادری دوست کا تعاون طلب کیا۔ دونوں مل کر اس منصوبے کی بنیادی تیاری کرنے لگے۔ دنیا کے لسانی گروہوں کے متعلق اعداد و شمار جمع کرنے پر انھیں

پتہ چلا کہ دنیا میں کم و بیش تین ہزار زبانیں بولی جا رہی ہیں۔ ان میں سے صرف ایک ہزار زبانوں میں انجیل کا ترجمہ کیا گیا ہے۔ باقی دو ہزار زبانوں میں ابھی اس کا ترجمہ ہونا باقی تھا ان میں سے بیشتر زبانیں ایسی تھیں جن کا کوئی رسم الخط موجود نہ تھا۔ یہ کام انھیں انجام دینا تھا۔

اعداد و شمار کی چھان بین سے یہ بھی معلوم ہوا کہ دنیا کی آدھی آبادی بالکل ان پڑھ ہے، دنیا کی آبادی میں جس شرح سے اضافہ ہو رہا ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ خواندگی پھیلانے کی ساری کوششوں کے باوجود ناخواندگی کے تناسب میں کوئی کمی واقع نہیں ہو رہی۔ بلکہ الٹا اس میں کچھ نہ کچھ اضافہ ہو رہا ہے۔ پس، ان دونوں پادریوں کو اپنے کام کی نوعیت کا اچھی طرح یقین ہو گیا۔

(۱) انھیں نوجوانوں کی ایک ایسی جماعت تیار کرنی چاہیے جو اشاعت دین کی خاطر آرام و آسائش قربان کرنے کو تیار رہو۔

(۲) انھیں ان نوجوانوں کو لسانیات کے سائنسی اصولوں کی تربیت دینی چاہیے تاکہ وہ وحشی اور نیم وحشی قبیلوں کی زبانیں سیکھیں۔ ان زبانوں کے لیے صوتی رسم الخط تیار کریں۔ انھیں اور ان کے بچوں کو یہ زبانیں پڑھنا لکھنا سکھائیں، اور انجیل کے ترجمے ان زبانوں میں تیار کریں اس سارے منصوبے کے سامنے آخری منزل یہ تھی کہ دنیا کی جن دو ہزار زبانوں میں ابھی انجیل موجود نہیں ان میں اس کے ترجمے تیار کیے جائیں۔

۱۹۳۴ء میں ٹاؤنزاینڈ اور اس کے ساتھی پادری نے مل کر امریکہ کی ریاست آرکنساس میں اپنا تبلیغی مدرسہ جاری کیا۔ یہ مدرسہ ایک بوسیدہ عمارت میں واقع تھا۔ پہلے سال اس میں صرف دو طالب علم داخل ہوئے لیکن آٹھ سال گذرنے کے بعد یہ ادارہ اتنی ترقی کر گیا کہ اسے ایک یونیورسٹی کے دامن میں پناہ مل گئی۔ اس کا رجسٹرڈ شدہ نام گرمائی مرکز لسانیات ہے اور یہ ہر سال تقریباً پانچ سو نوجوان طلبہ و طالبات کو اس قابل بنا تا ہے کہ وہ مختلف زبانوں کا تجزیہ کر سکیں۔ برطانیہ، کینیڈا اور آسٹریلیا میں اس ادارے کی شاخیں موجود ہیں۔ اور یہ اب تک تقریباً چار ہزار گریجوایٹ تیار کر چکا ہے۔ یہ فارغ التحصیل نوجوان اس وقت ۲۵ ملکوں میں کام کر رہے ہیں۔

گویا ئی مرکز لسانیات صرف علمی تعلیم پر بس نہیں کرتا۔ بے شک اس کے طلبہ اور طالبات تبلیغی جذبہ لے کر آتے ہیں۔ مگر اس جذبے کی تربیت اور امتحان بھی نصاب کے ضروری اجزا ہیں۔ نصاب کے آخری تین مہینوں میں طلبہ اور طالبات کو ہر قسم کی آسائش سے الگ ہو کر جنگلی زندگی گذارنی پڑتی ہے۔ انھیں عام اوزاروں کے بغیر تیشوں اور شاخوں سے اپنے لیے جھونپڑیاں بنانی پڑتی ہیں۔ تیز رفتار دریاؤں اور آب شاروں میں سے گذرنے کے لیے کشتیاں وغیرہ تیار کرنی پڑتی ہیں۔ جنگلی جانوروں، سانپوں اور مچھر مکھیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس کڑے عملی امتحان میں تقریباً نوے فی صد طلبہ کامیاب ہوتے ہیں۔ اب انھیں دور دراز جنگلوں اور بیابانوں میں تبلیغ مسیحیت اور اشاعت تعلیم کے لیے بھیج دیا جاتا ہے۔

حیرت انگیز کامیابی

ٹاؤنسز اینڈ کے عزم اور بے پناہ جذبۂ عمل نے دور حاضر میں نوجوان مبلغوں کی ایک جوشیلی اور جاں فروش جماعت تیار کی ہے جو اپنی مثال آپ ہے۔ یہ جماعت ایسے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں پر مشتمل ہے جو سائنسی تہذیب کی نرم و نازک گود میں پل کر بڑے ہوتے، مگر اپنے دین کی اشاعت کے لیے ہر قسم کے خطروں کا مقابلہ کرنے کے لیے گھر بار، خویش و اقارب اور تہذیب کی ہر قسم کی گہماگہمی سے کالے کوسوں دور یہ نوجوان ناقابل یقین محرومیوں اور مشکلوں کا مقابلہ کرتے ہیں، اور صدیوں سے جہالت میں ڈوبے ہوئے وحشیوں اور نیم وحشیوں کو لکھنا پڑھنا سکھا کر مسیحی دین کے لیے راستہ صاف کرتے ہیں یہ مشکل کام کو ایک جامع تنظیم کے تحت انجام پا رہا ہے۔ تاہم ہر علاقے میں یہ کام صرف دو ایک مبلغوں کے ذمہ ہے۔ جو کلی طور پر تنہائی کے عالم میں ہر قسم کے مسائل سے عہدہ برآ ہوتے ہیں۔ اس وقت یہ مبلغ تقریباً ۸۰۰ لسانی گروہوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔

لیکن کامیابی کی یہ منزل کٹھن راستے طے کرنے کے بعد نصیب ہوئی ہے۔ ٹاؤنسز اینڈ جب اپنے گرمائی مرکز لسانیات میں کچھ نوجوانوں کو تربیت دے چکا تو اس نے مبلغوں کی اس جماعت کے ساتھ میکسیکو کا رُخ کیا۔ لیکن سرحد پار کرنے کے فوراً بعد انھیں روک دیا گیا۔ سرکاری افسروں نے انھیں بتایا کہ آخر

تمہارا مقصد کیا ہے ؟ جب انھوں نے بتایا کہ ہم اصلی باشندوں کو ان کی زبان پڑھنا لکھنا سکھانے آئے ہیں تو جواب ملا کہ واہ حکومت تو تمام اصلی زبانوں کو مٹا کر صرف ہسپانوی زبان کو رواج دینا چاہتی ہے اور آپ الٹا ان زبانوں کو فروغ دینے آئے ہیں۔ اس پر ٹاؤنسز ایند نے ان عقل کے دشمنوں کو سمجھایا کہ ہسپانوی زبان پھیلانے کی بہترین صورت صرف یہ ہے کہ اصلی باشندوں کو پہلے ان کی اپنی زبان میں پڑھنا لکھنا سکھایا جائے۔ جب تک اصلی زبانوں کو رسم الخط حاصل نہیں ہوتا اس وقت تک وہ زینہ تیار نہیں ہو سکتا جس کی مدد سے ہسپانوی زبان تک رسائی حاصل ہو سکتی ہے۔

آخر بڑی مشکل سے یہ بات میکسکو کے حکمرانوں کی سمجھ میں آئی کہ اگر ہسپانوی زبان سکھانے کے لیے مقامی بولیوں سے کام لیا جائے تو وہ نسبتاً تھوڑے عرصے میں مٹ سکتی ہیں۔ چنانچہ ان لوگوں کو نہ صرف کام کرنے کی اجازت مل گئی بلکہ تھوڑی بہت سرکاری تائید بھی حاصل ہو گئی۔ انھوں نے سب سے پہلے ازتک قوم میں کام شروع کیا جو فرنگیوں کی آمد کے وقت میکسکو کی حکمران قوم تھی۔ اس تجربے کے نتائج سے حکومت اتنی متاثر ہوئی کہ اس نے ان مبلغوں کے ساتھ پورا پورا تعاون کیا۔ آج حالت یہ ہے کہ اس تبلیغی جماعت کے ۲۱۶ افراد میکسکو کے ۱۵ پسماندہ قبیلوں میں کام کر رہے ہیں۔ حال ہی میں حکومت کے ایک بہت بڑے افسر نے ان مبلغوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا:۔

"اب ہم آپ کو غیر ملکی خیال نہیں کرتے۔ آپ حقیقی معنوں میں میکسکو کے باشندے ہیں"۔

ٹاؤنسز ایند کے ان تھک جذبۂ عمل نے نوجوانوں میں جو حیرت انگیز روح پھونک دی ہے اس کی مثال میریانا نامی ایک نوجوان لڑکی نے پیش کی ہے۔ وہ اور اس کا نامزد شوہر دونوں ایک ساتھ گرمائی مرکز لسانیات میں تربیت پا رہے تھے۔ ان کی شادی کی تاریخ مقرر ہو گئی۔ مگر شادی سے عین پہلے وہ نوجوان اچانک بیمار ہو کر مر گیا۔ اس صدمے نے میریانا کے عزم پر کوئی اثر نہ ڈالا اور اس نے اکیلی ہی جانے پر اصرار کیا۔ یہ بات اس کے والدین کو بڑی عجیب معلوم ہوئی۔ مگر میریانا نے ان کو رضامند کر لیا۔

میریانا میکسیکو کے ایک ایسے قبیلے میں جا بیٹھی جس کے افراد کی تعداد چالیس ہزار کو پہنچتی تھی بڑی محنت سے اس نے ان کی زبان سیکھی۔ اس زبان میں قاعدے اور کتابیں تیار کیں اور وسولیمال کی

کی انتھک محنت سے نہ صرف سات بارونق مدرسے جاری کئے بلکہ لوگوں کو جادو ٹونے سے علاج کرانے کی بجائے جدید دواؤں سے خدمت لینے پر آمادہ کیا۔ اس مطلب کے لیے اس نے ہسپتال جاری کیے اور توہم پرستی دور کرنے کے لیے بہت سا لٹریچر تیار کیا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ میریا ناگی کی کوششوں سے پانچ ہزار افراد سورج کی پوجا چھوڑ کر عیسائی مذہب میں آ گئے۔ آخر ۱۹۵۷ء کے نکلتے پر جب میریا نا نے ایک اور قبیلے میں جانے کی تیاری کی تو ایک مشہور رسالے میں اس کے کارناموں پر ایک لمبا مضمون چھپا جس میں کہا گیا کہ ایک اکیلی عورت کی کوششوں نے ایک پوری قوم کو وحشت کی زندگی سے نکال کر تہذیب کے دائرے میں لا کھڑا کیا ہے۔

ایمیزن کے گھنے جنگل

ٹاؤنز اینڈ کے تربیت دادہ مبلغوں نے میکسیکو میں جو کارنامے انجام دیئے تھے ان کی شہرت جنوبی امریکہ کی دوسری ریاستوں میں بھی پہنچی اور انھیں ان کی طرف سے آنے اور کام کرنے کی دعوتیں موصول ہونے لگیں۔ ان میں سے ایک دعوت ریاست پیرو کے صدر کی طرف سے تھی۔ مبلغوں کو بھیجنے سے پہلے ٹاؤنز اینڈ خود پیرو میں گیا اور کئی مہینے اس نے گھنے استوائی جنگلوں میں گذارے۔ ایمیزن کے طاس میں نہ صرف گھنے جنگلوں میں سے گذرنا تقریباً تقریباً محال تھا بلکہ اس کے وحشی قبیلوں میں سے بہت سے انسان خور تھے اور بعض گوگوری قوموں سے اتنی نفرت تھی کہ اکے دکے گورے کو دیکھتے ہی ہلاک کر دیتے تھے۔

ان حالات نے ٹاؤنز اینڈ کو یقین دلا دیا کہ جنگل کی اس دنیا میں تبلیغی مرکز کھولنے سے پہلے ہوائی آمد و رفت کا بندوبست ہونا چاہیے۔ اس کے ساتھ ہی ریڈیو کے ذریعے پیغام بھیجنے اور وصول کرنے کا انتظام ہونا چاہیے۔ ان دونوں شرائط کے پورا ہو جانے سے نہ صرف دور افتادہ جنگلوں میں پڑے ہوئے اکے دکے مبلغوں کے ساتھ ہر وقت رابطہ قائم رکھنا ممکن ہوگا بلکہ انھیں ہر وقت ہر قسم کی مدد اور ہر قسم کا سامان مہیا کرنا بھی ممکن ہوگا۔

چنانچہ حکومت پیرو اور امریکی مخیروں کی مالی مدد سے ٹاؤنز اینڈ نے ایک ہوائی جہاز

خرید لیا۔ آج اس کے پاس ۱۹ ہوائی جہازوں کا ایک بیڑہ موجود ہے۔ یہ ہلکے پھلکے ہوائی جہاز جنگل میں صاف کی ہوئی چند سو مربع گز جگہ پر اتر سکتے ہیں۔ بلکہ مگرمچھوں سے بھرے ہوئے دریاؤں میں بھی اتر سکتے ہیں۔ ان جہازوں کے اترنے اور زمین سے ہوا میں اٹھنے کے لیے صرف ۵۰ گز لمبا زمین کا ٹکڑا کافی ہے، جب پوری طرح لدے ہوئے ہوں تو یہ جہاز ۱۴۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چل سکتے ہیں اور ہوا میں ۲۳ ہزار فٹ کی بلندی پر پہنچ سکتے ہیں۔ جنگل میں پھنسے ہوئے اکّے دکّے آدمی کو نجات دلانے کے لیے بھی اس کے پاس سامان موجود ہے۔ جہاز زمین کے بالکل قریب آہستہ رفتار سے چکر لگاتا ہوا ایک مضبوط رسہ نیچے لٹکا دیتا ہے جسے آدمی پکڑ سکتا ہے۔ اس رسے کی مدد سے اسے "سرسبز دوزخ" سے باہر کھینچا جا سکتا ہے۔ یہ جہاز جو کام دیتے ہیں اس کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ ۱۹۵۷ء میں انھوں نے پندرہ لاکھ میل کی پرواز کی اور اس سارے سفر میں کسی مسافر کے خراش تک نہیں آنے پائی۔

ٹاؤنز اینڈ نے اپنے تبلیغی جال کی نگرانی اور رہ نمائی کے لیے ایمیزن کے گھنے جنگلوں کے عین بیچ اپنا صدر مقام قائم کر رکھا ہے۔ چار سو ایکڑ کا یہ رقبہ استوائی جنگل کے بیابان میں انسانی چہل پہل سے بسا نظر آتا ہے۔ یہ پیرو کے ۴۹ قبائل میں سرانجام دی جانے والی تبلیغی سرگرمیوں کے لیے مرکز اعصاب ہے۔ اس مرکز کے پاس ہی جھیل یارینا واقع ہے۔ اس جگہ ہوائی جہازوں کی مرمت کے لیے ورکشاپیں قائم ہیں۔ ۵۰۰ مبلغوں اور ان کے کنبوں کے لیے رہائشی کوارٹر موجود ہیں۔ ایک بہت بڑا شفاخانہ قائم ہے۔ جو ہر قسم کی جدید ترین دواؤں کا ذخیرہ ہے۔ اس جگہ قبائلیوں کے لیے آ کر ٹھہرنے کے لیے مہمان خانے بھی موجود ہیں۔ جو قبائلی لکھنا پڑھنا سیکھ لیتے اور عیسائی مذہب قبول کر لیتے ہیں وہ تبلیغی کام کی تربیت حاصل کرنے یہاں آتے ہیں۔ اس جگہ ایک چھاپہ خانہ بھی ہے جو کتابیں اور لٹریچر تیار کرتا ہے۔ ۱۹۵۷ء میں اس نے کم و بیش اٹھارہ ہزار جلدیں تیار کی تھیں۔

تبلیغی صدر مقام کا اہم ترین خادم مرکزی ریڈیو کا وہ نظام ہے جس نے پیرو کے دور دراز علاقوں میں پھیلے ہوئے مبلغوں کو ایک دوسرے سے مربوط کر رکھا ہے۔ ٹاؤنز اینڈ نے مختلف حکومتی اداروں

اور مخیر افراد پر زور ڈال کر اتنے ریڈیو سیٹ اور روپیہ جمع کر لیا ہے کہ اس کے کارندے لاسلکی کے ذریعے جس وقت بھی چاہیں صدر دفتر کے ساتھ یا ایک دوسرے کے ساتھ بات چیت کر سکیں۔ تبلیغی مرکز کے ریڈیو سیناریو پر دن رات کام جاری رہتا ہے۔ مبلغوں کو سختی سے ہدایت ہے کہ صدر دفتر کے ساتھ لگاتار رابطہ قائم رکھیں۔ جب کسی مبلغ کی طرف سے کچھ دیر تک کوئی پیغام نہیں آتا تو فوراً ایک ہوائی جہاز اس کی خیر و عافیت معلوم کرنے کے لیے روانہ کر دیا جاتا ہے۔

ریڈیو کا جال جس طرح مبلغوں کی ہر وقت خدمت انجام دیتا ہے اس کی وضاحت کے لیے ایک مثال کا ذکر بے جا نہ ہوگا۔ ایک دور دراز وحشی قبیلے میں صرف دو نوجوان لڑکیاں کام کر رہی تھیں۔ شاؤ نیز اینڈ انھیں اکیلی بھیجنے پر رضامند نہ تھا۔ مگر انھوں نے کہا کہ کیا خدا اپنے خادموں کی حفاظت کا ذمہ نہیں لیتا؟ شاؤ نیز اینڈ نے کہا کیوں نہیں۔ وہ بولیں پھر آپ کو ہمیں اکیلے بھیجنے میں تامل کیوں ہے خدا ہمارا نگہبان ہے۔ چناں چہ شاؤ نیز اینڈ نے انھیں بھیج دیا۔ جس قبیلے میں انھیں کام کرنا تھا۔ اس کا سردار اپنی تند خوئی کے لیے مشہور تھا۔ مگر اس نے ان گوری لڑکیوں کو کچھ نہ کہا۔ ایک رات قبائلیوں کا ایک گروہ نشے میں مدہوش ان لڑکیوں کی جھونپڑی کی طرف چل دیا۔ ان کی نیت خراب تھی۔ گوری لڑکیوں کو ایک قبائلی عورت نے اس بات سے آگاہ کر دیا۔ وہ فوراً جنگل میں جا چھپیں جب بدمست قبائلی انھیں نہ پا کر واپس چلے گئے تو لڑکیوں نے اس واقع کی اطلاع فوراً صدر دفتر کو دی۔ وہاں سے قبیلے کے سردار کے نام پیغام آیا کہ یہ بڑی عجیب بات ہے کہ تمہارے جیسے با جرأت سردار کے ماتحت رہنے والے لوگ دو بے بس لڑکیوں کو تنگ کریں۔ سردار کی حمیت جھٹ جوش میں آئی اور اس نے لڑکیوں کی حفاظت کا ذمہ لیا۔

بعد میں وہ ان لڑکیوں کی کوششوں سے عیسائی بن گیا۔ اس وقت اس نے اعتراف کیا کہ اگر کوئی مرد اس جگہ تبلیغ کے لیے آتا تو میں اسے دیکھتے ہی ہلاک کر دیتا۔ اگر میاں بیوی آتے تو میں مرد کو قتل کر دیتا اور اس کی بیوی کو اپنے حرم میں داخل کر لیتا۔ مگر میں ان دو لڑکیوں کے سامنے بالکل بے بس ہو گیا جو مجھے بھائی کہہ کر پکارتی تھیں۔

توہم پرستی کے خلاف جنگ

ٹاؤنز اینڈ اور اس کی تبلیغی جماعت کو صرف تعلیم کی اشاعت ہی نہیں کرنی پڑتی انھیں توہم پرستی کے خلاف بھی لگاتار جنگ لڑنی پڑتی ہے جن وحشی اور نیم وحشی قبیلوں میں انھیں کام کرنا پڑتا ہے وہاں آج تک طبی علاج کا گزر نہیں ہوا، وہاں ہر بیماری کا علاج جادو ٹونے سے ہوتا ہے۔ ہر قبیلے میں مشہور جادوگر موجود ہیں جن کی ہر وقت مانگ رہتی ہے۔

ان لوگوں کے علاج کا طریق یہ ہے کہ نشہ پی کر بیمار کے پاس جاتے ہیں اور جسم کے جس حصے میں تکلیف ہو وہاں اپنا منہ رکھ دیتے ہیں اور اسے اس زور سے کاٹتے ہیں کہ خون نکل آتا ہے، اس خون کو وہ زمین پر تھوک دیتے ہیں۔ اب وہ مریض کے ارد گرد ناچتے ہوئے اور عجیب و غریب حرکات کرتے ہوئے چکر لگانے لگتے ہیں۔ ہر بار جب وہ زمین پر گرے ہوئے خون کے پاس آتے ہیں تو اس پر طرح طرح کی لعنت بھیجتے ہیں۔ آخر جب جسمانی تھکان اور نشے کی وجہ سے نیند کا غلبہ ہو جاتا ہے تو یہ جادوگر اسی جگہ زمین پر گر کر سو جاتے ہیں۔ جاگنے پر یہ قبیلے میں سے اس مرد یا عورت کا نام لے دیتے ہیں جس کو انھوں نے خواب میں دیکھا ہو۔ یہ شخص مریض پر جادو کرنے کا مجرم سمجھا جاتا ہے اور اسے قبیلے میں سے نکال دیا جاتا ہے۔ اگر مریض بیماری سے جاں بر نہ ہو سکے تو اس شخص کو قتل کر دیا جاتا ہے۔

لیکن مسیحی مبلغوں کی پھیلائی ہوئی روشنی کے طفیل قبائلی جادو ٹونے کی بجائے جدید علاج کی طرف رجوع کرنے لگے۔ مبلغوں کو جو تربیت دی جاتی ہے اس میں اچھی خاصی طبی تربیت بھی شامل ہے۔ عام طور پر ہر قبیلے میں دو مبلغوں کو بھیجا جاتا ہے۔ ان میں سے کم از کم ایک کے لیے طبی مدد دینے کے قابل ہونا ضروری ہے۔ ان لوگوں کی کوششوں سے اب عام قبائلی جادو ٹونے چھوڑ کر دواؤں اور ٹیکوں کی طرف رجوع کرنے لگے ہیں۔ حد یہ ہے کہ بہت سی حالتوں میں جادوگر بیکار رہتے جا رہے ہیں۔ اور جنگلوں میں جگہ جگہ بڑے بڑے ہسپتال قائم ہو رہے ہیں۔ جہاں دواؤں کے ذخیروں کے علاوہ ایکس رے اور ہر قسم کا دوسرا سامان بھی موجود ہے۔ غرض ایمرسن

عیسائیوں کو تاریخ میں پہلی بار معقول طبی سہولتیں حاصل ہوئی ہیں۔ انھیں پہلی بار یہ نعمت میسر آئی ہے کہ بیماری کی حالت میں حیوانوں کی طرح بے بسی کے عالم میں تڑپنے کی بجائے ان طبی سہولتوں سے فائدہ اٹھائیں جو جدید سائنس نے انسان کو عطا کی ہیں۔

یہاں یہ امر قابل لحاظ ہے کہ جنوبی امریکہ کی تمام ریاستیں ہسپانیہ اور پرتگال کے لوگوں کی آبادی ہوئی ہیں اور یورپ کے یہ دونوں ملک کٹر رومن کیتھولک ہیں۔ ملکہ ٹاؤنسزاینڈ اور اس کے ساتھی پروٹسٹنٹ مذہب سے تعلق رکھتے ہیں۔ عیسائیوں کے ان دونوں فرقوں میں ہمیشہ سے بیر چلا آیا ہے۔ چناں چہ پیرو کے دارالسلطنت لیما کے ایک مشہور اخبار میں ایک سربرآوردہ رومن کیتھولک کے قلم سے مضامین کا ایک سلسلہ شائع ہوا جس میں کہا گیا کہ جنوبی امریکہ پر پروٹسٹنٹ بھیڑیوں نے حملہ کر رکھا ہے۔ اس کے جواب میں ٹاؤنسزاینڈ نے لکھا کہ ہم پروٹسٹنٹ مذہب نہیں پھیلا رہے بلکہ صرف مسیحی تعلیمات پھیلا رہے ہیں۔ ہم لوگوں کو کسی خاص فرقے کی عبادات نہیں سکھا رہے بلکہ انھیں جہالت اور توہم پرستی سے نکال کر محبت اخوت اور سائنسی علم کی برکتیں عطا کر رہے ہیں۔ اس جواب کا نتیجہ خاطر خواہ نکلا۔ ٹاؤنسزاینڈ پر حملے ختم ہو گئے۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ پوپ کے نمائندے متعین لیما نے ٹاؤنسزاینڈ کے کام کو سراہا اور اس کے لیے خدا سے برکت طلب کی۔

حال ہی میں ایک شخص نے ٹاؤنسزاینڈ سے پوچھا کہ کیا آپ کو یقین ہے کہ آپ دنیا کی ان دو ہزار زبانوں میں انجیل کا ترجمہ کر سکیں گے جن میں ابھی اس کا ترجمہ نہیں ہوا۔ ابھی تک آپ صرف ۱۸۰ زبانوں میں یہ خدمت انجام دے سکے ہیں۔ اس نے کہا ہاں مجھے اس بات کا پورا یقین ہے۔ ۱۹۴۲ء میں ہم صرف ایک ملک میں کام کر رہے تھے۔ اس وقت ہم بارہ ملکوں میں یہ خدمت انجام دے رہے ہیں۔ مبلغوں کی تعداد کے لحاظ سے ہم نے اس وقت سے لے کر آج تک ایک ہزار فی صد ترقی کی ہے۔ اس رفتار پر چلتے ہوئے ہم اگلے پندرہ سال میں اپنا نصب العین حاصل کر لیں گے۔

"نائوسنز اینڈ کا مقولہ ہے کہ :۔ "اگر تم گھر سے باہر نہیں نکلو گے تو خدا تمہیں خود پکڑ کر کہیں نہیں لے جائے گا۔ لیکن اگر تم اس کی خاطر کسی جگہ بھی جاؤ گے تو وہ تمہاری دست گیری کرے گا"۔
اپنے طریق کار کی وضاحت کرتے ہوئے اس نے کہا :۔ "ہم اپنی دلی آرزو خدا کے حضور میں پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر یہ محض ہماری آرزو نہیں اور تیری رضا بھی یہی ہے تو ہمارے لیے راستہ کھول دے"۔

قابل تقلید

اوپر کی سطور میں ایک فرد واحد کے دینی جوش اور جذبۂ تبلیغ کی کارفرمائیوں کا جو مختصر سا ذکر کیا گیا ہے اس میں صاحب نظر لوگوں کے لیے بہت سے سبق پوشیدہ ہیں۔ دیدہ ور لوگوں نے اس حقیقت کو بہت اچھی طرح سمجھا ہے کہ دینی تبلیغ محض دوسروں کو رسمی عبادات سکھانے کا نام نہیں، بلکہ یہ زندگی میں ایک دوررس انقلاب پیدا کرنے کا نام ہے۔ ایک ایسا انقلاب جو انسانیت کو جہالت، توہم پرستی اور ذلت کی پستیوں سے اٹھا کر تہذیب و شائستگی کی بلندیوں پر پہنچا دے۔ آج جو شخص دینی تبلیغ کا کام کرنا چاہے اس کے لیے صرف مذہبی کتابوں کا جاننا کافی نہیں۔ بلکہ اسے اشاعت تعلیم اور حفظان صحت کے سائنسی طریقوں سے بھی اچھی طرح واقف ہونا چاہیے۔ نیز اسے جدید سائنس اور ٹکنالوجی سے بھرپور خدمت لینی چاہیے۔ دینی تعلیم اگر خدا کا کام ہے تو اس کام کے کرنے والے کو خدا کی بنائی ہوئی ان تمام قوتوں سے پوری پوری خدمت لینی چاہیے جن کا پتہ جدید سائنس نے دیا ہے۔

پاکستان کے قیام کے بعد ہم میں سے تقریباً ہر ایک نے انفرادی بہبود کے لیے کافی کچھ کیا ہے مگر من حیث القوم ابھی ہم نے تبلیغ دین کے لیے کچھ نہیں کیا جس تبلیغی کوشش کی روشن مثال اوپر دی گئی ہے اس سے ظاہر ہے کہ علم کی روشنی پھیلائے بغیر کوئی تبلیغ موثر نہیں ہوسکتی۔ یہ روشنی ہمارے اپنے ملک میں ابھی بڑی حد تک پھیلنی باقی ہے۔ پاکستان کو آج اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ نوجوانوں کی ایک ایسی جماعت تیار ہو جو تبلیغ کی صحیح روح کو سمجھے اور بے خبر انسانوں کو دین فطرت کی برکتوں سے مالا مال کر دے۔

اُردو پڑھنا سکھانے کا صحیح طریقہ

ایم سرائن داس

پاکستان میں پرائمری تعلیم کی کامیابی کا مقصد دو باتوں پر منحصر ہے نمبر ۱۔ صحیح طریقہ تعلیم نمبر ۲ طلبہ میں سوچ سمجھ کر پڑھنے اور اس سے لطف اٹھانے کی عادت پختہ ہو جائے۔ اکثر پرائمری مدارس میں ان دو مقاصد کے حاصل کرنے کی حتی الامکان کوشش نہیں کی جاتی۔ ایک تجربہ کار ماہرین فن تعلیم نے ہند و پاکستان مدرس کے مروجہ طریقوں کی بابت فرمایا ہے کہ ناقص طریقۂ تعلیم کی وجہ سے آج کل پاکستان میں بے شمار روپیہ وقت اور انسانی قوت ناجائز اور غیر مفید طور پر استعمال ہو رہی ہے۔ پہلی جماعت کے بچوں کا زیادہ تر وقت عموماً پڑھنا سکھانے میں نو صرف کیا جاتا ہے۔ لیکن جب سال کے اختتام پر نتیجہ نکالا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ جماعت ہی سے بہت کم بچے ایسے ہیں جو کسی آسان کہانی کو خود بخود خوشی سے پڑھ سکتے ہیں۔ اگر صحیح طریقۂ تعلیم سے پڑھنا سکھایا جائے تو مقررہ وقت کے ایک تہائی یا نصف حصے میں وہی طلبہ بہترین نتائج دکھا سکتے ہیں اور مقررہ وقت کا باقی حصہ طلبا بہت سے دیگر مفید مشاغل مثلاً دستی کام، کہانی سنانے اور عام واقفیت حاصل کرنے میں صرف کر سکتے ہیں (دوسرا مقصد) یعنی پڑھنے کی عادت کو پختہ بنانا شاذ و نادر ہی پورا ہوتا ہے۔ پرائمری سکول کے اکثر طلبہ پڑھائی کے فن پر عبور حاصل کرنے سے پہلے ہی مدرسہ چھوڑ جاتے ہیں۔ اس کی خاص وجہ یہی ہے کہ ہمارا پڑھنے کا طریقۂ تعلیم نہایت بوسیدہ اور ناقص ہے۔ ہمارے سکولوں میں پڑھانے کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے ان کو حروف تہجی کے نام ترتیب وار سکھائے جاتے ہیں۔ لیکن اس سے بچے پڑھنے کی ابتدا ایسی مشقوں سے کرتے ہیں جو ان کے لیے بے معنی اور غیر دلچسپ ہوتی ہیں۔ علاوہ ازیں اس طریقہ سے ان میں الفاظ کو حرف بحرف شناخت کرنے کی بُری عادت پڑ جاتی ہے جو ان کے پڑھنے کی رفتار کو بڑھنے نہیں دیتی۔ بغیر سوچے سمجھے طوطے کی طرح پڑھنے کے اس طریقے سے بچوں میں خوشی سے پڑھنے کی عادت بھی پختہ نہیں ہوتی (مشترکہ طریقہ) پڑھنا

سکھانے کے طریقے جو جدید طریقہ تعلیم کے بہت سے ہندوستانی مدارس میں موثر اور مفید ثابت ہوئے ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں ۱۔ لفظوں کا طریقہ ۲۔ جملوں کا طریقہ ۳۔ طریق الصوت ۴۔ کہانی کا طریقہ۔ جملہ تمام طریقوں کو ملا کر ایک طریقہ تیار کیا گیا ہے جو کہ ٹریننگ سکول موگا میں کئی سال تک ان کا عملی تجربہ ہوتا رہا ہے۔ مجھے اس سکول کا طالب علم ہونے کا فخر حاصل ہے اور میں اس طریقہ تعلیم کا تجربہ کئی سال تک پرائمری مدارس میں کر چکا ہوں جو کہ حقیقت پر مبنی ہے۔ اس طریقہ سے اردو پڑھنا سکھانے کے لیے خاص باتیں جو یاد رکھنے کے قابل ہیں مختصر طور پر ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔

پڑھنے کا دلچسپ مصالحہ ۱۔ ابتدا ہی سے پڑھنے کے اسباق بچوں کے لیے دلچسپ اور معنی خیز ہوں کیونکہ بچے بے معنی حروف اور آوازوں کی بجائے ایسے لفظوں اور جملوں کو جو ان کے لیے دلچسپ اور پُر مطلب ہوں فوراً سیکھ جاتے ہیں۔ وہ ایسے پڑھنے کو ایک بے معنی اور مبہم عمل نہیں سمجھتے، بلکہ اسے اپنے خیالات کے اظہار کا وسیلہ سمجھتے ہیں ۲۔ پڑھنا سکھانے کے لیے ایسا مصالحہ جو بچوں کی روزمرہ کی زندگی سے تعلق رکھتا ہو۔ پڑھنا سکھانے کی ابتدا ایسے جملوں اور لفظوں سے کرنی چاہیے جو بچوں کی دلچسپی کا باعث ہوں سب سے پہلے واحد لفظ جو بچوں کو سکھانا چاہیے وہ ان کا اپنا اپنا نام ہے۔ استاد کو چاہیے کہ وہ اس نصاب کے تمام سلسلہ میں پڑھنے کے مصالحہ کو ہمیشہ بچوں کی روزانہ زندگی سے تعلق دیتا جائے ۳۔ الفاظ کا اعادہ الفاظ کا اعادہ اس طریقے میں نہایت ضروری بات ہے۔ ترتیب وار نئے الفاظ کا اضافہ کیا جاتا ہے اور پرانے الفاظ بار بار استعمال کیے جاتے ہیں۔ جب بچہ نئے صفحہ پر نظر ڈالتا ہے تو اس صفحے کے بہت سے الفاظ پہچانتا ہے۔ اور ان کا مطلب سمجھتا ہے اور استاد کی تھوڑی سی مدد سے نئے الفاظ پڑھنے لگ جاتا ہے اور بعض الفاظ تصویروں کی مدد سے خود بخود پڑھ لیتا ہے ۴۔ زبانی اظہار خیالات۔ اس طریقے میں زبانی اظہار خیالات کی طرف بہت زیادہ توجہ دی جاتی ہے۔ گفتگو، ڈرامہ، کھیل اور دستی کام کے ذریعے بچے ان باتوں کو جنھیں وہ سیکھتے ہیں بخوبی سمجھ جاتے ہیں۔ یہ یاد رہے کہ بچے عموماً اردو الفاظ اور جملوں سے ناآشنا ہوتے ہیں۔ اس لیے زبانی اظہار خیالات کی مشق کا یہ قدم اس قدر ضروری ہے کہ اسے کبھی بھی نظر انداز نہ کیا جائے ۵۔ فقروں اور لفظوں کو پورا پورا پہچان کر پڑھنا۔ بچوں کو پہلے پہل یہ سکھایا جاتا ہے،

وہ پورے پورے فقروں فقلوں اور جملوں کو شناخت کر کے پڑھیں اور انھیں شروع ہی سے علیحدہ علیحدہ
لفظوں یا حرفوں کی طرف اشارہ کر کے پڑھنے سے روکا جائے نمبر ۲ حروف کی آوازیں سکھانا۔ اس طریقے کا
دوسرا قدم طریق الصوت شروع کرتا ہے۔ بچے کبھی بھی نئے الفاظ اور کہانیوں کو استاد کی مدد کے بغیر پڑھنے
کے قابل نہیں ہو سکتے۔ جب تک کہ انھیں حروف کی آوازوں کی شناخت اور ان کو آپس میں ملانے کا ڈھنگ
سکھایا جائے۔ چناں چہ جب انھیں حروف کی آوازوں کو آپس میں ملانے کا ڈھنگ آ جاتا ہے تو وہ
جہاں کہیں کسی لفظ کو دیکھتے ہیں تو اسے شناخت کر کے پڑھ لیتے ہیں۔ اکثر پاکستانی مدرسین کے لیے
طریقۂ تعلیم کا یہ قدم بہت مشکل ثابت ہوا ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ ان کی اردو الفاظ میں حروف
کے نام پکارنے کی عادت پختہ ہوتی ہے۔ اور انھوں نے اردو الفاظ کو ایسے طریقے سے ادا کرنا جس سے
ان کی علیحدہ علیحدہ آوازیں صاف ظاہر ہوں۔ سیکھا نہیں ہوتا۔ پس اس مشکل کو حل کرنے کے لیے
ہمارے مدرسین کی کتاب کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔ تاکہ اس کتاب کی ہدایات پر نہایت باریک بینی
اور تحقیق سے عمل درآمد کرنا چاہیے۔ پہلے پہل بچوں کو پورے الفاظ شناخت کرنے سکھائے جائیں حتیٰ کہ
ان تمام الفاظ کو جو قاعدہ پڑھنے کے لیے انھیں درکار ہے فقط ایک ہی نظر سے شناخت کرنے لگ جائیں۔

طریق الصوت:۔ یعنی حروف کی آوازیں سکھانے کے لیے ہمیشہ ایسے مصالحے کو استعمال
میں لایا جائے جو بچوں کے روزانہ دلچسپ سبقوں سے تعلق رکھتا ہو۔ یہ ثابت ہو چکا ہے کہ طریق الصوت کی
ایسی مشقیں جو بچوں کی پڑھنے کی ضروریات اور دلچسپی سے بعید ہوں بہت کم وقعت رکھتی ہیں۔ ہر ایک
استاد کو چاہیے کہ وہ اپنے اوقات فرصت میں عام اور روزمرہ کے الفاظ کو ایسے طریق سے بولنے کی مشق
کرے کہ آواز کے حصوں کے لحاظ سے ان کو علیحدہ علیحدہ آوازیں واضح طور پر سنی جا سکیں۔ اس طرح
بچوں کو نئے الفاظ پر عبور حاصل کرنا سکھانے میں بہت مدد ملے گی۔

ہجے سکھانے کا موقع:۔ اردو الفاظ کے ہجے کرنا سکھانا اس طریقۂ تعلیم میں نظر انداز نہیں کیا گیا
کیوں کہ اردو زبان میں ہجوں کا جاننا نہایت ضروری ہے۔ لیکن اس کو اس وقت تک ملتوی کیا جاتا
ہے۔ جب تک بچے مندرجہ ذیل نہ سیکھ لیں۔

(۱) متعدد الفاظ کو ایک ہی نظر میں شناخت کرنا

(۲) ایسے آسان فقروں کو جو کہ اُن کے سیکھے ہوئے الفاظ سے مرتب ہوں، تیزی اور ہوشیاری کی پڑھنا۔

(۳) بہت سے حروف کی آوازیں بتانا، اور اُن آوازوں کی مدد سے نئے الفاظ کا پڑھنا۔

جو طریقہ بچے سکھانے کا تجویز کیا جاتا ہے یہ ہے کہ بچے اپنے لیے لغایت مرتب کریں پہلے پہل الفاظ کی فہرستیں تختہ سیاہ پر لکھی جائیں۔ بعد میں کسی حرف کو لیا جائے، اور بچے اس حرف سے شروع ہونے والے مختلف الفاظ پیش کرتے ہیں اور استاد انھیں اس حرف کے نیچے تختہ سیاہ پر لکھتا جائے ؎

معلومات عامہ

پاکستان میں تیل صاف کرنے کا کارخانہ قائم کیا جائے گا

ڈھائی سال کے عرصہ میں پاکستان میں تیل صاف کرنے کا ایک نیا کارخانہ قائم کیا جائے گا۔ کارخانہ قائم کرنے کے سلسلہ میں حکومت پاکستان اور چار برطانوی، امریکی اور ولندیزی تیل کمپنیوں کے گروپ کے درمیان معاہدہ پر دستخط ہو گئے ہیں۔

یہ کارخانہ جو کورنگی میں قائم کیا جائے گا شروع میں ہر سال پندرہ لاکھ ٹن خام تیل صاف کرے گا اس سے پاکستان کے زرمبادلہ میں تین کروڑ تیس لاکھ روپے سالانہ کی بچت ہوا کرے گی۔ مزید برآں حکومت کو ایک کروڑ پچاس لاکھ روپے ٹیکس سے حاصل ہوں گے۔

ابتداء میں کارخانہ میں تقریباً چار سو افراد لازم رکھے جائیں گے۔ اور خاص تربیتی منصوبوں کی بناء پر نظم و نسق سے متعلق پاکستانی افسروں کی تعداد بڑھتی رہے گی۔

چاروں متعلقہ کمپنیاں یہ ہیں۔ برما آئل کمپنی لمیٹڈ۔ کیلفورنیا ٹیکساز تیل کارپوریشن (کالٹیکس) شیل پٹرولیم کمپنی لمیٹڈ اور اسٹینڈرڈ ویکیوم آئل کمپنی۔

کارخانہ قائم کرنے کے معاہدہ پر ۱۰ ستمبر کو حکومت پاکستان کی طرف سے وزارت صنعت کے سیکرٹری مسٹر نصیر احمد اور تیل کمپنیوں کے گروپ کی جانب سے مسٹر جے ایف اسٹرین۔ مینجنگ ڈائرکٹر برما آئل کمپنی نے دستخط کیے۔

بعد میں وزیر صنعت مسٹر ابوالقاسم خاں نے ایک پریس کانفرنس میں ایک بیان دیا تھا جو مندرجہ ذیل نکات پر مشتمل تھا۔

(۱) تیل صاف کرنے کا یہ کارخانہ کورنگی میں ڈیرہ بنایا جائے گا۔ اور کمپنیوں کا گروپ جگہ کا انتخاب کرنے کا مجاز ہوگا... سے آئندہ وقت دی جائے گی کہ وہ ... لاکھ

تیل صاف کرنے لگے گا۔

(۲) اس کارخانہ کے قیام پر اندازاً ساڑھے پندرہ کروڑ روپیہ خرچ ہوگا۔ اور کارخانہ کا کام شروع کرنے کے لیے ایک کروڑ روپیہ درکار ہوگا۔ ساڑھے سولہ کروڑ روپے کی کل رقم میں سے گیارہ کروڑ روپے کی رقم زرمبادلہ میں اور ساڑھے پانچ کروڑ روپے کی رقم پاکستانی کرنسی کی شکل میں ہوگی۔

(۳) کارخانہ چلانے والی کمپنی پاکستان میں رجسٹرڈ ہوگی جس میں چالیس فی صد حصص پاکستانی حصہ داروں کے ہوں گے اور بقایا ساٹھ فی صد حصص چار دوں غیر ملکی کمپنیوں کے گروپ میں تقسیم ہو جائیں گے۔

(۴) کارخانہ چلانے والی کمپنی کا انتظام ڈائرکٹروں کا ایک بورڈ کرے گا جس میں پاکستانی اور غیر پاکستانی حصہ داروں کی نمائندگی ان کے حصوں کی مناسبت سے ہوگی۔

(۵) کارخانہ غیر ملکوں سے خام تیل سب سے زیادہ سستے داموں پر خریدے گا۔ تیل کمپنیوں کو اجازت ہوگی کہ وہ اپنے غیر ملکوں کے ہیڈ کوارٹروں سے خام تیل درآمد کریں۔ یہ انتظام بھی کیا جائے گا کہ پاکستان میں پایا جانے والا خام تیل بھی اس کارخانہ میں صاف کیا جائے۔

(۶) یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ کارخانہ کی تیار کردہ اشیاء کے دام ان ہی اقسام کی درآمد شدہ اشیاء سے زیادہ نہ ہوں گے۔

(۷) کمپنی تمام شعبوں میں پاکستانی شہریوں کی بھرتی اور تربیت کا بندوبست کرے گی۔

(۸) یہ بھی فیصلہ کیا گیا ہے کہ حکومت محکمہ دفاع اور ریلوے کے لیے کارخانہ سے براہ راست تھوک قیمت پر مال خریدے گی

امید ہے کہ تیل صاف کرنے کا یہ کارخانہ کوئی ڈھائی سال کے عرصہ میں مکمل ہو جائے گا جب یہ کارخانہ کام شروع کر دے گا تو اس سے پاکستان ہر سال تین کروڑ تیس لاکھ روپے کے بقدر زرمبادلہ بچا سکے گا۔ کیوں کہ درآمد شدہ خام تیل کی قیمت تیار شدہ مصنوعات کے مقابلہ میں بہت کم

ہوگی۔ اس کارخانہ کے قیام سے بہت سے پاکستانیوں کو روزگار مل جائے گا ۔ اور یہ بہت سی نئی
صنعتوں کے قیام کا باعث ہوگا ۔

دو پاکستانیوں کو وظیفے

پاکستان شیل آئیل کمپنی نے پٹرولیم انجینیری اور علم ارضیات کی اعلیٰ تعلیم کے لیے دو پاکستانیوں
کو وظیفے مقرر کیے ہیں ۔ سات سو ستر پونڈ سالانہ کے یہ دو وظیفے دو سال تک جاری رہیں گے ۔
لاہور کے مسٹر آفتاب عالم اور مسٹر محمد فاروق عادل کو یہ وظیفے ملے ہیں ۔ مسٹر آفتاب عالم
کرسچین کالج، لاہور میں علم طبیعیات کے لیکچرر تھے جو علم ارضیات میں ایک سال کا پوسٹ گریجوایٹ
کورس کرنے کے بعد امپیریل کالج آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی سے ڈپلوما لیں گے ۔
مسٹر فاروق میکانکی انجینیری میں گریجوایٹ ہیں اور انھیں گذشتہ سال پنجاب یونیورسٹی
کی جانب سے طلائی تمغہ انعام میں ملا تھا ۔ وہ امپیریل کالج آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی میں پٹرولیم
انجینیری میں پوسٹ گریجوایٹ کورس کریں گے جس کی میعاد ایک سال ہے ۔

فلاحِ خاندان

بچوں کو بچوں کے محتاج خانے آجکل خاص اہمیت رکھتے ہیں ۔ چناں چہ فلاحِ خاندان کے
مزید روشنی ڈالنا بڑا اہم عمل ہے ۔ خاندان کی اہمیت کا اعتراف بیشتر سماجی کام سے گہرا رشتہ رکھ
اور برطانیہ میں تقریباً ایک سو اسی رضاکار ادارے ہیں جو خاندانوں کی معیشت اور تکلیف کی حا
ہر طرح مدد کرتے ہیں ۔ ان میں سب سے زیادہ اہم لندن میں فیملی ویلفیئر ایسوسی ایشن (انجم
خاندان) ہے جو ہر سال چار ہزار سے زیادہ خاندانوں سے منسلک ہے ۔ ہر ضرورت مند خاندان انجمن
کی ذمہ داری بن جاتا ہے اور یہ امداد کسی نوعیت کی بھی ہو سکتی ہے ، مالی ، عملی ، ذاتی ۔ تاکہ خا
اس کے اپنے پیروں پر کھڑا کیا جا سکے ۔ اس زمانہ میں مالی امداد سے زیادہ اہم ذاتی مسائل کا
خاندانی بہبود کے بیشتر ادارے رضاکار کمیٹیاں چلاتی ہیں جو مقامی حالات سے ماہر
جو ایک سکریٹری اور دوسرے تربیت یافتہ کارکنوں کے ذریعہ کام کرتی ہیں ۔ رضاکار

پنشنروں سے دوستانہ ملاقاتیں کرکے کئی طریقہ سے ان کے لیے مفید ثابت ہوتے ہیں۔

ایسے خاندان جو مسائل سے دوچار ہیں، برطانیہ میں ایک ہزار خاندانوں میں دو ہیں، اور ان پر ان کے تناسب سے زیادہ سماجی فنڈ صرف ہو جاتے ہیں۔ اور محنت وجدوجہد علیحدہ رہی۔ ان کا شمار ان خاندانوں میں ہے جن کے گھریلو حالات اس قدر بے ترتیب ہو گئے ہیں کہ ان میں بچہ کی پوری طرح نگرانی و پرداخت بھی ممکن نہیں۔

جنگ کے زمانے میں رضاکار ادارہ نے ایسے خاندانوں میں خدمات انجام دیں انھوں نے ان کا اعتماد حاصل کیا۔ ان کو گھروں کی صفائی کے کام پر لگایا اور انھیں دوبارہ آباد کرنے میں ہر ممکن مالی امداد دی اور از سر نو زندگی ابھرکرنے کے سلسلہ میں ان کی پوری پوری حوصلہ افزائی کی۔

جنگ کے بعد بھی رضاکار ادارہ نے اپنا کام جاری رکھا۔ ہر یونٹ پانچ سے دس تک تربیت یافتہ کارکنوں کی ٹیم پر مشتمل ہوتا ہے۔ ہر کارکن تقریب بارہ اور پندرہ خاندانوں کا ذمہ دار ہوتا ہے (یہ ضروری نہیں ہے کہ سب کو بیک وقت مدد کی ضرورت ہوتی ہے) یہ کارکن ایک نگران کار کی ہدایت کے مطابق کام کرتا ہے۔

دل کا اپریشن

دل کے امراض کے چند برطانوی ماہر دل کے امراض کے آپریشن کرنے کی غرض سے گذشتہ دنوں ...سکو گئے تھے۔ ان کی روانگی سے قبل دل کی سرجری کے سلسلہ میں ایک اور کامیابی کا اعلان کیا گیا جس کے ...بارے میں مجلہ لندن پریکٹیشنر کے ایڈیٹر ڈاکٹر ولیم ٹامسن آپ سے گفتگو کریں گے۔

ہم میں سے بہت سے لوگوں کے لیے یہ بات بڑی خوش آگین ہے کہ سرجن کبھی مطمئن نہیں ...ہوتے۔ جونہی وہ اس فن میں کوئی ترقی کرتے ہیں، اس کے فوراً بعد وہ یہ سوچنا شروع کر دیتے ہیں ...اس سے بہتر اور کیا ہو سکتا ہے۔ کسی نئے آپریشن کی جزئیات کو جب تکمیل تک پہنچا کر اس ...بنا لیا جاتا ہے کہ انھیں مریضوں پر آزمایا جا سکے تو اس دوران میں سرجیکل ریسرچ انسٹیٹیوٹ ...کام کرنے والے طلبا کسی نئے اور زیادہ موثر آپریشن کے بارے میں تحقیقات کر رہے ہوتے ہیں۔

یہ بات سرجری کی کسی شاخ پر اس قدر صادق نہیں آتی جتنی کہ دل کے آپریشن کے بارے میں درست ہے۔ یہ کوئی زیادہ مدت کی بات نہیں جب دل کا آپریشن عملاً ایک محال سمجھا جاتا تھا۔ لیکن آج ہزاروں ایسے آپریشن ہر سال کیے جاتے ہیں اور ان کے نتائج بھی خاطر خواہ نکلتے ہیں۔ سرجن بھی اب اس قدر ماہر ہو گئے ہیں کہ شاید ہی کوئی ایسا نقص ہو جسے دُور کرنے کے لیے وہ تیار نہ ہو جائیں۔

آپریشن جس قدر مشکل ہوگا اسی قدر اس بات کی اہمیت بڑھ جائے گی کہ آپریشن کے دوران میں دل اسی قدر زیادہ پُرسکون رہے۔ اس امر کو محسوس کرنے کے لیے کسی زیادہ تصور کی ضرورت نہیں کہ دل جو ایک منٹ میں ساٹھ سے اسی بار دھڑکتا ہے اس کا آپریشن کتنا مشکل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کئی برس تک سرجن اور ان کے رفقائے کار جو تحقیقات میں مصروف تھے، ایسے طریقے دریافت کرنے میں لگے ہوئے تھے جن سے دل کی حرکت کو روکا جا سکے اور مریض کو بھی کوئی نقصان نہ پہنچے۔

اس کے لیے جو طریقے استعمال ہوتے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ مصنوعی دل جسے "دل اور پھیپھڑا مشین" کہا جاتا ہے، استعمال میں لایا جاتا ہے۔ یہ مشین تھوڑے وقفے کے لیے دوران خون کو بحال رکھتی ہے اور جب سرجن دل پر عمل جراحی کر رہا ہوتا ہے تو اس دوران میں مریض کا دل حرکت نہیں کرتا۔

دوسرا طریقہ ہائی پوتھرمیا کی ترغیب دینا ہے۔ ہائی پوتھرمیا کا مطلب عام الفاظ میں "کم درجہ حرارت" ہے۔ دل کے امراض کا سرجن ہائی پوتھرمیا میں اس لیے دل چسپی لیتا ہے کہ جسم کا درجۂ حرارت جس قدر کم ہوگا اسی قدر یہ آکسیجن کے بغیر رہ سکے گا۔ خون کا اہم ترین مقصد یہ ہوتا ہے کہ پھیپھڑوں سے آکسیجن لے کر جسم کے باقی حصوں میں پہنچائے۔ اس لیے جسم کو آکسیجن کی جس قدر تھوڑی ضرورت ہوگی اتنا ہی زیادہ دیر تک کے لیے دل کی حرکت کو بغیر کسی ضرر کے روکا جا سکتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ہائی پوتھرمیا کم درجۂ حرارت جسم کے مختلف حصوں کو تھوڑی آکسیجن پر اکتفا کی اجازت دیتا ہے اور جسم کے خلیوں کے سلسلے کی سرگرمیوں کو بہت کم کر دیتا ہے۔ جس قدر ہم سرگرم عمل

ہوں گے اسی قدر ہمیں زیادہ آکسیجن کی ضرورت ہو گی۔ ہم سب جانتے ہیں کہ جب ہم کوئی سخت قسم کی ورزش کرتے ہیں تو ہمارا سانس گہرا اور تیز ہو جاتا ہے، یہ اس لیے ہوتا ہے کہ خون جب پھیپھڑوں میں سے گردش کرے تو اسے زیادہ سے زیادہ آکسیجن میسر آسکے۔ اسی طرح جب ہمیں بخار آتا ہے تو ہمارا سانس اور نبض تیز ہو جاتی ہے، اس لیے کہ جسم کے درجۂ حرارت کے بڑھ جانے کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے جسم کے خلیوں کو زیادہ آکسیجن کی ضرورت ہے۔ جب درجۂ حرارت کم ہو جاتا ہے تو اس کے برعکس عمل ہوتا ہے یعنی جسم کو کم مقدار میں آکسیجن کی ضرورت پڑتی ہے۔ چناں چہ تھوڑی دیر کے لیے دل کی حرکت کو روک لینا ممکن ہو جاتا ہے۔ اس سے جسم کے اہم ترین حصے مثلاً دماغ کو نقصان بھی نہیں پہنچتا

بہرحال ایسی حدود بھی ہیں جن سے جسم کا زیادہ درجۂ حرارت خطرے کے بغیر کم نہیں کیا جاسکتا اگر درجۂ حرارت ۸۶ درجے سنٹی گریڈ سے کم ہو جائے (عام صحت مند جسم کا درجۂ حرارت ۳۷ درجے ہوتا ہے) تو اس سے دل کا عمل اس قدر غیر منظم ہو جاتا ہے کہ اس کا دوبارہ نئے سرے سے ٹھیک عمل کرنا ممکن نہیں رہتا۔ اس درجۂ حرارت میں زیادہ سے زیادہ دس منٹ کے وقفے کے لیے دل کی حرکت کو بلا اندیشہ روکا جاسکتا ہے۔ دس منٹ کوئی زیادہ عرصہ نہیں ہے جس میں ایک سرجن دل پر عمل جراحی کر سکے، اس لیے محقق شب و روز محنت سے اس مشکل کے حل کے طریق سوچ رہے ہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ ویسٹ منسٹر ہسپتال لندن کے برطانوی سرجنوں نے اب اس مسئلہ کا حل تلاش کر لیا ہے۔ انھوں نے ہائی پوتھرمیا اور ''دل پھیپھڑا مشین'' دونوں کے عمل کو ملا کر اس سے کام لینا شروع کر دیا ہے۔ اس سے وہ جسم کے درجۂ حرارت کو ۱۵ درجے سنٹی گریڈ تک گھٹانے میں کامیاب ہو گئے ہیں اور درجۂ حرارت پر دل کی حرکت کو ۴۵ منٹ تک روکا جاسکتا ہے۔

رہی یہ چیز کہ اس طریقے پر کیسے عمل درآمد ہو سکتا ہے تو اس کی وضاحت ایک مریض پر عمل جراحی کی روداد سے کی جاسکتی ہے۔ ایک ڈھائی برس کے لڑکے کو جوف کو دل کا نقص تھا۔ عام اصطلاح میں اس مرض کو ''دل میں سوراخ'' کہا جاتا ہے۔

اس لڑکے کا خون کولنگ مشین (سرد کرنے والی مشین) کے ذریعے پمپ کیا گیا۔ یہاں تک کہ

اس کے بدن کا درجۂ حرارت ۱۵ ڈگری سینٹی گریڈ تک گر گیا۔ اس کے بعد پمپ کا عمل روک دیا گیا جس ۴۵ منٹ تک کوئی دوران خون نہیں تھا۔ اس دوران میں دل کے سوراخ کو درست کر دیا گیا۔ اس کے بعد دوبارہ پمپ کا عمل جاری کیا گیا۔ اب کے بار پمپ کرنے سے خون میں حرارت پیدا ہوئی اور آہستہ آہستہ دل نے پمپ کی بجائے معمول کا کام خود سنبھال لیا۔ خون میں دوبارہ حرکت پیدا کرنے کے عمل نے ۵ منٹ لیے اور کوئی آدھ گھنٹہ بعد لڑکا معمول کے مطابق بات کرنے لگا۔ اسی طریقے سے جن بچے مریضوں میں کامیابی سے آپریشن کیا گیا ہے یہ لڑکا ان میں سے ایک ہے، وہ دن دور نہیں جب دل کا مشکل ترین آپریشن اور زیادہ کامیابی سے کیا جا سکے گا۔ اور جس سے مریض کو پھر سے بھرپور اور مسرور زندگی میسر آئے گی۔

مزدوروں کو طبی سہولتیں

برطانیہ کے وزیر صحت کی ایک حالیہ رپورٹ کے مطابق ادارہ قومی صحت کے تحت انگلستان اور ویلز میں ہر مرد، عورت اور بچے کو طبی امداد بہم پہنچانے کے جاری اخراجات ہر سال تقریباً ۱۱ پونڈ ۸ شلنگ ہیں (اسکاٹ لینڈ کا حساب الگ ہے) بظاہر یہ رقم خاصی بڑی نظر آتی ہے لیکن بیشتر برطانوی باشندوں کی یہ رائے ہے کہ یہ خرچہ کارآمد ہے، فضول نہیں۔ ان کی یہ رائے ادارہ قومی صحت کے گیارہ سال کے دوران میں ان کے حاصل کردہ ذاتی تجربہ پر مبنی ہے۔

برطانیہ کے ٹریڈ یونین ممبروں کو یقینی طور پر اس بات کا کوئی افسوس نہیں کہ ان کو ادارہ قومی صحت کے لیے ٹیکس ادا کرنا پڑتا ہے۔ ان کو اس ادارہ سے دو طرح فائدہ پہنچ رہا ہے۔ ایک تو ان کے خاندان کے افراد کی صحت اچھی رہتی ہے۔ دوسرے وہ جتنے کم بیمار ہوں گے اتنا کم ان کو اپنے کام سے غیر حاضر رہنا پڑے گا اور ان کی اجرت کم کاٹی جائے گی۔

ٹریڈ یونین کے ممبر قومی صحت سروس کو وسیع تر کرنے کے متمنی ہیں۔ ٹریڈ یونین کانگریس عرصہ سے اس بات کی کوشش کر رہی ہے کہ اس سروس کا سلسلہ ایک جامع ادارہ صنعتی صحت کے ساتھ جوڑا جائے۔

آجکل قومی صحت سروس گھریلو بنیاد پر چل رہی ہے۔ اس کا سارا ڈھانچہ فیملی ڈاکٹر کے گرد گھومتا ہے ٹریڈ یونین کانگریس یہ چاہتی ہے کہ اس سروس کے ساتھ ساتھ صنعتی صحت سروس بھی چلائی جائے۔ ایسی سروس ضرورت کے مطابق فیملی ڈاکٹر سے تعاون کرے گی۔ لیکن زیادہ زور ایسے امور پہ دیا جائے گا جن کا تعلق صنعتوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی صحت سے ہے۔

برطانیہ میں اب بھی ایسے قوانین ہیں جن کے تحت مزدوروں کی صحت کی حفاظت کی جاتی ہے اور ان کی فلاح و بہبود کو فروغ دیا جاتا ہے۔ بہت سے کارخانوں کے مالکوں نے مزدوروں کو طبی سہولتیں بہم پہنچانے کے انتظامات کر رکھے ہیں۔ ایک اندازہ کے مطابق تقریباً چار ہزار ڈاکٹر اپنا تھوڑا وقت کارخانوں کے طبی مراکز میں گذارتے ہیں اور مزدوروں کا علاج معالجہ کرتے ہیں۔

آج سے چار سال قبل وزیر صحت نے ایک مشاورتی کمیٹی برائے صنعتی صحت قائم کی تھی جس میں ٹریڈ یونین ممبر، کارخانوں کے مالکان، ڈاکٹر اور دیگر ماہرین شامل کیے گئے تھے۔ کمیٹی سے کہا گیا تھا کہ وہ صنعتی صحت سروس کے مسائل سے متعلق صلاح مشورہ کرے۔ کمیٹی نے حقائق جاننے کے لیے سرکاری فیکٹری انسپکٹروں کے ذریعے بعض صنعتی علاقوں کا جائزہ لیا تھا جس کے نتائج اب شائع کئے گئے ہیں۔ ان نتائج سے ظاہر ہے کہ مزدوروں کی صحت کی حفاظت کے سلسلہ میں بہت کچھ کام ہو سکتا ہے۔ اب حکومت کارخانوں کے مالکان اور ٹریڈ یونین مذکورہ جائزہ کے نتائج کا مطالعہ کر رہی ہے ؂

۱۲ شمارہ ۸] لاھور [نومبر

اس شمارہ میں

ادارہ تحریر { پروفیسر سراج الدین
پروفیسر میاں نامدار خاں }

معاونین { عبدالغفور چوھدری
فضل احمد }

تعلیمی ماہ نامہ

نومبر ۱۹۵۹ء

جلد ——— ۱۲
شمارہ ——— ۸

سالانہ چندہ

پاکستان کے لیے ۶ روپے

غیر ممالک کے لیے ۸ روپے

قیمت فی پرچہ دس آنے

پبلشرز

یونی ورسٹی بک ایجنسی لاہور

آر۔ ایچ۔ ڈی خالد پرنٹر پبلشر نے دین محمدی پریس میں طبع کرا کے
یونی ورسٹی بک ایجنسی ۲ کچہری روڈ لاہور سے شائع کیا

زرعی شماریات

ملک کی تاریخ میں پہلی بار اہم ترین قومی صنعت یعنی زراعت کے متعلق اعداد و شمار جمع کیے جانے والے ہیں۔ موجودہ حکومت مبارک باد کی مستحق ہے کہ اس نے جہاں کئی اور ایسے کام تیزی اور مستعدی سے انجام دیے ہیں جو سالہا سال سے التوا کی نذر ہوتے آرہے تھے وہاں اس نے زرعی شماریات جیسے اہم کام کو بھی ہاتھ ڈالا ہے۔

ہم آج کل بہت سے مشکل معاشی اور معاشرتی مسائل سے دوچار ہیں۔ ملک کی آبادی میں بڑی تیزی سے اضافہ ہوا ہے اور یہ اضافہ بدستور جاری ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ غذائی صورتِ حال دن بدن تشویشناک شکل اختیار کرتی جا رہی ہے۔ اس کا علاج اس کے سوا کچھ نہیں کہ زراعت میں سائنس سے خدمت لی جائے۔ مگر سائنسی طریقوں پر کھیتی باڑی کرنے کے لیے کسان کے پاس اچھا خاصا رقبہ ہونا چاہیے پھر بھی نہیں زراعت میں سائنسی طریقے رائج کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ کھیتی باڑی کا سارا کام پہلے کی نسبت تھوڑے آدمی انجام دے سکیں گے۔ اس سے کئی نئے مسائل پیدا ہو سکتے ہیں۔ مثلاً اس کا ایک نتیجہ دیہاتی آبادی میں مزید بے کاری کی شکل میں پیدا ہو سکتا ہے۔ اس مشکل سے عہدہ برا ہونے کے لیے حکومت کے لیے ضروری ہوگا کہ دیہات میں گھریلو صنعتوں کو پہلے سے زیادہ منظم طریق پر فروغ دینے کی کوشش کرے۔

ملک کی زرعی پیداوار میں فوری اضافہ کرنا اور بے کار یا نیم بے کار لوگوں کے لیے کام مہیا کرنا آج ہماری اہم ترین قومی ضرورتوں میں سے ہیں۔ پہلی ضرورت کا حل سائنسی طریقہ ہائے زراعت کا استعمال ہے اور دوسری کا گھریلو صنعتوں کی ترقی۔ لیکن ان دونوں قومی منصوبوں کے تیار کرنے اور انھیں پروان چڑھانے کے لیے قابلِ اعتماد اعداد و شمار چاہئیں۔ جدید سائنسی دور میں قابلِ اعتماد اعداد و شمار کے بغیر

کوئی منصوبہ عملی جامہ نہیں پہن سکتا۔ مگر ہمارے یہاں اس قسم کے اعداد و شمار سرے سے ناپید ہیں
ملک کی اسّی پچاسی فی صدی آبادی کا انحصار زراعت پر ہے۔ مگر اس سب سے بڑی قومی صنعت
کے متعلق آج تک کوئی اعداد و شمار جمع نہیں کیے گئے۔ ان اعداد و شمار کا جمع کرنا قومی معیشت کی ترقی
کی طرف فی الحقیقت پہلا قدم ہے۔

تاہم یہ کام اس قدر لمبا چوڑا اور اتنا وقت طلب ہے کہ اسے تسلی بخش طور پر انجام دینا کوئی آسان
بات نہیں۔ یہ اعداد و شمار جس آبادی سے جمع کیے جاتے ہیں وہ لاکھوں مربع میل کے دیہی علاقوں
میں بکھری پڑی ہے۔ ان میں بعض علاقے دور افتادہ اور قومی زندگی کے دھارے سے الگ تھلگ
واقع ہوئے ہیں۔ پھر ہماری بیشتر دیہی آبادی اَن پڑھ اور جدید زندگی کے تقاضوں سے بے خبر
ہے۔ ایسے لوگوں کو اپنے متعلق صحیح صحیح معلومات مہیا کرنے پر آمادہ کرنا بذاتِ خود ایک مسئلہ ہے

تاہم جیسا ہم اوپر وضاحت کر چکے ہیں۔ زرعی شماریات کی ضرورت اور قومی منصوبہ بندی
میں ان کی اہمیت ناقابلِ انکار ہے۔ اس لیے ہر محبِ وطن پاکستانی کو چاہیے کہ اس اہم کام میں
اپنی حکومت کا ہاتھ بٹائے۔ اس ضمن میں سکولوں کے اساتذہ بڑی خدمت انجام دے سکتے ہیں
بہت سے دور افتادہ علاقوں میں استادوں کے سوا کوئی اور پڑھے لکھے آدمی موجود ہی نہیں ہوتے
ہم استادوں سے پرزور اپیل کریں گے کہ وہ دیہی آبادی کو زرعی شماریات کی ضرورت سے آگاہ کریں
اور اگر اس کے متعلق کوئی غلط فہمی پیدا ہوتے دیکھیں تو اسے دور کرنے کی کوشش کریں
ہمارے زیرِ تربیت اساتذہ بھی اس کام میں ہاتھ بٹا سکتے ہیں۔ بڑے دنوں کی چھٹیوں میں وہ اپنے
گاؤں والوں کو بتا سکتے ہیں کہ زرعی شماریات کیوں جمع کی جا رہی ہیں۔ اور ان سے دیہی آبادی کو کیا کیا
فائدے پہنچ سکتے ہیں۔

محنت کا احترام

فضل احمد

تعلیم کی اصل غایت

انسانی زندگی میں تعلیم کو جو غایت پوری کرنی چاہیے اس کی وضاحت کرتے ہوئے سربرآوردہ ماہرین تعلیم کی ایک جماعت نے حال ہی یوں اظہار خیال کیا تھا۔

"تعلیم کو چاہیے کہ وہ فرد کو اس قسم کا علم، ایسی مہارتیں اور عادتیں، ایسا زاویہ نگاہ اور ایسا نقطہ نظر عطا کرے جس کی بدولت وہ اپنا صحیح مقام حاصل کرنے کے قابل ہو جائے اور اس مقام کی بدولت اپنی ذات اور اپنے معاشرے کو بلند سے بلند تر مقام پر پہنچا سکے"۔

تعلیم کے اس تصور کا خلاصہ یہ ہے کہ تعلیم بنیادی طور پر نشوونما اور بالیدگی کا عمل ہے۔ تعلیم کا کام فرد کی مختلف صلاحیتوں کی آزاد نشوونما کا بندوبست کرنا ہے۔ تاکہ وہ خداداد صلاحیتیں جو پیدائش کے وقت سے مخفی صورت میں موجود تھیں، ہر قسم کے بوجھ سے چھٹکارا پاکر بڑھنے پھولنے لگیں اور اپنی پوری بہار کو پہنچیں۔ جب تعلیم یہ کام پورا کر دے گی تو فرد معاشرتی زندگی میں اپنا صحیح مقام معلوم کر سکے گا۔ اس سے اسے خود حد درجہ کی طمانیت اور مسرت حاصل ہو گی اور جس معاشرے کا وہ رکن ہے اسے بھی زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل ہو گا۔

تعلیم کا یہ ترقی پذیر تصور اس یقین پر مبنی ہے کہ ہر فرد بعض یگانہ صلاحیتیں لے کر پیدا ہوتا ہے اور ان صلاحیتوں کی نشوونما بے اندازہ امکانات لیے ہوتی ہے۔ مگر یہ صلاحیتیں منظر عام پر اسی وقت آتی ہیں جب انہیں پھولنے پھلنے کے مواقع ملیں۔ یہ مواقع ایک بالیدگی خیز اور اجازت دہ ماحول میں ہی پیدا ہو سکتے ہیں۔ اگر ماحول کرخت اور روح کش ہے تو فرد احساس پستی اور پژمردگی کا شکار رہے گا۔ اس کی خداداد صلاحیتیں بوجھ تلے دبی رہیں گی۔ ان صلاحیتوں کی خبر نہ دنیا کو ہونے پائے گی نہ خود ان کے مالک کو

اس طرح وہ قیمتی جوہر جو فرد کی زندگی میں رونق اور معاشرے کی زندگی میں ایک نئی بہار پیدا کر سکتے تھے بیکار ضائع ہو کر رہ جائیں گے۔ پس تعلیم کا کام فرد کی خداداد صلاحیتوں کو ہر قسم کے بوجھ سے آزاد کرنا اور انھیں نشوونما کی راہ پر لگانا ہے۔

خداداد صلاحیتوں کی نشوونما اگرچہ بذاتِ خود مقصد رہنی چاہیے اور اس کے لیے کسی خارجی محرک کی ضرورت نہ ہونا چاہیے تاہم اس نشوونما کے امتیازی نشان دو گانہ ہونے چاہئیں۔

(۱) ماحول میں سبب اور نتیجے کے ایسے رشتے دیکھنے لگے جو پہلے سے نگاہ سے اوجھل تھے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ فرد کو اپنے ماحول میں نئے معانی نظر آنے لگیں اور وہ پہلے سے مختلف طور پر سوچنے لگے۔

(۲) اس نئے فہم سے اس طرح عملی خدمت لی جائے کہ فرد اپنے ماحول پر پہلے سے زیادہ قدرت حاصل کرے۔ یعنی نیا علم اور نئی نگاہ اسے اس قابل بنا دے کہ وہ اپنے عام کاروبار کو پہلے سے بہتر طور پر انجام دینے لگے۔

جدید تعلیمی فکر ان دونوں نتائج کو فیصلہ کن قرار دیتا ہے۔ حقیقی تعلیم وہ ہے جو فرد کے فہم اور اس کی قوتِ عمل میں اضافہ کرے۔ تعلیم کی بدولت انسان کو نہ صرف بہتر سوجھ بوجھ سے کام لینے کے قابل ہو جانا چاہیے بلکہ اس کی بدولت اسے پہلے سے بہتر طور پر کام کرنے کے قابل ہو جانا چاہیے۔

اس استدلال کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ جدید تعلیم کے نزدیک فیصلہ کن چیز معلومات کا ذخیرہ نہیں بلکہ ان معلومات سے عملی کام لینے کی صلاحیت ہے۔ دوسرے الفاظ میں اصل چیز نظری علوم نہیں بلکہ روزمرہ زندگی میں ان کی عملی کارفرمائی ہے۔ تعلیم کی اصل کامیابی کا پیمانہ ذہن میں جمع کردہ معلومات نہیں بلکہ طرزِ عمل اور طریقِ کار کی تبدیلی ہے۔

کج فہمی اور اس کے نتائج

تعلیم کو انسان نے ہمیشہ زندگی کا سرچشمہ خیال کیا ہے۔ وجہ یہ کہ تعلیم ہی وہ ذریعہ ہے جس کی مدد سے انسان اپنے ماحول پر روز افزوں قدرت حاصل کرتا ہے۔ پیدائش کے وقت انسان جس بے بسی کی حالت میں ہوتا ہے اس کی مثال دوسرے حیوانوں میں ناپید ہے۔ بے بسی کی یہ کیفیت کافی سالوں تک

باقی رہتی ہے۔ گویا آغاز زندگی میں انسان اپنے آپ کو پورے طور پر اپنے ماحول کے رحم و کرم پر پاتا ہے بے بسی کی اس منزل کو پیچھے چھوڑ جانے کے بعد بھی کوئی فرد اپنے ماحول کے متعلق سب کچھ اپنے ذاتی تجربے کی مدد سے نہیں سیکھ سکتا۔ انسانی زندگی کی مہلت اتنی تھوڑی ہے اور انسان کا ماحول اس قدر پیچیدہ ہے کہ کوئی انسان ساری عمر صرف کر کے بھی اپنے ماحول پر بہت تھوڑی قدرت حاصل کر سکتا ہے انسان نے اپنی اس کوتاہی کا علاج تعلیم کی مدد سے کیا ہے۔ تعلیم نئی پود کو اس قابل بنا دیتی ہے کہ تہذیب و تمدن کی راہ پر اس کے باپ دادا جس مقام پر پہنچ چکے تھے وہ اس سے آگے سفر جاری رکھتے، دوسرے الفاظ میں تعلیم ہی وہ جادو ہے جو نئی پود کو زندگی پر عملی قدرت عطا کرتا ہے۔

تعلیم کی یہ عملی افادیت ہی اسے قدر و قیمت کی حامل بناتی ہے۔ انسان نے ہر زمانے اور ہر دور میں تعلیم کو اپنے لیے اور اپنی اولاد کے لیے اس لیے ضروری خیال کیا ہے کہ اس کی عملی افادیت ہر دوسری چیز سے زیادہ ہے۔ صاحب نظر لوگوں نے ہر زمانے میں اس نکتے کو اچھی طرح سمجھا ہے۔

تاہم تاریخ میں ایسے دور بھی آتے رہے ہیں جب قوموں نے علم اور تعلیم کی عملی افادیت کو نظر انداز کر کے انھیں مقصود بالذات خیال کرنا شروع کر دیا۔ جب تعلیم کی عملی افادیت نگاہ سے اوجھل ہو جائے تو یہ زندگی پر قدرت عطا کرنے کی بجائے اس سے فرار کی راہیں تیار کر دیتی ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ تعلیم کا نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ فرد پہلے کی نسبت زیادہ مؤثر کام کر سکے۔ تعلیم کی مدد تلاش ہی اس لیے کی جاتی ہے کہ انسان اپنے ماحول پر بہتر طور پر قدرت حاصل کر لے۔ یعنی جو کام وہ بصورت دیگر برے بھلے طور پر انجام دیتا ہے تعلیم اسے یہ کام زیادہ مہارت اور زیادہ قابلیت کے ساتھ انجام دینے کے قابل بنا دے لیکن جب تعلیم کا یہ عملی پہلو نگاہ سے چھپ جاتا ہے تو پھر تعلیم بالکل الٹ نتائج پیدا کرنے لگتی ہے۔ وہ انسان کو عملی زندگی سے کاٹ کر اسے ایک خیالی دنیا میں بند کر دیتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان زندگی کے عام کاروبار کے لیے تقریباً ناکارہ بن کر رہ جاتا ہے۔

اس استدلال کا واضح نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ حقیقی تعلیم وہ ہے جو انسان کو زندگی کے کاروبار میں اعلیٰ قسم کی مہارت عطا کرے۔ یعنی اگر کوئی شخص زراعتی تعلیم حاصل کرتا ہے تو وہ آن پڑھ کسانوں کے

مقابلے میں بہتر پیداوار حاصل کر سکے۔ اگر اس نے عملی فنون کی تعلیم حاصل کی ہے تو وہ ایک اُن پڑھ بڑھئی یا لوہار کے مقابلے میں بہتر اشیا تیار کر سکے۔ اگر اس نے کسی خصوصی تعلیم کی بجائے عام تعلیم حاصل کی ہے تو وہ روزمرہ استعمال کی چیزوں مثلاً عام آلوں، اوزاروں اور مشینوں وغیرہ سے بہتر خدمت لے سکے۔ عام تعلیم سے یہ مراد ہرگز نہ ہو کہ علوم و فنون کے اصول اور ان کی نظری بحثیں ذہن میں جمع کر لی گئی ہوں بلکہ اس سے مراد یہ ہو کہ انسان عام استعمال کی چیزوں کے اصولوں اور ان کی ساخت سے باخبر ہو اور ان کے اجزا کو آسانی سے الگ یا جمع کرنے پر قادر ہو وغیرہ وغیرہ۔

تعلیم کے اس پہلو کو صاحب نظر لوگوں نے ہر زمانے میں اولیت دی ہے۔ مگر جدید دور کی برق رفتار سائنسی تہذیب نے اس عملی پہلو کی اہمیت جس شد و مد سے ظاہر کی ہے وہ عہد حاضر ہی کا حصہ ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ پچھلے آٹھ دس سالوں میں دنیا کے وہ ملک بھی اپنے نصاب تعلیم کو عملی رنگ دینے پر مجبور ہوئے ہیں جو مدتوں سے علمی اور نظری قسم کی تعلیم کے قائل چلے آتے تھے۔ برطانیہ، روس اور فرانس ان ملکوں کی نمایاں مثالیں ہیں۔

ان ملکوں کے مقابلے میں، پاکستان، ہندوستان اور دنیا کے کئی اور کم ترقی یافتہ ملک ہیں جہاں آج بھی تعلیم کے صرف خالص علمی اور نظری پہلو کو اولیت مل رہی ہے۔ ان ملکوں میں تعلیم کو ایک آلہ کار یا وسیلہ نہیں بلکہ کم و بیش بذات خود مقصود سمجھا جاتا ہے۔ تعلیم کا صحیح تصور ایسی روایات کے نیچے دب چکا ہے جن کا خلاصہ زندگی کے عام کاروبار اور تعلیم کو دو متضاد چیزیں خیال کرنا ہے۔ اس کج فہمی کا نتیجہ یہ ہے کہ تعلیم کی اشاعت کے باوجود زندگی کا عام معیار اونچا ہونے میں نہیں آتا۔ دنیا بھر کے عالم اس بات پر یک زبان ہیں کہ ہر قسم کے قومی مسائل کے حل تعلیم ہی کے ذریعہ تلاش کیے جا سکتے ہیں۔ مگر کم ترقی یافتہ ملکوں میں تعلیم بظاہر کسی مسئلے کا تسلی بخش حل پیش کرتی نظر نہیں آتی۔ اس کی وجہ تعلیم کی بے اثری نہیں بلکہ تعلیم کا وہ غلط تصور ہے جو ان ملکوں میں جڑیں پکڑ چکا ہے۔

زندگی سے فرار

اوپر کہا جا چکا ہے کہ تعلیم کی سب سے بڑی غایت انسان کو اپنی دنیا پر روز افزوں قدرت عطا

کرنا ہے۔ اس مقصد کا حصول لگاتار جدوجہد اور محنت کا مطالبہ کرتا ہے۔ لہٰذا اس مقصد کے پیدا ہونے کی واحد راہ یہ ہے کہ تعلیم انسان کو بہتر محنت کش اور بہتر کارکن بنائے۔ دوسرے لفظوں میں اچھی تعلیم وہ ہے جو انسان کو زندگی کی کشمکش میں بھرپور اور کامیاب حصہ لینے کے قابل بنائے۔ لیکن جو قومیں تعلیم سے یہ خدمت نہیں لیتیں ان کے یہاں نام نہاد تعلیم جس قسم کے نتائج پیدا کر سکتی ہے اس کا اندازہ اس رپورٹ سے ہو سکتا ہے کہ جو کچھ ہفتے ہوئے ہندوستان کے متعلق اخبارات میں شائع ہوئی تھی۔

اس خبر میں بتایا گیا تھا کہ بین الاقوامی ماہرین کی ایک جماعت نے ایشیائی اور مغربی ملکوں کی معاشی زندگی کا ایک تقابلی مطالعہ کیا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ ہندوستانی دنیا کی سب سے کاہل قوم ہے سرکاری دفتروں اور پرائیویٹ کارخانوں میں سال بھر میں کوئی ایک سو پچاس چھٹیاں ہوتی ہیں۔ صرف اسی پر بس نہیں بلکہ سرکاری افسر عموماً دیر سے آنے اور معمولی سے معمولی عذر پر کام سے کھسک جانے کے عادی ہیں۔

اس خبر پر کسی لمبے چوڑے تبصرے کی ضرورت نہیں۔ وہی تعلیم جس نے مغربی ملکوں سائنس اور صنعت و حرفت کے میدانوں میں دنیا بھر کی امامت عطا کی ہے ہندوستانیوں کو زندگی سے فرار سکھانے کا موجب بنی ہے۔ جہاں مغربی ملکوں میں تعلیم اس لیے حاصل کی جاتی ہے کہ فرد زیادہ قابل، ناظم زیادہ مؤثر کارکن اور زیادہ محنتی مزدور بن سکے وہاں اہل ہند تعلیم اس لیے حاصل کرتے ہیں کہ محنت مشقت سے چھٹکارا پاکر تن آسانی کی زندگی گذار سکیں۔ وہاں تعلیم اگر زندگی پر قابو پانے کا ذریعہ ہے تو یہاں یہ زندگی سے دور بھاگنے کا وسیلہ۔

تاہم کسی کو اس غلط فہمی میں مبتلا نہ رہنا چاہیے کہ ہماری تعلیم ہندوستانی تعلیم سے مختلف نتائج پیدا کر رہی ہے۔ برصغیر پاک و ہند کا نظام تعلیم ایک ہی سرچشمہ سے زندگی حاصل کر رہا ہے اور آزادی کی ایک دہائی نے دونوں ملکوں کی تعلیم میں کچھ زیادہ فرق نہیں ڈالا۔ ہندوستان کی طرح ہمارے یہاں بھی والدین اور سرپرست بچوں یا نوجوانوں کو اس لیے تعلیم نہیں دلاتے کہ وہ بہتر کسان یا بہتر مستری یا بہتر مزدور بن جائیں بلکہ وہ اپنے گاڑھے پسینے کی کمائی اولاد کی تعلیم پر اس لیے صرف

کرتے ہیں کہ ان کی اولاد کاشت کاری کی صعوبت، مستری گری کی محنت اور مزدوری کی ذلت سے بچ جائے
والدین بچوں کو یہ بات بار بار یاد دلاتے رہتے ہیں کہ وہ اپنا پیٹ کاٹ کر ان کی تعلیم پر اس لیے خرچ کر رہے
ہیں کہ وہ محنت مزدوری کی ذلت سے نجات پاکر سہولت اور آسائش کی زندگی گذار سکیں۔

غیر ملکیوں کو عموماً تعجب ہوتا ہے کہ برصغیر پاک و ہند میں تعلیم کا یہ غلط تصور اتنا راسخ کیوں ہو چکا
ہے؟ بعض لوگ اسے انگریزی دور کی باقیات میں سے شمار کرتے ہیں۔ مگر ہندوستانی تاریخ میں
نگاہ رکھنے والے لوگ جانتے ہیں کہ اس برائی کی جڑیں برطانوی دور سے بہت پیچھے جاتی ہیں۔
تعلیم کو زندگی سے الگ تھلگ کرنے کی ذمہ داری سب سے زیادہ اس برہمنی فلسفۂ حیات پر ہے
جس نے ذات پات کو جنم دیا تھا۔

ویدک دھرم کی تعلیمات کے مطابق ہندو معاشرے کو چار بڑی ذاتوں یعنی برہمن، کھشتری، ویش
اور شودر میں تقسیم کیا گیا تھا۔ ان میں سے برہمن کو چوٹی کا درجہ دیا گیا تھا اور اس کے ذمے علم حاصل کرنے
اور علمی ترکہ کو محفوظ رکھنے کا کام لگایا گیا تھا۔ اس فرض کو اس قدر مقدس قرار دیا گیا تھا کہ برہمن کے علاوہ
کسی اور کو اس کام میں حصہ لینے کی اجازت نہ تھی۔ دیکھنے میں معلوم ہوتا ہے کہ یہ برہمنی فلسفہ تعلیم کو
زندگی میں حد درجہ کی اہمیت دیتا ہے۔ مگر حقیقت حال یہ ہے کہ اس فلسفے نے تعلیم کو زندگی سے بالکل
کاٹ کر رکھ دیا ہے۔ اس فلسفے کے طفیل برہمن کے ذمے علم حاصل کرنے کا فرض ضرور عاید ہو گیا۔ مگر اس کے
ساتھ ہی برہمن زندگی کے دوسرے کاموں کو اپنے مقام سے نیچا سمجھنے لگ گیا۔ کیوں کہ زندگی کے دوسرے
کاروبار کشتریوں، ویشوں اور شودروں کے ذمے لگائے گئے تھے، جو برہمنوں کے مقابلے میں گھٹیا
ذاتیں تھیں۔

اس برہمنی فلسفے کے خلاف سب سے پہلے بدھ مت نے بغاوت کی۔ ہندوستان کے بطن سے جنم لینے
والے اس مذہب نے ذات پات کا طلسم توڑنے کے لیے بڑا زور مارا، اور ہندوستان کی تاریخ میں
ایسے دور بھی آئے جب یوں معلوم ہوتا تھا کہ ہندومت اب ختم ہوا چاہتا ہے۔ مگر برہمنی فلسفے کی گرفت
ہندوستانی عوام کے دلوں پر اس قدر مضبوط تھی کہ بالآخر برہمنوں نے بدھ مت کو اس جنم بھومی سے

مار باہر نکالا۔

اس کے بعد اسلام آیا جس کے ہاں اونچ نیچ کے تصورات کے لیے سرے سے کوئی گنجائش نہ تھی۔ اسلامی اخوت اور مساوات نے اول اول برہمنیت کو بڑا پریشان کیا۔ مگر برہمنی فلسفہ صاحب اقتدار طبقے کو خدائی کا جو مقام عطا کرتا ہے اس نے رفتہ رفتہ اثر دکھانا شروع کیا تا آنکہ بابر کے پوتے اکبر نے برہمنیت کے آگے مکمل ہتھیار ڈال دیے۔ ہندوستانی مسلمانوں پر برہمنی فلسفہ کی یہ سب سے بڑی جیت تھی۔ اکبر کے جانشینوں اور خاص کر عالمگیر علیہ الرحمۃ نے کافی کوشش کی کہ اسلام کے ہندوستانی پیروؤں کو برہمنی اثرات سے پاک کیا جائے، مگر یہ کوششیں پوری طرح کامیاب نہ ہوئیں۔

مغلوں کے جانشیں انگریز بنے۔ ہر چند کہ سات سمندر پار سے آنے والی یہ قوم خود اپنے ملک میں جمہوریت کی بڑی علمبردار تھی۔ مگر اس کی استعماری مصلحتوں نے بہت جلد یہ بھانپ لیا کہ ہندوستان میں کامیاب جہاں بانی کے لیے برہمنی فلسفہ بڑا کارآمد اتحادی ثابت ہو سکتا ہے۔ چناں چہ انگریزی حکومت نے اپنے دفتری کاروبار چلانے کے لیے انگریزی خواں بابوؤں کی ایک مٹھی بھر جماعت تیار کر دی جو جلد ہی صحیح معنوں میں برہمنوں کی جانشین بن گئی۔ اس نام نہاد تعلیم یافتہ طبقے کو برہمنوں کی طرح زندگی کے تقریباً ہر کام سے عار تھی۔ یہ لوگ انگریزی تعلیم اس لیے حاصل نہیں کرتے تھے کہ انگریزوں کی طرح سائنسی ایجادکریں یا ملکی صنعت وحرفت کو ترقی دیں بلکہ ان کے سامنے صرف یہ مقصد تھا کہ وہ انگریزی تعلیم کی بدولت آبائی کاروبار سے چھٹکارا پا کر اس سفید پوش طبقے میں شامل ہو جائیں جو تیزی سے برہمنوں کی جگہ حاصل کر رہا تھا اور جس کے سامنے اکبر الہ آبادی کے الفاظ میں اس کے سوا اور کوئی مقصد نہ تھا کہ ؎ کھا ڈبل روٹی، کلرکی کر خوشی سے پھول جا

ان صدیوں پرانی روایات کی موجودگی میں یہ کوئی حیرانی کی بات نہیں کہ آزادی کے بارہ سال گزر جانے کے بعد بھی ہماری تعلیم ابھی زندگی سے فرار کی راہ سکھاتی ہے۔ زندگی پر مؤثر قدرت حاصل کرنے کا ڈھنگ نہیں سکھاتی۔

قومی زندگی کے لیے خطرہ

جب تک پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر تھی، اس وقت تک ان کا زندگی کے کاروبار سے الگ تھلگ رہنا ایک حد تک قابل برداشت ہو سکتا تھا۔ مگر تعلیم کے عام ہونے سے یہ صورت حال ناقابل برداشت بن چکی ہے۔ یہ اسی حقیقت کا احساس تھا جس نے پچھلے دنوں صدر پاکستان کو یہ کہنے پر مجبور کیا تھا کہ جب تک ہم اپنے آپ کو محنت کے عادی نہیں بناتے اس وقت تک قومی ترقی کا کوئی منصوبہ پروان نہیں چڑھ سکتا، اس کی وجہ بالکل ظاہر ہے، جدید مشینی تہذیب میں زندگی کے ہر شعبے کی رہنمائی تعلیم یافتہ طبقہ کے ہاتھ میں ہے، اور اگر یہ طبقہ محنت کو عار سمجھے تو ظاہر ہے کہ اس کی رہنمائی میں مکمل ہونے والا کوئی کام خوبی سے انجام نہیں پا سکتا۔ یہ صورت حال قومی زندگی کے لیے بہت بڑا خطرہ ہے۔ ایک ایسے دور میں جب دنیا کی قومیں ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کے لیے دن رات ایک کر رہی ہوں اور اس کش مکش میں ان قوموں کا ہر فرد برابر کا شریک ہو۔ ایسے دور میں کسی قوم کے تعلیم یافتہ افراد کا محنت کو عار سمجھنا اس قوم کے لیے سب سے بڑے خطرے کے علاوہ کچھ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ صدر پاکستان نے قوم کو اس خطرے سے آگاہ کرنا ضروری سمجھا ہے۔

ہماری تعلیم بے عملی کی جس حد تک حوصلہ افزائی کرتی ہے اس کی وضاحت ایک مثال سے ہو جائے گی۔ انجینئرنگ ایک عملی سائنس ہے جس کا مقصد ماہرین کی ایک ایسی جماعت تیار کرنا ہے جو ہر قسم کے تعمیری کام میں چوٹی کی دسترس رکھتے ہوں۔ مگر ہمارے یہاں انجینئرنگ کالجوں کے گریجوایٹ بھی نظری علم سے ایک قدم آگے نہیں جاتے۔ جب غیر ملکی انجینئروں کو ہمارے انجینئرنگ کالجوں کے گریجوایٹوں کے ساتھ مل کر کام کرنے کا اتفاق ہوتا ہے تو انھیں یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ پاکستانی انجینئر چھوٹے سے چھوٹے کام مثلاً سیمنٹ ریت اور کنکری کو صحیح مقدار میں ملانے کے لیے بھی دوسروں کے محتاج ہیں۔ وہ اس بات پر قادر نہیں کہ یہ معمولی سا کام بھی خود کر سکیں۔ یہ تعلیم کے اس شعبے کا حال ہے، جس کی منزل عملی تربیت کے سوا اور کچھ نہ ہونی چاہیے۔

اس نکتے پر جس قدر بھی زور دیا جائے کم ہے کہ ایسی تعلیم جو بے عملی کو ترقی دے اور زندگی سے

ذارکو اپنا سواج بنا رکھا ہے۔ وہ تعلیم نہ صرف بے کار ہے بلکہ واضح طور پر مضر بھی ہے۔ اس قسم کی تعلیم قومی زندگی کو برائیوں کے ایک ایسے شیطانی چکر میں پھنسا کر رکھ دیتی ہے جس میں باہر نکلنے کی کوئی راہ معلوم کرنا مشکل ہے۔ برصغیر پاک و ہند کی کروڑوں کی آبادی آج جن مشکل معاشی اور معاشرتی مسائل سے دوچار ہے ان میں سے اکثر اسی قسم کی تعلیم کی پیداوار ہیں۔ صاحب نظر لوگ بجا طور پر اس صورت حال کو تشویشناک قرار دیتے ہیں۔ مشہور برطانوی تاریخ دان ٹائن بی نے اپنی کتاب سٹڈی آف ہسٹری میں دلائل و شواہد سے ثابت کیا ہے کہ دنیا کی اکیس تہذیبوں میں سے انیس تہذیبیں کسی بیرونی حملہ آور کے ہاتھوں نہیں بلکہ اپنے اندرونی ضعف کے باعث صفحہ ہستی سے مٹ گئیں۔ ظاہر ہے کہ قومی قوت افراد کی قوت عمل کے مجموعے سے عبارت ہوتی ہے۔ جب تعلیم کی اشاعت کسی قوم کے افراد کی قوت عمل کو سرد کرنے کا سبب بنے تو اس قوم کو اپنے نظام تعلیم پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے

شہری سہولتوں سے عشق

تاریخی طور پر ایک مانی ہوئی حقیقت ہے کہ اول اول مدرسہ قائم ہی اس لیے کیا گیا تھا کہ وہ نئی پود کو زندگی پر عملی قدرت عطا کرے۔ لیکن زمانے کے گزرنے اور تہذیب و تمدن کی پیچیدگی بڑھ جانے سے یہ خطرہ پیدا ہونے لگا کہ مدرسہ کہیں ایک ایسی مصنوعی دنیا بن کر رہ جائے۔ جسے حقیقت کی دنیا سے کچھ علاقہ نہ ہو۔ تہذیب و تمدن کی ہر پیش قدمی کے ساتھ یہ خطرہ حقیقی شکل اختیار کر جاتا ہے اور اسے دور کرنے کی واحد صورت یہ ہے کہ مدرسے کے نصاب پر ہمیشہ نظر ثانی ہوتی رہے۔ تاکہ نئی پود کسی ایسی مصنوعی دنیا کی خوگر بن کر نہ رہ جائے جس کا سرے سے کوئی وجود نہ ہو۔

جن ملکوں نے زندگی کی دوڑ میں زیادہ ترقی کی ہے انھوں نے اس سنہری اصول پر بڑی کامیابی سے عمل کیا ہے۔ موجودہ صدی کے آغاز میں امریکی مدرسے کا نصاب اس حد تک نظری قسم کا تھا کہ آرٹ اور فنون عملی جیسے مضامین بھی رسمی لکیروں کے ساتھ چمٹے ہوئے تھے۔ لیکن ترقی پذیر صنعتی تہذیب کے تقاضے مختلف قسم کی تعلیم کا مطالبہ کر رہے تھے۔ چند صاحب نظر عالموں نے اس صورت حال کو اچھی طرح سمجھ کر مدرسے کے نصاب کو عملی شکل دینے کی مہم شروع کی۔ مثلاً آرٹ کی تعلیم کو بچوں

اور نوجوانوں کی تخلیقی قوت کے بکاس کی شکل دی گئی۔ زراعت کی تعلیم کو طلبہ کی گھریلو ضرورتوں کے مطابق کیا گیا۔ زراعت ماسٹر کے ذمے یہ فرض عاید کیا گیا کہ وہ نہ صرف کاشت کے بہترین طریقوں کی نظری تعلیم دے بلکہ طلبا سے مطالبہ کرے کہ اپنے اپنے کھیتوں میں ان طریقوں کو آزمائیں اور زراعت ماسٹر ان کے عملی کام کی نگرانی کرے۔ مدرسے کے نصاب کو عملی شکل دینے کی یہ تحریک اب اس قدر زور پکڑ چکی ہے کہ امریکہ کی ہمہ گیر مدرسے میں ہر اس کام کی عملی تربیت کا انتظام موجود ہے جس کی مانگ مدرسے سے باہر موجود ہو۔

یہ تحریک جو امریکہ سے چلی تھی اب مغربی یورپ اور روس تک پھیل چکی ہے۔ روسی مدرسے کا نصاب بالکل حال ہی تک خالص علمی اور نظری قسم کا تھا۔ مگر اب اس میں یک دم انقلاب آگیا ہے۔ چند برس ہوئے صرف لینن گراڈ کے شہر میں چند ہزار طلبہ نے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ ان میں سے بیشتر سفید پوشی قائم رکھنے والی ملازمت کے خواہاں تھے۔ ان کے لیے گاؤں کھیتوں میں کام کرنا ایک ناقابل برداشت خیال تھا۔ یہ اس ملک کے میٹرک پاس نوجوانوں کا حال تھا جو محنت کشوں اور مزدوروں کا ملک کہلاتا ہے۔ اس صورت حال نے روسی رہنماؤں کو چونکا دیا اور انہوں نے اسے ختم کر دینے کا تہیہ کرلیا۔ چناں چہ ایک فرمان کی رو سے ہر طالب علم کے لیے ضروری قرار دے دیا گیا کہ میٹرک پاس کرنے کے بعد وہ کم از کم ایک سال تک ہاتھ سے کام کرنے کی تربیت حاصل کرے۔ خواہ اسے آگے کالج میں تعلیم حاصل کرنی ہو خواہ کوئی اور کام کرنا ہو۔

اس کے مقابلے میں وہ خالص علمی اور نظری قسم کی تعلیم ہے جو ہمارے سکولوں اور کالجوں میں رائج ہے۔ یہ تعلیم ہمارے نوجوانوں کو جس قسم کی زندگی کے لیے تیار کرتی ہے اس کا تفصیلی حال ایک ہندوستانی تعلیمی کمیشن نے اپنی رپورٹ میں بیان کیا ہے۔ کمیشن متعلقہ شہادتوں اور اعداد و شمار سے اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ ہندوستانی سکول اور کالج نوجوان طلبہ اور طالبات کو شہری سہولتوں کا شیدائی بنا کر رکھ دیتے ہیں جبکہ ملک کی اسی فی صدی سے زیادہ آبادی دیہات میں بستی ہے۔ جو نوجوان دیہات سے تعلیم حاصل کرنے کے لیے سکولوں اور کالجوں کا رخ کرتے ہیں وہ بجلی کی روشنی، بجلی کے پنکھوں —

نل کے پانی، سینما، شہری سڑکوں اور باغوں اور دوسری شہری سہولتوں کے ایسے متوالے بن جاتے ہیں کہ ان کے لیے اپنے آبائی گاؤں میں جانا یا دیہات میں کام کرنا دوبھر ہو جاتا ہے۔ وہ شہری زندگی کے رسیا بن کر رہ جاتے ہیں اور دیہات کی تعمیر نو کے لیے کارندے حاصل کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

آرٹس کالج یا جنت الحمقاء

ہندوستانی تعلیمی کمیشن نے اپنی مروجہ تعلیم اور اس کے نتائج کا جو خاکہ کھینچا ہے وہ پاکستانی سترحال پر بھی پوری طرح صادق آیا۔ اس تعلیمی تصویر کا سب سے تاریک رُخ غالباً ہمارے آرٹس کالج پیش کرتے ہیں۔ جن کی تعداد میں آزادی کی آمد کے بعد بے تحاشہ اضافہ ہوا ہے۔ اس اضافے کا آغاز اس بہانے ہوا تھا کہ میٹرک پاس طلبہ اس قدر خام عمر ہوتے ہیں کہ کالج کی آزادی کی فضا ان کے لیے واضح طور پر نقصاں ثابت ہوتی ہے۔ لہٰذا ہائر سیکنڈری سکول کے نام سے ایک نئی قسم کا تعلیمی ادارہ وجود میں آنا چاہیے جو ہائی سکول اور آرٹس کالج کے درمیان واسطے کا کام دے۔ یہ ایک ایسا ادارہ ہو جہاں مدرسے کی سی فضا حکمران ہو اور یہ انٹرمیڈایٹ جماعتوں کا نصاب پیش کرے۔ آرٹس کالج میں جانے سے پہلے میٹرک پاس طلبہ دو سال اس ہائر سیکنڈری سکول میں گذاریں۔ اس سے ان کی طبیعتوں میں اتنی پختگی آجائے گی کہ وہ آرٹس کالج اور یونیورسٹی کی آزاد فضا میں ذمہ داری سے کام کر سکیں اور اعلیٰ تعلیم سے پورا فائدہ اٹھا سکیں۔

یہ استدلال بظاہر وزنی تھا۔ مگر جب ہائر سیکنڈری سکول عملی طور پر وجود میں آئے تو بہت جلد یہ بات واضح ہو گئی کہ ان کے اور آرٹس کالجوں کے درمیان نام کے سوا اور کچھ فرق نہیں۔ ان کالجوں میں پڑھانے کے لیے آرٹس کالجوں کی طرح لیکچرار بھرتی کیے گئے۔ بلکہ ان میں سے بہت سے آرٹس کالجوں میں سے تبدیل ہو کر آئے۔ اس کا پرنسپل تقریباً ہر حالت میں آرٹس کالج کے کسی سینیر لیکچرار کو مقرر کیا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہائر سیکنڈری سکولوں میں بھی بالکل وہی ماحول اور آزادی کی وہی فضا قائم ہو گئی جس سے خام طبع میٹرک پاس طلبہ کو نجات دلانا مقصود تھا۔ ایسا ہونا ناگزیر تھا کیوں کہ کالجوں کے لیکچرار سے یہ امید رکھنا ہی غلط تھا کہ وہ کوئی ایسا ماحول پیدا کر سکیں گے جس سے ان کی تعلیم و تجربہ انھیں بیگانہ

ہموار کرتا ہے

اس ضمن میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ آرٹس کالج ملک میں پچھلی صدی سے چلے آرہے ہیں۔ آزادی کی آمد کے بعد جب تعلیم کی مانگ میں یک دم اضافہ ہوا تو آرٹس کالجوں کی تعداد میں اضافہ ہونا ایک قدرتی امر تھا۔ اس لیے اس میں تشویش کی کونسی وجہ ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے آرٹس کالجوں نے پہلے دن سے زندگی سے بیگانہ کرنے والی تعلیم دی ہے۔ کیوں کہ ان کے گریجویٹوں نے ہاتھ سے کام کرنے کو ہمیشہ عار سمجھا ہے۔ مگر جب تک ان کالجوں کی تعداد محدود تھی ان کی تعلیم سے پیدا ہونیوالے نقصان بھی بالکل محدود تھے۔ مگر اب میٹرک پاس کرنے کے بعد اکثر طلبہ کالجوں کا رُخ کرنے لگے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کالجوں میں جانے والے طلبہ میں سے اکثریت ایسے طلبہ کی ہوتی ہے جو متوسط یا غریب گھرانوں سے آتے ہیں۔ بہتوں کے والدین اپنا اور اپنی اولاد کا پیٹ کاٹ کر انھیں کالج میں بھیجتے ہیں۔ مگر کالج میں قدم رکھتے ہی یہ برخوردار بڑی تیزی سے ایک چھوٹے پندار کا شکار ہونے لگتے ہیں۔ ان کا لباس اپ ٹو ڈیٹ ہونا چاہیے۔ کسی شخص کو انھیں گھر پر یا کسی اور جگہ کوئی کام کاج کرتے نہ دیکھنا چاہیے۔ ان کی جیب میں ہر وقت اتنے پیسے ہونے چاہئیں کہ دوستوں کے ساتھ مل کر سگریٹ نوشی چائے نوشی اور سینما کے ذوق کی داد دی جا سکے۔

گھر کے ماحول اور آرٹس کالج کی فضا کا فرق ہمارے اکثر نوجوانوں پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ایک مصنوعی شخصیت مسلط کر دیتا ہے۔ سکول سے نکل کر وہ اپنے آپ کو احمقوں کی ایک جنت میں پاتے ہیں جس کی تقریباً ہر چیز اصلیت سے بہت دور ہوتی ہے۔ اس جنت الحمقا میں چند سال گزار لینے کے بعد یہ لوگ اس مصنوعی دنیا کے اس قدر رسیا بن جاتے ہیں کہ عمر بھر جہاں جاتے ہیں اسی قسم کی جنت الحمقا پیدا کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ اور اگر اس کوشش میں ناکام رہیں تو زمانے کی ناقدر شناسی کا گلہ کرتے کرتے عمر گزار دیتے ہیں۔

کالج کی تعلیم ہمارے ملک اور ترقی یافتہ ملکوں میں جو مختلف نتائج پیدا کرتی ہے۔ ان کا موازنہ کرنے کے لیے میں دو مثالیں پیش کروں گا۔ میرے پڑوس میں ایک بابو جی رہتے ہیں جو کسی دفتر میں

کام کرتے ہیں اور کوئی دو اڑھائی سو روپے ماہوار تنخواہ پاتے ہیں۔ ان کے پانچ بچے ہیں۔ بڑے لڑکے نے اس سال میٹرک پاس کیا ہے اور اب کسی کالج کی فسٹ ایر جماعت میں پڑھتے ہیں۔ بابوجی کی ساری اولاد نہایت باادب اور باسلیقہ ہے۔ مگر بڑا لڑکا جب سے کالج میں داخل ہوا ہے اس کے مزاج میں ایک انقلاب پیدا ہو گیا ہے۔ پہلے وہ باپ کی غیر حاضری میں بازار سے سودا سلف لانے اور گھر کے دوسرے چھوٹے موٹے کام کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتا تھا۔ اب یہ تمام کام اس کے لیے باعث عار ہیں۔ یہ کام اس کے چھوٹے بھائی کریں نوکریں اسے ان سے کوئی سروکار نہیں رہا۔

اس کے مقابلے میں یونیورسٹی آف کنیٹی کٹ (امریکہ) کے ایک نوجوان طالب علم کی مثال ہے جو دوا سازی کی جماعت میں پڑھتا تھا۔ لب کا یہ طالب علم اسی ہوسٹل میں رہتا تھا جس میں میں۔ ایک شام میں اور میرا ایک پاکستانی ساتھی باہر سیر کو نکل گئے۔ یونیورسٹی سے دو اڑھائی میل کے فاصلے پر ایک کار کھڑی پائی۔ میرے ساتھی نے اس کار کو پہچان کر کہا او ہو یہ تو ہال کی کار ہے۔ تھوڑی دیر میں بل بھی ہاتھ میں کلہاڑا پکڑے، پسینے میں شرابور ہمارے پاس آ کھڑا ہوا۔ اور بولا میں کچھ دنوں سے سہ پہر کے وقت یہاں تھوڑا سا کام کرنے آتا ہوں، مجھے کچھ درخت کاٹنے ہیں۔ یہ کام قدرے سخت ہے۔ مگر اسی نسبت سے اس کی اجرت بھی زیادہ ہے۔

اسلامی روایات

مضمون کے شروع میں کہا جا چکا ہے کہ تعلیم اور محنت کو دو متضاد چیزیں خیال کرنا دراصل ایک برہمنی روایت ہے جو لمبی صدیوں میں سے گذرتی ہوئی اور طرح طرح کے روپ اختیار کرتی ہوئی آج پاکستانی معاشرے میں شرافت، نجابت، شائستگی اور وضعداری کا جامہ پہنے ہوئے ہے۔ تاہم اسلام کو اس روایت سے کبھی کوئی سروکار نہیں رہا۔ اسلام نے ایسی تعلیم اور شائستگی کو کبھی برداشت نہیں کیا جو انسان کو زندگی کے عام کاروبار میں دوسرے انسانوں کی طرح حصہ لینے سے روکے۔ اس ضمن میں سرورِ کونین صلعم کا اسوۂ حسنہ دنیا کے سامنے ہے:-

قبا میں دنیا کی سب سے پہلی مسجد تعمیر ہونے لگی تو سرورِ کونین صلعم صحابیوں کے ساتھ مزدوروں کی

طرح کام کر رہے تھے۔ صحابہ نے بہت کہا کہ آپ آرام فرمائیں ہم جاں نثار کام کرنے کے لیے کافی ہیں مگر آپ نے یہ بات پسند نہ فرمائی۔ بالکل یہی منظر مدینہ میں مسجد نبوی کی تعمیر کے وقت نظر آیا۔ جنگ احزاب کے موقع پر مدینے کے گرد خندق کھودنے کی ضرورت پیش آئی تو اس وقت بھی دنیا نے یہی منظر دیکھا ایک مرتبہ سیّد الانبیاء صلعم کو صحابہ کے ساتھ صحرا میں رات گذارنی پڑی، شام کا وقت قریب آیا تو لوگ کھانے کا بندوبست کرنے لگے۔ اتنے میں انھوں نے دیکھا کہ حضور صلعم پشت مبارک پہ کانٹے دار سوکھی ٹہنیوں کا ایک گٹھا اٹھائے آرہے ہیں۔ یہ دیکھ کر سب سنّاٹے میں آ گئے۔ آپ نے ان کی یہ کیفیت دیکھی تو فرمایا میں جماعت کا ایک ناکارہ فرد بننا اور طفیلی کے طور پہ جینا نہیں چاہتا۔ مجھے بھی اپنے حصے کا کام کرنا چاہیے۔

جب دنیا کے معلّم اعظم کی ذاتی مثال یہ ہو تو ظاہر ہے کہ علم کے اس سرچشمے سے فیض حاصل کرنے والے لوگ تعلیم اور محنت کو دو متضاد چیزیں خیال نہیں کر سکتے۔ چناں چہ خلفائے راشدہ ایران و روم کی سلطنتوں کے مالک ہونے کے باوجود اپنا چھوٹے سے چھوٹا کام خود کرنے میں فخر محسوس کرتے رہے۔ حضرت عمر کے متعلق مشہور ہے کہ ایک رات جب ایک بے کس عورت اور اس کے بچوں کو بھوکے پاکر آٹے کی بوری سر پہ اٹھا کر اس کی جھونپڑی کی طرف چلنے لگے تو نوکر نے عرض کی یا امیر المومنین لائیے بوری میں اٹھاوں۔ اس پر آپ نے فرمایا کہ اگر تم قیامت کے دن بھی میرا بوجھ بانٹ سکتے ہو تو اس وقت یہ بوجھ بھی اٹھالو۔ نوکر یہ سن کر چپ ہو گیا اور آپ خود یہ بوری اٹھائے اس عورت کے گھر گئے۔

یہ انھیں درخشاں اسلامی روایات کا صدقہ تھا کہ اسلام کے نام لیواؤں میں سے بعض نے برہمنی مت کی جنم بھومی ہندوستان کے مالک ہونے اور دہلی کے تخت پر بیٹھنے کے باوجود محنت کو کبھی عار نہ سمجھا۔ بلکہ اپنے ہاتھ سے روزی کمانے میں فخر محسوس کیا۔ اس مختصر سی فہرست میں اگر ایک طرف ناصرالدین محمود کا سا درویش بادشاہ ہے تو دوسری طرف اکبر، جہاں گیر اور شاہ جہان کا جانشین اورنگ زیب عالم گیر بھی ہے۔ جو بڑھاپے سے کمر دوہری ہو جانے کے باوجود عام

سپاہیوں کی طرح زمین پہ سوتا تھا اور ان کی طرح دکنی مہم کی ہر سختی کو مسکراہٹ کے ساتھ جھیلتا تھا۔

تاہم ناصرالدین محمود اور عالمگیرؒ ہندی مسلمانوں کی ایک ایسی جماعت سے تعلق رکھتے تھے جس کی تعداد برابر گھٹتی جارہی تھی۔ ہندی مسلمان بڑی تیزی سے برہمنی روایات سے اثر قبول کررہے تھے۔ بابر کا پوتا اکبر اس اثر پذیری میں انتہائی حد تک پہنچ گیا تھا، اکبر کی دلی آرزو یہ تھی کہ اسلام بھی برہمنیت کے آگے بالکل اسی طرح ہتھیار ڈال دے جس طرح بدھ مت نے ڈالے تھے۔ اکبر ایک حد تک اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہوا۔ مگر اس کی موت کے بعد حضرت مجدد الف ثانی اور پھر عالمگیر نے اکبر کی کوششوں کو ناکام بنانے کے لیے بڑے جتن کیے۔ مگر یہ کوششیں ہندی مسلمانوں کے ذہنوں کو برہمنیت کے اثرات کو پوری طرح صاف نہ کرسکیں۔ ان کی بھاری اکثریت بدستور ذات پات سے متاثر رہی اور ہاتھ سے کام کرنے کو علمی شان کے منافی خیال کرتی رہی۔ فرنگی حکمرانوں نے ان رجحانات کو اور قوی کرنے کی کوشش کی تاکہ ان کی سامراجی قوت طاقت پکڑے۔

ہمیں آزادی حاصل کیے اب بارہ تیرہ سال ہونے کو آئے ہیں۔ اس کے باوجود ہم پاکستانی معاشرے کو برہمنی روایات سے پاک کرنے کے لیے ابھی کچھ نہیں کرسکے۔ ایک برس پہلے یہ ملک ایک معرکہ خیز سیاسی انقلاب میں سے گذر رہا تھا۔ اب وقت آگیا ہے کہ اس سیاسی انقلاب کو معاشرتی انقلاب کی بنیاد بنایا جائے۔ یقیناً اسی خیال سے صدر پاکستان نے پاکستانی عوام اور خصوصاً پڑھے لکھے لوگوں سے اپیل کی ہے کہ وہ محنت سے کام کرنا سیکھیں، کیوں کہ اسی میں قومی نجات کا راز مخفی ہے۔

ذہنی انقلاب کی ضرورت

پاکستانی معاشرے میں محنت کو جو ادنیٰ مقام حاصل ہے وہ فی الحقیقت اس برہمنی فلسفہ کی پیداوار ہے جس نے ہندی معاشرے کو صدیوں سے اونچی نیچی ذاتوں میں تقسیم کر رکھا ہے اور جس کی رو سے ہاتھ سے کام کرنا نیچی ذاتوں کا کام ہے۔ اس فلسفے نے برہمن کو سب سے اونچا مقام دے کر اس کے لیے ہاتھ سے کام کرنا عار قرار دیدیا تھا۔ لمبی صدیوں میں جو سیاسی اور معاشرتی الٹ پلٹ ہوتی رہی

اس کے نتیجہ میں ہاتھ سے کام کرنا ہر اس شخص کے لیے عار بن گیا جو باعزت ہونے کا دعویدار ہو۔ آج پاکستانی معاشرہ اسی لعنت میں گرفتار ہے۔ یہ صورت حال نہ صرف سراسر غیر اسلامی ہے بلکہ بہترین قومی مفاد کے بھی سراسر خلاف ہے۔ مگر اس کے ختم کرنے کے لیے ایک ایسے ذہنی انقلاب کی ضرورت ہے جس کا آغاز ابھی ہمارے ملک میں تقریباً نہیں ہوا۔

ذہنی انقلاب صرف چند سالوں میں جو حیرت انگیز نتیجے پیدا کر سکتا ہے اس کی ایک نمایاں مثال موجودہ چین پیش کرتا ہے۔ حال ہی میں ایک امریکی اخبار نویس نے چین کا دورہ کرنے کے بعد اس ملک کے متعلق دوسری باتوں کے علاوہ ذیل کی باتیں کہی ہیں۔

"۱۹۳۷ء میں جب میں نے پرانے چین کو دیکھا تو اس کی گلیاں گندی اور نالیاں ننگی تھیں۔ گوشت اور کھانے کی چیزوں پر مکھیاں بھنبھناتی تھیں اور لوگ جوہڑوں پر کپڑے دھوتے تھے۔ نئے چین کی گلیوں میں ننگے پاؤں والی عورتیں مسلسل جھاڑو دیتی نظر آتی ہیں۔ نالیاں زمین کے نیچے غائب ہو رہی ہیں۔ پبلک باغوں اور آرام گھروں میں پینے کے لیے ابلے ہوئے پانی کے نلکے موجود ہیں۔ بڑے بڑے شہروں میں میں نے بڑے بڑے سرخ حروف میں لکھا دیکھا: "صفائی کے داروغہ کے لیے خوش آمدید" پولیس کے سپاہی، سکولوں کی لڑکیاں اور ریلوے گارڈ تمام مکھی مار سویٹر اٹھائے دکھائی دیتے ہیں۔ انہیں مکھیوں سے ایسی ہی نفرت ہے جیسے لوگوں کو سانپ سے۔ ایک کارخانے میں میں نے چار آدمیوں کو ایک مکھی دیکھتے ہی اس کے پیچھے بھاگتے دیکھا۔"

پرانے چین میں چوری چکاری عام تھی۔ لیکن اس دفعہ میں نے شاذ و نادر ہی اپنے ہوٹل کے کمرے کو قفل لگایا ہوگا (اور جب کبھی میں قفل لگاتا بھی تو چابیاں باہر دیوار پر چھوڑ جاتا) میں بڑے اطمینان سے اپنے کپڑے کمرے میں بکھرے چھوڑ جاتا۔ ایک مرتبہ میں ایک ہوٹل میں چھٹے پنس کی ایک نوٹ بک بھول گیا۔ ہوٹل کا نوکر اسے لوٹانے کے لیے سٹیشن تک بھاگا آیا۔"

چینیوں نے چھوٹی چھوٹی دکانوں میں دیانت نفس کا اصول جاری کر رکھا ہے۔ آپ خود ہی ٹکٹ سگریٹ اور سوڈا واٹر وغیرہ لے سکتے ہیں اور ایک کھلی صندوقچی میں سے خود ہی ریزگاری بھی

اٹھا سکتے ہیں۔ ایک کارخانے کا دعویٰ ہے کہ وہ اپنے ملازموں کو اجرت دینے کے لیے بھی دیانت نفس کے اصول سے کام لیتا ہے جس کسی کی جتنی مزدوری بنتی ہو وہ اسی قدر رقم نوٹوں کے ایک بنڈل سے اٹھا لیتا ہے اور کوئی شخص اس بنڈل کی رکھوالی کے لیے موجود نہیں ہوتا۔"

انعام یا بخشش ایک پرانا چینی رواج تھا، مگر اب اسے توہین خیال کیا جاتا ہے۔ جس لڑکے نے میرے جوتے صاف کیے اس نے تین پنس کا بل پیش کیا۔ میں نے اسے چھ پنس دے دیے۔ اس نے ریزگاری گن کر تین پنس واپس کر دیے اور ساتھ ہی تین پنس کی رسید دی۔ میں نے ایک پنس سے لیکر پندرہ پونڈ تک کا انعام پیش کر کے دیکھا، مگر ہر دفعہ نہایت مہذب مگر مضبوط لہجے میں جواب ملا کہ یہ نیا چین ہے۔ اس لیے انعام قبول نہیں کیا جا سکتا۔"

دکانوں اور ہوٹلوں کے ملازموں کے کندھوں پر نمبر نظر آتے ہیں۔ باہر ایک بورڈ پر یہ تمام نمبر درج ہوتے ہیں۔ اگر آپ کسی ملازم کے حسن سلوک کی داد دینا چاہتے ہیں تو اس کے نمبر کے نیچے سرخ جھنڈی گاڑ دیجیے۔"

نئے چین میں نہ گانے والی عورتیں ہیں نہ ناچ گھر۔ عصمت فروشی ختم کر دی گئی ہے۔ سردیوں کی راتوں میں شنگھائی کی سڑکوں اور گلیوں میں کوئی مشتبہ عورتیں چلتی پھرتی نظر نہیں آتیں، مجھے بتایا گیا کہ آزادی کی آمد کے بعد ان بدراہ عورتوں کو زیادہ مفید کام کی تعلیم دینے کے لیے مرکز کھولے گئے تھے۔"

یہ اس ملک کے ذہنی انقلاب کا حال ہے، جسے سیاسی انقلاب میں سے گزرے ابھی صرف چند برس گزرے ہیں۔ چین نہ صرف ایک پسماندہ ملک ہے بلکہ اس میں آبادی کی اتنی بھرمار ہے جو دنیا کے کسی اور ملک میں نہیں۔ ۶۵ کروڑ آبادی کے لیے غذا مہیا کرنے کے لیے ملک کا چپہ چپہ زیر کاشت ہے۔ اس لیے مویشیوں کے لیے چارہ پیدا کرنا تقریباً خارج از بحث ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ دودھ اور گوشت بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتے ہیں۔ ان دشوار معاشی مسائل کے ساتھ ہی چینی کسانوں کی صدیوں پرانی قناعت پسندی ہے جو تقدیر کو اٹل سمجھ کر اس کے سامنے چپ چاپ گھٹنے ٹیکنے میں یقین رکھتی ہے۔ مگر چین میں ایک ایسا گہرا ذہنی انقلاب آیا ہے، جس نے ان تمام رکاوٹوں کو

قابو پاکر ۷۰ کروڑ انسانوں کے جسم میں ایک نئی زندگی پھونک دی ہے اور انھیں اس قابل بنادیا ہے فرسودہ اوزاروں اور خالی ہاتھوں سے کام کر کے ایسے ناقابلِ یقین کارنامے انجام دے لیں جن پہ دنیا دنگ رہ جائے۔

پنجاب یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر نے ایک مرتبہ اپنے طلبہ کی کاہلی کے لیے موسم کو ذمہ دار ٹھہرایا تھا، اور تجویز پیش کی تھی کہ یونیورسٹیاں اور کالج موسمی حالات پہ قابو پانے کے انتظامات کریں۔ لیکن چین کی مثال ثابت کرتی ہے کہ کام کا شوق اور محنت کا احترام موسمی حالات پہ قابو پانے سے نہیں بلکہ ایک حقیقی ذہنی انقلاب پیدا کرنے سے ہی ترقی پا سکتا ہے۔ چین کی مثال کوئی اکیلی مثال نہیں۔ تاریخ میں بہت دفعہ یوں ہوا ہے کہ سخت گرم علاقوں کے لوگوں میں یک دم ایک ذہنی انقلاب آیا جس نے انھیں فوراً قوموں کی پہلی صف میں لا کھڑا کیا۔ لیکن جب یہ انقلابی روح مٹ گئی تو یہ لوگ دوبارہ پستی کے گڑھے میں جا گرے۔ پس آج جس چیز کی سب سے زیادہ ضرورت ہے وہ ذہنی انقلاب ہے جو اسلام نے ساڑھے تیرہ سو سال پہلے پیدا کیا تھا۔
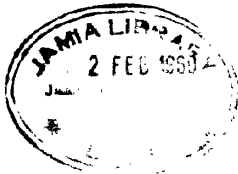
سقراط اور اس کا طریق استدلال

انیس احمد

ایتھنز کا سب سے دانا آدمی

قدیم یونانی دیوی دیوتاؤں اور غیبی آوازوں میں یقین رکھتے تھے۔ ان کے بڑے بڑے مندر لوگوں کی عقیدت کے مرکز تھے۔ لوگ اکثر معاملات میں مشورہ طلب کرنے کے لیے ان مندروں کی طرف رجوع کرتے تھے۔ سائل یہاں آکر طرح طرح کے سوال کرتے اور پروہت ان سوالوں کے جواب دیتے۔ یہ جواب غیبی آواز خیال کیے جاتے تھے۔"

ایتھنز کی شہری ریاست میں ڈیلفی کا مندر بڑی شہرت رکھتا تھا۔ ایک مرتبہ ایک شخص نے اس مندر کی غیبی آواز سے سوال کیا کہ ایتھنز میں سب سے دانا آدمی کون ہے؟ جواب ملا سقراط۔

لوگوں نے یہ سارا ماجرا سقراط کو سنا۔ اس نے سنجیدگی سے جواب دیا کہ غیبی آواز نے مجھے ایتھنز کا سب سے عقل مند آدمی اس لیے قرار دیا ہے کہ سارے ایتھنز میں میں ہی وہ اکیلا انسان ہوں جسے یہ معلوم ہے کہ غیبی کو مطلق کسی چیز کی خبر نہیں۔

پرانی دنیا کا یہ مشہور حکیم انسان کی فکری تاریخ میں آج بھی ایک باوقار مقام رکھتا ہے۔ سقراط دنیا کے ان غیر معمولی انسانوں میں سے ہے جنھوں نے کوئی کتابیں اپنی یادگار نہیں چھوڑیں، مگر جن کے زیر اثر دوسرے لوگوں نے کئی شہرۂ آفاق کتابیں لکھیں۔ مثلاً شمس تبریز نے اپنے پیچھے کوئی تصنیف نہیں چھوڑی مگر وہ مولانا روم کے سینے میں ایک ایسی چنگاری سلگا گئے جس نے دنیا کی مشہور کتاب مثنوی مولانا روم کو جنم دیا۔ اس طرح سقراط نے خود کوئی کتاب نہیں لکھی۔ مگر وہ اپنے شاگرد افلاطون پر علم و حکمت کے ایسے راز کھول گیا جنھوں نے جدید علوم فنون کے لیے بنیاد کا کام دیا۔ افلاطون اور

اور اس کے شاگرد ارسطو نے فلسفہ۔ علم السیاست۔ علم التعلیم وغیرہ پر جو شہرہ آفاق کتابیں لکھیں انہیں براہ راست سقراط کا ہی فیض سمجھنا چاہیے۔

گھر سے وحشت

پیشے کے لحاظ سے سقراط سنگ تراش تھا۔ مگر اس پیشے کو وہ صرف اتنی توجہ دیتا تھا جس سے وہ اپنی بیوی اور اپنے تین لڑکوں کا پیٹ پال سکے۔ وہ باقی وقت لوگوں کو علم و حکمت کی راہ دکھانے میں صرف کرتا تھا۔ یہ بات اس کی بیوی کو سخت ناپسند تھی۔ وہ تیز مزاج اور زبان دراز عورت واقع ہوئی تھی۔ سقراط لوگوں کو حکمت و دانش کا سبق دینے میں جو وقت صرف کرتا تھا اس کی بیوی کے لیے وہ وقت کا ضائع کرنا تھا۔ اس لیے وہ سقراط پر جی کھول کر برستی۔ سقراط کے لیے چپ رہنے کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔ اس صورتِ حال نے سقراط کے دل میں گھر سے وحشت پیدا کر رکھی تھی۔ وہ گھر سے باہر خوب خوش و خرم رہتا۔ لیکن جب گھر جانے کا وقت آتا تو بادل ناخواستہ اس طرف قدم اٹھاتا۔

سقراط کی تند مزاج بیوی کے متعلق کئی لطیفے مشہور ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ ایک صبح سقراط گھر کے دروازے پر بیٹھا کچھ سوچ رہا تھا، بیوی حسب معمول اسے کوسنے میں لگی تھی، کوستی جاتی تھی اور کہتی جاتی تھی کہ اس مردے پر کہنے سننے کا خاک بھی اثر نہیں ہوتا۔ وہ اس وقت برتن دھو رہی تھی۔ یکدم طبیعت میں جو اُبال آیا گندے پانی سے بھری ہوئی دیگچی سقراط کے سر پر لاکر انڈھیل دی۔

سقراط بڑے سکون سے بیٹھا رہا اور مسکرا کر بولا۔ کافی دیر سے گرج اور چمک جاری تھی، آخر پانی بھی برسنا ہی تھا۔

سقراط کا روزمرہ کا معمول یہ تھا کہ وہ پو پھٹنے سے پہلے اٹھتا، ضروریات سے فارغ ہو کر جلد جلد ناشتہ کرتا، یہ ناشتہ شراب میں بھگوئی ہوئی روٹی پر مشتمل ہوتا۔ ناشتے سے فارغ ہو کر وہ اپنا کوٹ پہنتا اور اس کے اوپر ایک موٹی چادر اوڑھ کر بازار کی راہ لیتا، یہاں وہ کسی دکان، یا حمام یا مندر یا بازار کے کسی ایسے گوشے کے سامنے جاکر کھڑا ہوتا جہاں لوگوں کی آمد و رفت ہوتی، بعض اوقات وہ کسی دوست کے گھر جا نکلتا، بہرصورت اس کا مقصد یہ ہوتا کہ کسی کے ساتھ بحث چھڑ جائے، جونہی کوئی شخص سقراط سے

بات چیت شروع کر دیتا، وہ بحث اپنے مخصوص انداز میں بحث کا رُخ اس خوب صورتی اور چابک دستی کے ساتھ اس طرح موڑ دیتا کہ بحث کرنے والا ان خیالات اور معتقدات کی لغویت تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتا جو مدتوں سے درست مانے چلے آتے تھے۔

سقراطی طرزِ استدلال

سقراط جب کسی سے بحث کرنے لگتا تو وہ بڑی پرفن سادگی اور انکساری سے زیرِ بحث سوال کے متعلق اپنی لاعلمی کا اظہار کرتا۔ جب دوسرا آدمی اس سوال کا جواب دیتا تو سقراط بڑے بھولے بھالے انداز میں اس جواب پر سوالوں کی شکل میں جرح شروع کر دیتا حتیٰ کہ جواب دینے والا اپنے جواب کے نامکمل یا غیر معقول ہونے کا اقرار کر لیتا، اور سقراط بڑی سادگی سے کہتا کہ شاید اس سوال کا جواب یہ ہو۔ اس پر آس پاس کھڑے لوگ اور خود فریقِ مخالف بے ساختہ پکار اٹھتا۔ ہاں ہاں اس سوال کا درست جواب یہی ہے۔ اس طرح طرزِ استدلال کی وضاحت ایک مثال سے ہو جائے گی۔

فرض کیجیے کہ ایتھنز کے ایک معزز شہری نے لوگوں سے خطاب کیا ہے۔ اور اپنے خطاب میں حبِ وطن اور شجاعت کی اہمیت پر زور دیا ہے۔ خطاب کے خاتمے پر سقراط چپکے سے اس کے سامنے جا کھڑا ہوتا اور کہتا! "معاف فرمائیے، میں آپ سے ایک دو باتیں پوچھنا چاہتا ہوں، مجھے آپ کی تقریر بہت پسند آئی ہے۔ مگر مہربانی فرما کر ذرا اس بات کی وضاحت فرما دیجیے کہ شجاعت سے آپ کی ٹھیک ٹھیک کیا مراد ہے؟"

"شجاعت سے مراد یہی ہے کہ خطرے کی گھڑی میں بھی آپ اسی جگہ جمے رہیں جہاں آپ کو اپنا فرض ادا کرنے کے لیے کھڑا کیا گیا ہے۔"

لیکن اگر جنگی حال اس بات کا تقاضا کرے کہ پیچھے ہٹ جانا چاہیے تو پھر؟"

"ہاں۔ وہ معاملہ دوسرا ہے، ایسی صورت میں آپ کو یقیناً پیچھے ہٹ جانا چاہیے"

تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ شجاعت سے مراد نہ ایک جگہ ڈٹ کر کھڑے رہنا ہے اور نہ پیچھے ہٹنا ہے تو پھر آپ شجاعت کا مفہوم کیا لیں گے؟"

آپ نے مجھے اچھی خاصی الجھن میں ڈال دیا ہے۔ شاید میں شجاعت کا ٹھیک ٹھیک مفہوم بیان ہی نہیں کرسکتا۔"

"مجھے خود اس کا ٹھیک مفہوم معلوم نہیں۔ لیکن شاید شجاعت سے مراد یہ ہو کہ انسان اپنے ذہن سے کام لے اور خطرے کی پرواہ کیے بغیر وہ راہ اختیار کرے جو معقول ہو۔"

اس پر پاس کھڑے ہوئے لوگوں میں سے کوئی پکار اٹھتا :۔ "ہاں ہاں۔ شجاعت کا یہ مفہوم درست معلوم ہوتا ہے"

اب سقراط اس طرف متوجہ ہوتا اور کہتا :۔ "تو کیا ہم سر دست شجاعت کا یہ مفہوم تسلیم کرلیں کہ غیر متزلزل قوت فیصلہ کا نام ہے؟ بے شک ہم مشکل سوال سے بحث کر رہے ہیں۔ لیکن میرے دوست آپ کی تائید نے مجھے یہ سمجھا دیا ہے کہ شجاعت حاضر دماغی کا نام ہے، اس لیے شجاعت کی ضد ٹھہری کہ جذبات اس شدت کے ساتھ امڈ آئیں کہ ذہن ماؤف ہو جائے۔"

اس پر چاروں طرف سے آوازیں آتیں :۔ "بے شک، بے شک شجاعت اسی چیز کا نام ہے کہ انسان ڈر خوف یا دوسرے جذبات کو اس قدر راہ نہ دیدے کہ اس کا ذہن درست طور پر سوچنا ہی بند کر دے۔"

شجاعت کا جو مفہوم سقراط نے اس مخصوص انداز میں بیان کیا لوگوں نے اسے فوراً درست تسلیم کیا وجہ یہ کہ انھوں نے سقراط کی ذاتی مثال کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ ڈیلیم کی جنگ میں سقراط نے جس ثابت قدمی اور بے خوفی کا مظاہرہ کیا تھا، عام لوگوں کو اس کا حال معلوم تھا۔ اسی طرح جب دس جرنیلوں کو اس جرم میں موت کی سزا دی گئی کہ وہ اپنے سپاہیوں کو ڈوبنے سے بچا نہ سکے تو عام لوگو اس فیصلے کو بے حد پسند کیا تھا۔ مگر سقراط نے عوامی ناراضگی کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اس فیصلے کو غلط قرار دیا تھا۔ اس کی رائے یہ تھی کہ انسانوں کے کسی گروہ پر جماعتی طور پر مقدمہ چلانا اور انھیں اس طرح سزا دینا اصولاً غلط ہے۔

معقولیت کا علمبردار | سقراط کو اس بات کا یقین تھا کہ ہر قسم کی بد اخلاقی اور ہر قسم کی برائی صرف

اُس وقت سرزد ہوتی ہے جس وقت انسان عقل کی رہنمائی ترک کرکے جذبات کی رو میں بہہ جاتا ہے وہ چاہتا تھا کہ دوسرے لوگ بھی یہ نکتہ سمجھ جائیں۔ یہ دھن اسے بے چین کیے رکھتی تھی اور وہ ہر ایسے موقع کی تلاش میں رہتا تھا جس کی بدولت وہ لوگوں پر معقولیت پسندی کی ضرورت واضح کر سکے۔ اس کا عقیدہ تھا کہ اگر لوگ جذبات میں بہنا چھوڑ کر ہر بات میں پاسبان عقل کی راہنمائی قبول کیا کریں تو دنیا سے تمام برائیاں مٹ جائیں یا کم از کم وہ تلخیاں اور بے معنی جھگڑے پیدا نہ ہوں جو انسانی زندگی کو بدمزہ بنائے رکھتے ہیں۔ وہ اپنے مخصوص انداز استدلال سے لوگوں پر یہ حقیقت واضح کرنا چاہتا تھا کہ ہر قسم کی خرابی افراط یا تفریط کے باعث پیدا ہوتی ہے۔ سلامتی کی راہ اعتدال کی راہ ہے۔ مگر اعتدال کی راہ ہمیشہ عقل و خرد کی روشنی سے ہی دکھائی دے سکتی ہے۔ جذبات کا طوفان عقل و خرد کا دشمن ہے اس لیے ہر حالت میں بچنا لازم ہے۔

سقراط نے صرف ٹھنڈے دل سے سوچ بچار کرنے کی ضرورت ہی واضح نہیں کی بلکہ اس نے اس کا ڈھنگ بھی لوگوں کو سکھلایا۔ وہ جب کسی سے کسی معاملے پر بات چیت شروع کرتا تو پہلے یہ کہتا کہ آؤ بحث سے قبل ان الفاظ کے معانی متعین کر لیں جو ہماری بات چیت میں بار بار استعمال ہونے والے ہیں۔ معانی کے اس طرح سختی سے مقرر ہو جانے کا نتیجہ یہ نکلتا کہ دوسرا آدمی انجام کار کسی ایسے اصول یا نظریے کے درست ماننے پر مجبور ہو جاتا جو عام لوگوں کی نگاہ میں قابل قبول نہ ہوتا۔

سچ یہ ہے کہ سقراط تے معقولیت پسندی کی تبلیغ بالکل اس وارفتگی سے کی جس سے حضرت مسیح کوئی چار سو سال بعد محبت کی تبلیغ کرنے والے تھے۔ نوع انسان کی فکری تاریخ پر سقراط نے بھی اسیطرح ایک ان مٹ نقش چھوڑا ہے جس طرح حضرت مسیح علیہ السلام نے۔ لیکن دنیا کے یہ دونوں عظیم معلم اس نکتے تک نہ پہنچ سکے کہ معقولیت پسندی اور محبت دونوں کی اصل جڑ توحید ہے۔ توحید کا انقلاب آفرین پیغام سقراط کے کوئی ایک ہزار برس بعد دنیا کے کانوں میں گونجنے والا تھا۔

مقناطیسی کشش

سقراط دیکھنے میں حد درجہ بدصورت تھا۔ اس کا سر بالوں سے بالکل کورا، اور درمیان سے گنبد کیطرح

اُبھرا ہوا تھا۔ اتنے بڑے سر کے مقابلے میں اس کا چہرا چھوٹا معلوم ہوتا تھا۔ اس کی ناک گول اور آگے سے اوپر کو اُبھری ہوئی تھی۔ اس مضحکہ خیز چہرے پر ایک لمبی ڈاڑھی لہراتی تھی۔ سقراط کے دوست اس کی بدصورتی کا اکثر مذاق اڑاتے اور سقراط خود اس دل لگی میں ان کی مدد کرتا۔

مگر اس ظاہر شکل و صورت کے پیچھے ایک مقناطیسی شخصیت چھپی تھی۔ جو لوگ سقراط کی باتیں سنتے وہ رفتہ رفتہ اس کے گرویدہ ہو جاتے۔ انھیں احساس ہونے لگتا کہ ناقص پوڑھے کی نگاہ رسمی پردوں کو چیرتی ہوئی حقیقت کے چہرے تک پہنچ رہی ہے۔ رفتہ رفتہ سقراط نے اپنے گرد نوجوان چیلوں کی ایک جماعت جمع کر لی۔ یہ شاگرد ہر وقت اپنے استاد کے ساتھ ساتھ رہتے۔ سقراط ان کے ساتھ مختلف مسائل پر بات چیت جاری رکھتا اور انھیں علم و حکمت کے باریک نکتے سمجھاتا۔

آخر سقراط کی شہرت ایتھنز سے نکل کر دور دور کے ملکوں میں جا پہنچی اور علم و حکمت کے پیاسے اس کے گرد جمع ہونے لگے۔ نوبت یہاں تک جا پہنچی کہ سسلی کا شہزادہ اس کے شاگردوں میں شامل ہو گیا۔ مگر سقراط اپنے شاگردوں سے کوئی فیس وصول نہیں کرتا تھا۔ اسے معقولیت پسندی کی تبلیغ کرنے کا جنون تھا۔ اور یہ بات اس کے لیے خوشی کا باعث تھی کہ اب اس کے گرد اثر پذیر نوجوانوں کی ایک ایسی جماعت جمع ہو گئی ہے جسے وہ جی کھول کر تبلیغ کر سکتا ہے۔

مخالفت کا طوفان

بظاہر سقراط کی تعلیم کو کسی طرح بھی انقلابی نہیں کہا جا سکتا تھا۔ وہ ملکی قوانین کا احترام کرتا تھا اور دوسروں کو ان کا احترام کرنے کی ترغیب دیتا تھا۔ اس قسم کے امن پسند آدمی کے خلاف ملکی قانون کا حرکت میں آنا ناقابل یقین حد تک عجیب معلوم ہوتا ہے۔ مگر ایتھنز کے نوجوان سقراط سے جو تربیت حاصل کر رہے تھے اس نے اکثر قدامت پسند لوگوں کو چونکا دیا۔ انھوں نے سقراط کو ریاست کے لیے ایک خطرہ قرار دیا۔ رفتہ رفتہ یہ مخالفت اتنی بڑھی کہ سقراط پر مقدمہ چلانے کی نوبت آگئی۔

یہ بات فی الواقعہ بہت عجیب معلوم ہوتی ہے کہ کسی آدمی کو محض اس لیے خطرناک سمجھا جائے کہ وہ دوسرے لوگوں کو معقولیت کی راہ کی طرف بلاتا ہے۔ سقراط سے پہلے بھی کئی لوگوں نے یہ دعوت دی تھی

مگر جس پرزور اور پُر تاثیر طریق سے سقراط نے یہ مہم جاری کی تھی یہ اسی کا حصہ تھا۔ پھر ہمیں یہ بھی نہ بھولنا چاہیے کہ جذبات سے بالکل الگ تھلگ ہو کر سوچنے اور الفاظ کے معانی سختی سے متعین کرنے کا نتیجہ اکثر صورتوں میں ایسے نظریوں اور نتیجوں کی شکل میں نکلتا تھا جو عوامی اعتقادات سے براہِ راست ٹکراتے تھے۔ قدامت پسندوں کو یہ بات ہرگز گوارا نہ تھی کہ جو اعتقادات پرانے بزرگوں کے وقت سے درست تسلیم ہوتے چلے آئے ہیں ان کے خلاف کوئی زبان کھولے۔ تاہم سقراط کو کسی مخالفت کی چنداں پرواہ نہ تھی، اس نے اپنی مہم بدستور جاری رکھی۔

شہادت کی موت

سقراط کے خلاف دو الزام تھے۔ پہلا یہ کہ وہ ان دیوی دیوتاؤں کو نہیں مانتا جن کو باقی لوگ مانتے ہیں اس پر دوسرا الزام یہ تھا کہ وہ ایتھنز کے نوجوانوں کو بداخلاق بنا رہا ہے، اس دوسرے الزام کی کوئی وضاحت نہیں کی گئی۔ تاہم یہ ضرور ہے کہ سپارٹا کے ساتھ لڑائی میں ایتھنز نے شکست کھائی تھی اس لڑائی میں سقراط کا ایک نوجوان شاگرد اہل سپارٹا سے جا ملا تھا۔ ہرچند کہ اس میں سقراط کا کوئی قصور نہ تھا مگر ایتھنز کے لوگ شکست کے صدمے سے چکرائے ہوئے تھے اور انھیں قربانی کے کسی ایسے بکرے کی تلاش تھی جس پر وہ اپنا غصہ نکال سکیں۔ قربانی کا یہ بکرا انھیں سقراط کی شکل میں مل گیا۔

سقراط کے مقدمے کا فیصلہ کرنے کے لیے پانسو ایک شہریوں پر مشتمل ایک جیوری مقرر کی گئی اس جیوری نے ساٹھ ووٹوں کی اکثریت سے فیصلہ دیا کہ سقراط کو موت کی سزا ملنی چاہیے۔ ساٹھ ووٹوں کی معمولی اکثریت اس بات کا ثبوت تھا کہ بہت سے شہری سقراط کو بے گناہ سمجھتے تھے۔ جن لوگوں نے اس بڈھے حکیم کو موت کی سزا کا حکم سنایا تھا، انھیں بھی یہ یقین نہیں تھا کہ سقراط کو فی الواقع ہلاک کر دیا جائے گا۔ وجہ یہ کہ ایتھنز کے دستور کے مطابق ملزم کو یہ حق پہنچتا تھا کہ سزا سنائے جانے کے بعد گریہ زاری سے سزا کے کم کیے جانے کا مطالبہ کرے۔ اس قسم کے مطالبے عام حالتوں میں پورے ہو جاتے تھے مگر سقراط ایک عام ملزم نہیں تھا۔ اس نے عمر بھر جذبات کی رو میں بہ جانے کے خلاف جہاد کیا تھا۔ اب وہ اپنی سزا کم کرانے کے لیے جیوری کے جذبات کو کس طرح اپیل کر سکتا تھا؟

سقراط نے بڑی تمکنت سے اپنا دلی سکون قائم رکھا۔ اس نے جیوری سے رحم کی کوئی اپیل نہ کی۔ اس کے دوستوں نے بڑا زور مارا کہ وہ جیوری سے رحم کی درخواست کرے۔ مگر سقراط نے اس قسم کے تمام مشورے مضبوطی سے ٹھکرا دیے۔

اب سقراط کو قید خانے میں لے جایا گیا۔ یہاں بھی شاگردوں اور دوستوں کا جمگھٹا اس کے گرد جمع تھا اور فلسفیانہ مسائل پر بحثیں جاری تھیں۔ دوستوں نے سقراط کو مشورہ دیا کہ چونکہ اس کو ناحق سزائے موت دی گئی ہے اس لیے اسے قید خانے سے بھاگ جانا چاہیے۔ انھوں نے اس ضمن میں ہر طرح کی مدد کرنے کا ذمہ بھی اٹھایا۔

سقراط نے اس تجویز پر بڑی حیرانی کا اظہار کیا اور کہا: ۔ کیا میں نے تمھیں ہمیشہ یہ تعلیم نہیں دی کہ تمھیں ملکی قانون کا پابند رہنا چاہیے؟ اگر ایتھنز کا قانون مجھے موت کا مستحق سمجھتا ہے تو مجھے کیا حق پہنچتا ہے کہ اس قانون کو پاؤں تلے روند کر اپنی جان بچاؤں؛ ایسا کرنا معقولیت کی راہ چھوڑ کر جذبات کی رہ نمائی قبول کرنا ہے۔ میں اس بات پر کبھی رضا مند نہیں ہو سکتا۔

اب بات چیت کا رخ موت کے بعد کی زندگی کی طرف مڑ گیا۔ بعض کا خیال تھا کہ انسانی زندگی موت کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے اس سے آگے اور کچھ نہیں۔ مگر سقراط کا خیال اس سے مختلف تھا۔ اس کا نظریہ یہ تھا کہ موت کے بعد انسان ایک اور دنیا میں پہنچ جاتا ہے جو اس دنیا سے بہت پاکیزہ اور مکمل ہے۔

علم و حکمت کے نکتوں پر اسی طرح دن بھر بحثیں جاری رہیں۔ سورج تیزی سے ڈھلتا جا رہا تھا، اس کے پہاڑ کی چوٹی کے پیچھے چھپتے ہی سقراط کو زہر کا پیالہ پینا تھا۔ سورج ڈوبنے سے تھوڑی دیر پہلے جلاد سقراط کی طرف آیا۔ سقراط نے اسے پاس بٹھایا اور کہا۔ تمھیں اس معاملے کی اچھی طرح خبر ہے، مجھے ذرا سمجھا دو کہ مجھے کیا کچھ کرنا چاہیے؟

جلاد نے کہا: یہی کہ آپ زہر کا پیالہ پینے کے بعد ادھر ادھر ٹہلنے لگیں، تاکہ یہ آپ کے جسم میں اچھی طرح سرایت کر جائے، جب آپ کی ٹانگیں لڑکھڑانے لگیں تو آپ لیٹ جائیں اور اپنا چہرہ کپڑے سے ڈھانپ لیں۔ اس کے جلد بعد آپ کا سارا جسم سن ہو جائے گا اور آپ ابدی نیند سو جائیں گے۔

آخر وہ گھڑی آن پہنچی جب ایتھنز کے سب سے دانا آدمی کو زہر کا پیالہ پینا تھا۔ جلاد زہر کا پیالہ لیے آن حاضر ہوا۔ سقراط کے شاگرد اور دوست کلیجہ تھام کر اس دہشت ناک منظر کے لیے تیار ہو گئے جس کے خیال سے بھی آنکھیں دکھ ہوتا تھا۔ سقراط نے بڑے اطمینان سے پیالہ پکڑا اور کمال سکون سے اسے پینے لگا، مگر شاگرد استاد کے سے ضبط کا مظاہرہ نہ کر سکے، وہ رونے لگے۔ سقراط پیالہ پیتے پیتے چند بار صرف اس غرض سے رکا کہ اپنے شاگردوں کو ان کے غیر معقول طرز عمل سے روکے۔

پیالہ ختم کر لینے کے بعد سقراط حسب ہدایت ٹہلنے لگا۔ شاگرد اس کو ہر طرف سے گھیرے ہوئے تھے۔ اب بھی علم و حکمت کے نکتے حل ہو رہے تھے۔ آخر جب ٹانگیں لڑکھڑانے لگیں تو سقراط منہ پر کپڑا ڈال کر لیٹ گیا۔ اس آخری لمحہ میں اسے ایک قرض کا خیال آیا جو واجب الادا تھا، اس نے منہ سے کپڑا اٹھایا اور آواز دی :-

کریٹو! میں نے فلاں پڑوسی سے ایک مرغ اُدھار لیا تھا، یہ قرض ادا کر دینا، دیکھنا بھول نہ جانا۔"

"بہت اچھا آقا ایسا ہی ہو گا۔" کریٹو نے جواب دیا۔ کیا میرے لیے کوئی اور ہدایت بھی ہے؟"

اس سوال کا جواب نہ آیا۔ وہ زبان جو کئی برس سے دن رات حق و صداقت کی حمایت کے لیے وقف تھی ہمیشہ کے لیے خاموش ہو چکی تھی۔

سقراط کا کارنامہ

سقراط کے شاگردوں میں سے افلاطون فہم و فراست میں سر فہرست تھا۔ اس نے اپنے استاد کے آخری لمحات کی تصویر بڑے دل گداز پیرائے میں کھینچی ہے۔ اور اپنا بیان ان الفاظ پر ختم کیا ہے :-

یہ انجام تھا ہمارے اس دوست کا جو ان تمام انسانوں میں سے جنہیں ہم جانتے ہیں سب سے اچھا، سب سے زیادہ انصاف پسند اور سب سے زیادہ دانا تھا۔"

سقراط نے اپنی زندگی میں علم و حکمت کے جن نکات پر سے پردہ اٹھایا اس کے شاگرد افلاطون نے ان فلسفیانہ نکات کو اپنی متعدد کتابوں میں جمع کیا ہے۔ یہ کتابیں آج بھی نوع انسانی کا ایک قیمتی ورثہ شمار ہوتی ہیں۔ افلاطون کے بعد علم و حکمت کی شمع کو اس کے شاگرد ارسطو نے روشن کیے رکھا۔ سقراط نے

قدیم یونان میں جو ذہنی تحریک شروع کی تھی اس کے زیر اثر فلسفہ کے کئی مکتب قائم ہوئے۔ یہ تمام مکاتیب فکر سقراط کے جانشین ہونے کے دعویدار تھے۔

سقراط سے پہلے ہی یونانی حکما، نظام فطرت کے مطالعہ کی راہ پر چل نکلے تھے۔ انھوں نے ستاروں اور دوسرے مظاہر فطرت کے مطالعہ سے معلومات کا ایک ایسا ذخیرہ جمع کر لیا تھا جو سائنس کہلانے کا مستحق تھا۔ لیکن سقراط نے انسانی فکر کو سائنس کا درجہ دیا۔ اس نے دنیا کو درست طور پر سوچنے کی راہ بتائی اور اس طرح فکر و استدلال کو علم منطق کے مقررہ اصولوں کے تابع کر دیا۔ یہی سقراط کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔

سقراط نے شہادت کی موت قبول کر کے اپنے مشن کو بے پناہ تقویت دیدی۔ جن شاگردوں نے اسے کمال صبر و سکون کے ساتھ اپنے معتقدات کی خاطر جان قربان کرتے دیکھا تھا وہ مبلغانہ جوش و خروش کے ساتھ اس کی تعلیمات کی اشاعت میں لگ گئے، اور اس طرح اپنے استاد کو حیاتِ جاوید عطا کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

مجرم بچوں کا علاج

ڈاکٹر عبدالرؤف

اکثر جرائم کی عمومی وجہ ذہنی ہوتی ہے۔ مگر بچوں کے جرائم تو تقریباً تمام تر ذہنی اسباب کی وجہ سے سرزد ہوتے ہیں۔ جب کسی بچے کو کوئی طبعی آرزو، کوئی قوی خواہش، کوئی دبی ہوئی امنگ جائز طریقے سے پوری ہوتی نظر نہ آئے تو وہ تنگ آکر خلاف معاشرت اور مجرمانہ طریقوں سے اسے پورا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ایسے میں بیشتر اوقات اس کا کردار ماحول اور اس کے معاشرتی نظام سے متصادم ہوتا ہے۔ اسی تصادم کو قانونی اصطلاح میں "جرم" کہتے ہیں۔ جرم کی بے شمار اقسام ہیں۔ اور ہر جرم کے لاتعداد اسباب ہیں۔ بڑوں کی طرح بچے بھی ہر قسم کے چھوٹے بڑے جرائم کے مرتکب ہوتے ہیں۔

جرائم کا انسداد انسانیت، تہذیب اور تمدن کی بقا کے لیے بے حد ضروری ہے۔ بچوں میں مجرمانہ رجحان اور کردار کی روک تھام کا سائنسی طریقہ یہ ہے کہ اُن کے جرائم کے اسباب ڈھونڈے جائیں اور ان کے علاج کے معقول طریقے سوچے جائیں۔ انسانی کردار قطعی پُراسرار نہیں ہے۔ انسان کی کوئی حرکت اور کوئی عمل بھی بے وجہ نہیں واقع ہوتا۔ اسی طرح ہر جرم کا کوئی نہ کوئی سبب یا محرک ہوتا ہے۔ کسی مجرم کا کامیاب علاج اُس وقت تک ناممکن ہے جب تک اس کے مجرمانہ کردار کے اصل اسباب کا کھوج نہ لگایا جائے۔ اسباب کا پتہ چل جائے تو یوں سمجھ لیجیے کہ آپ نے علاج کا بیشتر کام بھی ختم کر لیا۔

گھریلو تربیت کی اہمیت

بچوں کے کردار کے بگڑنے یا سنورنے میں گھر کی فضا کو بہت دخل ہے۔ اگر والدین بچے کی تربیت معقول طریقے سے کرتے ہوں تو بچوں کے بگڑنے کے امکان گھٹ جاتے ہیں۔ اس کے برعکس اگر اس سلسلہ میں تساہل، غفلت یا کج روی اختیار کی جاتی ہو تو بچے کا غلط سمتوں میں بھٹک جانا یقینی ہے۔

مجھے ایک چھوٹی سی کہانی یاد آگئی جو میں نے کسی زمانے میں دوسری جماعت کے طالب علم ہونے کی

حیثیت سے بڑھی تھی۔ ایک نوجوان ڈاکو کو ڈاکہ زنی اور قتل کی پاداش میں سزائے موت کا حکم ہوا۔ جب اسے پھانسی پر لٹکانے لگے تو اُس نے اپنی آخری خواہش کے لیے کہا گیا۔ ڈاکو نے التجا کی کہ اس کی بوڑھی والدہ کو بلایا جائے۔ چناں چہ جیل والوں نے اس بے چاری بدنصیب بڑھیا کو بلا بھیجا۔ اپنی والدہ کی شکل دیکھتے ہی ڈاکو اس پر جھپٹا اور اپنے دانتوں سے اس کی گردن کو اس زور سے کاٹ کھایا کہ وہ بے چاری بے ہوش ہو کر گر پڑی۔ جیل کے سٹاف نے ڈاکو اور اس کی والدہ کو الگ الگ کیا۔ وہ اس سارے واقعہ کی اصلیت اور معانی سمجھنے سے قطعی قاصر تھے۔ انھوں نے سخت حیرانی کے عالم میں ڈاکو سے اس نازیبا حرکت کے متعلق پوچھا تو ڈاکو کہنے لگا ''بات دراصل یہ ہے کہ میرے تمام بُرے افعال اور جرائم کا بنیادی سبب یہی بوڑھی والدہ ہے۔ میری زندگی کے اس قدر جلد ختم ہو جانے کی ذمہ داری بھی حقیقی طور پر اسی کے سر پر عاید ہوتی ہے۔ میں ابھی ننھا ہی تھا کہ میں نے چوری چکاری شروع کر دی۔ مجھے یاد ہے کہ میں جب بھی اپنے ہمسائے کی مرغی کے انڈے چرا کر لاتا تو میری والدہ بہت خوش ہوتی تھی اور میری حرکتوں کی داد دیا کرتی تھی۔ اپنے ابتدائی جرائم کی اس نیاضانہ سرپرستی سے میرا حوصلہ بڑھتا گیا۔ مجھے اصلاح اور بہتری کی کبھی بھی رغبت محسوس نہ ہوئی۔ پھر رفتہ رفتہ میرے جرائم اپنی نوعیت کے اعتبار سے زیادہ پیچیدہ اور سنگین ہوتے گئے۔ حتیٰ کہ میں نے ڈاکہ زنی اور قتل و غارت کے میدان میں بھی قدم رکھ دیے۔ آج مجھے اپنے سیاہ اعمال کی پاداش میں جان کی قیمت ادا کرنا پڑ رہی ہے۔ مگر فی الحقیقت اس المیے کی اصل ذمہ داری میری والدہ پر عاید ہوتی ہے جس کی غلط تربیت نے مجھے یہ دن دکھایا ہے۔ اسی تلخ حقیقت نے مجھے آج مجبور کر دیا کہ میں اس دنیا کو چھوڑنے سے پہلے اپنی والدہ کو جرائم کی تربیت کے لیے خراجِ عقیدت ادا کرتا چلا جاؤں۔''

اس لافانی کہانی کو پڑھے ہوئے مدتیں گذر چکی ہیں، مگر اُس ڈاکو کے آخری الفاظ میرے کانوں میں ابھی تک اسی شدت سے گونج رہے ہیں۔ یہ الفاظ والدین کے لیے کس قدر سبق آموز ہیں۔ ابتدائی مجرمانہ رجحانوں کی روک تھام کے موزوں علاج کے لیے بہترین مقام گھر ہے۔ والدین اگر احتیاط سے کام لیں اور بچوں کی مجرمانہ حرکات کو شروع ہی میں مناسب طریقوں سے روک دیا کریں تو آئندہ زندگی کے بیشتر المیوں

کی روک تھام ہی ہو سکتی ہے اور کامیاب اور خوش گوار زندگی کی داغ بیل بھی پڑ سکتی ہے۔

مدرسہ کی پڑھائی اور ماحول

جرائم کی روک تھام میں مدرسہ کو بہت دخل ہے۔ مدرسہ کی زندگی میں بچوں کو جرائم کی طرف رغبت دلانے والے چیدہ چیدہ عناصر یہ ہیں۔

(۱) بُری صحبت

(۲) لکھائی پڑھائی میں عدم دلچسپی

(۳) شکل تعلیم

مدرسہ کی بری صحبت کا اثر سخت ضرر رساں ہوتا ہے۔ مدرسہ کے ابتدائی ساتھی کردار اور شخصیت پر گہری طرح اثر انداز ہوتے ہیں۔ ایک اچھا بھلا بچہ جب مدرسہ میں ایسے بچوں سے ملنا جلنا شروع کرتا ہے جو بداخلاقی کی دنیا میں داخل ہو چکے ہوں تو اسے بھی بُرے کردار کی طرف تحریک ہوتی ہے۔ کئی مدرسوں میں مجرم بچوں کے باقاعدہ گروہ معرض وجود میں آجاتے ہیں، جو آپس میں مل کر نہایت منظم طریقے سے چوری چکاری اور دھینگا مشتی کی حرکتیں کرتے رہتے ہیں۔ مدرسہ کو جرائم کی زد سے محفوظ رکھنے کے لیے مدرسہ کے تفریحی پروگرام کی طرف خصوصی توجہ دینی چاہیے کیوں کہ تفریح اور کھیل کود سے جرائم اور خلاف معاشرت کردار کی تحریص میں خاطر خواہ کمی واقع ہو جاتی ہے۔ کھیلوں کی تنظیم یوں ہو کہ تقریباً ہر بچہ کوئی نہ کوئی کھیل ضرور کھیل سکے اور محض کھیل دیکھنے پر ہی اکتفا نہ کرے۔ بوائے سکاؤٹنگ اور گرل گائڈنگ کی تربیت کا اہتمام بہت مفید ثابت ہوتا ہے۔ مدرسوں میں علمی ادبی اور ثقافتی مجلسیں قائم ہونی چاہئیں۔ طلبہ کو مباحثوں اور ڈراموں وغیرہ میں شرکت کا شوق دلایا جانا چاہیے۔ بچوں کی ذہنی اور جسمانی بہتری کے لیے مدرسہ میں اس قسم کی دلچسپیوں کا اہتمام کیے جائیں تو بچے مفرح خاطر شاغل میں معروف رہنے کی وجہ سے خلاف معاشرت مستوں میں بہت کم بھٹکتے ہیں۔ اس طرح آوارہ صحبت اور بچر شاغل میں ان کے بھٹکنے کا احتمال بہت گھٹ جاتا ہے۔

تعلیم میں عدم دلچسپی اور جرائم

بعض بچے آوارگی اور جرائم کی طرف محض اس لیے بھی مائل ہو جاتے ہیں کہ مدرسہ کی پڑھائی اور دیگر

تعلیمی مشاغل انھیں بہت مشکل دکھائی دیتے ہیں۔ کتابوں میں کوئی دلچسپی نہ پاکر مدرسہ سے کھسکنا شروع کر دیتے ہیں۔ مدرسہ سے بھاگنا مجرمانہ مشاغل کی طرف پہلا قدم ہے۔ بھگوڑے بچے والدین کی پٹائی کے خوف سے عموماً گھر نہیں پہنچتے بلکہ چھٹی تک کا سارا وقت گلی بازار میں آوارہ گھوم کر بسر کر دیتے ہیں۔ اس آوارگی کے دوران میں انھیں طرح طرح کے گمراہ بچوں اور سماج دشمن افراد سے تعارف ہوتا ہے اور وہ آہستہ آہستہ بداخلاقی اور جرائم کی دنیا میں داخل ہو جاتے ہیں۔ اس قسم کے بچوں کی مشکل کا حل یہ ہے کہ مدرسہ میں درس و تدریس کا سلسلہ آسان اور دلچسپ بنایا جائے تاکہ انھیں سکول سے کھسکنے کی رغبت محسوس نہ ہو۔

بچوں کو اپنی پسند کے مضامین چننے میں مدد دینی چاہیے۔ اگر کوئی مضمون انھیں ناپسند ہو۔ انھیں اسے پڑھنے پر مجبور نہیں کرنا چاہیے۔ اپنی پسند کے مضامین چننے میں حتی الامکان انھیں وسیع اختیار دینا چاہیے۔ مضمون کا مواد سمجھانے کے لیے بصری اعانتیں اور جدید نفسیاتی طریقوں کا استعمال ہونا چاہیے۔ تاکہ بچے کمرہ جماعت میں یکسوئی کے ساتھ علم حاصل کر سکیں۔ مدرسہ کی پڑھائی دلچسپ اور موثر طریقے سے سرانجام ہو تو بچوں کے ذہن ادھر ادھر بھٹکنے سے بچ جاتے ہیں۔ دلچسپ درس و تدریس کی وجہ سے بچے خلاف معاشرہ حرکات اور جرائم کی زد میں آنے سے محفوظ ہو جاتے ہیں۔

مشکل معلم اور بچوں کے جرائم

مدرسہ میں مجرمانہ رجحان کی ترویج میں مشکل معلم کو بھی بہت دخل ہے بعض معلموں کی اپنی ذاتی اور جذباتی زندگی بےحد غیر متوازن ہوتی ہے۔ یاس محرومیت اور تلخی اُن پر ہر لحظہ چھائی رہتی ہے۔ اس قسم کے معلم بچوں سے عموماً مزاجی اور ترش بدخوئی سے پیش آتے ہیں۔ ان میں بچوں کو جھڑکیاں اور بدنی سزائیں دینے کا جنون سادیت کے درجہ تک پہنچ جاتا ہے۔ بچے جب جماعت میں اس قسم کی تشدد آمیز فضا سے بہت تنگ آ جاتے ہیں تو وہ ایسے مواقع کی تلاش میں رہنے لگتے ہیں جن میں وہ اپنی من مانی کر سکیں۔ چناں چہ چھیڑ چھاڑ، دھینگا مشتی اور چوری چکاری میں فرار اختیار کر کے انھیں مدرسہ کے تشدد آمیز ماحول سے چھٹکارا محسوس ہوتا ہے۔

اسی طرح بعض معلم ایسے بھی ہوتے ہیں جن کا اخلاق اور کردار پست ہوتا ہے۔ وہ بچوں کے سامنے غیر ذمہ دارانہ گفتگو اور غیر موزوں فطرت کے مرتکب ہوتے رہتے ہیں اور ان کے روزمرہ کردار کا جائزہ لیتے ہیں

تو انھیں بھی بداخلاقی اور جرائم کی ترغیب ہوتی ہے۔ اس قسم کے سماج دشمن معلموں کو اول تو پڑھانے کے کام پر مامور ہی نہیں کرنا چاہیے۔ اور اگر یہ نہ ہو سکے تو پھر ان کا باقاعدہ علاج ہونا چاہیے۔ تاکہ بچے ان کی بری ذہنیت اور غیر مناسب کردار کے زہریلے اثرات سے محفوظ رہ سکیں۔

اسباب اور علاج کا تحقیقی مرکز

جرائم کی روک تھام کے لیے بہترین لائحۂ عمل یہ ہے کہ مدرسہ میں جرائم کے اسباب اور علاج کے لیے ایک چھوٹا سا تحقیقی مرکز قائم کر دیا جائے جس میں معلم اور اگر ہو سکے تو ماہر نفسیات بھی مل کر کام کریں۔ یہ لوگ اس بات کا کھوج لگائیں کہ بچے مدرسہ کی حدود کے اندر اور باہر جرائم کیوں کرتے ہیں اور انھیں ایسی حرکتوں سے باز رکھنے کے موثر اور کامیاب طریقے کون سے ہیں۔

مغربی ممالک میں متعدد مدرسوں میں ایسے مراکز کھل چکے ہیں۔ اس قسم کے مراکز بچوں کے مجرمانہ رجحانوں کا ابتدا ہی میں علاج کر کے بے شمار بچوں کو مجرم بالغوں کی صورت پروان چڑھنے سے بروقت بچا لیتے ہیں بدقسمتی سے ہمارے ہاں کسی مدرسہ میں بھی اس قسم کا کوئی مرکز موجود نہیں۔ حالاں کہ یہ امر واضح ہے کہ اس قسم کے مرکز قائم کرنے میں کوئی خاص سرمایہ بھی درکار نہیں۔ اس کے علاوہ اس سمت میں تھوڑی بہت محنت اور سرمایہ صرف کر کے کئی بچوں کی زندگی سنور جاتی ہے۔ جس سے انجام کار قومی بچت اور ترقی کی صورت پیدا ہوتی ہے۔

فقدانِ تفریح اور جرائم

کھیل کود اور تفریح کو بچوں کی زندگی میں بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ بچوں میں جرائم کی ایک بڑی وجہ مناسب تفریحی سہولتوں کا میسر آنا بھی ہے۔ بچوں میں قوت، توانائی اور حرکت کا بے پناہ ذخیرہ موجود ہوتا ہے۔ اگر انھیں مناسب تفریحوں اور دلچسپیوں کے معقول اور مناسب مواقع میسر آ جائیں تو ان کی توانائی کو خارج ہونے اور بہتر تعمیری سمتوں میں صرف ہونے کا موقع مل جاتا ہے۔ اس کے برعکس اگر وہ تفریحی مشاغل میں لطف اندوز ہونے سے محروم رہیں تو توانائی اور حرکت کے یہ شدید جذبے (اندر ہی اندر) کھولتے رہتے ہیں جس سے ان میں اضطراب اور محرومیت تقویت پکڑ جاتے ہیں۔ حرکی اور تفریحی

تقاضوں کو جائز طریقوں سے پورا ہونے کے راستے مسدود پاکر ایسے بدنصیب بچے پھر خلاف معاشرت حرکات میں مسرت ڈھونڈنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ بچوں کو جرائم کی زد سے محفوظ رکھنے کے کسی پروگرام میں بچوں کے تفریحی مراکز، پارکوں اور کلبوں وغیرہ کے قیام کو بہت اہمیت دی جانی چاہیے۔ تفریحی مرکز یا کھیل کا میدان بچوں کے لیے صرف دلچسپی اور تفریح کے سامان ہی مہیا نہیں کرتا بلکہ ان کے مجرمانہ رجحانوں کا قلع قمع بھی کرتا ہے۔ کھیل کے ایک صاف اور کشادہ میدان میں کئی دوسرے بچوں کے ساتھ کھیل کود میں شریک ہونے سے بچے کو بے پناہ راحت اور فرحت نصیب ہوتی ہے جس کا میسر آنا اس کا پیدائشی حق ہی نہیں ہے۔ بلکہ اُس کی صحیح نشو و نما کے لیے لازمی بھی۔ آپس میں ملنے جلنے سے بچوں کا معاشرتی سلیقہ سلجھتا ہے۔ انھیں اپنے مافی الضمیر کو بیان کرنے، مقابلہ کرنے، دوسروں سے سبقت لے جانے، تعاون کرنے اور کسی مقصد کو سامنے رکھ کر منظم طور پر جد و جہد کرنے کی عملی تربیت ہوتی ہے کہ منظم کھیلوں میں شرکت سے بچوں کو ایک دوسرے کا رفیق بننے کی ترغیب ہوتی ہے۔ ان سب باتوں کا مجموعی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بچوں کی صحت سنورتی ہے۔ ان کا معاشرتی طریقہ سلجھتا ہے اور وہ اصلاح اور تحصیل کے لیے کوشاں رہنے لگتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کا تربیتی پروگرام مجرمانہ رجحانوں پر ضرب کاری کے مترادف ہے۔

چائلڈ گائڈینس کلینک

مجرم بچوں کے علاج کا ایک نیا مرکز چائلڈ گائیڈنس کلینک بھی ہے۔ نفسیاتی کلینک میں عموماً ایسے مجرم بچے علاج کے لیے لائے جاتے ہیں جن کے جرم کی نوعیت پیچیدہ ہو یا جو عادی مجرم بن چکے ہوں یا جن کے جرائم کے اسباب ایسے ہوں جو عام والدین اساتذہ یا معاشرتی کارکنوں کے لیے قدرے ناقابل فہم ہوں۔ بعض ممالک میں مجرم بچوں کے علاج اور روک تھام کے لیے خصوصی قسم کے کلینک قائم ہو چکے ہیں۔ ایسے کلینیوں میں ماہر نفسیات، معاشرتی کارکن اور طبیب اکٹھے مل کر کام کرتے ہیں۔ جب کوئی مجرم بچہ اس قسم کے نفسیاتی کلینک میں لایا جاتا ہے تو ماہر نفسیات اس کا مکمل نفسیاتی جائزہ لیتا ہے۔ وہ یہ دریافت کرتا ہے کہ جرم کے ارتکاب میں کن کن ذہنی عناصر نے نمایاں حصہ لیا ہے۔ مختلف آزمائشوں کی مدد سے مجرم بچے کی ذہانت کی پیمائش کی جاتی ہے پھر اس کی جذباتی زندگی کا معائنہ ہوتا ہے۔ اس کی لاشعوری الجھنوں کا کھوج

لگایا جاتا ہے۔ اور اس کی خوبیوں اور خامیوں پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔ بچے کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا عمیق تجزیہ کر کے اس کی ذہنی زندگی کا مکمل خاکہ تیار کر لیا جاتا ہے۔

اسی طرح معاشرتی کارکن بچے کے گھر اور گھریلو ماحول کی مکمل تحقیق کرتا ہے، وہ بچے کے والدین سے رابطہ قائم کرتا ہے اور ان کی زندگی کے حالات دریافت کرتا ہے اور اس بات کا کھوج لگانے کی کوشش کرتا ہے کہ بچے سے متعلق والدین کا عمومی رجحان اور روزمرہ برتاؤ کیسا ہے۔ اس کے علاوہ وہ بچے کے گھر کے طبعی، معاشرتی اور اقتصادی ماحول سے متعلق بھی متعلقہ کوائف اکٹھے کرتا ہے۔ وہ ان عناصر کی خصوصی چھان پھٹک کرتا ہے جو بچے کو جرائم اور خلاف معاشرت حرکات کی طرف مائل ہونے پر مجبور کرتے ہوں۔ معاشرتی کارکن اپنا کام ختم کر کے ان سب کوائف کی تفصیلات ماہر نفسیات کے سامنے رکھ دیتا ہے۔ کلینک میں کام کرنیوالے طبیب کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ بچے کا طبی معائنہ کر کے اس کی مکمل رپورٹ پیش کرے۔ طبیب یہ دیکھتا ہے کہ بچے میں کوئی ایسا جسمانی نقص یا بیماری تو موجود نہیں جو اُس کے جرم کا سبب بنی ہو۔ بسا اوقات جرائم کا محرک خالص جسمانی بیماری، نقص یا معذوری ہوتی ہے۔ اس صورت میں بچے کی اصلاح کے لیے اس کا طبی علاج بے حد ضروری ہے۔

علاج اور رہنمائی کا کام

جب ان تینوں ماہرین کے مخصوص جائزے مکمل ہو جاتے ہیں تو وہ آپس میں تبادلہ افکار کرتے ہیں اور اپنے اپنے جائزے اور مشاہدے سامنے رکھ کر علاج اور رہنمائی کا ایک ابتدائی خاکہ تیار کر لیتے ہیں۔ پھر ہر کوئی اپنی اپنی فنی خصوصیت اور استغراق کے بل بوتے پر بچے کے مجرمانہ رجحان کے علاج میں مصروف ہو جاتا ہے۔ ماہر نفسیات بچے کی ذہنی اور جذباتی زندگی میں صحت اور توازن قائم کرنے میں منہمک ہو جاتا ہے۔ معاشرتی کارکن والدین کو بچے کی بہتری کے لیے گھریلو ماحول میں تغیر و تبدل اور اصلاح و ترمیم کے قابل عمل مشورے دیتا ہے اور انھیں کلینک کے عملہ سے تعاون پر آمادہ کرتا ہے۔ اگر بچے میں کوئی جسمانی نقص یا بیماری وغیرہ موجود ہو تو طبیب اُس کا باقاعدہ علاج شروع کر دیتا ہے۔ ایک معیاری کلینک کے معقول معالجاتی پروگرام میں مجرم بچے کی زندگی کے کسی پہلو کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاتا۔ کوشش یہ کی جاتی ہے کہ بچے کی زندگی کے تمام وہ پہلو جنھیں اس کے

مجرمانہ کردار سے براہ راست یا بالواسطہ تعلق ہو زیر علاج آ جائیں۔ ظاہر ہے کہ یہ کام تبھی ممکن اور موثر ثابت ہو سکتا ہے جب یہ تینوں ماہرین فن اپنے اپنے شعبہ علم و فن پر کامل عبور رکھتے ہوں اور ایک دوسرے سے خوب اچھی طرح تعاون کرتے ہوں۔

پاکستان میں بچوں کی رہ نمائی کے لیے چند ایک نفسیاتی کلینک تو قائم ہو چکے ہیں۔ مگر مجرم بچوں کی خصوصی رہ نمائی اور علاج کے لیے کوئی علیحدہ کلینک ابھی تک معرض وجود میں نہیں آیا۔ اس کے برعکس مغربی ممالک میں اس قسم کے کلینک بچوں کی عدالتوں اور بورسٹل اداروں کے جزو لاینفک بن گئے ہیں

بورسٹل کا معالجاتی پروگرام

ہمارے ہاں جرائم پیشہ بچوں کے علاج کے لیے دے کر فقط ایک ہی ادارہ موجود ہے جسے "بچوں کا جیل" اور بورسٹل کا نام دیا جاتا ہے۔ اس قسم کا ایک ادارہ لاہور میں بھی موجود ہے۔ جب کوئی بچہ کسی جرم کا ارتکاب کرتا ہے تو اسے ایک متعینہ عرصے کے لیے بورسٹل میں قید کر دیا جاتا ہے۔ قید کے اس عرصہ میں بچے کی اصلاح اور علاج کی ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے۔

ہمارے ہاں بورسٹل میں عموماً گیارہ برس سے اکیس برس تک کی عمر کے بچوں کو رکھا جاتا ہے اس وقت لاہور کے بورسٹل ادارہ میں تقریباً تیرہ سو بچے مختلف قسم کے جرائم کی پیداش میں سزائیں بھگت رہے ہیں۔ اس ادارہ کے معالجاتی پروگرام کو سمجھنے کی خاطر مندرجہ ذیل چار حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

اول۔ تعلیمی پروگرام
فنی ۔ پروگرام
سوم۔ تفریحی پروگرام
چہارم۔ معاشرتی پروگرام

مجرم بچوں کی تعلیم و تربیت

مجرم بچوں کی تعلیم کے لیے اس ادارہ میں ایک چھوٹا سا مدرسہ بھی قائم ہے۔ اس مدرسہ کے

تمام اساتذہ تربیت یافتہ معلم ہیں۔ تعلیم کا عام معیار مڈل تک ہے۔ مگر بچوں کو میٹرک، السنہ شرقیہ، کمرشل اور دیگر امتحانات میں شمولیت کی اجازت بھی دی جاتی ہے اور ان کے لیے انھیں بورسٹل میں تیار کروانے کا اہتمام بھی ہوتا ہے۔ دینی تعلیم کے لیے ایک خاص کمرہ وقف ہے۔ جہاں ایک خصوصی معلم ہے اس کام پر مامور ہے۔ مدرسہ میں ایک چھوٹا سا کتب خانہ بھی موجود ہے۔

مجرم بچوں کو مختلف قسم کی فنی تربیت بھی دی جاتی ہے۔ تاکہ وہ اپنی سزا کا وقت کاٹ کر جب پھر آزاد ہوں تو اس فنی تربیت کے بل بوتے پر آبرو مندانہ طریقے سے اپنی روزی کمانے کے قابل ہو سکیں چناں چہ اس ادارہ میں باغبانی، خیاطی، طباخی، فرنیچر سازی۔ لوہے کا کام۔ چمڑے کا کام۔ برتن سازی، جلدسازی طباعت وغیرہ کی تربیت کا خاطر خواہ انتظام موجود ہے۔ ان فنون میں تربیت کے لیے علیحدہ علیحدہ مراکز بنے ہوئے ہیں۔ جن میں متعدد مستند ماہرینِ فن بچوں کو اپنے اپنے مخصوص شعبۂ فن میں عملی تربیت دینے پر مامور ہیں۔

بورسٹل میں بچوں کے تفریحی تقاضوں کو بھی ملحوظ خاطر رکھا جاتا ہے۔ چناں چہ مختلف قسم کی تفریحوں اور کھیلوں کے کافی تسلی بخش انتظامات کیے جاتے ہیں۔ درسی اور فنی تعلیم سے فارغ ہو کر بچے مختلف کھیلوں میں شرکت کرتے ہیں۔ بسا اوقات بورسٹل کی مختلف ٹیموں اور لاہور کے سکولوں کے بچوں کی ٹیموں کے مقابلے بھی ہوتے ہیں۔ کھیلوں کے علاوہ بچوں کو اخبار پڑھنے اور ریڈیو سے لطف اندوز ہونے کی سہولتیں بھی میسر ہیں۔

تربیتِ خود اختیاری

بورسٹل کا سب سے بڑا فریضہ یہ ہوتا ہے کہ بچوں کو خود اختیاری اور خود انتظامی کے اصولوں سے روشناس کرایا جائے۔ تاکہ ان میں شہریت اور معاشرتی سلیقہ تقویت پذیر ہو۔ اس ادارہ میں علاج کے اس پہلو کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا۔ چناں چہ ادارہ کے عملہ نے چند ایک ایسی کمیٹیاں قائم کر رکھی ہیں جن کے ذمہ بورسٹل کے مختلف امور کا انتظام سونپا گیا ہے۔ مثال کے طور پر صفائی کمیٹی بورسٹل میں عمومی صفائی کو برقرار رکھنے اور غلاظت وغیرہ کے پھیلنے میں تدارک کا اہتمام کرتی ہے۔ انتظامیہ کمیٹی نظم و نسق سے متعلق بورسٹل کے سرکاری عملہ کا ہاتھ بٹاتی ہے۔ خوراک کمیٹی کھانے پینے کے معاملات کی دیکھ بھال کرتی ہے۔ نماز کمیٹی بورسٹل میں صوم و صلوٰۃ اور دیگر دینی امور کی نگرانی کرتی ہے۔

ان تمام کمیٹیوں کا نظم و نسق بورسٹل کے بچوں کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ جو بچے بورسٹل میں قیام کے دوران میں اچھے کردار کا مظاہرہ کرتے ہیں انھیں ان کمیٹیوں میں ذمہ دار کنبیتیں اور انتظامی عہدے دیے جاتے ہیں۔ اس قسم کی تربیت سے بچوں میں احساس فرض اجاگر ہوتا ہے، اور انھیں اخلاق اور کردار کو بہتر سانچوں میں ڈھالنے کی عملی تربیت ہوتی ہے۔ خود انتظامی کی عملی تربیت سے اُس کے مجرمانہ رجحانوں کا بھی خاطر خواہ علاج ہو جاتا ہے۔

بورسٹل ادارہ کی ناکامیابی

بورسٹل ادارہ بیشتر بچوں کے مجرمانہ رجحانوں کے علاج کے لیے بہترین مرکز ثابت ہوتی ہے۔ مگر متعدد ایسے بچے بھی شاہدے میں آتے ہیں جو انہی اداروں میں جرائم کی مزید تربیت پا کر عادی مجرم بن جاتے ہیں۔ پاکستان اور برطانیہ کے کئی بورسٹل اداروں اور جیلوں میں مجھے متعدد ایسے مجرم بچوں اور بالغ قیدیوں سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ جن کے سوانح حیات سے یہ بات صاف ثابت ہوتی تھی کہ بورسٹل میں اصلاح اور علاج کے علاوہ جرائم کی تربیت کا احتمال بھی موجود ہے۔ کچھ عرصہ ہوا ان میں ایک بچے نے ایک بالغ مجرم سے مل کر ایک سپاہی کو بڑی سفاکی سے قتل کر دیا تھا۔ میں نے ان دونوں مجرموں کی زندگی کے حالات دریافت کیے تو پتہ چلا کہ وہ دونوں متعدد بار بورسٹل میں سزا بھگت چکے تھے اور انہی بورسٹل اداروں میں طرح طرح کے مجرم بچوں کے ساتھ رہنے اور ادارہ کے معالجاتی پروگرام سے استفادہ نہ کرنے کی وجہ سے ان میں جرم کی چاٹ قدرے پختہ ہو گئی تھی۔ آپ کو یاد ہو گا کہ چند سال ہوئے لاہور میں بیر سعید اور غنی دو نوجوان مجرموں کو بے شمار لوگوں کو قتل کرنے کی پاداش میں پھانسی کی سزا ہوئی تھی۔ ان دونوں مجرموں نے بیری فقیری کا ڈھونگ رچایا ہوا تھا۔ وہ امیر لوگوں کے بچوں کے ذریعہ ان کی دولت ہتھیاتے اور بعد میں بچوں کو قتل بھی کر دیا کرتے تھے۔ میں نے ان کے سوانح حیات پر تھوڑی سی تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ بچپن میں یہ دونوں نوجوان اتفاق سے لاہور کی بورسٹل میں اکٹھے سزا بھگت رہے تھے کہ ایک دوسرے کے گہرے دوست بن گئے بورسٹل کی قید کا زمانہ انھوں نے رہائی کے بعد کے دور میں منظم جرائم کرنے کے لیے باقاعدہ منصوبہ بندی میں صرف کیا۔ رہائی کے بعد انھوں نے ذاتی پایہ ایک دیوانے میں اپنی منڈلی قائم کی۔ اور روحانیات کا چولا اوڑھ کر ڈاکوؤں اور رہزنوں کے ایک ہولناک گروہ کی داغ بیل ڈالی۔ ان دونوں نوجوانوں کی دوستی اس قدر پختہ ثابت ہوئی کہ انھیں پھانسی بھی اکٹھے ہی ملی۔

بورسٹل کے عملہ کی تربیت

بورسٹل کے عملہ کو اگر انسدادِ جرائم، در مجرم بچوں کے علاج و اصلاح کے جدید طریقوں میں تربیت دی جائے تو مذکورہ بالا قسم کی ناکامیوں میں کافی تقلیل واقع ہو سکتی ہے۔ اس قسم کی عملی تربیت کی ضرورت بڑی مدت سے محسوس کی جا رہی تھی۔ مقام شکر ہے کہ نئے انقلابی دور میں اس اہم ملی تقاضے کو پورا کرنے کا سائنسی سامان بھی بہم پہنچایا گیا ہے۔ چناں چہ مغربی پاکستان کے روشن دماغ انسپکٹر جیل خانہ جات نے لاہور میں ایک ایسے مفید ادارے کا سنگ بنیاد رکھا ہے جسے پرزن سٹاف ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ (یعنی جیل کے عملہ کی تربیت گاہ) کا نام دیا گیا ہے۔ اس ادارہ میں جیلوں اور بورسٹل اداروں کے عملہ کو مجرم بچوں کی زندگی کے تمام پہلوؤں کو سمجھنے اور ان کے مجرمانہ رجحانات کا قلع قمع کرنے کے جدید طریقوں میں عملی تربیت دینے کا بہت معقول اہتمام کیا گیا ہے۔ بورسٹل ادارہ کی تاریخ میں یہ اقدام ایک سنگ میل کا مقام رکھتا ہے اور اس کے لیے مغربی پاکستان کا محکمہ جیل خانہ جات قابل مبارک باد ہے

مجرم بچوں کو جرائم کی زد سے محفوظ رکھنا بہت اہم اور کٹھن کام ہے۔ اس نیک کام میں حصہ لینا ہر حساس شہری کا اخلاقی فرض ہے۔ نفسیاتی کلینک، بورسٹل، بورسٹل کے عملہ کی تربیت گاہوں کے قیام کے علاوہ ایسے تحقیقی مراکز قائم کرنے کی بھی اشد ضرورت ہے جن میں جرائم کے اسباب اور محرکات پر ٹھوس تحقیق ہوا کرے۔ اس تحقیق کو کتابوں اور رسالوں کی صورت میں شائع کیا جانا چاہیے۔ اس قسم کی سائنسی تحقیق ہر متعلقہ ادارے کے لیے قابل وثوق رہنما کا کام بھی دے گی اور ہمارے معاشرے اور نئی پود کے فکر اور کردار پر روشنی ڈالنے کا باعث بھی بنے گی۔

تعلیم میں اُردو کی اہمیت

بشیر محمود اختر

اردو زبان ہماری گذشتہ تہذیب و معاشرت کی آئینہ دار، ہماری روایات کی عکاس اور ماضی کی عظمت و شوکت کی یادگار ہے۔ ہماری تہذیبی علامات کا رچاؤ اس میں ملتا ہے، فی الحقیقت اردو ہماری قومی حیثیت کی مظہر ہے۔

فروغ و بقا اس کے مزاج میں داخل تھے۔ چناں چہ اپنی فطری استعداد اور اُمنگ کے بل بوتے پر یہ ترقی کے مراحل طے کرتی رہی۔

کوئی پونے دو سو سال کا عرصہ ہوتا ہے جب اردو نے اپنی حیثیت منوانا شروع کر دی تھی۔ اپنی مقبولیت اور ہمہ گیری کے باعث اس کے قدم مضبوط ہونے لگے۔ اُس وقت یہ زبان اپنی ابتدائی حالت میں تھی لیکن آثار و علائم سے ظاہر تھا کہ اسے ضرور فروغ حاصل ہوگا اور یہ زبان پھلے پھولے گی۔ اُردو کی اُس وقت کی حالت کا اندازہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایک رکن مسٹر کربو کے الفاظ سے ہو سکتا ہے

اردو کی اس وقت یہاں حالت بجنسہ فرنچ کی سی ہے کہ وہ تمام یورپ میں بولی اور سمجھی جاتی ہے اس ایک اردو کے جان لینے سے ایک حصہ ملک سے دوسرے حصہ ملک تک بے تکلف آ جا سکتے ہو کسی معاون اور ترجمان کی ضرورت نہ ہوگی۔ یہ اردو اعربی، فارسی، ترکی اور سنسکرت کے میل سے بنی ہے اور فارسی خط میں (بہ نسبت دیوناگری کے) اس کا لکھا جانا زیادہ آسان اور بامعنی ہوتا ہے۔

اردو کی اسی ہر دل عزیزی اور صلاحیت نشو و نما و ارتقاء کے پیش نظر ۱۸۳۵ء میں فارسی کی بجائے حکومت کی دفتری زبان کا درجہ دے دیا گیا تھا۔ گارساں دتاسی کے خطبات میں بھی اس طرف اشارہ ملتا ہے

"ہندوستانی زبان بلاشبہ ترقی پذیر ہے۔ اس سے میرا مطلب یہ ہے کہ بجائے لوگوں کی معمولی اور روزمرہ کی زبان کے یا عوام پسند گیتوں کی زبان کے وہ گورنمنٹ کی سرکاری زبان ہو گئی ہے، جیسے پہلے فارسی تھی۔"

ہندوستانی زبان سے ان کی مراد بلاشبہ اردو ہی ہے۔ اپنے دسمبر ۱۸۵۱ء کے خطبہ میں اردو پر تاثرات بالتصریح بیان کر دیے ہیں وہ کہتے ہیں۔

یہ دنیا کی نہایت وسیع الاشاعت زبانوں میں سے ہے کیوں کہ آٹھ کروڑ سے زیادہ اشخاص اسے بولتے ہیں۔ اور سیاسی اور تجارتی لحاظ سے خاص طور پر قابل لحاظ اور لائق وقعت ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اسے تحقیقی ادبی حیثیت حاصل ہے۔ اور اسی نقطۂ نظر سے باعظم یورپ میں اس کا مطالعہ مفید ہوگا"۔ چناں چہ گارساں دتاسی خود پیرس کے السنۂ شرقیہ کے کالج میں اردو پڑھاتے تھے اور آج جو وسعت اور قبولیت ساری دنیا میں اسے حاصل ہو رہی ہے، اظہر من الشمس ہے۔

اب ہم مختصر طور پر اس بات کا جائزہ لیتے ہیں کہ بحیثیت ذریعۂ تعلیم اردو کا تاریخی پس منظر کیا رہا ہے اس سلسلہ میں کیا کیا کوششیں ہوئیں اور کہاں تک کامیاب رہیں :-

سنہ ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج کلکتہ عالم وجود میں آیا، اور پہلی مرتبہ اردو کو حکومت کی سرپرستی کا شرف حاصل ہوا۔ اس کے نگران ڈاکٹر گلکرسٹ اردو کے بڑے دلدادہ اور محسن تھے۔ انہوں نے اردو کی اشاعت اور ترقی کی غرض سے بڑی مفید سلسلے کتابیں لکھیں اور لکھوائیں۔

دہلی کالج دہلی کا سنگ بنیاد اسی دور میں رکھا گیا۔ اس کی از سر نو تنظیم ۱۸۲۵ء میں کی گئی۔ یہاں ادب فلسفہ اور سائنس پر بہت سی کتب اردو میں ترجمہ کرائی گئیں۔ یہاں کے ڈاکٹر اسپرنگر نے تعلیم کا ذریعہ اردو زبان کو مقرر کیا تھا۔

سر سید احمد خاں نے ۱۸۶۳ء میں سائنٹیفک سوسائٹی قائم کی تھی جس کا مقصود یہ تھا کہ تعلیم کا ذریعہ اپنی ملکی زبان کو بنایا۔ اس کوشش کے خاطر خواہ نتائج برآمد نہ ہو سکے۔

۱۹۱۸ء میں جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کا قیام عمل میں آیا۔ یہاں بھی ہر قسم کی تدریس کا کام اردو میں سرانجام پاتا تھا۔ جامعہ عثمانیہ دراصل اردو ذریعۂ تعلیم و تدریس کا ایک درخشاں نمونہ تھا۔

پھر کراچی کا اردو کالج ایک بہت بڑا تجرباتی ادارہ ہے جس میں کامیابی سے سب مضامین اردو ہی میں پڑھائے جاتے ہیں۔

بقول ڈاکٹر مولوی عبدالحق جب عثمانیہ یونیورسٹی کے منصوبہ کے بارہ میں مشاہیر کی آراء طلب کی گئیں تو ڈاکٹر ترتیج بہادر سپرو نے کہا تھا کہ :- "میں کئی یونیورسٹیوں کا ممتحن ہوں۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے طلبہ کے پرچے دیکھ کر مجھے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جو کچھ لکھتے ہیں سمجھ کر لکھتے ہیں اور انھیں اپنے مضمون پر کافی عبور ہے۔ بخلاف ان طلبہ کے جن کا ذریعۂ تعلیم انگریزی ہے ان کے جوابات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتابیں رٹ کر لکھتے ہیں"
ان مختصر اشارات سے واضح ہو گیا ہو گا کہ اردو میں ذریعۂ تعلیم بننے کی بے پایاں صلاحیت اور استعداد موجود ہے اور اس بات کا اظہار تجربہ پہلے کیا جا چکا ہے۔ قومی زبان ہی کو یہ استحقاق حاصل ہونا چاہیے کہ قوم کی تعلیم کا ذریعہ بنے۔

تعلیم دراصل زندگی کی عملی حصہ داری کے لیے نظری تیاری کے مصداق ہے۔ تعلیم انفرادی اور اجتماعی طور پر افراد کے اذہان کی تعمیر کرتی ہے۔ ان کے کردار کو اُجالتی۔ ان کی شخصیت کو نکھارتی، انھیں تہذیب اور شائستگی عطا کرتی ہے۔ یہ سب کچھ اپنی سب جزئیات سمیت اس صورت میں نتیجہ خیز اور زیادہ مؤثر ثابت ہو سکتا ہے جب تربیت و تدریس کا ابلاغ اپنی ہی زبان میں کیا جائے۔ ورنہ بصورت دیگر طلبہ دوسری زبان کے اخذ و تحصیل ہی کے لیے تعلیم کا بیشتر وقت صرف کر دیتے ہیں۔ مغربی پاکستان اردو کانفرنس لاہور (فروری ۱۹۵۹ء) کی قرارداد میں کہا گیا ہے کہ ذریعۂ تعلیم کے طور پر غیر ملکی زبان کا استعمال تعلیم کو عوام میں کما حقہٗ پھیلانے کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ ہے۔ نیز اسی باعث ہمارے طلبہ کو اپنے تہذیبی سرمائے کی برکات سے بہرہ مند ہونے کا موقع نہیں ملتا۔ غیر ملکی ذریعۂ تعلیم نوجوانوں پر ایک ایسا بے ضرورت بوجھ ہے جس سے انھیں نجات دلانا ہمارا فرض ہے۔ غیر ملکی ذریعۂ تعلیم نے ہمارے طلبہ کی ذہنی صلاحیتوں نیز ان کی آزادانہ غور و فکر اور علمی تحلیل و توضیح کی قابلیتوں کو مفلوج کر دیا ہے۔ یہی غیر ملکی ذریعۂ تعلیم ہمارا رشتہ قوم کے تہذیبی سرمائے سے منقطع کر دینے کا ذمہ دار ہے۔ اور اسی نے تعلیم یافتہ افراد کی چھوٹی سی اقلیت کو سوادِ اعظم سے اجنبی بنا دیا ہے۔"

اگرچہ اور بہت ساری وجوہ پیش کی جا سکتی ہیں۔ لیکن اگر مندرجہ بالا وجوہ پر ہی غور کیا جائے تو بخوبی معلوم ہو جائے گا کہ اردو ہماری تعلیم کا ایک غیر منفک عنصر ہے۔ جسے ہمیں کسی صورت

الگ رکھنے یا الگ دیکھنے کی کوشش نہیں کرنا چاہیے۔

ہمارے تعلیمی نظام میں ابھی اردو کی جیسی حیثیت ہونی چاہیے متعین نہیں ہوئی اور یہی ہماری بڑی محرومی ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں اس کی پرسش نہیں۔ انگریزی کے مقابلے میں اردو زبان کو قابلِ اعتنا سمجھا ہی نہیں جاتا۔ یہ درست ہے کہ ہم انگریزی کی ضرورت اور اہمیت سے تغافل نہیں برت سکتے لیکن اس کا بے جا تسلط بھی ذہنوں کے لیے تکدر کا باعث اور اردو کی ترقی میں رکاوٹ کا موجب ہوتا ہے۔ دونوں زبانوں کو اپنا اپنا جائز حق ملنا چاہیے۔ انگریزی اور اردو کی تعلیم کے فرق کو مولانا عبدالمجید سالک مرحوم نے ایک ذاتی خط میں یوں بیان فرمایا ہے: "میں نے بارہا محسوس کیا ہے کہ طلبہ سالہا سال تک اردو میں تعلیم پانے کے باوجود صحیح اردو میں خط بھی نہیں لکھ سکتے۔ لیکن انگریزی میں تقریر و تحریر کی خاصی مہارت پیدا کر لیتے ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اردو اور انگریزی ادب کی تدریس میں خاصا تفاوت ہے۔ اور جب تک اردو ادب کی تدریس کا انتظام کم از کم انگریزی کے برابر نہ کیا جائے گا، موجودہ صورت بدستور قائم رہے گی۔"

یہ تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ طلبہ کی تعلیم کا زیادہ وقت اور توجہ انگریزی لے لیتی ہے۔ اگر اتنا ہی وقت اور توجہ اردو کو ملے تو یقیناً ذہن و فکر میں ایک عظیم تبدیلی ہو، جو بہتر نتائج پیدا کرے اور فہم و تفہیم کی منزل کو سامنے لا کھڑا کرے گا۔" اور یہی ہماری تعلیم کا بڑا مقصد ہے۔" ٭

بچوں سے مناسب برتاؤ کیجیے

فضل الرحمٰن ناصر صدیقی

جونہی مہمان گھر میں قدم رکھتا ہے وہ عموماً سب سے پہلے چھوٹے بچے کی طرف توجہ کرتا ہے۔ ایک بناوٹی مسکراہٹ کے ساتھ پوچھتا ہے:۔ صاحبزادے تمہارا نام کیا ہے؟

بچہ کچھ ٹھٹک سا جاتا ہے لیکن والدین میں سے کوئی ایک فوراً لقمہ دیتا ہے:۔ ہاں بیٹا! چچا جان کو نام بتلاؤ نا۔ کہو جی میرا نام ہے عطاء الرحمٰن۔

"تاار مان" بچہ مدھم سے لہجے میں کہتا ہے۔

اس پر مہمان پہلے سے زیادہ کھل کر مسکراتا ہے۔ واہ واہ کیا پیارا نام ہے۔ عطاء الرحمٰن۔ ہاں بھئی تم نے یہ خوب صورت جوتا کہاں سے لیا؟ مجھے تو یہ بے حد پسند ہے۔ کیا یہ جوتا میرے جوتے سے تبدیل نہیں کرو گے؟

بچہ دیکھتا ہے کہ مہمان کے علاوہ والدین اور پاس بیٹھے ہوئے دوسرے لوگ بھی مسکرا رہے ہیں۔ وہ حیران ہوتا ہے کہ آخر ان لغویات پر مسکرانے کا کونسا موقع ہے؟ لیکن آداب محفل کا خیال کرتے ہوئے وہ ایک شرمیلی سی مسکراہٹ سے آنکھیں نیچی کر لیتا ہے۔ لیکن اگر اس کی بجائے وہ اپنے ابا اور امی سے یہ سوال کرے کہ اس قسم کی بیہودہ باتوں سے چچا جان کا آخر مطلب کیا ہے؟ تو وہ بالکل حق بجانب ہو۔

بہت سے لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ بچوں کو کسی بات کی کچھ خبر نہیں ہوتی۔ اس لیے وہ ان کے ساتھ بات کرتے وقت بناوٹ اور بے تکے پن سے جی بھر کر کام لیتے ہیں۔ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ بچہ اتنا بدھو نہیں جتنا وہ اسے خیال کیے بیٹھے ہیں۔ وہ اکثر باتوں کو خوب سمجھتا ہے اور جب اسے بدھو بنانے کی کوشش کی جاتی ہے تو اس پر جی ہی جی میں کڑھتا ہے۔ اسے اس بات پر رنج ہوتا ہے کہ بڑے لوگ اس کی بے چارگی سے ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

بالغوں کو یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ بچوں کو بناوٹی توجہ کا مرکز بنا کر وہ اپنی دانست میں ان کے ساتھ پیار کر رہے ہوتے ہیں۔ مگر بچہ اس نام نہاد پیار کو دل سے ناپسند کرتا ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ لوگ جو اس کی نگاہ میں واجب الاحترام ہیں باقی سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اس کے گرد کیوں جمع ہو گئے ہیں۔ اور ان کی نگاہیں اس کی معصومانہ حرکات و سکنات پر کیوں جم گئی ہیں۔ یہ چیز بچے کے دلی چین کو ختم کر کے رکھ دیتی ہے اور وہ اپنے آپ کو ایک بوجھ تلے دبا محسوس کرنے لگتا ہے۔ اسے رہ رہ کر یہ خیال آتا ہے کہ یہ مہمان کیا آیا میری شامت آگئی۔ خدا کرے کہ یہ جلد از جلد یہاں سے کنارہ کرے اور میں چین کا سانس لوں۔

اس سے یہ کہنا مراد نہیں کہ بچوں کو اجنبیوں سے وحشت ہوتی ہے۔ بچہ طبعاً متجسس ہوتا ہے۔ وہ ہر نئی چیز کو قریب سے دیکھنے کے لیے بے تاب رہتا ہے۔ مہمان بھی نئی چیزوں کی ذیل میں آتا ہے لیکن مہمان بچے کے ایک فطری تقاضے کو اپنے تصنع اور اپنی بیہودگی کی نذر کر دیتا ہے۔ اس لیے بچہ اس کے قریب آنے کی بجائے اس سے دور جا کر بیٹھ کر اپنی سلامتی دیکھنے لگتا ہے۔ لیکن اگر مہمان کو لیت سے کچھ حصہ ملا ہے تو وہ بچے کو خصوصی توجہ کا مرکز نہیں بنائے گا۔ وہ اس کے دل میں یہ احساس پیدا نہ ہونے دے گا کہ اس کی چھوٹی سے چھوٹی حرکت کو بھی ہنسی کا موضوع بنایا جا رہا ہے۔ اس سے بچے کے دل میں مہمان کی طرف سے سلامتی کا احساس پیدا ہو گا۔ وہ خود اس کے قریب آنا اور اس سے طرح طرح کے سوال پوچھنا پسند کرے گا۔

غرض بچوں کے ساتھ بات چیت کرتے وقت انھیں ہنسی مذاق کا نشانہ بنانے کی کبھی کوشش نہ کرنی چاہیے۔ بچے ایسی کوشش کو سخت ناپسند کرتے ہیں۔ تاہم بچوں کے ساتھ جو بات چیت کی جائے وہ تو انہی کی ذہنی سطح کے حسب حال ہونی چاہیے۔ بہت سے لوگ اس سے مراد یہ لیتے ہیں کہ بچوں کے ساتھ احمقانہ انداز میں بات چیت کرنی چاہیے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ یہ طریق کار بالکل غلط ہے۔ بچوں کی ذہنی سطح کے مطابق بات کرنے سے مراد یہ ہے کہ ان کے ساتھ کسی ایسے موضوع پر بات کی جائے جو ان کی فطری دلچسپیوں میں شامل ہو۔ مثلاً بچے کہانیوں کے شیدائی ہوتے ہیں

اگر انھیں کوئی اچھے دل چسپ پیرائے میں ایک کہانی سنا دے تو وہ اسے اپنے لیے ایک حقیقی تحفہ خیال کرتے ہیں اور اس تحفے کے پیش کرنے والے کو دل سے چاہنے لگتے ہیں۔
بچے کا دل مٹھی میں لینے میں ایک آسان اور موثر راہ یہ ہے کہ آپ اسے کوئی دل چسپ کہانی سنا دیں وہ فوراً آپ سے مانوس ہو جائے گا۔
بعض لوگ بچوں کو سنانے میں خوشی محسوس کرتے ہیں۔ وہ ان کے بھولے انداز میں کہے گئے بے محل الفاظ کی نقل اتارتے ہیں، وہ ان کی خیالی دنیا کو تہ و بالا کرنے کی دھمکی دیتے ہیں یا اس قسم کی دوسری حرکات کرتے ہیں، انھیں یاد رکھنا چاہیے کہ بچے انھیں دل سے ناپسند کرنے لگتے ہیں۔
بچوں کے ساتھ معاملہ کرتے وقت ہمیں اپنے آپ سے ہمیشہ یہ سوال پوچھ لینا چاہیے کہ کیا کسی بالغ کے ساتھ اس قسم کا برتاؤ کرنا مناسب ہوتا؟ اس سوال کا جواب ہمیں فوراً اپنی غلطی سے خبردار کر سکتا ہے۔ اگر یہ اصول پیش نظر رکھا جائے تو بچوں سے اس قسم کے سوال کبھی نہ پوچھے جائیں :-
ننھے میاں تمہاری عمر کیا ہے؟ وغیرہ
نہ ہی بچوں سے کبھی اس قسم کے مذاق کیے جائیں :- واہ واہ کیسے پیارے گھونگر دار بال ہیں! کیا میں ایک کنڈل کاٹ لوں؟
نہ ہی بچوں کی بھولی بھالی باتوں پر مسکرائیں اور قہقہے نہ لگائیں ٭

نصابِ تعلیم اور اِس کے مسائل

شاہد اشرف

نصاب کا پرانا تصوّر

ایک عام آدمی نصابِ تعلیم سے مراد وہ درسی کتابیں لیتا ہے جو محکمہ تعلیم یا ثانوی تعلیمی بورڈ کی طرف سے سکولوں میں پڑھانے کے لیے مقرر ہیں۔ نصاب کا یہ تصور بہت پرانا ہے۔ کسی تصور کے پرانے ہونے میں کوئی ہرج نہیں۔ بشرطیکہ وہ زندگی کا ساتھ دے سکے۔ لیکن نصاب کا یہ روایتی تصوّر موجودہ دور کی برق رفتار دنیا کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ سائنس اور ٹکنالوجی آجکل جس تیزی سے ترقی کر رہی ہیں اس کی مثال نوعِ انسان کی ساری تاریخ میں نہیں۔ اس صورتِ حال کا ناگزیر نتیجہ انسانی معاشرت کا وہ ہمہ گیر انقلاب ہے جس نے آج ساری دنیا کو گرفت میں لے رکھا ہے۔ موجودہ دور کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ کوئی قوم حد درجہ ترقی یافتہ ہو یا حد درجہ پسماندہ وہ اپنی معاشرتی زندگی کو دور رس تبدیلیوں کی زد میں پاتی ہے۔ یہ تبدیلیاں اس ہوش ربا تیزی سے اور اتنی بڑی تعداد میں بڑھتی چلی آتی دکھائی دیتی ہیں کہ پوری سوجھ بوجھ کے ساتھ پیش بندی کیے بغیر ان سے عہدہ برا ہونا ممکن نظر نہیں۔

زندگی کے دھارے کی یہ لگاتار تبدیلی طرح طرح کے معاشرتی مسائل پیدا کرتی ہے جو اپنے جلو میں وسیع پیمانے پر بے چینی اور پریشانی لیے آتے ہیں۔ اس بے چینی کو دور کرنے اور معاشرتی مسائل کے تسلی بخش حل ڈھونڈنے کے لیے انسان آج تک صرف ایک ہی معقول راہ تلاش کر سکا ہے اور وہ راہ ہے تعلیم۔

معاشرتی مسائل فی الحقیقت تعلیمی مسائل ہوتے ہیں۔ جہاں کہیں معاشرتی مسائل موجود ہوں سمجھ لینا چاہیے کہ اس جگہ تعلیمی مسائل موجود ہیں۔ کیونکہ معاشرتی زندگی کو اعتدال کی راہ پر رکھنا اور اس کی گوناگوں مشکلات کے حل تیار کرنا آخری تجزیے میں تعلیم ہی کی ذمہ داری ہے۔ مشہور یونانی حکیم

افلاطون نے بڑی سوچ بچار کے بعد یہ رائے قائم کی تھی کہ اچھی تعلیم ایک اچھے معاشرے میں دی جاسکتی ہے مگر مہذب انسان نے تاریخ سے یہ سبق سیکھا ہے کہ بگڑے ہوئے معاشروں کو سدھارنے کے لیے سب سے موثر نسخہ بھی تعلیم ہی ہے۔

تعلیم اپنی یہ اہم معاشرتی ذمہ داری نصاب کی مدد سے انجام دیتی ہے۔ نصاب وہ آلہ ہے جو تعلیم کو اس قابل بنا دیتا ہے کہ طرح طرح کے معاشرتی مسائل کے قابل عمل حل تیار کرے۔ لیکن یہ آلہ کام اسی صورت میں آسکتا ہے جب اس میں اس قدر لچک موجود ہو کہ یہ ہر قسم کے حالات میں خدمت دے سکے۔ اگر اسے ایک ایسی لگی بندھی شکل دے دی جائے تو زود یا بدیر نتیجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں نکل سکتا کہ نصاب میں معاشرتی زندگی کے حقائق سے بالکل کٹ کر رہ جائے اور وہ غرض پوری نہ کر سکے جس کے لیے اسے وضع کیا گیا تھا۔ نصاب کو مقررہ کتابوں کا مجموعہ خیال کرنے میں خرابی یہی ہے۔ ہم نے مدتوں تک گلستاں، بوستاں پندنامہ وغیرہ کو تعلیم کا مثالی نصاب قرار دے رکھا۔ اب کوئی نصف صدی سے زیادہ عرصے سے ہم نے انگریزی کی نقطی تکرار کو نصاب کا خلاصہ سمجھ رکھا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ صدیوں سے ہمارے معاشرتی مسائل لاینحل کے لاینحل چلے آتے ہیں۔

نصاب کی ماہیت

نصاب سے مراد وہ منصوبہ ہے جو کم عمر اشخاص کی کسی خاص جماعت کو تعلیم و تربیت دینے کے لیے واضح مقاصد کے تحت تیار کیا گیا ہو۔ اور جو یہ غایت حاصل کرنے کے لیے مسلسل اور ارتقا پذیر سرگرمیوں کا اہتمام کرتا ہو۔[۱]

نصاب اور اس کے مسائل کو بجا طور پر تعلیمی مسائل کی روح خیال کیا جاتا ہے۔ کیوں کہ نصاب ہی وہ آلہ یا اوزار ہے جس کی مدد سے تعلیم اپنے مقاصد حاصل کرتی ہے۔ اگر یہ اوزار مضبوط اور حسب حال ہو تو تعلیم اپنے مقاصد میں خوب کامیاب ہوتی ہے ورنہ نہیں۔ اس اعتبار سے نصاب اور اس کے مسائل کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہو جاتی ہے۔

نصاب کی جو تعریف اوپر دی گئی ہے وہ تین عناصر پر مشتمل ہے :-

(۱) نصاب تیار کرنے سے پہلے اس کے مقاصد طے ہو جانے چاہئیں۔ مقاصد کے بغیر نصاب سازی کا نام لینا بے کار ہے۔

(۲) نصاب سے مراد صرف مقررہ کتابیں نہیں، بلکہ وہ تمام سرگرمیاں ہیں جو مدرسے کی نگرانی میں انجام پائیں۔ خواہ یہ سرگرمیاں مدرسے کی چار دیواری کے اندر انجام دی جائیں خواہ اس کے باہر۔

(۳) نصاب جن بچوں یا نوجوانوں کے لیے بنایا جائے، اسے ان کے حسب حال ہونا چاہیے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ کوئی نصاب خواہ کتنے قابل اور فاضل ماہرین تعلیم کا تیار کیا ہوا کیوں نہ ہو، ہر جگہ اور ہر قسم کے حالات میں کام نہیں دے سکتا۔

ذیل میں نصاب کے ان تینوں پہلوؤں پر قدرے تفصیلی نگاہ ڈالی جاتی ہے۔

(۱) تعلیم کے لیے نصاب آلۂ کار کا درجہ رکھتا ہے اور تعلیم میں اولیت ہمیشہ نصب العین کو ملنی چاہیے، وجہ یہ کہ دوسری سائنسوں کی طرح تعلیم صرف طریق کار سے مطمئن نہیں ہو سکتی۔ اس کے لیے زیادہ اہم سوال یہ ہے کہ تدریسی طریقوں اور تکنیکوں سے کیا کیا خدمت لینی مراد ہے۔ معاشرہ تعلیم کا بندوبست اس لیے کرتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو دوام بخشنا چاہتا ہے۔ معاشرے کے دوام سے مراد اس کے افراد کی نسلی بقا نہیں بلکہ اس ثقافت کی بقا ہے جو معاشرے کے بطن سے پیدا ہوئی ہے، صاف تر لفظوں میں تعلیم کو سب سے پہلی فکر اس بات کی ہونی چاہیے کہ کس قسم کی سیرت کو مثالی سیرت سمجھا جائے، مثالی سیرت کا جو بھی خاکہ پسند کیا جائے وہ تعلیم کی آخری منزل ہو گا اور وہی نصاب کا مقصود۔

لیکن اگر کوئی معاشرہ اپنے لیے انسانی سیرت کا کوئی مثالی خاکہ نہیں چن لیتا تو نتیجہ بے مقصدیت کی صورت میں نکلتا ہے۔ اس کا نصاب تعلیم حادثات کے رحم و کرم پر رہنے لگتا ہے اور یہ نصاب ایسے شہری تیار کرتا ہے جو زندگی کے کسی کٹھن امتحان میں پورے نہیں اتر سکتے۔

انگریزی دور کی آمد سے لے کر آج تک ہماری قوم دو متضاد قسم کے مقصدوں کے درمیان بٹی رہی ہے۔ ایک گروہ جو جاگیرداری کا علم بردار ہے۔ قرون وسطیٰ کی زندگی کو منزل قرار دیے ہوئے ہے اور جوہری توانائی کے موجودہ دور میں بھی یونانی حکماء کے نظریوں کے ساتھ چمٹا رہنے پر مصر ہے، دوسرا گروہ جو

انگریزی تعلیم کا علمبردار سے مغربی تہذیب کو منزل قرار دیے ہوئے ہے اور اس تہذیب کا روحانی کھوکھلا پن اس کے جوشِ عقیدت میں بال بھر فرق پیدا نہیں کرتا۔ آج وقت کی سب سے بڑی ضرورت ان دونوں انتہاؤں کو گلے ملا کر ان کے محاسن کو یکجا کرنا ہے جس روز ہم نے پاکستانی تعلیم کے لیے ایک ایسی شالی سیرت کی منزل قائم کر دی جو اسلامی اتقیا اور جدید سائنس کے عناصر سے مل کر بنی ہو، اس روز ہماری تعلیم کو وہ مقصدیت عطا ہو جائے گی جس سے وہ آج تک محروم چلی آ رہی ہے۔

(۷) نصاب صرف کتابی نہیں ہونا چاہیے۔ بلکہ اس میں طرح طرح کی عملی سرگرمیاں بھی شامل ہونی چاہئیں ایسی سرگرمیاں جن کے آگے چل کر زندگی میں ضرورت پیش آنے والی ہے۔ جو نصاب اپنے آپ کو محض کتابوں کے اندر بند کر لیتا ہے۔ اس کی شال اس کنجوس کی ہے جو دولت کے ڈھیر لگائے چلا جاتا ہے مگر اس میں سے ایک کوڑی بھی اپنے اوپر خرچ نہیں کرتا۔ جس طرح اس کنجوس کی دولت بے کار ہے جو انسانوں کو عملی زندگی میں نکما بنا کر رکھ دے۔ ہمارے نصاب پر سب سے بھاری اعتراض یہ وارد ہوتا ہے کہ بچوں اور نوجوانوں کو ہاتھ سے کوئی مفید کام کرنا نہیں سکھاتا۔ بلکہ الٹا یہ ان کے دلوں میں اس کام سے نفرت پیدا کر کے رکھ دیتا ہے۔

ہماری پچاسی فی صد آبادی دیہات میں بستی ہے۔ مگر غلط قسم کے نصاب کے طفیل جو بچے ابتدائی مدرسے سے آگے تعلیم جاری رکھتے ہیں وہ رفتہ رفتہ شہری سہولتوں کے متوالے بننے لگتے ہیں۔ ان کے آبائی ماحول اور آبائی کام کاج عادی نہیں کر رہ جاتے ہیں۔ چاہیے تو یہ تھا کہ تعلیم انھیں اپنے باپ دادا سے بہتر کاشتکار اور بہتر کاریگر بنا دیتی مگر ہوتا یہ ہے کہ وہ کاشتکاری اور آبائی کام کاج کے نام تک سے بھاگنے لگتے ہیں۔ وہ ایک ایسی مصنوعی زندگی کے عاشق بن جاتے ہیں جو انھیں کسی کام کا نہیں چھوڑتی۔

اس قسم کا نصاب اسلامی روایات کے سراسر خلاف ہے۔ ایک حدیث میں کہا گیا ہے کہ والدین کو چاہیے اپنے بچوں کو تیر چلانا اور تیرنا سکھائیں۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب جان و مال کا دفاع تیروں سے کیا جاتا تھا۔ آج کل کے نصاب میں چھوٹے موٹے آلوں اور اوزاروں سے کام لینا اور چھوٹی موٹی

مشینوں اور کلوں کو الگ الگ کرا اور انھیں دوبارہ جوڑنا شامل ہونا چاہیے۔ آج جو نصاب نوجوانوں کو سائیکل۔ موٹر کار، ٹائپ مشین۔ بجلی کے سامان، مشینری، کیمیائی کھاد وغیرہ کے متعلق عملی کام نہیں سکھاتا وہ بڑا ناقص نصاب ہے۔ وہ اس تربیت کو نظرانداز کر رہا ہے جو موجودہ دور میں کامیاب زندگی گذارنے کے لیے ضروری ہے۔

تہذیب و تمدن جس قدر تیزی سے ترقی کریں۔ اسی قدر یہ خطرہ بڑھ جایا کرتا ہے کہ نصاب زندگی سے بے تعلق ہو جائے۔ ایسا ہونا بالکل قدرتی ہے۔ مگر ہوشمند قومیں زندگی اور نصاب کے باہمی فاصلے کو جلد از جلد پاٹنے کی کوشش کرتی ہیں۔ بالکل حال ہی تک انگلستان اور بیشتر یوروپی ملکوں کا نصاب ہماری طرح بالکل علمی قسم کا تھا۔ مگر پچھلے دس پندرہ برس میں ان ملکوں نے اپنے نصاب تعلیم میں انقلابی تبدیلیاں کی ہیں انگلستان جس کے نمونے پر ہم نے اپنے مدرسوں میں علمی قسم کا نصاب رائج کیا تھا دیر سے اپنا نصاب تبدیل کر چکا ہے۔ مگر ہمارے نصاب کا علمی مزاج بدستور قائم ہے۔

روسی مدرسے کا نصاب تعلیم کوئی دو سال پہلے تک خالص علمی قسم کا تھا۔ وقت کے تقاضوں کا ساتھ دینے کے لیے روس نے نہ صرف اس نصاب میں تبدیلی کی ہے۔ بلکہ ہائی سکولوں سے فارغ ہونے والے تمام نوجوانوں کے لیے لازمی قرار دیا ہے کہ وہ کم از کم ایک سال تک کھیتوں کانوں اور کارخانوں میں ہاتھ سے کام کریں۔ یہ اصلاح اس لیے کی گئی ہے کہ جو شخص ہاتھ سے کام کرنا نہیں جانتا وہ دماغ سے بھی بہت مفید خدمت نہیں لے سکتا۔

مدرسے کے نصاب میں طرح طرح کا عملی کام شامل کرنا آج ہماری تعلیم کی منہ بولتی ضرورت ہے۔ قومی تعمیر کے بیسیوں کام ادھورے پڑے ہیں۔ اور وہ اس وقت تک ادھورے پڑے رہیں گے جب تک پڑھے لکھے لوگ ہاتھ سے کام کرنے میں فخر محسوس نہیں کرنے لگتے۔ بچوں اور نوجوانوں کو مفید آلوں اوزاروں اور مشینوں سے کام لینا سکھانا اور ان کے دلوں میں محنت کا احترام پیدا کرنا آج ہمارے نصاب تعلیم کی اہم ترین ذمہ داریوں میں سے ہے ۔

(باقی آئندہ)

تعلیمی دنیا پر ایک نظر

فکر و فن اقبال

"فکر و فن اقبال (IQBAL : HIS ART AND THOUGHT) میں اقبال اور ملٹن کا دلچسپ موازنہ کیا گیا ہے"۔ یہ ہیں وہ الفاظ جو پروفیسر اے جے آربری نے ایک پاکستانی عالم سید عبدالواحد کی کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھے ہیں۔ پروفیسر اے جے آربری آجکل کیمبرج یونیورسٹی میں عربی پڑھاتے ہیں اس سے قبل موصوف لندن یونیورسٹی میں فارسی کے استاد تھے۔ آربری صاحب تبصرہ میں آگے چل کر لکھتے ہیں۔

سر محمد اقبال جو ایک عالم، مدبر، اتحاد اسلامی کے نقیب اور قیام پاکستان کے زبردست حامی تھے ان کی وفات کو بیس سال سے کچھ زائد عرصہ گذرا ہے اور بیس سال پر مشتمل اس قلیل عرصہ نے اس مفکر اور نابغہ روزگار شاعر کی شہرت کو چار چاند لگا دیے ہیں۔ ان کی اردو اور فارسی تصانیف یا ان کے بعض حصوں کا عربی، انگریزی، فرانسیسی، جرمن اور اطالوی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے اور سینکڑوں مقالوں میں ان کی تخلیقات کا تجزیہ اور ان کے تصورات کی وضاحت اور ترجمانی کی گئی ہے۔ یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ موجودہ زمانے میں کوئی مسلم مصنف اس قدر موضوع بحث نہیں رہا جتنے کہ اقبال۔ اور یہ اُن کے تصورات کی موزونیت اور بارآوری کا بیّن ثبوت ہے۔

زیر تبصرہ کتاب پہلی مرتبہ ۱۹۴۴ء میں غیر منقسم ہندوستان میں طبع ہوئی تھی۔ اور اس وقت سے اب تک اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ اب اس کتاب کا نیا ایڈیشن لندن کے مشہور و معروف ناشر، جان مرے نے انتہائی خوب صورت اور دل کش شکل میں شائع کیا ہے۔ جان مرے ایک صدی سے زیادہ عرصہ سے علم و ادب کی گراں بہا خدمات انجام دے رہے ہیں۔

کتاب کے مصنف سید عبدالواحد حیدرآباد (دکن) سے تعلق رکھتے ہیں اور اب کراچی میں مقیم ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ موصوف اقبال کے بہترین ترجمان ہونے کا بجا طور پر دعویٰ کر سکتے ہیں۔ نہ صرف یہ کہ وہ فلسفی

شاعر علامہ اقبال اور اُن کے بہت سے احباب و معتقدین کو جن میں سے بعض اب حیات بھی نہیں ہیں نہ صرف ذاتی طور پر جانتے ہیں بلکہ انھوں نے چالیس سال سے زیادہ مدت اقبال کی تخلیقات کے مطالعہ میں صرف کی ہے اس سے اقبال کے تبحر علمی اور ہمہ گیری اور مصنف کی اقبال سے والہانہ عقیدت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے اقبال کی تخلیقات فارسی، انگریزی اور ان کی مادری زبان اردو میں ہیں اور خوش قسمتی سے عبدالواحد کو ان تینوں زبانوں پر مکمل عبور حاصل ہے۔ اور یہ نوخیز حقیقت ہے کہ اقبال کو سمجھنے اور ان کی ترجمانی کرنے کے لیے ان تینوں زبانوں پر مکمل قدرت بھی انتہائی ضروری ہے۔ غرضیکہ زیرِ تبصرہ کتاب ایسی بے عیب اور صاف ستھری انگریزی میں لکھی گئی ہے کہ بہت سے انگریز اہلِ زبان مصنف کی انگریزی دانی پر رشک کیے بغیر نہ رہ سکیں گے۔

کتاب بڑی خوش اسلوبی اور ترتیب کے ساتھ لکھی گئی ہے۔ ابتداء میں اقبال کا مختصر لیکن واضح اور معلوماتی سوانحی خاکہ پیش کیا گیا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ کس طرح اقبال سیالکوٹ (پنجاب) کے اسکول کی تعلیم ختم کرکے پنجاب یونیورسٹی لاہور پہنچے جہاں ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کو پہلی مرتبہ اُجاگر ہونے کا موقعہ ملا۔ پھر اس کے بعد اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے وہ کیمبرج، لندن اور میونخ گئے اور ۱۹۰۸ء میں لاہور واپس ہوئے۔ جہاں انھوں نے انتہائی شہرت اور عظمت حاصل کی۔ یہاں تک کہ ۱۹۳۸ء میں ان کی وفات کے بعد بھی ان کی شہرت بڑھتی رہی۔

اس کے بعد سید عبدالواحد نے اقبال کے نظریات و تصورات اور اُن کے اسالیبِ بیان کو باب در باب بیان کیا ہے، اور اُن پر تنقید کی ہے۔ یقیناً کسی نے اب تک اس سے بہتر اقبال کے کلام کی ترجمانی نہیں کی ہے۔ نیز کتاب میں مشہور فلسفۂ خودی کی روشنی میں اس کے حوالہ جات کے ساتھ تشریح و توضیح کی گئی ہے۔ مشرقی اور مغربی فلاسفروں میں اقبال کے اُردو اور فارسی کی متعدد نظموں کے حوالے بھی دیے گئے ہیں جو ایک ایسے قاری کے لیے خاص طور پر اہم ہیں جو مشرقی شاعروں کی روایات اور تشبیہوں اور استعاروں سے نابلد ہو اور اس موقعہ پر جو بے شمار مثالیں دی گئی ہیں (اصل اشعار کا صاف انگریزی میں ترجمہ بھی دے دیا گیا ہے) وہ بحث و مباحثہ کے سلسلہ میں بے حد مفید ہیں۔

فلسفۂ کائنات :۔ نئے ایڈیشن میں سید عبدالواحد نے ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے جس میں انھوں نے اقبال اور ملٹن کا دلچسپ موازنہ کیا ہے۔ دونوں شاعروں نے کائنات کے رموز و اسرار بیان کیے ہیں۔ دونوں فلسفۂ کائنات کے مبلغ ہیں جس کا مذہب اور الٰہیاتی فنوالطیں انسان کی حیثیت سے قریبی تعلق ہے ملٹن اور اقبال دونوں کو الہامی شاعر بیان کیا گیا ہے۔ عظیم ادبی نقاد ڈاکٹر ایچ جے ۔سی گرائرسن الہامی شاعری کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اخلاقی کمزوریاں گناہ کا باعث ہوتی ہیں جن سے ہمیں تکلیف پہنچتی ہے۔ سچائی اور انفعال خوش آئند باتوں کی نوید ہیں اور یہ الہامی شاعری کے پیہم موضوعات ہیں۔
ڈاکٹر گرائرسن نے آگے چل کر لکھا ہے کہ اگر کسی شاعر کو الہامی کہہ سکتے ہیں تو وہ ملٹن تھا۔ جہاں تک اقبال کی شاعری میں الہامی نوعیت کا تعلق ہے تو اس موضوع پر مصنفین نے تفصیل اور وضاحت سے خامہ فرسائی کی ہے۔ اپنی تمام شاعری میں خواہ وہ عظیم موضوع فردوس گمشدہ سے متعلق ہو یا اس سے کم درجے کے موضوعات سے انسانوں پر خداوند تعالےٰ کے الطاف و کرام اور عتاب و عذاب کو اقبال نے حق بجانب قرار دینے کی کوشش کی ہے۔ اور افراد و اقوام کو یہ بتایا ہے کہ زندہ رہنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے اور وہ ہے سچائی اور حقانیت کا راستہ۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر کوئی الہامی شاعر تھا تو وہ اقبال تھا۔
نثری تصانیف : آخر میں مصنف نے اقبال کی نثری تخلیقات کا سرسری طور پر جائزہ لیا ہے۔ انھوں نے ان کی اردو تحریروں پر خاص طور پر توجہ دلائی ہے اور پاکستان سے باہر کے عام قاری کے لیے یہ بہت مفید ہے اس لیے کہ وہ اقبال کی انگریزی تحریروں کو تو سمجھ سکتا ہے لیکن ان کی اردو تخلیقات سے نابلد ہے مصنف نے اقبال کے خطوط کا بھی حوالہ دیا ہے۔ قائداعظم سے ان کی خط و کتابت بے حد تاریخی اہمیت رکھتی ہے اور ہمیں اس دن کا بڑا اشتیاق ہے جب ان کے انگریزی کے مراسلات کتابی شکل میں شائع ہو جائیں گے۔

برطانوی یونیورسٹیوں میں دولت مشترکہ کے بارے میں علوم

برطانیہ میں شاید ہی کوئی یونیورسٹی ایسی ہو جو جدید تحقیقات کی تعلیم و تربیت کے ذریعے دولت مشترکہ علوم کو فروغ نہ دے رہی ہو۔ طبیعیات اور عمرانیات میں بنیادی اصولوں کی تعلیم اور علاقوں کے ایک طویل سلسلہ میں ان کے استعمال کا مطالعہ۔ یہی دو چیزیں ہیں جو دولت مشترکہ علوم کو اکثر یونیورسٹیوں کی

تعلیم تک عام رسائی کا ایک اہم حصّہ بنا دیتی ہیں۔
یہ مسئلہ تو مشترک ہے خواہ زور بیاں کسی قدر مختلف ہی کیوں نہ ہو۔ چناں چہ اتالیق یا لیکچرار کو شالوں کے انتخاب میں جو ملکہ حاصل ہے اس کے مطابق اس کو کم و بیش دولت مشترکہ پر زور دینا ہی ہوگا۔
دولت مشترکہ کے بعض پہلوؤں کو یونیورسٹیوں نے رسمی طور پر منظور کرلیا ہے۔ گرم ممالک کے امراض کے متعلق طب نے پہلے پہل لندن اور لیور پول میں قدم جمایا اور اس شعبہ میں بہت سی دوسری ترقیاں ہوئیں شاہی ماضی کے مطالعہ کی قدر شناسی ہی آکسفورڈ یونیورسٹی اور لندن یونیورسٹی میں شعبۂ تاریخ دولت مشترکہ کے قیام کا سبب بنی اور جلد ہی ان شعبوں کے سربراہ ایسے لوگ مقرر ہوئے جو اس بات پر یقین رکھتے تھے کہ تاریخ کی کوئی حد مقرر نہیں کی جا سکتی۔ اور جو دولت مشترکہ حکومت اور اس سے متعلقہ مسائل سے گہری دل چسپی رکھتے تھے۔ بیٹ پروفیسر کی دعوت پر آکسفورڈ میں اسمٹس کا لیکچر لارڈ ہیلی کی تصنیف۔ افریقی جائزہ کا محرک ہوا۔
رہوڈز ہاؤس۔ آکسفورڈ میں لائبریری کے قیام نے دولت مشترکہ علوم کی تحقیقات کے سلسلہ میں تمام سہولتیں فراہم کردی ہیں۔ دولت مشترکہ کے گوشہ گوشہ سے آئی ہوئی معرکۃ الآرا اور نادر کتب حکومت برطانیہ کی زیر ہدایت یہاں محفوظ کردی گئی ہیں۔ مزید برآں سمندر پار ممالک کے سرکاری ملازمین کے لیے یونیورسٹی کورسوں کا انتظام کرنے والے ادارہ نے ان یونیورسٹیوں میں ایسے اتالیقوں کی ضرورت پیدا کردی جن کی دل چسپی سراسر دولت مشترکہ کے موضوع سے وابستہ تھی۔
اس ضمن میں اعلیٰ تعلیم کے لیے حکومت مزید لیکچراروں کی فراہمی کی ذمہ داری کو محسوس کر چکی تھی۔ ان لوگوں نے دل چسپی کا مرکز فراہم کیا جو برگ و بار لانے والا تھا۔ ان علوم میں رابطہ پیدا کرنے اور نوآبادیات اور نیم ترقی یافتہ علاقوں کے مسائل سے متعلق تحقیقاتی مرکز مہیا کرنے کے لیے آکسفورڈ اور لندن میں پہلے پہل کچھ ادارے قائم کیے گئے تھے۔
چناں چہ حال ہی میں پاکستان، گھانا اور سیلون کے تربیت یاب سفارتی اراکین کے لیے کورسوں کا انتظام کیا گیا ہے۔ دولت مشترکہ میں کچھ بھی تبدیلیاں کیوں نہ ہوں، ان یونیورسٹیوں میں سائنسدانوں اور ماہرین معاشیات

کی تعداد میں گراں قدر اضافہ ہوا ہے۔ ان ممالک کے سائنسدانوں اور فنی ماہرین کی تعلیم میں ان یونیورسٹیوں نے خاصا اہم حصہ لیا ہے۔

اب تقابلی مطالعہ جات بالخصوص شعبۂ حکومت میں قابل ذکر علمی اقدام کیے جا رہے ہیں۔ نوآبادیاتی علوم کو دولت مشترکہ کے قدیم اراکین کے علوم سے مدغم کرنے کی سعی کیمبرج میں اسمٹس شعبۂ لندن میں شعبہ امور دولت مشترکہ اور آکسفورڈ میں حکومت دولت مشترکہ کی ریڈرشپ کے قیام سے متاثر ہو کر کی گئی ہے۔

پارلیمانی حکومت اور انتقال اقتدار کا تمام میدان دولت مشترکہ حکومت کے طالب علم کے لیے کھلا ہوا ہے۔ اس کے موضوعات مرکزی ہیں۔ چنانچہ وفاقوں، قانون ساز مجلسوں، انتظامیہ، انتخابات اور سرکاری ملازمتوں کے بارے میں تقابلی کام بڑے جوش کے ساتھ جاری ہے۔ ماہرین علم الانسان اور علم سیاست کے طلبا مستقل کی قیادت اور مقامی ارباب اقتدار کی ترقی کے مطالعہ میں ایک مشترکہ میدان پاتے ہیں۔

برطانیہ میں دولت مشترکہ کے قدیم خود مختار ملکوں کے بارے میں آج کل بیس سال پہلے کے مقابلے میں بہت کم کام ہو رہا ہے۔ کینیڈا میں مورخین کا ایک ایسا اسکول ہے جو گذشتہ نسل کے مورخین کی کتابوں سے استفادہ کر رہا ہے۔

ان دنوں برطانیہ میں افریقی تاریخ پر زیادہ سے زیادہ توجہ دی جا رہی ہے اور مورخین کی ایک جماعت مشرقی افریقہ کی مشترکہ تاریخ مرتب کر رہی ہے۔ یہ بات صحیح ہے کہ افریقی تاریخ ابھی تک انڈر گریجوایٹ کورس کے معیار پر پوری نہیں اترتی۔ لیکن انگلستان اور اسکاٹ لینڈ کی متعدد یونیورسٹیوں کے محقق طلبا، اعلیٰ سطح پر افریقی تاریخ کا مطالعہ کر رہے ہیں اور افریقہ کے جغرافیائی اور سماجی حالات کے ذاتی طور پر جاننے کی ضرورت کو محسوس کر رہے ہیں، کیوں کہ گذشتہ چند سال کے عرصہ میں برٹش سے شاہی تاریخ کے شعبہ کے اختتام کے ساتھ ساتھ لندن یونیورسٹی غیر ملکی یونیورسٹیوں کی ماں بن گئی ہے۔

دولت مشترکہ کی یونیورسٹیوں سے سال کے سال روابط بڑھائے جا رہے ہیں۔ فورڈ، راک فیلر اور نفیلڈ وظائف اور برطانوی دولت مشترکہ کے طلبا کو برطانیہ بھیجتے ہیں۔ جہاں ان کو وہاں کے طلبا سے ربط ضبط بڑھانے کے مواقع ملتے ہیں۔

برطانوی یونیورسٹیوں کے اراکین جوابی دورے کرتے ہیں۔ سمندر پار ممالک کی یونیورسٹیوں کے خارجی ممتحن کی حیثیت سے کام کرتے ہیں۔ بحث مباحثہ کرتے ہیں۔ یا وہ حکومت کی جانب سے سیاسی یا فنی کمشنوں پہ بھیجے جاتے ہیں۔ بعض اوقات ہم مشترکہ منصوبوں کے بارے میں پڑھتے ہیں۔ مثال کے طور پر ڈرہم کے معاشی جغرافیہ داں مالٹا کی رائل یونیورسٹی میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ کام میں جٹے ہوئے ہیں۔

حکومت اور یونیورسٹیوں کے درمیان، دولتِ مشترکہ علوم کے میدان میں بالخصوص سائنس، دولتِ مشترکہ ادارۂ زراعت، شاہی ادارۂ جنگلات یا حفظانِ صحت اور مشرقی ممالک کی بیماریوں سے متعلق تحقیقاتی مراکز میں ایک قسم کا گہرا رابطہ اور تعاون ہے۔ معاشرتی علوم کے میدان میں اس قسم کا رابطہ بہت کم نظر آتا ہے۔ امید ہے کہ کوئن ایلزبیتھ ہاؤس آکسفورڈ کی بنیاد اساتذہ اور حکمرانوں کے درمیان تعاون اور رابطہ باہمی کا ایک اہم ذریعہ ثابت ہوگی۔

لندن یونی ورسٹی میں ٹریڈ یونین ممبروں کی تعلیم

سیکڑوں طلباء میں سے جنھوں نے حال ہی لندن یونیورسٹی کے سکولوں اور کالجوں میں داخلہ لیا ہے، چھ طلباء ایسے ہیں جو دوسروں سے بالکل مختلف ہیں۔ یہ طلباء لندن کے ادارۂ معاشیات (لندن سکول آف اکنامکس) میں زیرِ تعلیم ہیں، اور سب کے سب ٹریڈ یونین کے ممبر ہیں۔ اور ٹریڈ یونین کانگریس کے تعلیمی ٹرسٹ کے وظیفوں کے تحت تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔

جنگ کے بعد جب ٹریڈ یونین کانگریس نے ٹریڈ یونین تعلیم کی توسیع کے منصوبے مرتب کرنے شروع کیے تھے تو یہ تجویز بھی پیش ہوئی تھی کہ ٹریڈ یونین ممبروں کو لندن اسکول آف اکنامکس میں بھیجا جائے۔

کورس کی مقبولیت: — اسی غرض سے ۱۹۴۵ء میں ٹریڈ یونین کانگریس اور لندن نے اپنی ایک مشترکہ کمیٹی قائم کی جس نے اس تجویز کی افادیت پر غور و فکر کیا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ لندن سکول آف اکنامکس نے اس سال ایک مخصوص ٹریڈ یونین کورس شروع کیا اور ٹریڈ یونین کانگریس نے سات ٹریڈ یونین ممبروں کو یہ کورس مکمل کرنے کے لیے وظیفے دیئے۔ اس وقت سے

اب تک ٹریڈ یونین کانگریس کے بھیجے ہوئے کئی طلبا لندن اسکول آف اکنامکس کا یہ کورس کر چکے ہیں ان کا انتخاب ایک بورڈ کرتا ہے۔ بورڈ انتخاب کے وقت امیدواروں کی ٹریڈ یونین سے متعلق سرگرمیوں اور ان کی قابلیت کو مدِ نظر رکھتا ہے۔ ان کی فیس، کتابوں کے اخراجات اور دیگر الاؤنس ٹریڈ یونین کانگریس کا تعلیمی ٹرسٹ ادا کرتا ہے۔ جن طلبا پر اپنے اہل و عیال کی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں ان کو زائد الاؤنس دیا جاتا ہے۔

ٹریڈ یونین کانگریس کی پیروی کرتے ہوئے متعدد ٹریڈ یونینوں نے بھی فرداً فرداً لندن سکول آف اکنامکس میں اپنے ممبر بھیجے ہیں۔ چنانچہ ۱۹۲۵ء سے اب تک تقریباً ۲۰۰ ٹریڈ یونین ممبر یہ کورس کر چکے ہیں۔

اس اسکول میں کس قسم کے ٹریڈ یونین ممبر داخل ہوتے ہیں تو اس کا اندازہ آپ ان چھ طلباء سے لگا سکتے ہیں جو اس سال داخل ہوئے ہیں۔ ان میں ایک تو ٹرک ڈرائیور۔ ایک لندن کی زمین دوز ریلوے میں موٹر مین ایک سول سروس میں کلرک، ایک نقشہ نویس۔ ایک چھپائی کی تختیاں بنانے والا اور ایک خاتون سکریٹری ہے۔ یہ ٹریڈ یونین کے ممبر دیگر طلباء کے ہمراہ اسکول میں معاشیات سیاسیات۔ تاریخ، قانون۔ صنعتی تعلقات اور اس قسم کے مضامین کی کلاسوں میں شامل ہوں گے علاوہ ازیں وہ مل جل کر برطانیہ کی ٹریڈ یونینوں کے بعض مسائل کا مخصوص مطالعہ کریں گے۔ یونیورسٹی کی سرگرمیوں۔ طلباء کی یونین اور سکول کے متعدد کلبوں اور انجمنوں میں بھی وہ پورا پورا حصہ لے چکے ہیں ۔ اس طرح وہ اپنے ساتھی طلباء سے بہت کچھ سیکھ سکیں گے اور مزدور تحریک سے تعلق اپنے عملی تجربہ کی بنیاد پر ان کو بہت کچھ سکھا بھی سکیں گے۔

تحریک میں سرگرم حصہ ۔ ٹریڈ یونین ممبروں اور سکول کے دیگر طلباء میں ایک فرق ضرور ہے۔ وہ یہ کہ اپنی تعلیم کے اختتام پر ٹریڈ یونین ممبروں کو کوئی امتحان نہیں دینا پڑے گا اور نہ وہ کوئی سند حاصل کریں گے۔ ٹریڈ یونین تعلیم کا واحد مقصد یہ ہے کہ طلباء معاشرتی زندگی خاص طور سے مزدور تحریک میں کافی حصہ لے سکیں۔ اور یہ مقصد تب ہی حاصل ہو سکتا ہے جب ایسی تعلیم پر امتحان کی قید عائد نہ

کی جائے۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ امتحانات کے نتائج کے بغیر اس منصوبہ کی کامیابی یا ناکامی کا اندازہ کس طرح لگایا جا سکتا ہے۔ اس کا جواب آپ کو بعض سابق طلبا، کے ذاتی ریکارڈ سے مل جائے گا۔ ان میں سے کم از کم پچیس طلبا، ایسے ہیں جو ٹریڈ یونین ممبروں کے ہمہ وقتی عہدہ دار بن گئے ہیں۔ چھ دیگر طلبا نے ٹریڈ یونین تعلیم کے مختلف میدانوں میں ہمہ وقتی ملازمت اختیار کر لی ہے۔ تین طلبا، نے صحافت کا پیشہ اختیار کر لیا ہے۔ لیکن وہ سب ٹریڈ یونین کے اخبارات کے مدیروں یا نائب مدیروں کی حیثیت سے مزدور تحریک سے وابستہ ہیں۔ تین دیگر طلبا نو آبادیاتی سروس میں لیے گئے ہیں اور وہ سمندر پار کے ملکوں میں افسر محنت کے طور پر کام کر رہے ہیں۔ ایک طالب علم نے سیاست میں نام پایا ہے اور آجکل وہ دارالعوام کے ممبر ہیں۔ انتخابات میں ٹریڈ یونین ممبروں نے اس کی حمایت کی تھی۔ متعدد سابق طلبا، اپنی پرانی ملازمتوں پر واپس آ گئے ہیں اور مزدور تحریک سے وابستہ ہو کر خدمت سرانجام دے رہے ہیں

کون کس کا موجد ہے

جب ایک ریاضی داں پیمانہ اٹھاتا ہے یا ایک ملاح بحری جہاز کی جہاز پیما سے رہنمائی پاتا ایک طبیب پن سلین کا انجکشن تجویز کرتا ہے۔ یا ٹیکہ لگانے کے لیے مریض کے بازو کو کھرچتا ہے تو ان میں سے ہر ایک برطانیہ کی ایجاد و اختراع کی قوت کو خراج تحسین ادا کرتا ہے۔ بے شمار خدمت آفرین ایجادات کا تمام تر سہرا انگریزوں کے سر ہے۔ جن کے ناموں سے بھی سمندر پار ممالک کے لوگ متعدد ماہرین کے ۔ ناآشنا ہیں۔

پہلی پبلک ریلوے ۱۸۲۵ء میں دور شمالی انگلستان میں سٹاکٹن سے ڈارلنگٹن تک چلی تھی پہلی زمین دوز ریل گاڑیاں لندن میں چلنی شروع ہوئی تھیں۔ یہ گاڑیاں ۱۸۶۳ء میں بھاپ سے چلتی تھیں لیکن ۱۸۹۰ء میں بجلی سے چلنے لگیں۔ جٹ طیارہ کا پہلا انجن وہٹل نے ۱۹۳۰ء میں ایجاد کیا تھا۔ پہلی پیڈ سائیکل کرک پیٹرک میکملن نے ۱۸۳۹ء میں بنائی۔ پہلی دو نشستی بائیسکل ڈینیل البعودن نے ۱۸۸۶ء میں ایجاد کی۔ پہلا ہوادار ٹائر، آر ڈبلیو ٹامسن نے ۱۸۴۵ء میں بنایا۔ پہلے فری وہیل کی ایجاد کا سہرا

نکلے اور گبس کے سر ہے (سنہ ۱۹۴۳ء) پہلی دخانی کشتی ولیم سائمنگٹن نے سنہ ۱۸۰۲ء میں ایجاد کی اور پہلا ٹربو پراپ طیارہ سنہ ۱۹۲۸ء میں ایجاد ہوا۔

حفاظتی ایجادات :- اب تک ہم نے صرف ذرائع نقل و حمل کے بارے میں بتایا ہے۔ اب حفاظتی ایجادات کی طرف آئیے۔ کان کنوں کی سہولت کے لیے سر ہمفری ڈیوی نے انیسویں صدی کے آغاز میں حفاظتی لیمپ ایجاد کیا۔ حد سے زیادہ بوجھ سے لدے ہوئے جہازوں کی حفاظت کے لیے پلمسول لائن کو سیموئیل پلمسول نے ترقی یافتہ شکل دی۔ پہلی حفاظتی کشتی لیونیل لیوکن نے سنہ ۱۷۸۵ء میں ایجاد کی اور غالباً تندرستی کے لیے سب سے زیادہ اہم چیز طہارت خانہ کی ایجاد ہے جو سنہ ۱۵۹۶ء میں ایجاد ہوا اور جس کے موجد سر جان ہیرنگٹن ہیں۔

دوران خون کی دریافت :- سترھویں میں ڈاکٹر ولیم ہاروے نے دوران خون کی دریافت کی۔ نرسنگ سروس کی ابتدا فلورنس نائٹ انگیل نے جنگ کریمیا میں کی (۱۸۵۵ء) سمی اور زہری مادوں کے انسداد کے لیے جوزف لسٹر نے دوائیں ایجاد کیں (سنہ ۱۸۶۷ء سنہ ۱۸۲۷ء) سر ولیم جینیر نے ٹیکہ کی ایجاد کی (سنہ ۱۷۹۸ء-۱۸۱۵ء) سلفا ڈرگس پہلی حیات بخش دوائیں ہیں جو معرض وجود میں آئیں۔ یہ نمونیہ اور دوسرے امراض میں بہت مفید ثابت ہو چکی ہیں۔ پنسلین کی دریافت سر الیگزینڈر فلیمنگ نے کی۔

اب اپنے گھر پر ایک اجمالی نظر ڈالیے۔ گردش سنہ ۱۹۱۵ء میں ایجاد ہوا۔ تھرماس سر جیمس ڈیور نے ایجاد کیا۔ مشینوں کے ذریعے پیک کی ہوئی مٹھائیاں، ٹافیاں اور ڈبل روٹی بنانے کا طریقہ ا ے۔ فورلیس اور ایف گروو دڑنے سنہ ۱۹۰۱ء میں نکالا جسے وینڈا ای۔ ہال لمیٹڈ، لندن نے سنہ ۱۸۱۳ء میں خاص قسم کا نعمت خانہ ایجاد کیا۔

برطانوی ریکارڈ کے مطابق زاویہ پیما کی ایجاد سترھویں صدی میں ہوئی۔ برقی ڈائنمو اٹھارویں صدی کے اوائل میں منظر عام پر آیا۔ زاویہ پیما دوربین کی ایجاد سنہ ۱۸۵۷ء میں ہوئی۔ عکسی دوربین کی ایجاد کا سہرا آئزک نیوٹن کے سر ہے (سنہ ۱۶۴۲ء تا ۱۷۲۷ء) ایڈمنڈ گنٹر نے سنہ ۱۶۲۰ء میں سلائیڈ رول کی ایجاد کی۔

پہلی عوامی ڈاک سروس کا آغاز سنہ ۱۸۴۰ء میں ہوا۔ اور سر رولینڈ ہل نے ہی پہلا ڈاک کا ٹکٹ اختراع کیا۔ گھاس کاٹنے کی مشین کی ایجاد ایڈون بڈنگ نے سنہ ۱۸۳۲ء میں کی۔ یہ

[دسمبر] لاهور لد ۱۲ شمارہ ۹]

اس شمارہ میں

[illegible] ماہنامہ

آموزش

دسمبر ۱۹۵۹ء

جلد ــــــــــــ ۱۲
شمارہ ــــــــــــ ۹

سالانہ چندہ
پاکستان کے لیے ۶ روپے
غیر ممالک کے لیے ۸ روپے

قیمت فی پرچہ دس آنے

پبلشرز
یونی ورسٹی بک ایجنسی لاہور

آر۔ ایچ۔ ڈی۔ خالد پرنٹر پبلشر نے دین محمدی پریس لاہور میں طبع کرا کے
یونیورسٹی بک ایجنسی سوکھبری رو ڈ لاہور سے شائع کیا

نئے دور کا آغاز

نامدار خاں

انقلابی حکومت نے پچھلے ایک برس میں قومی زندگی کے مختلف شعبوں میں جو بنیادی اصلاحیں کی ہیں ان کے نتائج رفتہ رفتہ محسوس کیے جانے لگے ہیں۔ ملکی اور غیر ملکی مبصروں کو اب اس بات کا یقین ہو گیا ہے کہ نئی حکومت نے اقتدار سنبھالنے کے بعد جو وعدے کیے تھے وہ خالی الفاظ نہیں تھے۔ وہ وعدے تیزی سے عملی شکل اختیار کر رہے ہیں اور پاکستان کے جسم میں تازہ صحت مند خون پیدا ہو رہا ہے۔

کم ترقی یافتہ ملکوں کو سب سے زیادہ ضرورت دو چیزوں کی ہے: (۱) عدل پسند حکومت (۲) قدرتی وسائل کی تیز رفتار ترقی، تاکہ عوام کا معیار زندگی اونچا ہو جائے۔ پہلی غایت حاصل کرنے کے لیے موجودہ حکومت نے جو کچھ کیا ہے۔ اس کے متعلق کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں۔ ہر شہری یہ بات ذاتی تجربے سے اچھی طرح جانتا ہے، کہ دفتری نظام میں کس قدر اصلاح ہو چکی ہے۔ پاکستان کے قدرتی وسائل میں اس کی زرعی دولت کو پہلا مقام حاصل ہے۔ موجودہ حکومت نے زرعی اصلاحات نافذ کرکے زرعی ترقی کے جس باب کا آغاز کیا ہے وہ ہماری تاریخ کا ایک سنہری باب ہے۔ زرعی اصلاحات کا مطلب یہ ہے کہ اب لاکھوں کاشتکار جو پہلے محض مزارع تھے اب زمینوں کے مالک بن گئے ہیں۔ اس سے ملک کی زرعی پیداوار میں نمایاں اضافہ ہونا ناگزیر ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ یہ قدم ملک کی سیاسی زندگی کو بھی استحکام دینے والا ثابت ہوگا۔ پہلے حالت یہ تھی کہ مغربی پاکستان کے تقریباً سو کنبے صوبے کے وسیع زرعی رقبوں کے مالک تھے۔ یہی کنبے ملک کی سیاسی زندگی پر چھائے ہوئے تھے۔ زرعی اصلاحات نے اس صورت حالات کا خاتمہ کرکے ایک صحت مند متوسط طبقے کو ملک کی سیاسی قسمت کا مالک بنا دیا ہے۔ یہ چیز پاکستان کے سیاسی استحکام کی سب سے بڑی ضمانت ثابت ہونے والی ہے۔

کسی ملک کی سیاسی صحت کی سب سے بڑی پہچان یہ ہوتی ہے کہ اس کے عوام کو حکومت کے کام میں کس حد تک شریک کیا جا رہا ہے۔ اس ضمن میں بھی موجودہ حکومت کا کارنامہ اپنی مثال آپ ہے۔ قیام پاکستان کے بعد کوئی گیارہ برس تک ملک میں پارلیمانی نظام رائج رہا۔ مگر اس نظام نے ملک کو سیاسی طور پر دیوالیہ بنا کر رکھ دیا موجودہ حکومت نے بنیادی جمہوریتوں کی شکل میں ملک کے لیے ایک ایسا جمہوری نظام وضع کیا ہے جو نہ صرف ہمارے قومی مزاج کے حسب حال ہے بلکہ عوام کو صحیح معنوں میں حکومت کے کام میں شریک کرنے کا بھی ضامن ہے۔ بنیادی جمہوریتوں کا یہ تجربہ اس قدر حقیقت پسندانہ ہے کہ ایشیا کے دوسرے ملک بھی اس کے نتائج پر آنکھیں لگائے بیٹھے ہیں۔

مگر اس سارے تعمیری کام کی اصل بنیاد تعلیم پر ہی قائم ہو گی۔ کسی قوم کے عوام ملکی معاملات میں اس وقت تک ہوش مندی اور ذمہ داری کے ساتھ حصہ نہیں لے سکتے جب تک وہ ملکی اور عالمی حالات سے معقول طور پر باخبر نہ ہوں۔ دوسرے لفظوں میں آزاد جمہوری زندگی اور معاشی ترقی کے لیے عوام کا پڑھے لکھے ہونا ایک لازمی شرط ہے۔ اس پس منظر میں ملک کے نظام تعلیم کی تعمیر نو ایک غیر معمولی اہمیت حاصل کر لیتی ہے۔ تعلیمی کمیشن کی رپورٹ اس وقت حکومت کے زیر غور ہے۔ وزیر تعلیم اور صدر جمہوریہ نے اس رپورٹ کے متعلق اب تک جو اشارے کیے ہیں ان سے صاف پتہ چلتا ہے کہ نظام تعلیم میں بہت جلد بنیادی تبدیلیاں ہونے والی ہیں۔ یہ تعلیمی اصلاحات صحیح معنوں میں ملک میں ایک نئے دور کا آغاز کرنے والی ثابت ہوں گی۔

ذہنی صحت اور اس کی اہمیت

فضل احمد

ذہنی صحت کیا ہے؟

جسمانی صحت کا مفہوم پرانے وقتوں سے متعین چلا آتا ہے لیکن آج کل تعلیمی اور طبی لٹریچر میں ذہنی صحت کی اصطلاح بھی عام استعمال ہونے لگی ہے۔ جن لوگوں نے جدید نفسیات کا مطالعہ نہیں کیا انھیں بعض اوقات اس اصطلاح کا درست مفہوم اخذ کرنے میں دقت محسوس ہوتی ہے۔ تاہم جس طرح بدنی صحت سے مراد یہ ہے کہ انسانی جسم ہر طرح اعتدال پر ہو، اس کے سارے کل پرزے اپنے اپنے ٹھکانے پر ہوں اور مناسب رفتار اور پورے تال میل کے ساتھ کام کر رہے ہوں۔ بالکل اسی طرح ذہنی صحت سے بھی یہ مراد ہے کہ انسانی ذہن ہر قسم کی الجھن، ہر قسم کے بوجھ اور ہر طرح کے غیر معقول ڈر سے بالکل آزاد ہو اور ہر قسم کے مسائل کو بے لاگ اور معروضی رنگ میں دیکھے۔

انسان جسم اور روح کے مجموعے کا نام ہے۔ جسم کی صحت اور سلامتی کے لیے ضروری ہے کہ مناسب اور متوازن غذا، اور ایک زندگی بخش ماحول میسر ہو۔ مغرب کی ساری تہذیب نے ایک لمبے عرصے تک یہ خیال کیے رکھا کہ انسانی جسم کی مناسب دیکھ بھال سے روحانی یا ذہنی صحت کا اہتمام از خود ہو جاتا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ مادی فراوانی اور تن آسانی انسانی ذہن کے تمام بوجھ ختم کر سکتی ہے۔ لیکن مادی تہذیب کی ہوشربا ترقی کے ساتھ اس تہذیب کے علم برداروں کو آہستہ آہستہ یہ احساس بھی ہونے لگا کہ اکیلی جسمانی صحت ذہنی صحت مندی کی ضامن نہیں ہو سکتی۔ یہ عین ممکن ہے کہ ایک انسان کو ہر قسم کے مادی لوازمات اور ہر طرح کی بدنی سہولتیں مہیا ہوں لیکن وہ طرح طرح کی ذہنی الجھنوں کا شکار ہو۔ تعلیم کسی آدمی کو ہر قسم کے علوم اور ہر طرح کی مہارتیں سکھا سکتی ہے۔ مگر صرف اتنا کر دینے سے یہ لازم نہیں آتا کہ اس کے تحت الشعور کو ہر طرح کے طوفانی جھکڑوں سے پاک کر دیا گیا ہے۔ جو تعلیم صرف علوم اور مہارتیں سکھاتی ہے، اس کی پیداوار

چوٹی کے عالم، فنی ماہر اور سائنس دان ہو سکتے ہیں لیکن یہ تعلیم اس بات کا یقین نہیں دلا سکتی کہ اس کے پیدا کردہ لوگ سلامت روی کے نمونے بھی ہوں گے۔

مغربی تعلیم کی یہ کمی موجودہ صدی کے آغاز سے ہی شدت سے محسوس ہونے لگی تھی۔ دونوں جنگوں کے درمیانی وقفے میں اس موضوع پر بہت کچھ لکھا گیا اور دوسری عالمی جنگ کے بعد سے ترقی یافتہ ملکوں کے تعلیمی اداروں نے جسمانی صحت کی طرح ذہنی صحت کی طرف بھی توجہ کرنی شروع کی۔ سکولوں اور کالجوں میں بچوں اور نوجوانوں کی ذہنی الجھنیں دور کرنے کے لیے خصوصی طور پر تربیت یافتہ استاد مقرر کیے گئے اور ان کی خدمات کو رہنمائی کا نام دیا گیا۔ رہنمائی کے تصور میں بھی رفتہ رفتہ کافی تبدیلی پیدا ہوئی۔ اس کا جدید ترین تصور یہ ہے کہ طالب علم کی اس طور پر مدد کی جائے کہ وہ اپنی ذات سے آگاہ ہو جائے تاکہ وہ ایک اچھی زندگی گزار سکے۔

غرض جدید مدرسہ ذہنی صحت کی ذمہ داری پوری طرح قبول کر چکا ہے جس طرح بچوں کی جسمانی صحت برقرار رکھنے اور اسے ترقی دینے کے لیے نہ صرف موزوں تعلیم و تربیت کا بندوبست کیا جاتا ہے بلکہ جسمانی معائنے بھی اکثر ہوتے رہتے ہیں، اسی طرح ذہنی صحت برقرار رکھنے کے لیے طلبہ کے معاشرتی ماحول، ان کے اوضاع و اطوار اور ان کی دلچسپیوں کے متعلق ضروری تفصیلیں جمع کی جاتی ہیں۔ ان معلومات کی روشنی میں ان کے طرز عمل اور ان کی کارکردگی کا جائزہ لیا جاتا ہے اور جہاں کوئی طالب علم کسی ذہنی الجھن کا شکار نظر آئے اسے اس قابل بنایا جاتا ہے کہ اپنی اس کمزوری کا احساس پیدا کرے اور اس کے حقیقی اسباب دور کرے۔

ذہنی صحت اور طب

مشرق میں یہ عقیدہ پرانے زمانوں سے چلا آ رہا ہے کہ ذہنی اور روحانی اسباب جسمانی صحت پر اثر ڈالتے ہیں۔ یہ کوئی اتفاقی امر نہیں کہ مشرق کے مشہور طبیبوں میں سے اکثر باخدا لوگ تھے، وہ خود بھی روحانی قدروں میں یقین رکھتے تھے اور مریض کو بھی ان سے مدد لینے کی تلقین کرتے تھے۔ مگر مغرب میں ذہنی اسباب کی اہمیت بالکل حال ہی کی پیداوار ہے۔ مغربی طب نے اپنی ہوش ربا ترقی کے باوجود دیر تک

یہ خیال کیسے رکھا کہ جسمانی عوارض کا روح سے کچھ واسطہ نہیں اس لیے ان کے علاج کے لیے دوائیں اور جراحی ہی کافی ہے لیکن اب صورتِ حال بڑی حد تک بدل گئی ہے۔ مغربی طب نے پچھلے تین دہائیوں میں اتنی ترقی کی ہے جتنی پچھلے تین سو سال میں بھی نہ ہوئی تھی۔ اس کے باوجود مغربی طب کے چوٹی کے رہنما کئی جسمانی بیماریوں کے علاج میں محض دواؤں اور جراحی کو بے بس پاتے ہیں۔ اس بات نے انھیں مجبور کیا ہے کہ بیماریوں کے جسمانی اسباب کے علاوہ دوسرے زیادہ گہرے اسباب کی تلاش کریں۔ یہ دوسرے اسباب انسانی تحت الشعور میں ملے ہیں۔ ان دلچسپ تجربوں اور مشاہدوں نے طبی نقطۂ نگاہ میں بنیادی تبدیلی پیدا کر کے رکھ دی ہے۔

اس ضمن میں سب سے زیادہ مدد نفسیات سے ملی ہے۔ علم نفسیات ایک نوعمر سائنس ہے، مگر اس کے انکشافات نے تعلیمی دنیا کی طرح طبی دنیا میں بھی تہلکہ ڈال دیا ہے۔ نفسیات نے یہ حقیقت واضح کی ہے کہ جسمانی صحت کی طرح جذباتی صحت بھی اہم ہے۔ وجہ یہ کہ زندہ رہنے کی آرزو کی زیادہ گہری جڑیں انسانی جذبات میں گڑی ہوئی ہیں۔ نتیجہ یہ ہے انسانی زندگی میں سب سے زیادہ طاقت ور قوت جذبات کی ہے۔ اکثر حالتوں میں جذباتی کیفیت یہ فیصلہ کرتی ہے کہ انسان بیمار ہوگا یا تندرست۔

ایک نفسیاتی معالج کی رائے

اس اہم نکتے پر ایک مشہور نفسیاتی معالج نے ذیل کے الفاظ میں رائے ظاہر کی ہے :-

انسانی زندگی کے متعلق ہم جو کچھ جانتے ہیں اس کا اہم ترین نکتہ یہ ہے کہ ذہن جسم پر حکمران ہے۔ ہمارے ہر قسم کے جذبات جسمانی تبدیلیاں پیدا کرتے ہیں۔ مثلاً ڈر سے دل کی حرکت پر اثر پڑتا ہے۔ غصے کی وجہ سے دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی ہے۔ خون کا دباؤ بڑھ جاتا ہے۔ اور کاربوہائیڈریٹ پیدا کرنے والے اعضا نمایاں اثر قبول کرتے ہیں۔

برلن یونیورسٹی کے ایک بڑے ڈاکٹر نے حال میں اپنے ایک مطالعہ کے نتائج شائع کیے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ زیادہ لمبی عمر ان لوگوں کی ہوتی ہے جن کے مختلف اعضاء ایک ہی رفتار سے گھسیں یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب انسان متوازن مزاج ہو اور آسانی سے جذبات کا شکار نہ ہو۔

غرض جدید طب اب ذہنی صحت کو بھی وہی اہمیت دینے لگا ہے جو جسمانی صحت کو۔ جدید طب کے

ایسے لوگوں سے بکثرت واسطہ پڑتا ہے جو دیکھنے میں بالکل اچھے بھلے معلوم ہوتے ہیں اور جن کی صحت مندی کے متعلق طبی آلات اور طبی امتحان پورا پورا یقین دلاتے ہیں۔ مگر اس کے باوجود یہ لوگ تکان اور بےچینی کی شدید شکایت کرتے ہیں۔ یہ تکان آخر پیدا کس طرح ہوتی؟ جبکہ اس کی کوئی جسمانی وجہ موجود نہیں؟ اس سوال نے ڈاکٹروں کو دیر تک پریشان کیے رکھا۔ مگر اب وہ جانتے ہیں کہ اس قسم کی تکان احساس اندرونی خلفشار کی پیداوار ہوتی ہے جو فرد کی تخلیقی قوتوں کو پارہ پارہ کر کے رکھ دیتی ہے۔ وہاں قوت جو طرح طرح کے مفید کام انجام دے سکتی تھی ذہنی پریشانی کے باعث بھسم ہو کر رہ جاتی ہے اور فرد کے اندر ناہمواری کا ایک قوی احساس پیدا کرتی ہے۔ یہ تکلیف دہ احساس دراصل ایک نامعلوم تشویش کا نتیجہ ہوا کرتا ہے۔ ایک ایسی تشویش جو فرد کے تحت الشعور میں جاگزیں رہتی ہے۔ اور جس کے اسباب کی خبر خود فرد کو بھی نہیں ہوتی۔

تشویش کی اقسام

مشہور ماہر نفسیات فرائڈ نے تشویش کو "اندرونی ڈر" کا نام دیا ہے۔ تاہم ڈر لازمی طور پر ناپسندیدہ چیز نہیں۔ ڈر صحت مند بھی ہو سکتا ہے۔ مثلاً ایک حیوان اپنے آپ کو دشمن سے دوچار پاتا ہے۔ اسے فوری طور پر یہ فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ آیا بھاگ نکلے یا دو دو ہاتھ کرلے۔ اس غیر معمولی صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے اس کے اندرونی اعضاء فوراً اس کی کمک کو آن حاضر ہوتے ہیں۔ دل زیادہ تیزی سے حرکت کرنے لگتا ہے۔ خون کا دباؤ یکدم بڑھ جاتا ہے۔ اعصاب تن جاتے ہیں۔ یہ اندرونی تبدیلیاں جو ڈر کی وجہ سے پیدا ہوئی ہیں جانور کو اس قابل بنا دیتی ہیں کہ وہ ایک ایسے فیصلے کو جس پر اس کی زندگی کا دارومدار ہو سکتا ہے۔ تیزی اور پوری قوت کے ساتھ عملی جامہ پہنا سکے۔

انسان بھی گو ایک حیوان ہے۔ مگر تہذیب و تمدن کی صدیوں لمبی ترقی نے اس کی زندگی کو بے حد پیچیدہ بنا دیا ہے۔ ایسا اتفاق بہت شاذ ہوتا ہے کہ اسے دوسرے حیوانوں کی طرح اپنی زندگی فوری خطرے میں نظر آئے۔ تاہم انسان کو بھی کئی قسم کے ڈر لاحق رہتے ہیں۔ اسے یہ ڈر لاحق رہتا ہے کہ اگر روزگار ہاتھ سے نکل گیا تو نیم فاقہ مستی کی نوبت آ جائے گی۔ اسے ڈر رہتا ہے کہ اگر اسے اور اس کے

بال بچوں کو موزوں قسم کی غذا نہیں ملے گی تو ان کی صحت خراب ہو جائے گی۔ اسے ڈر رہتا ہے کہ اگر بڑھاپے کے لیے کچھ بچا کر نہ رکھوں گا تو بڑی مشکل پیش آئے گی۔ اسے خطرہ رہتا ہے کہ اگر دنیا میں تیسری عالمگیر لڑائی چھڑ گئی تو اس کا ملک اور خود اس کا گھر بار تباہ و برباد ہو جائے گا۔ یہ تمام ڈر صحت مند قسم کے ڈر ہیں۔ وہ انسان کو اس قابل بناتے ہیں کہ وہ آنے والے خطروں کے لیے پہلے سے تیار ہو جائے تاکہ ان خطروں کے رونما ہونے کے وقت وہ بے بسی کے عالم میں نہ ہو۔

ان صحت مند قسم کے ڈروں کے مقابلے میں غیر صحت مند قسم کے ڈر ہیں۔ غیر صحت مند قسم کا ڈر وہ ڈر ہے جس کی کوئی معقول وجہ نہ ہو لیکن پھر بھی وہ جب غلبہ پالے تو انسانی دل و دماغ کو ماؤف کر دے۔ اس قسم کے ڈر کی وضاحت ایک مثال سے ہو جائے گی۔ راقم کو ایک صاحب کا علم ہے جن کی عمر اس وقت ساٹھ سے اوپر ہے، وہ اچھے پڑھے لکھے اور خوش اخلاق آدمی ہیں مگر ان کے دوستوں کو ان کی ایک کمزوری کا علم ہے۔ وہ یہ کہ جب انھیں بتایا جائے کہ فلاں آدمی مر گیا تو ان کا رنگ یک دم اڑ جاتا ہے، اور ان پر لرزہ سا طاری ہو جاتا ہے۔ انھیں کسی جنازے کے ساتھ جانا پڑے تو ان کے اوسان خطا ہو جاتے ہیں اور اگر وہ کسی مردے کا چہرہ دیکھ لیں تو ان کے لیے رات کو سونا ناممکن ہو جاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ ان صاحب کے پاس اس عجیب و غریب ڈر کی کوئی وجہ موجود نہیں۔ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ موت اٹل ہے۔ ہر آدمی کو اس کا ذائقہ چکھنا ہے۔ اور خود ان کی باری بھی اب بہت دور نہیں لیکن یہ ساری باتیں جاننے کے باوجود وہ اپنے ڈر پر قابو نہیں پا سکتے۔

اس قسم کے غیر صحت مند ڈر کی بیسیوں اور مثالیں فوراً ذہن میں آ سکتی ہیں۔ مثلاً ایک آدمی دیکھتا ہے کہ اس کا بیٹا ماں کے ناجائز لاڈ پیار کی وجہ سے بگڑ رہا ہے۔ وہ خوب سمجھتا ہے کہ یہ چاؤ چونچلے لڑکے کی زندگی پر مستقل طور پر برا اثر ڈالنے والے ہیں، وہ کئی بار ارادہ کرتا ہے کہ بیوی کی باتوں کو نظر انداز کرکے بیٹے کو محنت اور روزمرہ کے کام کاج کا عادی بنائے۔ مگر وقت آنے پر ایک عجیب قسم کا ڈر اس کے دل پر غیر شعوری طور پر چھا جاتا ہے۔ اور اس کے سارے ارادے دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔ اس کا بیٹا اس کی آنکھوں کے سامنے بگڑتا ہے اور وہ کچھ نہیں کر سکتا۔

صحت مند اور غیر صحت مند قسم کے ڈروں کی مثالیں دیکھ لینے کے بعد یہ سمجھنا کچھ مشکل نہیں رہتا کہ پہلی قسم کا ڈر انسانی زندگی اور انسانی شخصیت کی تعمیر کے لیے ضروری ہے۔ لیکن دوسری قسم کا ڈر سراسر تخریبی نوعیت کا ہے۔ جہاں صحت مند قسم کا ڈر انسانی مستقبل اور فرد کی شخصیت کو مضبوط بنیادوں پر تعمیر کرتا ہے، وہاں غیر صحت مند قسم کا ڈر ان بنیادوں کو کھوکھلا کر کے رکھ دیتا ہے۔

پس ذہنی صحت حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ذہن کو غیر صحت مند قسم کے ڈروں سے بالکل پاک کر دیا جائے۔ دل میں کوئی ایسی پھانس باقی نہ رہے جو صحت مند قسم کے ڈر سے پیدا ہونے والی قوت کو کھوکھلا کرے۔

بعض بیماریوں کا سبب

اس سلسلے میں ایک بے حد دلچسپ انکشاف یہ ہے کہ بہت سے غیر صحت مند ڈر طرح طرح کی جسمانی بیماریوں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ ایک مشہور ڈاکٹر نے اس امر کی کئی ایک مثالیں دی ہیں۔

مثلاً وہ بیان کرتا ہے کہ ایک شخص کو میں عرصے سے جانتا تھا، وہ ایک کاروباری ادارے کا منیجر تھا، وہ اپنا کام بڑی جانفشانی سے کرتا تھا، اس کی بڑی وجہ اس کی بیوی تھی۔ بیوی اس پر پوری طرح چھائی ہوئی تھی اور اسے ہر چیز سے بڑھ کر اس بات کی تمنا تھی کہ اس کے میاں اونچے عہدے تک پہنچیں تاکہ یہ چیز اس کے لیے فخر کا باعث بن سکے۔ ایک رات اس شخص نے مجھے گھر پر بلایا۔ میں نے دیکھا کہ وہ درد سے کراہ رہا ہے، درد کی شدت کا یہ حال تھا کہ جلد پر ہاتھ رکھنے سے بھی وہ بے کل ہو جاتا تھا۔ اس نے بڑے حسرت بھرے لہجے میں مجھ سے کہا کہ خدا کے لیے مجھے دو دن کے اندر اندر تندرست کر دیجیے۔ کیونکہ تیسرے دن مجھے ایک انٹرویو کے لیے جانا ہے جس کے ساتھ میری آئندہ ترقی کے مواقع وابستہ ہیں۔

ڈاکٹر بیان کرتا ہے کہ میں نے اس آدمی کو ہر وہ دوائی دی جو اس مرض کو فائدہ دے سکتی تھی، مگر اس کی تکلیف میں کوئی کمی نہ ہوئی۔ آخر انٹرویو کا دن آیا اور گذر گیا۔ مگر یہ شخص اسی طرح بستر میں پڑا کراہتا رہا۔ اگلی صبح اسے اس حد تک افاقہ ہو گیا کہ اپنے کام پر جا سکے۔ اس کے دو ایک روز بعد وہ میرے پاس آیا

اور مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اس کی تکلیف پورے طور پر ختم ہو چکی ہے۔ میں فوراً اس سارے ماجرے کی اصل وجہ سمجھ گیا۔ جب تک اس شخص کے اعصاب پر انٹرویو کا خوف سوار تھا اسے ایک خوفناک قسم کی درد نے جیت گرائے رکھا۔ لیکن جب اس کا ایک حریف اس آسامی کے لیے چن لیا گیا جسے حاصل کرنے کی اسے آرزو تھی تو اس کا خوف جاتا رہا اور اس کے ساتھ ہی اس کا درد بھی ختم ہو گیا۔

دوسرا واقعہ اس سے مختلف ہے۔ ایک روز ایک ادھیڑ عمر کا آدمی اس ڈاکٹر کے پاس آیا۔ اس کے جسم پر پھوڑے تھے۔ اس نے کہا یہ پھوڑے تیس سال سے میری زندگی تلخ بنائے ہوئے ہیں کاش میں اُن سے چھٹکارا پا جاؤں، مجھے زندگی میں اور کسی چیز کی تمنّا نہیں۔

"فرض کرو تم کل صبح بالکل تندرست اٹھتے ہو۔ پھر تم کیا کرو گے؟" ڈاکٹر نے پوچھا۔

"واہ میں زندگی سے لطف اٹھاؤں گا"

"وہ کس طرح؟ تم کیا کرو گے؟"

"میں بھی زندگی سے اسی طرح لطف اٹھاؤں گا جس طرح اور لوگ اٹھاتے ہیں"

اِس جواب نے ڈاکٹر کو یقین دلایا کہ یہ شخص تندرست نہیں ہو گا۔ وہ اس لیے کہ اس کے سامنے کوئی ایسا مقررہ مقصد نہیں تھا جو اس کی اندرونی قوتوں کو صحت حاصل کرنے کے لیے ابھارے، بلکہ معاملہ اس کے بالکل برعکس تھا۔ یہ شخص خود اپنے آپ کو قابلِ رحم خیال کرنے کا عادی ہو چکا تھا۔ جب وہ کام پر جاتا تو ساتھی درد بھرے لہجے میں کہتے :- کتنا باہمت انسان ہے کہ تکلیف کے باوجود برابر کام کیے جا رہا ہے۔ جب وہ گھر آتا تو بیوی بچے اس کی ہر ضرورت کا خاص الخاص خیال رکھتے۔ یہ غیر معمولی ہمدردی اور محبت اسے محض پھوڑوں کے طفیل حاصل تھی اور پچھلے تیس سال سے حاصل چلی آ رہی تھی۔ بھلا اس کا تحت الشعور اس بات کو کب گوارا کر سکتا تھا کہ وہ ایک ایسی چیز کو کھو دے جس کی بدولت اسے چاروں طرف سے سہارے حاصل تھے؛ نتیجہ یہ ہوا کہ لگاتار علاج کے باوجود اس کے پھوڑوں میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی۔ بظاہر یہ شخص پھوڑوں سے بہت تنگ تھا اور ان سے نجات پانا چاہتا تھا، مگر اس کے نہاں خانۂ دل میں جو گہرے جذبات چھپے ہوئے تھے وہ تندرستی کے مقابلے میں اس محبت اور ہمدردی کو زیادہ قیمتی سمجھتے تھے

جو اس شخص کو اپنی بیماری کی بدولت حاصل تھی۔

اس قسم کے مریضوں کو دیکھنے کے بعد ڈاکٹروں کی رائے اب یہ ہے کہ کوئی مریض اپنے مرض سے اس وقت تک چھٹکارا نہیں پا سکتا جب تک علاج کو اس کی ساری ہستی کی تائید حاصل نہ ہو۔ اگر وہ اپنی حالت قابلِ رحم سمجھتا ہے اور جو لوگ اس کے اس احساس کو سہارا دیں انھیں پسند کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے سامنے کوئی اور اونچا مقصد نہیں۔ وہ کسی اور چیز کے لیے جینا نہیں چاہتا، اور جب مریض کا اپنا نصب العین مرض کی بدولت حاصل ہو رہا ہو، اسے مرض سے کون نجات دلا سکتا ہے؟

حالیہ طبی مطالعوں نے ثابت کیا ہے کہ جلدی بیماریوں اور جذباتی الجھنوں کے درمیان بہت گہرا تعلق ہے۔ جلدی بیماریاں گو مہلک نہیں ہوتیں، مگر یہ مریض اور طبیب دونوں کے لیے عموماً دردِ سر بن جاتی ہیں۔ حال ہی میں تیس غیر منتخب مریضوں کا مطالعہ یہ معلوم کرنے کے لیے کیا گیا تھا کہ آیا جلدی بیماری اور جذباتی مسائل کے درمیان کوئی تعلق ہے۔ اس مطالعہ سے معلوم ہوا کہ اکثر حالتوں میں جلد کی تکلیف براہِ راست ایک خاص قسم کے جذباتی طوفان کا نتیجہ تھی۔ مریض اپنے آپ کو بے انصافی کا شکار خیال کرتا تھا اور اس معاملے میں اپنے آپ کو بے بس بھی محسوس کرتا تھا۔

جذباتی تناؤ اور اس کے نتائج

انسان طبعاً آزادی پسند ہے، وہ دوسروں کا محتاج ہو کر رہنا پسند نہیں کرتا۔ انسانی بچہ مکمل بے بسی کے عالم میں پیدا ہوتا ہے۔ مگر جونہی اس کے ننھے اعضا کچھ طاقت حاصل کرتے ہیں، بچہ دوسروں کے سہاروں سے آزاد ہونے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے لگتا ہے، اور دن بدن اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا سیکھنے لگتا ہے۔ آزادی کے لیے یہ جدوجہد جوانی کے زمانے تک جاری رہتی ہے۔ اس جدوجہد میں بعض اوقات تکلیف دہ جذباتی تناؤ بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ یہ جذباتی تناؤ فرد کو اس بات پر ابھارتے ہیں کہ وہ آزاد ہونے کے لیے پہلے سے زیادہ شدت کے ساتھ ہاتھ پاؤں مارے۔ تاہم یہ جذباتی طوفان بعض حالتوں میں بیماریوں کی شکل بھی اختیار کر لیتے ہیں۔

ایک مشہور ڈاکٹر نے اس صورتِ حال کی وضاحت اپنے ذاتی مشاہدے سے کی ہے۔ وہ

بیان کرتا ہے کہ ایک نوجوان کنواری لڑکی اس کے پاس آئی اور شکایت کی کہ مجھ میں طاقت کی اتنی کمی ہے کہ جو کام کرنا چاہوں اسے نہیں کر سکتی۔ ہر چند ارادہ کرتی ہوں کہ دوسروں کی طرح صبح اٹھوں اور کام کاج کروں مگر اپنے اندر اتنی طاقت نہیں پاتی۔ معلوم نہیں کیوں؟

طبی معائنے سے معلوم ہوا کہ اس کی قوت حرکت اعتدال سے بقدر تیس درجے کم ہے۔ اس کی آنتیں باقاعدگی سے کام نہیں کر رہی تھیں۔ وہ ایک چھوت کی بیماری کا بھی شکار تھی جو علاج کے باوجود پچھلے تین سال سے دور نہ ہوئی تھی۔ ان سب شکایتوں پر مستزاد یہ کہ تھوڑے عرصے سے وہ موٹاپے کا شکار ہونے لگی تھی۔

ڈاکٹر نے جب مریضہ کی ذہنی صحت کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ وہ اپنی ماں کے ہاتھوں سخت نالاں ہے اس کی ماں ایک تیز مزاج اور مضبوط ارادہ عورت ہے۔ وہ بیٹی کے احساسات کی کچھ پرواہ نہیں کرتی اور ہر صورت میں اپنی بات منوانا چاہتی ہے۔ بعض اوقات مریضہ اس صورت حال سے اس قدر برگشتہ ہو جاتی ہے کہ زندگی ختم کرنے کا ارادہ کر لیتی ہے۔ مریضہ کو فوری طور پر جس مسئلے نے پریشان کر رکھا تھا وہ اس کی شادی کا مسئلہ تھا۔ وہ ایک اچھے شریف آدمی سے جو ایک اچھے روزگار پر لگا تھا شادی کرنا چاہتی تھی۔ مگر اس کی ماں کو اس رشتے پر شدید اعتراض تھا، وہ اس نوجوان کی سماجی حیثیت کو خاطر میں نہ لاتی تھی۔

ڈاکٹر نے مریضہ سے بات چیت کرنے کے بعد اسے یقین دلایا کہ اس کے تمام جسمانی عوارض اس کے جذباتی تناؤ کی پیداوار ہیں۔ جب تک یہ تناؤ ختم نہ ہوگا دوائی کام نہیں دے گی۔ مریضہ یہ نکتہ سمجھ گئی اور اس نے اس جذباتی بوجھ کو ہلکا کرنے کا عزم کر لیا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ علاج اثر پیدا کرنے لگا۔ اس کی شکایات میں کمی واقع ہونے لگی۔ اب اس نے ایک اور قدم آگے اٹھایا۔ ماں کی مخالفت کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اس نے اپنی پسند کے خاوند کے ساتھ شادی کر لی اور اس کے ساتھ اس شہر سے کہیں باہر چلی گئی۔

جب وہ پانچ مہینوں کے بعد واپس آئی تو ڈاکٹر اسے بڑی مشکل سے پہچان سکا۔ اب وہ ایک

بے حد قبول صورت نوجوان عورت تھی۔ اس کا موٹاپا غائب ہو چکا تھا اور اسی طرح اس کی دوسری بیماریاں بھی ختم ہو چکی تھیں۔

اسی قسم کے اَن گنت واقعات جمع کیے جا سکتے ہیں، جہاں دوائی نے اس وقت کام کیا جب مریض کی ذہنی صحت بھی بحال ہونے لگی۔ مغربی طب اب اس بات کا قائل ہو چکا ہے کہ علاج کرنے کے لیے محض دوائی کھلانے یا ٹیکہ لگانے پہ بھروسہ کرنا غلط ہے۔ ایسا کرنے سے وہ بیماری کی علامتوں کو دور کر سکتا ہے، بیماری کو جڑ سے نہیں اکھاڑ سکتا۔ اسے جڑ سے اکھاڑنے کے لیے ڈاکٹر کو چاہیے کہ مریض کی جذباتی کیفیت کو بھی اعتدال پہ لائے۔ لیکن اس کے لیے مریض کو ڈاکٹر کے ساتھ تعاون کرنا چاہیے اگر مریض چپ چاپ طبیب کے پاس جا بیٹھتا ہے اور اس سے یہ توقع رکھتا ہے کہ وہ اس کی ہر قسم کی شکایات کا کھوج لگائے اور ان کا علاج کرے تو وہ ایک بڑی غلط فہمی میں مبتلا ہے۔ مریض کو چاہیے کہ نہ صرف طبیب کو اپنی جذباتی کیفیت ور سے آگاہ کرے بلکہ جب وہ اپنی ذہنی صحت کی اصلی کیفیت سے آگاہ ہو جائے تو اسے اعتدال پہ لانے کی پوری کوشش کرے۔

عام امراض کی نوعیت

انسانی بیماریوں کو تین بڑے گروہوں میں بانٹا جا سکتا ہے۔ پہلے گروہ میں وہ بیماریاں آتی ہیں جو خالصتہً اعضاء کی ساخت سے تعلق رکھتی ہیں۔ یہ بیماریاں جراحی کے عمل کی محتاج ہوتی ہیں۔ ان میں کوئی نفسیاتی عنصر شامل نہیں ہوتا۔ دوسری انتہا پہ وہ بیماریاں ہیں جو خالصتہً ذہن اور جذبات سے تعلق رکھتی ہیں۔ ایسی بیماریوں کا علاج نفسیاتی علاج گاہ میں ہی ہو سکتا ہے۔ طبیب ان کے متعلق کچھ نہیں کر سکتا ان دونوں انتہاؤں کے بین بین بیماریوں کی وہ بہت بڑی تعداد ہے جن میں اکیلا دوائی کا استعمال کام نہیں دے سکتا۔ بے شک ان بیماریوں میں علاج کا آغاز ڈاکٹر کی دوائی سے ہی ہونا چاہیے۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ مریض اپنی جذباتی ساخت کو نتیجہ طور پر سمجھنے لگے اور اسے صحت مند شکل دینے کے لیے مناسب کارروائی کرے۔

اس قسم کے مریض کی ایک مثال ایک ڈاکٹر نے دی ہے۔ ایک روز ایک چست و چوبند جدید وضع کی

ادھیڑ عمر عورت اس ڈاکٹر کے پاس آئی اور بعض جسمانی تکلیفوں کا ذکر کیا۔ ڈاکٹر نے احتیاط سے اس کا معائنہ کیا، اور کہا کہ تمام اعضاء بالکل ٹھیک کام کر رہے ہیں۔ اس پر اس نے اطمینان کا سانس لیا، مگر بعد میں باتیں کرتے کرتے پوچھنے لگی کہ اگر سب اعضاء ٹھیک کام کر رہے ہیں تو میں آخر بیمار کیوں ہوں؟ مجھے یہ نہ بتلائیے کہ یہ اعصابی تکلیف ہے، میں یہ جواب سنتے سنتے اکتا گئی ہوں۔ میں اپنی تکان اور دوسرے عوارض کی ٹھیک ٹھیک وجہ جاننا چاہتی ہوں۔

اس پر ڈاکٹر نے اس کے روزمرہ کے مشاغل کے متعلق دریافت کیا معلوم ہوا کہ اس نے اپنے ذمے بساط سے بڑھ کر فرائض سنبھال رکھے ہیں، جب وہ ان میں سے کسی ذمہ داری سے پوری طرح عہدہ برا نہیں ہو سکتی تو وہ دل ہی دل میں کڑھتی ہے اور اپنے آپ کو کوستی ہے۔ اس بات چیت کا نتیجہ یہ نکلا کہ عورت اپنے جسمانی عوارض اور اپنے جذباتی تلاطم کا باہمی تعلق سمجھ گئی۔ ادھر ڈاکٹر نے اسے کچھ دوائی تجویز کر دی اور ساتھ ہی مناسب غذا بھی۔ مریضہ کو ہدایت کی گئی کہ اپنی شکایات اور اپنی جذباتی کیفیتوں کا باقاعدہ ریکارڈ رکھے۔

مریضہ نے ان ہدایات پر عمل کیا۔ اس کی شکایات کم ہو گئیں مگر پوری طرح دور نہ ہوئیں۔ ریکارڈ رکھنے سے اسے صاف طور پر نظر آنے لگا کہ جس روز اسے جذباتی کوفت ہوتی تھی، اسی روز اس کی شکایات میں یکدم اضافہ ہو جاتا تھا، اس علم نے اسے صحت حاصل کرنے میں بڑی مدد دی اور وہ رفتہ رفتہ بالکل ٹھیک ہو گئی۔

کچھ مہینوں کے بعد وہ پھر ڈاکٹر کے پاس آئی۔ اس کی شکایات دفعتہً پھر لوٹ آئی تھیں۔ بات چیت کرنے پر پتہ چلا کہ پچھلے ہفتے میں اسے تین عزیزوں کو گھر سے رخصت کرنا پڑا۔ اس کی بیٹی ایک بورڈنگ سکول میں داخل ہو گئی تھی۔ اس کا بیٹا فوج میں بھرتی ہو گیا تھا۔ اور اس کی بہن کسی دوسرے شہر میں چلی گئی تھی لیکن اب کی دفعہ ڈاکٹر اور مریضہ دونوں کو کوئی خاص دقت پیش نہیں آئی۔ معمولی بات چیت سے مریضہ کو علم ہو گیا کہ اسے کیا کرنا چاہیے، اور وہ دوبارہ ڈاکٹر کے پاس نہیں آئی۔

یہاں ایک نکتہ خاص طور پر قابل لحاظ ہے۔ وہ یہ کہ مندرجہ بالا مریضہ کو اس لیے صحت حاصل ہوتی رہی

کہ وہ اپنی جذباتی بیماری کو تسلیم کرنے کے لیے تیار تھی لیکن دنیا میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو ایسا کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ اس قسم کا مریض ڈاکٹر کے پاس جاتا ہے اور اس سے یہ جواب سنتا ہے کہ "آپ کو کوئی خاص تکلیف نہیں ہے۔ گھبرائیے نہیں۔ اس تکلیف کے متعلق ذکر کرنا چھوڑ دیجیے اور آپ رفتہ رفتہ خود بخود ٹھیک ہو جائیں گے۔"

یہ جواب سن کر وہ آگ بگولا ہو جاتا ہے اور دل میں کہتا ہے: لو صاحب یہ حضرت بھی وہی وعظ جھاڑنے لگے جو میں سنتے سنتے اکتا گیا ہوں۔ میں تکلیف سے مر رہا ہوں اور ان حضرت کے نزدیک مجھے کچھ تکلیف ہی نہیں۔ کاش اس ڈاکٹر کو اپنے فن میں زیادہ گہری نگاہ حاصل ہوتی۔

دانا ڈاکٹر اس قسم کے مریض کو اس قسم کا جواب کبھی نہیں دے گا۔ وہ بھانپ لے گا کہ یہ شخص اپنے آپ پر ترس کھانے کا ایسا عادی ہو چکا ہے کہ اس سے یہ لت آسانی سے نہیں چھوٹے گی۔ اس لیے وہ خود بھی اس شخص پر ترس کھانے والوں کی صف میں شریک ہو جاتا ہے اور کہتا ہے: بھئی آپ کی تکلیف تو بہت پیچیدہ ہے۔ اس کا فوری طور پر کھوج لگانا ممکن نہیں۔ یہ کام آہستہ آہستہ ہی ہوگا۔ سر دست ان گولیوں کا استعمال شروع کر دیجیے اور ہر تیسرے چوتھے دن معائنے کے لیے آئیے۔

یہ جواب مریض کی پوری تسلی کر دیتا ہے۔ وہ اپنے دل میں کہتا ہے: یہ بہت سیانا ڈاکٹر معلوم ہوتا ہے۔ اس نے پہلی ہی ملاقات میں یہ تشخیص کر لی ہے کہ میری تکلیف بے حد پیچیدہ ہے اور اس کا علاج دقت طلب۔ انشاء اللہ اس کے علاج سے ضرور فائدہ ہوگا۔

مریض کا یہ ردعمل ڈاکٹر کو بہت کام دیتا ہے۔ وہ رفتہ رفتہ اس کا پورا بھروسہ حاصل کر لیتا ہے اور بالآخر اسے اس قابل بنا دیتا ہے کہ اپنے جذباتی مسائل کو بھی صحیح طور پر سمجھ لے۔ یہ منزل اس کی شفایابی کی منزل ہوتی ہے۔

حلم و بردباری

کچھ دن ہوئے راقم گاڑی میں سفر کر رہا تھا۔ سامنے کی سیٹ پر درمیانی عمر کے ڈاڑھی والے آدمی بیٹھے تھے۔ شکل اور لباس سے وہ اس طبقے سے تعلق رکھنے والے معلوم ہوتے تھے جو دیہات میں چھوٹا مو

کاروبار کرتا ہے۔ ان میں سے ایک آدمی دوسرے کو اپنی حالیہ سرگذشت سنا رہا تھا۔

اس نے اپنے ساتھی کو بتایا کہ میں نے پچھلے سال اتنی رقم سے آموں کا ایک باغ خریدا۔ فصل ختم ہونے آئی تو وہ ایک درخت پر آم اتارنے کے لیے چڑھا، ٹہنی ٹوٹ گئی اور وہ بائیں بازو کے بل زمین پر گر پڑا بائیں کہنی ٹوٹ گئی۔ چار پانچ مرتبہ اسے چڑھایا گیا مگر وہ درست ہونے میں نہ آئی اور بایاں بازو اب تک نیم بے کار ہے۔ باغ سے فراغت پانے کے کچھ عرصہ بعد وہ اور اس کا چھوٹا بھائی بہاولپور کے علاقے میں گئے تاکہ کوئی جنس خریدلائیں۔ وہاں آدھی رات کے وقت گاڑی سے اترے اور رات اسٹیشن پر ہی پڑے رہے۔ صبح اٹھ کر دیکھا کہ جیب ساری رقم سے خالی ہے۔ چنانچہ یہ شخص خالی ہاتھ گھر واپس آیا۔ ایک بازو بے کار ہو جانے کے سبب سخت قسم کی محنت مشقت ہو نہیں سکتی تھی۔ تاہم اسے بھکاری بننا گوارا نہ تھا۔ وہ لائل پور اس غرض سے گیا کہ جاروب کشی کا کام ہی مل جائے، وہاں جان پہنچان والوں نے کہا تم جنگی نہیں مسلمان ہو۔ یہ گھٹیا کام کیوں کر گوارا کرو گے؛ جواب دیا گیا کہ بھیک مانگنے سے جاروب کشی کئی درجے بہتر ہے ان دنوں وہ شخص درزی کا کام سیکھ رہا تھا اور چند ماہ تک اسے خاصی دسترس حاصل کر لینے کی امید تھی۔

اس شخص کی سرگذشت نے راقم کو سوچ میں ڈال دیا۔ یہاں ایک ناخواندہ یا زیادہ سے زیادہ نیم خواندہ آدمی بیٹھا تھا، جسے بالکل حال ہی میں پے درپے بہت سے مصائب کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ ان مصائب نے اسے جسمانی طور پر معذور اور مالی طور پر فقیر بنا کر رکھ دیا تھا۔ ان حالات میں وہ اگر اپنے آپ کو بے بس اور قابل رحم خیال کرنے لگ جاتا تو کچھ عجیب نہ ہوتا۔ مگر اس کا رد عمل بالکل مختلف تھا۔ وہ اپنی ساری مجبوریوں کے باوجود بے بسی کا اعتراف کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ بلکہ ان بے بسیوں پر قابو پانے کا عزم کیے بیٹھا تھا۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کے چہرے پر طمانیت برس رہی تھی اس نے اپنی کہانی مسکراہٹوں کے ساتھ بیان کی۔ اس کے دل میں تقدیر کے خلاف کوئی تلخی نہ تھی۔

جو لوگ زندگی میں اس قسم کا نقطۂ نگاہ اختیار کیے رکھتے ہیں، ان کے دلی سکون کو آسانی سے درہم برہم نہیں کیا جاسکتا۔ تیز مزاج بیوی یا بد مزاج افسر یا بدمعاملہ شریک کار ان کے جذبات کو ابھار نہیں سکتے

وہ زندگی کا سفر کمال سکون اور اطمینان سے طے کیے جاتے ہیں۔ خواہ راستے میں کتنی ہی رکاوٹیں پیش آئیں۔ ایسے لوگ ذہنی طور پر صحت مند ہوتے ہیں۔ ان کی ذہنی صحت ان کے جسموں کو بہت سی آفات سے بچائے رکھتی ہے

اپنے آپ سے دشمنی

یہ کہنا کوئی مبالغہ نہیں کہ ذہنی صحت انسان کے لیے سب سے بڑی دولت ہے۔ کیوں کہ یہ وہ اکسیر ہے جو ہر زہر کے اثر کو زائل کر دیتی ہے۔ بقول حافظ شیرازی

کایں کیمیائے ہستی قارون کند گدا را

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ہر انسان زندگی کا بھوکا ہوا کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ حقیقت بھی ناقابل انکار ہے کہ ذہنی صحت سے بڑھ کر کوئی اور چیز زندگی بخش نہیں۔ حقیقی طور پر بھرپور زندگی وہی شخص گذار سکتا ہے جو ذہنی صحت کی دولت سے مالا مال ہو۔

مگر یہ ایک بڑی عجیب بات ہے کہ دنیا میں اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جو ذہنی صحت سے کم و بیش محروم ہیں۔ اکثر لوگ اپنے اوپر طرح طرح کے جذباتی بوجھ لادے رکھتے ہیں جو ان کی شخصیت کی کمر کو عمر بھر جھکائے رکھتے ہیں۔ بظاہر یہ بات ناقابل یقین حد تک عجیب معلوم ہوتی ہے کہ انسان جبلی طور پر زندگی کا بھوکا ہونے کے باوجود ایک ایسا طریق کار اختیار کرے جو اس کی ذہنی صحت کو تباہ کرنے والا اور اس کی زندگی کو کم کرنے والا ہو۔ تاہم یہ عجوبہ انسانی زندگی کی غالباً سب سے تلخ حقیقت ہے۔ انسانوں کی بہت بھاری اکثریت عقل سلیم کی بجائے جذبات کی رہنمائی قبول کرتی ہے۔ اور اس طرح اپنی ذہنی صحت کو تہ و بالا کیے رکھتی ہے۔

ایسا کیوں ہے؟ اس کا جواب اس کے سوا کچھ نہیں کہ ذہنی صحت کو تباہ کرنے والے جراثیم اپنا جال اس چابکدستی سے بچھاتے ہیں کہ عام انسان اس جال میں پھنس جاتے ہیں اور انھیں یہ احساس بھی نہیں ہونے پاتا کہ وہ ہلاکت کے پھندے میں پھنس چکے ہیں۔ وہ اپنے خیال میں زندگی بڑھانے کی کوشش میں لگے ہوتے ہیں۔ مگر یہ نہیں جانتے کہ ان کی یہ کوشش الٹے نتائج پیدا کر رہی ہے۔ کما قال اللہ تعالےٰ

الذین ضل سعیھم فی الحیٰوۃ الدنیا وھم یحسبون ۔ انھم یحسنون صنعا۔

ایسے لوگوں کو حقیقت کا آئینہ دکھانا تاکہ ان پر اپنی کج نگاہی واضح ہو جائے انھیں ذہنی صحت کی

راہ پر ڈالتا ہے۔ یہ کام معلم کا بھی ہے اور طبیب کا بھی۔ معلم کا کام بچوں اور نوجوانوں کو ذہنی صحت کی راہ پر ڈالنا ہے اور طبیب کا کام ایسے بالغوں کو ذہنی صحت کی اہمیت سے آگاہ کرنا ہے، جو یہ صحت کھو چکے ہیں اور اس کے فقدان کی بدولت طرح طرح کے جسمانی عوارض میں مبتلا ہوں۔

نفسیاتی تشخیص اور نفسیاتی علاج

موجودہ زمانے کی سائنسی تہذیب کو مادی تہذیب کا نام بھی دیا جاتا ہے۔ وہ اس لیے کہ اس تہذیب کو ترقی دینے میں شروع شروع میں جن لوگوں نے حصہ لیا ان میں سے اکثر کا عقیدہ یہ تھا کہ اگر انسان مادی فراوانی پیدا کر لے تو وہ اپنی زندگی کے سارے مسائل حل کر لے گا۔ اس عقیدے نے ایک نہایت تھوڑے عرصہ میں مغرب کو وہ مادی فراوانی عطا کی جس کی مثال تاریخ میں نہیں۔ لیکن جیسا پیچھے کہا جا چکا ہے۔ مغرب اپنی اس فکری لغزش سے آگاہ ہو چکا ہے۔ اب اس پر یہ حقیقت کھل چکی ہے کہ مادی لوازمات ذہنی صحت کے ضامن نہیں اور ذہنی صحت کے بغیر جسمانی صحت عموماً ایک بے معنی شے رہتی ہے۔

اس حقیقت کے آشکارا کرنے میں سب سے زیادہ حصہ علم نفسیات نے لیا ہے۔ نفسیات ایک کم عمر معاشرتی سائنس ہے جس نے اس صدی کے آغاز میں لوگوں کی توجہ کو اپنی طرف کھینچنا شروع کیا اور پچھلی چند دہائیوں میں بڑی تیزی سے ترقی کی ہے۔ نفسیات کے انکشافوں سے علم التعلیم اور علم طب دونوں نے بڑا فائدہ اٹھایا ہے۔ ان دونوں کے پیش نظر مقصد یہ ہوتا ہے کہ فرد کو صحت مند اور بھرپور زندگی عطا کی جائے۔ نفسیاتی تحقیقات نے یہ حقیقت واضح کی کہ ذہنی توازن حاصل کیے بغیر نہ زندگی بھرپور بن سکتی ہے، اور نہ صحت مند۔ انسانی زندگی سے بھرپور لذت اسی صورت میں حاصل ہو سکتی ہے کہ انسان کا اپنی دنیا کے ساتھ پوری ہم آہنگی حاصل ہو، اور پوری ہم آہنگی اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتی جب تک انسان اپنے ماحول کے تمام عناصر کے ساتھ ہم آہنگ نہ ہو۔ جو شخص اپنی نگاہ ماحول کے صرف مادی عناصر تک محدود رکھتا ہے اور اس کے ذہنی اور جذباتی عناصر کو کچھ اہمیت نہیں دیتا، وہ اپنے ماحول پر نہ کبھی قدرت حاصل کر سکتا ہے اور نہ ہی زندگی سے بھرپور لطف اٹھا سکتا ہے۔ ماحول کے ذہنی، جذباتی اور روحانی عناصر بھی

اتنے ہی اہم ہیں جتنے اس کے مادی عناصر۔

مغرب کو مندرجہ بالا حقیقت کا احساس اگرچہ بہت دیر سے ہوا، مگر احساس ہو جانے کے بعد اس حقیقت کو کافی اہمیت دی جانے لگی ہے۔ چناں چہ مغربی ملکوں میں نفسیاتی تشخیص یا نفسیاتی علاج کا اب عام رواج ہے۔ بتی رفتار صنعتی تہذیب میں رہنے والے لوگ جو بظاہر تندرست اور چست چوبند دکھائی دیتے اور ہر قسم کی مادی سہولتوں کے مالک ہوتے ہیں، ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں ہر سال نفسیاتی علاج گاہوں کا رخ کرتے اور ان کی خدمات سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ مغرب میں اب نفسیاتی علاج بھی اسی طرح رواج پکڑ رہا ہے جس طرح جسمانی علاج۔

اس صورت حال نے تعلیمی دنیا میں بڑے دور رس نتائج پیدا کیے ہیں۔ تعلیمی درس گاہوں کو اول اول یہ احساس پیدا ہوا تھا کہ طلبہ کا وقتاً فوقتاً طبی معائنہ ہونا چاہیے اور انھیں ضروری طبی سہولتیں حاصل ہونی چاہئیں تاکہ وہ جسمانی طور پر صحت مند رہیں۔ کیوں کہ جسمانی صحت کے بغیر دماغی کام کرنا مشکل بلکہ ناممکن ہو جاتا ہے۔ طبی امداد کی ذمہ داری قبول کرنے کے بعد اب تعلیمی درس گاہیں ذہنی صحت کی طرف توجہ دے رہی ہیں۔ بڑے بڑے تعلیمی ادارے نفسیاتی ماہرین کی خدمات حاصل کرتے ہیں، تاکہ طلبہ ذہنی صحت کے معاملے مناسب امداد دی جا سکے۔ جو مدرسے کسی ماہر نفسیات کی خدمات حاصل نہیں کر سکتے وہ یہ کام مدرسے کے ایک خصوصی طور پر تربیت یافتہ استاد کے ذمے لگا دیتے ہیں کہ وہ طلبہ کے معاشرتی پس منظر اور ان کے جذباتی رجحانات کے متعلق ایک جامع ریکارڈ تیار کرے، اور اس ریکارڈ کی روشنی میں طلبہ کے جذباتی مسائل کو حل کرے۔ اس خدمت کو "رہنمائی" یا "مشورے" کا نام دیا جاتا ہے۔ رہنمائی یا مشورے کی یہ خدمت اس اصول پر مبنی ہے کہ جذباتی طور پر بیمار طالب علم کو وعظ و تلقین کی ضرورت نہیں بلکہ اسے ضرورت اس بات کی ہے کہ وہ اپنے جذباتی طرز عمل اور اس کے حقیقی اسباب کو خود سمجھ لے اور خود ہی اس طرز عمل میں اصلاح پیدا کرنے کی کوشش کرے۔ مشیر یا رہنما کا کام محض حقیقت کا آئینہ اس کے سامنے رکھ دینا ہے تاکہ وہ اپنی مزاجی ساخت کو اپنی آنکھوں سے اس کے صحیح خدوخال میں دیکھ لے۔ رہنمائی یا مشورے کا یہ تصور بالکل نیا ہے اور اسے "بالواسطہ مشورہ" پکارا جاتا ہے۔ اضلاع متحدہ امریکہ کے بیشتر تعلیمی اداروں میں اس قسم کی

رہنمائی کا انتظام موجود ہے۔ یہ تحریک یورپی ملکوں میں بھی پھیل رہی ہے۔

راس الحکمۃ مخافۃ اللہ

جو تہذیب زندگی کی تعمیر مادی بنیادوں پر کرے، اس کے لیے ذہنی قوت کا الگ سے انتظام کرنا لازمی ہو جاتا ہے۔ مادی تہذیب کا مرکزی مفروضہ یہ ہے کہ ہر معقول آدمی ہر حالت میں اپنی بہبود کے لیے کوشاں رہتا ہے۔ وہ ہوش و حواس کے قائم رہتے ہوئے کبھی کوئی ایسا قدم نہیں اٹھاتا جو خسارہ پیدا کرنے والا ہو۔ اس معاشرے کے افراد زیادہ سے زیادہ پُر مسرت زندگی گزاریں گے۔

یہ مفروضہ مادی سرگرمیوں کے بارے میں بڑی حد تک درست ثابت ہو سکتا ہے۔ مگر اسے ذہنی صحت سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ اس مفروضے کی بنیاد یہ ہے کہ ایک عام آدمی اپنے سارے کام عقل کی رہنمائی میں انجام دیتا ہے۔ مگر انسانی طرز عمل کا معمولی سا تجزیہ کرنے سے اس مفروضے کا کھوکھلا پن ظاہر ہو جاتا ہے۔ ہمارے بیشتر افعال عقل کی رہنمائی میں نہیں بلکہ جذبات کی رہنمائی میں سرزد ہوتے ہیں۔ جو تہذیب اپنی ساری کوشش عقل و خرد اور علم و ہنر تک محدود رکھے اور جذبات کی تربیت کو اپنے دائرہ عمل سے خارج رکھے وہ مادی فراوانی کے میدان میں معجزے پیدا کر سکتی ہے۔ لیکن متوازن مزاج انسان اور سلامتیت سے بھرپور سوسائٹی پیدا نہیں کر سکتی۔ اپنی اس کمی کا تدارک کرنے کے لیے اس کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ ذہنی صحت کی دیکھ بھال کے الگ انتظام کرے۔ مغرب نے اس قسم کا بندوبست "نفسیاتی علاج" اور "بالواسطہ مشورے" کی صورت میں کیا ہے۔

تاہم یہ حقیقت اپنی جگہ ناقابل انکار ہے کہ سارے معاشرے کے لیے نفسیاتی علاج کی سہولتیں مہیا کرنا بڑا مہنگا سودا ہے۔ دنیا کے پس ماندہ یا کم ترقی یافتہ ملک جو ابھی اپنے شہریوں کے لیے معقول پیمانے پر طبی سہولتیں بھی مہیا نہیں کر سکے مستقبل قریب میں اس بات کی امید نہیں رکھ سکتے کہ قومی پیمانے پر نفسیاتی علاج معالجے کی سہولتیں بہم پہنچا سکیں۔ ہم پاکستان میں ابھی اس قابل نہیں ہو سکے کہ قوم کے سارے بچوں کو جو ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کی عمر رکھتے ہیں ابتدائی مدرسوں میں بھیج سکیں۔ جس معیشت میں اتنی سکت نہ ہو کہ اپنے ہر شہری کو خواندگی کی تعلیم دے وہ دوسری باتوں کا انتظام کس طرح کر سکتی ہے؟

لیکن اس سے یہ مراد ہرگز نہ لینی چاہیے کہ چوں کہ ہم نفسیاتی علاج معالجے کی سہولتیں وسیع پیمانے پر

فراہم نہیں کر سکتے اس لیے پاکستانی قوم کے لیے ذہنی طور پر مریض ہونا ضروری ہے۔ پیچھے ایک نیم خواندہ پاکستانی کی مثال درج کی جاچکی ہے جس کی ذہنی صحت پر مہذب ملکوں کے شہری بھی رشک کھاسکتے ہیں اس قسم کے سینکڑوں ہزاروں انسان پاکستان کے دیہی علاقوں میں بکھرے ہوئے مل سکتے ہیں۔ ان لوگوں کو نہ کسی نفسیاتی علاج کی کی سہولتیں میسر ہیں اور نہ ہی انھیں کوئی بالواسطہ مشورہ دینے والا موجود ہے جس سے مہذب دنیا کے کئی شہری محروم ہیں۔ وہ انمول دولت ہے اس کا ڈر۔

اس مضمون کے شروع میں کہا گیا تھا کہ ڈر صحت مند قسم کے بھی ہو سکتے ہیں اور غیر صحت مند قسم کے بھی۔ صحت مند قسم کے ڈر وہ ہیں جو انسان کو مستقبل کے لیے تیار کریں۔ اس قسم کے ڈروں میں اللہ کا ڈر سرفہرست ہے۔ یہ وہ ڈر ہے جو انسان کو غلط قسم کے جذبات کے چنگل سے نجات دلاکر اس کے طرز عمل کو عقل سلیم کی رہنمائی عطا کرتا ہے۔ اس سے مراد ہرگز نہیں کہ اللہ کا ڈر جذبات کی حکمرانی کو سرے سے ختم کردیتا ہے۔ جذبات اچھے بھی ہو سکتے ہیں اور برے بھی برے جذبات وہ ہیں جو انسان کو محض خود غرضی اور خود پسندی کی راہ دکھائیں۔ اچھے جذبات وہ ہیں جو انسان کو تنگ خود غرضیوں سے نکال کر اسے ہمدردی اور خدمت کے راستے پر لگائیں۔ اللہ کا ڈر دوسری قسم کے جذبات کو ترقی دیتا اور پہلی قسم کے جذبات کو ختم کرتا ہے۔

جن تہذیبوں نے اپنی بنیاد مادی کی بجائے روحانی قدروں پر رکھی ہے ان کے ہاں ذہنی صحت کا مسئلہ بڑی حد تک از خود حل ہو جاتا ہے۔ مشرق کی کم و بیش تمام تہذیبیں روحانی بنیادوں پر مبنی ہیں۔ ان کے ہاں سب سے بڑی کامیابی یا "فوز العظیم" دنیاوی مال و دولت یا جاہ و جلال نہیں بلکہ روحانی عظمت ہے۔ ان کے ہاں مادی فراوانی ہو یا نہ ہو لیکن ان کے یہاں ذہنی صحت کی فراوانی ہمیشہ رہی مثال کے طور پر تبت کو لیجیے جو "دنیا کی چھت" کے نام سے مشہور ہے۔ اس ملک کی آب و ہوا اس قدر شدید اور اس میں زندگی کی عام سہولتوں کی اتنی کمی ہے کہ باہر کے آنے والوں کو اس بات پر حیرانی ہوتی ہے کہ اس ماحول میں لاکھوں انسان جیتے کیوں کر ہیں؟ مگر اس سے بڑھ کر حیرانی انھیں اس سکون اور طمانیت پر ہوتی ہے، اہل تبت کی فطرت ثانیہ ہے۔ یہ طمانیت مذہب کی پیدا کردہ ہے جو دنیاوی علائق کو کوئی

اہمیت نہیں دیتا۔

اسلام دینِ فطرت ہونے کے اعتبار سے نہ بدھ مت کی سی رہبانیت کو انسانی زندگی کی منزل قرار دیتا ہے اور نہ مغرب کی مادی فراوانی کو۔ وہ ان دونوں کو ایک ساتھ دیکھنے کا خواہاں ہے۔ وہ ایسے انسان پیدا کرنا چاہتا ہے جن کے قوائے عمل دن رات حرکت میں ہوں۔ مگر ان کی یہ کبھی نہ ختم ہونیوالی جدوجہد ذاتی نفع کے لیے نہیں بلکہ اللہ کی راہ میں ہونی چاہیے۔ اللہ کی راہ سے مراد ملک و ملت کی بہبودی اور نوعِ انسان کی بھلائی ہے۔

بعض لوگوں نے اللہ کے ڈر کو تقدیر پرستی کے ہم معنی قرار دینے کی کوشش کی ہے۔ زندگی کا جو فلسفہ رہبانیت کو اپنی منزل قرار دیتا ہو اس کے نزدیک ممکن ہے اللہ کے ڈر کا مفہوم یہی ہو لیکن اسلام کے نزدیک اللہ کا ڈر بالکل مختلف معنی رکھتا ہے۔ اس کے نزدیک تقویٰ اس چیز کا نام ہے کہ انسان اپنی ساری قوتوں کو لگاتار تلاشِ حق اور اشاعتِ حق میں لگائے رکھے۔ ظاہر ہے کہ خوفِ خدا کا یہ مفہوم تقدیر پرستی سکھانے کی بجائے پیہم جدوجہد کا سبق دیتا ہے۔

جو شخص اپنے طرزِ عمل کو پورے طور پر اللہ کے ڈر کے تابع کر دے۔ اسلام کی اصطلاح میں اسے مومن کا نام دیا جاتا ہے۔ اس کے متعلق "المومن ینظر بنور اللہ" کا فتویٰ دیا گیا ہے۔ اس کی شرح یہی ہے کہ اللہ کا ڈر مومن کے ذہن کو غلط قسم کے جذبات سے اس حد تک پاک کر دیتا ہے کہ وہ ہر چیز کو اس کے صحیح رنگ میں دیکھنے لگتا ہے۔ جب نگاہ درست ہو جائے تو طرزِ عمل کا درست ہو جانا یقینی ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں سمجھیے کہ مومن کو بھرپور ذہنی صحت حاصل ہوتی ہے۔

ہماری اجتماعی اور انفرادی زندگی تیزی سے مغربی اثرات قبول کر رہی ہے۔ ایسا ہونا ناگزیر ہے۔ سائنس اور ٹکنالوجی کے میدان میں مغرب دنیا کا امام ہے اور پسماندہ قومیں اپنی معیشت کو جدید صنعتی بنیادوں پر تعمیر کیے بغیر اپنے چند در چند مسائل حل نہیں کر سکتیں۔ اس کام میں مغرب سے سبق حاصل کرنا زندگی کی ایک ناگزیر ضرورت ہے۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ ہم سائنس اور ٹکنالوجی کے سبقوں کے ساتھ ساتھ مغرب کا مادی اندازِ فکر بھی اختیار کیے جا رہے ہیں۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ یہ اندازِ فکر ذہنی صحت کا دشمن ہے۔ اگر ہم مغربی اندازِ فکر

اختیار کریں گے تو اس کے ساتھ لامحالہ مغرب کی ذہنی بیماریاں بھی آئیں گی۔ اور ہمیں ان بیماریوں کے لیے
علاج گاہیں بھی قائم کرنا ہوں گی۔ لیکن کیا مغربی سائنس اور مغربی انداز فکر کے درمیان چولی دامن کا ساتھ ہے؟
نہیں ہرگز نہیں۔ یہ پوری طرح ممکن ہے کہ ہم اللہ کا حدود میں رکھتے ہوئے بھی جدید سائنس اور ٹکنالوجی
سے بھرپور خدمت لیں۔ ایسا کرنے سے ہم اپنی روایتی ذہنی صحت کو بھی قائم رکھ سکتے ہیں اور مادی
فراوانی بھی پیدا کر سکتے ہیں۔ یقیناً اللہ کی منشا یہی ہے۔ آج ہمارے سامنے سب سے بڑا چیلنج یہی ہے
کہ ہم اللہ کی اس منشا کو کہاں تک پورا کرتے ہیں؟ ٭

ابن خلدون

محمد عبدالعزیز

ابن خلدون کے متعلق ہم صرف اتنا جانتے ہیں کہ وہ جدید علم تاریخ کا بانی کہلاتا ہے۔ ایک معلم کی حیثیت سے اسے جاننے اور پرکھنے کی اب تک کوشش نہیں کی گئی۔ اُردو میں اس وقت جو مواد دستیاب ہوتا ہے اس میں اس کے مقدمے کے ترجمے اور افکار ابن خلدون کو ایک مقام دیا جا سکتا ہے۔ لیکن ترجمہ زبان و بیان اور چھپائی کے لحاظ سے ناقص ہے۔ اور افکار میں اس کے نظریات تعلیم پر جو بحث کی گئی ہے، وہ اتنی ناکافی ہے کہ اس سے نہ انداز تدریس کا جائزہ لیا جا سکتا ہے۔ اور نہ طلبہ کی عمومی شخصیت کی نشوونما، ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ایک تیز دھارا ہے اور اس میں ہر چیز بہتی چلی جاتی ہے۔ اس میں ٹھہراؤ نہیں۔ کبھی کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ دو چیزیں آپس میں ٹکرا جاتی ہیں اور ان کی صورتیں اس طرح بگڑ جاتی ہیں کہ ایک محدب آئینے سے بھی نہیں پہچانی جا سکتیں۔

ابن خلدون نے علم اور تحصیل علم یعنی تعلیم و تعلم، طریق تدریس، مسائل سزا و جزا، آسان سے مشکل، اجمال و تفصیل، طلبہ کی ذہنی استعداد، صرف و نحو اور تدریس زبان، تعلیمی تدریج، تکرار اعادہ اور جائزہ وغیرہ پر جس طرح بحث کی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کل کی نہیں آج کی باتیں ہیں، ہماری اپنی، ہمارے اپنے معاشرے کی اور ہمارے مزاجی تقاضوں کے عین مطابق۔ اس کی یہ کاوش کتنی بلند اور کتنی دلکش ہے۔ جی چاہتا ہے کہ مغربی معلموں کے افکار و خیالات کے مطالعے سے پہلے اس کی باتوں کو پڑھا جائے۔ اس میں بعض باتیں ایسی بھی پائی جائیں گی جو اگرچہ خالص اصولی ہوں گی لیکن ہمارے مزاج اور ہمارے ذہنی تقاضوں سے ہم آہنگ ہوں گی۔ سیدھی سادی باتیں، سیدھے سادے انداز میں۔ اس میں نہ مغربی ڈھنگ کی جھلک ہوگی اور نہ مشرقی پندار کی نمائش۔ جو بات اپنی بولی میں کہی جائے اس کا اثر ہوتا ہے اور جو بات دوسروں کی بولی اور دوسروں کے انداز میں کہی جائے اس کا اثر ہوتا تو ہے لیکن دیرپا نہیں۔

ابن خلدون مشرقی ہے۔ اس کے آب و گل میں مشرق کا خمیر ہے۔ چنانچہ اس کے افکار و خیالات میں

ایک ایسی عقلیت اور رجائیت ہے جس سے آج مشرق کا خمیر خالی ہے۔ اس سے بعض حالتوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ عقل و خرد کی سان پر وہی چیز کھری اترتی ہے جو مغرب سے آئی ہو، مشرق کی ہر چیز فاسد ہے۔ ابن خلدون نے اگر کوئی کام کی بات کہی تو اس لیے کہ وہ مشرقی نہیں درا صل مغربی ہے۔ اور اس نے یورپ کے علوم و فنون سے استفادہ کیا ہوگا۔ یہ نظریہ غلط بینی اور غلط اندیشی پر مبنی ہے۔ ابن خلدون ایک ایسے زمانے میں پیدا ہوا اور اس نے اپنی زندگی ایک ایسے ماحول میں گذاری جو طوائف الملوکی اور انتشار کے نذر ہو چکا تھا۔ ان حالات میں اسے نہ مغربی علوم و فنون کی تحصیل کا موقع ملا اور نہ اس وقت مغرب آشنا حسین اور دلکش تھا کہ شراب علم کی لذت مشرقی بادہ خواروں کو کشاں کشاں مغربی مے خانوں میں لے جاتی۔ اس لیے اس نے جو عمرانی، تاریخی اور تعلیمی نظریے قائم کیے وہ یورپ سے مستعار نہیں۔ اس کے اپنے تجربات کی روشنی میں اس کی اپنی تخلیق ہیں۔ اگر وہ دو تین صدی پہلے پیدا ہوتا تو اس کی تصنیفات کا دوسرے عرب حکماء کی طرح لاطینی اور دوسری مغربی زبانوں میں ترجمہ ہوتا، اور مغربی افکار پر اس کا براہِ راست اثر پڑتا، اور اگر دو سو سال بعد پیدا ہوتا تو وہ خود مغرب سے فائدہ اٹھاتا۔[1]

یہ ایک عجیب بات ہے کہ موجودہ طریق تدریس نے ہمارے ذہنوں کو روشن کم کیا متعصب زیادہ بنا دیا اس سے جو فکری افلاس پیدا ہوا، اس سے صرف یہی نقصان نہیں ہوا کہ ہم نے اپنے علمی سرمائے کو طاق نسیاں رکھ دیا بلکہ ہماری نگاہیں مغربی علوم پر اس طرح جھپٹتی ہوئی پڑتی ہیں کہ ہم اوپر کی سطح سے نیچے اتر کر آب دار موتیوں کو نہیں دیکھ سکتے جو ان کی زندگی کو جگمگاتے رہتے ہیں۔ ابن خلدون، اندلس، المغرب اور مصر و شام کے ہر باغ میں پھرا، اور جو پھول اسے خوش رنگ نظر آیا اسے اپنی قبا میں ٹانک لیا اور اس سے ایک ایسا گلدستہ تیار کیا جو اس کے اپنے اجتہادِ فکر کا آئینہ دار ہے۔ ہم میں آج اس اجتہادِ فکر کی کمی ہے۔ ہم بچے کی معمولی سی انگریزی گفتگو کو اس کی حقیقی قابلیت پر محمول کر کے اس طرح خوش ہوتے ہیں جیسے کوئی گم شدہ خزانہ مل گیا ہو۔ علم اور اس کی تحصیل کا مقصد دو حرف پڑھ لینا نہیں، اس کا جاننا اور سمجھنا ہے۔ اور اگر جاننے اور سمجھنے کی اہلیت پیدا نہیں ہوتی تو مغرب کی یہ علمی سیادت بھی ان کی نوآبادیاتی سیادت کے مترادف ہوگی۔ محکوم کا جسم اور ذہن حاکم کے اشاروں کے تابع ہوتا ہے۔ اس میں فکری بلندی پیدا ہونے نہیں پاتی۔ ہم محکوم تھے اور اگرچہ

---

[1] پروفیسر ساری۔ عبدالرحمن ابن خلدون ص ۲۵

آزاد ہو چکے ہیں لیکن اس وقت ایک عبوری دور سے گذر رہے ہیں۔ غلامی کا خمار ابھی باقی ہے۔ جاگتے جاگتے اونگھ جاتے ہیں اور اونگھتے ہی اونگھتے ہر بات کا فیصلہ کر لیتے ہیں، یہ حق ہے یہ ناحق، یہ محمود ہے یہ مذموم علی ہذا القیاس

ابن خلدون پر بھی اگر ہماری نگاہیں مغرب کی عینک لگا کر پڑتی ہیں تو ہمیں اس پر تعجب نہیں ہونا چاہیے جس طرح ہماری حکومت، صنعت وحرفت اور تجارت مغرب کے فیضان کی رہین منت ہے۔ مشرقی علوم کی تحقیق وتدقیق بھی ہم نے مغرب والوں کے سپرد کر دی ہے۔ چناں چہ ابن خلدون کو مشرق نے نہیں مغرب نے دریافت کیا ہے۔ اور پچھلے سو سال سے اس کے نظریات کی تشریح کا جو کام مغرب میں ہو رہا ہے وہ ہم سے نہ ہو سکا[1] اگرچہ یہ صحیح ہے کہ عربی زبان میں بھی ابن خلدون پر چند عمدہ کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ لیکن جدید طرز فکر کے سانچے میں ڈھال کر اس کے علمی کارناموں کی تنقیح اور تجزیے کی ابھی بڑی ضرورت ہے۔

ابن خلدون کی زندگی میں انقلاب آتے رہے۔ بعض انقلاب خود اس کے آوردہ تھے اور بعض حوادث کے لیکن اس نے ہر انقلاب کے سیل کو تھاما اور تیر کر پار نکل گیا۔ وہ ایک بوقلموں شخصیت کا مالک تھا۔ کبھی منشی علامت۔ کبھی رئیس الوزارت، کبھی سفیر، کبھی معلم، کبھی فقیہہ اور کبھی قاضی تا ایں کہ زندگی کے آخری ایام میں اس کا تعلق سیاست سے کم ہوتا گیا اور خالص فقہ اور علم سے زیادہ[2]۔ اس نے اپنا مقدمہ ۱۳۷۵ء میں قلعۂ ابن سلامہ میں لکھنا شروع کیا۔ اور چار سال کی محنت شاقہ کے بعد ۱۳۷۹ء میں مکمل کر لیا[3] اس وقت المغرب کی سیاسی فضا اتنی زہرناک ہو چکی تھی کہ اس نے مصر کا عزم کیا۔

ابن خلدون ۱۳۸۲ء میں قاہرہ پہنچا اور مدرسۂ قمحیہ میں فقہ مالکی کا پروفیسر مقرر ہوا۔ لیکن ازہر، ظاہریہ، برقوقیہ اور سلطانیہ میں بھی اس کے رشحاتِ فیض سے طلبہ کی بہت بڑی جماعت فائدہ اٹھاتی رہی[4] تعلیم وتعلم کے اس مشغلے کے ساتھ ساتھ اس نے مالکی عدالت کے قاضی کی حیثیت سے بھی کام کیا لیکن قضا کا عہدہ راس نہ آیا۔ وہ کبھی معزول ہوتا اور کبھی بحال اور اسی کشمکش میں اس کی ساری زندگی گذر گئی[5]

---

[1] م۔ ع۔ عنان۔ ابن خلدون صفحہ ۱۱۲ [2] طٰہٰ حسین۔ ابن خلدون (ترجمہ عبد السلام ندوی) صفحہ ۱۔ ۴۲

[3] چارلس عساوی۔ ابن خلدون صفحہ ۶ [4] ایضاً ر صفحہ ۱۳۱

[5] ایضاً صفحہ ۱۲۔ ۲۴

اسی زمانے میں اس پر یہ مصیبت آئی اور یہ بھی گذرا کہ وہ جہاز جس میں اس کے کنبے کے تمام نفوس سوار تھے
طوفان کی نذر ہو گیا۔ اور ابن خلدون بیک وقت "دولت بیوی اور بچوں" سے محروم ہو گیا[۱]

یہ حادثہ ایک سانحۂ عظیم تھا۔ اس پر اس کا اتنا اثر ہوا کہ وہ کبھی ترک ملازمت کا ارادہ کرتا اور کبھی
ترک دنیا کا۔ یہ واقعہ ۷۸۹ھ کا ہے۔ اس کے بعد وہ اکیس برس اور زندہ رہا۔ لیکن اس کی زندگی کا یہ زمانہ بھی
اتنا ہی پرآشوب اور سیماب وار گذرا۔ مگر اس دور میں اسے تعلیم و تعلم اور درس و تدریس سے جو نسبت رہی
اس نے اسے تحریر و تقریر میں مدون کیا۔ اسے اپنے افکار و خیالات کے منطقی تجزیے کا موقع ملا حقائق کے نئے
تجربات کی روشنی میں پرانی تحریروں میں بھی قطع و برید کی ضرورت محسوس ہوئی اور اگرچہ قاہرہ کے سیال آب و ہوا
اور اس کی افتاد طبع کے اثرات اس کی اپنی زندگی پر پڑتے رہے۔ لیکن اس سے اس کے قلم کو ضعف نہیں پہنچا[۲]

اس مختصر سے مضمون میں تاریخ کی ترتیب و تدوین، اصول جہاں بانی، حکومت، سلطنت، بادشاہ، عوام
ان کے سیاسی، عمرانی اور معاشی تقاضوں سے قطع نظر جن پر ابن خلدون نے اپنے مقدمے میں مفصل بحث
کی ہے، صرف اس کے نظریات تعلیم کی تعیین کی کوشش کی جائے گی۔ اچھی تعلیم انفرادی تہذیب و تربیت اور
معاشری تعمیر و تنظیم پر کس قدر اثر انداز ہوتی ہے۔ اس کے متعلق ابن خلدون نے کیا کہا اور کس طرح کہا۔

ابن خلدون اور دور حاضر

یہ دور کہ جس میں ہم نے ایٹم بم کی تباہ کاری بھی دیکھی اور غالباً ہائیڈروجن بم اور راکٹ کے کرشمے
بھی دیکھ لیں گے۔ علوم طبیعی کی تحصیل و تکمیل کا نصف النہار ہے۔ "مسخر الشمس و مسخر القمر" کی بات جو کل تک
ناممکن نظر آتی تھی، آج ممکن معلوم ہونے لگی۔ اور اگر خدانخواستہ ہم خود چاند تک نہ پہنچ سکے تو چاند کے مناظر
کی تصویریں ضرور دیکھ لیں گے۔ ظاہر ہے کہ یہ ترقی علم اور اکتساب علم کی رہین منت ہے اور جو کچھ آئندہ ہوگا
اس میں بھی علم ہی کی عکاسی ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ اس وقت تحصیل علم پر اتنا زور دیا جا رہا ہے اور اسے
اتنا آسان بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے کہ علم کے مبادیات اور تہذیب حاضر کی میکانیت سے ہر شخص واقف
ہو جائے اور جو لوگ اعلیٰ ذہنی صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ انھیں علمی مسائل کے سمجھنے اور سمجھانے پر زیادہ

۱۔ م۔ ع۔ عنان۔ ابن خلدون ص۵۳

۲۔ چارلس عساوی۔ ابن خلدون ص۸

وف حاصل ہو جائے۔ اس مقصد کے پیشِ نظر تدریس کو زیادہ نفسیاتی، زیادہ منطقی، زیادہ مستدلال اور زیادہ
نٹیفک بنا دیا گیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس میں انسان کے انفرادی اور اجتماعی تقاضوں کو بھی بالخصوص ملحوظ
ھا گیا ہے۔

ان حالات میں کہ ہمارے ذہن دورِ حاضر کی میکانکی ترقی سے اس قدر متاثر ہیں کیا یہ ممکن ہے کہ ہم
یے ایسے آدمی کی بات بھی سننے کے لیے آمادہ ہو جائیں جس نے ازمنۂ وسطیٰ میں زندگی کا سانس لیا ہو اور پھر
بھی کہ مشرقی ہو؟ بظاہر اس کے ماننے میں تھوڑا سا تامل ضرور ہوگا۔ اس لیے کہ ہم علم کو دورِ جدید اور مغرب
راہ تک بنانے کے اس قدر عادی ہو چکے ہیں کہ جب تک اس پر مغرب اور تجدد کی چھاپ نہ ہو ہم اسے
یلم نہیں کرتے۔ قطع نظر اس سے کہ اس کی علمی حیثیت کیا ہے۔

ابنِ خلدون ان دونوں اوصاف سے خالی ہے۔ وہ انیسویں یا بیسویں صدی عیسوی میں نہیں چودھویں
مدی عیسوی میں پیدا ہوا۔ اور دانش مندانِ فرنگ کے کسی معروف گھرانے میں نہیں، ایک مشرقی عرب خاندان میں
س صورت میں کیا اس کی بات قابلِ توجہ اور قابلِ سماعت ہوگی۔ لیکن اسے میرے اور آپ کے سہارے کی
رورت نہیں۔ تعصب کی یہ دوا اس کے نظریات کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ وہ اسے پچھاڑ کر خود آپ کے ذہنوں میں
ز جائے گا۔ وہ آپ سے رحم کا نہیں انصاف کا طالب ہوگا۔ اور وہ آپ سے اپنی بات منوا لے گا
رجب آپ اس کے نظریات کا تجزیہ کریں گے تو آپ کو خود احساس ہوگا کہ نظری لحاظ سے مغرب نے
ئی نمایاں ترقی نہیں کی۔ مغرب کی فضیلت صرف ان نظریات پر عمل کرنے میں ہے اور بس۔

یہ عہد جس میں ہم زندگی کا سانس لے رہے ہیں، اتنا سریع الرفتار ہے کہ آج کی بات کل پرانی
ہو جاتی ہے۔ لیکن چراغ سے چراغ جلتا ہے۔ ایک تجربہ دوسرے تجربہ کی اساس بنتا ہے اور ذہنی اور
اری لحاظ سے دنیا آگے بڑھ جاتی ہے۔ اس کے باوجود انسانی زندگی کے بعض بنیادی اصول ایسے ہیں
، وہ ویسے کے ویسے ہی رہتے ہیں۔ اصول میں تغیر نہیں پیدا ہوتا۔ طریقِ کار میں تغیر پیدا ہو جاتا ہے۔ دعات
گچھلا کر فولاد تیار کیا جاتا ہے۔ یہ اصول ایک بنیادی اصول ہے۔ جو اس ترقی یافتہ دور میں بھی ایک اصول
ی کی حیثیت رکھتا ہے، لیکن اس کے طریقِ کار میں تغیر پیدا ہو چکا ہے۔ اب لکڑی یا کوئلے کی بجائے اسے

اسے بجلی گیس، یا جوہری توانائی سے پگھلایا جا سکتا ہے۔ بالکل اسی طرح انسانی زندگی کے بھی کچھ لابدی اعمال اصول ہیں حیات کا عمل اور ردِ عمل ایک قسم کے حالات میں ایک ہی قسم کے حالات کا حامل ہوتا ہے۔ غصہ کب کیوں، اور کس طرح پیدا ہوتا ہے۔ اس کے جو عوامل ہزار برس پہلے انسانی زندگی میں ہیجان پیدا کر دیتے تھے۔ آج بھی ہم پر اسی طرح اثر انداز ہوتے ہیں۔ انفرادی طور پر بھی اور اجتماعی طور پر بھی۔

تعلیم و تعلم کا تعلق بھی انسان سے ہے جو ایک فرد کی حیثیت سے سوسائٹی کا رکن ہوتا ہے۔ اس کی تہذیب و تربیت فی الواقع سوسائٹی کی تہذیب و تربیت ہے۔ یہ بات آج بھی اتنی صحیح ہے جتنی ازمنہ گذشتہ میں تھی۔ انسانی نفسیات بنیادی طور پر وہی ہے۔ حالات کے مطابق صرف اس کے کوائف بدلتے رہتے ہیں۔ چناں چہ ابن خلدون نے اس موضوع پر قلم اٹھایا تو فرد کی تہذیب و تربیت کے لیے اس کے پیش نظر وہ جملہ سیاقی عوامل تھے جس سے اس کا ضمیر تیار ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تعلیم اور طریق تعلیم کے متعلق اس نے جو کچھ کہا وہ جدید اور بالکل جدید ہے۔

علم کا عرفان انسانی معاشرے کے لیے فطری ہے کہ یہی چیز اسے دوسرے حیوانوں سے جدا کرتی ہے۔ یہی چیز اسے لوگوں سے اشتراک عمل، اقتصادی روابط، لین دین، اور معاشرے میں زندہ رہنے کا سلیقہ سکھاتی ہے۔ اس لیے علم کی تحصیل میں بھی دوسری صنعتی مہارتوں کی طرح انہماک اور شغف کے ساتھ عمدہ تکنیک کی ضرورت ہے۔ ابن خلدون کے اپنے الفاظ میں:

> ہر صنعت ایک ذہنی اور عملی مہارت (SKILL) ہے۔ چوں کہ عملی ہے، اس لیے اس کا تعلق جسم اور حسیات سے ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ جسمانی اور حسی مہارتیں براہ راست اتصال اور براہِ راست ارسال کی بدولت زیادہ مکمل اور جامع طور پر حاصل کی جا سکتی ہیں۔

مہارت (SKILL) ایک ایسا وصف ہے جو کسی عمل کے مسلسل تکرار کا نتیجہ ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ عمل کا تصور ذہن میں پختہ ہو جاتا ہے۔ مہارت کی برتری کا انحصار عملی نمونے کی اچھائی پر ہے جس کی نقل کی جاتی ہے۔ اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ آنکھوں دیکھی چیز کا اتباع کانوں سنی چیز سے زیادہ آسان ہوتا ہے۔ اس طرح تعلم کا انحصار معلم کی علمی فضیلت،

طریق تدریس اور طلبہ کے طبعی میلانات پر ہے [۱]

اس اقتباس سے ابن خلدون کے بنیادی نظریات کی توضیح ہو جاتی ہے۔ معلم کی علمی حیثیت کیا ہے؟ آیا فی الواقع اس میں پڑھانے کی اہلیت ہے اور اگر ہے تو وہ کس طرح پڑھاتا ہے۔ تعلم کا انسانی نفسیات سے کیا تعلق ہے۔ ذہنی پختگی کے لیے تکرار کی کیوں ضرورت ہے۔ اور جو چیز انسان اپنی آنکھ سے دیکھتا ہے اور محسوس کرتا ہے اس سے تعلم میں کیا آسانیاں ہو جاتی ہیں۔ اس قسم کے سوالات کو ذہن میں رکھ کر ابن خلدون اپنے تعلیمی نظریات کی تشریح کرتا ہے اور ایک بالغ نظر طبیب کی طرح نبضوں کو ٹٹولتا ہے۔ مرض کی تشخیص کرتا ہے اور پھر اس کا علاج بھی بتاتا ہے۔

فکر اور علم

ابن خلدون علم کو فکر کی حرکت کا نتیجہ بتاتا ہے [۲]۔ اگر فکر کی حرکت نہ ہو تو علم علم نہ رہے، بلکہ کوئی ایسی چیز بن جائے جس میں محض جمود اور تعطل ہو، اسی لیے اسے فکر کی مشق پر اس قدر اصرار ہے۔ اس نے انسانی فکر کو تین درجوں میں تقسیم کیا ہے۔ تمیز، تجربی اور نظری۔ تمیز جس سے وہ مختلف باتوں میں تمیز کر سکتا ہے ہر مسئلے کو اپنے اپنے خانے میں رکھتا ہے۔ انھیں گڈمڈ نہیں کرتا لیکن اس کے آگے یہ اس کی رہنمائی نہیں کرتی۔ تجربی فکر کی دوسری منزل ہے۔ اس میں انسان صرف تمیز ہی نہیں کرتا، بلکہ ہر مسئلے کا اس طرح تجزیہ کرتا ہے کہ اس کی باریکیوں کا جائزہ لے کر اس کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کے بعد جو نتائج مرتب ہوتے ہیں ان کے تسلیم کرنے میں اسے کوئی تامل نہ ہوگا۔ فکر کا تیسرا درجہ نظری کہلاتا ہے اور یہ فکر کی زیادہ ترقی یافتہ اور منظم شکل ہے، جو انسان کو آگے اور بہت آگے لے جاتی ہے۔ اب وہ صرف ایک مسئلے کا تجزیہ کر کے اس کے نتائج کی ترتیب ہی پر خوش نہیں ہوتا۔ بلکہ اس پر مزید غور و خوض کرتا ہے اور اس کے اسباب و علل کا جائزہ لیتا ہے۔ اور پھر یہ دیکھتا ہے کہ ہماری زندگی اور ہمارے معاشرے پر اس کا کیا اثر پڑتا ہے۔ فکر کے اسی فاعل کا نام علم ہے۔ ابن خلدون کے خیال میں یہ فکر صرف شہری اور متمدن آبادی میں پیدا ہو سکتی ہے۔ بدوی قبائل اس فکر کی لذت سے محروم رہتے ہیں [۳]

---

[۱] ابن خلدون، مقدمہ جلد دوم صفحہ ۳۴۴
[۲] ایضاً۔ المقدمہ ص ۳۵۸
[۳] طٰہٰ حسین، ابن خلدون (ترجمہ عبدالسلام ندوی) صفحہ ۲۲۶ - ۲۲۸

اقسام علوم

فکر ہی علم کی اساس ہے اور وہ مختلف علوم کو دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔ ایک علوم دینیہ (نقلیہ) اور دوسرا علوم فلسفیہ جیسا۔ علم کی یہ دونوں قسمیں ہر ملک اور ہر قوم کے لیے ضروری ہیں اور ہر زمانے میں ان کی ضرورت رہی ہے اور ان دونوں میں ایک قسم کا توازن پیدا ہو جائے تو ہماری بہت سی الجھنیں دور ہو جائیں۔ مادی ترقی کی راہ میں انسان اکثر انسان نہیں رہتا۔ وحشی اور خون خوار بن جاتا ہے اور پھر اس کا رد عمل یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ انسان آدمی ہی سے اپنا منہ چھپا لے اور کسی گوشے میں بیٹھ کر ہو حق کرتا رہے۔ یہ دونوں کیفیتیں اس توازن کے فقدان کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ آج ہم ان دونوں کو اپنی زندگی سے اس طرح ہم آہنگ بنانا چاہتے ہیں کہ ہماری متوازن شخصیتوں میں دونوں کا گنگا جمنی رنگ جھلکتا ہو۔ اتنی مادی ترقی کے باوجود ہمیں آج بھی سکون قلب کے لیے دین اور مذہب کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اور یہ چیز صرف دین اور دنیا کی صحیح تعلیم کی بدولت میسر آ سکتی ہے۔

علوم فلسفیہ کا تعلق انسانی ذہن سے ہے[1]۔ اس میں سوچنے کی کتنی اہلیت ہے۔ ان علوم کے مختلف مسائل استدلال اور طریق تدریس پر وہ اپنی اہلیت کے مطابق غور و خوض کرتا ہے اور اس کا اپنا ذہن اس سلسلہ میں اس کی رہنمائی کرتا ہے۔ اور اس طرح کہ وہ صحیح اور غلط میں تمیز کر سکے۔ حق اور ناحق میں امتیاز قائم کر سکے اس کے بعد وہ ایک فیصلہ کرتا ہے جو تمام تر اس کی تحقیق کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اور چوں کہ علم فکر کی حرکت سے پیدا ہوتا ہے۔ اس لیے علم بھی جامد نہیں متحرک ہے اور ایسا متحرک کہ آگے بڑھتا رہتا ہے۔ ایک منزل کی آگہی اسے دوسری منزل تک لے جاتی ہے اور پھر یہ سلسلہ منقطع نہیں ہوتا۔

ابن خلدون نے علوم فلسفیہ یا عقلیہ کو پہلے چار حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ اور پھر ہر جز کی مختلف شاخوں پر سیر حاصل بحث کی ہے[2]۔

---

[1] روزنتھال۔ مقدمہ ج ۳ ص ۴۳۲

[2] روزنتھال۔ مقدمہ۔ جلد دوم اور سوم۔ باب ششم (۱ – ۳۲)؛
جلد دوم ص ۴۱۱ – ۴۶۳ اور جلد سوم ص ۱۰۳ – ۴۸۰
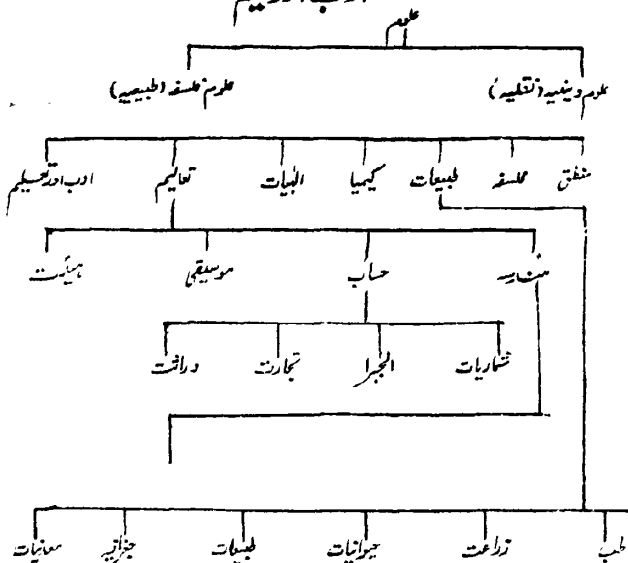
ادب اور تعلیم

لیکن چوں کہ اس مضمون کا مقصد ابن خلدون کے طریق تعلیم کا تجزیہ ہے، اس لیے مختلف علوم کا محض ایک خاکہ پیش کر دیا گیا ہے اور تعلیم و ادبیات سے متعلقہ مضامین کا مفصل تجزیہ کیا گیا ہے ÷ (مسلسل)

نئی جمہوریت اور معاشرتی فلاح

ڈاکٹر عبدالرؤف

مسلمانوں نے تہذیب و تمدن اور انسانی فلاح و بہبود کے لیے جو بیش بہا خدمات سرانجام دی ہیں، تاریخ میں انھیں سنہرے حروف سے لکھا جاتا ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں نے بھی اس سلسلے میں بہت تعمیری کام کیا ہے۔ آج سے بارہ برس پہلے ہندوستانی مسلمانوں نے اپنی تہذیب و تمدن کو بچانے اور قوم کو ترقی کی راہ پر گامزن کرنے کے لیے ایک تاریخی جدوجہد کی تھی۔ اس جدوجہد میں ہزاروں لوگوں کو اپنی جانوں سے ہاتھ دھونا پڑا۔ بے شمار لوگ بے خانماں ہو گئے۔ بالآخر مسلمانوں کو اپنی محنت کا پھل ملا اور ایک نیا اسلامی ملک پاکستان قائم ہو گیا۔

انقلاب سے پہلے جمہوریت کی گت

لوگوں کا خیال تھا کہ پاکستان بننے کے بعد اس خطے کے مسلمانوں کو اپنی تہذیب و تمدن کو فروغ کا موقع ملے گا صنعت و حرفت ترقی کرے گی تعلیم عام ہو جائے گی۔ اور ملک کی معاشرتی حالت سدھر جائے گی۔ بدقسمتی سے عوام کی یہ توقعات نہ صرف غلط ثابت ہوئیں بلکہ قائداعظم ؒ اور قائدِ ملت کی بے وقت وفات کے بعد ملک میں ہر قسم کی برائی بڑھنے لگی۔ سیاسی دھڑے بندیاں۔ گروہوں کے توڑ جوڑ اور انتخابات میں گڑبڑ کا رواج اس قدر عام ہو گیا کہ لیڈروں پر عوام کا اعتماد بالکل جاتا رہا۔ انقلاب سے پہلے زمانہ میں ہم نے جمہوریت کی جو گت بنا رکھی تھی اس کے متعلق صدر فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں کے الفاظ کس قدر صحیح ہیں، آپ نے فرمایا تھا کہ آدمی کا ضمیر کیسا ہی کیوں نہ ہو دو باتیں اس کے لیے بڑی مشکل ہوتی ہیں۔ مذہب کی تبدیلی اور جماعت سے علیحدگی۔ لیکن اسمبلیوں میں ہمارے عام نمائندے ایک جماعت سے دوسری جماعت میں شامل ہوتے رہے اور نہ انھیں روحانی اذیت ہوتی تھی نہ ذہنی کوفت۔ یہ تھا وہ طریقہ جس پر پاکستان میں اسلام کے مقدس نام پر جمہوریت چلائی جا رہی تھی۔ اسی کے

نتیجہ کے طور پہ اخلاقی اقدار ہی نہیں بلکہ طبعد خیالات بھی جو ہمارے سدیوں اور تمدن کی پیداوار ہیں ختم ہو گئے تھے۔ ہر
میں اقربا پروری، رشوت ستانی، ذخیرہ اندوزی، چور بازاری اور سمگلنگ کو پھلنے پھولنے کا موقع مل جانا بالکل بد
امر تھا۔ ان باتوں کا مجموعی نتیجہ یہ نکلا کہ عوام کے لیے جینا دوبھر ہو گیا۔ اور ملک کے لیے ترقی کے تمام راستے بند ہو

یاک داتائے راز آید بروں

اتفاق کی بات سمجھیے یا بکیس لوگوں کی دعاؤں کا نتیجہ کہ ہماری فوجوں کے ایک کہنہ مشق جرنیل میں قومی خدمت
جذبہ اس قدر غالب آگیا کہ انھوں نے اس کہرام اور انتشار کے خلاف علم جہاد بلند کرنے کی ٹھان لی۔ اُن کی
تبینہ روز کاوشوں کا نتیجہ ایک ایسے ہمہ گیر انقلاب کی صورت نکلا جس نے سارے وطن کی کایا پلٹ دی۔ ا
عظیم انقلاب کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ یہ ایک بے انتہا خوش گوار طریق سے رونما ہوا۔ جانی نقصان تو کیا
کوئی آدمی زخمی تک بھی نہ ہوا۔ انقلاب کے فوراً بعد سیاسی، معاشرتی۔ اقتصادی اور انتظامی گڑبڑ ایسے غائب
ہو گئی جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ یہ تاریخی انقلاب آئے ابھی ایک سال ہی گذرا ہے۔ مگر ہم نے اس
قلیل مدت میں جو حیرت انگیز ترقی کر لی ہے اس پر نہ صرف ہمیں خود حیرانی ہوتی ہے بلکہ دنیا کے دوسرے
ممالک انگشت بدنداں ہماری طرف دیکھ رہے ہیں۔

جمہوریت کا قیام اور بحالی

مگر انقلاب کا مقصد محض ملک کا بکھرا ہوا شیرازہ درست کرنا ہی نہیں تھا۔ بلکہ انقلاب کے بانی
دلی خواہش اس ملک میں جمہوریت کی بحالی اور معاشرتی فلاح و بہبود کے منصوبوں کو عملی جامہ پہنانا
تھا۔ چناں چہ انقلاب کے فوراً بعد اپنی پہلی تقریر میں فیلڈ مارشل محمد ایوب خان نے قوم کو خطاب کرتے
ہوئے فرمایا تھا "میں بالکل واشگاف الفاظ میں اس بات کا اعلان کر دینا چاہتا ہوں کہ ہمارا اصل مقصد
ملک میں جمہوریت کا قیام و بحالی ہے۔ مگر یہ جمہوریت ایسی ہونی چاہیے جو ہمارے عوام کی سمجھ میں آسکے
اس سے وہ کام لے سکیں۔ چناں چہ جون ۱۹۵۹ء میں بنیادی جمہوریتوں کا اعلان کر دیا گیا۔

یونین کونسل اور اس کا دائرہ عمل

بنیادی جمہوریت ہمارے لیے بہترین نظام کار ہے۔ جمہوریت کے اس طریقہ کے مطابق ہر بالغ

ووٹ دینے کا حق حاصل ہوگا۔ اسی طرح ہر شخص کو انتخابات میں حصہ لینے کی آزادی ہوگی۔ گاؤں اور شہر میں رہنے والے ہر ایک ہزار افراد اپنا ایک ایسا نمائندہ منتخب کریں گے جس کے متعلق انھیں ذاتی یقین ہوگا کہ اُس میں اُن کی ترجمانی کرنے اور ان کی زندگی سنوارنے کی صلاحیتیں موجود ہیں۔ اس قسم کے دس افراد کا چناؤ ہو جانے کے بعد اُن کی ایک انتظامی مجلس، یا پنچایت بن جائے گی، جیسے یونین کونسل کا نام دیا گیا ہے یونین کونسل کی تشکیل رقبہ یا علاقہ کی بنا پر نہیں، بلکہ افراد پر ہوگی۔ یعنی اگر ایک بڑے علاقہ میں کل آبادی فقط دس ہزار ہو اور اتنی ہی آبادی ایک مقابلۃً چھوٹے علاقہ میں ہو تو دونوں علاقوں سے دس دس نمائندے منتخب ہوں گے۔

یونین کمیٹی میں دس منتخب شدہ نمائندوں کے علاوہ حکومت عوام ہی میں سے پانچ اور نمائندے نامزد کرے گی۔ یہ نامزد ممبر علاقہ کے ایسے قابل افراد ہوں گے جو کسی وجہ سے الیکشن میں حصہ لینے سے ہچکچاتے ہوں مگر ان کی علمی یا فنی صلاحیتوں کے پیش نظر یونین کمیٹی میں ان کی موجودگی عوام کے مفاد کے لیے بہتر سمجھی جاتی ہو۔ یونین کمیٹی گویا کل پندرہ ممبروں پر مشتمل ہوگی۔ اسے اپنے علاقے کے تمام مسائل حل کرنے کا اختیار ہوگا۔ اور اسے اس سلسلہ میں پورا سرکاری تعاون حاصل ہوگا۔

سابقہ اور موجودہ جمہوریتوں کا موازنہ

معاشرتی نقطہ نگاہ سے یونین کونسل کی تشکیل دو پہلوؤں سے اس نام نہاد جمہوریت سے بدرجہا بہتر ہے جو انقلاب سے پہلے ہمارے سر پر تھوپی گئی تھی۔ اول یہ کہ اس میں انتخاب کا طریق خالص جمہوری ہے، دوم اس میں نامزد افراد کی شمولیت کی وجہ سے علمی، فنی اور انتظامی امور سے متعلق کج بحثوں، بیہودہ خیالات اور غلط فیصلوں کا امکان بہت کم رہ جاتا ہے۔ انتخابات کے پہلے نظام میں یہ بات عموماً دیکھنے میں آتی تھی کہ اکثر حلقوں سے جو امیدوار اکثریت سے کامیاب ہوتے تھے۔ ان کے ووٹوں کی تعداد اپنے مخالف امیدواروں کے ووٹوں کی مجموعی تعداد سے کہیں کم ہوتی تھی۔ مثلاً اگر ایک دس ہزار بالغوں پر مشتمل حلقہ کی ایک جگہ کے لیے چار افراد امیدوار ہوں اور الف کو ۲۵۰۰ ب کو ۲۰۰۰ ج کو ۲۵۰۰ اور د کو ۱۵۰۰ ووٹ ملیں اور الف کامیاب ہو جائے تو اسے اس علاقے کا صحیح نمائندہ کہنا زیادتی ہوگی۔ کیونکہ دس ہزار ووٹوں کی مجموعی

تعداد سے اسے ۲۵۰۰ ووٹ ملے۔ اس کے برعکس ۶۵۰۰ افراد نے اس کے خلاف ووٹ ڈالے

بنیادی جمہوریتوں میں اس ناقص سسٹم کو بالکل ختم کر دیا گیا ہے۔ نئے نظام میں گاؤں اور شہر کی ہر آبادی ہزار افراد کو اپنا نمائندہ منتخب کر سکے گی، جسے ان کے ووٹوں کی حمایت حاصل ہو۔

نامزد نمائندوں کا فلسفہ

اس بنیادی فائدہ کے علاوہ اچھے ہوئے نامزد افراد کی شمولیت سے یونین کمیٹیاں سابقہ جمہوری نظام سے بدرجہا بہتر اور مفید ثابت ہوں گی۔ فرض کیجیے کہ ایک علاقے میں سیلاب کی روک تھام یا پرائمری تعلیم پر بحث ہو رہی ہے۔ اگر کوئی منتخب رکن ایسا نہ ہو جسے ان مسائل سے نپٹنے پر فنی تجربہ اور تربیت حاصل نہ ہو تو اس علاقہ کی مشاورتی جماعت کے فیصلوں میں نقائص اور اغلاط کا واقع ہو جانا یقینی ہے۔ مگر یونین کمیٹیوں میں اس بات کا خلا جو پیدا ہو سکتا ہے پر کر دیا گیا ہے۔ اول تو ایسے افراد ہی منتخب ہو سکیں گے جو اپنے علاقہ کے اہم امور سے واقفیت اور واقفیت رکھتے ہوں، لیکن اگر اس قسم کے باخبر لوگوں نے کسی وجہ سے انتخابات میں حصہ نہ لیا ہو تو حکومت انھیں نامزد کر کے علاقہ کے لوگوں کو ان کی خدمات اور قابلیت سے استفادہ کرنے کا موقع بہم پہنچائے گی۔ اس طرح یونین کمیٹی صحیح معنوں میں اپنے علاقہ کے عوام کی نمائندہ بھی ہو گی اور ان کے روزمرہ مسائل حل کرنے کی اہل بھی۔

اس حقیقت میں قطعی شبہ نہیں کہ ہمارا سابقہ نظام معاشرتی بہبود کے امور سے متعلق تغافل ہی نہیں برتتا تھا، بلکہ کافی حد تک اس کے نااہل بھی تھا کیوں کہ اس کی بنا غیر صحت مند سیاست پر رکھی گئی تھی۔ اس کے برعکس بنیادی جمہوریت ایک ایسا نظام ہے جس کی بنا ہی معاشرتی فلاح و بہبود پر استوار کی گئی ہے۔ ہر ایک ہزار کی آبادی کو ایک نمائندہ منتخب کرنے اور پندرہ نمائندوں کو ایک یونین کمیٹی کی صورت دے دینے کا اہم ترین مقصد یہ ہے کہ ہر علاقے میں ایک ایسی چھوٹی سی مجلس بنا دی جائے جو اپنے علاقے کے روزمرہ امور کو اچھی طرح سمجھ سکے اور لوگوں کی زندگی سنوارنے کے لیے مناسب عملی اقدام اٹھا سکے۔ چناں چہ بچوں کی تعلیم و تربیت، صحت و صفائی کا اہتمام، سڑکوں کی تعمیر، جرائم کا انسداد، امن اور نظم و نسق کی بحالی، حتیٰ کہ چھوٹے موٹے دیوانی اور فوجداری مقدموں کا فیصلہ کرنا بھی یونین کمیٹیوں کے اختیار میں ہو گا۔

جمہوریت کی مخروطی تشکیل

یونین کمیٹی کثرت رائے سے اپنا صدر منتخب کرے گی۔ تمام یونین کمیٹیوں کے صدر ایک بڑی مجلس کے رکن بن جائیں گے، جسے مغربی پاکستان میں تحصیل کونسل اور مشرقی پاکستان میں تھانہ کونسل کہا جائے گا۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے۔ اس مجلس کا عمل دخل زیادہ وسیع علاقہ تک ہوگا۔ اس کا دائرہ عمل بھی نسبتاً وسیع ہوگا۔ اسی طرح چند تحصیل اور تھانہ کونسلوں کو ملا کر ایک ڈسٹرکٹ کونسل بنے گی اور چند ڈسٹرکٹ کونسلوں کے مجموعہ کا نام ڈویژنل کونسل رکھا جائے گا۔ بنیادی جمہوریت کی یہ مخروطی تشکیل ہی بذاتِ خود عوامی بہبود کی ضامن ہے۔ اس نظام میں جمہوریت اوپر سے نیچے مسلط ہونے کی بجائے، نیچے سے اوپر کی طرف بتدریج چڑھتی ہے۔ کسی مرحلہ پر بھی عوام پر کوئی چیز ان کی مرضی کے خلاف تھوپی نہ جا سکے گی۔ بلکہ جمہوریت کے ہر مرحلہ پر ہر کام براہِ راست ان کے اپنے ہاتھوں میں ہوگا۔ معاشرتی فلاح و بہبود کا بنیادی اصول بھی یہی ہے کہ لوگوں کو اپنے روزمرہ معاملوں کا حل خود ڈھونڈنے کے قابل بنا دیا جائے۔ اس پہلو سے دیکھا جائے تو بنیادی جمہوریت گویا معاشرتی فلاح و بہبود کا دوسرا نام ہے۔

ہمارے اہم معاشرتی مسائل

انتخابات ختم ہونے اور مختلف بنیادی جمہوریتوں کے تشکیل میں آنے کے فوراً بعد ان تمام مجلسوں کے سامنے معاشرتی فلاح و بہبود کے چند بنیادی منصوبے ہوں گے، جن پر فوری غور و فکر اور عمل شروع ہو جائے گا۔ ہمارے چند اہم معاشرتی مسائل جن کی طرف بنیادی جمہوریتوں کی خصوصی توجہ مرکوز ہونے والی ہے یہ ہیں۔

اول : غربت

دوم : بیماری

سوم : جہالت

مقامِ افسوس ہے کہ ہمارے ہاں افلاس اور غربت بہت ارزاں ہے۔ ایسے لوگوں کی کمی نہیں جنھیں معقول غذا مناسب لباس اور موزوں رہائش میسر نہیں آتی۔ کم آمدنی کی وجہ سے ہمارا معیارِ زندگی بھی بہت پست ہے۔ ایک جمہوری ریاست میں بھوک اور غربت اس قدر عام نہیں ہونی چاہیے۔ یہ امر باعث مسرت ہے کہ ..

انقلاب کے بعد حالات نے بڑی تیزی سے بدلنا شروع کر دیا ہے۔ غربت کے خلاف جنگ لڑنے اور عوام کا معیار زندگی بہتر کرنے کے لیے حکومت نے بہت موثر اور کامیاب محاذ قائم کر لیا ہے۔ مگر یہ ذمہ داری محض حکومت ہی کی نہیں ہوا کرتی۔ غربت کو ختم کرنا ہم سب کا سانجھا فرض ہے۔

غربت پھیلانے والے معاشرہ دشمن عناصر

اگر غور سے دیکھا جائے تو کسی معاشرے میں غربت کا وجود کافی حد تک چند خود غرض اور سفاک افراد کی سیاہ کاریوں کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اکثر حالات میں یوں ہوتا ہے کہ چند معاشرہ دشمن عناصر صنعت و حرفت اور تجارت میں چور بازاری، ذخیرہ اندوزی، منافع بازی اور سمگلنگ وغیرہ کو فروغ دینے کا ذمہ دار بنتے ہیں، وہ اپنے خود غرض مشاغل سے ملک میں ایسے ناساز گار حالات پیدا کر دیتے ہیں جس سے عوام مہنگائی اور نایابی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ان کی زندگی طرح طرح کی تلخیوں کا شکار رہنے لگتی ہے۔ اگر دکاندار، تاجر اور کارخانہ دار اس قسم کی خلاف معاشرہ حرکات سے اجتناب کریں تو غربت کا کافی حد تک انسداد ہو جاتا ہے۔ انقلابی حکومت نے جس تدبر اور معاملہ شناسی سے اس ناز یبا حرکت کے خلاف جنگ لڑی ہے اور اتنی قلیل مدت میں جس قدر کامیابی حاصل ہوئی ہے، اس کی نظیر نہیں ملتی۔ مگر اس سلسلہ میں مکمل کامیابی اسی صورت ممکن ہے جب ہر شہری ایسی اور اس قسم کی دوسری خلافِ معاشرہ حرکات کا قلع قمع کرنے کے لیے اپنی اپنی حیثیت اور قابلیت کے مطابق موثر اقدام اٹھانے کا تہیہ کر لے۔ بنیادی جمہوریتوں کی تمام مجلسوں کے سامنے اہم ترین مسئلہ یہی ہوگا کہ ملک کو غربت کے چنگل سے نجات کیسے دلائی جائے اور عوام کے معیار زندگی کو بلند کیسے کیا جائے۔

ان خلاف معاشرہ حرکات کے علاوہ کئی اور عناصر بھی ہمارے عوام کی مالی بے کسی کا سبب بنے ہوئے ہیں۔ مثال کے طور پر ہمارے مادی ذرائع کی کمی یا ان کی موجودگی سے متعلق ہماری لاعلمی، صنعتی پستی کی وجہ سے کارخانوں کی تعداد کا کم ہونا اور کم لوگوں کو کام میسر آنا، فنی اور سائنسی تعلیم اور معلومات کی کمی، محنت اور استقلال کا فقدان۔ عورتوں کا مناسب اقتصادی مشاغل میں حصہ نہ لینا۔ وغیرہ وغیرہ۔ نئے جمہوری نظام میں گاؤں اور شہر کی تمام آبادیوں کو ان مسائل کے حل کے لیے وافر سہولتیں بہم پہنچا دی گئی ہیں۔ بلکہ یہ کہنا بالکل بجا ہوگا کہ بنیادی جمہوریتوں کو اسی غرض کے لیے قائم کیا جا رہا ہے۔

جسمانی اور ذہنی بیماریاں

ہمارے ہاں طرح طرح کی جسمانی اور ذہنی بیماریوں کو بہت آسانی سے پھیلنے کے مواقع مل جاتے ہیں مثال کے طور پر تپ دق کو ہی لے لیجیے۔ ہمارا کوئی گاؤں، قصبہ یا شہر ایسا نہیں جو اس موذی مرض کی زد سے محفوظ ہو۔ بے شمار لوگ اس منحوس مرض کا شکار ہو کر اپنے خاندان اور معاشرہ دونوں کے لیے وبال جان بن جاتے ہیں۔ اسی طرح کئی دوسری بیماریاں بھی ہم میں بہت عام ہیں۔ بیماری کے عام ہونے کے علاوہ ہمارے ہاں صحت کا عمومی معیار بھی ترقی یافتہ ملکوں کی نسبت کافی پست ہے۔ صحت کا معیار پست ہونے اور بیماریوں کے پھیلنے کے اسباب بے شمار ہیں مثلاً غربت، صحت و صفائی کے بنیادی اصولوں سے غفلت یا لاعلمی بیماری کے علاج سے ناواقفیت، مستند ڈاکٹروں اور ہسپتالوں کی کمی، دوائیوں کا فقدان یا مہنگائی، رہنے سہنے اور کام کاج کے ناقص طریقے وغیرہ۔ نئے جمہوری نظام میں عوام اور حکومت نے بیماری پھیلانے والے ان تمام عناصر کے خلاف ایک متحدہ محاذ قائم کرنا ہے۔ اور یہ محاذ یونین کمیٹیوں کے ذریعے سے ایک نہایت باضابطہ اور موثر شکل اختیار کر جائے گا۔

جہالت کی انواع

ہمارے عوام کی ایک بھاری تعداد جہالت کا شکار بھی ہے۔ جہالت کی ایک بڑی نوع ناخواندگی ہے ہمارے ہاں خواندگی کی شرح فی صد بیس کے لگ بھگ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر ایک سو افراد میں سے اسّی کسی قسم کی کوئی تحریر پڑھنے اور سمجھنے سے قطعی قاصر ہیں۔ ملک کی یہ ناخواندہ اکثریت ہماری معاشرتی ترقی میں بہت رکاوٹ ڈال رہی ہے۔ نئے جمہوری نظام کی ہر مجلس زیادہ سے زیادہ مدرسے کھولنے، تعلیم بالغاں کو ملی تحریک کی صورت دینے اور روزمرہ معلومات کا چرچا کرنے والے منصوبوں کو مقدم اہمیت دے گی۔

جہالت کی ایک اور نوع بری رسومات ہیں جو معاشرتی ارتقا میں بہت بری طرح حائل ہیں۔ شادی بیاہ اور جنم و مرگ کے موقعوں پر ہم لوگ جس بے دریغی سے روپیہ خرچ کرتے ہیں، اس سے ہمارے اسراف بے جا کا ثبوت ہی نہیں ملتا، بلکہ یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ ہم اپنے خوشی اور غمی کے موقعوں کو فضول رسموں کی نذر کر کے جہالت کے مرتکب ہوتے ہیں۔

آبادی، ذرائع اور جہالت

اسی طرح ہماری زندگی کے کئی اور شعبے ایسے ہیں جن میں جہالت اور کم علمی نے ہنگامے برپا کیے ! مثال کے طور پر خاندانی منصوبہ بندی ہی کو لے لیجیے۔ اس سمت میں ہمارے عوام کا علم بہت کم اور بہت سا ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اکثر غریب گھرانوں میں بچوں کی تعداد اور مادی آسائشوں میں اس قدر تفاوت جاتی ہے کہ سارے گھر کی زندگی اجیرن ہو جاتی ہے۔ آبادی میں بے معنی اضافہ سے معاشرہ بھی طرح طرح کے نقصان اٹھاتا ہے کیوں کہ اس کے محدود ذرائع بڑھتی ہوئی آبادی کی متنوع ضروریات کو پورا کرنے کے کفیل نہیں ہوتے۔ اس کے علاوہ روزمرہ ضروریات، فالتو وقت کا مناسب استعمال معقول تفریح، مناسب شمولیت، بچوں کی دیکھ بھال، کام کاج کے سلیقہ وغیرہ سے متعلق اکثر لوگ استعدر نا واقفیت کا شکار ہوتے ہیں کہ اسے بھی جہالت کی ایک نوع کہا جا سکتا ہے۔

جہالت کی یہ تمام اقسام انسانی بہتری کے لیے سم قاتل ہیں۔ نئے جمہوری نظام میں ان تمام برائیوں کے خلاف متعدد محاذ کے منصوبے تیار کر لیے گئے ہیں۔ بنیادی جمہوریتوں کا مقصد لوگوں کی زندگی کے تمام شعبوں میں خاطر خواہ تبدیلیاں لانا ہے۔ انقلابی حکومت نے اس تعمیری کام کا آغاز پہلے ہی کر دیا مگر اس شروع کیے ہوئے کام کی صحیح تکمیل بنیادی جمہوریتوں کے قیام اور ان کے صحیح عمل سے ہی ہو

ہمارا مقدس فریضہ

ہمارا فرض اب بڑی سرعت سے ترقی کی مختلف منزلیں طے کرتا چلا جا رہا ہے۔ ترقی کی رفتار کو تیز کرنے کے لیے ہم سب پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ ہم جمہوریت کے اس تعمیری نظام کو کامیاب بنانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کریں جس میں انسان اور اس کی بہتری کو مقدم قرار دیا گیا ہے ٭

تدریسی امدادیں

محمد حسین

قدرت نے انسان کو اس کی فلاح و بہبود کی خاطر کئی ایک حسوں سے نوازا ہے، جن میں سننے، دیکھنے، چکھنے، چھونے اور سونگھنے کی حسوں کو اولیت حاصل ہے۔ اور انسان کو ان کی موجودگی سے چھوٹے بڑے میں فرق، رنگ دار و بے رنگ میں تمیز، تازہ، باسی اور بدبودار چیزوں میں فرق، کھٹے میٹھے اور کڑوے ذائقوں میں پہچان کرنے میں سہولت ملتی ہے۔ ماسوائے چند ایک کے یہ تمام حسیں ہر فرد میں پائی جاتی ہیں۔

دماغی اور فکری قوتوں کی اساس دراصل انہی بنیادی حسّوں پر رکھی ہوئی ہے۔ بالیدگی خیال اور تازگی دماغ کے لیے ان بنیادی حسّوں کا استعمال نہ صرف سودمند ہے، بلکہ روح پرور بھی۔ دل کش نظارہ دیکھ کر کون خوش نہیں ہوتا؟ موسیقی کے وجد آور سروں اور کیف بخش دھنوں سے مستفید ہونے کے لیے کس کا جی نہیں چاہتا؟

علم التعلیم نے سننے اور دیکھنے کی حسّوں سے بالخصوص اور دیگر سے بالعموم دوران تدریس سبق کی افادیت بڑھانے کے لیے پورا فائدہ اٹھایا ہے۔ اندھے، بہرے اور گونگے طلبہ کی کسی ایک حس کی عدم موجودگی میں دوسری حسوں مثلاً دیکھنے کی بجائے چھونے کی حس، سننے کی بجائے دیکھنے اور چھونے کی حسّوں کو کام میں لایا گیا ہے۔

عام طور پر سننے اور دیکھنے کی حسیں ہی زیادہ تر سبق کو عام فہم بنانے کے لیے بطور مددگار کے استعمال کی جاتی ہیں۔ عہد متقدمین تدریس کا دار و مدار صرف لیکچر دینے پر ہی سمجھا جاتا تھا، لیکن عہد حاضر میں ان دونوں خاصیتوں پر مبنی بہت سا ساز و سامان تیار کر لیا گیا ہے، جن کی امداد کے بغیر سبق کو تسلی بخش نہیں سمجھا جاتا جن کی ایک مختصر فہرست صفحہ ۵۵۵ پر درج کی جا رہی ملاحظہ ہو

۱ - چارٹس . ترسیمات

۲ - کتب ، رسائل و اخبارات

۳ - گراموفون

۴ - جادو کی لالٹین .

۵ - ایپی ڈائی اسکوپ

۶ - ریڈیو اور ٹیلی ویژن

۷ - فلمیں اور سلائڈیں .

چارٹس اور ترسیمات

سبق کے دوران چارٹس کی اہمیت کو ایک خاص مقام حاصل ہے . چارٹس مختلف قسم کے ہوتے ہیں . تاریخ کی تدریس کے لیے تاریخی چارٹس تیار کیے جائیں ، تاریخی دور کے مشہور واقعات ترتیب سے درج ہوں . بادشاہوں اور مشہور زمانہ ہستیوں کے حالات و واقعات سمیت اگر چارٹس میں ان کی تصاویر کو بھی شامل کر لیا جائے تو چارٹس اپنی صوری خصوصیت کی بنا پر طلبہ میں نہ صرف ذوق پسندیدگی ہی پیدا کرنے کا باعث ہوں گے بلکہ تاریخ جیسے خشک مضمون کہا جاتا ہے ، میں دل چسپی پیدا کر کے نوجوان طالب علموں کی طبع نازک پر بار گراں بننے کی بجائے آسان اور سہل پیرایوں میں سمجھانے کے قابل بھی ہوں گے . سکندر اعظم کے ہندوستان پر تاریخی حملے کو نقشہ بناکر اور چارٹس کی مدد سے اس طرح سمجھایا جائے کہ طلبہ محو تدریس ہوں اُن کی آنکھیں دیکھ رہی ہوں اور کان سُن رہے ہوں . کان جو کچھ سنیں اس کو زیادہ عرصہ تک دماغ میں محفوظ رکھنے کے لیے آنکھیں چارٹس و نقشہ جات سے پیدا کردہ ماحول کو ذہن میں برقرار رکھیں . غیر ملکی تاریخ اور غیر ملکی زبان کی تدریس کے لیے اس ملک کے پس منظر کا طلبہ کے سامنے ہونا ضروری ہے . چارٹس ہی اس اہم ضرورت سے ہم کنار ہو سکتے ہیں . طلبہ میں چارٹس بنانے کا شوق بھی پیدا کیا جائے . تاکہ ان میں تخلیقی جوہر کی نشو و نما بھی ہو سکے .

چارٹس سبق کو موزوں طریقوں پر پیش کرنے کے لیے موثر اور سستے امدادی ذرائع میں سے

ایک ہیں۔ تاہم ان کی تیاری پر محنت کثیر اور دماغی کاوشیں صرف کرنا پڑتی ہیں۔ لاپرواہی اور بے توجہی سے بنائے ہوئے چارٹس زیادہ کارگر نہیں ہوتے۔ صفائی ان کی تیاری میں پہلا لازمہ ہے۔ مختلف رنگوں کے امتزاج میں بھی کافی مشق اور مہارت کی ضرورت ہے۔ چوں کہ چارٹس کی تیاری میں مسلسل محنت، صبر اور کام سے لگاؤ کی ضرورت ہے، اور طلبہ کو مناسب راہ نمائی کے بعد اس طرف منعطف کرایا جاسکتا ہے۔ تاکہ طلبہ کے لیے ایک اچھی فعالیت بھی ثابت ہو سکتا ہے جس کو مختلف ڈیزائنوں سے اور زیادہ پُر لطف بنایا جاسکتا ہے۔

تاریخی چارٹس کے علاوہ معلوماتی چارٹس بھی اپنی نوعیت کے اعتبار سے کچھ کم مفید نہیں۔ روزمرہ معلومات کو اس انداز سے چارٹس کی صورت میں پیش کیا جائے کہ طلبہ پر اس کا خاطر خواہ اثر ہو۔ اور بجائے اس کے کہ ہر نوعمر طلبہ کے ذہنوں پر ٹھوس قسم کی معلومات وا عداد و شمار کی بارش کریں، مناسب ہے کہ دل چسپ پیرائے میں ترسیمی چارٹ سے مدد لی جائے۔ جیساں ہیہ دباؤ، بارش، درجہ حرارت کے روزانہ فرق کو سلاخ نما ترسیمی چارٹ سے ظاہر کیا جائے جسے طلبہ ایک نظر میں ہی بھانپ جائیں۔ ایک مقررہ عرصے میں مختلف ملکوں کی آبادی، پیداوار، تجارت اور صنعت وحرفت میں سالانہ اضافے کی شرح معلوم کرنے کے لیے سلاخ نما ترسیمی چارٹ بنائے جائیں۔

سائنس کے اسباق میں تدریس کو زیادہ موثر بنانے کے لیے سائنسی چارٹس کا استعمال لابدی ہے جماعت میں طلبہ کی کمزوری اور ترقی ظاہر کرنے کے لیے بھی ایک چارٹ ہو جس سے ایک نگاہ میں طلبہ کی کارکردگی اور علمی استعداد کا اندازہ ہو جائے۔

چارٹس کے استعمال میں بھی خاص احتیاط کی ضرورت ہے، صرف اچھے خوش نما اور دیدہ زیب چارٹس ہی استعمال کرنے چاہئیں۔ ایک ہی وقت بہت سے چارٹس طلبہ کے سامنے نہیں دکھانے چاہئیں اس سے طلبہ کی توجہ منتشر ہونے کا خوف ہے۔ دوران سبق جس مرحلے پر چارٹ کی ضرورت لاحق ہو عین اسی موقع پر چارٹ طلبہ کے سامنے کھولنا چاہیے۔ تاکہ اُن میں انہماک کے ساتھ دیکھنے کی خواہش پیدا ہو۔ یکے بعد دیگرے بہت سے چارٹس نہیں پھیلانے چاہئیں جس وقت چارٹ کے دکھانے کا مقصد پورا ہو چکے تو ان کو لپیٹ کر رکھ دینا چاہیے۔ تاکہ طلبا سبق کے اگلے حصے پر توجہ دینے کی بجائے چارٹ

نہ دیکھتے رہیں۔ اس کے لیے کوئی مخصوص قانون نہیں کہ چارٹس کتنی دیر تک طلبہ کے سامنے کھلے رہیں۔ بہ تیار یہ زیر تربیت اساتذہ سبق کے وقع و محل کو مدنظر رکھ کر اس میں کافی دسترس حاصل کر لیتے ہیں۔ اصل مقصد تو طلبہ کے ذہنوں پر اثر انداز ہونا ہے۔ تاکہ اُن پر اس قسم کا اثر قائم رہے۔

لیکن ہمارے ہاں عام طور پر تدریسی امدادوں سے بہت کم افادہ حاصل کیا جاتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ سالانہ معائنہ پر طلبہ ہنگامی حالات میں الٹے سیدھے قسم کے چارٹس تیار کر لیتے ہیں اور بلا کسی classification کے کمرے کی چاروں دیواری پر لٹکا دیتے ہیں۔ ان کی آرائش میں کوئی نفسیاتی تکنیک استعمال نہیں کی جاتی جس سے ذہنی نشوونما کی کچھ تسکین ہو سکے۔ چارٹس کو ترتیب سے چسپاں کرنا بھی ایک فن ہے۔ اور جس طرح ہمارے ہاں بعض کو بے اندازہ سامان آرائش و نمائش میسر ہے، لیکن ڈرائنگ روم میں فرنیچر کی سلیقے اور قرینے سے آراستگی کے فن سے عاری ہیں جس طرح اُن کے ذہن کی کورذوقی اور اکھڑپن کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ اسی طرح سے بے ترتیب چارٹس سے بھرا ہوا کمرہ معلم کی ذہنی کیفیت ظاہر کرتا ہے۔

پھر اس موجودہ طریقہ میں بڑی قباحت یہ بھی ہے کہ کیلیں ٹھونکنے سے دیوار کی سفیدی اور خوب صورتی میں فرق آجاتا ہے۔ بہر حال چارٹس پھٹ پھڑانے لگتے ہیں۔ کچھ گر جاتے ہیں کچھ ٹیڑھے لٹکے رہتے ہیں مناسب تو یہ ہے کہ لکڑی کا ایک فریم تیار کر کے دیوار میں لگا دیا جائے جس میں کوئی اچھا عمدہ سا چارٹ تیار کر کے لگا دیا جائے اور شیشے کا ڈھکنا بند کر کے قفل لگا دیا جائے۔ اور جب یہ اندازہ ہو کہ تمام طلبہ اس سے مستفید ہو چکے ہیں تو چند یوم کے بعد اس کو کسی دوسرے چارٹ سے بدل دیا جائے۔ غیر ملکی یا ملکی رسالہ جات، اخبارات کے متعلقات اس میں وقتاً فوقتاً بدلتے رہنا چاہئیں۔ چارٹس و تراشیات اور اخبارات و رسائل سے لگائے ہوئے متعلقات کو بھی سجانے میں بچوں کے نفسیاتی پہلو کو ذہن میں رکھنا چاہیے۔ یہ معلوم ہو کہ طلبہ کس چیز کا اثر جلدی قبول کرتے ہیں، اسی لحاظ سے ان سب کی موزوں ترتیب کا انتظام کر کے ایک اہم اور مفید درسی معاون سے استفادہ کرنے سے کبھی گریز نہ کیا جائے۔

کتب، رسائل و اخبارات

اچھی کتابیں معلم کی بہترین مددگار ثابت ہوتی ہیں۔ اس کے علاوہ ٹیکسٹ بکس صوری و معنوی لحاظ سے

خوبیوں اور خوبصورتیوں کا مرقع ہو، کتاب کا سرورق نہ صرف دیدہ زیب ہو بلکہ جاذب نظر بھی۔ کتاب پائیداری کے علاوہ قیمت میں سستی ہو تاکہ ہر طالب علم حاصل کر سکے اور تعلیم عام کرنے میں مدد ملے۔ کتاب کی لکھائی چھپائی عمدہ ہو اور اتنی باریک نہ ہو کہ طالب علم کی نگاہ پر اثر پڑے اور نہ ہی خط آتنا موٹا اور بھدا ہو کہ غیر ضروری طور پر کتاب ضخامت بڑھ جائے۔ کتاب کو منظور کرنے سے پہلے اس کا مطالعہ ضروری ہے۔ اس بات کا اچھی طرح سے اطمینان کر لینا چاہیے کہ یہ موجودہ نصاب کے معیار پر پوری بھی اترتی ہے یا نہیں۔ چناں چہ دیکھنے میں آیا ہے کہ بعض کتابیں نصاب سے بلند معیار کی ہوتی ہیں اور طالب علم کی علمی واقفیت بڑھانے کے لیے نصاب سے خارج چیزیں بھی شامل کر لی جاتی ہیں۔ جبکہ بعض میں نصاب کو بھی پوری طرح نہیں اپنایا جاتا۔

اس افراط و تفریط میں طلبہ ہی زیادہ تر خسارے میں رہتے ہیں۔ ساری کتاب کو محض رٹنے کی کوشش کرتے ہیں جو کہ ناممکن العمل ہے۔ مختصر کتابوں میں پہلے ہی اختصار سے کام لیا جاتا ہے اور جب طلبہ یاد کرنے لگتے ہیں تو کام کی چیزوں کو بھی چھوڑ دیتے ہیں۔ چناں چہ کمرہ جماعت کے باہر جبکہ معلم بھی ان کی راہ نمائی کے لیے موجود نہیں ہوتا۔ صرف کتابیں ہی ہیں جن سے وہ رہبری حاصل کریں۔ اگر خدانخواستہ کتابیں بھی معیاری نہ ہوں تو پھر طلبہ اندھیرے میں ہاتھ ٹوئیاں مارتے پھرتے ہیں۔ اکثر دیکھنے میں آتا ہے کہ جغرافیہ، سائنس، وانگریزی کی بعض کتابوں میں واقعات و بیانات سرتاپا غلط درج ہوتے ہیں یا پھر بعض مشہور قسم کی سکیمیں مثلاً سلسلہ اتحاد وغیرہ سرے سے شامل ہی نہیں کیے جاتے۔ معلمین کا فرض ہے کہ طلبہ کو اس قسم کی کتابوں سے بچائیں۔ اس کی وجہ غالباً شروع سال میں ناشروں کی طرف سے نمونے کی کتابوں کی بھر مار اور کمیشن کی پیشکش ہے جس میں اچھی کتابوں کا انتخاب عمل میں نہیں لایا جاتا اور ناقص قسم کی کتابیں صرف تھوڑے سے ذاتی فائدے کی بنا پر طلبہ کے سر تھوپ دی جاتی ہیں۔

چناں چہ کتابیں جو بصری طور پر سب سے اہم اور معلم کے بعد طلبہ کی رہ نمائی میں ثانوی حیثیت رکھتی ہیں انھیں اس قسم کی خامیوں اور کتابت کی غلطیوں مثلاً حساب میں سوالات کے جوابات میں کثیر غلطیاں ہجوں کی غلطیاں وغیرہ سے مُبرا ہونا چاہیے۔

اچھی کتابوں کے علاوہ طلبہ کو علمی لحاظ سے مستفید ہونے کے لیے اخلاقی، ادبی، معاشرتی اور معلوماتی

رسائل کی بھی ضرورت ہے تاکہ وہ اخلاقی اور سماجی طور پر اچھی قدروں کو اپنا سکیں اور اپنے مطالعہ کو وسعت دے سکیں۔ یہاں طلبہ پر کمرہ جماعت جیسا دباؤ، جبر اور پابندی نہیں ہوگی۔ بلکہ تمام تر مطالعہ ان کے شوق اور دلچسپی پر منحصر ہوگا۔ لیکن کتابوں کے انتخاب میں معلم سے رہنمائی کی ضرورت لاحق رہتی ہوگی۔ اچھے خوش نما رسائل کے تراشے بھی سبق کے دوران استعمال کیے جا سکتے ہیں۔ اچھی تصویروں کے البم بنوائے جائیں جن سے پاکستان اور دیگر ممالک کے حالات پر روشنی پڑتی ہو۔

طلبہ میں پورے طور پر ادبی ذوق پیدا کرنے کے لیے سکول کا اپنا ماہانہ مجلہ ہونا چاہیے۔ طلبہ سے مضامین لکھنے کو کہا جائے جس سے انھیں اپنے جذبات و احساسات کا بہتر طریقہ پر اظہار کرنا آئے گا۔ اگر سکول میں تعداد بہت زیادہ ہو تو ہائی حصے کا مجلہ علیحدہ ترتیب دیا جائے اور مڈل حصے کا علیحدہ۔ خوبصورت اور خوش خط لکھے ہوئے مضامین اور نظموں کو مجلہ کی صورت دینے میں انچارج بطور نگران کام کرے۔ اڈیٹر سب اڈیٹر طلبہ خود ہی منتخب کریں اور وہ ہی اس کی ترتیب کا سارا انتظام کریں۔ مقابلہ کی سپرٹ پیدا کرنے کے لیے بہترین لکھنے والوں کو انعام دیا جائے۔ اس کے علاوہ ملکی اور غیر ملکی، ادبی، تعلیمی اور معاشرتی رسائل سکول لائبریری میں طلبہ کے پڑھنے کے لیے موجود ہونے چاہئیں۔ تاکہ وہ ملکی ادب، تہذیب اور معاشرت سے لاعلم نہ رہیں۔ معلمین کی علمی استعداد اور وسعتِ خیالات کے لیے ترقی یافتہ ممالک خاص رسائل شائع کرتے ہیں۔ اساتذہ کو ایسے رسائل بہم پہنچانا چاہئیں جن میں سے دلچسپ اور سبق آموز تراشے طلبہ کی رہبری کا باعث بھی بن سکتے ہیں۔

۲۔ اخبارات

حالاتِ حاضرہ سے باخبر رکھنے کے لیے اخبارات کے مطالعے کی عادت طلبہ میں پیدا کرنا تعلیم کا ایک اہم جزو ہے۔ اخبار بینی سے ان کے علمی خزانے میں بیش بہا اور انمول موتیوں کا اضافہ ہوگا۔ تقریر و تحریر میں سنے ہوئے اور برمحل الفاظ مہیا ہوں گے۔ مشکل الفاظ کے ہجے اور بناوٹ بار بار کی مشق سے اور ذہن پر بار ڈالے بغیر ازبر ہو جائیں گے۔ اخبارات علمی طور پر معلومات افزا ہی نہیں بلکہ صحیح مطالعہ سے اچھے معاشرے کی تعمیر کا کام بھی لیا جا سکتا ہے۔ سکول لائبریری میں اچھی قسم کے ملکی و غیر ملکی اخبارات بھی منگانے چاہئیں۔ اساتذہ

کے لیے اخبارات کا مطالعہ کرنا ضروری ہے تاکہ روزمرہ کے حالات سے آگاہ ہو سکیں۔ حکومت کے مختلف منصوبوں مثلاً پانچ سالہ پلان۔ بجلی پلاننگ اور دوسرے معاشی منصوبوں سے باخبر ہونے کے لیے اخبارات کا مطالعہ لازمی ہے جن میں بڑی تفصیل سے تمام سکیمیں درج ہوتی ہیں۔ جدید سائنسی ایجادات اور ترقیوں کے بارے میں معلومات اخبارات کے علاوہ کسی اور ذریعے سے اتنی تفصیل کے ساتھ مہیا نہیں ہوتیں۔ دوسرے ملکوں کے حالات و سیاست سے واقف رہنے کا ذریعہ بھی اخبارات ہی ہیں۔ اخبارات کے خصوصی نمبر ادبی و معلوماتی لحاظ سے بڑی علمی قدر رکھتے ہیں۔ تعلیم عام کرنے کے لیے اخبارات کے صفحات جو مختصر عرصے میں کر سکتے ہیں اتنا پوری قوم کئی گنا وقت میں نہیں کر سکتی۔ اخبارات بطور درسی معاونات کے معلم کی مدد صرف حوالہ جات کی صورت میں نہیں کرتے بلکہ اخبارات میں اندرون ملک اور بیرونی ممالک کی قابل دید جگہوں کی تصاویر شائع ہوتی رہتی ہیں۔ مثلاً وادی کاغان کے خوش نما منظر۔ کافرستان کے لوگوں کے لباس وگھر۔ نیاگرا کی آبشار سمندروں کی تصویریں۔ بندرگاہ میں جہاز پر کام کرنے کا نظارہ جس میں تصویر بطور تراشوں کے طلبہ کے ذہنوں میں کوئی ایک مبہم اور دھندلی سی شکلوں کے بجائے ایک واضح اور صاف تخیل پر مبنی شکل بنانے میں استعمال کی جائیں۔

۳۔ گرافون

سمعی امدادوں میں سے گراموفون تعلیمی میدان میں گراں بہا خدمات سرانجام دے رہا ہے اور ہم اس کے بانی تھامس ایلوا۔ ایڈیسن کو سائنس دان کے علاوہ بچوں کا محسن کہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ یہ ایک کلاک جیسی مشنری پر مشتمل ہوتی ہے جس میں ریکارڈ اور ساؤنڈ بکس اس کے اہم حصے ہیں۔ اسٹوڈیو میں آواز بھرا ہوا ریکارڈ تیار کیا جاتا ہے۔ پھر ریکارڈ پر پیدا شدہ لہریں ساؤنڈ بکس کے دیافرغمے پر وہی اثرات پیدا کرتی ہیں اور وہی آواز دوبارہ بلند سنائی دیتی ہے۔ گراموفون جب شروع میں ایجاد ہوا تو صرف گانے وغیرہ سننے کے کام ہی لایا جاتا تھا۔ لیکن یورپ میں تعلیم کی ترقی کے ساتھ ہی اس سے بے شمار قسم کی تعلیمی سہولتیں مہیا کی گئیں اور تعلیم بذریعہ کھیل جیسے اہم درسی معاون کا درجہ دیا گیا۔ موسیقی سے بچوں کی رغبت کے پیش نظر ایسے ریکارڈ تیار کرائے گئے جن میں تعلیمی اسباق موجود ہیں اور پس منظر میں ہلکی پھلکی موسیقی

دقیق اور مشکل الفاظ کے تلفظ کو صحیح طور پر بچوں میں پھیلانے کے لیے مستند زبان لوگوں سے ریکارڈ تیار کرا کر بچوں کو سنائے گئے، جس سے طلبہ کو ان تک پہنچنے کے لیے طویل فاصلے کرنا پڑا۔ اور گھر بیٹھے ہی ماہر زبان کے الفاظ میسر آسکے۔ ورنہ ریکارڈ کی غیر موجودگی میں ممکن تھا کہ شاید وہ تمام عمر ان سے مستفید ہونے کا موقع ہی نہ پاسکتے۔ وقت کی بچت کے ساتھ خرچ میں بھی کمی واقع ہوئی اور گراموفون بطور جامع ادارہ کے بن گیا۔ لیکن اس سے طلبہ معلم کی ضرورت سے سبکدوش نہیں ہو سکتے۔ کیوں کہ معلم ہی ہے جو انھیں تعلیمی ریکارڈ موقع و محل کی مناسبت سے مہیا کرے گا۔ گراموفون "تعلیم بذریعہ کھیل" کا زبردست امدادی ذریعہ ضرور ہے۔ لیکن اس کے استعمال میں بھی بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے۔ طلبہ اسے محض تماشہ ہی نہ بنالیں یہ درست ہے کہ کمرہ جماعت کی بے کیف کیفیت کا ازالہ ہو جاتا ہے اور طلبہ میں اس سے سیکھے ہوئے الفاظ کے تلفظ صحیح طور پر رائج ہو جاتے ہیں، فن تقریر میں گراموفون کی امداد ناگزیر ہے۔ اور بہترین مقرروں کی تقریروں کے ریکارڈ سنائے جائیں۔ طلبہ بھی ویسا ہی اب و لہجہ، زیر و بم اور دوسرے دقیقے اختیار کریں گے۔ موسیقی کی تدریس میں گراموفون کے استعمال سے مزید سہولتیں ملتی ہیں۔ لیکن شرط یہ ہے کہ ہر ریکارڈ سے پہلے معلم طلبہ کو ضروری ہدایت دے، تاکہ وہ ریکارڈ کی سماعت میں ان ہدایات کے مطابق استفادہ حاصل کر سکیں۔ ہمارے ہاں ابھی گراموفون سے عام سکولوں میں اس طرح فائدہ نہیں اٹھایا جاتا۔ صرف ٹریننگ کالج اور ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ میں ہی زیر تربیت اساتذہ کی محض نصابی ضرورت کے پیش نظر چند بار استعمال کر لیا جاتا ہے اور وہ بھی صرف انگریزی زبان کے تلفظ سمجھانے کے لیے۔ اب جبکہ اردو ہماری قومی زبان بن چکی ہے اس کی صحیح تدریس کے لیے اردو میں ریکارڈ تیار کیے جانے چاہئیں۔ تاکہ سکولوں کے علاوہ عام ان پڑھ لوگ بھی ریکارڈ سن کر زبان کے آداب و مجلسی طور طریقوں سے آشنا ہو سکیں۔ سستے ریکارڈ تیار کرنے کے لیے محکمہ تعلیم کا ایک سٹوڈیو ہو جس میں مختلف تعلیمی ریکارڈ تیار کر کے تمام سکولوں میں بہم پہنچائے جائیں۔ علامہ اقبال اور حالی نے بچوں کے لیے بہت سی نظمیں لکھی ہیں، بچوں میں پوری قومی روح سرایت کرنے کے لیے ضروری ہے کہ بچپن سے ہی ان کے کان ایسی نظموں سے آشنا ہو جائیں۔ اس مقصد برآری کے لیے ایسی نظموں کے ریکارڈ تیار کیے جائیں۔ قومی ترانہ جس کے احترام میں ہر پاکستانی کا دل معمور ہے۔

سکولوں میں اور خصوصاً دیہاتی سکولوں میں کسی خاص طرز و جاذبیت سے نہیں گایا جاتا۔ کیا ہی اچھا ہو اگر قومی ترانے کے ریکارڈ سکولوں کو مہیا کیے جائیں۔ تاکہ بچے گراموفون پر سن کر صحیح تلفظ، ملیح و لہجہ اور طرز اختیار کر سکیں۔ علاوہ ازیں اچھی اُردو و انگریزی سکھانے کے لیے نثر کے خاص خاص حصوں کو بذریعہ ریکارڈ بچوں تک پہنچایا جائے۔

۴۔ جادو کی لالٹین

سائنس نے ترقی کو اپنی ذات تک ہی محدود نہیں رہنے دیا۔ بلکہ اس کی مثال روشن لیمپ جیسی ہے جو خود منوّر ہے اور اپنے ماحول پر بھی ضیا پاشی کرتا ہے۔ روزمرہ زندگی پر ہی اس کا اثر نہیں بلکہ ہر شعبۂ حیات میں دور رس نتائج کی حامل ہوئی ہے، درس و تدریس کی کوکھ سے جنم لے کر احسان فراموشی نہیں کی بلکہ آغوشِ مادرانہ کو سہولتیں بہم پہنچانے کے لیے نت نئے سامان، ایجادوں کی صورتوں میں بطور عقیدت پیش کیے جادو کی لالٹین خاص تعلیمی و درسی لوازمات میں سے ایک ہے۔

یہ تین حصوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ پہلا حصہ لکڑی یا ٹین کا ایک مستطیل بکس ہوتا ہے جس کو چوڑی دار لاٹھوں پر ایک دستہ کی مدد سے آگے پیچھے حرکت دے سکتے ہیں۔ تاکہ سکرین پر تصویر صاف اور نمایاں دکھائی دے سکے۔ بکس کی تمام اندرونی سطحیں سیاہ کی ہوتی ہیں۔ اور درمیان میں ایک بڑا بجلی کا لیمپ لگا ہوتا ہے جس کی پشت پر ایک ٹین کا پالش شدہ مقعر آئینہ لگا ہوتا ہے جو روشنی کی شعاعوں کو منعکس کر کے مرکز پر جمع کر دیتا ہے۔ روشنی کو اور زیادہ تیز کرنے کے لیے دو محدب عدسے ایک سیدھی نالی میں عین روشنی کے راستے میں فٹ کیے ہوتے ہیں۔ اس سے آگے سلائیڈ رکھنے کے لیے جگہ چھوڑی ہوتی ہے۔ پھر دوبارہ روشنی کی شعاعوں کو مرتکز کرنے کے لیے نالی میں ایک اور محدب عدسہ ہوتا ہے۔ دوسرا حصہ سکرین ہوتا ہے جس کو بکس سے اتنی دور رکھا جاتا ہے کہ اس پر تصویر بڑی اور نمایاں اتر سکے، صرف اتنا خیال رکھنا کافی ہے کہ سکرین بکس کی سمت میں ہو۔ اگر ایسا نہ ہو تو پھر بکس کے نیچے لگے ہوئے پیچ کو گھمانے سے بکس نیچے اوپر حرکت کر سکتا ہے، اسے ایسا کر لینا چاہیے۔ تیسرا حصہ سلائیڈ پر مشتمل ہوتا ہے کیونکہ اسی آلے کے ذریعے خاموش تصاویر یا اچھے مناظر کی لی ہوئی تصویروں کی نمائش ہی ہو سکتی ہے۔ چنانچہ

عام طور پر نفیساز معلومات فلم کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو دستی یا اتومیٹک کے فریم میں رکھ کر سلائیڈ چلائی جاتی ہے۔ ورہ چرشیٹ کے ٹکڑوں پر تیار کیے جاتے ہیں تھوڑی سی محنت اور مشق سے اچھے سلائیڈ تیار کرنا آجاتے ہیں۔ طلبہ میں اگر اس مشغلے کا رجحان کرایا جائے تو بہت سا قیمتی وقت بچ سکتا ہے جسے وہ آوارہ گردی اور دوسرے فضول بحث و مباحثہ، لڑائی جھگڑے اور غلط بینی میں گنواتے ہیں۔ سکول میں موجود شدہ اِس آلے کے لیے مختلف النوع رنگ برنگی سلائیڈز بھی مہیا ہو سکیں گی، جن سے ان کے بعد آنے والے طلبہ بھی استفادہ کرتے رہیں گے۔

تدریسی افادیت کے لیے طلبہ کو مختلف مضامین پر بنائی گئی سلائیڈیں دکھانی چاہئیں۔ مغل آرٹ کا صحیح تصور طلبہ کے ذہنوں میں بٹھانے کے لیے لال قلعہ دہلی۔ تاج محل آگرہ۔ جامع مسجد دہلی، شاہی قلعہ، مسجد و مقبرہ جہاں گیر۔ شالا مار باغ لاہور اور مغل عہد کی دیگر مشہور عمارتوں کی نمائش کی جائے۔ پاکستان میں کھیتی باڑی کے طریقہ کا مقابلہ دوسرے یوروپین ممالک کے طریقوں سے اس آلہ کے ذریعہ دکھایا جائے تاکہ ہمارے طلبہ بھی ترقی یافتہ ممالک کے ان طریقوں سے واقفیت حاصل کرلیں۔ شہد کی مکھیوں کی پرورش کے مختلف مرحلے، کشمیر، سوات اور خوب صورت جھیلوں اور دریاؤں کے مناظر کی نمائش کے لیے یہ آلہ خاص طور پر مفید ہے۔ دوسرے ممالک کی بنی ہوئی سلائیڈیں بھی دل چسپی سے خالی نہ ہوں گی۔ البتہ یہ طریقہ کسی قدر مہنگا ثابت ہوتا ہے۔ لیکن اس کی درسی افادیت کے پیش نظر اس سے درگزر نہیں کر سکتے۔ یہ طلبہ میں قوت مشاہدہ کو ترقی بخشتا ہے اور فطری صلاحیتوں کی نشو و نما میں مدد و معاون ہوتا ہے۔ (باقی)

نصابِ تعلیم اور اس کے مسائل

شاہد اشرف

(مسلسل نمبر ۲)

۳۔ پیچھے اشارہ گذر چکا ہے کہ نصاب کے جامد ہو جانے سے کیا کیا خرابیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ جامد قسم کا نصاب یہ خرابیاں اس لیے پیدا کرتا ہے کہ وہ زندگی کی حقیقی ضرورتوں سے بے تعلق ہو کر رہ جاتا ہے اس لیے جدید تعلیمی فکر اس بات کا شدت سے مطالبہ کرتا ہے کہ نصاب پر بار بار نظر ثانی ہوتی رہے تاکہ زندگی کے بدلے ہوئے حالات کا ساتھ دیا جا سکے۔

نصاب سازی کے اس اہم اصول کا منطقی نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ ہر مدرسے کے نصاب میں مقامی حالات کی اچھی خاصی جھلک موجود ہو۔ زیادہ صاف لفظوں میں اس سے مراد یہ ہے کہ گو قومی وحدت اور ملی یگانگت کے لیے نصاب میں قومی زبان، قومی تاریخ و جغرافیہ، شہریت، عام سائنس وغیرہ کے مضامین کو لازمی مقام ملنا چاہیے۔ اس کے ساتھ ہی ہر مدرسے کو یہ آزادی ہونی چاہیے کہ مقامی صنعت و حرفت اور مقامی زندگی کے دوسرے اہم عناصر کے لیے اپنے ہاں جگہ نکال سکے۔ ہر مدرسے کے نصاب میں ایسی عملی سرگرمیاں وافر مقدار میں موجود ہونی چاہئیں جو بچوں اور نوجوانوں کو آگے چل کر مقامی زندگی میں بھرپور حصہ لینے کے قابل بنا دیں۔

یہ اہم غایت اسی صورت میں حاصل ہو سکتی ہے جب نہ صرف نصاب پر اکثر نظر ثانی ہوتی رہے بلکہ اس کام میں ماہروں کے علاوہ استادوں، والدین بلکہ خود طلبہ کی آواز کو بھی کچھ نہ کچھ دخل حاصل ہو۔

جیسا اس مضمون کے شروع میں کہا گیا تھا۔ نصاب میں وہ اوزار ہے جس کی مدد سے ہر قسم کے تعلیمی مسائل حل کیے جا سکتے ہیں۔ یہ بھی وضاحت کی جا چکی ہے کہ تعلیمی مسائل دراصل معاشرتی مسائل ہوتے ہیں لیکن نصاب ان مسائل کو تسلی بخش طور پر اسی صورت میں حل کر سکتا ہے جب اسے مؤثر اور لچکدار شکل دی گئی ہو پس اگر ہم چاہتے ہیں کہ ان چند در چند مشکل معاشرتی مسائل کے تسلی بخش حل تیار کریں جنھوں نے

قوم کو سالہا سال سے پریشانی کی کھانی پڑی ہیں ۔ اپنے نصاب تعلیم کی تدوین از سر نو ان سائنسی اصولوں کی روشنی میں کرنی چاہیے جن کی طرف اوپر اشارہ گذر چکا ہے ۔

حرف انتباہ

تاہم یہ خیال نہ لینا چاہیے کہ جس نصاب میں اوپر دیے گئے تینوں اوصاف موجود ہوں گے وہ از خود کوئی کرشمہ پیدا کر دے گا۔ نصاب کے مندرجات خواہ وہ مختلف مضامین کی شکل میں ہوں خواہ عملی سرگرمیوں کی شکل میں مطلوبہ نتائج اسی صورت میں پیدا کر سکتے ہیں جب انھیں مناسب ماحول میں موثر طور پر پیش کیا جائے۔ تعلیمی ماہر اس بارے میں یک زبان ہیں کہ نصاب کو معنی عطا کرنے کا کام استاد کی ذمہ داری ہے۔ بے شک نصاب میں صحیح قسم کے مضامین اور سرگرمیاں شامل ہونی چاہئیں، مگر نصاب کے مندرجات درست طور پر پیش بھی کیے جانے چاہئیں، دوسرے لفظوں میں استاد کا طریق تدریس بھی اسی قدر اہم ہے جس قدر نصاب کے مندرجات۔ یہ دونوں نصاب کے اہم ستون ہیں جس طرح کوئی انسان دونوں ٹانگوں کے بغیر متوازن طور پر کھڑا نہیں ہو سکتا۔ بالکل اسی طرح نصاب بھی اپنے توازن کے لیے مندرجات اور طریق تدریس دونوں کا محتاج ہے۔ متوازن نصاب وہی ہوگا جس کے مندرجات بھی صحیح قسم کے ہوں اور جسے پیش بھی درست طریق پر کیا جائے۔ جو نصاب ان دونوں چیزوں میں سے کسی ایک سے عاری ہوگا وہ ایک لنگڑا نصاب ہوگا۔ اور اس سے معیاری نتائج کبھی نہ پیدا ہو سکیں گے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

طریق تدریس کے متعلق ایک غلط فہمی کا ازالہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔ بہت سے نوجوان اساتذہ جو ٹریننگ کالجوں میں تربیت پاتے ہیں یا اس تربیت سے فارغ ہو کر معلمی کے پیشے میں داخل ہوتے ہیں، عموماً یہ خیال کرنے لگتے ہیں کہ جدید طریقہ ہائے تدریس ہمارے عام مدرسوں میں کام نہیں دے سکتے۔ حال ہی میں راقم کو ایک دوست سے ملنے کا اتفاق ہوا جو اسی سال ٹریننگ کالج سے فارغ ہوئے تھے اور اب ایک ہائی سکول کے ہیڈ ماسٹر ہیں۔ انھیں اس بات کی شکایت تھی کہ پرانے استادوں کو نئے طریقہ ہائے

کرنے پر آمادہ کرنا بڑا مشکل ہے۔ وہ کسی طرح اس طرف مائل نہیں ہو سکے۔

صدر معلم صاحب نئے تدریسی طریقوں کی افادیت کے دل سے قائل تھے اور نیک نیتی سے یہ چاہتے تھے کہ اپنے مدرسے کو ان طریقوں سے فائدہ پہنچائیں مگر ان کی سا دلیل مشکل یہ حائل تھی کہ ان کے رفقائے کار اس معاملے میں ان کا ساتھ دینے پر تیار نہ تھے۔ ان لوگوں کی دلیل یہ تھی کہ ہم اچھے نتائج کے ذمہ دار ہیں۔ طلبہ، والدین اور تعلیمی افسر سب اچھے نتائج کا مطالبہ کرتے ہیں۔ انھیں اس بات سے کچھ غرض نہیں کہ یہ نتائج کن طریقوں سے حاصل کیے گئے ہیں۔ ان حالات میں آزمودہ طریقوں کو چھوڑ کر ایسے طریقوں کے آزمانے سے کیا فائدہ جن کے لیے ہمارے یہاں کافی ساز و سامان بھی موجود نہیں!

صدر معلم صاحب اس استدلال کے سامنے کچھ لاجواب سے تھے۔ اس پر راقم نے گذارش کی کہ نئے تدریسی طریقوں سے مراد وہ مخصوص طریقے نہ لینے چاہئیں جو مغربی ملکوں میں پیدا ہوئے اور وہاں مروج ہیں۔ مثلاً منصوبی طریق یا ڈالٹن پلان وغیرہ۔ جدید تعلیمی فکر نے جس قدر نئے طریقے وضع کیے ہیں ان سب کی تفصیلیں کافی مختلف ہیں۔ مگر ان سب کی بنیاد ایک ہے اور جب تک وہ بنیاد قائم ہے اس وقت تک اس بات سے کچھ فرق نہیں پڑتا کہ کس قسم کا ساز و سامان استعمال کیا گیا ہے اور استاد نے کن کن تکنیکوں سے کام لیا ہے۔ تکنیکوں اور تفصیلوں کے معاملے میں ہر استاد کو اپنے مخصوص حالات کا لحاظ رکھنے کی پوری آزادی ہے۔

نئے تدریسی طریقوں کی اصل روح ان کے لوازمات نہیں بلکہ ان کا بنیادی فلسفہ ہے۔ یہ بنیادی فلسفہ فہم اور بچے کے احترام کے دوگانہ عناصر پر مشتمل ہے۔ اس فلسفے کا پہلا مطالبہ یہ ہے کہ جو کچھ پڑھایا جائے وہ اس طرح پڑھایا جائے کہ طالب علم اسے اچھی طرح سمجھ لے۔ فہم کی بہترین پرکھ یہ ہے کہ بچے میں خود کتابیں پڑھنے کا شوق پیدا ہو جائے۔ جو استاد اپنے طلبہ میں مطالعہ کا سچا ذوق پیدا کر دیتا ہے۔ وہ جدید تدریسی طریقوں کا ایک اہم مطالبہ پورا کر دیتا ہے خواہ وہ کوئی بھی تکنیکیں اختیار کرے۔

اس فلسفے کا دوسرا مطالبہ یہ ہے کہ بچے کو پورے معنوں میں ایک انسان سمجھا جائے اور اس کا وہی احترام کیا جائے جو ایک انسان کا ہونا چاہیے۔

باخبر شو از مقام آدمی   احترام آدمیت، احترام آدمی

اس اصول کا تقاضا یہ ہے کہ جماعت کے کمرے میں ڈر، خوف، نفرت اور غصے کی فضا پیدا کرنے کی بجائے ہمدردی، محبت اور حلیمی کی فضا پیدا کی جائے۔ اس نکتے پر زور دینے کی ضرورت نہیں کہ پہلی قسم کی فضا ذہنی توانائی کو شل کر کے رکھ دیتی ہے، جبکہ دوسری قسم کی فضا انہیں تحریک کو ابھارتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ذہنی نشوونما کے لیے یہ دوسری قسم کی فضا ہی موزوں ہو سکتی ہے۔

جو استاد اپنے تدریسی کام کی عمارت فہم اور احترام آدمیت کی دوگانہ بنیادوں پر اٹھا سکے وہ یقیناً جدید طریقہ ہائے تدریس سے کام لے رہا ہے، خواہ وہ کسی قسم کا ساز و سامان استعمال کرے اور کسی قسم کی تکنیکیں کام میں لائے۔ جدید تدریسی طریقوں کا مطالبہ جب اس رنگ میں کیا جائے تو پھر کسی استاد کے لیے یہ کہنے کی گنجائش باقی نہیں رہتی کہ یہ طریقے قابل عمل نہیں۔ یا ان سے کام لینے سے امتحانی نتائج خطرے میں پڑ جائیں گے۔ ناقابل عمل ہونے کا سوال اس لیے بیچ سے اٹھ جاتا ہے کہ استاد سے نقطۂ نگاہ تبدیل کرنے کا مطالبہ کیا جاتا ہے، اس سے یہ مطالبہ نہیں کیا جاتا کہ فلاں فلاں تدریسی امدادیں استعمال کرو، یا فلاں فلاں تکنیکوں سے کام لو۔ اچھے نتائج کی ضمانت فہم سے حاصل ہو جاتی ہے۔ جہاں مضامین اور سرگرمیوں کا حقیقی فہم موجود ہوگا وہاں امتحانی نتائج بہترین قسم کے ہوں گے۔

ایک آسان عملی راہ

احترام آدمیت اور فہم اگرچہ دو الگ عناصر ہیں، تاہم ان میں سے ہر ایک دوسرے پر کافی حد تک اثر انداز ہوتا ہے۔ احترام آدمیت کی فضا کا انحصار زیادہ تر صدر معلم کے اپنے زاویۂ نگاہ پر موقوف ہے۔ اگر وہ جمہوری قدروں کا دل سے شیدائی ہے تو اس کے ماتحت کام کرنے والے اساتذہ بھی تحکم پسندی سے دست بردار ہونے پر مجبور ہو جائیں گے۔

تدریس کو بامعنی بنانے اور طلبہ میں مطالعہ کا شوق پیدا کرنے کے لیے ایک منظم منصوبہ بنانے کی ضرورت ہے۔ خود مطالعہ کرنا ایک مشکل مہارت ہے اور اپنی تربیت کے لیے محتاط توجہ چاہتی ہے۔ اگر کوئی صدر معلم ذوق مطالعہ کو ترقی دینے کے لیے ایک جامع منصوبہ تیار نہیں کرتا تو اس ذوق کی آبیاری اساتذہ کی انفرادی پسند پر موقوف رہ جائے گی اور غالب امکان یہ ہے کہ

بیشتر اور بعض حالتوں میں تمام کے تمام اساتذہ اس کی طرف توجہ نہیں کریں گے۔ اس لیے مناسب یہ ہے کہ مدرسے کے اوقات میں سے ہر روز ذاتی مطالعہ کے لیے ایک پیریڈ نکالا جائے۔ مدرسے کے ہال یا کسی اور موزوں کمرے میں ایسی آسان دل چسپ اور مفید کتابیں رکھی جا سکتی ہیں جہاں ایک جماعت اپنے استاد کی نگرانی میں بیٹھ کر ان کتابوں کا مطالعہ کرے۔ استاد کے ذمہ یہ کام ہونا چاہیے کہ نہ صرف بوقت ضرورت طلبہ کی مشکلات دور کرے بلکہ اسے یہ بھی چاہیے کہ طلبہ کو لغات اور حوالے کی دوسری کتابوں سے مدد لینے کا ڈھنگ سکھا دے۔

ہمارے یہاں ذاتی مطالعہ کی ضرورت اور اہمیت کو جس بری طرح نظر انداز کیا جا رہا ہے، اس کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ طلبہ کی ایک بھاری تعداد ہائی اسکول سے کالج میں پہنچنے کے بعد بھی یہ لغات سے الفاظ کے معانی اور تلفظ معلوم کرنے کا ڈھنگ جانتے ہیں اور نہ یہ جانتے ہیں کہ کوئی مضمون یا تقریر تیار کرنے کے لیے ضروری مواد کسی قسم کی حوالے کی کتابوں سے حاصل کرنا چاہیے۔ حد یہ ہے کہ بہت سے طلبہ بی۔ اے اور ایم اے پاس کر لینے کے بعد بھی اس قابل نہیں ہوتے کہ کسی علمی یا فنی کتاب کو پڑھ کر اس سے ضروری معلومات اور نکات جمع کر لیں۔

اس ضمن میں ایک افسوس ناک امر یہ بھی کہ خود اساتذہ میں بہت سے ایسے ہیں جو شوقیہ کوئی کتاب بلکہ رسالہ تک پڑھنا نہیں چاہتے۔ اس قسم کے مردہ روح استادوں سے یہ امید رکھنا کہ وہ اپنے شاگردوں میں ذوق مطالعہ پیدا کریں گے ایک جھوٹی امید ہے۔ اس لیے جو صدر معلم اپنے طلبہ میں ذوق مطالعہ پیدا کرنا چاہے، اسے پہلے یہ یقین کر لینا چاہیے کہ استاد اس ذوق سے محروم نہیں۔ اس کی ایک اچھی صورت یہ ہے کہ صدر معلم استادوں کو مختلف علوم کی نئی کتابیں دیتا رہے اور ان سے مطالبہ کرتا رہے کہ انجمن اساتذہ کے جلسے میں ان کتابوں کے مطالعہ کا خلاصہ پیش کریں۔

جو صدر معلم یہ باتیں کر سکے اسے تسلی رکھنی چاہیے کہ اس کے مدرسے میں بہت جلد نئے تدریسی طریقے رائج ہو جائیں گے۔ خواہ ان طریقوں کو جدید ناموں سے پکارا جائے یا نہ پکارا جائے۔

تعلیمی دنیا پر ایک نظر

برطانیہ کے زیر حفاظت علاقوں میں تعلیمی ترقی

زیر نگرانی علاقوں میں برطانیہ کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ جب ان کو آزادی ملے تو ان کا تعلیمی نظام اتنا موثر اور صحت مند ہو کہ وہ مزید تعمیر و ترقی کی بنیاد بن سکے۔

یہ ہیں وہ الفاظ جو برطانیہ کے دفتر نوآبادیات کے سرا ینڈریو کوہین نے اس وقت کہے جب موصوف اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کی چوتھی تولیتی کمیٹی کے روبرو ماتحت علاقوں کی تعلیمی ترقی سے متعلق اپنی رپورٹ پیش کر رہے تھے۔ انہوں نے کہا کہ چار باتوں کو مدنظر رکھ کر برطانوی پالیسی مرتب کی گئی ہے۔ اول یہ کہ تعمیر و ترقی کے لیے تعلیم بہت ضروری ہے۔ بہتر لیڈروں کے بغیر قومی تعمیر ممکن نہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ زیر نگرانی علاقوں کے باشندوں کو اس بات کے لیے تربیت دینا کہ وہ اپنے ملک کا انتظام خود سنبھال سکیں، برطانوی نظم و نسق کی ایک نمایاں خصوصیت رہی ہے۔

دوسرے یہ کہ تعلیم کا مسئلہ ایک عالمگیر مسئلہ ہے۔ دنیا کے پانچ سے چودہ سال تک کی عمر کے ۵۵ کروڑ بچوں میں سے ۲۵ کروڑ بچے ایسے ہیں جن کو تعلیم میسر نہیں۔ اور ان کی صرف تھوڑی سی تعداد زیر نگرانی علاقوں میں پائی جاتی ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ برطانیہ کی رائے میں تعلیمی نظام مقامی اداروں کو چلانا چاہیے۔ یہ چیز ایک ایسا نظام قائم کرنے کی برطانوی پالیسی کے مطابق ہوگی جس سے حکومت خود اختیاری بتدریج نشوونما پا سکتی ہے۔

آخری بات یہ ہے کہ ماتحت علاقوں میں تعلیم کی مانگ نے اتنی زیادہ شدت اختیار کر لی ہے کہ اسے غیر معمولی قرار دیا جا سکتا ہے۔ باہر سے کافی بڑی امداد کے باوجود مانگ ذرائع سے بڑھ چکی ہے۔ برطانیہ نے [illegible] سے [illegible] تک نوآبادیاتی ترقی و فلاح و بہبود کے فنڈوں میں سے تقریباً دو کروڑ سات لاکھ پونڈ تعلیمی مقاصد کے لیے دیے ہیں۔ صلاح و مشورے دینے والے ماہرین اور عملہ کی خدمات کو

فراہمی اس کے علاوہ ہے۔ ویسے تمام زیر نگرانی علاقوں میں بالآخر برطانیہ کا مقصد یہ ہے کہ سب بچوں کو مفت اور لازمی تعلیم دی جائے۔ چناں چہ گذشتہ پانچ سال میں پرائمری سکولوں میں داخلہ لینے والے بچوں کی تعداد میں خاصا بڑا اضافہ ہوا ہے۔ بیشتر علاقوں میں کم از کم پچاس فی صد اور کئی دوسرے علاقوں میں اس سے بھی زیادہ اضافہ ہوا ہے۔ ایک نمایاں مثال مغربی نائیجیریا کی ہے۔ جہاں اضافہ ۱۴۴ فی صد ہے عام طور پر پرائمری درجہ میں ایک بچہ پانچ سے آٹھ سال تک رہتا ہے۔ چھ سالہ بنیادی کورس اب مقبول ہو رہا ہے۔ اور اسے متعدد زیر نگرانی علاقوں مثلاً مغربی نائیجیریا، گیمبیا، یوگنڈا، شمالی بورنیو، سنگاپور، اور ہانگ کانگ میں شروع کیا گیا ہے۔

اسکولوں میں اب زیادہ لڑکیاں داخل ہو رہی ہیں۔ لیکن اس معاملہ میں وہ ابھی تک لڑکوں سے پیچھے ہیں۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ عورتوں کو مردوں کے مقابلہ میں اب تک کم رتبہ حاصل رہا ہے (حالانکہ اب اس میں بتدریج تبدیلی ہو رہی ہے) اور ملازمت وغیرہ میں مردوں کو عورتوں پر ترجیح دی جاتی ہے سر اینڈریو نے اپنی رپورٹ میں مزید اپنی رپورٹ میں یہ بتایا ہے کہ نسل رنگ یا مذہب کا امتیاز برتے بغیر تعلیم کو ترقی دینا برطانوی پالیسی کا بنیادی اصول ہے۔ ایک نسلی علاقوں میں تو کوئی مسئلہ نہیں لیکن جن علاقوں میں ایک سے زیادہ نسلوں کے لوگ آباد ہیں وہاں ترقی کی جانب قدم اٹھانا اتنا آسان کام نہیں ایک مربوط تعلیمی نظام مشترکہ قومیت کے احساس کی نشو و نما میں نہایت مؤثر ذریعہ ثابت ہو سکتا ہے لیکن اس کی راہ میں مشکلات بہت زیادہ ہیں۔ آگے چل کر سر اینڈریو نے کہا کہ سب سے بڑی مشکل زبان اور روایات کی ہیں لیکن نسلی تعاون کی جو عملی مثالیں اب ہمیں مل رہی ہیں ان سے ہماری بڑی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔

ویسے ثانوی تعلیم ترقی کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ کیوں کہ یہ یونیورسٹیوں اور کالجوں کو طلبا مہیا کرتی ہے گذشتہ پانچ سال کے دوران یونیورسٹیوں اور کالجوں کا میدان کافی وسیع ہو گیا ہے۔ نیا سالینڈ اور یوگنڈا جیسے علاقوں میں دو سو فی صد اور مغربی نائیجیریا میں سات سو فی صد سے بھی زیادہ توسیع ہوئی ہے۔ ایک مشکل اساتذہ کی قلت ہے۔ برطانیہ اور دیگر دولت مشترکہ ملکوں نے اساتذہ کی تربیت سے متعلق

خاصی بڑی امداد دینے کا وعدہ کیا ہوا ہے۔

اعلیٰ تعلیم کی اہمیت بھی بہت زیادہ ہے۔ اور [illegible] سے زیر حفاظت علاقوں میں یونیورسٹیوں کی تعمیر و ترقی کے سلسلہ میں کافی کام ہوا ہے۔ علاوہ ازیں تعلیم کے اعلیٰ معیار پر بہت زور دیا گیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ شروع میں طلبہ کی تعداد محدود رہی ہے اور چند یونیورسٹیاں قائم کی گئی ہیں، لیکن یہ پالیسی کامیاب رہی۔ اب اب توسیع کا کام بڑی تیزی سے ہو رہا ہے۔ برطانیہ نے کالج اور یونیورسٹیاں قائم کرنے میں خاصی بڑی مالی امداد دی ہے۔ یہی نہیں بلکہ زیر نگرانی علاقوں کے طلبا کی ایک بڑی تعداد برطانوی یونیورسٹیوں میں بھی زیر تعلیم ہے۔ اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ سنہ ۱۹۵[illegible]ء کے تعلیمی سال میں ان کی تعداد گیارہ دو سو تھی۔

آخر میں سر اینڈریو نے کہا کہ تعلیمی کام سے متعلق زیادہ خوش فہمی کے اظہار کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ لیکن اس بات کی بھی کوئی وجہ نہیں کہ جو کامیابی حاصل کی گئی ہے اس کا اعتراف نہ کیا جائے۔ میں یقین سے یہ کہہ سکتا ہوں کہ جب تاریخ لکھی جائے گی تو برطانیہ کی تعلیمی کوششوں کو جو اس نے گذشتہ ۱۵ سال میں کی ہیں، ایک بہت بڑا کارنامہ قرار دیا جائے گا۔

پاکستانی گریجویٹوں کا برطانیہ میں مطالعہ

دو پاکستانی ان دنوں امپیریل کالج آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی میں ایک ڈپلوما کورس کر رہے ہیں یہ گورنمنٹ کالج آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی لاہور کے گریجویٹ اکیس سالہ محمد فاروق عادل، اور تیئیس سالہ آفتاب عالم ہیں۔ جو تین ماہ پہلے پاکستان شیل آئل کمپنی کے وظیفوں کے تحت مطالعہ کی غرض سے برطانیہ گئے تھے۔ اب یہ دونوں ایک سال کا پوسٹ گریجویٹ کورس کر رہے ہیں۔

مسٹر فاروق عادل جو لاہور میں میکینکل انجینئرنگ کا مطالعہ کر چکے ہیں۔ اب پٹرولیم انجینئرنگ میں کورس کر رہے ہیں۔ ان کے علاوہ مسٹر آفتاب عالم جنھوں نے پہلے طبیعیات اور علم ریاضی کا مطالعہ کیا۔ اب ارضی طبیعیات کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ دونوں گریجویٹوں کے نزدیک کالج میں متعدد دل چسپیاں اور مصروفیات ہیں۔ جن میں ان کا بیشتر فالتو وقت صرف ہوتا ہے۔ کالج میں لیکچروں کے ایک

مطالعاتی پروگرام میں حصہ لینے کے علاوہ بحث و مباحثہ میں شرکت اور غیر نصابی نوعیت کی فلمیں دیکھتے ہیں۔ مزید یہاں معذور پاکستانی بے شمار انجمنوں اور کلبوں سے تعلق رکھتے ہیں جن کی بدولت ان کا دنیا کے تمام حصوں سے آنے والے طلباء سے رابطہ قائم ہے۔ برٹش کونسل اور ہیل انٹرنیشنل کی بدولت جو لندن میں طلباء کے دوران قیام میں ان کی دیکھ بھال کرتی ہے۔ وہ برطانوی خاندانوں سے ملتے جلتے رہتے ہیں۔ اور اس طرح انہوں نے اپنے بے شمار دوست بنا لیے ہیں۔

نرسنگ ——— ایک عظیم پیشہ

کوئی سو سال اُدھر کی بات ہے جب فلورنس نائٹ انگیل نے ۱۸۶۰ء میں سینٹ ٹامس ہسپتال لندن میں پہلے نرسوں کے تربیتی سکول کی داغ بیل ڈالی اور اسی دن سے گویا جدید فن نرسنگ کی نہ صرف برطانیہ بلکہ تمام دنیا میں شروعات ہو گئی تھی۔ اب اس سکول کی صد سالہ سالگرہ اسی سال منائی جا رہی ہے۔ فلورنس نائٹ انگیل نے تعلیمیافتہ عورتوں کے لیے نرسنگ کو ایک اہم اور باعزت پیشہ بنایا جس میں اس سے پہلے تک مشکوک چال چلن کی عورتیں آتی تھیں، جن کا میلان طبیعت فن کی خدمت نہ کیا ہوتا۔ بلکہ ان کا جب کبھی بس چلتا وہ اپنے کپڑوں میں مشروبات یا دواؤں کی شیشیاں چھپا کر لے جاتیں بہر حال فلورنس نائٹ انگیل نے نرسوں اور نرسوں کی استانیوں اور دائیوں کی تربیت کے جو اصول وضع کیے وہ آہستہ آہستہ دنیا بھر میں اپنائے جانے لگے۔

۱۹۱۰ء میں جب نوے برس کی عمر میں انہوں نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا تو وہ اس انقلاب کو پروان چڑھتے دیکھ چکی تھیں۔ لیکن اس کے بعد کے تیس سال میں ترقی کی رفتار اتنی زیادہ تیز نہیں رہی۔ بعض ہسپتالوں میں نرسوں کی ذمہ داریوں میں تو بے انتہا اضافہ ہو گیا۔ لیکن ان میں اور اجرتوں میں کوئی مناسبت قائم نہ رہ سکی۔ پھر دوسری جنگ عظیم کے بعد نرسنگ نے حیرت انگیز ترقی کی۔ اور اگر فلورنس نائٹ انگیل زندہ ہوتیں تو آج برطانیہ کی نرسوں کو جو سہولتیں حاصل ہیں ان کو جو معقول اجرتیں مل رہی ہیں اور انہیں معاشرہ میں جو عزت حاصل ہے اس سے وہ یقیناً حیرت زدہ رہ جاتیں۔

زمانۂ جنگ کی تبدیلی: دراصل اس تبدیلی کا اصل محرک وہ عام عظیم تغیر یا انقلاب تھا جو دوسری عالمگیر جنگ کے بعد دیکھنے میں آیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہزاروں عورتیں جو زیادہ تر شادی شدہ تھیں، اور جنگ کے ایک لازمی کام کے طور پر نرسنگ اختیار کر چکی تھیں، اب جنگ ختم ہونے پر اپنے وطن واپس جانے کی آرزومند تھیں۔ ادھر ہسپتالوں کو نرسوں کی خدمات حاصل کرنا دشوار ہو رہا تھا۔ چناں چہ وزارت صحت اور ہسپتالوں کے منتظمین نے شدت سے محسوس کیا کہ نرسنگ نگہداشت کی خدمات حاصل کرنے کی غرض سے فی الفور اقدامات کرنے کی ضرورت ہے۔

غرضیکہ پہلا قدم یہ اٹھایا گیا کہ فاضل وقت میں کام کرنے والی نرسوں کا ایک محفوظ دستہ قائم کیا جائے۔ یہ ایک ایسا قدم تھا جس سے اگر حالات کچھ اور ہوتے تو شاید چند ہی سیٹیں مقرر ہوتیں۔ مثال کے طور پر ایسی شادی شدہ خواتین بھی تھیں جو اپنی چند ساعتیں خدمت کے لیے وقف کر سکتی تھیں جو اپنے جنگ سے پہلے کے پیشوں میں واپس جا چکی تھیں، اور اب ہفتہ کے آخری دو روز یا ہفتہ کی ایک دو شاموں میں خدمات انجام دینے کے لیے تیار تھیں۔ ہاں وہ محفوظ دستہ جو ہنگامی حالات کے پیش نظر قائم کیا گیا تھا، اب مستقل ہو چکا ہے۔ اور اس کی بدولت نرسیں ہفتہ میں عام اوقات کار کی پابند ہیں۔

سہولتیں: دوسری جنگ عظیم کے بعد نظر یہ آ رہا تھا کہ پندرہ روز میں ۹۶ گھنٹے کام کرنے کا جو نصب العین پیش نظر رکھا گیا تھا وہ شاید حاصل نہ ہو سکے۔ لیکن آج بیشتر ہسپتالوں میں نرسیں ہفتہ میں ۴۴ گھنٹے کام کرتی ہیں۔ مزید برآں، فاضل اوقات میں کام کرنے والی نرسوں کا محفوظ دستہ جس میں دس سال پہلے کے مقابلہ میں دس ہزار زائد نرسیں ہیں، اس بات کی ضمانت ہے کہ باقاعدہ خدمات انجام دینے والی نرسوں کو وقت پر چھٹی ملے گی۔ اور وہ اپنی تعطیلات معمول کے مطابق لے سکیں گی۔

ان حالات کو بہتر بنانے کے ساتھ ساتھ نرسوں کے مکانات کو بہتر بنانے اور انھیں تمام سہولتیں دینے کے لیے ہر ممکن کوشش کی گئی ہے۔ یہی نہیں بلکہ مطالعہ اور سونے کے ہوادار اور روشن کمرے اور بڑے بڑے ہال کمرے نرسوں کو فراہم کیے گئے۔ تاکہ ان میں وہ اپنے مہمانوں کو

خاطر تواضع کر سکیں۔ پھر مباحثہ کلب، شوقیہ ڈرامے کھیلنے کی سوسائٹیاں اور نغمہ خواں جماعتوں کے قیام سے ہسپتال کی سماجی زندگی میں یکسر تبدیلی پیدا ہو گئی۔ اس پر مستزاد یہ کہ ڈاکٹروں اور نرسوں کے درمیان جو ناقابل عبور حد قائم تھی وہ توڑ ڈالی گئی اور اب ڈاکٹر اور نرس ہسپتال کی سماجی سرگرمیوں میں مل جل کر حصہ لینے لگے۔

بڑے بڑے ہسپتالوں کے نظم و نسق کو دیکھیے تو اس میں بھی انقلابی تبدیلیاں کی گئی ہیں اور نرسوں کے ذمہ جو بیگار تھی وہ ختم کر دی گئی۔ اس اثنا میں اس کی تنخواہ میں جو کسی زمانہ میں گھر کے ملازم کی اجرت سے کچھ زیادہ نہ تھی، تیزی کے ساتھ اضافہ کیا گیا ہے۔

اعلیٰ صلاحیتیں : یہاں یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ دوسرے پیشوں کی طرح نرسنگ میں اب بھی بہت سی اصلاحات کی ضرورت ہے۔ مثال کے طور پر ہسپتالوں کی پرانی عمارتیں ہیں جن کی نگران میٹرنیں ہیں، اور جن کے نظم و ضبط کے اصول اور طریقے وقت کے نئے تقاضوں کے اتنے زیادہ مطابق نہیں۔ بہر حال مسلسل بہتری کا جو رجحان پیدا ہو چکا ہے اور جسے وزارت صحت نے تیزی سے آگے بڑھایا ہے۔ اس سے یہ آس بندھ گئی ہے کہ کوئی ہسپتال پرانے طور طریقوں پر قائم نہیں رہ سکے گا۔ بنظر غائر دیکھا جائے تو دنیائے طب میں جو جدید ترقیاں ہوئیں ان کی بدولت نرسنگ ایسا باقاعدہ پیشہ بن چکا ہے جس میں فنی چابک دستی اور اعلیٰ صلاحیتوں کی ضرورت ہے۔ تاہم اس سے اچھا عمل کرنے والی نرسوں کی ضرورت بھی ختم نہیں ہوتی، جو مشکل سے امتحانات پاس کیے بغیر مریضوں کی ہر طرح دیکھ بھال اور ان کی نرسنگ بڑی خوبی سے کر سکتی ہیں۔

مختصر کورس : ویسے اس صورت حال سے نمٹنے کی غرض سے سرکاری اسسٹنٹ نرس کی سند رکھی گئی جس کے لیے دو سال کا کورس، جبکہ سرکاری رجسٹرڈ نرس بننے کے لیے تین سال کا تربیتی کورس کرنا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ مختصر کورس اور ایک سال کا تجربہ ان بے شمار لڑکیوں کے لیے باعث کشش ہے جو کافی پڑھی لکھی تو ہیں لیکن اس ذمہ داری اور نرسنگ کی خاص تربیت کی خود کو اہل نہیں پاتیں۔ چنانچہ ان تبدیلیوں کی بدولت گذشتہ دس سال میں انگلستان اور ویلز میں پورے وقت

کام کرنے والی نرسوں کی تعداد میں فی صد بڑھ چکی ہے۔ بعض ہسپتالوں میں داخلہ کی اتنی درخواستیں آتی ہیں کہ یہ نشستوں سے کہیں زیادہ ہوتی ہیں۔ یہ صورت حال ایسے زمانہ میں ہے جبکہ روزگار ہر جگہ آسانی سے مل جاتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ اب معاشرہ میں نرس کا رتبہ بدل چکا ہے۔ ادھر ہسپتال وسیع النظر، ہمدرد اور مقابلتاً کم عمر عورتوں کو میٹرن مقرر کر رہے ہیں۔ ہسپتال کے باہر عوامی زندگی میں بھرپور حصہ لینے کی غرض سے ہسپتال ان کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔

ترقی پذیر ممالک کا معیار زندگی بلند کیا جا رہا ہے۔

وزیراعظم برطانیہ مسٹر میکملن نے نئے سال کے موقعہ پر ایک پیغام میں کہا ہے کہ میں آئندہ دس سال کے بارے میں بڑا پُرامید ہوں۔ مجھے ناامیدی کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ اس لیے بھی کہ میں طبعاً رجائیت پسند ہوں۔ میرا خیال ہے کہ شک وشبہ اور یاس وقنوطیت کے جذبہ سے عظیم کاموں اور ذمہ داریوں تک رسائی سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ ہماری دعا ہے کہ خدا کرے سنہ ۱۹۶۰ء کا سال شاہراہ امن پر مزید پیش قدمی کا باعث ہو۔ ایک مضمون میں، جو برطانیہ کے ایک جریدہ میں شائع ہوا، مسٹر میکملن نے لکھا ہے کہ برطانیہ کا فرض ہے کہ وہ اس کے لیے پوری کوشش کرے کہ ترقی پذیر ممالک خصوصیت کے ساتھ دولت مشترکہ ممالک کا معیار زندگی بڑی تیزی کے ساتھ اونچا ہو۔ اس سلسلہ میں ہم نے بہت کچھ کام کیا ہے اور مزید کوششوں کی ضرورت ہے۔

امید افزا حالات: آگے چل کر وزیراعظم نے کہا ہے کہ برطانیہ کو امن عالم کی بنیادوں کو مضبوط ومستحکم بنانے میں عملی کام کرنا چاہیے۔ اس لیے کہ آنے والے سالوں میں مدبروں کا یہ ایک عظیم کام ہوگا۔ سنہ ۱۹۵۹ء میں بھی حالات کافی امید افزا رہے۔ اس میں ڈرانے دھمکانے کی بجائے مذاکرات کا روز افزوں جذبہ پایا گیا ہے۔ اب سنہ ۱۹۶۰ء میں ہمیں جو کام کرنا ہے وہ یہ ہے کہ ہم نئی اور مضبوط بنیادیں استوار کریں، تاکہ تمام اقوام جدید سائنس کے فائدے اٹھا سکیں۔

اسٹرلنگ کا استحکام: مضمون میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ برطانیہ کو چاہیے کہ وہ اسٹرلنگ کے نہ

مضبوط و مستحکم بنائے رکھے تاکہ دنیا میں اسے وقعت کی نظر سے دیکھا جائے۔ علاوہ ازیں برطانیہ کو بیرونی منڈیوں میں اپنی اشیاء کی قیمتوں کو ایسی مناسب سطح پر رکھنا ہوگا، جہاں یہ دوسرے ملکوں سے مقابلہ کر سکے اس اساس پر ہم خوش حالی کی امید کر سکتے ہیں۔

پاکستان میڈیکل کمیشن کے لیے دو پروفیسر

برطانوی یونیورسٹیوں کے دو پروفیسر ۱ جنوری کو بذریعہ طیارہ برطانیہ سے پاکستان روانہ ہو گئے ہیں یہاں وہ حکومت پاکستان کے قائم کیے ہوئے ایک کمیشن میں شامل ہوں گے جس کے سپرد یہ کام ہوا ہے کہ وہ طبی تعلیمی کام کی جانچ پڑتال نیز اس بارے میں سفارشات پیش کرے۔

یہ ہیں پروفیسر ہنری پرسی گولڈنگ جو برمنگھم یونیورسٹی میں علم عضویات کے پروفیسر ہیں اور پروفیسر چارلس الیگزانڈر ویلز جو لیورپول یونیورسٹی میں علم جراحی کے پروفیسر ہیں۔ یہ پروفیسر حکومت پاکستان کی درخواست پر پاکستان آ رہے ہیں۔

پروفیسر ویلز جن کی عمر ۶۲ سال ہے، تین سال قبل رائل کالج آف سرجنز کی طرف سے پاکستان کا دورہ کر چکے ہیں۔ اس میں انھوں نے مطالعہ کی غرض سے ان تعلیمی ہسپتالوں اور طبی اسکولوں کا دورہ کیا تھا، جن میں انڈر گریجویٹ اور پوسٹ گریجویٹ تعلیم کا انتظام ہے۔

پروفیسر گولڈنگ نے جن کی عمر ۶۲ سال ہے حال ہی میں ایک اخباری نمائندہ کو بیان دیتے ہوئے کہا کہ میں پاکستان کے طبی اسکولوں کے دورہ کا انتہائی دلچسپی اور بڑی بے تابی کے ساتھ انتظار کر رہا ہوں۔ پاکستان کے انڈر گریجویٹ میرے شاگرد رہ چکے ہیں اور مجھے ان میں سے چند سے ملاقات کر کے بہت خوشی ہوگی۔

[جنوری] لاهور ۱۱ شماره ۱۰]

اس شمارہ میں

ادارہ تحریر { پروفیسر سراج الدین، پروفیسر میاں نامدار خاں

معاونین { عبدالغفور چوہدری، افضل احمد

تعلیمی ماہنامہ

آموزش
لاہور

جنوری سنہ ۱۹۶۰ء

جلد ــــــــــ ۱۲
شمارہ ــــــــــ ۱۰

سالانہ چندہ
پاکستان کے لیے ۶ روپے
غیر ممالک کے لیے ۸ روپے

قیمت فی پرچہ دس آنے

پبلشر
یونی ورسٹی بک ایجنسی ۔ لاہور

تعلیمی کمیشن کی رپورٹ

میاں نامدار خاں

تعلیمی کمیشن کی رپورٹ جس کی طرف اکثر لوگوں کی آنکھیں لگی تھیں اب منظرِ عام پر آ چکی ہے۔ اس پر ایک سرسری نظر ڈالنے کے بعد ہر شخص صدرِ جمہوریہ کے اس خیال سے اتفاق کرے گا کہ تعلیمی کمیشن کی سفارشوں کو عملی جامہ پہنانے سے قومی زندگی میں ایک خوش گوار اور ہمہ گیر انقلاب پیدا کیا جا سکے گا۔ حکومت ان سفارشوں کو قبول کر چکی ہے۔ بڑی بڑی سفارشیں درج ذیل ہیں :

۱۔ پرائمری تعلیم : ملک میں جمہوری نظام کو مضبوط بنانے اور قومی زندگی کو ترقی کی راہ پر لگانے کے لیے ضروری ہے کہ تمام شہری پڑھے لکھے ہوں۔ یہ غرض حاصل کرنے کے لیے پندرہ سال کا عرصہ مقرر کیا گیا ہے۔ پہلے دس برسوں میں پانچویں جماعت تک کی تعلیم ہر ایک کے لیے لازمی اور مفت کر دی جائے گی اور اگلے پانچ برسوں میں اس لازمی تعلیم کی حد آٹھویں جماعت تک بڑھا دی جائے گی۔ پرائمری تعلیم کا عرصہ بڑھانے سے دو مقاصد حاصل کرنے مطلوب ہیں : (۱) پرائمری پاس کرنے والے دوبارہ ناخواندگی یا نیم خواندگی کا شکار نہ بن جائیں۔ (۲) پرائمری مدرسے کے آخری مراحل پر تعلیم کو فنی رنگ دیا جا سکے تاکہ آگے چل کر طلبہ اور طالبات ثانوی درجے کی فنی تعلیم سے فائدہ اٹھا سکیں۔

۲۔ ثانوی تعلیم : اب تک ہماری ثانوی تعلیم کی سب سے بڑی کمی یہ رہی ہے کہ اس نے نوجوانوں کو یونیورسٹی تعلیم کے لیے تیار کرنے کی خاطر صرف علمی قسم کی تعلیم کا بندوبست کیا ہے۔ ثانوی نصاب پورے طور پر علمی قسم کا رہا ہے۔ اور اس میں فنی تعلیم و تربیت کی سرے سے کوئی گنجائش نہیں۔ حکومت نے کمیشن کی اس سفارش کو منظور کر لیا ہے کہ اس افسوس ناک صورتِ حال کا خاتمہ کر دیا جائے۔ اب ثانوی تعلیم

یونیورسٹی کی گرفت سے بالکل آزاد ایک نیا نصاب جامع اور متوازن نصاب پیش کرے گی۔ ایک ایسا نصاب جس میں چند لازمی مضامین کی مشترکہ بنیاد کے ساتھ ہی زرعی، تجارتی اور ٹیکنیکل مضامین کے لیے بھی جگہ ہو گی۔ اس اصلاح کا مقصد یہ ہے کہ نوجوانوں کی اکثریت جب ثانوی مدرسے سے فارغ ہو تو کوئی خاص فنی مہارت حاصل کر کے نکلے تاکہ بیشتر نوجوانوں کو پیشے کی تلاش میں سرگرداں نہ ہونا پڑے۔

۳۔ ثانوی تعلیم کو ایک الگ اور خود کفیل حیثیت دے کر کمیشن نے دراصل یونیورسٹی تعلیم کی اصلاح کا سامان بہم پہنچایا ہے۔ یونیورسٹی تعلیم فی الحقیقت ان غیر معمولی قابلیت کے طلبہ اور طالبات کے لیے مخصوص ہونی چاہیے۔ جو علوم و فنون کے میدانوں میں تحقیق و انکشاف کی ذمہ داری سنبھال سکیں۔ مگر اب تک ہماری یونیورسٹیوں کے دروازے ہر اس شخص کے لیے کھلے تھے جو پڑھائی کے اخراجات ادا کر سکے۔ اب یہ فیصلہ کر لیا گیا ہے کہ اعلیٰ تعلیم صرف وہ چیدہ طلبہ اور طالبات حاصل کریں گے جو حقیقی قابلیت کا ثبوت دیں، خواہ ان کی مالی حیثیت کچھ بھی ہو۔

۴۔ دوسرے اہم پہلو: ان انقلابی تبدیلیوں کے علاوہ نظام تعلیم میں بہت سی اور اہم اصلاحات بھی کی جائیں گی۔ مثلاً دینی تعلیم آٹھویں جماعت تک ہر مسلمان بچے کے لیے لازمی ہو گی۔ مگر یہ تعلیم ایسی ہو گی جو عملی اخلاق کو بلند اور نگاہ کو کشادہ کرنے والی ہو۔ تعلیم کے ہر درجے پر ہاتھ سے کام کرنے کو نصاب کا لازمی جزو بنایا گیا ہے۔ تاکہ کوئی پڑھا لکھا آدمی کام کرنے کو عار نہ سمجھے۔ نظام امتحانات کی اصلاح کے لیے زمانہ طالب علمی کی کارکردگی کے لیے ایک چوتھائی نمبر مقرر کیے گئے ہیں۔

یہ ساری اصلاحات ملک کے نظامِ تعلیم میں ایک نئے دور کا آغاز کرنے والی ہیں +

بچوں کو ضبط کا عادی بنائیے

فضل احمد

لاڈ پیار کی ضرورت

اولاد سے محبت کرنا ایک فطری جذبہ ہے۔ یہ جذبہ انسانوں کی طرح حیوانوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ ماں باپ اپنے بچوں سے اس لیے محبت نہیں کرتے کہ وہ آگے چل کر ان سے مادی فائدے حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ بلکہ وہ اس لیے محبت کرتے ہیں کہ وہ محبت کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ اپنے بچوں سے محبت کرنا حیواتی خیر میں ہے۔ انسان حیوان ناطق ہونے کے سبب اس فطری جذبے میں دوسرے حیوانوں کے ساتھ برابر کا شریک ہے۔

فطرت کے کارخانے میں کوئی چیز بے کار نہیں بنائی گئی۔ اگر تمام حیوان اپنے بچوں کے ساتھ محبت کرنے پر مجبور ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ محبت بچوں کی صحت مند نشو و نما کے لیے ضروری ہے۔ بچہ حیوان کا ہو یا انسان کا اسے آخر کار اپنی دنیا پر قابو حاصل کرنا ہوتا ہے۔ اس کے بغیر اس کی زندگی خطرے میں رہتی ہے۔ لیکن ماحول پر قابو پانے کے لیے اسے کچھ نہ کچھ وقت چاہیے۔ وہ ماں کے پیٹ سے نکلنے کے ساتھ ہی ماحول کے سارے تقاضوں کا ساتھ نہیں دے سکتا، جب تک وہ ایسا نہ کر سکے اس وقت تک اسے کسی سہارے کی ضرورت ہے۔ فطرت نے اسے یہ سہارا ماں، باپ کی محبت کی شکل میں مہیا کیا ہے۔ ماں باپ خواہ حیوان ہوں یا انسان وہ اپنے چھوٹے بچوں کی خاطر تکلیف اٹھانے میں راحت محسوس کرتے ہیں۔ وہ خود ہر قسم کی محرومی برداشت کر کے اپنے چھوٹے بچوں کو بھوک یا پیاس اور دوسری آفات سے بچاتے ہیں۔ حد یہ ہے کہ برفانی علاقوں کا ایک چھوٹا سا چھپا نما جانور جب یخ بستہ زمین پر اپنے بچوں کے لیے کوئی خوراک تلاش نہیں کر سکتا تو وہ اپنے آپ کو ان کے آگے کھانے کے لیے ڈال دیتا ہے۔ اور یہ ننھی جانیں اپنی ماں کے گوشت پر پل کر بڑی ہو جاتی ہیں۔

بے بسی کا جس قدر لمبا عرصہ انسانی بچے کے حصے میں آیا ہے وہ کسی اور حیوان کے بچے کا حصہ نہیں

دوسرے حیوانوں کے بچے چند گھنٹوں، چند دنوں، چند ہفتوں یا زیادہ سے زیادہ چند مہینوں میں کم و بیش اس قابل ہو جاتے ہیں کہ اپنی سب ضرورتیں خود پوری کر لیں۔ مگر انسانی بچہ کئی سالوں تک خود مختاری کی اس منزل تک نہیں پہنچتا۔ سچ یہ ہے کہ بلوغت کی عمر کو پہنچنے تک وہ عموماً کسی نہ کسی رنگ میں ماں باپ کا دست نگر رہتا ہے۔

ماں باپ کی محبت محض مادی ضرورتیں پوری نہیں کرتی بلکہ وہ ایک اہم نفسیاتی ضرورت کو بھی پورا کرتی ہے نفسیاتی مطالعوں نے یہ بات پوری طرح ثابت کر دی ہے کہ شخصیت کی تعمیر میں احساس سلامتی کو کلیدی درجہ حاصل ہے۔ احساس سلامتی سے مراد صرف یہ نہیں کہ کھانے پینے کو اچھا ملے یا دوسری سہولتیں میسر ہوں۔ یہ چیزیں بھی ضروری ہیں۔ لیکن احساس سلامتی کے لیے ان سے بڑھ کر ایک اور شے کی ضرورت ہے اور وہ چیز ہے کسی کا محبوب و مطلوب ہونا۔ بچوں کو اس بات کی بے حد پیاس رہتی ہے کہ کوئی ان کا چاہنے والا اور ناز برداری کرنے والا ہو۔ ایسے اشخاص کا وجود ان کی خودی کو سہارا دیتا اور ان کے اندر بھروسہ پیدا کرتا ہے۔ جو بچے اس قسم کے سہارے سے محروم رہیں ان کی شخصیتیں کبھی وہ پائداری حاصل نہیں کر سکتیں جو بصورت دیگر انھیں حاصل ہوتی۔

اس حقیقت کے پیش نظر جدید نفسیات کا متفقہ فیصلہ یہ ہے کہ برے سے برا گھر بھی بچوں کی تربیت کے لیے بہترین تربیت گاہ سے اچھا ہے۔ زیادہ عرصہ نہیں گذرا یہ خیال کیا جانے لگا تھا کہ چونکہ والدین میں سے اکثر نفسیاتی اصولوں سے واقف نہیں ہوتے اس لیے بچوں کی بہترین تربیت کی یہ صورت ہے کہ انھیں بلند پایہ تربیت گاہوں میں بھیج دیا جائے جو ماہرین نفسیات کی نگرانی میں چل رہی ہوں۔ مگر اس قسم کے تجربے چنداں کامیاب ثابت نہیں ہوئے۔ وجہ یہ کہ اچھی سے اچھی تربیت گاہ بھی دوسری ہر سہولت بہم پہنچا سکتی ہے مگر ماں باپ کے لاڈ پیار کا بدل فراہم نہیں کر سکتی۔ اور اس چیز کی کمی شخصیت کی تعمیر میں ایک ایسا خلا چھوڑ دیتی ہے جسے پورا کرنا کسی طرح ممکن نہیں۔ ماں باپ کے لاڈ پیار کی مثال سورج کی روشنی کی ہے۔ جو ننھا پودا اس جان بخش روشنی سے محروم ہو اسے بہترین قسم کی زمین، اچھی سے اچھی کھاد اور شاہی دیکھ بھال بھی بہت زیادہ فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔

یہ اسی نفسیاتی حقیقت کا احساس تھا جس نے قرآن حکیم کو یہ تاکید کرنے پر مجبور کیا کہ "یتیم پر سختی مت کرو" جو بچہ ماں باپ کے لاڈ پیار سے محروم ہو وہ اتنی بڑی سختی کا شکار ہے کہ کسی اور کو اس پر مزید سختی کرنے

حق نہیں پہنچتا۔ بچے کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی اور مصیبت نہیں ہو سکتی کہ وہ اس لاڈ پیار سے محروم کر دیا جائے جو اس کی ہر دوسری محرومی کا ایک حد تک ازالہ کر سکتا ہے۔

بچے کو بگاڑیے نہیں

چھوٹے بچوں کے حکم میں ایک آمر کی سی سختی ہوتی ہے۔ وہ جس چیز کے پیچھے پڑ جائیں اس کا مطالبہ ایسی شدت سے کرتے ہیں کہ ماں باپ کو اکثر ان کا کہا ماننا ہی پڑتا ہے۔ مگر یہ صورت حال بہت ابتدائی بچپن میں ہی قابل قبول ہو سکتی ہے۔ جونہی بچہ ذرا ہوش سنبھالے ماں باپ کا فرض ہے کہ اسے دوسرے کی ضرورتوں اور مجبوریوں کا بھی احساس دلائیں۔ ماں باپ کو یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ لاڈ پیار کے معنی اپنے آپ کو بچوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دینا نہیں۔ چوں کہ ماں باپ یہ غلط راہ اختیار کرتے ہیں، وہ بچے کو ایک ایسی لت ڈال رہے ہیں جس کا چھوٹنا محال ہے۔

اصولاً یہ چاہیے کہ جوں جوں بچہ سیانا ہوتا جائے اس کے ہر مطالبے کو معقولیت کی کسوٹی پر پرکھا جائے اور جہاں کہیں وہ غیر معقول مطالبہ کرے اسے اس کی نامعقولیت کا احساس دلایا جائے جو ماں باپ یہ راہ اختیار کرتے ہیں وہ بچے پر بڑا احسان کرتے ہیں۔ اس طرح بچہ جائز و ناجائز میں تمیز کرنے لگتا ہے۔ اسے یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ زندگی کی ساری اچھی چیزیں اکیلے اس کے لیے نہیں بلکہ دوسرے لوگ بھی ان میں برابر کے حصہ دار ہیں۔ یہ شعور بچے کے ذہن اور اس کی شخصیت میں ایک صحت مند توازن پیدا کرتا ہے۔ لیکن اگر بدقسمتی سے ماں باپ نے معقولیت کی یہ راہ اختیار نہیں کی۔ اگر انھوں نے اس کی جائز و ناجائز بات کے آگے سر جھکا دیا ہے تو بس پھر انھوں نے اپنے اوپر ایک ایسا سخت گیر آمر مسلط کر لیا ہے جس سے وہ مدت تک اور شاید مدت العمر چھٹکارا نہ پا سکیں گے۔ مطلق العنانی کی لذت کچھ ایسی لذت ہے کہ بقول شاعر ؎

چھٹتی نہیں ہے یہ کافر منہ سے لگی ہوئی

ماں باپ اپنی اولاد کے بھولے پن کے متعلق خواہ کیسی ہی غلط فہمی میں مبتلا ہوں۔ سچ یہ ہے کہ بچے بہت چھوٹی عمر میں یہ بات اچھی طرح سمجھ جاتے ہیں کہ ان کی لگام کس حد تک ڈھیلی چھوڑی جاتی ہے جو لڑکی یا لڑکا یہ دیکھے کہ ذرا سیانا ہو جانے پر بھی اس کے ہر اشارے کی تعمیل بالکل اسی طرح ہوتی ہے

جس طرح ابتدائی بچپن میں ہوتی تھی تو وہ جھٹ اس صورت حال سے پورا فائدہ اٹھاتا ہے۔ وہ ابتدائی بچپن کے چاؤ چونچلوں کو اپنا پیدائشی حق قرار دے کر ان کا ایسی سختی سے مطالبہ کرتا ہے کہ ماں باپ اس مطالبے کے آگے عاجز آجاتے ہیں۔ مطالبہ پورا ہونے میں ذرا سی سستی برخوردار کے مزاج میں وہ طوفان پیدا کرکے رکھ دیتی ہے کہ ماں باپ کے اوسان خطا ہو جاتے ہیں۔ وہ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ ان کا نور نظر دوسرے بچوں سے الگ واقع ہوا ہے۔ وہ دوسروں کے مقابلے میں زیادہ بے خبر اور بے بس ہے۔ لہٰذا وہ زیادہ ناز برداری کا محتاج ہے اور اسے اس ناز برداری سے محروم رکھنا اس پر زیادتی کرنا ہے۔ جہاں ماں باپ اس قسم کے احساس کا شکار ہوئے وہاں برخوردار نے فوراً ایک آمر مطلق کا درجہ اختیار کیا اور وہ سارے گھر کو اپنی مرضی کے تابع رکھنے پر تل گیا۔

ماں باپ کو یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ اپنے ذاتی مفاد کی نگہداشت کے معاملے میں بچے بڑے آدمیوں سے کسی طرح کم نہیں ہوتے۔ وہ ماں باپ کی نفسیاتی کمزوریوں کو جھٹ بھانپ جاتے ہیں اور ان سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہیں۔ بعض ماں باپ اس غلط فہمی میں پڑے رہتے ہیں کہ اگر انھوں نے بچے کی جائز و ناجائز ناز برداری کا راستہ چھوڑ دیا تو اس سے اس کا دل ٹوٹ جائے گا اور وہ یہ سمجھنے لگے گا کہ مجھ سے محبت نہیں کی جاتی۔ ایسا خیال کرنا بہت بڑی بھول ہے۔ چھوٹے بچے بھی جائز و ناجائز سختی میں اچھی طرح تمیز کر نا جانتے ہیں۔ جو والدین ناجائز ناز برداری نہیں کرتے ان کے بچے ان سے کچھ زیادہ ہی محبت کرتے ہیں، تھوڑی محبت نہیں کرتے۔ بلکہ زیادہ سچ یہ ہے کہ جو والدین اپنے لیے نہیں جیتے بلکہ اپنی نکیل بچوں کے ہاتھ میں دے دیتے ہیں ان کے بچے انھیں دل سے کبھی پسند نہیں کرتے۔

گیارہ بارہ برس کی عمر کا ایک لڑکا ماں کی آنکھوں کا تارا ہے۔ ماں اسے ہر قیمت پر خوش رکھتی ہے۔ اس بچے کا جی مدرسے میں نہیں لگتا کیوں کہ وہاں چاؤ چونچلے موجود نہیں۔ وہ آبائی کام کاج کو ہاتھ نہیں لگاتا اس لیے کہ خود اس کی اپنی طبیعت یہ بوجھ اٹھانے کے لیے تیار نہیں۔ دوسرے ماں کا لاڈ پیار یہ گوارا نہیں کرتا کہ اس کا نور نظر ایسا گھٹیا اور پر مشقت کا کام کرے۔ مگر اس طرح زندگی گزار کر یہ لڑکا سیکھ کیا رہا ہے؟ کاہلی اور تن آسانی۔ لیکن کل اسے جب زندگی کے کڑے حقائق کا سامنا کرنا پڑے گا اس وقت ماں اسے اس زحمت سے

بچانے کے لیے موجود نہیں ہوگی۔ وہ یقیناً زندگی کے کٹھن امتحان میں بری طرح ناکام ہوگا اور اس کے لیے وہ ماں کو یقیناً کوسے گا۔

سچ یہ ہے کہ اپنی اولاد اور زندگی کے حقائق کے درمیان حائل ہونا اولاد کے ساتھ کوئی نیکی نہیں۔ وجہ یہ کہ جلد ہی یا دیر بعد، ہر شخص کو زندگی کے سارے بوجھ خود اٹھانے ہیں۔ جس شخص کو چھوٹی عمر سے ہی یہ بوجھ اٹھانے کی تربیت نہ ملی ہو، وہ مقابلے کے اس امتحان میں دوسروں سے پٹ جاتا ہے۔ زندگی کی بہترین تیاری شروع ہی سے اپنا بوجھ خود اٹھانا ہے جس نوجوان کا بوجھ عمر بھر ماں باپ نے اٹھائے رکھا ہے وہ کسی ذمہ داری کو خوبی سے انجام نہیں دے سکتا۔

کیا بچے ضبط قبول نہیں کرتے؟

بعض اوقات ماں باپ اس غلط فہمی میں مبتلا رہتے ہیں کہ بچوں کو ضبط کا عادی بنانا ان کے بس سے باہر ہے۔ وہ کئی دفعہ ارادہ کرتے ہیں کہ آگے کو بچے کی خودسری برداشت نہیں کریں گے۔ لیکن جب اگلی بار آتی ہے تو ان کا ارادہ جواب دے جاتا ہے۔ بچے کے ذرا سے مچلنے سے ان کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں اور وہ فوراً ہتھیار ڈال کر اسے من مانی کرنے دیتے ہیں۔ یہ افسوسناک صورتِ حال اس کی سینہ زوری کو اور بھی بڑھا دیتی ہے۔ اسے یقین ہو جاتا ہے کہ گھر کی ہر شے اس کے دل کی خوشی حاصل کرنے کے لیے ہے۔ ماں باپ اور دوسرے لوگ گھر میں محض اس لیے ہیں کہ وہ اس کی نازبرداری کیا کریں، خود اس کے ذمہ نہ کوئی ذمہ داری ہے نہ کوئی کام سوائے اس کے کہ وہ گھر والوں سے خدمت لے۔ گھر والوں کا فرض ہے کہ اس کی آنکھ کے اشارے پر چلیں۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتے تو اپنے فرض سے کوتاہی برتتے ہیں۔ اس کوتاہی کی سزا کے لیے اسے تادیبی کارروائی کرنی چاہیے۔ یہ تادیبی کارروائی رونے پیٹنے، روٹھنے اور طرح طرح کی دھمکیوں کی شکل اختیار کرتی ہے۔ یہ وہ ہتھیار ہیں جنھوں نے ہمیشہ اس کے ہاتھ مضبوط رکھے ہیں اور بظاہر اس بات کی کوئی وجہ نہیں کہ وہ آئندہ ایسا نہیں کریں گے۔

جو ماں باپ بچے کے ان ہتھیاروں کے سامنے گھٹنے ٹیک دیتے ہیں وہ اپنے لیے زیردستی کی ایسی حیثیت قبول کر لیتے ہیں جس سے انھیں کوئی نجات نہیں دلا سکتا۔ چاہے چونچلوں کے دلدادہ ماں باپ یہ سمجھتے ہیں کہ بچہ سیانا ہو کر خود بخود معقولیت کی راہ پر آجائے گا اور ان کے جائز حقوق پہچاننے لگے گا۔ لیکن عام حالتوں میں

ان کی یہ امید کبھی پوری نہیں ہوتی۔ بھولا بھالا بچہ بڑا ہوتے ہوتے خود بچوں کا باپ بن جاتا ہے مگر وہ ماں باپ کی دید دستی کے درجے سے بلند تر دیکھنا نہیں چاہتا۔ جب ان کے ساتھ معاملہ پڑتا ہے تو وہ اپنی بات منوانے کے لیے اب بھی اسی طرح روٹھتا اور مچلتا ہے جس طرح بچپن میں کرتا تھا۔

صادق کی عمر اس وقت پچیس سال کے لگ بھگ ہو گی وہ ایک بچی کا باپ بن چکا ہے۔ وہ بچہ ہی تھا کہ باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا۔ ماں نے اسے بڑے لاڈ پیار سے پالا۔ اسے یہ خیال تھا کہ باپ کے نہ ہونے سے یہ بچہ جس پدری محبت سے محروم ہو گیا ہے اس کی کمی بھی مجھے ہی پوری کرنی چاہیے۔ اس دھن میں وہ اپنی جان پہ ہر سختی روا رکھتی تھی۔ مگر کیا مجال جو صادق کی کوئی ضرورت ادھوری رہ جائے۔ صبح مدرسے جانے کے وقت سے پہلے وہ ناشتے کے علاوہ صادق کی کتابیں اور دوسری چیزیں خود تیار کرتی۔ جب یہ مدرسے سے آتا تو بستہ پٹخ کر ایک طرف پھینک دیتا۔ ماں بستہ اٹھا کر ٹھکانے پہ رکھتی۔ صادق بات بات پہ بگڑتا۔ مگر ماں بلائیں لیتی اور منت سماجت سے اسے کپڑے بدلنے اور کچھ کھانے پینے پہ مائل کرتی اور ساتھ ہی حسرت بھرے لفظوں میں اپنے نورِ نظر کی ناقابلِ علاج محرومی کی شکایت کرتی۔

اس بات کو اب بیس سال ہونے کو آئے ہیں۔ مگر ماں بیٹے کے تعلقات میں رتی بھر فرق نہیں آیا۔ صادق کو دفتر جانا ہے۔ ماں ناشتہ پکا رہی ہے۔ توا چولھے پہ دھرا ہے اور چائے کی دیگچی نیچے پڑی ہے۔ اتنے میں صادق چولھے کی طرف بڑھتا ہے۔

"مجھے دفتر کے لیے دیر ہو رہی ہے اور یہاں توا اب چولھے پہ رکھا گیا ہے"۔

"تو ہوا کیا؛ دو منٹ میں روٹی پک جائے گی۔ چائے تیار ہو چکی ہے"۔

"خوب رہا۔ چائے ٹھنڈی ہونے کے لیے نیچے رکھ رکھی ہے؟ میں اس شربت کو پی کر کیا کروں گا؟"

"روٹی پک جانے پہ میں اسے دوبارہ گرم کر دوں گی"

"چائے یہ جوشاندہ مجھ سے نہ پیا جائے گا۔ میں نے کتنی بار کہا ہے کہ میں بالکل تازہ چائے کے سوا اور نہیں پی سکتا۔ آج مجھے بھوکا ہی دفتر جانا پڑے گا"۔

یہ کہہ کر صادق نے فرش پہ سے چائے کی پیالی اٹھائی اور اسے دیوار پہ دے مارا۔ اور خود دروازے

کی طرف چل دیا۔ ماں چولہا چھوڑ کر پیچھے بھاگی اور بیٹے کو کندھے سے پکڑ کر منانے لگی۔ مگر وہ جوں جوں منت سماجت کرتی، بیٹا اینڈ تا۔

یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ یہی نوجوان جو ماں کے ساتھ اس طرح مچلتا ہے دوسرے لوگوں کے ساتھ معاملہ کرتے وقت بڑا معقول اور ذمہ دار بن جاتا ہے۔ آخر یہ کیوں؟ اس سوال کا جواب علم نفسیات سے ہی دریافت کیا جا سکتا ہے۔ ہر شخص اپنی خودی کو سہارا دینا چاہتا ہے اور جہاں کہیں اسے موقع مل جائے کہ وہ دوسروں کی خودی کو روند سکے تو وہ اس موقع کو کسی قیمت پر ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہتا۔ قطع نظر اس سے کہ روندی جانے والی شخصیت ماں ہے، یا باپ یا کوئی دوسرا۔ اس ضمن میں دوسرا قابل ذکر نکتہ یہ ہے کہ جو شخصیت ایک بار کسی دوسرے کے ہاتھوں پٹ جائے اس کے لیے دوسری بار اس کے سامنے کھڑے رہنا مشکل ہو جاتا ہے اور جہاں ایک شخصیت دوسری کے ہاتھوں ان گنت بار پٹ چکی ہو وہاں اس کے کھڑے رہنے کا سوال ہی ختم ہو جاتا ہے۔ یہ اسی نفسیاتی حقیقت کا نتیجہ ہے کہ بعض اوقات بڑے بڑے کرخت مزاج لوگ جو اپنے ماتحتوں کے لیے آفت بنے رہتے ہیں گھر کی دہلیز کے اندر قدم رکھتے ہی بھیگی بلی بن جاتے ہیں۔ کیوں کہ گھر کی چاردیواری میں انہیں ایسی شخصیت سے سابقہ پڑتا ہے جو انھیں بیسیوں مرتبہ پچھاڑ چکی ہوتی ہے۔

پس جو ماں باپ بچوں کے ساتھ معاملہ کرتے وقت اپنی نکیل پورے طور پر ان کے ہاتھ میں دیدیتے ہیں ان کے دوبارہ خود مختار ہونے کے امکانات تقریباً ختم ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنی شخصیت کو ایک ایسے جابر آمر کے رحم پر چھوڑ دیتے ہیں جو ان پر کبھی رحم نہیں کرے گا۔

کنبے کے سب سے بڑے بچے کے آمر بننے کے امکانات نسبتاً زیادہ ہیں۔ نوعمر ماں باپ کے گھر جب پہلا بچہ پیدا ہوتا ہے تو ہر طرف سے مبارک سلامت کی آوازیں بلند ہوتی ہیں۔ ناتجربہ کار ماں باپ فرط محبت میں مناسب حدوں سے بہت آگے گذر جاتے ہیں۔ ابھی ان کے کندھے ذمہ داریوں کے بوجھ سے بڑی حد تک آزاد ہوتے ہیں۔ یہ فارغ البالی انہیں ایسے ایسے چاؤ چونچلوں کے اہتمام پر ابھارتی ہے جو بعد میں پیدا ہونے والے بچوں کے لیے مہیا نہیں کیے جا سکتے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس لاڈلے بچے کا مزاج ناقابل حد تک بگڑ جاتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو سارے گھر کا حاکم سمجھنے لگتا ہے۔ چونکہ والدین کا طرز عمل اس کے خیال کی تائید کرتا ہے

اس لیے اس کا دماغی توازن اس طرح بگڑ جاتا ہے کہ پھر اس کا اعتدال پر آنا مشکل ہو جاتا ہے۔

تاہم اس میں کلام نہیں کہ بچوں کو بگاڑنے کی ذمہ داری پورے طور پر والدین پر ہے۔ کوئی بچہ طبعاً آمر مزاج پیدا نہیں ہوتا۔ اپنی شخصیت کو دوسروں کے مقابلے میں زیادہ نمایاں کرنا ایک بشری تقاضا ہے جو بچوں بوڑھوں سب میں ایک سا موجود ہے۔ جہاں تک بچہ بہت چھوٹا ہوتا ہے، اس کے لیے یہ سمجھنا ممکن نہیں کہ میری طرح دوسرے لوگ بھی احترام کے حق دار ہیں۔ لیکن جب اس میں ذرا سوجھ بوجھ پیدا ہو تو ماں باپ کا فرض ہے کہ اسے احساس دلائیں کہ گھر کے دوسرے افراد بھی گھر کی ہر چیز پر اسی طرح حق رکھتے ہیں جس طرح وہ گھر کے سارے دھندے اس غرض سے چلائے جاتے ہیں کہ کنبے کے سارے افراد کو ایک سی سہولت ملے۔ گھر کے کاروبار کرنا کسی ایک فرد کی ذمہ داری نہیں اور نہ اس کی راحتیں کسی ایک فرد کے لیے مخصوص۔ کنبے کے سارے افراد کا فرض ہے کہ اپنے اپنے حصے کا کام کریں اور ان سب کو یہ حق حاصل ہے کہ گھر کی سہولتوں سے برابر کا فائدہ اٹھائیں۔

ماں باپ کی ذمہ داری

بچے میں ذمہ داری کا احساس پیدا کرنا۔ ماں اور باپ دونوں کی برابر کی ذمہ داری ہے۔ سچ یہ ہے کہ جب تک وہ دونوں مل کر اپنے فیصلے نافذ کرنا نہیں سیکھتے اس وقت تک بچے کو ضبط کا عادی بنانا ممکن نہیں۔ مثلاً بارہ سال کی ایک لڑکی سرخی پاؤڈر سے بناؤ سنگار کیے دوپٹہ کندھوں پر ڈالے ننگے سر مدرسے کو جانے کے لیے تیار ہوتی ہے۔ اچانک باپ کی نگاہ اس پر پڑتی ہے اس کا چہرہ سرخ ہو جاتا ہے اور وہ کہتا ہے۔ جاؤ منہ دھو کر اس بناؤ سنگار کو صاف کرو۔ دوپٹہ کندھے کی بجائے سر پر رکھو۔ شریف زادیاں اس طرح باہر نہیں نکلا کرتیں۔

لڑکی سر نیچے جھکا لیتی ہے اور ماں کی طرف دیکھ کر کہتی ہے ”لڑکیاں اس طرح بن سنور کر مدرسے جاتی ہیں۔ ابا جان مجھ پر خواہ مخواہ خفا ہو رہے ہیں“۔

ماں بیٹی کی یہ بات سن کر چپ رہتی ہے۔ اپنے آپ کو بیوی کی تائید سے محروم پا کر میاں بھی چپ ہو جاتا ہے اور بیٹی کھٹ سے دروازہ کھول کر مدرسے کی راہ لیتی ہے۔ آج سے اس کے لیے پردہ نشین

جائز ہو جاتا ہے جو مدرسے کی کسی استانی یا لڑکی نے اختیار کر رکھا ہو۔

اگر والدین یہ چاہتے ہیں کہ ان کے بچے ایسے طور طریقے اختیار کریں جو ان کے نزدیک پسندیدہ ہوں تو انھیں اس معاملے میں اپنا فیصلہ یک زبان ہو کر دینا چاہیے۔ بچے یہ بہت کبھی نہیں کر سکتے کہ ماں اور باپ کے متفقہ فیصلے کو پیٹھ پیچھے ڈال دیں۔ انھیں یہ ہمت صرف اس وقت ہوتی ہے جب والدین میں سے ایک چشم پوشی کے حق میں ہوتا ہے اور دوسرا اپنا فیصلہ نافذ کرنے کے حق میں۔ بچہ اس کمزوری سے فوراً فائدہ اٹھاتا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ وہ چھوٹے ڈالو اور راج کرو کے نفسیاتی اصول سے بھی آگاہ ہوتا ہے اور آئندہ اس اصول سے خوب کام لیتا ہے۔

بچوں کی کج روی کے متعلق چشم پوشی کرنے کے معاملے میں ہمارے ملک کی عورتیں خاص طور پر مجرم ہیں انکی بھاری اکثریت ان پڑھ اور بچے کے بعید المدت مفاد سے بے خبر ہوتی ہے۔ اکثر مائیں یہ خیال کرتی ہیں کہ بچے پر شروع ہی سے منبط عائد کرنا اس پر بے جا سختی عائد کرنا ہے، اسے ساری عمر دنیا کے دھندوں میں ہی پھنسے رہنا ہے۔ اس لیئے بچپن میں اسے گھر کا کوئی کام کاج کرنے کے لیئے تنگ نہ کرنا چاہیے بلکہ مدرسے کے کام کاج کے متعلق بھی اس سے کوئی سخت باز پرس نہ ہونی چاہیے۔ ماں کے اس قسم کے خیالات باپ کے ہاتھ کو کمزور اور بعض اوقات بالکل ناکارہ کر کے رکھ دیتے ہیں اور بچہ آزادی سے من مانیاں کرتا پھرتا ہے۔

اسلم ایک تیرہ سالہ لڑکا ہے۔ اس کے ہم جماعت استاد کے پاس شکایت کرتے ہیں کہ وہ تمباکو پیتا ہے۔ استاد اسے بلاتا ہے اسلم اپنے قصور کا صاف صاف اعتراف کرتا ہے، استاد حیرانی سے پوچھتا ہے کہ تمہارے ماں باپ نے اتنی چھوٹی عمر میں تمہیں تمباکو پینے کی اجازت کس طرح دی۔ اس پر وہ بتاتا ہے کہ میں ماں باپ کا سب سے بڑا بچہ ہوں۔ دادی اماں مجھ سے بے حد پیار کرتی ہیں۔ دو تین سال ادھر کی بات ہے کہ جب میں انھیں حقہ تازہ کر کے دیتا تو دو ایک کش خود بھی لگا لیتا۔ اس پر دادی اماں بڑی خوش ہوتیں اور کہتیں واہ واہ میرا لال حقہ پیتا کتنا پیارا معلوم ہوتا ہے۔ شروع شروع میں تمباکو میرے گلے کو بڑی تکلیف دیتا۔ مگر ہوتے ہوتے مجھے اس میں لطف آنے لگا۔ امی نے یہ سارا تماشہ آنکھوں سے دیکھا مگر ان کی مجال نہ تھی کہ دادی اماں کے سامنے دم ماریں۔ ایک دن ابا جان نے بھی مجھے حقے کے

کش لگاتے دیکھ لیا۔ وہ بڑے خفا ہوئے، مگر دادی اماں جھٹ بیچ میں کود پڑیں اور بولیں خبردار غلام محمد جو تم نے میرے بیٹے کو کچھ کہا! اس پر ابا بھی چپ ہو گئے اور میں مزے سے سب کے سامنے حقہ پینے لگا۔

گھر کے با اختیار افراد میں پھوٹ بچے کے کردار پر تباہ کن اثر ڈالتی ہے۔ لیکن اس پھوٹ کا صرف ایک ہی علاج ہے۔ وہ یہ کہ ماں باپ اور دوسرے با اختیار افراد پسندیدہ ضابطہ اخلاق کے متعلق ہم خیال ہوں انھیں نہ صرف اس بات پر اتفاق ہو کہ کنبے کے بچوں کو کون سے طور طریقے سیکھنے چاہئیں۔ بلکہ وہ اپنے اخلاقی معیاروں کے نافذ کرنے کے معاملے میں بھی کسی نرمی کو روا نہ سمجھتے ہوں۔ ایسا کیے بغیر بچوں کو کسی اچھے اخلاقی ضابطے کا پابند نہیں بنایا جا سکتا۔

سیرت سازی میں گھر کا ہاتھ

صاحب نظر لوگوں نے اس نکتہ کو اچھی طرح سمجھا ہے کہ بچوں کے کردار تعمیر کرنے میں جو کردار گھر ادا کر سکتا ہے اسے پورا کرنا کسی اور ادارے کے بس کی بات نہیں۔ کنبہ بعض ایسے خصائص رکھتا ہے جو صرف اسی کا حصہ ہیں۔ وہ سہ گانہ خصائص یہ ہیں:

(۱) اولیت (۲) تسلسل (۳) محبت

گھر ہی وہ ادارہ ہے جس سے بچے کو سب سے پہلے سابقہ پڑتا ہے اور یہ سابقہ اس قدر ہمہ گیر قسم کا ہوتا ہے کہ بچے کی ساری وفاداری گھر اور کنبے کے لیے وقف ہو جاتی ہے۔ سیانا ہونے پر بچے کی ہمدردیاں وسیع تر ہونے لگتی ہیں اور اس کی وفاداریاں کئی جگہ بٹنے لگتی ہیں۔ مگر گھر کی اولیت اسے بچے کی وفاداریوں میں ہمیشہ پہلا مقام دیے رکھتی ہے۔

گھر کا دوسرا خاصہ اس کا تسلسل ہے۔ سیانا ہونے پر بچہ پہلے گلی کوچے میں اور پھر مدرسے میں مختلف گروہوں کا رکن بننے لگتا ہے۔ مگر یہ گروہ بنتے ٹوٹتے رہتے ہیں۔ ان کے مقابلے میں گھر کو ایک ایسا تسلسل حاصل رہتا ہے جو لگاتار جاری رہتا ہے۔

گھر کا تیسرا اہم خاصہ فطری محبت کی فضا ہے۔ بچے کی خودی کو جو سہارا اس فضا میں ملتا ہے وہ کسی دوسری فضا میں نصیب نہیں ہو سکتا۔ ناپسندیدہ طور طریقوں کی بنا پر ماں باپ بچے کو جس طرح چاہیں

ڈانٹ ڈپٹ دیں بچے کے دل میں یہ خیال کبھی پیدا نہیں ہو سکتا کہ وہ اس سے محبت نہیں کرتے۔

گھر اور کنبے کے یہ خصائص ماں باپ کی ذمہ داری کو بہت بڑھا دیتے ہیں۔ ماں باپ کو یہ ذمہ داری سوجھ بوجھ کے ساتھ انجام دینی چاہیے۔ بے شک بچوں کے ساتھ حتی الامکان پیار محبت کا سلوک ہونا چاہیے۔ خواہ مخواہ کا جبر و تحکم اچھے نتیجے پیدا نہیں کر سکتا۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہ لینا چاہیے کہ کنبے کی تکمیل بچے کے ہاتھ میں دیدی جائے۔ کنبے کے تمام افراد برابر کی توجہ کے حقدار ہیں۔ جب کبھی بچہ یہ کوشش کرنے لگے کہ دوسروں کے جذبات کو روند کر اپنے آپ کو مسلط کرے تو والدین کا فرض ہے کہ اسے سختی سے روک دیں۔ بچے کو جائز آزادی ضرور ملنی چاہیے۔ مگر جائز آزادی اور چیز ہے اور بدلگامی دوسری شے۔ بچے کو بدلگام ہونے کی اجازت کسی صورت میں نہ ملنی چاہیے۔ ایسا کرنا والدین اور بچے دونوں کے مفاد میں ہے۔ جو والدین ناجائز لاڈ پیار کی وجہ سے بچے کو بدلگام ہونے دیتے ہیں وہ اپنے اوپر بھی ظلم کرتے ہیں اور بچے پر بھی۔

جدید نفسیات نے انفرادیت کے احترام اور آزادی کی اہمیت پر جو زور دیا ہے اس سے بعض والدین نے یہ غلط نتیجہ نکالا ہے کہ انھیں ہر قسم کی دخل اندازی سے دست بردار ہو جانا چاہیے۔ مگر عملی تجربے نے ثابت کیا ہے کہ اس قسم کی دست برداری مجرمانہ غفلت کے ہم معنی ہے۔

آزادی کا درست مفہوم

جدید نفسیات بچے کی آزادی اور اس کی انفرادیت کے احترام پر بے حد زور دیتی ہے۔ موجودہ صدی کے نفسیاتی انکشافات سے پہلے والدین اور اساتذہ دونوں اس بات میں یقین رکھتے تھے کہ بچے کو کڑے ضبط میں کس کر رکھنا چاہیے۔ اگر ایسا نہیں کیا جائے گا تو وہ آگے زندگی میں چل کر کوئی قابل ذکر ذمہ داری نہیں سنبھال سکے گا۔ ضبط کا یہ تحکمانہ نظریہ صدیوں تک مغرب اور مشرق دونوں میں مقبول رہا۔ جو نہی بچے ذرا سیانے ہوتے انھیں یہ اجازت نہ دی جاتی تھی کہ وہ بڑوں کے سامنے زیادہ اونچی آواز سے بولیں۔ ان کے لباس اور شکل و شبہات میں بھی عموماً حد درجہ سادگی کا مطالبہ کیا جاتا تھا۔

جدید نفسیاتی انکشافات نے مغرب میں اس صورتِ حال کے خلاف سخت ردِ عمل پیدا کیا۔ نفسیات کا فتویٰ یہ ہے کہ جن بچوں کو بچپن کے زمانے میں دبا کر رکھا جائے وہ طرح طرح کی نفسیاتی الجھنوں کا شکار

ان کی خودی دب کر ایسے ناپسندیدہ ذہنی بیجوں کی شکل اختیار کرلیتی ہے، جن کی خبر خود ان کے مالک کو بھی نہیں ہوتی۔ والدین اور دوسرے لوگ سمجھتے ہیں کہ بچہ ماشاء اللہ بڑا مؤدب بن گیا ہے مگر اس کے نہاں خانہ دل کے اندھیرے گوشوں میں فساد کے ایسے زہریلے بیج چھپے رہتے ہیں جو آئندہ زندگی میں کسی وقت اچانک پھل پھول کر فرد کو طرح طرح کی ذہنی اور جسمانی بیماریوں میں مبتلا کر دیتے ہیں۔

ان نفسیاتی حقائق نے مغربی والدین کو بری طرح چونکا دیا۔ ان کے ذہنوں پر یہ بھوت سوار ہو گیا کہ اگر انھوں نے بچے کو کسی بات سے ٹوکا تو نہ جانے وہ کس قسم کی خوفناک ذہنی الجھنوں کا شکار ہو جائے گا اس احساس نے انھیں تقریباً بالکل بے بس بنا کر رکھ دیا۔ اس قسم کے بے بس والدین کی مغرب میں آج بھی کمی نہیں۔ وہ صاف طور پر دیکھتے ہیں کہ یہ طور طریقے بچے کے لیے اچھے نہیں۔ مگر یہ خیال کہ ان کی مداخلت بچے کے کردار پر اور بھی زیادہ برا اثر ڈالے گی ان کے ہاتھ کو شل کر کے رکھ دیتا ہے۔ مگر تازہ ترین نفسیاتی تحقیق نے اس طرز عمل کو بھی ایسا ہی غلط قرار دیا ہے جس طرح بے لچک جبر دکراہ کو۔ بچوں کی نفسیات میں نگاہ رکھنے والے عالم اب اس بات پر یک زبان ہیں کہ بچے کی آزادی سے مراد بچے کی بدلگامی نہیں اور نہ ہی اس سے مراد یہ ہے کہ بچہ ماں باپ کو غلام بنا کر رکھ دے۔ صحیح آزادی اسی جگہ پھل پھول سکتی ہے جس جگہ کا ہر رہنے والا آزاد ہو۔ اگر کنبے کے افراد میں سے کسی ایک کو بھی غلام بنا دیا جائے گا تو کنبے میں آزادی کی روح پرور فضا اسی وقت فنا ہو جائے گی۔ اگر بچے کو آہنی شکنجے میں کسنا ناپسندیدہ ہے تو اسی قدر ناپسندیدہ اس کے ہاتھ میں ماں باپ کی نکیل دے دینا ہے۔

اولاد سے محبت ایک پاکیزہ فطری جذبہ ہے۔ مگر مشرقی رسم ورواج نے اس جذبے کو بھی عجیب وغریب شکل دے رکھی ہے۔ اس کی بڑی وجہ مشرقی ماؤں کی بے خبری اور ان کی تنگ نظری ہے۔ وہ یہ نہیں سمجھتیں کہ ان کا ناجائز لاڈ پیار ان کی اولاد کو ایسی غلط عادتوں کا غلام بنا رہا ہے جو اسے عمر بھر پریشان کریں گی۔ جاؤ چونچلوں سے پلے ہوئے برخوردار جب بالآخر زندگی کے بے پناہ ضبط سے دوچار ہوا کرتے ہیں تو ان کا پہلا ردّ عمل ہمیشہ یہ ہوا کرتا ہے! ہائے ماں باپ کے غلط لاڈ پیار نے ہمیں کہیں کا نہ چھوڑا!

ابن خلدون

فارق العلائی

یہ صحیح ہے کہ علم بجائے خود انسانی ذہن کو روشن اور متنوع بنا دیتا ہے لیکن ایک مبتدی کے آگے سب سے بڑا مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ علم کس طرح حاصل کیا جائے کہ وہ مقصود بالذات اور مستقل بالذات بن جائے۔ وہ آسمان پر جھلملاتے ہوئے تاروں کو دیکھتا ہے اور اس کا جی چاہتا ہے کہ لپک کر انھیں اپنی کلاہ میں ٹانک لے لیکن ان جھلملاتے ہوئے تاروں تک پہنچنا اتنا آسان نہیں۔ اس کی نگاہیں اپنے رہنما اور معلم کی طرف اٹھتی ہیں۔ کیا معلم اس کی آنکھوں میں اس کی اس التجا کو پڑھ سکتا ہے؟ اگر پڑھ سکتا ہے تو اس کی قیادت مبتدی کو سب کچھ سکھا پڑھا سکتی ہے۔ اگر نہیں تو اس کے ہاتھ بار بار ان خزف ریزوں پر پڑتے رہیں گے جنھیں وہ اپنے پاؤں سے کئی مرتبہ روند چکا ہے۔ ابن خلدون خود ایک پختہ کار معلم تھا اور صرف یہی نہیں کہ وہ اپنے طالب علموں کی نفسیات سے واقف تھا وہ یہ بھی جانتا تھا کہ ان کے ذہنی تقاضوں کو کس طرح پورا کیا جا سکتا ہے اور دراصل اسی کا نام عمدہ تدریس ہے۔

طریق تدریس

اس دور میں تحصیل علم اور تدریس کو زیادہ سائنٹیفک بنانے کی کوشش کی گئی ہے اور اسے کسی حد تک سائنٹیفک اور میکانکی بنا بھی لیا گیا ہے۔ کہتے ہیں قدما نے کبھی طریق تدریس پر غور و خوض نہیں کیا اور بچوں کی صلاحیتوں پر صیقل کرنا تو ایک بات ہے انھیں تو ان کی صلاحیتوں کا علم بھی نہیں ہوتا تھا۔ یہ مبالغہ ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی صحیح ہے کہ بعض حالات میں تدریس اس قدر ناقص ہوتی تھی کہ طالب علم اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتا تھا۔ ابن خلدون خود مروجہ طریق تدریس کا حامی نہ تھا۔ اس نے نصاب اور طریق تدریس کے خلاف تحریری اور تقریری جہاد کیا اور ان راہوں کی نشان دہی کی جو طالب علم کو منزل تک پہنچا سکتی ہیں اور جب ہم اس کے نظریات تدریس کا جائزہ لیتے ہیں تو تھوڑی دیر حیرت و استعجاب کی کیفیت طاری رہتی ہے کس قدر گہری

کتنے واضح اور کیسے فطری۔

ایک مضمون کو کیسے پڑھایا جانا چاہیے۔ یہ ایک اہم مسئلہ ہے۔ لیکن اس سے اہم بات یہ ہے کہ کس مضمون کو کس وقت اور کتنا پڑھنا چاہیے آیا اس میں کسی تدریج کو ملحوظ رکھنے کی ضرورت ہے یا ایک ہی وقت میں علی الحساب سب کچھ پڑھا دینا چاہیے۔ طلبہ کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے پڑھانا تھا پڑھا دیا۔ لیکن ان کے ذہنوں کے روزن میں جھانک کر ان کے دل کی گہرائیوں میں اترنا آسان نہیں۔ اس کے لیے اصولی طور پر متعلم کو سمجھنے کی ضرورت ہے اس وقت اس کی عمر کیا ہے۔ اس کا میلان طبع کیا ہے اور اس کی ذہنی صلاحیت کیا ہے۔ ابن خلدون متعلم کی عمر، میلان طبع اور ذہنی صلاحیت کو سامنے رکھ کر محاکمہ کرتا ہے اور پھر جو بات کہتا ہے ایمان و ایقان کے ساتھ۔

تعلیمی تدریج

پہلی منزل کسی مضمون کا پڑھا دینا اور اس طرح کہ اس کا اثر تا دیر قائم رہے، ذرا مشکل ہوتا ہے۔ اسے موثر بنانے کے لیے سنبھل سنبھل کر قدم اٹھانے کی ضرورت ہے۔ رفتار متوازن ہو۔ درجہ بدرجہ منزل بہ منزل۔ یہ نہیں کہ ایک جست میں ایں سوے افلاک سے آں سوے افلاک۔ ابن خلدون ایک چابکدست راہ داں کی طرح اپنے طالب علموں کو راہ کی دشواریوں سے روشناس تو کرنا چاہتا ہے لیکن اس طرح کہ ان کے پائے ہمت کو تکان نہ آنے پائے اور وہ ایک منزل سے دوسری منزل کی طرف بڑھتے ہی چلے جائیں۔ ہر پتھر کو اٹھائیں، ہر کانٹے کو چنیں۔ ہر گھاٹی کو عبور کریں اس میں انھیں جو لذت حاصل ہو گی وہ یقیناً لابدی ہو گی۔

پہلی منزل میں وہ طالب علموں کو صرف علم کے مبادیات اور بنیادی اصولوں تک محدود رکھنا چاہتا ہے تفصیل کا موقع نہیں۔ اس مقام پر اسے صرف اتنا پڑھنا چاہیے جتنا اس کا ذہن قبول کرے اور جتنی اس میں اپنانے کی اہلیت ہو۔ جب اس طرح مضمون کا سرسری جائزہ لے لیا جائے کہ طالب علم کو اس کی معمولی سدھ بدھ ہو جائے تو گویا اس نے تحصیل علم کی پہلی منزل طے کر لی اور اس پر قدرے دست گاہ حاصل کر لی مگر یہ دست گاہ یا مہارت ناقص یا ناکافی ہو گی۔ لیکن اس کی بدولت طالب علم میں اس مخصوص علم کے پڑھنے اور اس کے مسائل کے سمجھنے کا ذوق ضرور پیدا ہو جائے گا۔ اور اس کا یہی ذوق آگے چل کر علمی پیچیدگیوں کا حل بن جائے گا[۲]۔

[۱] چارلس عساوی۔ ابن خلدون صفحہ ۱۵۷

[۲] " " ۱۵۰ روزن تھال جلد سوم، مقدمہ صفحہ ۲۹۲

دوسری منزل | جب علم کے مبادیات سے واقفیت ہو جائے اور متعلم میں اس کے سمجھنے کی اہلیت پیدا ہو جائے تو ایک بار پھر اسی موضوع کو پڑھانے کی ضرورت ہے۔ لیکن دونوں منازل کے طریق تدریس میں ایک نمایاں فرق یہ ہوگا کہ پہلی منزل عمومی اصول اور واقعات پر ختم ہو جاتی ہے اور دوسری منزل میں تدریس کا تقاضہ انھیں اصول و براہین اور واقعات کا تشریحی جائزہ ہے۔ جو بات بتائی جائے اور جس واقعے کا تبصرہ کیا جائے اس کا ایک ایک پہلو واضح ہو جائے[1]۔ اس کے حقائق کیا ہیں۔ اس پر کیا کیا اعتراض ہو سکتے ہیں اور کن کن گوشوں سے اس پر اعتراض ہو چکے ہیں۔ کیا یہ اعتراض صحیح ہیں۔ اگر صحیح ہیں تو ان کے اسباب و علل کیا ہیں اور اگر نہیں تو پھر اس سے کیا نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔ اس طرح طالب علم میں رفتہ رفتہ خود کوشی، خود آگہی اور خود رائی[2] کی عادت پڑ جائے گی۔

یہ منزل متعلم کو ایک بلند سطح پر لے جاتی ہے۔ وہ ہر اصول کا تجزیہ کرتا ہے۔ ہر بات کو تولتا ہے اور پھر ایک نتیجے پر پہنچتا ہے۔ اس خودکاری اور تعامل سے جو مہارت پیدا ہوتی ہے اس سے متعلم کی عمومی تعلیمی حالت بہتر ہو جاتی ہے[3]۔

تیسری منزل | ایک موضوع کو اس طرح دو مرتبہ پڑھا لینے کے بعد اس پر تیسری مرتبہ بھی بحث کرنے کی ضرورت ہوتی ہے یہ اس لیے کہ اگر دوسری منزل میں کوئی بات رہ گئی ہو تو تیسری منزل میں اس کی وضاحت ہو جائے۔ ایک ایک نکتے، اور ایک ایک کھونٹے کی اس طرح تشریح کی جائے کہ اس کا کوئی پہلو الجھا ہوا باقی نہ رہے[4]۔ پہلی اور دوسری منزل میں امور متنازع پر بحث سے اس لیے اغماض ضروری تھا کہ طالب علم جب تک مسئلے کے مبادیات اور پھر اس کے اصول و فروع سے واقف نہ ہو اور اس میں اتنی ذہنی پختگی پیدا نہ ہو سکی ہو کہ وہ حق و ناحق میں تمیز کر سکے اس کا امور متنازع پر خود غور کرنا ایسا ہی جیسے کسی نو آموز کو بھیڑ میں موٹر چلانے کے لیے کہہ دیا جائے۔ موٹر چلانی تو اسے آتی ہے لیکن ابھی ہینڈل، بریک اور گیئر پر اسے اتنی قدرت حاصل نہیں ہوتی کہ وہ لوگوں کے اژدحام میں سے گذر سکے۔ اس لیے پہلے اسے صاف ستھری سڑک پر موٹر کو دھیمی رفتار پر چلانا ہوگا۔ پھر کسی ایسی شاہراہ پر کہ جہاں

---

[1] روزن تھال۔ المقدمہ صفحہ ۲۹۰ ۔ چارلس عیساوی۔ ابن خلدون صفحہ ۱۵۰

[2] خود رائی میں نے یہاں خود فیصلہ کرنے کی اہلیت کے مفہوم میں استعمال کیا ہے۔

[3] روزن تھال۔ المقدمہ ص ۲۹

[4] ایضاً ۔ جلد سوم ص ۲۹

لوگوں کی آمد و رفت اتنی زیادہ نہ ہوا اور پھر ایک ایسے شارع عام پر کہ جہاں آنے جانے والوں کا ہجوم حال ہے۔ بعینہٖ اسی طرح پڑھنے والے کو ایک ایک منزل سے ایک ایک مرتبہ ضرور گذرنا ہوگا۔

یہ بھی ممکن ہے کہ بعض ذہین اور ذکی طالب علموں کو ان منازل سے گذرنے میں اتنا وقت صرف نہ کرنا پڑے جتنا انھیں اوسط درجے کے طلبہ کی نسبت ایک منزل سے دوسری منزل تک پہنچنے میں زیادہ دشواری نہ ہو۔ لیکن اس کا انحصار طلبہ کی اپنی ذہانت اور صلاحیت پر ہے۔ عام حالات میں متذکرہ بالا تکرار ثلاثہ کی ضرورت ہے کہ مہارت تام پیدا کرنے کا یہی طریقہ صحیح اور مفید ہے[1]۔ اگرچہ خاص تعلیمی نقطۂ نگاہ سے ہر طالب علم کے لیے ان تینوں مرحلوں سے گذرنا ضروری ہے لیکن ابن خلدون نے اس اصول کو اتنا سخت بنانے کی کوشش نہیں کی۔ طالب علم میں اگر تفہیم مسائل کی اہلیت ہے وہ ان رسموں سے قطع نظر اپنی جودت طبع کے بل بوتے پر آگے بڑھ سکتا ہے اور کوئی چیز اسے آگے بڑھنے سے روک نہیں سکتی وہ اپنے ماحول اور مستقبل دونوں کا خالق بن سکتا ہے اور اسے اس کا خالق بننا چاہیے۔

تدریس کا نفسیاتی پہلو صنعتی ترقی کے اس تیز رفتار زمانے میں تعلیم کو صرف میکانکی ہی نہیں بنایا گیا بلکہ طلبہ کے رجحانات اور ان کی نفسیات کو بھی ملحوظ رکھا گیا ہے۔ نفسیات کو پیش نظر رکھنا تقاضائے انسانی ہے۔ انسان کی ذات کا مطالعہ، اس کے احساسات و جذبات کا جائزہ اور اس کی بست و بود کا تجزیہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ علم کو اس کے قالب میں آمادہ کر اس کے اخلاق و عادات اور احساسات و جذبات کی صحیح تربیت کی جائے اور اسی عمل کا نام تعلیم ہے۔ چنانچہ تعلیم و تربیت کے مسائل پر ابن خلدون کے قلم کو جنبش ہوئی تو اس نے طالب علم کی نفسیات کو فراموش نہیں کیا۔

درس و تدریس میں دلچسپی کس طرح پیدا کی جاسکتی ہے؟ یہ سوال اتنا پیچیدہ نہیں جتنا پیچیدہ اس کا جواب ہے۔ اگر پڑھنے والے کو دلچسپی نہیں تو پڑھانے والا آسمان کے تارے بھی توڑ کر لائے تو اس کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوگا۔ ابن خلدون انسانی احساسات کی اس نزاکت سے واقف ہے اور وہ اپنی پیش کردہ تعلیم کو اتنی دلکش اور متنوع بنا دینا چاہتا ہے کہ اس کا دوسروں پر بھرپور اثر ہو۔

---

[1] روزن تھال۔ المقدمہ جلد سوم صفحہ ۲۹۳

الجھاؤ: ابن خلدون نے المغرب، اندلس اور بلاد شرقیہ میں جو طریق تدریس مروج پایا، اس سے وہ غیر مطمئن تھا۔ یہی نہیں بلکہ اس کے پیش نظر تو اساتذہ کی اہلیت بھی محل نظر تھی۔ کیا ان کا طریق تدریس صحیح ہے؟ کیا وہ جو کچھ پڑھاتے ہیں اس میں غلطی کم کم سے کم امکان ہے اور جب اس نے ان عوامل کا تجزیہ کیا تو مدرسین کی اکثریت کو صحیح طریق تدریس سے عاری پایا[۱]۔ تعلیم جب تک طالب علم کی ذہنی صلاحیتوں کے مطابق نہ ہو اس کی افادیت مشکوک رہے گی۔ ابن خلدون نے مدرسین کی بہت بڑی جماعت کو اس کلیہ سے ناواقف پایا[۲]۔ جو مسئلہ ان کے سامنے آیا پڑھا دیا خواہ اس سے متعلم کی ذہنی صلاحیتیں مفلوج ہی کیوں نہ ہو جائیں۔ اور بعض اوقات پڑھانے والے ابتدائی مدارج ہی میں طلبہ کو ایسے پیچیدہ مسائل میں الجھا دیتے کہ اس پر دست رس حاصل کرنا ممکن نہیں ہوتا[۳]۔ وہ محض ڈور کو سلجھاتے رہتے ہیں، اس سے بحث نہیں کہ سرا ملتا ہے یا نہیں۔

ابتدائی مدارج میں طالب علم صرف علم کے مبادیات سے روشناس ہوتا ہے۔ آخری منزل تک پہنچنا ابھی دور کی بات ہے۔ اس منزل میں علم کے آخری نتائج سے بحث کرنا، اس سے اس کی ذہنی صلاحیتوں کو چھینتا ہے یہ طریق تدریس ایسا ہی ہے گویا علت سے پہلے معلول پر بحث کی جائے۔ اس سے فکر کی حرکت بند ہو جاتی ہے طالب علم مایوس ہو جاتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ علم ایک ایسی چیز ہے جس کا حاصل دشوار اور بہت ہی دشوار ہے، ابھی اس کا ذہن آشنا پختہ اور تیز نہیں کہ اپنی پوری طاقت سے وہ اس پر دست رس حاصل کر سکے[۴]۔ وہ رفتہ رفتہ پہلے ایک بات اور پھر دوسری بات سیکھتا ہے، اور اسے اسی طرح سکھانا چاہیے۔

آمادگی: ابتدائی مدارج میں طالب علم جو دیکھتا اور سمجھتا ہے اس میں قطعیت نہیں ہوتی۔ یہ باتیں محض عمومی ہوتی ہیں، ابھی صحیح ادراک پیدا نہیں ہوتا۔ اس منزل میں اسے جو کچھ پڑھایا جائے، اس طرح پڑھایا جائے کہ پہلے اسے ایک بات بتا دی جائے جب اسے اس پر وقوف حاصل ہو جائے تو دوسری بات بتائی جائے یہاں تک کہ طالب علم استعداد کا لحاظ رہے[۵]۔

۱۔ چارلس عساوی۔ ابن خلدون صـ ۱۵۸۔
۲۔ روزن تھال۔ المقدمہ جلد سوم صـ ۲۹۳
۳۔ ایضاً
۴۔ "
۵۔ "

تحصیل علم کی یہ خواہش اسے آگے اور بہت آگے لے جاتی ہے اور علم کا افق اتنا وسیع ہو جاتا ہے کہ اس میں دقیق مسائل کے سمجھنے کی اہلیت پیدا ہو جاتی ہے۔

توضیحی مثالیں: بعض اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ معلومات کا جو ذخیرہ مدرس کے پاس ہوتا ہے وہ اسے بے کم وکاست طالب علموں کے سامنے پیش کر دیتا ہے لیکن یہ ضروری نہیں کہ یہ معلومات ان کے ذہن کا جزو بن جائیں۔ ممکن ہے کوئی بات بالکل ہی سمجھ میں نہ آئی ہو یا تھوڑی بہت سمجھ میں تو آئی ہو لیکن اس کے بعض پہلو تشنہ رہ گئے ہوں۔ اس وقت مدرس کیا کرے گا؟

دور حاضر نے مدرس کی ان مشکلات کو مختلف انداز میں حل کیا ہے۔ وہ کوئی کہانی سنا سکتا ہے۔ کوئی تصویر دکھا سکتا ہے۔ یا تجربہ کر کے دکھا سکتا ہے۔ اور اس طرح کہ ایک ایک بات واضح ہو جائے۔ کہانی سنا کر کسی بات کی وضاحت کرنا نئی نہیں پرانی بات ہے۔ انجیل اور قرآن حکیم میں ایک اصول کی توضیح کے لیے ایک یا دو واقعات سے کام لیا گیا ہے۔ حکمائے متقدمین کا بھی یہی طریقہ رہا ہے۔ اور یہ صحیح ہے کہ اس سے زیادہ موثر طریقہ انسان نے اب تک ایجاد نہیں کیا۔ ابن خلدون طلبہ کی ان دشواریوں کو بتاتا ہے کہ ان کا حل کیا ہے۔ کہیں یہ دشواری مثالوں سے حل ہو سکتی ہے، کہیں کہانی سے، کہیں تصویروں سے اور کہیں معروف مثالوں سے[1]۔ اس نے درس کو موثر بنانے کے لیے ان کے استعمال کی اس طرح تلقین کی ہے جیسے دور حاضر کا کوئی ماہر مروجہ طریق تدریس پر تجدید کا خواہاں ہو۔

سوالات: سوال پوچھنا تدریس کا بہت پرانا طریقہ ہے۔ سقراط باتوں باتوں میں کام کی ایسی بات بتا دیتا کہ سامع آسے کبھی نہ بھول سکے اور اگر درس و تدریس کو معلم اور متعلم کے ذہنی تعامل کا نتیجہ سمجھا جائے تو سوال کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔ لیکن کون سا سوال کس وقت اور کس طرح پوچھنا چاہیے۔ ابن خلدون المغرب کے طریق تدریس پر جہاں اور مختلف نقطہ نگاہ سے تنقید کرتا ہے، ان کے سوال پوچھنے کے انداز پر بھی اتنا ہی نکتہ چیں ہے۔ سوال اگر متعلم کی عمر اور اس کی ذہنی صلاحیت کے مطابق نہ ہو تو اس کا پوچھنا اتنا ہی بے معنی۔ سوال اس کی فہم و فراست سے بالا نہ ہو اور نہ اس موضوع سے ہٹ کر ہو جو پڑھایا گیا ہے۔ اگر سوال کی اساس اس کے علاوہ کچھ اور ہوگی تو اس سے

---

[1] روزن تھال۔ المقدمہ۔ جلد سوم صـ ۲۹۳

چارلس عساوی۔ ابن خلدون صـ ۱۵

متعلم کو کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا[1]

موضوع : دورِ جدید میں تدریس کا ایک عام اصول یہ ہے کہ ایک وقت میں ایک ہی کام کیا جائے۔ یہ نہیں کہ موضوع درس جغرافیہ ہے اور مدرس جغرافیہ پڑھاتے پڑھاتے ریاضی پڑھانے لگے، یا اردو پڑھاتے پڑھاتے سائنس۔ اس سے الجھاؤ پیدا ہوتا ہے۔ اور سیکھنے والا فضا میں تلا بازیاں کھاتا نظر آتا ہے۔ ابن خلدون بھی ایک وقت میں ایک ہی کام کرنے کا قائل ہے۔ اگر ایک موضوع یا ایک کتاب پڑھائی جا رہی ہے کہ اس کے مختلف مسائل کی تشریح ہو جائے تو اس کتاب پر اس وقت تک تکیہ کرنا چاہیے جب تک اس پر پوری قدرت حاصل نہ ہو جائے[2]

ایک موضوع میں دوسرے موضوع کو گڈ مڈ کر دینا تعلیم نہیں بازی گری ہے۔ اس لیے ابن خلدون نے مسائل کے اس اختلاط سے گریز کیا ہے اور ہر پڑھانے والے کو تنبیہ کی ہے کہ پہلے متعلم کو ساری کتاب پڑھنے دو اور جب وہ شروع سے آخر تک اس پر ملکہ حاصل کر لے۔ اس کے مقاصد سے روشناس ہو جائے۔ اور اس پر اتنی دست گاہ حاصل کر لے کہ وہ اس کی عادت بن جائے اور یہ کہ وہ اپنی اس عادت کو استعمال کرنا بھی جانتا ہو۔ اس کے بعد اگر وہ دوسرے موضوعات کی طرف رجوع کرے تو اس سے نقصان نہیں ہوگا۔ چراغ سے چراغ جلتا ہے۔ ایک مضمون پر قدرت حاصل ہو جائے تو دوسرے مضامین کی تحصیل میں آسانی ہوتی ہے۔

اس سے ایک فائدہ یہ ہوتا ہے کہ متعلم کی نگاہیں بالیدہ۔ اس کا ذہن متنوع اور اس کی کوششیں بار آور ہو جاتی ہیں۔ رفتہ رفتہ اس کے ذوق میں اتنا نکھار پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ اس کے دقائق میں دلچسپی لینے لگتا ہے اور پھر پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل کے حل کرنے میں اسے لطف آنے لگتا ہے اور یہی لذت کام اس کے علمی ذوق کو نکھارتی ہے اور اس کے ملکۂ علمی کو مکمل کرتی ہے[3]

انحراف توجہ : طالب علم کو ایک ہی وقت میں ایک مضمون پڑھنے اور اس پر قدرت حاصل کرنے کی

---

[1] روزن تھال۔ المقدمہ صفحہ ۹۷ - ۲۹۲

[2] ایضاً جلد سوم صفحہ ۲۹۱

[3] ایضاً جلد سوم صفحہ ۲۹۲

اس لیے بھی ضرورت ہے کہ ایک وقت میں ایک سے زیادہ مضمون پڑھانے سے اس کی توجہ بٹ جاتی ہے[۱]۔ کبھی وہ ایک مضمون کے ایک موضوع کی طرف لپکے گا اور کبھی دوسرے مضمون کی ایک بات اسے ایسی پسند آئے گی کہ بس وہ اس میں مگن ہو جائے گا۔ اور ابھی دونوں میں سے ایک پر بھی اسے قدرت حاصل نہیں ہو گی کہ کوئی تیسری چیز اس کے سامنے آجائے گی اور وہ ان میں اس طرح الجھ کر رہ جائے گا جیسے عشق پیچاں کی بیل۔ ایک ایک شاخ دوسری شاخ میں اور یہ معلوم نہیں کہ اس کا سرا کہاں ہے اور کس طرف ہے۔

اوقات تدریس

ابن خلدون نے اوقات تدریس کے جن اصولوں سے بحث کی ہے وہ اس نظام اوقات سے مختلف ہے جو ہمارے مدرسوں اور اعلیٰ تعلیم گاہوں میں مروج ہیں۔ مدرسوں میں اوقات کی تقسیم مضمون وار یا اونچے مدارج میں پرچہ وار ہوتی ہے۔ انگریزی، اردو، ریاضی، کیمیا، طبیعات اور اسی طرح دوسرے مضامین اور پرچے یکے بعد دیگرے پڑھائے جاتے ہیں۔ بظاہر یہ وقت نامہ طلبہ کی نفسیات، مضمون کی اہمیت اور دشواری کے پیش نظر مرتب ہوتا ہے۔ مگر اکثر ان اصولوں سے اغماض کیا جاتا ہے۔

ابن خلدون کسی کتاب یا مضمون کو کسی منصوبے کے بغیر پڑھا دینے کا حامی نہیں۔ ایک مضمون پر کتنا وقت صرف کیا جائے۔ اس نے اس کی بھی تعیین نہیں کی۔ لیکن یہ ضرور بتا دیا ہے کہ ایک مضمون کو کس طرح پڑھانا چاہیے۔ تدریس کو طول دینا اور اس طرح کہ ایک درس اور دوسرے درس کے مابین طویل وقفہ تعلیمی نقطہ نگاہ سے صحیح نہیں۔ اس کا ایک نقص یہ ہے کہ طالب علم نے جو کچھ آج پڑھا ہے ممکن ہے ایک طویل وقفے کے بعد وہ اسے بالکل بھول جائے۔ اور اگر بالکل نہ بھول سکے تو اس کے ذہن میں محض ایک ہلکا تصور باقی رہ جائے۔ اس کا دوسرا نقص ایک سبق کا دوسرے سبق سے غیر مربوط ہو جاتا ہے[۲]۔ کسی علمی موضوع پر بحث کرنا آسان نہیں ہوتا اور بات اگر ایک ہی نشست میں وضاحت اور ایقان کے ساتھ کہہ دی جائے اور مختصر سے الفاظ میں تو اس کا اثر دیرپا ہوتا ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ ساری بات ایک ہی سانس میں

۱۔ روزن تھال۔ المقدمہ جلد سوم صفحہ ۲۹۲

۲۔ چارلس عساوی۔ ابن خلدون صفحہ ۱۵۹

کہہ دی جائے۔ وقفے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ابن خلدون اس توقف کا منکر نہیں۔ حسب ضرورت دو نشستوں کے مابین دم لینے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور اس دم لینے کے بعد مدرس اور متعلم دونوں پھر اپنی منزل کی طرف قدم گذار ہو جاتے ہیں۔ لیکن طویل وقفہ مفید نہیں ہوتا۔ اس سے متعلم مسائل کے مالۂ و ما علیہ کو بھول جاتا ہے حتیٰ کہ دو سبقوں کے درمیان اپنا ذہنی ارتباط قائم نہیں رکھ سکتا، اور یہ کوئی اچھی بات نہیں۔ اس سے صرف تشویق علمی ہی کو ضعف نہیں پہنچتا۔ علمی کی تشکیل بھی مشکل ہو جاتی ہے[۱] اور اس کا سب سے بڑا مقصد ملکۂ علمی ہی کی تحصیل ہے۔ ابن خلدون کے پیش نظر غیر ضروری وقفہ علت اور عدم ملکہ اس علت کا معلول ہے۔ اس لیے اس سے احتراز ضروری ہے۔

مسئلے کے منفی پہلو پر بحث کرنے کے بعد ابن خلدون نے اس کے مثبت پہلو پر بھی بحث کی ہے۔ اگر متعلم کے ذہن میں مسئلے کے ما فیہ کا مواد محفوظ رہے اور یہ اسے نسیان کے اثر سے بھی بچالیتا ہے تو ملکۂ علمی کا حصول آسان ہو جاتا ہے۔ اس میں پختگی پیدا ہو جاتی ہے۔ اور حق و صداقت سے زیادہ نزدیک ہو جاتا ہے[۱] اور پھر اس پر ایک ایسی جلا ہو جاتی ہے کہ سارا ماحول جھلملانے لگتا ہے۔ لیکن دست گاہ (ملکہ) کوشش پیہم اور مسلسل عمل سے حاصل ہوتی ہے۔ عمل چھوڑ دیا جائے تو دست گاہ باقی نہیں رہتی۔ انسان اسے بھول جاتا ہے۔ اور ایسا بھولتا ہے گویا اس سے اسے کبھی کوئی سروکار ہی نہ تھا۔[۲]

وہ ان میں سے ہر ایک پر دست گاہ حاصل کرنے کی کوشش کرے گا لیکن وہ کسی پر دست گاہ حاصل نہیں کر سکے گا اور جب اسے اپنی پوری کوشش میں ناکامی ہو گی تو وہ انھیں پیچیدہ و مشکل اور ناممکن الحصول سمجھنے لگے گا[۳] اور پھر شکست اور ناکامی اور ایک شکست ہو تو اس پر قدرت حاصل کر لی جائے۔ لیکن اگر یہی شکست شکست مسلسل کی صورت اختیار کرے تو اس کے قویٰ میں اضمحلال پیدا ہو جائے گا۔ اور رفتہ رفتہ اس کی ساری قوتیں سلب ہو جائیں گی لیکن اس کے برعکس اگر متعلم کے ذہن میں اس قسم کا کوئی الجھاؤ نہ ہو تو وہ ایک مضمون کو لے کر اس کی ایک ایک بات کا جائزہ لے سکتا ہے۔ اور کسی مضمون پر دست گاہ یا ملکہ حاصل کرنے کا یہی طریقہ سب سے زیادہ آسان ہے[۴]

---

[۱] چارلس عیساوی۔ ابن خلدون ص۱۵۹

[۲] روزن تھال۔ المقدمہ۔ جلد سوم ص۲۹۵

[۳] روزن تھال۔ المقدمہ۔ جلد سوم ص۲۹۵

[۴] ایضاً

بچوں کی تعلیم اور طریق تدریس

بچوں کی تعلیم و تعلم کے متعلق ابن خلدون کا اپنا مخصوص نقطۂ نگاہ ہے یہ نہیں کہ وہ حرف پڑھانے تھے پڑھا دیے جو جی میں آیا پڑھا دیا۔ نہ بچوں کے مزاج اور ان کی نفسیات کا لحاظ، نہ ان کی ذہنی صلاحیتوں کا احساس ور نہ یہ خیال کہ مضمون کو کب اور کس وقت پڑھانا مفید ہے۔ اس کے لیے ابن خلدون نے دنیائے اسلام یں مروجہ طریقوں کا جائزہ لیا۔ اندلس، المغرب، الافریقیہ (تونس) اور المشرق میں بچوں کو کس طرح پڑھایا اتا ہے اور کیا پڑھایا جاتا ہے۔ اس تقابلی مطالعہ اور مختلف طریقہ ہائے تدریس کے مواذنے کے بعد اس نے پوں کی تعلیم و تربیت کے کچھ اصول مرتب کیے اور اس میں مضمون کی افادیت اور بچوں کے نفسیاتی تقاضوں کو دنظر رکھنے کی کوشش کی۔

ابن خلدون نے مروجہ طریق تعلیم کا ایک عمومی جائزہ لیا اور تعلیم کے مندرجات کا تجزیہ کیا۔ اس وقت ابتدائی ادرج میں قرآن کی تدریس لازمی تھی۔ بلکہ بعض علاقوں میں تو صرف قراتِ قرآن ہی کو تعلیم کا مدعا اور مطلوب سمجھا جاتا تا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ بعض اہل الرائے کے خیال میں چونکہ قرآن اسلام کا سب سے بڑا نشان ہے۔ اس لیے قرآن علیم ہمارا دینی شعار ہے۔ اس سے متعلم کا ایمان پختہ اور اس کا دل اسلامی معتقدات سے معمور ہو جاتا ہے۔ معتقدات براہ راست قرآن یا حدیث سے ماخوذ ہوتے ہیں[2]۔ اس طرح رفتہ رفتہ قرآن تعلیم و تدریس اور ملکۂ بعد کی اساس بن گیا۔ اس کی ایک توجیہہ یہ پیش کی جاتی ہے کہ جو بات ابتدائی مدارج اور ایام بلوغت میں پڑھائی جاتی ہے، اس کا اثر دیرپا ہوتا ہے۔ پہلا تاثر آخری تاثر ہوتا ہے۔ یہی بنیاد ہوتی ہے جس پر طالب علم پنے علم و عرفان کی عمارت تعمیر کرتا ہے۔ اگر بنیاد مضبوط ہے تو عمارت بھی مضبوط ہوگی اور اگر بنیاد ہی ضعیف ہو تو عمارت کے ڈھے جانے کا اندیشہ ہر وقت لاحق رہے گا[3]۔

اس کلیے کے پیش نظر بلاد اسلامیہ میں تدریس قرآن کو ضروری سمجھا جاتا ہے۔ اس سے متعلم کے اخلاق حمیدہ

---

[1] محمد حسین۔ ابن خلدون۔ مترجمہ عبدالسلام ندوی صفحہ ۲۳۲

[2] روزنتھال۔ المقدمہ۔ جلد ۳

[3] ایضاً " صفحہ ۳۰۱

پیش ہو جاتی ہے۔ اس کے عادات و اطوار منور ہو جاتے ہیں۔ اور دراصل حاصل زیست یہی ہے کہ آدمی آدمی ہو جائے[1]

درس قرآن کا یہ نظریہ ہر جگہ یکساں نہیں۔ اختلاف رائے ناگزیر ہے۔ ہر شخص کے سوچنے کا انداز منفرد ہوتا ہے۔ ایک گروہ یہ سمجھتا ہے کہ قرآن کی تدریس انسانی اخلاق کی تہذیب و تربیت کے لیے ضروری ہے۔ دوسرا گروہ اسے اس لیے پڑھانا چاہتا ہے کہ قرآن عربی انشا پردازی کا بہترین نمونہ ہے۔ اس کے پڑھنے سے طلبہ میں جو لسانی ملکہ پیدا ہوگا اس کی مدد سے وہ دوسرے علوم و فنون پر دسترس حاصل کر سکتے ہیں۔ اسی طرح تیسرے گروہ کا نقطۂ نظر اور ہے، اور چوتھے گروہ کا انداز فکر کچھ اور۔ علیٰ ہذا القیاس ہر شخص کا اپنا اپنا خیال اور اپنا اپنا طریق کار ہے[2]

ان حالات کے پیش نظر ابن خلدون نے مختلف تدریسی طریقوں کا جائزہ لیا، اور عقل و استدلال کی روشنی میں ایک راہ کی نشان دہی کی۔ اس میں اس نے خود اپنے اجتہاد فکر سے کام لیا اور جہاں جہاں سے کام کی باتیں معلوم ہوئیں ان سے استفادہ کیا۔ المغرب، الافریقہ، اندلس اور المشرق[3] سب کو دیکھا، سب کو پرکھا اور پھر اپنی ایک رائے قائم کی۔

---

[1] روزن تھال۔ المقدمہ، جلد سوم صفحہ ۳۰۰ - ۳۰۱

[2] ایضاً ، ، صفحہ ۳۰۲

[3] ابن خلدون نے بلاد اسلامیہ کو چار حصوں میں تقسیم کیا۔ المغرب، وہ علاقہ ہے جو ماورائے افریقہ (تونس) ہے۔ افریقہ تونس، اندلس ہسپانیہ اور المشرق سے مراد وہ علاقے ہیں جو مصر سے مشرق میں واقع ہیں۔

سزا کا نفسیاتی پہلو

انور علی قریشی

قصور اور سزا کا تعلق

قصور اور سزا کو پرانے وقتوں سے لازم و ملزوم سمجھا گیا ہے۔ صدیوں سے یہ بات بالکل قدرتی خیال کی جاتی رہی ہے کہ جو شخص قصور کرے اسے سزا دی جائے تاکہ وہ آئندہ اس قصور کے قریب نہ جائے اور دوسرے اس کی مثال سے عبرت پکڑیں۔

اس نظریے کے پیچھے یہ یقین کام کر رہا ہے کہ انسان دوسرے حیوانوں کی طرح راحت کا بھوکا ہے اور اذیت سے دور بھاگتا ہے۔ اس لیے انسان میں مطلوبہ طرزِ عمل پیدا کرنے کی بہترین صورت یہ ہے کہ پسندیدہ طرزِ عمل کے ساتھ راحت اور ناپسندیدہ طرزِ عمل کے ساتھ اذیت وابستہ کر دی جائے۔ اس تصور نے انسانی فکر پر ان گنت صدیوں تک حکمرانی کی ہے۔ دنیا بھر کے ضابطہ ہائے قانون اور ہر قسم کی عدالتوں نے انسانی کردار کو سیدھی راہ پر لانے کے لیے یہی طریق کار اختیار کیا ہے۔ تعلیم و تربیت کے ہر قسم کے اداروں نے اپنا سارا طریق کار اسی مفروضے کو بنیاد بنا کر مرتب کیا ہے۔

مگر جدید نفسیاتی تحقیق نے اس مفروضے کی بنیاد ہلا کر رکھ دی ہے۔ سزا کی بے اثری کے متعلق یہ کوئی نیا انکشاف نہیں۔ صاحبِ نظر لوگوں کو اس حقیقت کی دیر سے خبر ہے۔ ایک زمانہ وہ تھا جب یورپ میں جیب کاٹنے کی سزا پھانسی تھی۔ جو لوگ دوسروں کی جیبیں کاٹتے پکڑے جاتے تھے انھیں چوراہوں میں پھانسی پر لٹکا دیا جاتا تھا اور اس انصاف کا تماشہ دیکھنے کے لیے ٹھٹ کے ٹھٹ جمع ہو جاتے تھے۔ مگر حیرانی کی بات یہ ہے کہ جب ایک جیب تراش پھانسی پر لٹکایا جا رہا ہوتا تھا، دوسرے جیب تراش اپنے کام میں لگے ہوتے تھے اور جب مجمع منتشر ہوتا تو کئی لوگ اپنی جیبیں کٹی پاتے۔ ان کامیاب مجرموں کو پھانسی کا عبرتناک منظر بھی جرم سے باز نہ رکھ سکا۔

معاملے کا افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ جرم کرتے ہوئے پکڑے وہ جاتے ہیں جو ابھی اس کام میں ماہر نہیں ہوئے ہوتے۔ ماہر مجرم بہت شاذ پکڑے جاتے ہیں، اس لیے وہ پولیس، قانون، عدالتوں اور قید خانوں کے سارے نظام کے ہوتے ہوئے اطمینان کے ساتھ پوری زندگیاں کامیابی کے ساتھ جرم کرتے کرتے گزار دیتے ہیں ایسے عادی مجرموں کا وجود نئے بننے والے مجرموں کو اگر کوئی سبق دیتا ہے تو یہ کہ جرم اختیار کرنے سے پہلے اس کی پوری تربیت حاصل کرنی چاہیے۔ یہ بات عادی مجرموں کے گرد جاں نثار چیلوں کا ایک گروہ جمع کر دیتا ہے اور یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہتا ہے۔

یہ بات سب کو معلوم ہے کہ بہت کم مجرم پکڑے جاتے ہیں، پھر جو پکڑے جاتے ہیں ان میں سے بہت تھوڑوں کے خلاف جرم ثابت کیا جا سکتا ہے۔ اور آخر جنھیں سزا ہو بھی جائے ان میں سے بہت تھوڑے پوری سزا بھگتتے ہیں۔ ان ناقابل تردید حقائق نے بعض صاحب نظر لوگوں کو یہ کہنے پر مجبور کیا ہے کہ ضابطۂ تعزیرات سراسر بے کار ہے۔

انسانی کردار کے محرکات

انسانی علوم آج ترقی کے جس درجے پر پہنچ چکے ہیں اس کی بدولت پرانے وقتوں کا یہ خیال غلط ثابت ہو چکا ہے کہ دکھ اور سکھ کے تازیانوں کی مدد سے انسانی کردار کو مطلوبہ راہ پر لگایا جا سکتا ہے۔ انسان بے شک دکھ سے بھاگتا ہے اور سکھ کا ہر وقت پیاسا رہتا ہے۔ مگر دنیا میں ایسے انسان ہمیشہ موجود رہے ہیں جنھوں نے قانون کی آنکھ سے بچ کر راحت حاصل کرنے کی آسان راہیں معلوم کر لیں اور انھیں بالکل کوئی تکلیف نہ پہنچی۔ یہ لوگ جانتے تھے کہ جو راہیں وہ اختیار کر رہے ہیں ان کے لیے قانون نے کیا سزا مقرر کر رکھی ہے انھیں یہ اچھی طرح علم تھا کہ رائے عامہ ان کے فعل کو نفرت سے دیکھے گی۔ عام حالتوں میں انھیں یہ بھی معلوم نہ تھا کہ اگلی دنیا میں انھیں اپنے فعل کے لیے جواب دینا پڑے گا۔ مگر ان ساری باتوں کا علم انھیں جرم کی راہ سے باز نہ رکھ سکا۔ اس قسم کے لوگ دنیا میں آج بھی ہر جگہ موجود ہیں اور آئندہ بھی موجود رہیں گے۔

یہ بجا ہے کہ انسان کی بھاری اکثریت جرم کے راستے سے دور رہتی ہے۔ بہتوں کو ان کا ضمیر اس راستے سے باز رکھتی ہے۔ کئی قانون کے ڈنڈے سے ڈرتے ہوئے جرم کے پاس نہیں پھٹکتے اور کئی رسوائی کے ڈر سے

اس سے بچے رہتے ہیں. مگر اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی جھٹلائی نہیں جا سکتی کہ ہر معاشرے میں کچھ نہ کچھ
افراد ایسے بھی ہوتے ہیں جن کا کردار ان ساری باتوں سے کوئی اثر قبول نہیں کرتا. وہ اپنے آپ کو ہر طرف
سے مایوس اور دھتکارا ہوا محسوس کرتے ہیں. انھیں رہ رہ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ معاشرے نے
ان کے ساتھ انصاف نہیں کیا اور نہ ہی اس سے آئندہ انصاف کی امید ہے. یہ احساس انھیں نا امیدی
اور نامرادی کے بھنور میں بار بار غوطے دیتا ہے اور وہ دفعتہً فیصلہ کر لیتے ہیں کہ وہ ایسی راہ نکالیں گے
جو آسانی سے ان کی محرومی کا علاج کر دے.

جرم اور سزا کا ذکر کرتے ہوئے بعض لوگ یہ دلیل دیا کرتے ہیں کہ ماں باپ کا لاڈلا بچہ بھی جب کوئی
ناپسندیدہ کام کرنے لگے تو وہ اس کے ہاتھ کو جھنجوڑ کر روک دیا کرتے ہیں یا بچے کے ایک طمانچہ لگا دیا
کرتے ہیں. یہ سزا بچے کو تصور سے روک کر اسے ناپسندیدہ طرز عمل کا عادی بنا دیتی ہے. یہ
استدلال ضابطہ تعزیرات کے متعلق درست تسلیم نہیں کیا جا سکتا. یہاں جرم کرنے والے بچے نہیں
بالغ ہوتے ہیں. اس کے علاوہ وہ کسی کے لاڈلے نہیں ہوتے بلکہ انھیں اس بات کی شکایت ہوتی ہے
کہ ان کا غم نکالنے والا کوئی نہیں.

سزا کی اصل ماہیت

جب کسی شخص پر جرم ثابت ہو جاتا ہے اور عدالت اس کی سزا کا فیصلہ سنا دیتی ہے تو قانون اس
بات پر اطمینان کا اظہار کرتا ہے کہ اس نے عوام کے ایک دشمن سے بدلہ لے لیا ہے. مگر اس بدلے کی
نوعیت کیا ہے. یہی نا کہ مجرم کو کچھ مہینوں یا سالوں کے لیے معاشرے سے کاٹ کر ایک قید خانے میں
بند کر دیا جاتا ہے. مگر اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ جتنے عرصے کے لیے اسے قید کیا گیا ہے وہ عرصہ
اس کی اصلاح کے لیے کافی ہے. کسی ایک جرم کا ارتکاب کرنے والے مختلف مجرم ایک سا ذہنی پس منظر
نہیں رکھتے. ممکن ہے ایک شخص نے یہ جرم کسی وقتی جذبے کے تحت کیا ہو اور دوسرے نے کسی پختہ عادت
کی بنا پر. ظاہر ہے کہ ان دونوں کی سزا ایک سی نہ ہونی چاہیے. مگر ضابطہ تعزیرات میں اس قسم کی چھان
بین کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے.

پھر اس سے بڑی لغویت یہ ہے کہ جب کوئی مجرم اپنی مقررہ قید بھگت لیتا ہے تو اسے دوبارہ معاشرے پر مسلط کر دیا جاتا ہے خواہ اس میں کوئی اصلاح ہوئی ہو یا نہ۔ عام حالتوں میں زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ قید خانے کی روح کش فضا نے اس کی رہی سہی انسانیت کو بھی ختم کر دیا ہوگا۔ اس طرح انسانی اوصاف کھو دینے اور ماتھے پر اور ماتھے پر سیاہی کا ٹیکہ لیے یہ بدنصیب دوبارہ اسی معاشرے پر ٹھونس دیا جاتا ہے جس کا اسے دشمن قرار دیا گیا تھا۔ جان پہچان والے اس سے کنی کتراتے ہیں۔ کام کاج حاصل کرنے کا میدان اس پر پہلے سے کئی گنا تنگ ہو گیا ہوتا ہے۔ مگر قانون اس سے توقع رکھتا ہے کہ اب وہ پہلے کی نسبت بہتر شہری بنے اور پسندیدہ طور طریقے اختیار کرے۔

اس قسم کی توقع صاف طور پر لغو ہے۔ جو شخص انسانی کردار کے متعلق ذرا بھی نگاہ رکھتا ہو وہ سمجھ سکتا ہے کہ کسی مجرم کو اس وقت تک قید خانے سے رہا نہ کرنا چاہیے جب تک اس کے متعلق یہ یقین نہ ہو جائے کہ اس میں کوئی حقیقی تبدیلی پیدا ہو چکی ہے۔ اس قسم کی تبدیلی کسی کو محض بند رکھنے سے پیدا نہیں ہو سکتی۔ کردار میں تبدیلی پیدا کرنے کے لیے اس شخص کا نفسیاتی مطالعہ ہونا چاہیے۔ اس کے ذہنی پس منظر کو سمجھنے کے بعد اس کی موزوں تربیت ہونی چاہیے۔ اسے کوئی موزوں پیشہ سکھانا چاہیے۔ قید خانے سے باہر اس کے لیے کوئی موزوں کام تلاش کرنا چاہیے۔ یہ ساری باتیں ہو لیں تو پھر اسے قید سے رہا کرنا چاہیے۔

تاہم اگر کوئی قیدی ایسا ہو کہ وہ کسی تدبیر سے اصلاح قبول نہ کرے تو پھر اس قسم کے قیدی کو ہرگز رہا نہ کرنا چاہیے۔ یہ فرض معاشرے کی طرف سے قید خانہ کے افسروں پر عاید ہوتا ہے کہ وہ قیدیوں کو صرف اس وقت واپس کریں جب وہ کامیابی سے معاشرے میں سما سکتے ہوں۔ اگر وہ اس صلاحیت سے عاری رہیں تو ان کا واپس بھیجنا معاشرے پر ظلم کرنا ہے۔

جدید نفسیات نے اصلاح و علاج کے تصور میں جو انقلابی تبدیلی پیدا کی ہے۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے ایک ماہر نفسیاتی معالج پیارکرتا ہے کہ جس نفسیاتی علاج گاہ کے ساتھ اس کا تعلق ہے آج سے دس سال پہلے اس میں ایک مریض اوسطاً پانچ سال تک قیام کرتا تھا۔ اب اوسط قیام کی مدت صرف تین ماہ رہ گئی ہے۔ اب کیفیت یہ ہے کہ اس سال پہلے کسی کو دو سال سے پہلے چھٹی نہیں ملتی تھی۔ دس سال پہلے

علاج گاہ میں بھیڑ کا یہ حال تھا کہ نئے مریضوں کو داخلہ مشکل سے ملتا تھا۔ آج کئی بستر خالی پڑے ہیں۔ ہاں بعض مریض ایسے ضرور نکل آتے ہیں جنھیں فارغ کرنا ممکن نظر نہیں آتا۔ اسی طرح کچھ مریض ایسے بھی ہوتے ہیں جنھیں چھٹی دینے کے بعد دوبارہ داخل کرنا پڑتا ہے۔ بالکل یہی طریق کار اخلاقی مریضوں کے متعلق اختیار کرنا چاہیے۔

اصلاح حال کی ضرورت

ماہرین نفسیات موجودہ ضابطہ ہائے تعزیرات سے ہرگز ہرگز مطمئن نہیں وہ یہ نہیں کہتے کہ معاشرے کو سماج دشمن عناصر سے بچایا نہ جائے۔ بلکہ ان کو شکایت یہ ہے کہ تعزیرات کے موجودہ ضابطے وہ مطلب پورا نہیں کرتے جسے پورا کرنے کا وہ دعویٰ کرتے ہیں۔ وجہ یہ کہ مروجہ قوانین جرم کے حقیقی محرکات کا کھوج لگانے کی کوئی کوشش نہیں کرتے۔ وہ ایک ہی جرم کرنے والے تمام اشخاص کو ایک سا مجرم گردانتے ہیں۔ پھر وہ اصلاح حال کے لیے ان مجرموں کو ایک مقررہ عرصے کے بعد قید و بند میں جکڑ دیتے ہیں تاکہ ان کی مسخ شدہ سیرت اور زیادہ مسخ ہو جائے اور جب یہ بدنصیب لوگ ہر انسانی وصف سے خالی ہو جاتے ہیں تو انھیں پھر سے معاشرے پر تھوپ دیا جاتا ہے۔ تاکہ یہ اپنی اور دوسروں کی زندگیوں کو پہلے سے بھی زیادہ تلخ بناتے رہیں۔

قانون اور سزا کا یہ تصور اس قدر فرسودہ ہو چکا ہے کہ جدید ذہن اسے قبول نہیں کر سکتا۔ بے شک عدالتوں کو چاہیے کہ مجرموں کی پوری پہچان کرکے انھیں قصوروار قرار دے دیں۔ مگر اس کے بعد جو کچھ ہوتا ہے اس کے لیے کوئی جواز موجود نہیں۔ مجرموں کے ساتھ منتقمانہ برتاؤ کیا جاتا ہے جو ان کے دلوں میں معاشرے کے خلاف مزید بغاوت پیدا کرتا ہے۔ چاہیے یہ کہ ہمارا طریق کار معالجاتی ہو۔ ہم یہ معلوم کریں کہ معاشرہ ان بدنصیب لوگوں کو کیوں جذب نہیں کر سکا۔ ان اسباب کا کھوج لگانے کے بعد انھیں دور کرنے کی راہیں پیدا کرنی چاہئیں۔ مجرموں کے قلب و دماغ کو اس طور پر بدل دینا چاہیے کہ وہ معاشرے میں ایک مفید جگہ پکڑنے کے قابل ہو جائیں۔ اگر ہم اس کوشش میں ناکام رہیں تو ہمیں اپنی ناکامی کا کھلے طور پر اعتراف کرنا چاہیے اور مجرم کو غیر معین عرصے تک قید خانے میں ہی رکھنا چاہیے۔ تاکہ معاشرہ اس ناقابل اصلاح

آدمی کے شر سے بچا رہے۔

اس پس منظر میں موت کی سزا اخلاقی اور قانونی ہر دو لحاظ سے ناقابل قبول نظر آتی ہے۔ طبیب ہر قسم کے مریضوں کا علاج توجہ اور ہمدردی سے کرتے ہیں، خواہ اس کی بیماری کتنی ہی خطرناک ہو اور خواہ اس کے بچنے کی کوئی بھی امید نہ ہو۔ آج تک کسی حکیم یا ڈاکٹر نے کسی مریض کے مار دیئے جانے کا مشورہ نہیں دیا۔ یہ بڑی عجیب بات ہے کہ جو چیز ہم جسمانی بیماریوں میں پسندیدہ خیال نہیں کرتے۔ ہم ذہنی اور روحانی بیماریوں کے علاج میں اس سے کام لیتے نہیں جھجکتے۔ کسی شخص کو قتل کی سزا دے کر ہمیں خواہ کتنا ہی اطمینان محسوس ہو۔ مگر اس فعل کے صاف معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالےٰ نے اس انسان کو پیدا کر کے غلطی کی تھی اور ہم نے اس غلطی کو درست کر دیا ہے۔ یہ استدلال مذہبًا، اخلاقًا اور قانونًا کسی طرح بھی جائز نہیں۔ خالق نے جس شخص کو پیدا کیا ہے اس نے اسے زندہ رہنے کا حق بھی دیا ہے۔ کسی دوسرے انسان کو کسی طرح زیبا نہیں کہ اس سے یہ حق چھینے ؂

تدریسی امدادیں

محمد حسین

مسلسل نمبر ۲

۵ - ایپی ڈائی سکوپ

اس کی ساخت بھی اول الذکر سے ملتی جلتی ہے صرف اتنا فرق ہوتا ہے کہ اس میں سلائڈیں استعمال نہیں ہوتیں بلکہ اس کے اندر ہی ایک چھوٹا سا پلیٹ فارم بنا ہوتا ہے جس پر ملفوبہ شے رکھ کر اس کی نمائش کی جاتی ہے۔ یہ آلہ چھوٹی اشیا کو بڑا کر کے دکھانے کے کام آتا ہے۔ مثلاً اگر کسی پودے کی مہین مہین جڑیں اس کے اندر رکھی جائیں اور بجلی کا بٹن دبا دیا جائے تو پردہ پر وہ جڑیں بہت موٹے رسے کی مانند دکھائی دیں گی۔ چھوٹے چھوٹے کیڑے مکوڑوں کی ساخت اور جسم کے مختلف اعضا کو دیکھنے میں اس سے کام لیا جا سکتا ہے جس چھوٹی چیز کو کھلی آنکھ صاف طور پر نہ دیکھ سکے تب یہ آلہ ہماری مدد کے لیے حاضر ہے۔ چھوٹے سائز کے فوٹو، باریک لکھی ہوئی عبارت، دل کش نظارے والے فوٹو دیکھنے میں بڑی دل چسپی محسوس ہوتی ہے درسی معاون کے طور پر یہ جادو کی لالٹین اور فلم ہمارے ہاں بہت ہی کم استعمال میں لائے جاتے ہیں کیوں کہ ان کی نمائش میں تاریک اطاق اور بجلی کی فراہمی ایک مسئلہ ہے۔ جیسا کہ پاکستان ایک زراعتی ملک ہے۔ زیادہ تر آبادی اور اسکول دیہات میں واقع ہیں۔ بڑے بڑے شہروں کے سوائے دیہات میں ابھی بجلی عام نہیں ہوئی۔ سکولوں کی تعمیر کے وقت ایک تاریک اطاق کی ضرورت کو محسوس نہیں کیا جاتا اس کا سہل طریقہ یہ ہے کہ کسی ایک اندرون عمارت گھرے ہوئے کمرے کو اندر سے سیاہ پینٹ کر دی جائے اور کھڑکیوں روشندانوں کو بند کر دیا جائے۔ شیشوں پر بھی سیاہ پینٹ کر دی جائے۔ بجلی کے بدل کے طور پر کوئی اور تیز ذریعہ روشنی بنایا جائے مثلاً کاربائیڈ لیمپ وغیرہ۔ اپنے ملکی حالات کے پیش نظر ان میں مناسب ترمیم کر کے نئے سانچے میں ڈھال لینا چاہیے۔

۶ - ریڈیو اور ٹیلی ویژن :- ریڈیو صرف سماعت کا ہی ذریعہ ہے، جبکہ ٹیلی ویژن سمعی بصری دونوں

لحاظ سے مکمل واکمل ہے۔ ہمارے ہاں صرف ریڈیو کا ہی رواج ہے۔ چناں چہ ہر سکول میں ایک ریڈیو سیٹ لازمی ہو۔ طلبہ کو تعلیمی پروگرام سنانے کا انتظام ہو۔ ریڈیو کی حیثیت ایک ادارہ تعلیمی سے ہے۔ آئے دن مشہور معروف لیڈران ملک کی تقریریں و ملکی ترقی کے حالات نشر ہوتے رہتے ہیں۔ دوسرے یورپین ممالک میں تو طلبہ کے لیے علیحدہ تعلیمی پروگرام نشر کیا جاتا ہے۔ ادبی ذوق کو بڑھانے کے لیے مشہور ادیبوں اور ڈرامہ نویسوں کے فن پارے ریڈیو سے نشر کیے جاتے ہیں۔ طلبہ اچھے اور صحیح تلفظ سے واقفیت حاصل کرتے ہیں اور معلومات میں روز افزوں اضافہ ہوتا ہے۔ سکول ریڈیو سے بہترین مفاد حاصل کرنے کے لیے تقسیم کار ہونا چاہیے۔ انتظام ایک انچارج کے تحت ہو جو مختلف اوقات میں اس کی سماعت کا انتظام کر سکے تعلیمی افادیت کے پیش نظر بچوں کا خصوصی درسی پروگرام روزانہ نشر کیا جائے۔ وہ وقت تو ابھی دور ہے جب سکول ریڈیو سٹیشن قائم ہو گا۔ کیوں کہ یہ ابھی ممکن نہیں کہ معلم کو ریڈیو سے بدل دیں۔ نہ تو حالات اس کے لیے سازگار ہیں اور نہ قطعی طور پر ایسا ہو سکتا ہے۔ ہمارے اندر ابھی قومی ملکیت کا احساس اتنے عروج پر نہیں جتنا کہ قومی تقاضہ ہے۔ حالاں کہ ترقی یافتہ ممالک کے دوش بدوش چلنے کے لیے ہم میں ان قومی تقاضوں کا فقدان ہماری منازل ترقی میں ایک زبردست رکاوٹ بھی رہا ہے۔

سچے اور محب وطن شہری پیدا کرنے کے لیے دورِ حاضر میں ریڈیو سے بہتر ذریعہ نشر کوئی اور نہیں ہو سکتا قوم اور ملک دونوں کی فلاح و بہبود کے لیے اور تعلیمی مسائل کے حل کے لیے اس مفید ایجاد سے بقدر کام لیا جائے۔

۷۔ تعلیمی فلمیں

تعلیمی فلمیں پانچ موضوعات پر مبنی ہو سکتی ہیں (۱) تاریخی فلمیں جن میں سکندر، پکار، اور ہمایوں جیسی فلمیں شامل ہیں۔ اس قسم کی فلمیں طلبہ میں نہ صرف تاریخ سے دلچسپی قائم رکھتی ہیں بلکہ بہترین ماحول بھی میسر کرتی ہیں۔ شاہی دربار کی جاہ و حشمت، رعب و جلال اور تمکنت کی ایک تصویر طلبہ کے ذہنوں پر نقش ہو جاتی ہے (۲) معلوماتی فلمیں بھی لازمی ہیں جن میں ملکی ترقی کے متعلق اہم معلوماتی منظروں کی عکاسی کی ہوتی ہے چناں چہ انتخاب کی اہمیت اور صحیح طریقہ کار کو بہتر طور پر عوام کو سمجھانے کے لیے ادارہ قومی تعمیر نو کی

طرف سے نئی کرن فلم بنائی گئی ہے۔ جسے دیکھنے کے بعد ایک آدمی کو کم از کم اتنا شعور ضرور ہو جاتا ہے کہ ووٹ قوم کی ایک امانت ہے اور اسے اندھا دھند ضائع نہ کرنا چاہیے۔ طلبہ جو آج کے بچے ہیں اور کل کے شہری ہیں کے لیے ان چیزوں کا سمجھنا انتہائی اہم ہے۔ چنانچہ معلوماتی فلموں کی عوام کی نسبت طلبہ کو کہیں زیادہ ضرورت ہے۔ طلبہ خود جان کر اپنے والدین و احباب کو ان چیزوں سے بخوبی روشناس کرا سکتے ہیں اول توجہ طلبہ کے سکھلانے میں صرف کرنی چاہیے (۳) جغرافیائی اہمیت کی فلمیں جن کا استعمال تدریس میں ناگزیر سمجھا جاتا ہے۔ وادی کشمیر کے برف پوش پہاڑ۔ اسکیمو لوگوں کی زندگیاں، مختلف سمندروں میں بحری رووؤں کا حال سندھ کی دیہاتی زندگی کی جھلک دکھانے کے لیے فلموں کی نمائش کا انتظام کرنا چاہیے۔ ناروے کے لوگوں کی طرز بود و باش سوئٹزرلینڈ کے خوبصورت مناظر پر مبنی فلموں سے طلبہ تھوڑے وقت میں بہت کچھ سیکھ لیتے ہیں جبکہ کلاس روم میں اکتا دینے والے لیکچر سے وہ جلد ہی گھبرا جاتے ہیں اور توجہ منتشر کر کے باہم باتوں میں مشغول ہو جاتے ہیں (۴) سماجی و اصلاحی فلموں کی اہمیت بھی دوسروں کے مقابلے میں کچھ کم نہیں ہندوستان میں صوبائی عصبیت کو مٹا کر یگانگت پیدا کرنے کے لیے ایک فلم "تین بتی چار راستہ" تیار کی گئی ہے جس کا چربہ اتار کر پاکستان میں بھی نیا دور کے نام سے پیش کی گئی ہے۔ بیداری گو ایک ہندوستانی فلم کا چربہ ہے۔ لیکن پھر بھی تعلیمی ماحول پیدا کرنے والی فلمیں طلبہ کے لیے از بس ضروری ہیں۔ ہمارے معاشرے میں ابھی کئی ایک جہالتیں موجود ہیں جنہیں دور کرنے کے لیے تعلیمی فلمیں ایک اہم اور وقتی رول ادا کر سکتی ہیں۔ طلبہ خود کئی غیر سنجیدہ افراد یا عادت کے شکار ہوتے ہیں۔ اچھے آداب سکھانے کے لیے ہم فلموں کے ذریعے بھی کام لے سکتے ہیں (۵) سائنسی موضوعات پر مبنی فلمیں ترقی یافتہ ملکوں میں تدریس کا ایک اہم حصہ سمجھی جاتی ہیں۔ مختلف چیزوں کے اصولی کارکردگی کو بہ احسن طریق فلمایا جاتا ہے۔ مثلاً ایک کار کا انجن کیسے کام کرتا ہے۔ کاغذ کیسے تیار کیا جاتا ہے۔ ملک میں ٹیکنیکل تعلیم کو عام کرنے کے لیے سائنسی فلموں کو ضروری طور پر تدریس کا ایک حصہ بنا دینے گا کیونکہ ملک کو جلد صنعتی بنانے میں اس قسم کی فلمیں ہی جلد تر اس کام سے ہم آہنگ ہو سکتی ہیں۔

لیکن ساتھ ہی درسی و تعلیمی فلموں کو ہم اندھا دھند استعمال نہیں کر سکتے بلکہ بہت حد تک محتاط ہو کر ان سے استفادہ حاصل کرنا ہے۔ بہت زیادہ دیر تک تاریک کمرے میں بیٹھنا بھی بصارت پر

اثر ڈالتا ہے۔ فلم کی نمائش سے پہلے طلبہ کو نفسِ مضمون سے آگاہ کر دینا چاہیے۔ تاکہ سمجھنے میں کوئی مشکل نہ رہے۔ اس کے علاوہ طلبہ اسے محض تفریح نہ سمجھیں بلکہ علمی حیثیت کو پہچانیں۔ اس کے لیے معلم ہی انہیں مناسب ہدایات دے کر تیار کر سکتا ہے۔

۸۔ **تعلیمی سیر**: اگر طلبہ کو تاریخی، صنعتی اور قابلِ دید جگہوں کی سیر کرائی جائے تو علمی طور پر طلبہ بہت زیادہ مستفید ہوتے ہیں۔ ایک طالب علم روزمرہ کی استعمال کی چیزیں دیکھ کر حیران ہوتا رہتا ہے اور یہ جاننے کی کوشش کرتا ہے کہ فلاں فلاں چیزیں کس طرح بنائی گئی ہیں۔ اس کی اس تسکین کو پورا کرنے کے لیے اس کو مختلف کارخانے جات کی سیر پر لے جایا جائے تاکہ وہ بچشم خود دیکھ لے۔ پلاسٹک کے کارخانے اور دیگر صنعتی جگہوں پر جانا طالب علم کی معلومات میں اضافے کا باعث بنتے ہیں۔ تاریخی مقامات شاہی قلعہ لاہور۔ ہڑپہ، موہنجو داڑو ٹیکسلا جیسے اہم مقامات کی سیر سے کئی صدیوں پرانے حالات، تہذیب و تمدن آشکارا ہوتے ہیں۔ لیکن ان سب باتوں سے پہلے ایک ترتیب وار پروگرام کی اہمیت کو محسوس کرنا ہے۔ مختلف مقامات کے مہتمم صاحبان اور کارخانوں کے منتظم لوگوں سے پیشگی اجازت لینا ضروری ہے۔ بیشتر اوقات فوری طور پر اجازت حاصل نہیں ہوتی اور مہنگے مصارف صرف کر کے بھی مایوس لوٹنا پڑے تو پھر کچھ خوش گوار اثرات ظاہر نہیں ہوتے۔ ایک ڈائری ہمراہ ہو تاکہ سفر کے دل چسپ حالات اور مختلف مقامات پر لیے گئے اقتباسات درج کیے جا سکیں۔ سفر کے دوران بہت سے دل کش مناظر میسر آتے ہیں۔ اگر فوٹو گرافی کا شوق بھی ہے تو کیمرہ بھی ہمراہ ہو گو فوٹو گرافی ایک مہنگا مشغلہ ہے لیکن اس کے لیے ہوئے فوٹو ایک مستقل یادگار ہوتے ہیں اور بہت عرصے تک بھی ذہنوں سے اس جگہ کے متعلق بھول نہیں ہوتی۔ دل کش اور خوب صورت مناظر ذہن کی پلیٹ پر آشکارا رہتے ہیں۔ رہبرِ تعلیم سیر طلبہ کو مختلف وقفوں کے بعد سفر کا ایک طائرانہ سا جائزہ دلگا دیا کرے تاکہ طلبا صرف تفریح سمجھ کر ہی خوش نہ ہوتے رہیں بلکہ تعلیمی مدعا بھی حاصل ہو جس کے لیے اس قسم کے سفر اختیار کیے جاتے ہیں۔ شہری طلبہ اپنے معلم کی نگرانی میں وقتاً فوقتاً کارخانوں کی سیر کر سکتے ہیں اور کبھی کبھی دیہات کا رُخ بھی کریں تاکہ وہ یہ معلوم کر سکیں کہ دیہات والے کس حد تک اپنے ماحول سے وابستہ ہیں۔ ان کے کھیتی باڑی کے طریقوں کا مطالعہ کریں۔ اسی طرح دیہاتی طلبہ گروپ بنا کر معلم کی نگرانی میں شہروں کی سیر کریں۔ فیکٹریوں، ورک شاپوں اور ملوں میں جا کر مصنوعات کو تیار ہوتا دیکھیں۔

تاریخی مقامات اور قابل دید جگہوں کی سیر کریں اور جب سڑک کے کنارے میں سپاہی کو کھڑا پائیں تو ٹریفک کے اصولوں سے بھی کچھ واقفیت حاصل کریں۔ اس قسم کی سیروں کو زیادہ کامیاب بنانے کے لیے پہلے سے مطالعہ کر کے جانا چاہیے۔ اور ایسے نقطوں کو نوٹ کر لینا چاہیے اور جو سمجھ میں نہ آتے ہوں یہ نہ ہو کہ جائے وقوع پر جا کر ہی ساری باتیں یاد کی جائیں، بلکہ ہمارا ذہن پہلے سے اس کے لیے تیار ہو اور پیش آنے والی ضرورتوں اور واقعات کا ڈائری میں ایک خاکہ سا بنا لینا چاہیے اور سفر سے واپسی پر جائزہ لیا جائے کہ کونسی مزید نئی باتیں سیکھ لی ہیں۔

۱۔ ریفریشر کورسز

مندرجہ بالا تدریسی امدادوں کی تیاری اور نفسیاتی ترتیب کے لیے ہر سال ضلع وار ریفریشر کورسز منعقد ہونے چاہئیں تاکہ وہاں معلمین آسانی سے پہنچ سکیں اور علمی ماہرین کی زیر نگرانی اپنی مشکلات پر تبادلۂ خیالات کے علاوہ اچھی درسی امدادیں تیار کرنا بھی سیکھ لیں اس قسم کے کورسز میں پانچ سال کے اندر ضلع کے تقریباً سبھی مدرسین کی باری آجائے۔ ان کورسز میں چارٹ کی تیاری ان کا سجانا اور رنگوں کا چناؤ وغیرہ سکھایا جائے اس کے علاوہ پروجیکٹر کو چلانے کی تربیت حاصل کی جائے۔ جادو کی لالٹین کے لیے مختلف النوع سلائڈیں تیار کرنا اور فلم سٹریپس بنانا سکھایا جائے۔ فوٹوگرافی کی تربیت دی جائے۔ تاکہ اساتذہ اپنے سکولوں میں اگر فوٹو گرافک کلب قائم کر سکیں۔ طلبہ میں اچھے قسم کے مشغلے پیدا کرنا بھی وقت کی اہم ضرورت ہے۔ اگر مستقبل میں طلبہ اپنے مشغلے کو بطور پیشہ بھی اختیار کرنا چاہیں تو کوئی رکاوٹ مانع نہ ہو۔ اور معلم کو یہ دیکھ کر دلی طمانیت حاصل ہو گی کہ اس کا شاگرد باعزت طور پر برسر روزگار ہے۔ ملک سے کسی حد تک بے روزگاری کو دور کرنے میں ایسے مشغلوں کی اہمیت واضح ہے اور انھیں زیادہ سے زیادہ فروغ دینے کی کوشش کرنا چاہیے۔

ریفریشر کورسز نئی معلومات کا ایک بے بہا خزانہ ہیں اور تدریس میں ان کی حیثیت مسلم ہے۔ ان کا اصل مقصد یہ ہے کہ جدید قسم کے خیالات و موجودہ ترقی جو تدریس پر اثر انداز ہو رہی ہے اساتذہ کو ان سے ہم آہنگ کریں اور وقت کی مطابقت کے ساتھ انھیں گاہے گاہے تازہ کرتے رہیں۔

اساتذہ کو سکولوں میں حوالہ جات کی کتابیں ور سائل تو درکنار معمولی کتابیں بھی دستیاب نہیں ہوتیں جن سے وہ اپنی تدریس کو بہتر بنا سکیں۔ اس لیے ریفریشر کورسز میں حاضر ہونے کا موقع میسر آ جائے تو وہی

غنیمت ہے۔ ورنہ معلم کو اپنی علمی استعداد بڑھانے کے لیے اپنی جیب پر ہی انحصار کرنا پڑتا ہے جیسا کہ
ترقی یافتہ ملکوں کا محکمہ تعلیم اساتذہ کی رہنمائی کے لیے مختلف رسائل و پمفلٹ شائع کرتا ہے۔ اسی طرح اگر ہمارے
ہاں بھی ایسا ہی انتظام ہو تو بلاشبہ فن تدریس کی بہت سی خامیوں کا ازالہ ہو سکتا ہے۔ تعلیم کا مقصد یہ بھی ہے
کہ طلبہ کو بہتر مواقع پیش کریں جن سے وہ فائدہ اٹھا کر اپنی شخصیت کی نشو و نما کریں۔ اپنی خوابیدہ صلاحیتوں
کو جھنجھوڑیں اور مستقبل میں اچھے شہری اور بہتر زندگی گذارنے کے قابل ہوں۔ یہ تمام امور پہلے اساتذہ کو
خود معلوم ہوں کہ وہ کس طرح سے ایک ناقص ماحول کو بہتر ماحول میں تبدیل کر سکتے ہیں۔ ایسا کرنے کے لیے
ایسے کورسز لازماً ہر سال منعقد کیے جائیں تاکہ اساتذہ کو بچوں کی نفسیات سے واقفیت حاصل ہو اور بہتر
طریق تدریس اختیار کر سکیں۔

خاتمۂ کلام

مندرجہ بالا تدریسی امدادوں کو اپنانے پر جس تدریجی روشنی ڈالی ہے اس میں اس بات کا خاص لحاظ
رکھنا ہے کہ یہ امدادی ذرائع ہیں اور نہ کہ منزل۔ اس کی مثال ایسی سمجھیے جیسے کسی مسافر کو اپنی منزل پر پہنچنا ہے،
اس کے لیے اسے تیز رفتار ٹرین میں سفر کرنا ہوگا۔ اب یہ فرض مسافر پر عاید ہوتا ہے کہ وہ راستے کی دلفریبیوں
میں پھنس کر نہ رہ جائے بلکہ اسے لازماً اپنی منزل پر پہنچنا ہے۔ سہولت اور آرام کے لیے تیز رفتار ٹرین اس کی
امداد کے لیے حاضر ہے۔ اسی طرح اگر ہم ان موجودہ تعلیمی و درسی معاونات سے فائدہ نہ اٹھائیں تو
ہم باقی دنیا سے تعلیمی معاملوں میں بہت پیچھے رہ جائیں گے۔ چناں چہ افراط و تفریط سے بچتے ہوئے
ان کی مناسب اہمیت پر غور کرنا چاہیے۔ ہمارے ہاں زیادہ تر چارٹس ہی کو درسی معاون سمجھا جاتا ہے
اور وہ بھی معائنہ کے وقت اور سارے سال چنداں پرواہ نہیں کی جاتی۔ حالاں کہ باقی کے درسی معاونات
کے لیے شہری سکولوں کی فضا بھی سازگار ہے۔ صرف معمولی سی ترمیم کے ساتھ سبق کے دوران ان کو اچھی
طرح سے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ معلم کو البتہ کافی محنت کے ساتھ تیاری کرنا ہوگی۔ ان کے استعمال سے
سبق آسان و عام فہم اور دلچسپ ہو جائے گا۔ علاوہ ازیں طلبہ بھی اس موثر تدریس میں برابر کے شریک
ہوں گے۔ اور ان کی حیثیت سست سامع کی سی نہ ہوگی۔ دیہاتی سکولوں میں بھی کچھ متبادل قسم کے درسی

معاونات اُسی ماحول سے ڈھونڈ نکالنے کچھ زیادہ مشکل نہیں۔ گاؤں کے ظروف ساز۔ بڑھئی اور لوہار ہمار حسب منشا چیزیں تیار کرسکتے ہیں۔ ہمارے اندر تخلیقی قوتوں کی بیداری کی ضرورت ہے۔ تاکہ ہم اپنے گردونواح کے حالات کے مطابق اپنے گرد بکھری ہوئی چیزوں کی تشکیل سے کام لینا سیکھ لیں۔ ہر چیز میں ہمیں کسی کا محتاج نہ رہنا چاہیے، بلکہ معلم نئے تجربات کرے اور انھیں زیادہ سے زیادہ طلبہ پر آزما کر اُن کی آزمائش کریں اور فلاح و بہبود کے لیے دوسرے اساتذہ سے ان کو متعارف کرائے تب ہی ہمارا نظام تعلیم اور تدریس بہتر بنیادوں پر قائم ہوسکیں گے ؎

ایک نیا تعلیمی ادارہ

ڈاکٹر عبدالرؤف

جمہوری نظام میں تعلیم کو مرکزی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ جمہوری ممالک کے نظامِ تعلیم کو چند ایسے اہم اور بنیادی فرائض ادا کرنے کا شرف حاصل ہوتا ہے، جو عوام کی روحانی، معاشرتی، ثقافتی، اقتصادی اور فنی نشو و ارتقا کا باعث بنتے ہیں۔ دراصل جمہوریت کی صحت اور بقا کا دار و مدار بھی عوام کی ذہنی اور جسمانی نشو و نما پر ہی ہے۔ عوام کی نشو و نما کے لیے یہ امر ضروری ہے کہ ملک کا نظامِ تعلیم اس قدر ٹھوس اور جامع ہو کہ اس میں درس گاہوں کا نظم و نسق اور درس و تدریس معیاری ہو۔ تربیت اساتذہ سائنسی انداز میں ہو۔ نصابی کتب کی تصنیف، تالیف اور اشاعت میں تخلیقی صلاحیت اور تکنیک سے کام لیا جائے، تعلیم کے مختلف امور پر ٹھوس تحقیق کا معقول اہتمام ہو۔ بہتر تعلیمی روایات اور قوانین نافذ ہوں اور ملک کے فلسفۂ تعلیم میں انسانیت کے اعلیٰ معیار و اقدار کا احترام ہو۔

ان تمام اور اسی طرح کے دیگر متعلقہ تعلیمی فرائض کی باضابطہ ادائیگی کے لیے ایک ایسے مخصوص تعلیمی ادارے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے جو اپنی مرکزی حیثیت کی وجہ سے یہ کام اچھی طرح کر سکے۔ تعلیمی نظم و نسق اور منصوبہ بندی میں اعداد و شمار، جائزے اور ملکی اور غیر ملکی معلومات بہت بصیرت افروز ثابت ہوتے ہیں۔ اس قسم کی تمام معلومات اور اعداد و شمار بھی صحیح طور پر ایک مرکزی تعلیمی ادارہ مہیا کر سکتا ہے۔ اس قسم کے مخصوص تعلیمی ادارے کو بیورو آف ایجوکیشن کا نام دیا جاتا ہے۔ دنیا کے مختلف ممالک میں اس وقت اس قسم کے اداروں کی تعداد ستر سے تجاوز کر چکی ہے۔ اور ان کی تعداد میں مزید اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ تعلیمی طور پر ترقی یافتہ ممالک میں تعلیم کے کسی شعبہ میں اصلاح یا تغیر کی جب بھی ضرورت محسوس ہوتی ہے تو ان اداروں سے مدد طلب کی جاتی ہے۔ چناں چہ تعلیم و تدریس اور تعلیمی اداروں کے نظم و نسق میں مجوزہ تغیر اور اصلاح کی اساس ہمیشہ اُن معلومات اور مشوروں پر رکھی جاتی ہے جو تعلیمی بیورو سے دستیاب

ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ بیوریو آف ایجوکیشن کو ایک ایسے تعلیمی مرکز کی حیثیت حاصل ہے جسے نظامِ تعلیم کی ایک اہم اور بنیادی ضرورت پیدا کرنے کا موقع ملتا ہے۔

بیورو کے مقاصد

تعلیمی بیورو متعدد مفید تعلیمی اور تمدنی ضروریات پوری کرتا ہے۔ اس تعلیمی ادارے کی افادیت کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے اس کے جملہ اغراض و مقاصد کا مختصر سا تجزیہ بہت ممد ثابت ہوگا۔ تعلیمی بیوریو کے اہم ترین اغراض و مقاصد کو پانچ گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ جو درج ذیل ہے۔

(۱) تدریسی مقصد۔
(۲) تنظیمی مقصد
(۳) قانونی مقصد
(۴) ملّی مقصد
(۵) بین الاقوامی مقصد

بیوریو کا تدریسی مقصد: آج ہمارے متعدد تدریسی مسائل ایسے ہیں جن کا فوری اور معقول حل اشد ضروری ہے۔ کالجوں اور سکولوں میں درس و تدریس کی اصلاح کیسے ہو۔ بہتر کتب نصاب کیسے لکھی جائیں۔ تعلیمی اداروں کے درسی اور غیر درسی مشاغل کی منصوبہ بندی کیسے ہو، امتحان کا صحیح طریقہ کیا ہے، اور اسے کس صورت میں منعقد کیا جائے، تعلیم اور تربیت کے ضابطوں میں جان کیسے ڈالی جائے، اخلاق اور کردار کو تدریسی پروگرام سے صحیح طور پر متاثر ہونے کے لیے کیا اقدام اٹھائے جائیں، کم عقل، ناقص، مجرم اور پسماندہ بچوں کی تعلیم و تدریس کیسے اور کہاں ہو؛ ملک کی جاہل اور ان پڑھ آبادی کو کم کرنے کے لیے تعلیم بالغاں کے مراکز کی تنظیم کیسے ہو، وغیرہ وغیرہ۔ اس قسم کے سوالوں کے تسلی بخش جوابوں کا دستیاب ہونا کسی معقول اور ترقی پسند نظامِ تعلیم کے لیے بے حد ضروری ہے۔ بیورو آف ایجوکیشن ہی ایک ایسا ادارہ ہے جو مقامی اور بیرونی تحقیقوں، مشاہدوں اور تجربوں کی روشنی میں ان سب سوالوں کے معقول اور جامع حل پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ تعلیمی

اداروں کے تدریسی مشاغل کو اس قسم کی بیش بہا خدمات سے بہت معاونت مل سکتی ہے۔ اور اس حقیقت میں بھی کوئی شک نہیں کہ اس قسم کی بصیرت افروز معاونت کے بغیر تعلیمی اداروں میں سہو و خطا کے احتمالات بڑھ جاتے ہیں۔

تعلیمی اداروں کی تنظیم اور اصلاح

آج ہم اس بات کو بھی بڑی شدت سے محسوس کر رہے ہیں کہ ہمارے تعلیمی اداروں کو بہتر اور تعمیری سانچوں پر منظم کرنا اور جدید تعلیمی دریافتوں اور تحقیقوں کی روشنی میں ان میں تنظیمی اصلاحات کا نافذ کرنا اشد ضروری ہے۔ بیورو آف ایجوکیشن اس سمت میں بھی قائدین تعلیم کے بہت آڑے آ رہا ہے اس ادارہ میں ملک کے تعلیمی نظام اس کے محاسن و معائب کے جائزہ کا معقول اہتمام ہوتا ہے ملکی تعلیمی نظام کو بہتر بنانے اور اس میں خاطر خواہ تبدیلیاں اور اصلاحات نافذ کرنے کے لیے بیورو آف ایجوکیشن میں بیرونی ممالک کے تعلیمی نظاموں کے مطالعہ اور جانچ پرکھ کا اہتمام بھی کیا جاتا ہے تاکہ دنیا کی دیگر اقوام کے تعلیمی مشاغل اور تجارب سے حتی الامکان استفادہ کیا جا سکے۔ بہتر تعلیمی نظم و نسق اور تعلیمی اداروں میں تعمیر اور اصلاحات رائج کرنے کے لیے بیورو آف ایجوکیشن کی رہنمائی کے بغیر چارہ نہیں۔

بیورو اور تعلیمی قوانین

دنیا کا کوئی ملک ایسا نہیں ہے جہاں چند ایک خالص تعلیمی قوانین نافذ نہ ہوں۔ ان تعلیمی قوانین و ضوابط کا مقصد ملک میں تعلیم عام کرنا، تعلیمی کارکنوں کے لیے بنیادی سہولتوں کا اہتمام کرنا، تعلیمی بہتری کے منافی عناصر کا قلع قمع کرنا اور ہر اس اقدام کو فروغ دینا ہوتا ہے جس سے تعلیم و تدریس اور تعلیمی نظم و نسق کو تقویت پہنچتی ہو۔ ظاہر ہے کہ مفید تعلیمی قوانین کی تشکیل اور اُن کا نفاذ کسی ترقی پسند تعلیمی نظام کے لیے بے حد ضروری ہے۔

بیورو آف ایجوکیشن اس سلسلہ میں بھی بہت مفید خدمات سرانجام دیتا ہے۔ یہ ادارہ تعلیمی طور پر ترقی یافتہ ممالک کے رائج قوانین و ضوابط کا جائزہ لیتا ہے اور اپنے ملک کی مخصوص ضروریات کے پیش نظر ایسی قانونی تجاویز پیش کرتا ہے جو ماہرین تعلیم اور قانون ساز مجلسوں کے اراکین کو تعلیمی قوانین کی

تشکیل میں بہت کام آتی ہیں۔ اگر بیورو آف ایجوکیشن کی جانب سے اس قسم کی مفید تجاویز موصول ہونے کا اہتمام نہ ہو تو ملک کا تعلیمی نظام اچھے اچھے تعلیمی قوانین کے وجود اُن کے عملی اطلاق اور ان سے نکلنے والے تمام فوائد سے یکسر محروم رہ جاتا ہے۔

تعلیمی اور تمدنی بیداری

بیورو آف ایجوکیشن کا ایک اہم مقصد تعلیمی اور تمدنی بیداری پیدا کرنا بھی ہے کسی ملک کی اخلاقی، صنعتی اور معاشرتی ترقی کے لیے یہ امر ضروری ہے کہ اس کے عوام تعلیمی اور تمدنی طور پر بیدار ہوں اس قسم کی بیداری کے بغیر ہر قسم کی ترقی کے راستے یا تو بالکل مسدود ہو جاتے ہیں یا ترقی کی رفتار بہت سست پڑ جاتی ہے۔ بیورو آف ایجوکیشن عوام کی تعلیمی اور تمدنی بیداری میں پیش پیش حصہ لیتا ہے۔ مختلف تعلیمی ضرورتوں اور تعلیم کے تمام شعبوں سے متعلق مفید اور ٹھوس معلومات بہم پہنچا کر یہ ادارہ عوام میں تعلیمی اور تمدنی صحت اور بیداری کرنے کا باعث بنتا ہے۔ بیوپاریوں کی تعلیمی سہولتوں، اس کی شائع شدہ کتابوں رسالوں اور پمفلٹوں کی بدولت اساتذہ، تعلیمی منتظمین، والدین، تعلیمی محققین حتیٰ کہ عام شہریوں کو بھی اپنے وطن کے تعلیمی حالات سے واقفیت اور دلچسپی ہونے لگتی ہے۔ بیورو کی ان کاوشوں کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ لوگوں میں یہ احساس اجاگر ہونے لگتا ہے کہ وطن کی تعلیمی ضروریات کو کیسے سمجھا جائے اور کون سے اقدام اٹھائے جائیں جن کی مدد سے ان ضروریات کو پورا کر کے وطن کی تعلیمی حالت کو بہتر بنایا جا سکے۔ بیورو لوگوں میں یہ سوچنے کی صلاحیت بھی پیدا کر دیتا ہے کہ وطن کی تعلیمی بہتری میں ہر فرد کی مخصوص صلاحیتیں کس حد تک کارآمد ثابت ہو سکتی ہیں۔

بین الاقوامی مقصد

سطور بالا سے یہ امر واضح ہے کہ تعلیمی بیورو اپنے مخصوص ملک کے علاوہ دنیا کے باقی ملکوں کے تعلیمی نظم و نسق اور قوانین و ضوابط اور کتب و رسائل وغیرہ سے متعلق بہت بصیرت افروز اطلاعات بہم پہنچاتا ہے۔ اس زاویہ نگاہ سے یہ ادارہ لوگوں میں ایک بین الاقوامی وسعتِ نظر پیدا کرنے کا باعث بھی بنتا ہے۔ اس ادارہ کی خدمات کی بدولت ماہرین اور منتظمین تعلیم، اساتذہ اور طلبہ میں دوسرے ممالک کے تعلیمی نظاموں، اقدار ان کی خوبیوں

اور خامیوں کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ مختلف تعلیمی نظاموں سے واقفیت کی بنا پر ان میں ملک کے تعلیمی نظام میں ترمیم و اصلاح تجویز کرنے کی ترغیب اور قابلیت پیدا ہو جاتی ہے۔ مختلف تعلیمی نظاموں سے واقفیت کی بنا پر ان میں اپنے ملک کے تعلیمی نظام میں ترمیم و اصلاح تجویز کرنے کی ترغیب اور قابلیت پیدا ہوتی ہے جس سے ملک کا نظام تعلیم بہت فائدہ اٹھاتا ہے۔

اس خالص فنی فائدہ کے علاوہ بیورو آف ایجوکیشن .... ہوں میں تمدنی اور معاشرتی ارتباط کا باعث بھی بنتا ہے۔ یہ ادارہ مختلف ملکوں کے ماہرین تعلیم کو دوسرے ممالک کے تعلیمی اداروں اور اُن کے نظم و نسق اور نظام تدریس وغیرہ کے ذاتی مشاہدے کرنے میں بہت سہولتیں بہم پہنچاتا ہے۔ تعلیم کے مختلف شعبوں سے دلچسپی رکھنے والے افراد جب دوسرے ممالک کے ماہرین سے ذاتی تبادلہ خیال کرتے ہیں اور مختلف درس گاہوں اور تحقیقی اداروں میں پڑھتے پڑھاتے ہیں تو علمی اور تنظیمی لبصیرت کے علاوہ انھیں ایک دوسرے کی تہذیب و تمدن سے عملی واقفیت ہوتی ہے۔ قومیں اور افراد ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھنے اور ایک دوسرے کے قریب آنے لگتے ہیں۔ اس قسم کا تمدنی اور معاشرتی ارتباط مختلف قوموں میں ثقافتی تعلقات استوار کرکے امن عالم اور بین الاقوامی فلاح و بہبود کے لیے راستہ ترا شتا ہے۔

یونیسکو کا عالمی جائزہ

تدریسی، تنظیمی، قانونی، ملی، اور بین الاقوامی زاویہ نگاہ سے دیکھا جائے تو تعلیمی بیورو کسی نظام تعلیم کی اہم ترین اور بنیادی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اس ادارے کے بغیر تعلیم اپنے اغراض و مقاصد میں کامیاب نہیں ہوسکتی۔ اسے کسی ترقی پسند نظام تعلیم میں اس قسم کے تعلیمی ادارے کو مرکزی اہمیت حاصل ہونی چاہیے۔

اس وقت دنیا کے اکثر ممالک میں اس قسم کے متعدد ادارے معرض وجود میں آچکے ہیں اور ان کے مشاغل کی بدولت ان ممالک کے تعلیمی نظاموں کو بہت فائدہ پہنچ رہا ہے۔ کچھ عرصہ ہوا، اقوام متحدہ کے تعلیمی، سائنسی اور ثقافتی ادارے (یونیسکو) اس قسم کے ان تمام تعلیمی اداروں کا جائزہ لیا تھا جو اس وقت دنیا کے مختلف علاقوں میں سرگرم عمل ہیں۔ اس جائزہ سے اس بات کا انکشاف ہوا کہ دنیا کے تقریباً تیس

ممالک میں ساٹھ کے قریب تعلیمی بیورو قائم ہو چکے تھے۔ اس جائزہ سے یہ بات بھی واضح ہوئی کہ ان اداروں کو اپنے مخصوص ممالک کے تعلیمی نظم و نسق اور درس و تدریس کے امور میں تعمیری خدمات سرانجام دینے کے اعتبار سے قطعی مرکزی حیثیت حاصل ہو چکی تھی۔ یونیسکو اب حال ہی میں ایک اور جائزہ مکمل کر رہا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ اس قسم کے اداروں کی تعداد پہلے ہی بہت بڑھ چکی ہے۔

ہمارا بیورو آف ایجوکیشن

پاکستان کے تعلیمی حلقوں میں بھی مدت سے اس قسم کے اداروں کے قیام کی ضرورت کو بڑی شدت سے محسوس کیا جا رہا تھا۔ چنانچہ کچھ عرصہ ہوا حکومت نے اقوام متحدہ کے تعلیمی، سائنسی اور ثقافتی ادارہ کے مشورہ سے پاکستان میں تین بیورو کھولنے کا فیصلہ کیا۔ ان میں سے ایک بیورو مغربی پاکستان اور ایک مشرقی پاکستان کے لیے مختص کیا گیا۔ اس کے علاوہ کراچی میں ایک مرکزی بیورو بھی کھولا گیا ہے۔ مشرقی پاکستان کے تعلیمی بیورو نے ابھی اپنا کام شروع نہیں کیا۔ مگر مغربی پاکستان کے بیورو اور مرکزی بیورو میں کام شروع ہو چکا ہے۔

مغربی پاکستان کے اس تعلیمی ادارہ کو ویسٹ پاکستان بیورو آف ایجوکیشن کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس ادارہ کا کام باضابطہ طور پر اکتوبر ۱۹۵۸ء سے شروع ہوا۔ اور خداوند تعالےٰ کے فضل و کرم سے یہ ادارہ اپنے فرائض تعمیری سلیقہ سے طے کر رہا ہے۔ اس ادارہ کو تعلیمی جائزے لینے، اعداد و شمار اکٹھا کرنے اور انھیں شائع کرنے تعلیمی تحقیق کے لیے جملہ سہولتیں بہم پہنچانے اور تعلیم کے تمام شعبوں سے متعلق ماہرین تعلیم، تعلیمی منتظمین، اساتذہ طلبہ اور محققین کی رہنمائی کے خوشگوار اور ذمہ دار فرائض سونپے گئے ہیں۔

اس ادارہ کی وسعت کی منصوبہ بندی مکمل ہو گئی۔ مگر فی الحال یہ ایک چھوٹے سے خود مختار محکمہ کی حیثیت سے کام کر رہا ہے جو مندرجہ ذیل تین شعبوں پر مشتمل ہے۔

(ا) شعبۂ تعلیمی شماریات

(ب) شعبۂ تعلیمی دستاویزات

(ج) شعبۂ تالیف، تصنیف اور اشاعت

تعلیمی شماریات کا کام: بیورو کے تعلیمی شماریات کے شعبہ کا صدر ایک ایسا نوجوان ہے جسے تعلیمی

اعداد و شمار کی فراہمی اور ترتیب و تاویل کا خاصہ تجربہ ہے۔ اس کے علاوہ وہ علم شماریات میں ایم اے کی سند کا حامل بھی ہے۔ اس شعبہ کا کام مغربی پاکستان کے تمام حصص سے تعلیمی اعداد و شمار فراہم کرنا انھیں ترتیب دینا۔ ان کی تاویل کرنا اور مختلف صورتوں میں ان کی باقاعدہ اشاعت کا اہتمام کرنا ہے۔ یہ شعبہ صوبہ کی تعلیمی ضرورتوں خامیوں ترقی و تنزل وغیرہ کا باقاعدہ تجزیہ کرتا ہے۔ اس شعبہ کے تیار شدہ جائزوں اور رپورٹوں کے طائرانہ مطالعہ ہی سے یہ امر واضح ہو جاتا ہے کہ ہماری تعلیمی حالت کیا ہے۔ ہماری تعلیمی ضرورتیں کیا ہیں اور مزید منصوبہ بندی اور عمل کن سمتوں کی طرف ہونا چاہیے۔

حال ہی میں شعبہ تعلیمی شماریات نے قیام وحدت مغربی پاکستان کے بعد کے تعلیمی حالات اور اعداد و شمار کو ترتیب دے کر ایک مفصل جائزہ شائع کیا ہے جسے وطن اور بیرونی ممالک کے ماہرین تعلیم نے خراج تحسین پیش کیے ہیں۔ کچھ عرصہ ہوا اس شعبہ کی زیر ہدایت لاہور میں ماہرین تعلیمی شماریات کی ایک کانفرنس بھی منعقد ہوئی تھی۔ اس کانفرنس میں ملکی اور غیر ملکی ماہرین شماریات نے حصہ لیا۔ کانفرنس میں تعلیمی اعداد و شمار فراہم کرنے اور انھیں ترتیب دینے کے مروجہ طریقوں کا جائزہ لیا گیا۔ جدید طریقوں کو اپنانے اور تعلیمی اعداد و شمار کا بہم پہنچانے سے متعلق عملی تجاویز پر غور و خوض ہوا۔ چند روز ہوئے اس شعبہ نے مغربی پاکستان کی تعلیمی حالت سے متعلق ایک اور جائزہ شائع کیا ہے جس میں وحدت مغربی پاکستان کے قیام کے دوسرے سال یعنی سنہ ۵۸-۱۹۵۷ء کے تعلیمی کوائف کی تفصیلات پیش کی گئی ہیں۔ اسی طرح سنہ ۵۹-۱۹۵۸ء اور سنہ ۶۰-۱۹۵۹ء کے ایسے ہی جائزے مکمل کیے جا رہے ہیں۔ ان جائزوں کو تاریخی اہمیت بھی حاصل ہے کیوں کہ اس سے پہلے اس قسم کی تفصیلات کہیں بھی شائع نہیں ہوئیں۔

شعبہ تعلیمی دستاویزات: مغربی پاکستان میں کوئی بھی ایسا مرکز موجود نہ تھا جس میں تعلیمی منتظمین، اساتذہ، تعلیم کے طلبہ اور محققین کو اس قسم کا تعلیمی مواد دستیاب ہو سکتا جو ان کے لیے اپنے اپنے حلقۂ عمل میں بصیرت افروز ثابت ہوتا۔ بیورو آف ایجوکیشن شعبہ تعلیمی دستاویزات نے ہماری اس دیرینہ تعلیمی ضرورت کو بھی بخوبی پورا کر دیا ہے۔ یہ شعبہ پاکستان اور بیرونی ممالک کے دستاویزات، کتب، تحقیقی مقالے رسائل، تعلیمی فلمیں۔ غرضیکہ ہر قسم کا مفید تعلیمی مواد اکٹھا کر رہا ہے۔ اس شعبہ نے ایک ایسے تعلیمی دستاویزی

مرکز کو واغ بیل رکھ دیا ہے جس میں انواع واقسام کی تعلیمی تحریریں باضابطہ طریق سے جمع کی جارہی ہیں۔
اس شعبہ کے صدر کو تعلیمی نفسیات اور نادر دستاویزات سے بہت گہری دلچسپی ہے۔ دستاویزی مرکز کا کام چلانے کے لیے ایک ناظم کتب خانہ بھی مامور ہے جسے کتب خانوں کے نظم ونسق کی تربیت اور تجربہ حاصل ہے۔ اس شعبہ کی فنی رہنمائی کے لیے اقوام متحدہ کے تعلیمی، سائنسی اور ثقافتی ادارہ کی وساطت سے ایک ایسے مشیر کی خدمات بھی حاصل کرائی گئی ہیں جسے تعلیمی دستاویزات کی فراہمی اور ترتیب وتنظیم کا وسیع تجربہ ہے یہ شعبہ ان دنوں پاکستان میں چھپی ہوئی تمام تعلیمی کتب کی ایک مشرح فہرست تیار کر رہا ہے جسے عنقریب شائع کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ چند اہم تعلیمی جائزے بھی اس شعبہ کے زیرِ ہدایت تیار ہو رہے ہیں۔

تالیف، تصنیف اور اشاعت

تالیف، تصنیف اور اشاعت کے لیے بیورو آف ایجوکیشن میں ایک علیحدہ شعبہ قائم ہے جس کا کام ادارہ کے مختلف پروگراموں کی اشاعت کرنا اور تعلیمی پمفلٹوں، کتابوں اور رسالوں کی تالیف وتصنیف کا اہتمام کرنا ہے۔ اس شعبہ نے ایک پندرہ روزہ تعلیمی اخبار، تعلیمی تحقیق پر ایک معیاری سہ ماہی رسالہ اور تعلیم کے مختلف شعبوں پر معلوماتی کتابچوں کے ایک عوامی سلسلہ کا منصوبہ تیار کر لیا ہے۔ اس منصوبہ کے کئی ایک پہلوؤں پر عمل بھی شروع ہو چکا ہے۔ تعلیمی بیورو کے ان تین شعبوں کے علاوہ ایک اور شعبہ کھولا جانے والا ہے، جسے تعلیمی تحقیق کا شعبہ کہا جائے گا۔ اس نئے شعبہ کو تعلیمی تحقیق کرنے اور محققین اور ماہرینِ تعلیم کی حوصلہ افزائی اور رہنمائی کا امتیازی شرف حاصل ہو گا۔
مغربی پاکستان کے بیورو آف ایجوکیشن کو قائم ہوئے ابھی تھوڑا ہی عرصہ ہوا ہے مگر اس قلیل مدت میں اس ادارے نے بہت حیرت انگیز ترقی کر لی ہے۔ آج وطن اور بیرونی ممالک کے ماہرینِ تعلیم اس کی تعمیری خدمات کے لیے رطب اللسان ہیں۔ اس تعلیمی ادارہ کی ترقی اور ٹھوس کام کی چند اہم وجوہات یہ ہیں کہ اس کا سارا عملہ روشن دماغ تعلیم یافتہ اور محب وطن نوجوانوں پر مشتمل ہے۔ جو یقین محکم اور عمل پیہم کے اصولوں پر بہت شدت سے کاربند ہیں۔

ذرّے
یعنی
ایٹم کی کہانی

عزیز احمد
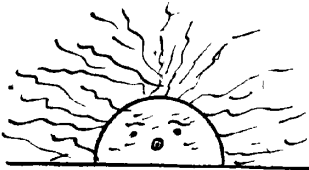
قوت کا خزانہ .... سورج

ہر قسم کی قوت کا خزانہ سورج ہے۔ بعض لوگوں کو شاید یہ بات بڑی عجیب معلوم دے۔ مگر سچ یہ ہے کہ جب سے دنیا بنی ہے سورج اسے ہر قسم کی قوت مہیا کرنے میں لگا ہے۔ زمین سے سورج کا فاصلہ اگرچہ کوئی نو کروڑ میل ہے، مگر اتنی دور دراز سے بھی سورج اس قابل ہے کہ اپنی زندگی بخشنے والی قوت کا کچھ حصہ زمین کو دے۔

قوت کے متعلق کچھ زیادہ کہنے سے پہلے یہ معلوم کر لینا چاہیے کہ قوت کسے کہتے ہیں۔ اس سوال کا جواب ہر شخص کو خود اپنے تجربے سے معلوم ہو سکتا ہے۔ جو شخص خوب دوڑ اچھل سکتا ہو اسے طاقتور کہا جاتا ہے۔ چلنا پھرنا۔ چیزوں کو اٹھا کر ادھر اُدھر رکھنا۔ آلوں۔ اوزاروں سے کام لینا۔ غرض ہر قسم کی حرکت صرف قوت سے ہی پیدا ہوتی ہے۔ ہر قسم کی گرمی بھی قوت سے ہی پیدا ہوتی ہے۔ اگر کوئی شخص بہت کمزور ہو جائے تو اس کا درجۂ حرارت اعتدال سے گھٹ جاتا ہے اور مرنے کے بعد جسم بالکل ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ وہ اس لیے کہ موت کے بعد جسم قوت سے بالکل خالی ہو جاتا ہے۔ اگرچہ قوت کی بعض اور شکلیں بھی ہیں۔ مگر اس کی سب سے اہم پیداواریں حرکت اور گرمی ہیں۔

ہمارے جسموں میں قوت کہاں سے آتی ہے؟ غذا سے۔ ہم دو طرح کی غذائیں کھاتے ہیں (۱) نباتاتی یعنی اناج، سبزیاں، پھل وغیرہ (۲) حیوانی یعنی دودھ۔ گوشت مچھلی، انڈے وغیرہ۔ مگر جن حیوانوں کا دودھ گوشت، انڈے وغیرہ ہم کھاتے ہیں وہ نباتاتی غذا پر گذارہ کرتے ہیں۔ اس لیے یہ کہنا بالکل درست ہے کہ ہر قسم کی غذا کا اصل سرچشمہ نباتات ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ جو غذا

ہمارے جسموں میں قوت پیدا کرتی ہے۔ اسے نباتات یعنی طرح طرح کے پودے اور درخت تیار کرتے ہیں۔ پودے اور درخت اس لحاظ سے غذا کے کارخانے ہیں جو خدا نے ہمارے لیے پیدا کیے ہیں۔

مگر پودے اور درخت غذا کہاں سے اور کس طرح حاصل کرتے ہیں؟ اس سوال کا جواب شاید آپ کو معلوم ہو۔ پودے اور درخت سورج کی روشنی کی مدد سے کاربن جذب کرتے رہتے ہیں اور اس طرح پودے پھول کر طرح طرح کی سبزیاں، کئی قسم کے اناج اور رنگا رنگ پھل پیدا کرتے ہیں۔ گویا پودے اور درخت وہ کارخانے ہیں جو سورج کی قوت کو آہستہ آہستہ جمع کرتے رہتے ہیں، اور پھر اسے سبزیوں، اناجوں اور پھلوں کی شکل میں ہمارے حوالے کر دیتے ہیں۔ درخت اور پودے یہ کام سورج کی روشنی ہی سے انجام دے سکتے ہیں۔ جب سورج چھپ جاتا ہے اور رات کا اندھیرا چھا جاتا ہے تو درخت اور پودے ہوا میں سے کاربن جذب نہیں کر سکتے۔

اب یہ سمجھنا آسان ہے کہ پرانے وقتوں کی کئی قومیں سورج کی پوجا کیوں کرتی تھیں۔ ہندو آج بھی سورج کو سورج دیوتا کے نام سے پکارتے ہیں۔ اسی طرح پرانے وقتوں کے مصری اور یونانی بھی سورج کو ایک دیوتا خیال کرتے تھے اور اس کی پوجا کرتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ دیکھتے تھے کہ ہر قسم کی قوت کا خزانہ سورج ہے۔ اگر سورج نہ ہو تو زمین پر سے قوت کے سارے ذخیرے ختم ہو جائیں اور اس کے ساتھ ہی زندگی بھی ختم ہو جائے۔

قوت کے ذخیرے

زندگی کی ساری بہار قوت سے ہے۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ قوت کی سب سے اہم پیداوار ہیں حرکت اور گرمی ہیں۔ حرکت کی بدولت انسان طرح طرح کی چیزیں بناتا اور انھیں ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتا ہے۔ حرارت کی مدد سے بھی وہ کئی قسم کی چیزیں بناتا اور چیزوں کو حرکت دیتا ہے۔ مثلاً پانی ابال کر بھاپ پیدا کی جاتی ہے جو انجن چلاتی ہے۔ انسان بڑی آسانی سے حرارت کو حرکت میں بدل سکتا ہے۔ اور حرکت کو حرارت میں تبدیل کر سکتا ہے۔

جب انسان بالکل وحشی تھا وہ ہر قسم کی حرکت کے لیے اپنے جسم کی قوت استعمال کرتا تھا۔ اسے

بوجھ اٹھاتا ہوتا اپنے سر یا کندھوں پر اٹھاتا۔ جب اس نے کچھ ترقی کر لی تو وہ یہ کام، بیلوں، گھوڑوں، گدھوں اونٹوں وغیرہ حیوانوں سے لینے لگا۔ حرارت حاصل کرنے کے لیے انسان کے پاس گھاس پھوس اور لکڑی کے سوا اور کوئی چیز نہ تھی۔ صدیوں تک حالت یہی رہی۔ ہمارے دیہی علاقوں میں آج بھی بوجھ اٹھانے۔ ہل اور رہٹ چلانے کے لیے بیلوں، گھوڑوں۔ گدھوں اونٹوں کے علاوہ اور کوئی ذریعہ نہیں۔ اس طرح وہاں آگ جلانے کے لیے لکڑی کے سوا اور کوئی چیز نہیں۔ گویا ہمارے دیہات میں جسمانی قوت اور لکڑی ہی قوت کے ذخیرے ہیں۔

انسان نے آج تک جتنی بھی ترقی کی ہے۔ قوت کے نئے نئے ذخیرے معلوم کر کے کی ہے۔ جب تک وہ اپنے جسم یا حیوانوں کے جسم اور لکڑی سے ہی ساری قوت حاصل کرتا تھا۔ اس وقت تک اس کی زندگی بڑی پرانی قسم کی تھی۔ اور انسانی زندگی کے سارے کام بڑی آہستہ آہستہ انجام پاتے تھے۔ مگر اٹھارھویں صدی کے نصف آخر میں جیمز واٹ نامی ایک انگریز نے قوت کا ایک اور خزانہ معلوم کر لیا۔ قوت کا یہ نیا خزانہ بھاپ تھا۔ بھاپ کا انجن بڑی بڑی بھاری بھرکم مشینوں کو چلانے لگا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے انسانی زندگی میں ایک بہت بڑا انقلاب آگیا۔ بھاپ کے انجن کی شکل میں انسان کو ایک ایسا طاقتور دیو ہاتھ آگیا جو بڑی آسانی اور تیزی سے بھاری بوجھ کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتا اور انسان کے لیے ہر طرح کی محنت مشقت کا کام کرتا۔

پانی کو بھاپ میں بدلنے کے لیے انسان لکڑی کی جگہ کوئلے اور تیل سے کام لینے لگا۔ کوئلہ اور تیل دونوں قوت کے بہت بڑے ذخیرے ہیں۔ جو سورج نے ہمارے لیے تیار کیے ہیں۔ کوئلے کے متعلق ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ جنگلات کے دب جانے سے بنا ہے۔ پرانے وقتوں میں جب ہماری زمین ابھی بچپن میں تھی اس کے لمبے چوڑے رقبے گھنے جنگلوں سے ڈھکے تھے۔ لاکھوں سالوں کے عرصے میں یہ جنگل زمین پر گرتے گئے اور ان کے اوپر چٹانوں کی موٹی تہیں جمتی گئیں۔ چٹانوں کے بوجھ اور زمین کی حرارت نے ان دبے ہوئے درختوں کو کوئلے میں تبدیل کر دیا۔

دنیا کے مختلف حصوں میں زمین کے سینے میں تیل کے ذخیرے بھی اسی طرح لاکھوں برسوں سے چھپے چلے آتے تھے۔ جدید انسان نے قوت کے ان ذخیروں کو بھی اپنی خدمت پر لگالیا ہے

ہر قسم کی موٹریں، ہوائی جہاز اور بیسیوں قسم کی مشینیں تیل سے چلتی ہیں۔ تیل کے ذخیروں کے متعلق ابھی پوری طرح پتہ نہیں چل سکا کہ یہ کس طرح پیدا ہوئے۔ لیکن اس بارے میں کچھ شک نہیں کہ یہ بھی کوئلے کی طرح سورج کی قوت کے ہی ذخیرے ہیں۔ جب ہم کوئلہ اور تیل جلاتے ہیں تو سورج کی وہ قوت جو لاکھوں کروڑوں برس پہلے کوئلے یا تیل میں جمع ہوئی تھی باہر نکل آتی ہے اور ہم حرارت محسوس کرتے ہیں۔ اس کے متعلق ہم زیادہ تفصیل کے ساتھ آگے چل کر دیکھیں گے۔

ابھی اٹھارہویں صدی ختم نہیں ہونے پائی تھی کہ انسان نے قوت کا ایک اور ذخیرہ معلوم کر لیا، یہ بجلی تھی۔ لاکھوں برس سے انسان بادلوں میں پیدا ہونے والی بجلی کی چمک اور اس کی گرج کو ڈر اور خوف کے ساتھ دیکھا کرتا تھا۔ اب اس نے خود بجلی پیدا کرنا اور اس سے خدمت لینا سیکھ لیا۔ بجلی کی شکل میں انسان نے ایک اور بہت بڑا دیو اپنے قابو میں کر لیا۔ قوت کے اس نئے خزانے کی بدولت مشینیں پہلے سے کئی گنا زیادہ تیزی سے چلنے لگیں۔ کارخانوں کی پیداوار بے تحاشہ بڑھ گئی زندگی میں ایک نیا انقلاب پیدا ہوا۔ کارخانوں کی بنی ہوئی چیزیں سستی ہو گئیں اور وہ چیزیں جو پہلے صرف شہزادوں اور امیروں کو ہی ہاتھ لگا کرتی تھیں، اب ہر کس و ناکس کے استعمال میں آنے لگیں۔ بجلی کے آنے سے زندگی میں جو انقلاب پیدا ہوا ہے۔ اس کا کچھ اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ ۱۸۵۰ء میں جتنے مزدور جتنا کام کرتے تھے آج صرف ایک مزدور اتنا کام بجلی سے چلنے والے اوزاروں کی مدد سے کر لیتا ہے۔

انسانی زندگی میں یہ سنہری انقلاب اس لیے ممکن ہو سکا کہ انسان لگاتار اس کوشش میں لگا ہے کہ اپنی زندگی کو بہتر سے بہتر بنا لے۔ یہ مقصد حاصل کرنے کے لیے وہ فطرت کے سارے بھید معلوم کر لینا چاہتا ہے۔ وہ یہ جان لینا چاہتا ہے کہ زمین اور آسمان کا عظیم الشان کارخانہ کس طرح چل رہا ہے اس بھید پر سے پردے اٹھانے کے لیے انسان نے ان تھک کوشش کی ہے۔ اس کوشش کا اسے بہت کچھ پھل ملا ہے۔ اگرچہ وہ دن غالباً کبھی نہیں آئے گا، جب انسان فطرت کے سارے بھید معلوم کر لے پھر بھی جدید انسان نے چند پچھلی دہائیوں میں اس میدان میں بڑے بڑے کارنامے کر دکھائے ہیں۔ اگلے صفحوں میں ہم ان میں سے ایک بہت بڑے کارنامے کا حال معلوم کریں گے۔

ذرہ (ایٹم) کیا ہے؟

ہم مکان بنانا چاہیں تو اس کے لیے اینٹوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ اینٹیں خواہ کچی ہوں یا پکی، خواہ پتھر کی سلیں ہوں یا روڑے۔ مگر ان کے بغیر کام نہیں چلتا۔ ہر عمارت کے لیے کسی نہ کسی قسم کی اینٹوں کا استعمال ضروری ہے۔ اللہ تعالےٰ نے دنیا میں ان گنت قسم کی چیزیں بنائی ہیں۔ حیوانات۔ نباتات اور جمادات تمام کے تمام مادے سے بنے ہیں۔ مگر مادہ کیا شے ہے؟ انسان کو اس سوال نے پرانے وقتوں سے سرگرداں کر رکھا تھا۔ وہ دیکھتا تھا کہ اگر کسی مکان کو گرا دیا جائے تو ان اینٹوں یا پتھروں کو الگ الگ کیا جا سکتا ہے جن سے یہ بنا تھا۔ کیا دنیا کی مختلف چیزوں کو توڑنے پھوڑنے سے بھی اس قسم کی کوئی اینٹ ہاتھ لگ سکتی ہے جن سے یہ چیزیں بنی ہیں۔ یہ وہ سوال تھا جس کا صدیوں تک کوئی آخری جواب نہ مل سکا۔

مسیح علیہ السلام کے پیدا ہونے میں ابھی چار سو سال سے زیادہ عرصہ باقی تھا کہ ایک یونانی حکیم نے اس سوال پر سوچنا شروع کیا۔ اس حکیم کا نام ڈیموکریٹس تھا۔ اس نے مختلف چیزوں کو باریک پیس کر دیکھا وہ جتنا پیستا تھا ان کے ذرّے اسی قدر باریک سے باریک ہوتے چلے جاتے تھے۔ آخر اسے یقین ہو گیا کہ اگر ان ذرّوں کی پسائی اسی طرح جاری رہے تو وہ اتنے باریک ہو جائیں گے کہ اگر ایک ذرّے کو اکیلا رکھا جائے تو وہ آنکھ کو دکھائی نہیں دے گا۔ تمام چیزیں ان نظر نہ آنے والے ذرّوں سے بنی ہیں۔ یہ وہ اینٹیں ہیں جن سے فطرت نے جمادات، نباتات اور حیوانات کو بنایا ہے۔

ڈیموکریٹس نے جب یہ بات دوسرے لوگوں سے بیان کی تو وہ اس کی ہنسی اڑانے لگے۔ بہت سے لوگ اس کے گرد جمع ہو گئے۔ ایک بولا۔ "واہ بھئی تم بھی عجیب بے پر کی اڑاتے ہو۔ یہ دیکھو میرے ہاتھ میں سونے کی ایک ڈلی ہے۔ ایک اندھا آدمی بھی کہہ سکتا ہے کہ یہ سونا ایک ٹھوس ڈھیلہ ہے۔ یہ نظر نہ آنے والے ذرّوں سے مل کر نہیں بنا۔" اس پر یکدم ایک قہقہہ لگا۔ ڈیموکریٹس لوگوں کے ٹھٹھے مخول سے چپ سا ہو گیا۔ مگر ایک شخص اس کی باتیں بڑے غور سے سن رہا تھا۔ اس نے بڑھ کر کہا۔ "دانا عالم آپ ان بے خبر لوگوں کی باتوں کا خیال نہ کریں۔ آپ اپنی باتیں جاری رکھیں اور مجھے کچھ اور بتائیں۔"

یہ لفظ سنتے ہی ڈیموکریٹس کا چہرہ مسکراہٹ سے چمک اٹھا اور اس نے کہا۔ "ہم اپنے اردگرد جو کچھ دیکھتے ہیں یہ سب ایسی ننھی ننھی اینٹوں سے بنا ہے۔ جنھیں ہماری آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں

تم نے آج تک چھوٹی سے چھوٹی جو چیز بھی دیکھی ہے۔ یہ اینٹیں اس سے بھی چھوٹی ہیں۔ میں ان اینٹوں کو ایٹم کا نام دیتا ہوں۔ پتھر، درخت اور خود ہمارے جسم ان ہی خورد بینی ذرّوں سے بنے ہیں۔

کیمیا کی تلاش۔

ڈیموکریٹس کا زمانہ یونان میں علم و حکمت کی بہار کا زمانہ تھا۔ دوسرے عالموں نے اس کے خیالات کو درست قرار دیا اور وہ اس سوال پر زیادہ سوچ بچار کرنے لگے۔ چند برس بعد مشہور یونانی عالم ارسطو نے اس سوال پر اور روشنی ڈالی۔ اس نے کہا۔ "دنیا میں ان گنت چیزیں ہیں۔ ہر چیز کو بنانے کے لیے خدا نے ایک ہی قسم کے ذروں سے کام نہیں لیا۔ یہ یقینی معلوم ہوتا ہے کہ فطرت میں تھوڑے سے بنیادی ذرّے ہیں ان کے آپس میں ملنے جلنے سے یہ ان گنت چیزیں بنی ہیں۔"

ارسطو کے ان خیالات نے بعض لوگوں کے دلوں میں ایک نئی لگن پیدا کر دی۔ انھوں نے سوچا کہ اگر بنیادی ذروں کے ادل بدل سے چیزوں کی بناوٹ کو بدلا جا سکتا ہے تو کیوں نہ وہ بنیادی ذرّے معلوم کیے جائیں جن کے ملانے سے سونا بن جائے۔ اگر یہ نسخہ ہاتھ لگ گیا تو بس پھر وارے نیارے ہیں دولت کا دریا بہنے لگے گا، اور ہر قسم کی محنت سے چھٹکارا مل جائے گا۔"

یہ لوگ کیمیاگر کہلائے۔ ان کو بس ایک ہی دھن تھی وہ یہ کہ مختلف چیزوں کو کوٹ چھان کر اور آگ پہ گرم کر کے اس طرح ملایا جائے کہ یہ مرکب قیمتی سونا بن جائے۔ اس دھن میں ان لوگوں نے ان گنت تجربے آزمائے۔ اپنا اور اپنے دوستوں کا بے اندازہ وقت اور پیسہ ضائع کیا۔ لاکھوں قسم کے مرکب بنے، مگر سونا نہ بننا تھا نہ بنا۔ کیمیاگروں کا ہر تجربہ ناکام ثابت ہوا، مگر پھر بھی ان لوگوں نے جی نہ ہارا۔ ارسطو کو مرے سینکڑوں سال گذر گئے مگر کیمیاگر اپنی دھن میں لگاتار لگے رہے۔ مشرق اور مغرب دونوں میں کیمیاگر لوگوں کا ایک گروہ ہمیشہ چلا آیا۔ یہ لوگ پرانے کیمیاگروں کی کتابوں کو سینوں سے لگائے پھرتے رہے۔ وضع قطع سے یہ عالم معلوم ہوتے تھے۔ ان کا عام دستور یہ تھا کہ دولت مند لوگوں کو اپنی باتوں میں پھنسا لیتے اور ان کی دولت سے سونا بنانے کے تجربے کرتے رہتے۔ مگر ان میں سے کبھی کوئی تجربہ کامیاب ثابت نہ ہوا۔ کیمیاگر کوئی دو ہزار برس تک سونا بنانے کی دھن میں سرگرداں رہے۔ آخر کار ۱۸۰۸ء میں

ایک برطانوی عالم نے ان کی کوشش کو بے کار ثابت کر دیا۔ اس عالم کا نام جان ڈالٹن تھا۔ اور وہ ایک مدرسے میں پڑھاتا تھا۔ اس نے کہا دوسری چیزوں کو سونے میں تبدیل کرنے کی کوشش اس لیے بے سود ہے کہ سونا بذاتِ خود ایک خاص قسم کے بنیادی ذرّوں سے بنا ہے۔ سونا ایک مفرد ہے مرکب نہیں۔ دنیا میں جس قدر مفردات ہیں ان کے ذرّے ایک دوسرے سے الگ قسم کے ہیں، اس لیے کوئی دوسرے مفرد مل کر سونے کے ذرے نہیں بنا سکتے۔"

بجلی کا جادو

ہم پیچھے کہہ آئے ہیں کہ یونانی حکیم ڈیموکریٹس نے آج سے کوئی چوبیس سو سال پہلے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ دنیا کی ہر چیز نظر نہ آنے والے ذرّوں سے بنی ہے۔ اس زمانے میں انسان کے پاس اتنا علم نہیں تھا کہ وہ ان خوردبینی ذرّوں کے متعلق کچھ اور معلوم کر سکے۔ اس طرح بائیس سو سال گذر گئے اور انسان ذرے کے متعلق کچھ اور معلوم نہ کر سکا۔ آخر برطانوی سائنس داں ڈالٹن نے کیمیائی تجربوں سے ثابت کر دکھایا کہ دنیا کی ہر چیز بے حد ننھے ذرّوں سے بنی ہے اور جب کوئی کیمیائی تبدیلی ہوتی ہے تو یہ عمل ان ننھے ذرّوں کے ذریعے انجام پاتا ہے۔

کوئی ایک سو سال تک سائنس دانوں کا خیال یہی رہا کہ ذرّہ (ایٹم) ایک ٹھوس چیز ہے جسے آگے توڑا پھوڑا نہیں جا سکتا۔ مگر بہت جلد ایسے واقعات پیش آئے جنھوں نے اس یقین کو ہلا دیا۔

سائنس دان ایک عرصے سے بجلی کے متعلق حیران تھے کہ آخر یہ قوت ہے کیا؟ وہ بجلی پیدا کر سکتے تھے اسے ناپ سکتے تھے، اس سے کام لے سکتے تھے، مگر یہ نہیں جانتے تھے کہ بجلی چیز کیا ہے۔

انیسویں صدی کے نصف آخر میں سر ولیم کروکس نامی ایک برطانوی سائنس داں نے بہت سے تجربے کیے۔ ان تجربوں سے کروکس کو ایسا معلوم ہوا کہ بجلی دراصل بہت چھوٹے چھوٹے ریزے ہیں جو خوفناک رفتار سے نہایت ننھی ننھی گولیوں کی طرح اڑتے چلے جاتے ہیں۔ لیکن وہ یہ بات پوری طرح ثابت نہ کر سکا۔

اس کے کچھ عرصہ بعد دوسرے سائنس دانوں نے تجربے کیے اور کروکس کے خیال کو درست ثابت

کر دکھایا۔ ان تجربوں سے یہ بات پوری طرح معلوم ہوگئی کہ بجلی نہایت ننھے ننھے برقی ریزوں کی ایک طوفانی ندی کا نام ہے۔ جب ان ریزوں کی رفتار کو ماپا گیا تو انسانی ذہن چکرا کر رہ گیا۔ ان کی رفتار ہزاروں میل فی سیکنڈ نکلی جس قدر بجلی کی لہر زیادہ طاقتور کی جاتی اسی قدر اس کی رفتار بھی بڑھ جاتی۔ منفی بجلی کے ان ننھے ننھے ریزوں کو "الیکٹرونز" کا نام دیا گیا۔

اس علمی دریافت نے سائنسی دنیا میں تہلکہ ڈال دیا۔ اب تک یہ خیال کیا جاتا تھا کہ دنیا کی ہر چیز ننھے نظر نہ آنے والے ذرّوں سے ہی بنی ہے۔ ان ذرّوں کو آگے توڑنا کسی طرح ممکن نظر نہ آتا تھا۔ مگر اب یہ بات ثابت ہوگئی ہے کہ فطرت نے تمام چیزوں کو جن ننھی نظر نہ آنے والی اینٹوں یعنی ذرّوں سے بنایا ہے ان کا کچھ حصہ بجلی پر مشتمل ہے۔ ذرّے (ایٹم) کے باقی حصے میں کیا ہے؟ یہ وہ سوال تھا جس نے اب سائنسدانوں کو للکارا۔

سائنس دان اس سوال کے حل کرنے میں لگ گئے۔ اب اس معاملہ میں کوئی شبہ نہ تھا کہ ننھا ذرہ آگے کئی ریزوں میں بٹا ہے۔ یہ بات بھی یقینی نظر آتی تھی کہ یہ ریزے برقی قسم کے ہیں اور برقی کشش سے آپس میں جڑے ہوئے ہیں۔ اس یقین سے یہ نتیجہ بھی نکلتا تھا کہ ان ریزوں کے درمیان ضرور فاصلہ ہے۔ (مسلسل)

معلومات عامہ

افریقہ ترقی و تعمیر کی جانب پیش قدمی کر رہا ہے

وزیر اعظم برطانیہ مسٹر میکملن نے گزشتہ دنوں گھانا کے دارالخلافہ اکرا کی ایک سرکاری ضیافت میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ دولت مشترکہ افریقہ کی اس پیش قدمی میں، جو وہ تعاون باہمی اور پُرامن ترقی کی جانب کر رہا ہے ممتاز حصہ لے سکتی ہے۔

مسٹر میکملن نے کہا کہ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ افریقہ ہم سب کے لیے ایک چیلنج پیش کر رہا ہے جو ہم سے اس بات کا متقاضی ہے کہ ہم اپنی سی بہترین کوششیں کریں۔ ہمارا مشترکہ فرض ہے کہ افریقہ میں جو چیلنج درپیش ہیں۔ ان سے اس طریقہ سے نمٹا جائے کہ اہل افریقہ کے لیے پُرامن اور خوشحال مستقبل کی یقین دہانی ہو سکے۔

اس سے قبل مسٹر میکملن نے کہا کہ تبدیلیوں کی ایک رو تیزی کے ساتھ افریقہ سے گذر رہی ہے۔ ویسے برطانوی افریقی علاقوں میں جو حکومت خود اختیاری کی جانب بڑھ رہے ہیں۔ گھانا وہ پہلا ملک ہے جو منزل مقصود تک پہنچ چکا ہے۔ چنانچہ قوم کی ترقی و تعمیر کا آپ جو تجربہ کر رہے ہیں وہ اہل برطانیہ کے لیے تمام دلچسپی کا باعث ہے:

وزیر اعظم نے آگے چل کر کہا کہ مغربی افریقہ میں جہاں یورپی کام کی غرض سے آئے ہیں نہ کہ اسے اپنا وطن بنانے کے لیے۔ وہاں ان کے اور افریقیوں کے درمیان تعلقات میں کبھی کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ ان کے مفادات بھی ایک دوسرے سے کبھی نہیں ٹکرائے۔ برعکس اس کے وہ دوستانہ ماحول میں مل جل کر کام کرنا جانتے ہیں۔

بہر حال مغربی افریقہ کے ممالک میں مختلف زبانیں۔ مختلف رسوم اور روایات کی قومیں آباد ہیں انھیں پُرامن اور دوستانہ طور پر مل جل کر رہنا ہے نیز انھیں اپنے اختلافات طے کرنے اور شکوک و شبہات پر غالب آنے کے طریقے معلوم کرنا ہوں گے۔ مسٹر میکملن کہا کہ گھانا اور اس کے بعد نائجیریا کو خود مختار ملکوں کی حیثیت سے

اس قسم کے مسائل اپنے طور پر حل کرنا ہوں گے۔

کولمبو منصوبہ بین الاقوامی تعاون باہمی کی نادر مثال ہے

لنکاسٹر ہاؤس میں برما کے ڈاکٹر میا ہین کے اعزاز میں پچھلے دنوں برطانیہ کے نائب وزیر خارجہ لارڈ لینسڈاؤن نے ایک استقبالیہ دیا۔ ڈاکٹر ہین کولمبو منصوبہ کے تحت برطانیہ میں تربیت حاصل کرنے والے تین ہزارویں فرد ہیں۔ یہاں یہ ذکر بھی برمحل ہوگا کہ ڈھاکہ کے ڈاکٹر مظہر الاسلام برطانیہ میں کولمبو منصوبہ کے دو ہزارویں تربیت یافتہ تھے۔ ڈاکٹر اسلام نے ہارویل میں ادارۂ جوہری توانائی میں شعاع ریزی کی طبیعیات اور طب میں شعاع کار ذرات کے استعمال کی مہارت حاصل کی ہے۔ لندن میں ان کی آمد کے موقع پر لارڈ ہوم وزیر تعلقات دولت مشترکہ نے ان کا استقبال کیا تھا۔ نیز لندن اور رویلز کی انجمن نے ان کے اعزاز میں جو استقبالیہ دعوت دی اس میں وہ ڈیوک آف ایڈنبرا سے ملے تھے۔

اب تین ہزارویں تربیت یاب کے اعزاز میں جو استقبالیہ دیا گیا وہ کولمبو منصوبہ کی دسویں سالگرہ کے موقع پر ہوا۔ نیز ممتاز مہمانوں میں برطانیہ کے مستقل نائب وزیر برائے روابط دولت مشترکہ سر الیگزینڈر کلٹربک، برٹش کونسل کے ڈائرکٹر جنرل سر پال سینکر اور لارڈ ریڈنگ شامل تھے۔

مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے لارڈ لالینسڈاؤن نے کہا کہ یہاں پاکستان، ہندوستان، سیلون، انڈونیشیا ملایا۔ ویٹ نام، تھائی لینڈ اور فلپائن کے طلبا جمع ہیں، جو برطانیہ میں کولمبو منصوبہ کے تحت تربیت حاصل کر رہے ہیں اور ان کے مطالعہ کے مضامین میں بے حد تنوع ہے۔ مثلاً سرکاری نظم و ضبط کسٹم کے طور طریقے، گرم ممالک میں فن تعمیرات اور علم ارضیات۔

لارڈ لینسڈاؤن نے کہا کہ کولمبو منصوبہ میں کام کرتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم ایک خاندان کے افراد کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ اس میں یہ خیال کبھی کسی کو نہیں گذرتا کہ امداد دینے والے ممالک کون ہیں۔ دراصل یہ باہمی امداد ہے۔ ہم نے اس عظیم منصوبہ میں جو حصہ لیا ہے اس پر ہم بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں ویسے اہل برطانیہ یہ تہیہ کیے ہوئے ہیں کہ وہ تعاون باہمی کی اس بے مثال بین الاقوامی کوشش میں برابر حصہ لیتے رہیں گے۔ خود حکومت برطانیہ کولمبو منصوبہ کے کام کو بے انتہا اہمیت دیتی ہے۔

مشاورتی کمیٹی کی سالانہ رپورٹ :- کولمبو منصوبہ مشاورتی کمیٹی کی آٹھویں سالانہ رپورٹ لندن میں شائع ہوا ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ برطانیہ ۱۹۵۸-۵۹ء میں کولمبو منصوبہ کو سرمایہ اور فنی امداد کافی بڑے پیمانہ پر دی۔ اس کی اور وجوہات کے علاوہ ایک وجہ یہ بھی ہے کہ یہ امداد پاکستان کے ترقیاتی منصوبوں کے لیے دی جا رہی ہے۔
رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ ۱۹۵۱ء کے بعد سے برطانیہ نے جنوبی و جنوب مشرقی ایشیا کی ترقی کے لیے جو رقمیں مخصوص کیں، وہ مجموعی طور پر پندرہ کروڑ پونڈ (یعنی بیس کروڑ روپے) تک جا پہنچی ہے۔ اس مدت میں اب تک جو رقمیں دی جا چکی ہیں وہ ایک کروڑ پونڈ کے لگ بھگ ہیں۔ علاوہ ازیں برطانیہ نے کولمبو منصوبہ علاقہ میں ترقیاتی مقاصد کے لیے ہر سال حسب شرح سے روپیہ پیسہ صرف کیا وہ تقریباً تین کروڑ پونڈ (یعنی چار کروڑ روپے) تک جا پہنچی۔

آگے چل کر رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ فروری ۱۹۵۹ء میں برطانیہ نے پاکستان کو ایک کروڑ پونڈ تقریباً ۱۲ کروڑ ۴۷ لاکھ ۳۲ ہزار ۲۲۷ روپے) کا قرض دینا منظور کیا۔ یہ رقم پاکستان کے ترقیاتی پروگرام بالخصوص زراعت پر صرف کی جائے گی۔

علاوہ ازیں حکومت برطانیہ نے جن اداروں کو ریسرچ اور سازوسامان گذشتہ سال بہم پہنچایا یا یہ سامان بہم پہنچانے پر رضامندی کی، ان میں یہ ادارے شامل تھے۔ ڈھاکہ کا پارچہ بافی تربیتی مرکز۔ گورنمنٹ کالج لاہور، پاکستان کا تابکار ذرات کا مرکز۔ سندھ زراعتی و تحقیقاتی ادارہ اور ڈھاکہ کا مٹی کے برتنوں کی تیاری کا ادارہ۔

گذشتہ سال کے وسط تک دو ہزار ۸۲ ۵ لوگوں کو برطانیہ میں تربیتی سہولتیں دی گئی ہیں۔ ان میں پاکستان سول سروس کے بیس زیر تربیت عہدیدار بھی تھے۔ ویسے سول سروس کے بیس عہدیدار ہر سال برطانیہ میں تربیت حاصل کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں پاکستان کو گذشتہ سال دو ماہروں کی خدمات بھی فراہم کی گئیں ایک یونیورسٹی پروفیسر کو یہ فرض سونپا گیا کہ وہ پاکستان کی یونیورسٹیوں کا دورہ کریں اور اس بات کا مطالعہ کریں کہ کیا کولمبو منصوبہ کے تحت برطانوی یونیورسٹیوں کے عملہ کی خدمات ملک کو فراہم کی جا سکتی ہیں۔ یہی نہیں بلکہ ایک برطانوی فرم کو ڈھاکہ کو ترقی دینے کا ایک منصوبہ تیار کرنے کا کام سپرد ہوا۔

ٹڈیوں کے خلاف جنگ

ٹڈی دل صدیوں سے افریقہ اور دوسرے استوائی ممالک میں تباہی، قحط اور ابتری پھیلاتے چلے آئے ہیں۔ عرصے تک لوگوں کو بچاؤ کے طریقے بھی نہیں معلوم تھے۔ البتہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا سائنس کی موجودہ ترقی کے پیش نظر اب بھی انسان کی بجائے ٹڈیاں فصلیں کھایا کریں گی اور انسان لاچار اور مجبور دیکھتا رہے گا۔

ٹڈیوں سے بچاؤ کے لیے اب بہت سے کامیاب طریقے ہیں۔ کئی قسم کے زہر ہیں کہ اگر انھیں احتیاط سے استعمال کیا جائے تو انسان اور پالتو جانوروں کو کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ لیکن یہی زہر اگر چند اونس مقدار تیل میں ملا کر ہوائی جہاز کے ذریعے پودوں اور اڑتے ہوئے ٹڈی دلوں پر چھڑک دیے جائیں تو لاکھوں ٹڈیوں کا خاتمہ ہو سکتا ہے۔ ٹڈیوں کو ختم کرنے کا یہ طریقہ کامیابی کے ساتھ مراقش، ماریطانیا، سینیگال، چیڈ، سوڈان، حبشہ، شمالی لینڈ، کینیا، ٹانگانیکا، مشرق وسطیٰ، پاکستان، ہندوستان اور دوسرے ملکوں میں اختیار کیا گیا ہے۔ اور بیسیوں مربع میل میں پھیلے ہوئے ٹڈی دلوں کا خاتمہ کیا گیا ہے۔

جو ممالک ٹڈیوں کے زیر اثر آتے ہیں ان میں سے اکثر نے اس مقصد کے لیے مخصوص ادارے قائم کر رکھے ہیں۔ ان تدابیر کے باوجود سنہ ۱۹۵۳ء میں صرف شمالی لینڈ کے علاقہ میں ٹڈیوں نے دو لاکھ پچاس ہزار پونڈ مالیت کا نقصان کیا۔ سنہ ۱۹۵۴ء میں شمالیات میں فصلوں کو جو نقصان پہنچا اس کا اندازہ چھے لاکھ پونڈ ہے۔ اسی سال مراقش میں چالیس لاکھ پونڈ کا زراعتی مال ٹڈیوں نے تباہ کیا۔ سنہ ۱۹۵۸ء میں ٹڈیوں نے حبشہ میں جو غلّہ تباہ کیا وہ ایک سال تک دس لاکھ آدمیوں کا پیٹ بھر سکتا تھا۔ سنہ ۱۹۵۹ء میں حبشہ میں پھر اسی قسم کی تباہی آئی اور انھیں قحط سے بچنے کے لیے غلہ درآمد کرنا پڑا۔

اس قسم کی تباہیاں اب کم ہوتی ہیں۔ اس لیے کہ بہت سے ممالک اب ٹڈیوں کے خلاف اپنا بچاؤ کر سکتے ہیں۔ یہ بچاؤ اس زمانے میں بھی کرنا پڑتا ہے جب ٹڈی دل حملہ آور نہیں ہوتے۔ اور یہ کثیر رقم خرچ ہوتی ہے۔ شمالی افریقہ کے علاقوں، کینیا، ٹانگانیکا اور یوگنڈا کے ایک حفاظتی ادارے اور تدابیر پر ہر سال تقریباً سات لاکھ پچاس ہزار پونڈ خرچ ہوتے ہیں۔

افریقہ میں ریگستانی ٹڈی دل ساحل عقیانوس، مغربی افریقہ بشمول گیمبیا، سرالیون، گھانا، نائیجیریا، چیڈ، اور سوڈان، حبشہ شمالی لینڈ، عدن، کینیا، ٹانگانیکا، یوگنڈا، اور وہاں سے بھی آگے مشرق وسطیٰ، پاکستان اور ہندوستان پر حملے کرتے رہتے ہیں۔ کبھی ان ٹڈی دلوں کا اجتماع ایک علاقہ پر ہوتا ہے اور کبھی دوسرے پر۔ کبھی ایک ملک متواتر کئی حملوں سے آزاد ہوتا ہے اور دوسرا اتنا گھرا ہوا کہ اس کے لیے اپنی فصلیں بچانا ناممکن ہوتا ہے۔ ایک موسم میں سارے ٹڈی دل ایک علاقہ میں جمع نہیں ہوتے۔ اس لیے بہت سے دل بچ نکلتے ہیں۔ دوسرے سال یہ دل کسی دوسرے علاقہ پر حملہ کر دیتے ہیں۔ ممکن ہے اس دوسرے علاقہ میں اس وقت بچاؤ کے انتظامات ٹھیک نہ ہوں۔ پچھلی مرتبہ جس علاقہ پہ حملہ ہوا تھا وہاں نسبتاً عافیت تو ضرور ہوگی لیکن حفاظتی تدابیر ان کو بھی اختیار کرنی پڑتی ہیں۔ جن پر بہت روپیہ خرچ کرنا پڑتا ہے۔

آج کل علیحدہ علیحدہ ملکوں میں جو بچاؤ کی تدابیر اختیار کی جاتی ہیں وہ بہت موثر ہیں۔ لیکن ان سے ان ریگستانی ٹڈیوں کا خاتمہ نہیں ہوتا جو بیس برس سے بار بار حملے کر رہے ہیں۔ یہ ٹڈی دل ایک ملک سے دوسرے ملک میں آزادی سے جا سکتے ہیں۔ جبکہ ان کے خلاف لڑنے والے انسان آسانی سے ان سرحدوں پار نہیں کر سکتے۔

لندن کے تحقیقاتی مرکز نے جسے اقوام متحدہ کے خوراک اور زراعت کے ادارے کی مالی امداد حاصل ہے ریگستانی ٹڈیوں کے خلاف ایک بین الاقوامی اطلاعات کا سلسلہ قائم کر رکھا ہے۔ اب یہ ممکن ہے کہ کسی بھی علاقہ میں جہاں ٹڈی دل جمع ہو رہے ہوں بروقت سامان اور ماہرین کو پہنچایا جا سکتا ہے۔ ٹڈی دلوں پہ علاقائی فتح حاصل نہ ہوگی۔ بلکہ ان کے اثرات دور رس ہوں گے۔

اقوام متحدہ کا خوراک اور زراعت کا ادارہ ریگستانی ٹڈی دلوں کے خلاف موثر عملی تدابیر پر غور کر رہا ہے جن کی رو سے ٹڈی دل کے خلاف لڑنے والے حکام ایک ملک سے دوسرے ملک میں آسانی سے آ جا سکیں تاکہ اسے کمک پہنچا سکیں۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب متصل ممالک میں پہلے سے باہمی امداد کا معاہدہ ہو اور حکام اور عملے کے فاضل دستے ہوں جو وقت پڑنے پر بہت جلد متاثرہ علاقے میں پہنچائے سکیں۔

اس قسم کے تعاون سے ٹڈیوں کی ڈو ایسی قسموں کے خلاف کامیابی ہوئی ہے جنھوں نے حال ہی میں افریقہ
میں تباہی و بربادی مچائی تھی۔ انھیں فصلی ٹڈیاں اور سُرخ ٹڈیاں کہتے ہیں۔ ان کے حملے اکثر افریقہ کے ان
زرخیز علاقوں میں ہوئے تھے جو ریگستانی ٹڈیوں کی زد میں نہیں آتے تھے۔ تحقیقات کے بعد معلوم ہوا
کہ ان ٹڈیوں کی پیدائش کے علیحدہ علیحدہ علاقے ہیں، جب ان علاقوں کا تعین ہو گیا تو متعلقہ ممالک کے
درمیان معاہدے کیے گئے، تاکہ ان کے سدِ باب کے لیے بین الاقوامی ادارے بنائے جا سکیں۔

یہ مستقل ادارے کم و بیش پندرہ سال سے قائم ہیں۔ ان کا کام یہ ہے کہ وہ ٹڈی دلوں پر نظر رکھیں
اور اس سے پہلے کہ وہ پھیلیں اور بڑھیں ان کا خاتمہ کر دیں۔ ان اداروں نے اب تک ایسی ٹڈیوں کو پھیلنے
یا بڑھنے نہیں دیا ہے۔

ریگستانی ٹڈیوں سے بچاؤ زیادہ مشکل ہے۔ اس کی پیدائش کا کوئی محدود علاقہ نہیں۔ اس کے
دَل وسیع علاقوں میں گشت کرتے رہتے ہیں، اور بارش کے علاقوں میں افزائش نسل بھی کرتے رہتے ہیں
اس لیے ابھی تک اس کے حملے کو مؤثر طریقہ پر نہیں روکا جا سکا ہے۔ بین المملکتی اور بین الاقوامی تعاون سے
یہ خطرہ البتہ کم ضرور ہو سکتا ہے۔ جہاں تک بچاؤ کے فنی آلات اور ذرائع کا تعلق ہے تو انسان ان سے
مالا مال ہے۔

برطانیہ کے ڈاک خانے جن کی اپنی ریل گاڑیاں ہیں

لاکھوں آدمی روزانہ مختلف قسم کے خطوط لکھتے ہیں۔ کچھ خطوط تجارت سے متعلق ہوتے ہیں اور بعض خطوط
میں اچھی اور بُری گھریلو خبریں ہوتی ہیں۔ ان خطوط میں خاص خاص موقعوں پر مبارک باد کے پیغامات
درخواستیں۔ دھمکی آمیز خطوط۔ محبت نامے۔ کرایہ کے مطالبات اور ہر قسم کے بل شامل ہوتے ہیں۔
ان تمام خطوط کو باقاعدگی سے ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانے کا کام ڈاک خانہ انجام دیتا ہے
اس مضمون میں لندن کے ایک صحافی لیوز ڈرول نے برطانیہ کے ڈاک خانہ کے نظام پر روشنی ڈالی ہے
ویسے برطانیہ میں اس نظام کی بنیاد پڑے ہوئے ایک صدی سے زیادہ عرصہ ہو چکا ہے۔

اتوار کے علاوہ میری قریب قریب ہر صبح اپنے دوست مسٹر رسے خطوط رساں سے اپنے مکان پر

ملاقات ہوتی ہے۔ مسٹر ریسے سے ملاقات کر کے مجھے ہمیشہ مسرت ہوتی ہے کیوں کہ وہ بہت ملنسار اور منکسر آدمی ہیں۔ اور اپنے فرض منصبی کو باعث فخر سمجھتے ہیں۔ شاید وہ یہ جانتے ہیں کہ وہ ان شاہی ایلچیوں کے جانشین ہیں۔ جو سینکڑوں سال پیشتر یہ فرائض انجام دیتے تھے۔ مسٹر ریسے اور ڈاک خانہ کے ان کے ساتھی کارکن اب تک تاج شاہی کے ملازم ہیں اور ڈاک خانہ کے ملازمین کی تنظیم برطانیہ میں مزدوروں کے دوسرے درجہ کی سب سے بڑی تنظیم ہے۔ ویسے سب سے بڑی تنظیم کوئلہ کی کانوں میں کام کرنے والوں کی ہے۔

میرے لیے مسٹر ریسے اس سلسلہ کی آخری کڑی ہیں جس نے میرے خطوط ملک کے مختلف حصوں کے لیٹر بکسوں سے جمع کیے۔ ان کو چھانٹا۔ ان کو ڈاک گاڑیوں میں رکھا۔ جہاں اکثر وہ پھر چھانٹے ہیں۔ ان کو خطوط ارسال دفاتر بھیجا۔ جہاں مسٹر ریسے اور ان کے ساتھی خطوط کو جمع کرتے، چھانٹے اور اپنے اپنے حلقوں میں بانٹتے ہیں۔ چنانچہ میرے دروازے پر مسٹر ریسے خطوط لے کر آتے ہیں۔

برطانیہ کے بے شمار لوگ ڈاک خانہ کے شعبہ سے متعلق ہیں۔ گذشتہ سال ہم سب نے نو ارب اسی کروڑ خطوط ڈاک خانہ کے ذریعہ بھیجے۔ اس حساب سے تین کروڑ خطوط روزانہ بھیجے گئے۔ ڈاک خانہ کا یہ شعبہ جنرل پوسٹ آفس کی بنیاد ہے۔ اور اس کا تقریباً تین لاکھ پچاس ہزار افراد پر عملہ ہے۔

ڈاک خانہ کے موجودہ نظام کا تصور سنہ ۱۸۴۰ء میں رولینڈ ہل نامی ایک شخص کے ذہن میں پیدا ہوا۔ ان کے زمانے میں جو خطوط ایک شہر سے دوسرے شہر بھیجے جاتے تھے ان پر فاصلہ کے حساب سے محصول لیا جاتا تھا۔ ایک روز دفعتاً انھیں یہ خیال آیا کہ اگر محصول ڈاک کم ہو تو کثرت سے خطوط بھیجے جائیں گے اور یہ کام نہ صرف منفعت بخش ثابت ہوگا بلکہ اس سے عوام کی خدمت بھی ہوگی۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کا یہ خیال صحیح بھی ثابت ہوا۔ کیوں کہ اب لوگوں کے لیے یہ سہولت تھی کہ وہ ایک پینی خرچ کر کے اپنے خط برطانیہ کے ایک حصہ سے دوسرے حصہ میں بھیج سکتے تھے۔ اس زمانہ میں خط پر سیاہ ٹکٹ لگا کر ایک پینی محصول وصول کیا جاتا تھا۔ اور سنہ ۱۸۴۰ء کے ایک پینی کے ٹکٹ دنیا کے سب سے پہلے ٹکٹ تھے۔

خوش قسمتی سے اس زمانہ میں ملک بھر میں ریلوں کا جال بچھایا جا رہا تھا جس سے اس نظام کو چلانے میں کافی مدد ملی۔ چنانچہ دوسری جنگ عظیم سے کچھ ہی عرصہ قبل ایسے ستر گشتی ڈاک خانے تھے جو ریل گاڑیوں کے

اندر خطوط چھانٹ لیتے تھے۔ ان میں سے چار ڈاک خانے گو یا پوری ریل گاڑیاں تھیں۔ ایک گاڑی جو ایبرڈین اور لندن کے درمیان رات کے وقت چلتی ہے دنیا کی سب سے بڑی ڈاک گاڑی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ برطانیہ کا جنرل پوسٹ آفس ایک کار عظیم کی حیثیت رکھتا ہے۔ ملک کے کسی بھی نقل و حمل ادارہ گاڑیوں کا اتنا بڑا بیڑہ نہیں ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس میں سب سے بڑا ادارہ زری خانہ بھی ہے۔ جہاں ہرکاروں کی وردیاں سلتی ہیں۔ پھر ۱۹۵۵ء میں ڈاک خانوں کی مجموعی آمدنی کا اندازہ لگائیے تو یہ ۷۳ کروڑ پونڈ کے لگ بھگ تھی۔ اس میں سے اسے بیس لاکھ پونڈ کا منافع ہوا۔ دیکھا جائے تو یہ اتنے بڑے "کاروبار" کا بہت معمولی سا منافع ہے۔ تاہم ڈاک خانوں کی غرض و غایت روپیہ پیسہ کمانا نہیں بلکہ عوام کی خدمت ہے۔ بہرحال اس بات کا خیال رکھیے کہ یہ تمام آمدنی صرف خطوط پہنچانے سے نہیں ہوئی۔

برطانیہ کے ڈاک خانے بنک کا کام بھی کرتے ہیں جس سے زیادہ تر محنت پیشہ لوگوں کا تعلق ہے۔ پھر یہ حکومت کی طرف سے بوڑھوں اور بیواؤں کو پنشن اور چھوٹے بچوں کو خاندانی الاؤنس دیتے ہیں۔ نیز پوسٹل آرڈروں کے ذریعہ جن سے روپیہ پیسہ بحفاظت ایک جگہ سے دوسری جگہ بھیجا جاتا ہے۔ کافی کاروبار کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں ڈاک خانے ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے لائسنس بھی جاری کرتے ہیں۔ ویسے برطانیہ میں لوگ لائسنس لیے بغیر ریڈیو یا ٹیلی ویژن استعمال نہیں کرتے۔

خطوط کو چھانٹنے نیز خطوط بھیجنے کے معاملہ میں گذشتہ چند سالوں کے اندر برطانیہ نے جدید ترین مشینیں استعمال کی ہیں۔ اور ان کا استعمال روز بروز بڑھ رہا ہے۔ مثال کے طور پر ڈاک خانہ لندن میں اپنے بڑے بڑے دفتروں کے درمیان زمین دوز ریل گاڑیاں چلاتا ہے۔ ریلوے کا یہ پورے کا پورا نظام خود کار ہے۔ اور اس کے ذریعے تقریباً تیس لاکھ خطوط ہر روز باہر بھیجے جاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر ڈاک خانہ کا یہ زمین دوز ریلوے نظام موجود نہ ہوتا تو لندن کی سڑکوں پر بے پناہ آمد و رفت ہوتی اور ڈاک خانہ کی سینکڑوں گاڑیاں آمد و رفت کے نظام کو زیادہ مشکل بنا دیتیں ۔

۱۲ شمارہ ۱۱] لاهور [فرور

اس شمارہ میں

ادارہ تحریر { پروفیسر سراج الدین
پروفیسر میاں نامدار خاں

معاونین { عبدالغفور چوھ
فضل احمد

آموزش
لاہور

فروری سنہ ۱۹۶۰

جلد ——— ۱۲

شمارہ ——— ۱۱

سالانہ چندہ

پاکستان کے لیے ۶ روپے

غیر ممالک کے لیے ۸ روپے

قیمت فی پرچہ دس آنے

پبلشرز

یونی ورسٹی بک ایجنسی لاہور

آر. ایچ. ڈی خالد پرنٹر پبلشر نے دین محمدی پریس لاہور میں طبع کرا کے
یونیورسٹی بک ایجنسی ـــــــــ لاہور سے شائع کیا

قومی تعمیر میں تعلیم کا حصّہ

میاں نامدار خاں

موجودہ حکومت نے قومی تعمیر کے ہمہ گیر منصوبے میں تعلیم کو جو کلیدی درجہ دیا ہے اس کی شرح تعلیمی کمیشن کی رپورٹ میں دیکھی جا سکتی ہے۔ حکومت نہ صرف کمیشن کی سفارشیں منظور کر چکی ہے بلکہ انھیں جلد از جلد عملی جامہ پہنانے کا بھی عزم کر چکی ہے۔ یہ چیز ملک کے مستقبل کے لیے ایک بہت نیک فال ہے۔ کیونکہ ٹکنالوجی کے موجودہ دور میں کوئی قوم تعلیم کو بنیادی ذریعہ بنائے بغیر کسی قسم کی قابل ذکر ترقی نہیں کر سکتی۔

ملک و قوم نے آج تعلیم کے ساتھ جو توقعات وابستہ کر رکھی ہیں ان کی طرف مغربی پاکستان کے گورنر نے حال ہی میں اپنے ایک خطبے میں نہایت بلیغ پیرائے میں اشارہ کیا ہے۔ یہ خطبہ پشاور یونیورسٹی کے سالانہ جلسہ تقسیم اسناد کے موقع پر پڑھا گیا۔ مسٹر اختر حسین نے اس خطبے میں فرمایا :-

"آج ملک کو ماہرین طبیعات، ماہرین کیمیا، ڈاکٹروں، انجینیروں، ہر قسم کے فنی ماہروں اور روشن دماغ عالموں کی ضرورت ہے۔ موجودہ حالات کا تقاضا یہ ہے کہ تعلیم کی برکات عوام تک پہنچیں۔ تعلیم کا جواز محض وہ بھلائی ہے جو اس کی بدولت نوع انسان کے لیے پیدا ہوتی ہے۔ خصوصی مہارت کا اصول اس بات کا تقاضہ کرتا ہے کہ زندگی کے ہر میدان میں بلند سے بلند تر کامیابی حاصل کی جائے۔"

ملک میں جو معاشرتی انقلاب پیدا ہو رہا ہے اس کا ذکر کرتے ہوئے گورنر نے کہا: آج ملک کو بلند تر اور پیچیدہ تر مہارتوں کی ضرورت ہے۔ کیوں کہ ملک کی آبادی بڑی تیزی سے بڑھ رہی ہے ہماری تعلیم کو کردار پیدا کرنا چاہیے۔ کردار سے مراد یہ ہے کہ انسان اپنے حیوانی تقاضوں کو قابو میں رکھ سکے اور اپنی بدنی اور ذہنی قوتوں کو اہل وطن کی بلند تر خدمت کے لیے وقف کر سکے۔ ملک کی معاشی اور سیاسی بحالی کے لیے

موجودہ حکومت نے بہت سے قدم اٹھائے ہیں۔ ان منصوبوں میں دل چسپی لینا اور انھیں کامیاب بنانے میں مدد دینا ہر تعلیم یافتہ شہری کا فرض ہے۔ ہمارا تازہ ترین تجربہ بنیادی جمہوریتوں کے متعلق ہے۔ اس تجربے کی کامیابی کا مدار بالآخر ایسے شہریوں کے وجود پر ہے جو علم، قوت فیصلہ اور کردار کے مالک ہوں۔ اس قسم کے شہری پیدا کرنا تعلیمی اداروں کا کام ہے۔ آج سب سے زیادہ ضرورت لگاتار کام کرنے کی ہے۔ جوہری توانائی کے موجودہ دور میں کام اور لگاتار کام ہی قوموں کو خوش حال بنا سکتا ہے"۔

گورنر مغربی پاکستان نے ان الفاظ میں فی الحقیقت پوری قوم کے خیالات کی ترجمانی کی ہے۔ پاکستان اس وقت اپنی تعمیر کے ایک بے حد اہم دور میں سے گذر رہا ہے۔ پچھلے بارہ برسوں میں قوم نے اپنی بساط کے مطابق تعلیم پر بہت کچھ صرف کیا ہے۔ اب آنے والے سالوں میں قومی آمدنی کا اور بھی بڑا حصہ تعلیم پر صرف ہونے والا ہے۔ روپے اور قوت کا یہ سارا صرف اس غرض سے ضروری سمجھا گیا ہے کہ تعلیم قومی تعمیر کے کام کو پائدار اور تیز تر کر دے۔ آخری تجزیے میں تعلیم محض ایک آلہ کار ہے اور بس۔ تعلیم کی کامیابی کی واحد پرکھ یہ ہے کہ جو مقاصد اس کے ساتھ وابستہ کیے گئے تھے وہ پورے ہو رہے ہیں یا نہیں؟ سکولوں کالجوں اور یونیورسٹیوں کا زیادہ تعداد میں کھل جانا بذات خود کوئی بہت بڑا کارنامہ نہیں۔ اصل کارنامہ یہ ہے کہ تعلیم کی اشاعت جن اغراض کے لیے کی گئی ہے وہ اچھی طرح پوری ہوں۔

آج پاکستان اپنے چھوٹے بڑے تعلیمی اداروں سے بجا طور پر یہ توقع رکھتا ہے کہ وہ ایسی تعلیم دیں جو قومی تعمیر کے کام میں فائدہ مند ثابت ہو۔ یہ صورت حال ہر قسم کے تعلیمی اداروں کو قومی خدمت کا ایک سنہری موقع بھی عطا کرتی ہے۔ اور ان پر ایک بھاری ذمہ داری بھی عاید کرتی ہے۔ تاریخ جب موجودہ تعلیمی اداروں کا جائزہ لے گی تو محض ان کے اس کردار کی بنا پر لے گی جو وہ قومی تعمیر کے کام میں ادا کریں گے ؎

ہمارے دینی مدارس

فضل احمد

اسلام اور تعلیم

صحیح علم کی اہمیت اور معقولیت کی قدر و قیمت پر جس قدر زور اسلام نے دیا ہے، دنیا کے کسی دوسرے مذہب نے نہیں دیا۔ یہ بالکل قدرتی امر تھا۔ اسلام دنیا کا اکیلا مذہب ہے جو اپنی سچائی منوانے کے لیے مابعد الطبیعاتی بھول بھلیوں، دیوی، دیوتاؤں کے افسانوں یا اوتاروں کے معجزوں سے کام نہیں لیتا۔ وہ انسانی عقل کو افسانوں کی دھند یا کرامتوں کی دھمکیوں سے بے بس بنا کر اس پر اپنے احکام ٹھونسنے کے سراسر خلاف ہے۔ اس کے برعکس وہ قدم قدم پر انسانی معقولیت سے اپیل کرتا ہے اور انسان کو یہ یاد دلاتا ہے کہ انسانی شرف فی الحقیقت عقل و خرد سے کام لینے کا ہی نام ہے۔ پھر تم کیوں جان بوجھ کر اس شرف کو پاؤں تلے روند رہے ہو؟ تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عقل کا جو خدائی شعلہ تمہیں عطا کیا ہے اسے بجھا دینے کے درپے ہو۔ یہی وہ روشنی ہے جو زندگی کے خوفناک بھنوروں سے تمہیں سلامتی کی منزل پر پہنچانے والی ہے۔ تم اس کی قدر و قیمت کیوں نہیں پہچانتے؟

اللہ کی رضا کے سامنے سر جھکانے یعنی اس کے مقررہ قوانین کے ساتھ پوری طرح ہم آہنگ ہونے کو اسلام نے "فوز العظیم" یعنی سب سے بڑی کامیابی شمار کیا ہے۔ یہاں یہ نکتہ قابل ذکر ہے کہ جہاں دوسرے مذہبوں میں زندگی کی سب سے بڑی کامیابی "نجات" یعنی دنیاوی بکھیڑوں سے چھٹکارا ہے وہاں اسلام کے نزدیک زندگی کی سب سے اونچی منزل "رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ" قرار دی گئی ہے۔ اس منزل کو ایک اور جگہ "ادخلوا فی السلم کافۃ" کے لفظوں میں بھی بیان کیا گیا ہے۔ عام فہم لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام انسانوں کو زندگی سے بھاگ کر نجات حاصل کرنا نہیں سکھاتا۔ بلکہ اس کی تعلیم یہ ہے کہ انسان زندگی کے دھارے کا مقابلہ اللہ کے بنائے ہوئے قانون کے مطابق کرے۔ ایسا کرنے سے وہ اللہ سے راضی ہوگا اور اللہ اس سے

راضی ہو جائے گا۔ اس طرح وہ پورے طور پر اللہ کی رضا میں داخل ہو جائے گا۔ وہ اپنی دنیا سے بھاگنے کی بجائے اس سے پورے طور پر ہم آہنگ ہو جائے گا۔ اور یہی زندگی کی سب سے بڑی کامیابی یعنی "فوز العظیم" ہے۔

زندگی کے ساتھ پوری ہم آہنگی حاصل کرنے کے لیے دنیا اور اس کے حالات کا صحیح علم حاصل کرنا پہلی شرط ہے۔ اسی لیے قرآن نے اپنے ماننے والوں کو صاف لفظوں میں بتا دیا ہے کہ "اللہ سے اس کے صرف وہی بندے ڈر سکتے ہیں جو علم رکھنے والے ہیں"

یہاں یہ نکتہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ اللہ کے ڈر سے محض یہ مراد نہیں کہ انسان کسی غضبناک اور بدلہ لینے والے خدا کا تصور باندھ کر گریہ زاری میں لگا رہے۔ اسلام کا خدا سراپا رحمت اور محبت ہے اللہ کے ڈر سے مراد یہ ہے کہ انسان اس بات سے ڈرے کہ کہیں وہ اللہ کے بنائے ہوئے قوانین کی خلاف ورزی نہ کر دے کیوں کہ یہ ایسے اٹل قوانین ہیں جو کسی کی رو رعایت نہیں کرتے۔ "لَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا" (تم اللہ کے قوانین کو کبھی بدلتا نہیں دیکھو گے)

قرآن نے تقویٰ یعنی اللہ کے ڈر کو سب سے بڑی نیکی قرار دیا ہے۔ اور جیسا ہم دیکھ چکے ہیں تقویٰ سے مراد یہ ہے کہ انسان پورے طور پر اللہ کے بنائے ہوئے قوانین کے مطابق زندگی گذارے۔ تقویٰ کے اس مفہوم کی تائید سیدنا حضرت فاروق اعظمؓ کے قول سے بھی ہوتی ہے۔ آپ سے کسی نے پوچھا تھا کہ تقویٰ سے کیا مراد ہے؟ آپ نے فرمایا: کیا تم کبھی ایسے راستے سے نہیں گذرے جس میں کانٹے بکھرے ہوں، تم ایسی حالت میں کیا کرتے ہو۔ یہی نا کہ سنبھل سنبھل کر قدم رکھتے ہو تاکہ پاؤں کسی کانٹے پر نہ جا پڑے یہی حال تقویٰ یعنی اللہ کے ڈر کا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ انسانی زندگی اس طرح گذرے کہ اس کا ہر فعل فطرت کے قوانین کے مطابق ہو۔ ایسا کرنا اللہ کو راضی کرنا اور خود اس سے راضی ہونا ہے۔ اسی کا نام تقویٰ اور اسی کا نام اسلام ہے۔ اسی ضابطہ حیات کا ایک اور نام دین فطرت ہے، جو انسان فطرت کے مقررہ قوانین سے ہٹ کر چلتا ہے۔ وہ اللہ سے راضی نہیں۔ اس لیے اللہ بھی اس سے راضی نہیں ہو سکتا۔ اللہ کے قوانین سے ٹکر لے کر وہ مصیبت اور ہلاکت کو دعوت دیتا ہے۔ وہ زندگی سے ہم آہنگ نہیں ہو سکا، وہ سلامتی کی راہ سے بھٹک گیا، جس کی سزا اسے مل کر رہے گی۔ اسے اپنے کیے کی سزا سے

کوئی نہیں بچا سکتا۔

یہ ہے زندگی کا وہ تصور جو اسلام نے ایک ایسی دنیا کے سامنے پیش کیا جو مذہب کو محض اسرار، ریتوں اور پہیلیوں بجھوّں کا مجموعہ بنائے بیٹھی تھی۔ یہ تصور انسان کے صحیح علم کو کامیاب زندگی کا سنگ بنیاد قرار دیتا ہے اس لیے یہ کوئی حادثہ نہیں تھا کہ اسلام کے ظہور کے ساتھ ہی پہلے جزیرۃ العرب میں اور پھر اُن ملکوں میں جہاں اسلامی جھنڈا پہنچا علم کی وہ بے پناہ پیاس پیدا ہوئی جس کی مثال اس سے پہلے تاریخ میں نہ تھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ پرانی دنیا میں بھی ایتھنز کی شہری ریاست میں علم کا سورج بڑی تیزی سے چمکا تھا۔ مگر وسعت کے لحاظ سے اس ننھی سی ریاست کا اسلامی قلمرو سے بھلا کیا مقابلہ، پھر ایتھنز میں علم کی برکتیں آزاد شہریوں کے ایک چھوٹے سے طبقے کے لیے مخصوص تھیں جبکہ اسلامی دنیا میں علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور ہر مسلمان عورت پر فرض کر دیا گیا تھا۔

اس زندگی بخش اور متحرک تصورِ زندگی کا قدرتی نتیجہ یہ نکلا کہ اسلام دنیا کے جس خطے میں بھی گیا اپنے جلو میں مدرسوں، مکتبوں اور کتب خانوں کا جال بچھاتا گیا۔ یہ زندگی اور روشنی کے وہ سوتے تھے جو صدیوں سے پاؤں تلے روندی ہوئی انسانیت کو نئی امید اور نئی تر و تازگی عطا کرتے تھے۔ ان کا فیض ہر کس و ناکس کے لیے دن رات جاری تھا۔ ان کے دروازے غیر مسلموں کے لیے بھی اسی طرح کھلے تھے جس طرح مسلمانوں کے لیے علم کے پیاسے اور زندگی کے بھوکے انسان ان کے گرد جوق در جوق جمع ہوتے اور عقل و بصیرت کے موتی جھولیاں بھر بھر کر لے جاتے۔

تعلیم کا اسلامی مفہوم

اس ضمن میں ایک اور اہم نکتہ یہ ہے کہ اسلام ساری زندگی کو ناقابل تقسیم وحدت قرار دیتا ہے اس لیے یہاں اس قسم کا کوئی تصور نہیں کہ زندگی کا یہ حصہ خدا کے لیے ہے اور اس کا یہ دوسرا حصہ شہنشاہ روما کے لیے ہے اسے شہنشاہ کے لیے وقف کر دو۔ زندگی کے اس وحدتی تصور نے ہمارے یہاں تعلیم کو بھی ایک ہمہ گیر جامعیت عطا کی۔ تعلیم کا یہ جامع تصور سراپا معقولیت تھا۔ جب تعلیم کا مقصد انسان کو زندگی کے ساتھ ہم آہنگ بنانا تھا۔ جو اُسے چاہیے کہ زندگی کے کسی گوشے کو نظر انداز نہ کرے۔ اسے ایسی تربیت کا

بندوبست کرنا چاہیے۔ جو متوازن اور ہمہ جہتی شخصیت تیار کرے۔

تعلیم کے اس جامع تصور نے اسلامی دنیا میں دینی اور دنیوی تعلیم کے درمیان کبھی دیواریں کھڑی نہیں ہونے دیں۔ اسلام بنیادی طور پر ایک روحانی قوت ہے۔ اس کا یہ عقیدہ ہے کہ زندگی کی آخری بنیادیں روحانی نوعیت کی ہیں۔ مادی خوش حالی انسان کی ایک ناگزیر ضرورت ہے۔ لیکن جب زندگی صحت مند روحانی بنیادوں پر استوار کی جائے تو مادی فراوانی از خود پیچھے پیچھے آتی ہے۔ اسلامی تاریخ اس یقین کی صداقت کا کبھی نہ مٹنے والا ثبوت ہے۔ معلم کامل صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ساتھیوں کو صحت مند روحانی زندگی عطا کر کے انھیں خلافت ارض کا حق دار بنا دیا تھا۔ یہ چیز رہتی دنیا تک تاریخ کا سب سے بڑا معجزہ رہے گا۔ ۶۲۲ء میں سرور کونین ؐ کو اپنے پیدائشی شہر مکہ میں بھی جان کی امان نہ تھی۔ لیکن اس واقعہ کو مشکل سے ایک صدی گزری ہوگی کہ ان کے نام لیوا پرتگال سے لے کر وادی سندھ تک اور کوہ قاف سے لے کر نیل کی آب شاروں تک پھیلی ہوئی سلطنت کے مالک تھے۔ یہ اسی تعلیم کا براہ راست نتیجہ تھا۔ جس کا آغاز باقاعدگی سے مسجد نبوی میں ہوا تھا۔ اور جس نے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ صدیوں سے سوئی ہوئی انسانیت کو یکدم چونکا کر تحقیق و تلاش کی راہ پر لگا دیا تھا۔

اس ضمن میں ایک نکتہ خصوصیت سے قابل لحاظ ہے۔ یہ وہ نکتہ ہے جو ہم صدیوں سے بھلائے بیٹھے ہیں۔ زندگی کی بنیاد صحت مند روحانی قدروں پر ہی اٹھائی جا سکتی ہے۔ اس کی امتیازی پہچان یہ ہے کہ یہ انسان کو زندگی کی دوڑ میں بھی اولیت کا مقام عطا کرتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس سے مراد یہ ہے کہ صحت مند روحانی زندگی کو طرح طرح کے دنیاوی علوم کی بے پناہ پیاس پیدا کرنی چاہیے جو نصاب تعلیم ایسا نہیں کرتا اور اپنے خوش نما ناموں کے باوجود صحت مند روحانی تعلیم نہیں دے رہا۔ مومنوں کو قرآن نے صاف لفظوں میں دنیاوی سربلندی کی بھی خوش خبری دی ہے۔ جہاں یہ سربلندی ذلت اور پسماندگی میں بدل جائے وہاں سمجھ لینا چاہیے کہ نصاب میں کوئی بنیادی غلطی واقع ہو گئی ہے۔

دین فطرت اس نفسیاتی نکتے کو اچھی طرح سمجھتا ہے کہ سچائی اور جھوٹ کی جنگ ازل سے جاری ہے اور ابد تک باقی رہے گی۔ یہ جنگ نہ ہو تو انسانوں کا امتحان ہی ختم ہو جائے اور اچھے برے انسانوں کی

درمیان تمیز کرنے کا کوئی ذریعہ بھی باقی نہ رہے۔ اس احساس کا منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ سچائی کو بھی اپنے اندر اسی طرح قوت پیدا کرنی چاہیے جس طرح جھوٹ کر رہا ہے۔ ایسا کیے بغیر اسے ایک غیر ساوی جنگ لڑنا پڑے گا جس میں غالباً یہ جھوٹ کے ہاتھوں پٹ جائے گی۔ یہ اسی احساس کا نتیجہ تھا کہ دین فطرت کے ماننے والوں نے پہلے دن سے ہی اپنی توجہ ہر قسم کے مفید علوم و فنون پر بھی صرف کی۔ ہر وہ علم اور ہر وہ فن جو اسلام اور مسلمانوں کی قوت اور ان کی مادی خوش حالی کو بڑھا سکتا تھا۔ اسے کوشش کر کے حاصل کیا گیا اور اسے نصاب تعلیم میں مناسب جگہ دی گئی۔

اس آفاقی نقطہ نگاہ نے اسلامی نصاب تعلیم میں ہمہ گیر وسعت پیدا کر دی۔ بے شک اس نصاب کا مرکزی نقطہ ہمیشہ روحانی قدریں رہیں۔ قرآنی تعلیمات اس نصاب کے گوشے گوشے میں رچی بسی رہیں مگر اس نصاب نے علم و حکمت کے ہر جواہر پارے کو خوش آمدید کہا خواہ وہ مغرب سے ہاتھ لگا ہو یا مشرق سے۔ چنانچہ بہت جلد اس نصاب میں فلسفہ، منطق، علم الکلام، طب وغیرہ مضامین نے اہم جگہ حاصل کر لی۔ قدرتی طور پر ان نئے علوم کی آمد اسلامی تعلیمات کی تقویت کا ذریعہ بنی۔ اسلام نے ان علمی اوزاروں کو اپنی سچائی ثابت کرنے کے لیے استعمال کیا اور ان سے بے حد مفید خدمت لی۔

غرض تعلیم کے متعلق اسلام کا نظریہ ہے کہ اسے بنیادی اسلامی قدروں کو اپنا مرکزی نقطہ بنانا چاہیے اور ان کے گرد مروجہ علوم و فنون کو اس طرح مرتب کرنا چاہیے کہ ان سب میں بھی اسلامی روح بس جائے۔ اس قسم کی تعلیم نوع انسان کے لیے حقیقی برکت ثابت ہو گی۔ وہ انسان کو نہ صرف مادی فراوانی کے ان گنت ذرائع عطا کرے گی بلکہ اس فراوانی کو پاکیزہ تر زندگی کے حصول کا ذریعہ بھی بنائے گی۔

جمود کی آمد

تعلیم کے اس متحرک تصور نے صدیوں تک اسلامی دنیا کو نوع انسان کا امام بنائے رکھا۔ تمام علمی اور فنی میدانوں کی رہنمائی مسلمانوں کے ہاتھوں میں تھی۔ وہ دنیا میں جدھر نکل جاتے ہاتھوں ہاتھ لیے جاتے کیونکہ دوسری قومیں جانتی تھیں کہ علوم و فنون کے سرچشمے ہیں۔

افسوس یہ صورت حال آہستہ آہستہ بدلنے لگی۔ بغداد کی تباہی وہ آخری کاری ضرب تھی جس نے

مسلمانوں کو اس طرح بکھرا دیا کہ وہ تعلیم کے درست تصور کو بھی بھول بیٹھے۔ اسلام کے لیے بے شک یہ بڑا کٹھن وقت تھا۔ صدیوں کی خود مختاری کے بعد یکدم خونخوار وحشیوں کی آہنی ایڑی تلے آجانے سے یوں محسوس ہوتا تھا کہ بس اب آگے کوئی مستقبل نہیں۔ ناامیدی کے اس اندھیرے میں اہل الرائے عالموں نے سلامتی اس میں دیکھی کہ جو روحانی اور ثقافتی میراث موجود ہے اسے کسی نہ کسی طرح محفوظ رکھا جائے۔ اس فکر میں انھوں نے فیصلہ کیا۔ اب اجتہاد کا دور ختم ہے اور تقلید کا دور شروع ہو چکا ہے۔ پہلے عالم جو کچھ کر گئے ہیں اسے کافی سمجھو اور اسی پہ چلتے جاؤ۔

یہ فیصلہ ایک خوفناک وقتی مصلحت کے زیر اثر کیا گیا تھا۔ مگر افسوس بعد میں آنے والوں نے اسے تقدیر کا لکھا ہوا خیال کیا اور نصاب تعلیم کو ایک بے لچک شکل دے دی۔ اس افسوسناک خرابی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ تاتاری حملے کے بعد اسلامی دنیا عربی ذہن کی تخلیقی رہنمائی سے محروم ہو گئی تھی۔ اب معاملات کی باگ ڈور ایرانیوں اور ترکوں کے ہاتھ میں تھی۔ ان قوموں میں اور بہتیری خوبیاں تھیں مگر وہ عربوں کی سی ذہنی آزادی اور ان کی سی ذہنی اپج نہ رکھتی تھیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ نصاب تعلیم پر ایک خوفناک جمود سوار ہو گیا جس سے ہم آج تک خلاصی حاصل نہیں کر سکے۔

اسے تاریخ کی ستم ظریفی سمجھا جائے کہ جو زمانہ اسلامی دنیا میں جمود کی حکمرانی کا ہے، وہی زمانہ مغرب میں ان تھک ذہنی بیداری کا ہے۔ ادھر ہم پرانی لکیروں سے چمٹے بیٹھے تھے۔ اور دوسری طرف مغربی قومیں دیوانہ وار تلاش و جستجو کی راہوں پہ دوڑی جا رہی تھیں۔ ترکوں کی بے پناہ تلوار نے ان سے قسطنطنیہ کا ناقابل تسخیر شہر ضرور حاصل کر لیا۔ مگر مسیحی قوموں نے اس کے عوض کئی نئے براعظموں پر اپنے جھنڈے جا گاڑے۔ صرف یہی نہیں، انھوں نے فطرت کے چہرے پہ سے کئی پردے الٹ کر اس کے بہت سے قیمتی راز بھی معلوم کر لیے اور ان کی مدد سے اپنی خدمت کے لیے ایسی ایسی دیو قامت مشینیں ایجاد کر لیں جو قوت اور تیزی میں الف لیلے کے دیووں کو شرمندہ کریں۔ اسلامی دنیا تلوار پر ہاتھ ٹیکے یہ سارا تماشہ دیکھتی رہی، مگر ٹس سے مس نہ ہوئی۔ اس نے اپنی آنکھوں کے سامنے ایک مختلف قسم کی دنیا کو جنم لیتے دیکھا۔ مگر اس سے ہم آہنگ ہونے کے لیے انگلی تک نہ ہلائی۔ اسے یہ پرانا سبق یاد نہ رہا کہ رضائے الٰہی کے سامنے کامل طور پہ

سرجھکانے کی عملی صورت یہ ہے کہ انسان اپنی دنیا کے ساتھ پوری طرح ہم آہنگ ہو۔ وہ ان تمام قوتوں کو اچھی طرح سمجھے جو اس کی دنیا پر اثر انداز ہو رہی ہیں۔ اور ان کے ساتھ پوری کامیابی سے عہدہ برا ہو۔ اس صلاحیت سے عاری ہو کر "رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ" کا مقام حاصل نہیں کیا جا سکتا۔

اس خوفناک غلطی کی ہمیں بہت بھاری قیمت ادا کرنی پڑی۔ یہ قیمت ابھی تک پوری طرح ادا نہیں ہوئی۔ مسلمان ملکوں پر جب مغرب نے یکے بعد دیگرے وار کیے تو ان سب کے پاؤں اس طرح ڈگمگائے کہ پھر جم نہ سکے۔ اس سے بڑی تباہی یہ آئی کہ مغرب کے سیاسی غلبے نے مغربی علوم و فنون کے دروازے بھی کھول دیے۔ ہر چند کہ یہ علوم و فنون بذات خود مفید تھے مگر وہ اسلامی روح سے قطعاً نابلد تھے۔ صرف یہی نہیں بلکہ جس تثلیث پرست مادی تہذیب نے انھیں جنم دیا تھا وہ ان کے تانے بانے میں اس طرح رچی بسی تھی کہ ان علوم کی اشاعت نے اسلامی دنیا میں ایک ایسی نئی پود پیدا کر کے رکھ دی جو عام حالتوں میں اپنے ثقافتی ورثے سے بے خبر اور بعض اوقات اس سے متنفر نظر آئی۔

ہم پر یہ آفت اس لیے نازل ہوئی کہ ہمارے نصاب تعلیم نے وقتی تقاضوں کا ساتھ نہ دیا۔ ہم آنکھیں بند کر کے صدیوں پرانا نصاب پڑھاتے رہے اور یہ نہ دیکھا کہ یہ نصاب جس دنیا نے تیار کیا تھا وہ دنیا مدت ہوئی نابود ہو گئی۔ اب اس کی جگہ اور نئی دنیا نے لے لی ہے جس کے حالات اور تقاضے پرانی دنیا سے بالکل مختلف ہیں۔ اگر پرانی دنیا میں یونانی علم و حکمت کا راج تھا تو موجودہ دنیا میں سائنس کی حکمرانی ہے جس طرح ہمارے پہلے اسلاف نے یونانی علوم کو اسلامی جامہ پہنا کر نصاب تعلیم میں داخل کیا تھا۔ اسی طرح ہمیں بھی چاہیے تھا کہ جدید سائنسی علوم کو اسلامی تعلیمات کے گرد مرتب کرتے، تاکہ جدید علوم و فنون سیکھنے کے لیے ہماری نئی نسل کو مغرب کے سامنے گھٹنے ٹیکنے پڑتے۔ اس فروگذاشت نے وہ تباہی پیدا کی جس کی مثال ہماری تاریخ میں نہیں۔ اس کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ دینی اور دنیاوی تعلیم دو الگ چیزیں بن کر رہ گئی ہیں یہ صورت حال ہماری روایات کے خلاف ہے۔ اس کا دوسرا نتیجہ یہ نکلا کہ ہمارے دینی عالم اپنی دنیا سے بالکل بے خبر ہو کر رہ گئے۔ آج حالت یہ ہے کہ لاہور جیسے علمی شہر میں بھی کسی جمعہ کے دن شہر کی مسجدوں میں دیے جانے والے خطبوں کو سنیے۔ چند ایک استثناؤں کو چھوڑ کر باقی ہر جگہ ایسی بے معنی باتیں کی جا رہی ہوں گی جو

مجاہدین کو اکتا کر سلا دینے کے سوا اور کوئی نتیجہ پیدا نہیں کر سکتیں۔ یہ گت اس دین کی بنی ہے۔ جو سراپا معقولیت ہے۔

اس صورتِ حال کا غالباً سب سے بڑا نقصان نئی پود میں بڑھتا ہوا لا دینیت کا رجحان ہے۔ مغربی تعلیم اسے ایک ایسے دین سے روشناس کرتی ہے جو معقولیت کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ اس سے یہ غلط تاثر لیا جاتا ہے کہ دنیا کا کوئی بھی مذہب معقولیات کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ لہٰذا لینن کا یہ قول سو فی صدی درست ہے کہ "مذہب وہ افیون ہے جو انسانوں کو مدہوش بنا کر رکھ دیتا ہے"۔ یہ افسوس ناک تاثر ہماری نئی پود کو آسانی سے ہر قسم کی گمراہی کے گڑھے میں گرا سکتا ہے۔

اصلاح کا احساس

پاکستان قائم اس لیے نہیں کیا گیا تھا کہ قوم کے کچھ افراد کو تجارت سے ہاتھ رنگنے یا اقتدار کی گدیاں سنبھالنے کا سامان پیدا ہو جائے۔ بلکہ اس کی اصل غرض اسلامی ثقافت کا تحفظ اور اس کی ترقی تھی۔ مگر یہ امر بہت تکلیف دہ ہے کہ پچھلے بارہ تیرہ برس میں اس حقیقی مقصد کو پورا کرنے کے لیے تقریباً کچھ نہیں کیا گیا۔ ملک میں لاکھ پتیوں اور کروڑ پتیوں کے گروہ پیدا ہو چکے ہیں۔ اونچی اونچی عمارتیں۔ نئی نویلی کوٹھیاں اور چمکیلی کاریں جگہ جگہ نظر آتی ہیں۔ وزیروں اور وزیر زادوں کے جتھے موجود ہیں، مگر اس قومی بیماری کو دور کرنے کی فکر بہت کم لوگوں کو ہے جس نے ہمیں پستی کے سب سے گہرے گڑھے میں دھکیلا تھا۔

تاہم اس سلسلے میں امید کی ایک سنہری کرن بھی موجود ہے۔ دینی مدرسوں کے جامد نصاب اور ان کی عام اصلاح کا خیال بہت سے ذہنوں میں دیر سے موجود ہے۔ علامہ اقبال مرحوم ایک ایسی دینی درس گاہ کا خاکہ تیار کر رہے تھے۔ جہاں کے فارغ التحصیل علماء قدیم و جدید علوم پر ایک ساتھ نگاہ رکھتے ہوں۔ اس مطلب کے لیے انہوں نے جامعہ ازہر سے کچھ مصری عالم بھی مانگے تھے۔ پٹھانکوٹ کے نزدیک جمال پور کی دیہاتی فضا میں مجوزہ جامعہ کی داغ بیل بھی ڈالی گئی تھی۔ یہ کام اس مرحلے پہ تھا کہ علامہ مرحوم اس دنیا سے رخصت ہو گئے اور یہ کام رک گیا۔

قائد اعظم کی یادگار قائم کرنے کے لیے بھی ایک اسی قسم کے دارالعلوم کا قیام زیرِ تجویز تھا۔ لیکن یہ

تجویز پیش کرنے والی حکومتیں اپنی سیاسی مصلحتوں میں اس قدر کھوئی رہیں کہ انہیں اس تجویز کو عملی جامہ پہنانے کی فرصت نہ ملی۔

مغربی پاکستان میں پہلے بھی دینی مدرسوں کی ایک خاصی تعداد موجود تھی، مگر پاکستان قائم ہونے کے بعد سے اس تعداد میں نمایاں اضافہ ہوا ہے۔ کئی ایک دینی مدرسے جو مشرقی پنجاب یا ہندوستان کے دوسرے حصوں میں چل رہے تھے وہاں سے اٹھ کر مغربی پاکستان میں آن قائم ہوئے۔ ان مدرسوں نے ابھی کوئی ایسی تنظیم قائم نہیں کی جو ان سب کے نمائندوں کو کبھی کبھی ایک ساتھ بیٹھنے کا موقع دے۔ مگر اس قسم کی تنظیم کی ضرورت اکثر مدرسے محسوس کرنے لگے ہیں۔

اسی طرح دینی مدرسوں کے منتظمین سے بات چیت کرنے پر پتہ چلا ہے کہ ان میں سے اکثر موجودہ صورت حال سے مطمئن نہیں۔ وہ محسوس کرتے ہیں کہ ان کا موجودہ نصاب بے حد پرانا اور دقیانوسی ہے اور اس میں اصلاح ہونی چاہیے۔ یہ احساس بذات خود ایک اچھی چیز ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ کسی طرح اس احساس سے عملی کام لیا جائے۔ اس کی ایک مؤثر صورت یہ ہے کہ دینی مدرسوں کو کسی نہ کسی طرح ایک وفاق میں منظم کر دیا جائے۔ تاکہ ان کے نمائندے آپس میں مل کر کسی نتیجہ خیز اصلاح پر متفق ہو سکیں۔

ایک غیر سرکاری جائزہ

مغربی پاکستان کے دینی مدرسوں کا ایک غیر سرکاری جائزہ بالکل حال ہی میں لیا گیا ہے۔ یہ جائزہ جامعہ چشتیہ ٹرسٹ کے زیر اہتمام حافظ نذر احمد صاحب معلم اسلامیات اسلامیہ کالج لاہور نے تیار کیا ہے۔ اس کام پر کوئی نو ہزار روپے صرف ہوئے اور حافظ صاحب نے کوئی پونے چھ ہزار میل کا سفر طے کیا۔ اس جائزے کی مفصل رپورٹ چند ہفتوں تک شائع کی جا رہی ہے۔ ذیل میں اس کا وہ خلاصہ دیا جاتا ہے جو اخبار نوائے وقت مورخہ ۸ فروری ۱۹۶۰ء میں شائع ہوا تھا:—

مغربی پاکستان کے عربی مدارس میں بیالیس ہزار سے زائد طالب علموں، اساتذہ، مروجہ کتابوں، مالی وسائل اور دیگر کوائف کے متعلق غیر سرکاری سروے مکمل ہو گیا ہے۔ اپنی نوعیت کے اس اولین

جامع تحقیق کے دوران سینکڑوں طلبا اور اساتذہ کی جانب سے کیا گیا ہے کہ معلومات عامہ کی غرض سے وہ انگریزی زبان سیکھنا چاہتے ہیں۔ ریسرچ کے مطابق مروجہ دینی کتابوں کے آخری ایڈیشن پانچ سو برس پرانے ہیں اور توکل کے ضمن میں ایک وصیت کے زیر اثر طلبہ اور اساتذہ اپنی معاشرتی کفالت کے لیے کسی اور پیشہ ورانہ تربیت یا فنی تعلیم کے آرزومند نہیں ہیں۔

صوبہ بھر میں مدارس دینیہ کی اس ریسرچ کے سلسلہ میں روایت پرستی اور قدیم نظریات کے اظہار کے باوجود یہ جذبہ پایا جاتا ہے کہ نصاب کی بعض کتابوں پر نظر ثانی کر کے انھیں عصر حاضر کے دینی تقاضوں کے مطابق بنایا جائے مخصوص طرز تدریس کی کتابیں حسب ضرورت شائع کی جائیں اور اس طرح نئے نصاب کو جدید طریقے سے پڑھانے والے اساتذہ کی تربیت کا بھی انتظام کیا جائے۔ لیکن دینی نظام تدریس کی اس نشاۃ ثانیہ کے حامیوں کی اکثریت کو اپنی مالی حالت بدلنے سے زیادہ دلچسپی نہیں ہے۔

غیر سرکاری طور پر دینی مدارس کی تاریخ مرتب کرنے کے کام کا آغاز اسلامیہ کالج کے معلم اسلامیات حافظ نذر احمد نے دسمبر ۱۹۵۶ء میں شروع کیا تھا۔ انفرادی طور پر اس سلسلہ میں جو کوائف جمع ہوئے اس کی ابتدائی رپورٹ پاکستان اورینٹل کانفرنس کے پہلے اجلاس میں پیش کی گئی تھی۔ یہ رپورٹ اڑتالیس صفحات پر مشتمل تھی اس کا خیر مقدم کیا گیا اور مختلف علمی اور دینی حلقوں کی جانب سے اس خواہش کا اظہار بھی کیا گیا کہ اس نوع کی ریسرچ ملک میں دینی نظام تعلیم کی اصلاح اور امداد کے لیے ضروری ہے۔ سنہ ۱۹۵۹ء کے آغاز میں جامعہ چشتیہ ٹرسٹ نے اس ضمن میں ایک منصوبہ بنایا۔ اس مقصد کے لیے پندرہ ہزار روپے مختص کیے گئے۔ پانچ افراد پر مشتمل عملہ کا تقرر کیا گیا۔ اور تفصیلی سوالنامے سواد و ہزار کی تعداد میں جاری کیے گئے۔ اس سروے کے دوران پتہ چلا کہ مغربی پاکستان میں دینی مدارس کی تعداد ساڑھے چھ سو ہے۔ تین سو ستر مدارس نے اس ریسرچ سے تعاون کیا اور معلومات فراہم کیں۔ ان میں سے دو سو چھتیس درس گاہوں کے کوائف ترتیب دیے جا چکے ہیں۔ اس کام پر آٹھ ہزار آٹھ سو روپے خرچ آئے ہیں۔ اس سروے کے سلسلہ میں حافظ نذر احمد جنرل سیکرٹری نے پانچ ہزار سات سو میل کا سفر طے کیا۔ مدارس عربیہ کے متعلق یہ جامع رپورٹ اپریل کے پہلے ہفتہ میں شائع کی جائے گی۔ یہ چھ سو صفحات پر مشتمل ہوگی۔ عربی اور انگریزی میں اس رپورٹ کا

خلاصہ الگ شائع کیا جارہا ہے۔

عربی مدارس کی ریسرچ کے ضمن میں کم و بیش تمام دینی مدارس فکر و نظر سے معلومات حاصل کی گئی ہیں یہ معلومات حنفی، بریلوی، دیوبندی، اہل حدیث اور شیعہ فرقہ کی دینی درس گاہوں پر محیط ہیں۔ سوالناموں سے کئی دینی فرقوں کے سربراہوں سے ہدایات جاری کرائی گئیں۔ ڈیڑھ سو کے لگ بھگ سوالات اور ضمنی استفسارات کیے گئے۔ یہ سوالنامے لاہور اور کراچی کے علاوہ سیالکوٹ، شیخوپورہ۔ تھلات۔ کوہاٹ، کوئٹہ، کیمل پور۔ گجرات گوجرانوالہ۔ لاڑکانہ۔ لائل پور، سرداں، مظفر گڑھ۔ ملتان۔ منٹگمری، میاں والی۔ نواب شاہ، وزیرستان و ہزارہ آزاد کشمیر، گلگت۔ بنوں، بہاولپور، بہاول نگر، پشاور۔ تھرپارکر، ٹھٹھ، جہلم، جھنگ۔ جیکب آباد۔ حیدرآباد خیرپور، بیرس وارڈ۔ ڈیرہ اسماعیل خان۔ راولپنڈی۔ ڈیرہ غازی خان۔ رحیم یار خاں، سرگودھا۔ سانگھڑ۔ سکھر اور ریاست سوات کے مدارس میں بھیجے گئے۔ اور بیشتر معلومات بھی انہی علاقوں سے میسر آئیں۔

جن پونے تین صد دینی مدارس کے کوائف مرتب ہو چکے ہیں ان کے مطابق بیالیس ہزار تین سو نوے طالب علم ان درس گاہوں سے وابستہ ہیں۔ ان میں سے دس ہزار دو سو ساٹھ طالب علموں کی اقامت کا انتظام متعلقہ مدارس کے ذمہ ہے۔ سب سے زیادہ طالب علم ایک ہزار ایک سو پینتیس دارالعلوم کراچی میں ہیں، وہاں اساتذہ کی مجموعی تعداد چونتیس ہے۔ طالب علموں کی اکثریت مغربی پاکستان کے مختلف شہری اور دیہی علاقوں سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کے علاوہ ایران، افغانستان۔ افریقہ۔ انڈونیشیا، ہندوستان اور ترکی کے نوجوان بھی حصول تعلیم دین کے لیے مغربی پاکستان کے مدارس عربیہ میں مقیم ہیں۔ سب سے زیادہ دینی درس گاہیں لاہور شہر میں ہیں ان کی مجموعی تعداد ۲۹ ہے۔ اضلاع میں سب سے زیادہ دینی مدارس ضلع ملتان میں ہیں۔ سب سے زیادہ وظیفہ (پچاس روپے ماہوار) افریقی طالب علموں کو ملتا ہے بیرونی طلبا کی رہائش اور خوراک کے علاوہ متعدد ادارے کتابیں بھی فراہم کر رہے ہیں۔ متفرق اخراجات کے طور پر ایک روپے سے دس روپے اور بعض حالتوں میں بیس روپے ماہانہ تک وظیفہ ملتا ہے۔ ذریعہ تدریس بیشتر جگہ عربی، فارسی اور اردو ہے۔ بعض مدرسوں میں پشتو بھی ہے۔

اساتذہ کا مسئلہ: سروے کے مطابق پونے تین صد دینی مدارس میں پاکستانی

پاکستانی اور غیر ملکی اساتذہ کی مجموعی تعداد ایک ہزار چار سو بیاسی ہے۔ مصر، عراق اور ہندوستان کے فارغ التحصیل اساتذہ یہاں کئی مدارس عربیہ میں تعلیم دے رہے ہیں کراچی کے تین مدرسوں میں شام اور مصر کے معلمین ہیں۔ ہمارے کئی دینی مدرسوں کو سعودی عرب، مصر اور شام کی حکومتیں کتابیں فراہم کرتی ہیں۔ افغانی طالب علموں کی دینی تدریس کا بوجھ زیادہ تر پاکستانی مدرسوں پر ہے۔ اساتذہ کی تنخواہ پندرہ روپے ماہوار سے شروع ہو کر تین صد روپے ماہانہ تک ہے۔ بیشتر اساتذہ کی بود و باش سادہ ہے۔ فاضل آمدنی کے ذرائع میں سے نذر و نیاز، تعزیات اور مواعظ ہیں۔

مسجدیں، لائبریریاں اور تبلیغ : ریسرچ کے مطابق پچاس فی صد مدارس عربیہ کو اچھی لائبریریاں میسر ہیں۔ کئی تاریخی مساجد، درس گاہوں سے ملحق ہیں۔ طلبہ کے قیام اور مطالعہ کے سلسلہ میں جگہ کا مسئلہ مساجد کی وجہ سے اکثر اوقات حل ہو جاتا ہے۔ بہت کم تعداد میں دینی مدارس کے لیے متروکہ عمارتیں حاصل کی جا سکی ہیں۔ درس گاہوں سے وابستہ املاک اور آمدنی کے کوائف ابھی یکجا نہیں کیے جا سکے۔ دینی کتابوں میں سے بعض نایاب ہیں۔ ذاتی مساعی سے قیمتی کتب اکٹھی کی جاتی ہیں۔ ایک درجن سے زیادہ دینی ادارے تبلیغی جرائد شائع کرتے ہیں۔ لٹریچر کے ذریعہ اشاعت دین کی مثال لاہور کے ایک دینی مدرسے نے قائم کی ہے۔ اس کے شعبۂ تبلیغ و اصلاح کی جانب سے اب تک گیارہ لاکھ نو ہزار رسالے مفت تقسیم کیے جا چکے ہیں، قیمت پر فروخت ہونے والی تبلیغی کتابیں ان کے علاوہ ہیں۔ یہ امر قابل غور ہے کہ ان دینی مدارس کی شاخیں مغربی ممالک میں قائم نہیں کی گئی ہیں اور بیشتر پاکستانی مدرسوں کا آپس میں بھی کوئی رابطہ نہیں رہا ہے۔ اگر وفاق المدارس کی تجویز بروئے عمل آ گئی تو ملکی مدارس عربیہ میں تعاون کی صورت پیدا ہو جائے گی۔ سردست ایک سو مدارس نے وفاق میں شرکت کا ارادہ ظاہر کیا ہے۔

رائج کتابیں اور مضامین : سروے کے مطابق درس نظامی میں کافی تنوع ہے۔ لیکن مروجہ نصاب کم و بیش پانچ سو برس قدیم ہے اور اس کو از سر نو مرتب کر کے شائع نہیں کیا گیا۔ مثال کے طور پر دینی مدارس میں صرف و نحو کی جو تازہ ترین کتاب پڑھائی جاتی ہے اس کی تصنیف سنہ ۱۸۰۶ء میں ہوئی۔ گویا کہ اس نصاب میں تبدیلی اب تک نہیں کی گئی۔ منطق میں تازہ کتاب ۱۱۲۲ھ فلسفہ میں سنہ ۱۷۵۱ء نحو میں شرح جامی

علم الکلام میں ۱۳۵۸ھ طب میں ۱۳۲۲ھ اور فقہ میں ۱۰۸۵ھ کی کتاب شریک نصاب ہیں۔ وقتی تقاضے اور ارتقائے ذہن انسانی نے اس نصاب تدریس پر اپنا اثر نہیں ڈالا ہے۔ اس سلسلہ میں دینی مدارس نے اپنی تین بنیادی مشکلات بتائی ہیں اولاً یہ کہ نیا نصاب تعلیم مرتب نہیں کیا گیا۔ اس نصاب کی اشاعت ایک دشوار مرحلہ ہے اور نئے نصاب کے مطابق تعلیم دینے کے لیے تربیت یافتہ اساتذہ درکار ہیں۔ تاہم ان مدارس کی بنیادی صفت یہ بیان کی جاتی ہے کہ فارغ التحصیل مذہبی درسگاہوں میں تعلیم دینے کے فرائض بخوبی انجام دے سکتے ہیں۔ ان دینی مدارس کے بعض ناظمین نے اندیشہ بیان کیا ہے کہ اگر گریجوایٹ ائمہ مساجد اور مبلغ بنا دیے گئے تو وہ سادگی قناعت اور توکل کی زندگی بسر کرنے سے قاصر ہوں گے۔ تعلیم اور تبلیغ کی راہ میں یہ بنیادی دشواریاں نہیں پیش آ سکتیں۔ دوسری جانب یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ کئی دینی مدارس میں انگریزی تعلیم کا شوق بڑھ رہا ہے۔ لیکن دینی درسگاہوں میں اس کا انتظام سرِدست نہیں کیا گیا۔ کئی مفتیانِ دین نے دوران ریسرچ اپنی اس خواہش کا اظہار دبی زبان سے کیا ہے۔ معلومات کا انحصار ان جلسوں پر ہے جو سال میں ایک بار تین دنوں کے لیے باقاعدگی سے بلائے جاتے ہیں۔ طلبا کی صحت ناقص غذا اور ٹھوس تعلیم کے باعث تسلی بخش نہیں ہے۔

فتاویٰ اور توکل : مدارس عربیہ میں سے ایک کے دارالفتاویٰ سے جو معلومات حاصل ہوئی ہیں ان کے مطابق ایک سال میں آٹھ ہزار پاکستانی اور غیر ملکی باشندوں نے دینی مسائل میں رہنمائی کے لیے رجوع کیا۔ انھیں بالعموم ڈاک سے جواب بھجوائے گئے۔ کئی دینی اداروں کے ناکافی مادی وسائل کی ایک نفسیاتی وجہ یہ بتائی گئی کہ دارالعلوم دیوبند کے مسلک کے پابند مدارس میں بانی دارالعلوم مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی علیہ الرحمۃ کی وصیت کی اس شق کے گہرے اثرات منتظمین، اساتذہ اور طلباء نے علوم دین کی زندگیوں میں پائے گئے ہیں۔ وصیت کا وہ حصہ ان الفاظ میں ہے۔

"مدرسہ میں جب تک آمدنی کی کوئی سبیل یقینی نہیں مدرسہ انشاء اللہ تعالیٰ اسی طرح چلے گا۔ اگر کوئی آمدنی یقینی ایسی حاصل ہو گئی جیسی جاگیر یا کارخانہ تجارت یا کسی امیر محکم القول کا وعدہ تو پھر یوں نظر آتا ہے کہ یہ خوف، رجا، جو سرمایہ رجوع الی اللہ ہے ہاتھ سے جاتا رہے گا۔ اور امداد غیبی موقوف ہو جائے گی اور کارکنوں میں باہم نزاع پیدا ہو جائے گا۔ القصہ آمدنی اور تعمیر وغیرہ میں ایک نوع کی بے سروسامانی ملحوظ رہے"۔

فی طالب علم خرچ : اس سروے کے مطابق دنیاوی تعلیم کے مقابلہ میں دینی تدریس پر فی طالب علم بہت کم خرچ ہوتا ہے۔ اس کی وجوہ یہ بیان کی گئی ہیں کہ مدارس سے ملحقہ مساجد اور کتب خانے اقامتی طالب علموں کے تعلیمی اور رہائشی مصارف نہایت قلیل ہیں اور وہ سادہ زندگی پر قناعت کی مسلسل ترغیب سے متاثر ہوتے ہیں جبکہ یونیورسٹی کے درجہ تک اسلامیات کے طالب علم ان کی نسبت کم مضامین کا مطالعہ کرتے ہیں لیکن اس پر کہیں زیادہ روپیہ صرف ہوتا ہے۔"

بعض اہم اور دلچسپ پہلو

یہ اپنی قسم کا پہلا جائزہ ہے جو دینی مدرسوں کے متعلق تیار کیا گیا ہے۔ اس کے خلاصے پر ایک نظر ڈالنے کے بعد علماء کا بڑے سے بڑا معترض بھی یہ ماننے پر مجبور ہوگا کہ اگر ہماری مسجدوں کے امام اپنی دنیا سے بے خبر ہیں، اگر وہ اپنے خطبوں میں ڈھنگ کی بات نہیں کرتے، اگر وہ ان توقعات سے بہت پیچھے رہتے ہیں جو ہم ان سے جائز طور پر باندھتے ہیں تو اس میں ان کا کچھ قصور نہیں۔ یہ اس فرسودہ نصاب تعلیم کا قصور ہے جس میں سے انہیں گزارا جاتا ہے۔ جو قوم اپنے دینی رہنماؤں کی تعلیم و تربیت کو بالکل اپنے حال پر چھوڑ دے، اسے یہ حق نہیں پہنچتا کہ دینی رہنماؤں کی بے بصری کی شکایت کرے۔

رپورٹ کا بے حد روشن پہلو یہ ہے کہ ہمارے علماء میں سے اکثر کو اصلاح کی ضرورت کا احساس ہے بعض اس حد تک جانے کو تیار ہیں کہ اپنے مدرسوں میں انگریزی داخل نصاب کرلیں۔ بہرحال انگریزی زبان پڑھ لکھ لینا بذاتِ خود کسی شخص کو کوئی فوقیت عطا نہیں کرسکتا۔ اصل چیز وہ علوم ہیں جو انگریزی کی مدد سے سیکھے جاسکتے ہیں۔ دینی مدرسوں میں پڑھنے والوں کو صرف سائنسی اور معاشرتی علوم سے معنی خیز تعارف حاصل کرنے کی ضرورت ہے اور یہ ضرورت انگریزی سیکھے بغیر بھی پوری ہوسکتی ہے۔

رپورٹ ایک اور معنی خیز پہلو پر بھی روشنی ڈالتی ہے۔ وہ یہ کہ اساتذہ اور طلبہ دونوں اس بات کے خواہاں نہیں کہ نصاب میں فنی تعلیم شامل کی جائے۔ اس کے جواز میں دلیل یہ دی گئی ہے کہ اگر مسجدوں کے امام کسی پیشے میں مہارت پیدا کرلیں گے تو ان کی تقریباً ساری توجہ اس پیشے کی طرف منتقل ہوجائے گی اور دینی خدمت کے لیے وقت نہیں نکال سکیں گے۔ یہ نقطہ نگاہ صرف ایک حد تک درست تسلیم کیا جاسکتا ہے

یہاں تک کہنا غالباً درست ہوگا۔ کہ اگر کوئی دینی درس گاہ اپنے طلبہ کو بجلی کے ماہر بنا کر نکالے تو ان میں سے بیشتر اپنا سارا وقت اس پیشے کی نذر کرنا پسند کریں گے اور مسجد کے معاملات میں برائے نام دلچسپی لیں گے۔ لیکن دینی مدرسوں کے ضمن میں جب فنی تعلیم کا ذکر کیا جاتا ہے تو اس سے کسی کی یہ مراد نہیں ہوتی کہ وہاں سے بجلی کے ماہر یا سلائی کے ماہر باہر نکلیں۔ اس سے غرض صرف اتنی ہوتی ہے کہ ان درس گاہوں کے طلبہ کو بعض ایسی مفید فنی مہارتوں میں کچھ نہ کچھ دست گاہ ہونی چاہیے جن کی مدد سے وہ مسجد سے متعلقہ آبادی کی بہتر خدمت انجام دے سکیں۔ مثلاً اگر بننے والے اماموں کو جدید طریقہ ہائے تدریس میں اچھی خاصی تربیت مل جائے تو مسجد میں ابتدائی مدرسے چلا سکتے ہیں۔ اگر وہ علم طب میں خاصی دست گاہ حاصل کرلیں تو وہ مقامی آبادی کو حفظانِ صحت، متوازن غذا اور صحت مند عادات کے سبق سکھانے کے علاوہ اس کی معمولی طبی امداد بھی کر سکتے ہیں۔ اس قسم کی تربیت امام کے وقار کو بڑھاتی ہے۔ اس کے کام کو زیادہ مؤثر بنائی اور اس کی آمدنی میں تھوڑا بہت اضافہ بھی کر سکتی ہے۔ بے شک اشاعت دین ایک ایسا کام ہے جو خصوصی مہارت اور ہمہ وقتی توجہ چاہتا ہے۔ مگر مسیحی مبلغوں کی مثال یہی سبق دیتی ہے کہ دینی مبلغوں کو زندگی کے کچھ دوسرے میدانوں میں بھی اتنی عملی سوجھ بوجھ ضرور حاصل کرنی چاہیے جس کی بدولت وہ نوع انسان کے لیے کچھ اور مفید ہو سکے۔ ہمارے دیہات میں ترقی اور تعمیر نو کے جو منصوبے رائج کیے جا رہے ہیں انھیں عملی شکل دینے میں امام مسجد اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔ مثلاً وہ مغلوں کی بیماریوں اور حیوانوں کی بیماریوں کے خلاف جنگ کی کمان سنبھال سکتا ہے۔ یہ خدمت اس کے دینی مشاغل میں چنداں حارج نہیں ہو سکتی۔ مگر اس کے لیے اسے فنی تربیت کی ضرورت ہے۔

ہمارے دینی مدرسوں کا ایک نمایاں پہلو بے سروسامانی اور تنگی کی زندگی ہے جو ان کے طلبہ کا حصہ ہے مثلاً لاہور کے ایک بہت بڑے مدرسے میں طلبہ کو صرف پندرہ روپے ماہانہ وظیفہ ملتا ہے جس پر انھیں گذارا کرنا پڑتا ہے۔ مدرسے کا اپنا کوئی باورچی خانہ نہیں جہاں کھانا پکتا ہو۔ طلبہ بازار سے کھانا کھاتے ہیں۔ گرانی کے موجودہ دور میں ایک نوجوان لاہور میں پندرہ روپے ماہوار پر جس قسم کی زندگی گذار سکتا ہے اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔

معلوم نہیں اسلامی دنیا کے باقی حصوں میں بھی بے سروسامانی کی یہ روایت موجود ہے یا نہیں۔ مگر برصغیر پاک و ہند میں اس کی جڑیں خوب مضبوط ہیں۔ اس کی ایک وجہ دارالعلوم دیوبند کے بانی کی وہ مشہور

وصیت ہے، جس میں انھوں نے یہ خواہش ظاہر فرمائی تھی کہ "القصہ آمدنی اور تعمیر وغیرہ میں ایک قسم کی بے سروسامانی ملحوظ رہے۔"

طالب علم اور بالخصوص دین کے طالب علم کے لیے سادہ زندگی ایک اونچا النصب العین ہے مگر سادہ زندگی کے معنی نفس کشی ہرگز نہ ہونا چاہیے۔ ہمارے بعض دینی مدرسوں میں طلبہ عملاً نیم فاقہ مستی کی زندگی گذار رہے ہیں جو کوئی پسندیدہ صورتِ حال نہیں۔"

مضبوط پہلو

ہماری ساری کمیوں کے باوجود ہمارے دینی مدرسے آج بھی بعض ایسی خوبیوں کے حامل ہیں جو مغربی تعلیم کے کسی بڑے سے بڑے ادارے کو بھی نصیب نہیں۔ ان میں سے زیادہ نمایاں یہ ہیں:۔

تمام اخراجات کی کفالت: دینی مدرسے طلبہ کے ہر قسم کے اخراجات کا بوجھ اٹھاتے ہیں، نہ صرف یہ کہ وہ کوئی فیس وصول نہیں کرتے بلکہ وہ طلبہ کے رہنے، کھانے، کپڑوں، کتابوں وغیرہ کے اخراجات بھی خود ادا کرتے ہیں۔ ان کے دروازے پہ کوئی آجائے اگر وہ علم حاصل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے تو کوئی مالی معذوری اسے اس چیز سے محروم نہیں رکھ سکتی۔ طریق کار مدرسے کی مالی ذمہ داری کا فی بوجھل بنا دیتا ہے۔ پہلے وقتوں میں مدرسوں کو اس ذمہ داری سے عہدہ برا ہونے کے لیے جاگیریں اور اوقاف مل جایا کرتے تھے۔ مگر اب ان کا بڑا سہارا محض عوام کے خیرات وصدقات ہیں۔ غالباً یہی مالی دشواری ان مدرسوں کے طلبہ کی بے سروسامانی کا بڑا سبب ہے۔

تعلیم نفس: جدید تعلیمی نظریوں کا سارا زور اس بات پر ہے کہ طالب علم کو ذاتی کوشش اور تلاش سے ہر قسم کا علم حاصل کرنا چاہیے جس درس گاہ میں استاد کاوش اور تلاش سے علم جمع کرے اور طلبہ کے سامنے پیش کرے وہ حقیقی تعلم پیدا نہیں کر سکتی۔ استاد کا کام صرف تلاش و تحقیق کے راستوں کی نشاندہی کرنا اور طلبہ کی فراہم کردہ معلومات کی جانچ پڑتال کرنا ہے نہ کہ طالب علموں کے ذہن میں علم بھرنا۔

ہمارے عام سکولوں اور کالجوں میں پڑھائی کے جو طریقے چالو ہیں وہ جدید تعلیمی نظریوں کے لحاظ سے

بالکل از کار رفتہ ہیں۔ لیکن ہمارے دینی مدرسوں میں پڑھائی کے جو طریقے رائج ہیں وہ حیرت انگیز حد تک سوید ہیں یہاں یہ دستور نہیں کہ استاد سبق تیار کرکے آئے اور طلبہ کے سامنے تقریر یا تشریح کرنے لگ جائے۔ بلکہ طریق تدریس یہ ہے کہ استاد جماعت کو ایک دن پہلے بتا دیتا ہے کہ کل فلاں موضوع پر بحث ہوگی اس کے لیے فلاں فلاں کتب کے فلاں فلاں حصے دیکھ کر آؤ۔ صبح مکتب کا کام شروع ہونے سے پہلے طلبہ پورے دو گھنٹے تک اس موضوع کا مطالعہ کرتے ہیں۔ ازاں بعد چار گھنٹے تک مکتب کی پڑھائی جاری رہتی ہے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ جماعت کے طلبہ اور ان کا استاد مل کر بیٹھتے ہیں۔ استاد موضوع کے مختلف پہلوؤں پر سوال پوچھتا ہے۔ طلبہ جواب دیتے ہیں۔ جہاں کسی ایک طالب علم کا جواب ناکافی یا ادھورا ہو، اس کے دوسرے ساتھی اسے مکمل کر دیتے ہیں، اور جماعت میں سے کوئی بھی طالب علم ایسا نہ کر سکے تو استاد خود یہ کام انجام دیتا ہے۔

چار گھنٹے کی پڑھائی کے بعد دوپہر کے کھانے اور ظہر کی نماز کا وقفہ آجاتا ہے۔ اس کے بعد دو گھنٹے تک پھر پڑھائی ہوتی ہے۔ ازاں بعد مکتب بند ہو جاتا ہے۔ مگر طلبہ کو پورے چار گھنٹے تک اور کام کرنا ہوتا ہے ساری جماعت ایک جگہ مل کر بیٹھتی ہے۔ دن میں جو کچھ پڑھا ہوتا ہے اب اس کی تکرار یعنی دہرائی ہوتی ہے۔ اس کی صورت زبانی رٹنے کی نہیں بلکہ طلبہ ایک دوسرے پر سوال کرتے ہیں۔ یہ گویا ٹھوس قسم کی علمی بحث و تمحیص ہوتی ہے۔ جس میں ہر طالب علم کو پوری سرگرمی سے حصہ لینا پڑتا ہے۔

اس طرح دن بھر میں ہر طالب علم کو کم از کم بارہ گھنٹے تک ٹھوس علمی کام کرنا پڑتا ہے۔ یہ کام ذاتی کاوش اور تلاش کا مطالبہ کرتا ہے۔ ہر مکتب کے ساتھ ایک اچھا کتب خانہ موجود ہوتا ہے۔ جس میں بعض اوقات نادر کتابیں اور قلمی نسخے موجود ہوتے ہیں۔ طلبہ ان کتابوں سے پورا فائدہ اٹھاتے ہیں۔ یہ طریق کار سراسر سائنسی ہے۔ کیوں کہ اس میں طلبہ کو ہر قسم کے مسائل کے جواب خود تلاش کرنا اور تیار کرنا پڑتے ہیں۔ استاد انھیں نہ نوٹ لکھواتا ہے نہ بنے بنائے جواب مہیا کرتا ہے۔

انتشار اور سخت کوشی: دینی مکتبوں کے روزانہ معمول کا جو خاکہ اوپر کی سطروں میں دیا گیا ہے اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان میں پڑھنے والے طلبہ کس سخت کوشی سے کام لیتے ہیں۔ یہ سخت کوشی ہمارے آرٹس کالجوں کی رعایتی تن آسانی کے مقابلے میں بے حد دل خوش کن تضاد پیدا کرتی ہے۔ ہمارے سکولوں

بالعموم اور کالجوں میں خصوصیت کے ساتھ طلبہ اس قدر آرام طلب اور تن آسان بن جاتے ہیں کہ ذرا سا کام کرنے کے بعد انہیں تفریح کرنے یا تازہ دم ہونے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ کالجوں میں بالخصوص نہ صرف یہ کہ سال میں بہت تھوڑا عرصہ پڑھائی ہوتی ہے۔ بلکہ پڑھائی کے دنوں میں بھی ایک عام طالب علم کو روزانہ برائے نام کرنا پڑتا ہے۔ اور پھر یہ کام بھی کس نوعیت کا؟ مزے سے کرسی پر پاؤں پھیلائے بیٹھے ہیں۔ جی چاہا پروفیسر کی بات سنی۔ نہ جی چاہا نہ سنی۔ اور اگر ترنگ میں آگئے تو کمرے سے باہر نکل گئے۔ کوئی پوچھنے والا نہیں کہ کب آتے ہو؟ کب جاتے ہو؟ کیا پڑھتے ہو؟ جو پڑھا ہے اس میں سے کیا کچھ پلّے پڑا ہے؟ اس میں سے کیا کچھ پلّے پڑا ہے؟ بس کالج کا طالب علم ہونے ہی کے طفیل نہ صرف پڑھائی کے متعلق ہر قسم کی بازپرس سے آزادی مل گئی بلکہ گھر کے کام کاج سے بھی بالا ہو گئے اور نماز روزے سے بھی چھٹی مل گئی۔ دینی مدرسوں میں اس قسم کی مادر پدر آزادی کا گذر تک نہیں۔

دینی مکتبوں میں اگر طلبہ کی سخت کوشی اس درجے کی ہے تو اساتذہ کا ایثار اور ان کی سادگی بھی کچھ کم نہیں۔ کالج کے ایک لیکچرار کو نوکری شروع کرتے ہی سب کچھ مل ملا کر تین سو روپے سے کچھ اوپر تنخواہ ملتی ہے۔ یہ مشاہرہ اس نوجوان کو ملتا ہے جو ابھی ابھی کالج سے نکلا ہو۔ اور ایم۔ اے کی ڈگری کے سوا اور کوئی علمی تجربہ یا تجربے کی پختگی نہ رکھتا ہو۔ مگر لیکچرار صاحب اس پہ ہرگز خوش نہیں ہیں۔ انھیں شکایت ہے کہ مجھے ملتا ہی کیا ہے؟ معمولی سا تدریسی کام بھی ان کی ناک کر توڑے جاتا ہے۔ اور وہ اس فکر میں رہتے ہیں کہ سال میں جو گنتی کے دن پڑھائی کے آتے ہیں ان کی بھی چھٹی حاصل کی جائے۔ ایک کالج کے طالب علم اپنے اساتذہ کا ذکر کرتے ہوئے بتا رہا تھا کہ ان میں سے آدھے ہفتے کے دن غائب رہتے ہیں اور آدھے سوموار کے دن۔ جمعہ کی آدھی چھٹی ویسے ہی ہوتی ہے۔ اس سے طلبہ کا ہرج ہوتا ہے تو ہوا کرے اکثر طلبہ اپنے اساتذہ سے بڑھ کر چھٹی منانے کے دلدادہ ہوتے ہیں تو چنانچہ ایک اس چیز کو نقصان وہ خیال کرتے ہیں ان کی پرواہ ہی کسے ہے؟

اس کے مقابلے میں دینی مکتبوں میں کام کرنے والے اساتذہ ہیں ان کی بھاری اکثریت پختہ کار اور بالغ نظر عالموں پر مشتمل ہے۔ مگر ان میں بہت کم ایسے ہوں گے جو تین سو روپے ماہوار تنخواہ پاتے

ان کی زندگیاں ایثار اور سادگی کے منہ بولتے نمونے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ دینی مکتبوں میں پڑھنے والا تقریباً ہر طالب علم کوئی جماعت پاس کرنے کے بعد اس قابل ہو جاتا ہے کہ اس جماعت کو پڑھا سکے۔ ہمارے کالج اس قسم کا نتیجہ پیدا نہیں کر سکتے۔

حرفِ آخر

دینی مکتبوں کی مجموعی تصویر پر نگاہ ڈالتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ ان کی سب سے بڑی کمزوری ان کے نصاب کی فرسودگی ہے۔ اگر ان کی یہ کمی دور ہو جائے تو وہ آج بھی ایسے رہنما پیدا کر سکتے ہیں جو خود فراموشی اور یک دلی کے ساتھ ملک و قوم کی خدمت کریں۔ پاکستان بنیادی طور پر ایک زرعی ملک ہے جس کا معیارِ زندگی کافی نیچا ہے۔ ہمارے کالجوں نے اب تک ایسے لوگ پیدا کیے ہیں جو نہ صرف نگاہ کی گہرائی سے محروم ہیں بلکہ جو ایسے معیارِ زندگی کے متوالے ہوتے ہیں جو عوام کو نصیب نہیں۔ اس سے عوام اور ان کے رہنماؤں کے درمیان جو فاصلہ پیدا ہو گیا ہے اس نے ملک کو بڑا نقصان پہنچایا ہے۔

دینی مکتبوں کے پڑھے ہوئے لوگ ان دونوں برائیوں سے بچے ہوئے ہیں۔ انھیں طالب علمی کے زمانے میں اس طور پر کام کرنا پڑتا ہے کہ وہ مقررہ نصاب میں کافی گہری نگاہ حاصل کر لیتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی زندگی بالکل ایسی ہی سادہ ہوتی ہے جیسی عوام کی۔ اگر پڑھایا جانے والا نصاب فرسودہ یا ناکافی ہے تو اس میں پڑھنے والوں کا کچھ قصور نہیں۔ اگر آج اس نصاب میں ضروری اصلاح و ترمیم ہو جائے تو کل ملک کو ایسے بالغ نظر اور اپنے آپ کو بھول کر کام کرنے والے رہنما مل سکتے ہیں جن کی آرٹس کالجوں سے کبھی توقع نہیں کی جا سکتی۔

اس مضمون میں جس غیر سرکاری جائزے کا حوالہ دیا گیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ ہر قسم کے دینی مکتب اب اصلاحِ حال کی ضرورت محسوس کرنے لگے ہیں۔ اگر انقلابی حکومت اس معاملے میں ان مکتبوں کی ذرا سی رہنمائی کر دے تو اصلاحِ حال کا یہ کام خلافِ توقع تیزی سے ہو جائے۔ موجودہ حکومت نے جہاں کہیں دوسرے مدتوں سے اٹکے ہوئے کام پایۂ تکمیل کو پہنچائے ہیں۔ وہاں اگر یہ اس اہم کام کی طرف بھی توجہ کرے تو اس کے کارناموں میں ایک اور کارنامے کا اضافہ ہو جائے گا۔

ابنِ خلدون

فارق العلائی — سلسلہ نمبر ۳

مروجہ تدریسی طریقے

المغرب:- المغرب میں تعلیم کی ابتدا قرآن سے کی جاتی تھی اور اس کی انتہا بھی قرآن ہی سے ہوتی تھی۔ طلبہ شروع سے آخر تک قرآن اور صرف قرآن پڑھتے تھے۔ زمانۂ تدریس میں قرآنی علم ہجا، املا، اور اس کے متعلقہ مسائل کے علاوہ ماہرین علم ہجا کی اختلاف رائے پر بھی بحث کی جاتی تھی۔ لیکن اس سے پہلے کہ طلبہ کو قرآن پر کامل دست گاہ حاصل نہ ہو جائے۔ حدیث، فقہ، نظم، اور عربی لسانیات کو خارج از درس سمجھا جاتا تھا ع۱ قرآن پر مکمل دست گاہ حاصل کرنا مشکل تھا۔ بعض اوقات طلبہ کی بہت بڑی اکثریت اس سے محروم رہ جاتی تھی۔ اب ایسی صورت میں ایسے طلبہ کیا کریں۔ کیا وہ قرآن چھوڑ کر کچھ اور پڑھنا شروع کر دیں۔ دراصل وہ قرآن کو چھوڑ کر دوسرے علوم کی طرف متوجہ نہیں ہو سکتے تھے۔ اگر ہونا بھی چاہیں تو مروجہ نظامِ تعلیم انھیں اس کی اجازت نہیں دیتا تھا، اس لیے جو اس سے محروم رہ گئے وہ گویا علم کی تحصیل سے بھی محروم رہ گئے ع۲

ابن خلدون نے المغرب کے شہروں اور دیہاتوں میں ابتدائی مدارج سے لے کر انتہائی مدارج تک یہی طریقہ مروج پایا۔ اول تدریس قرآن اور تکمیلِ درسِ قرآن کے بعد دوسرے علوم، اور جو لوگ اپنی عمر کا وافر حصہ گذار نے کے بعد لکھنے پڑھنے کا عزم کرتے تو انھیں بھی یہی دشوار گذار مراحل کو طے کرنے پڑتے۔ ابن خلدون کے نقطۂ نگاہ میں اس طریقِ تدریس کا ایک فائدہ یہ ضرور ہوا کہ قرآنی علم ہجا اور املا پر اتنی قدرت المغرب والوں کو حاصل ہو جاتی تھی کہ دوسرے علاقے کے مسلمان ان سے مقابلہ نہیں کر سکتے تھے ع۳

ع۱ روزن تھال۔ المقدمہ۔ جلد سوم صفحہ ۳۰۱

ع۲ ایضاً

ع۳ ایضاً

اندلس : اندلس میں جو طریق تدریس رائج تھا وہ المغرب کے مروجہ طریقے سے مختلف تھا۔ اگرچہ اندلس میں بھی قرآن ہی کو تعلیم کی بنیاد تسلیم کیا جاتا تھا۔ لیکن تعلیم صرف قرآن تک محدود نہ تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ طلبہ کو لکھنا پڑھنا بھی سکھایا جاتا تھا۔ عربی شعر و انشا کی تدریس پر توجہ دی جاتی تھی اور انھیں دوسرے مضامین سے بھی متعارف کرایا جاتا تھا۔ عربی زبان اور خط کی اتنی مشق کرائی جاتی تھی کہ انھیں ملکہ تامہ حاصل ہو جائے۔[۱]

اندلس میں قرآن کی تدریس پر زور نہیں دیا جاتا تھا۔ بلکہ قرآن کو بھی محض دوسرے مضامین کی طرح پڑھایا جاتا تھا اور بس۔ اس طریق تعلیم میں جو چیز سب سے زیادہ پیش نظر رہتی تھی وہ عربی خط کی مشق اور اس کی اصلاح اور یہ مشق جوانی تک جاری رہتی تھی۔ اس طرح طلبہ کو عربی زبان پر بھی قدرت حاصل ہو جاتی تھی۔ وہ عربی خط، ہجا، اور املا سے بھی روشناس ہو جاتے تھے اور اس وقت تک ان کے پاس عمومی معلومات کا بہت بڑا ذخیرہ جمع ہو جاتا تھا۔ لیکن جس زمانے میں ابن خلدون نے زندگی کا سانس لیا اندلس کی علمی مجلس برخاست ہو چکی تھی۔ تعلیم و تدریس کی جو روایات قائم تھیں ایک ایک کر کے ختم ہو رہی تھیں۔ اسے افسوس تھا کہ اندلس کی عظمت کی نشانیاں مٹتی جا رہی ہیں۔ اس کا اثر یہ ہے کہ اب ان روایات کے معدوم ہو جانے سے، اندلسی طالب علم کی معلومات بھی علم کے مبادیات سے آگے نہیں بڑھنے پاتیں۔ اور یہی چیز اس کی ذہنی کش مکش کی نشان دہی کرتی ہے۔[۲]

افریقیہ (تونس) : افریقیہ کا طرز تعلیم اندلس کے طرز تعلیم سے مختلف تھا۔ المغرب میں صرف قرآن کی تدریس ہی کو حاصل تعلیم سمجھا جاتا تھا۔ مگر علاقے میں قرآن کے ساتھ ساتھ حدیث کی بھی تعلیم دی جاتی تھی اور نصاب تعلیم میں، سائنس کے چند بنیادی اصول اور سائنٹیفک مسائل کی تدریس بھی بالالتزام شامل تھی۔ لیکن اس کے باوصف قرآن اور صرف قرآن ہی کی تدریس پر سب

[۱] روزن تھال۔ المقدمہ۔ جلد سوم صفحہ ۳۰۱

[۲] ایضاً

[۳] ایضاً

۳۰۲

زیادہ توجہ دی جاتی تھی۔ قرآن کس طرح پڑھنا چاہیے۔ اس کے مختلف متن کیا کیا ہیں اور ان کے پڑھنے کے طریقے کیا کیا ہیں۔ اس طرح تونس میں قرآن کی اچھی تدریس اور قرآن کی تدریس کے بعد خطاطی کی تحصیل پر سارا زور صرف کیا جاتا تھا[1]

ابن خلدون کو تونس کے طریق تدریس میں اندلس کی جھلک نظر آئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ابن خلدون کی پیدائش سے پہلے ہی ہسپانیہ میں مسلمانوں کا سیاسی اقتدار ختم ہو رہا تھا۔ چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تاب مقاومت باقی نہ تھی۔ مسیحی غلبہ روز بروز مستحکم ہوتا جا رہا تھا۔ خود ابن خلدون کا خاندان اشبیلیہ سے ہجرت کر کے تونس میں آباد ہو گیا تھا۔ اسی طرح اندلسی شیوخ کے سینکڑوں خاندان سے جو عیسائی مقبوضات سے نکل نکل کر المغرب اور افریقیہ میں آباد ہو رہے تھے۔ ان کے اثرات افریقیہ کے طرز تعلیم پر براہ راست پڑے۔ چنانچہ تونس کے نظام میں اندلس کے نظام کا عکس اس تاریخی حادثے کا اثر مابعد ہے۔ جس کی بدولت اندلسی شیوخ مدتوں تونس والوں کے معلم رہے ہیں[2]

المشرق: ابن خلدون نے بلاد مشرقیہ کے نظام تعلیم کا بھی گہرا مطالعہ کیا۔ اگرچہ اندلس، المغرب اور مصر کی طرح ان علاقوں سے اس کا کوئی براہ راست تعلق نہ تھا۔ نہ اس نے یہاں کے مدرسوں میں پڑھا تھا اور نہ یہاں کی سیاست سے اس کا براہ راست یا بالواسطہ کوئی تعلق رہا۔ لیکن اس کے باوجود اس نے مشرقی نظام تعلیم کا تجزیہ کیا۔ اس کی اچھائی اور برائی کو پرکھا اور خود ایک نتیجہ مرتب کیا[3]

اُس وقت مشرق میں جب بچہ سن رشد کو پہونچتا تو اسے قرآن اور دین کے بنیادی اصول پڑھائے جاتے تھے۔ خطاطی کی تدریس کا انتظام ایک مختلف فن کی حیثیت سے بالکل علاحدہ تھا۔ اس کا نظام علاحدہ، اس کا طریق تدریس جداگانہ اور اس کے اصول و ضوابط مختلف۔ اس کی حیثیت ایک فنی کی تھی اور اسے ایک فن کی طرح پڑھایا جاتا تھا اور اسی لیے بچوں کے نصاب میں اس کا کوئی

۱؎ ابن خلدون مقال۔ المقدمہ۔ جلد سوم صفحہ ۳۰۲

۲؎ ایضاً

۳؎ ایضاً

مقام نہ تھا۔ لیکن اس سے یہ مراد لینا غلط ہوگا کہ بچوں کو لکھنا سکھایا ہی نہیں جاتا تھا۔ لکھنا تو سکھایا جاتا تھا مگر اس کی نوعیت مؤخرالذکر سے مختلف ہوتی تھی۔ اس وقت انہیں صرف صحیح طور پر لکھنا سکھا دیا جاتا تھا۔ اور اگر انھیں اس کا ذوق ہے اور ان کا مقصد خطاط بننا ہے تو آگے چل کر وہ کسی خطاط کی مدد سے اسے ایک فن کی حیثیت سے سیکھ سکتے تھے ۱۔

موازنہ

بلادِ اسلامیہ کے مختلف علاقوں کے تعلیمی نظام کا تجزیہ کرنے کے بعد ابن خلدون نے ان کا موازنہ کیا ایک ایک کے حسن و قبح کا جائزہ لیا۔ اچھائی کو سراہا۔ برائی کو برائی کہا اور پھر ایک ایسی راہ کی نشاندہی کی جو چلنے والوں کو منزل تک پہونچا سکتی۔

ابن خلدون کے نقطۂ نگاہ سے قرآن کی تدریس برحق۔ لیکن صرف تدریس قرآن ہی پر اپنی تمام تر توجہ کو مرکوز کر دینا صحیح نہیں۔ المغرب اور تونس کے نظامِ تعلیم میں ساری توجہ تدریس قرآن پر مرکوز ہوتی ہے۔ اس لیے طلبہ میں ادب کا صحیح ذوق پیدا نہیں ہوتا اور نہ زبان میں اتنا نکھار پیدا ہوتا ہے کہ یہ کہا جا سکے کہ اب ان میں لسانی ملکہ پیدا ہوگیا ہے۔ بلکہ اس سے یہ ہوتا ہے کہ طلبا کی لسانی صلاحیتیں بیدار نہیں ہونے پاتیں۔ ابن خلدون کے خیال میں تدریس قرآن سے طلبہ میں لسانی ملکہ پیدا ہی نہیں ہوسکتا۔ قرآن پڑھنے سے زبان پر قدرت حاصل نہیں ہوسکتی، اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ قرآن جیسی تحریر لکھنا انسان کے امکان میں نہیں۔ اور کوئی شخص اس کے اسلوب کا تتبع نہیں کرسکتا ۲۔ قرآن کا جاننا اور عربی لسانیات دو مختلف چیزیں ہیں، صرف قرآن پڑھ لینا کافی نہیں ہوتا۔ اس کی تفہیم اتنی ہی ضروری ہے اس کے علاوہ یہ ضروری نہیں کہ قرآن پڑھ لینے سے عربی لسانیات اور ادب پر بھی قدرت حاصل ہوجائے اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص قرآن تو پڑھ لیتا ہے لیکن اسے عربی زبان نہیں آتی ۳ اور یہ بھی ہوتا ہے کہ

---

۱ روزن تھال۔ المقدمہ۔ جلد سوم صفحہ ۳۰۲

۲ ایضاً صفحہ ۳۰۳

۳ ایضاً

بیانی اور لسانی دونوں میں وہ بہت پیچھے رہ جاتا ہے۔ اس میں لکھنے کی اہلیت پیدا ہوتی ہے اور نہ بولنے کی ؏۱

قرآن کے اس طریق تدریس کا جائزہ لینے کے بعد ابن خلدون نے مغربی اور افریقی طریق تدریس کا موازنہ کیا۔ اس نے تونس (افریقیہ) کے طلبہ کو مغربی طلبہ سے بیانی اور لسانی اعتبار سے نسبتاً بہتر پایا اس کے پیش نظر اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ تونس میں قرآن کی تدریس کے ساتھ ساتھ دوسرے علوم وفنون کی تدریس پر بھی تھوڑی بہت توجہ دی جاتی تھی۔ زبان سیکھنے کے سلسلہ میں قرآن کے علاوہ عربی ادب کے دوسرے سے بھی استفادہ کر سکتے تھے۔ اس طرح طلبہ میں عربی زبان کی ایک معمولی سی دست گاہ پیدا ہو جاتی تھی لیکن یہ دست گاہ اتنی معمولی ہوتی تھی کہ اس کی مدد سے کوئی اچھا یا منفرد اسلوب پیدا ہونا مشکل تھا ؏۲

المغرب اور الافریقیہ کے طریق تدریس پر ایک مفصل بحث کے بعد ابن خلدون نے اندلس کے طریق تدریس کا تقابلی جائزہ لیا۔ اندلس کے طریق تدریس کا نمایاں پہلو نصاب کا کثیر الفروع ہونا تھا۔ اس میں عربی زبان، نظم و نثر، انشا پردازی اور لسانیات کے اہم موضوع شامل تھے اندلسی طلبہ کو دینی علوم میں اتنی دست گاہ حاصل نہیں ہوتی تھی۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ اندلس والے قرآن اور احادیث کی تدریس پر اتنا وقت صرف نہیں کرتے تھے۔ وہ لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ ان کی یہ تعلیم خالص علمی اور ادبی تعلیم ہوتی تھی۔ اور اب اس میں یا انھیں ملکۂ تامہ حاصل ہو جاتا تھا۔ یا پھر ان کی یہ دست گاہ ناقص رہ جاتی تھی۔ ملکہ یا عدم ملکہ کا انحصار ثانوی اور ابتدائی تعلیم پر تھا بچے نے ابتدائی مدارج میں کس قسم کی تعلیم پائی ہے۔ ثانوی مدارج میں اس نے کیا کیا اور کس طرح پڑھا ؏۳

صحیح طریق تدریس

مختلف طریقہ ہائے تدریس کا جائزہ لینے کے بعد ابن خلدون کی نگاہیں اندلس کے طریق تدریس

؏۱ روزن تھال، المقدمہ۔ جلد سوم صفحہ ۳۰۲

؏۲ ایضاً

؏۳ ایضاً ص۳۰۳

مرکوز ہو جاتی ہیں ۔ اس کا یہ نظریہ علاقائی عصبیت یا کسی جذباتی لگاؤ پر قائم نہ تھا۔ یہ اس کے عقلی استدلال کا نتیجہ تھا۔ اگرچہ اس کے اپنے زمانے میں اندلس کا نظام تعلیم بھی سکرات کے عالم میں تھا اندلس میں مسلمانوں کی سیاسی گرفت ڈھیلی ہو چکی تھی اور رفتہ رفتہ وہ سارے علاقے جو عبدالرحمٰن، حکم اور منصور کے تابع فرمان تھے مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل کر عیسائیوں کی آزادیت میں جا رہے تھے وہ مرقع تھا جو ابن رشد، ابن طفیل، ابن باجہ۔ قاضی ابوبکر ابن العربی اور دوسرے مکاتب عہد کے رشحات فیض سے قائم و استوار رہی تھی۔ مذہبی جنون میں عیسائیوں کے علمی سرمائے کو نذر آتش کرتے جا رہے تھے۔ خود مسلمان آغاز یوں حال تھا کہ اب اس میں اسلاف کے علمی ورثے کی حفاظت کی اہلیت باقی نہیں رہ گئی تھی۔

ابن خلدون نے اس بگڑتے ہوئے نظام کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اس سے اس کی ترقیمی کا اندازہ لگایا۔ اپنے اس نظریے کی توجیہ کے لیے اس نے قدما کی تصنیفات کو کھنگالا اور جہاں جہاں سے کام کی باتیں ملیں ان سے استدلال کیا۔ اس سلسلے میں وہ سب سے زیادہ قاضی ابوبکر ابن العربی سے متاثر ہوا۔[1] اس نے اس کی کتاب الرحلۃ کا مطالعہ کیا اور اس میں سے کام کی باتیں اخذ کیں۔

ابن العربی نے مروجہ طریق تدریس کا جائزہ لیا۔ اس میں جو باتیں غیر ضروری معلوم ہوئیں انھیں ترک کر دیا اور نئے رجحانات کے پیش نظر جو چیزیں ضروری تھیں انھیں تجدد کا ایسا رنگ دیا کہ اب وہ پرانی نہیں، نئی معلوم ہونے لگیں۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ اس میں چند نئی چیزوں کا بھی اضافہ کیا ابن العربی نے عربی زبان (بالخصوص نظم) لسانیات اور ریاضی کو اپنے ترتیب نصاب میں فوقیت دی اس کے بعد اصول دین الاسلام فقہ وراثت احادیث وغیرہ کی باری آتی ہے۔[2]

اس طرح گویا ابن العربی کے خیال میں اس سے پہلے کہ کوئی اور علم پڑھایا جائے، زبان پر قدرت حاصل کر لینا ضروری ہے۔ اگر زبان پر مکمل دسترس حاصل ہو جائے تو دوسرے علوم کا پڑھنا آسان ہو جاتا ہے۔ ابن خلدون، ابن العربی کے اس نقطۂ نگاہ سے متفق ہے اور حق یہ ہے کہ تحصیل علم کے سلسلے میں

---

[1] طٰہٰ حسین۔ ابن خلدون (مترجمہ عبدالسلام ندوی)

[2] وہ زن تھال۔ المقدمہ۔ جلد سوم صفحہ ۳۰۷

اس سے زیادہ بہتر موقف اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ زبان پر قدرت حاصل ہونے سے پہلے قرآن کی تدریس ابن العربی کے خیال میں پڑھانے والوں کی ناسمجھی ہے[ع۱]۔ وہ بچوں کو شروع ہی میں وہ چیزیں پڑھانے کی کوشش کرتے ہیں جن کی تفہیم ان کے لیے مشکل ہو جاتی ہے۔ وہ قرآن کو سمجھتے نہیں لیکن انھیں قرآن پڑھایا جاتا ہے۔ اس سے ان کی رفتار ترقی رک جاتی ہے۔ اس وقت انھیں کچھ اور باتیں پڑھانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن ان کا وقت ایسے مشکل امور کی تشریح میں ضائع ہو جاتا ہے، جن کے سمجھنے کی اہلیت ابھی ان میں پیدا نہیں ہوتی۔ ابن خلدون نے ابن العربی کے اس نظریے کو لفظاً لفظاً اپنے مقدمے میں درج کیا ہے[ع۲] اور اس طریق کار کے اختیار کرنے کی تلقین کی۔

اپنے تعلیمی مبحث میں ابن خلدون نے ایک وقت میں ایک ہی کام میں ملکہ پیدا کرنے پر زور دیا ہے لیکن اگر طالب علم ذہین ہو اور وہ بیک وقت دو چیزوں میں ملکہ حاصل کر سکتا ہے تو ایسے طالب علم کو اس نے اس اصول سے مستثنیٰ قرار دیا ہے[ع۳]۔ اس کا یہ نظریہ بھی ابن العربی سے مستعار ہے، جس کا اس نے مقدمے میں خود اعتراف کیا ہے[ع۴]۔

ابن العربی کے اس طریق تدریس کو نہ صرف یہ کہ اس نے سراہا بلکہ اس نے اسے تدریس کا بہت ہی اچھا طریقہ قرار دیا۔ لیکن اسی سانس میں اس اندیشے کا بھی اظہار کر دیا کہ جب ایک بات رسم بن جاتی ہے تو اس رسم میں از خود ایک نئی قوت ہوتی ہے کہ حالات کو ایک نئے سانچے میں ڈھالنا مشکل ہو جاتا ہے۔ مروج طریقہ یہی ہے کہ قرآن کو سب سے پہلے پڑھایا جائے۔ اس کے بہت سے اسباب ہیں۔ بعض اسے محض حصول برکت کے لیے پڑھانا ضروری سمجھتے ہیں اور بعض ان چیزوں کے خوف سے جو جوانی میں بچوں کو متاثر کرتی ہیں اگر بچے جوانی کے اس گرداب میں پھنس گئے تو اس سے انھیں نقصان پہونچ سکتا ہے اور اس سے یہ بھی اندیشہ

ع۱ روزن تھال۔ المقدمہ۔ جلد سوم صفحہ ۳۰۴

ع۲ ایضاً

ع۳ ایضاً

ع۴ ایضاً

ہو سکتا ہے کہ وہ حصول علم ہی سے محروم رہ جائیں۔ اس کے علاوہ یہ بھی ممکن ہے کہ قرآن پڑھنے کا شوق ہاتھ سے نکل جائے تو پھر وہ اس نعمت سے بالکل ہی محروم ہو جائیں۔[1]

اس کا ایک سبب یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ بچپن میں والدین کے احکام قطعی اور حتمی ہوتے ہیں۔ گھریلو ماحول میں رہ کر انھیں جو کچھ سکھایا جائے وہ سیکھ لیتے ہیں۔ لیکن جب ان کی رگوں میں جوانی کا تناؤ پیدا ہوتا ہے تو وہ خود سر ہو جاتے ہیں۔ اور انھیں اکثر بری باتوں سے رغبت ہو جاتی ہے۔ اس لیے اس سے پہلے کہ یہ طوفان آئے اور اس رو میں سب کچھ بہا لے جائے۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر اسے قرآن پڑھا دیا جائے کہ اعمال صالح کی اسی وقت توقع ہو سکتی ہے۔ ان اسباب کے باوجود ابن خلدون قرآن کی تدریس کے لیے وہی وقت موزوں سمجھتا ہے، جب پڑھنے والے میں اس کی اہلیت پیدا ہو جائے اور اس ضمن میں وہ ابن العربی سے بے کم و کاست متفق ہے۔[2]

۱۔ روزنتھال۔ المقدمہ۔ جلد سوم صفحہ ۳۰۴

۲۔ ایضاً

بچے اور تفریح

ڈاکٹر عبدالرؤف

تفریح — ایک فطری شغل ہے جس کے لیے بچے ایک بے ساختہ کشش محسوس کرتے ہیں۔ کوئی بچہ ایسا نہیں ہے جسے تفریح اور کھیل کود میں شرکت پر آمادہ کرنے کے لیے کسی قسم کی کوئی محنت کرنا پڑتی ہو۔ تفریح ہر بچے کی نشو و نما کے لیے اشد ضروری ہے۔ عمر کے مختلف ادوار میں مختلف قسم کی تفریحیں اور کھیل بچوں کی دلچسپی کا باعث بنتے ہیں۔ موزوں تفریحوں اور کھیلوں میں شمولیت سے بچوں کی شخصیت بنتی ہے اور ان کا اخلاق اور کردار بہتر سانچوں میں ڈھلتے ہیں۔ اس کے برعکس اگر بچے تفریحوں سے بالکل محروم رہیں یا انھیں غلط قسم کی تفریحوں کی چاٹ پڑ جائے تو ان کی شخصیت اور اخلاق کے ناگوار سمتوں میں ڈھلنے کے امکان بڑھ جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر لچر فلمیں، آوارگی، جوا بازی، مزاحیہ گالی گلوچ وغیرہ خطرناک نوع کی تفریحوں کی چند ایک اقسام ہیں جو بچوں کی جذباتی اور معاشرتی صحت پر خصوصی طور پر ناگوار اثر ڈالتی ہیں۔ عین اسی قسم کی غلط تفریحیں بچوں میں جرائم پسندی اور طرح طرح کی خلاف معاشرہ حرکات کا سب سے بڑا سبب بھی ہیں۔ اسی طرح تفریحوں کا بالکل ہی میسر نہ آنا بھی مساوی طور پر خطرناک ہے: بچوں میں توانائی اور حرکت کا بے پناہ ذخیرہ موجود ہوتا ہے۔ جسے اخراج کے مناسب مواقع میسر نہ آئیں تو وہ غلط سمتوں کی طرف بھٹک جاتے ہیں۔ کھیل اور تفریح بچے کی توانائی اور حرکت کے جذبوں کو معقول سمتیں دے کر نہ صرف ان کی تشفی کا باعث بنتے ہیں بلکہ ان کی بہتر نشو و نما کا سبب بھی بنتے ہیں۔

تفریحوں کے اہتمام کی ذمہ داری

بچوں کے لیے صحت مند تفریحوں کے اہتمام کی ذمہ داری ہم سب پر عائد ہوتی ہے۔ والدین کی حیثیت سے ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنی اپنی استطاعت کے مطابق گھروں میں بچوں کے لیے ہر قسم کی موزوں تفریحوں اور دلچسپیوں کے سامان مہیا کریں۔ تقریباً ہر ننھا بچہ کھلونے پسند کرتا ہے۔ چھوٹے بچوں کے لیے

سب کھلونوں کا اہتمام کرنا تمام والدین کا بنیادی فرض ہے۔ ننھے بچوں کے لیے کھلونے وہی اہمیت لیتے ہیں جو خوراک اور لباس کو حاصل ہے۔ بڑی عمر کے بچوں کے لیے کیرم بورڈ، لڈو، تعلیمی تاش اور طرح طرح کی دوسری اندرون خانہ کھیلیں مفرح اور منفعت بخش ثابت ہوتی ہیں۔

گھر کے جذباتی ماحول کو مزید خوش گوار بنانے کے لیے والدین کو خود بھی بچوں کے کھلونوں، تفریحی مشاغل اور کھیل کود میں دل چسپی لینی چاہیے۔ انھیں دن میں ایک آدھ بار بچوں کے ساتھ مل کر کسی نہ کسی تفریحی شغل میں تھوڑی بہت شمولیت ضرور کرنی چاہیے۔ مثال کے طور پر آنکھ مچولی، لڈو، کیرم بورڈ، تعلیمی تاش وغیرہ۔ والدین اور بچے اکٹھے مل کر بخوبی کھیل سکتے ہیں۔ اس طرح کے تفریحی مشاغل سے بچے نہ صرف لطف اندوز ہی ہوتے ہیں، بلکہ ان میں اور والدین میں باہمی سمجھ اور تعاون کی نئی نئی راہیں پیدا ہوتی ہیں۔ بچوں کی شخصیت اور اخلاق کی نشو و نما اور ایک خاندان کی کامیابی کے لیے بے حد ضروری ہیں۔

تعاون اور رفاقت بچے کی شخصیت پر بہت خوش گوار اور بے انتہا تعمیری اثر ڈالتے ہیں۔ اگر ممکن ہو تو والدین کو اس بات کی کوشش بھی کرنی چاہیے کہ بچے اپنے مدرسہ اور محلّے کے پسندیدہ ہمجولیوں کو اپنے گھر بلائیں اور ان سے مل کر اندرون خانہ تفریحات سے لطف اندوز ہوں۔ دوسروں سے مل کر تفریحی اور کھیل کود میں شریک ہونے سے بچوں کی جسمانی، جذباتی اور معاشرتی صحت پر بہت خوش گوار اثر پڑتا ہے جو انھیں بہتر، صحت مند اور پُر وقار شہریوں کی صورت پروان چڑھنے میں بہت آڑے آتا ہے۔

والدین کی بہانہ سازی

ہمارے ہاں اکثر والدین بچوں کو تفریحی سہولتیں بہم پہنچانے اور اُن سے مل کر گاہے گاہے تفریح کرنے کے اہم فریضہ سے عموماً منحرف پائے جاتے ہیں۔ چناں چہ اس بنیادی فریضہ کی عدم ادائیگی کے سلسلے میں طرح طرح کے غیر معقول اور بسا اوقات مضحکہ آمیز بہانے پیش کیے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر بعض والدین یہ عذر لنگ پیش کرتے ہیں کہ بعمر رغبت کی وجہ سے وہ بچوں کی تفریحوں میں خود شریک نہیں ہو سکتے۔ بسا اوقات والدین یہ کہتے بھی سنے جاتے ہیں کہ صاحب! اب اس عمر میں بھلا ہمیں بچوں کی تفریحوں میں کیا دل چسپی ہو سکتی ہے؟ کچھ لوگ غربت کا بہانہ بنا کر بچوں کو تفریحیں مہیا کرنے کے

ذریعہ سے بالکل مستغنی قرار دیے جانے کی کوشش کی کرتے ہیں۔

اس قسم کے تمام دور تفریح کی اہمیت اور بچوں کی تفریحات میں والدین کی شمولیت کی غرض و غایت سے متعلق طرح طرح کی کج فہمیوں پر مبنی ہوتے ہیں۔ اکثر والدین شاید یہ حقیقت سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے کہ بچوں کے لیے معقول تفریحوں کے اہتمام میں کچھ زیادہ وقت صرف نہیں ہوتا۔ اور یہ کہ اس سمت میں ذرا سی محنت، اور تھوڑے سے غور و فکر کے جو خوشگوار نتائج نکلتے ہیں اُن کا اندازہ لگانا ممکن نہیں۔ انہیں شاید اس امر کا اندازہ نہیں کہ اگر اس ذریعہ سے غفلت برتی جائے تو بچوں کی زندگی طرح طرح کی الجھنوں کی نذر ہو جانے کا احتمال بڑھ جاتا ہے۔ بچوں کی الجھنیں انجام کار والدین کی پریشانی، زیادہ توجہ اور مسلسل پریشانی کا باعث بن جاتی ہیں۔

اسی طرح غربت کا بہانہ بنا کر بچوں کی ہر قسم کے تفریحی سامان اور مشغلوں سے محروم کر دینا بھی قطعی غیر معقول ہے۔ بچوں کی روزمرہ تفریحوں اور دلچسپیوں پر عموماً زیادہ رقم خرچ نہیں آتی۔ مثال کے طور پر تعلیمی تاش ہی لے لیجیے۔ تاش کا ایک اچھا خاصہ سیٹ چند آنوں میں خریدا جا سکتا ہے۔ اور پھر متواتر کئی سال تک اس سے کام لیا جا سکتا ہے۔ متعدد تفریحیں ایسی بھی ہیں جن کے سامان بے حد ارزاں دستیاب ہونے کے علاوہ مزید سستے داموں گھر پر بھی بنائے جا سکتے ہیں۔ اور اگر والدین پان سگریٹ چائے اور سینما وغیرہ پر اپنا ذاتی خرچ کم کر دیں تو وہ اس بچی ہوئی رقم سے بچوں کے لیے متعدد ایسے تفریحی سامان بھی مہیا کر سکتے ہیں جو قدرے مہنگے ملتے ہیں۔

تفریح اور مدرسہ

مدرسہ کا کام بچوں کو نصاب پڑھانے یا امتحان پاس کروانے تک ہی محدود نہیں ہے۔ تفریح اور کھیل کود بھی بچے کے لیے اسی قدر ضروری ہے جس قدر کہ نصابی تعلیم۔ تفریح میں باقاعدہ شمولیت سے بچوں میں نصابی تعلیم کو زیادہ ہمت اور محنت سے سیکھنے کا سلیقہ پیدا ہو جاتا ہے جو ان بچوں میں عموماً کم ہوتا ہے جنھیں مناسب تفریحوں میں شمولیت کے مواقع میسر نہ آئے ہوں۔

مقام تعجب ہے کہ ہمارے مدارس میں تفریح کی اہمیت کو ابھی تک پوری طرح تسلیم نہیں کیا گیا۔

اساتذۂ کرام ابھی تک تفریح اور کھیل کود کی بنیادی اہمیت کے منکر معلوم ہوتے ہیں۔ چنانچہ ہمارے اکثر مدرسوں میں طلبہ کی بھاری اکثریت مناسب تفریحوں اور دلچسپیوں میں شمولیت سے یکسر محروم رہ جاتی ہے۔ جس کا ایک نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مدرسہ کی زندگی بچوں میں راحت، مسرت، کھلاڑی پن اور وفا کے جذبے پیدا کرنے سے قاصر رہتی ہے۔ جو فقط منظم تفریحوں اور دلچسپ کھیلوں ہی سے پیدا ہو سکتے ہیں۔

اس پہلو سے دیکھا جائے تو ہمارے مدرسوں کے نظم و نسق پر فوری نظرثانی کی اشد ضرورت ہے مدرسہ کی تعلیم کو صحیح طور پر کامیاب اور مؤثر بنانے کے لیے تفریحی مشاغل کو نصابی تعلیم کے برابر کا رتبہ دیا جانا چاہیے۔ ہر مدرسہ میں منظم تفریحوں، اجتماعی کھیلوں، تمدنی سرگرمیوں، سکاؤٹنگ، گائیڈنگ، مباحثوں، مشاعروں اور طرح طرح کی دیگر ذہنی اور جسمانی تفریحوں کا اس قدر معقول اہتمام ہونا چاہیے کہ ہر بچہ ان سے اچھی طرح لطف اندوز ہو سکے۔ تفریحوں اور کھیلوں کو مخصوص ٹیموں یا گروہوں کی اجارہ داری نہیں بننے دیا جانا چاہیے۔ بلکہ کوشش یہ ہونی چاہیے کہ مدرسہ کی ساری آبادی ان میں مساوی طور پر شریک ہو سکے۔

اگر واقعیت پسندانہ طریق سے دیکھا جائے تو کسی مدرسہ کی اصل کامیابی کا راز اس کے امتحانی ریکارڈ پر ہی منحصر نہیں ہے۔ کسی مدرسہ کی اصل کامیابی اس بات میں مضمر ہے کہ اس میں بچوں کی تفریحی سرگرمیوں کے لیے کس قسم کے سامان کس حد تک مہیا کیے گئے ہیں اور مدرسہ کے کتنے فی صد بچے ان تفریحی سہولتوں سے فی الواقع مستفیض ہوتے ہیں۔

غیر معمولی بچے اور تفریح

اس حقیقت میں شک و شبہ کی قطعی گنجائش نہیں کہ تفریح ہر قسم کے بچے کے لیے بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔ مگر غیر معمولی بچوں کی چند اقسام ایسی ہیں جن کے لیے تفریح کا اہتمام خصوصی طور پر ضروری ہے۔ اس قسم کے بچوں کی چند مثالیں درج ذیل ہیں:

(۱) یتیم بچے

(۲) مجرم بچے

(۳) مریض بچے

(۴) معذور بچے

یتیم بچوں کے لیے تفریح کا خصوصی اہتمام

انسانیت کا بنیادی تقاضا یہ ہے کہ ہر اس انسان کی سرپرستی کی جائے جس کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہ ہو۔ انسانیت کے عام تقاضوں کے علاوہ قرآن شریف اور احادیث نبوی میں بھی یتیموں کی بہتری اور دیکھ بھال سے متعلق متعدد احکام موجود ہیں۔ ان سب پہلوؤں سے دیکھا جائے تو ہم پر اس سمت میں خصوصی توجہ لازم ہو جاتی ہے۔ مگر کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ ہمارے یتیم خانے ہماری سخاکی اور غفلت کا شکار ہو چکے ہیں۔

ہمارے اکثر یتیم خانے ایسے اداروں کی صورت اختیار کر چکے ہیں جنھیں یاس، افسردگی اور محرومیت کو چلتے پھرتے دیکھا جا سکتا ہے۔ یتیم خانوں کے ناظمین اپنے گھروں میں تو بچوں کے لیے تفریح اور دل جسپی کا ہر ممکن سامان مہیا کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرتے۔ مگر کسی یتیم خانہ میں بھی بچوں کی تفریح کے سامان کا کوئی نام و نشان تک بھی نظر نہیں آتا۔ یتیم بچوں کو عام بچوں کی نسبت بلکہ زیادہ تفریح اور کھیل کود کی فرصت ہوتی ہے۔ کیوں کہ ان کی جذباتی زندگی کو ایک ایسی ناقابلِ تلافی ٹھیس پہنچی ہوتی ہے، جس کی شدت کو کم کرنے کے لیے کھیل کود اور تفریح اشد ضروری ہے۔ یتیم خانوں کے افسردہ اور یاس زدہ ماحول کو خوش گوار بنانے اور ان میں مقیم بدنصیب بچوں کی زندگی سنوارنے کے لیے مناسب تفریحوں، منظم کھیلوں اور تمدنی سرگرمیوں کا خصوصی اہتمام بے حد ضروری ہے۔ ناظم یتیم خانہ اور اردگرد کی حساس آبادی اگر اس سلسلہ میں ایک دوسرے کا تعاون کریں تو تمام یتیم خانوں میں تفریحی سرگرمیوں کا خاطر خواہ اہتمام بہت آسانی سے ہو سکتا ہے۔

مجرم بچوں کی تفریح کا اہتمام

ہمارے معاشرے میں بچوں کی ایک خاصی تعداد ایسی بھی ہے جو طرح طرح کی خلاف قانون حرکات کی پاداش میں بورسٹل جیلوں میں مقید کر دی جاتی ہے۔ بورسٹل جیل ایک ایسا ادارہ ہے جہاں صرف کم سن مجرموں کو مقید رکھا جاتا ہے اور قید کے دوران میں ان کی تعلیم و تربیت اور اصلاح کی کوشش کی جاتی ہے۔ بورسٹل میں مقید بچوں کی تعداد کا اندازہ اس امر ہی سے لگایا جا سکتا ہے کہ فقط لاہور کی بورسٹل ہی میں

اس وقت ڈیڑھ ہزار کے لگ بھگ بچے مختلف سزائیں بھگت رہے ہیں۔

بچے جرم کیوں کرتے ہیں؟ ابتدائی عمر میں ارتکاب جرم کے لیے بے شمار اسباب ذمہ دار ہیں۔ جدید جرمیاتی اعداد و شمار شاہد ہیں کہ مجرم بچوں کی اکثریت ان بچوں پر مشتمل ہوتی ہے جنھیں یا تو مناسب تفریحیں بالکل میسر نہیں یا وہ غلط اور ناقص تفریحوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس قسم کے بچے خلاف معاشرہ اور خلاف قانون حرکات میں راحت اور لطف کے متلاشی بن جاتے ہیں جو بصورت دیگر انھیں میسر نہیں آتا۔

جس طرح صغر سنی میں ارتکاب جرائم کے اسباب بھی بے شمار ہو سکتے ہیں۔ اسی طرح علاج کے لیے بھی متعدد طریقے استعمال ہو سکتے ہیں۔ بہرکیف بچوں کے جرائم کے علاج کا ایک تیر بہدف علاج تفریح اور کھیل کود بھی ہے۔ مجرم بچوں کو راہ راست پر لانے کے لیے بورسٹل اداروں میں معقول تفریحی مشاغل کا عام کرنا بہت ضروری ہے۔ بورسٹل کی زندگی میں مجرم بچوں کے لیے جس قدر زیادہ تفریحی مشاغل اور کھیل کود کے سامان مہیا کیے جائیں اُن کا اخلاق اور کردار اسی قدر سنورتا ہے۔ منظم تفریحیں اور کھیل مجرمانہ رجحانوں پر ضرب کاری کا کام کرتے ہیں۔ کوشش یہ ہونی چاہیے کہ بورسٹل میں کھیلوں کی زیادہ سے زیادہ ٹیمیں بنیں اور اگر ممکن ہو تو ان ٹیموں کے باہر کی عام ٹیموں کے ساتھ مقابلے کروائے جائیں۔

علاج کے علاوہ کھیل اور تفریح مجرمانہ رجحانوں کی روک تھام کے لیے بھی استعمال کیا جا سکتا ہے اگر بچوں کو گھر، مدرسہ اور عام ماحول میں معقول تفریح اور کھیل کود میسر آ جائے تو ان کا ذہن ادھر ادھر بھٹکنے سے بچ جاتا ہے۔ خلاف معاشرت اور خلاف قانون خیالات ان سے دور رہتے ہیں اور مہذب اور قانون کا احترام کرنے والے شہریوں کی صورت پروان چڑھتے ہیں۔

مریض بچے اور تفریح

ہسپتالوں میں ان بچوں کے لیے تفریح کے خصوصی اہتمام کی ضرورت بھی ہے جو مختلف جسمانی بیماریوں کی وجہ سے زیر علاج ہوں۔ مریض بچوں کے لیے ایسی تفریحوں کا اہتمام بہت ضروری ہے۔

جن میں جسمانی محنت بہت کم کرنا پڑتی ہو۔ علاج کے دوران میں مناسب تفریحوں کے میسر آجانے سے تمام مریض بچوں کو مسرت اور راحت کا موقع حاصل ہو جاتا ہے بلکہ ان کی بیماری کا علاج بھی نسبتاً جلدی ہو جاتا ہے۔

اسی طرح ذہنی شفاخانوں میں زیرِ علاج بچوں کی تفریح کا اہتمام بھی بہت منفعت بخش ثابت ہوتا ہے۔ بچوں کی اکثر ذہنی بیماریاں خالص جذباتی اسباب کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ انسان کی جذباتی زندگی کی بہتری کے لیے تفریح اور کھیل کود اشد ضروری ہے، بلکہ بچوں کی متعدد ذہنی بیماریاں ایسی بھی ہیں جن کا علاج فقط کھیل ہی سے کیا جاتا ہے۔ علاج کے اس طریقہ کو علاج بذریعہ کھیل کہتے ہیں۔

تفریح اور کھیل کود کو بھی ذہنی اور جسمانی بیماریوں کے علاج کے علاوہ حفظِ ما تقدم کے طور پر بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ جن بچوں کو معقول تفریحی مشاغل اور اجتماعی کھیلوں میں جی بھر کے شامل ہونے کے مواقع میسر رہتے ہیں، ان کی زندگی میں ان بیماریوں کے لاحق ہونے کا خدشہ تقریباً ختم ہو جاتا ہے۔

معذور بچے اور تفریح کا اہتمام

کئی بچے ابتدائی عمر ہی سے کسی جسمانی نقص کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اندھے، بہرے، لنگڑے، لولے اپاہج بچے۔ معذور بچوں کی چند مثالیں ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے بچے عام بچوں کے ساتھ مل کر تفریح اور کھیل کود سے لطف اندوز نہیں ہو سکتے۔ ہم انھیں تفریحی سرگرمیوں سے بالکل محروم بھی نہیں کر سکتے ہیں کیونکہ برائی کے خلاف معاشرت سمتوں کی طرف پھیل جانے کے امکان بڑھ جاتے ہیں۔

اس کے علاوہ معذور بچوں کو اپنی جسمانی صحت اور توانائی برقرار رکھنے کے لیے بھی کسی نہ کسی کی تفریح اور کھیل کود کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لیے ہسپتالوں اور گھروں کو معذور بچوں کے لیے اس قسم کی مخصوص تفریحوں اور کھیلوں کا اہتمام کرنا اشد ضروری ہے۔ جو ان کی انفرادی معذوریوں کے لیے موزوں ہوں۔

یہ امر کس قدر افسوس ناک ہے کہ ہمارے ہاں بچوں کی اس نوع کی تفریحی سرگرمیوں سے متعلق معاشرہ ایک ایسی غفلت اور فرض ناشناسی کا ثبوت دے رہا ہے جو بہت تشویش ناک ہے۔ کسی قسم کی کوئی بھی تفریح میسر نہ آنے کی وجہ سے ہمارے اکثر معذور بچے یاس اور محرومیت کے بوجھ تلے دبے رہتے ہیں کئی معذور بچے گداگری اور جرم کو بطور رد عمل جیسی یا فن کے بھی اختیار کر لیتے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ہمیں اپنی

غفلت کی وجہ سے کافی جانی اور مالی نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ معذور بچوں کے لیے چند چھوٹی موٹی تفریحوں کے اہتمام سے بے شمار افراد کی زندگی بھی سنور سکتی ہے اور معاشرہ بھی طرح طرح کے نقصان سے بروقت بچایا جا سکتا ہے۔

بچوں کی تفریحوں کے لیے ملی جہاد کی ضرورت

وطن کے بچوں کی تفریحی سرگرمیوں کا جائزہ لیا جائے تو یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوتی ہے کہ ہمارے بچوں کی ایک بہت ہی حقیر اقلیت کو مناسب تفریحوں میں شمولیت کا موقع ملتا ہے۔ ہر شہر اور ہر گاؤں میں بچوں کی ایک بھاری اکثریت ایسی تفریحوں اور کھیلوں سے یک سر محروم رہتی ہے جو ان کا پیدائشی حق ہے۔ تفریح اور کھیل میں معقول شمولیت محروم رہنے کی وجہ سے بچے اخلاق اور شخصیت کی متوازن نشوونما سے بھی محروم رہ جاتے ہیں۔ اکثر تفریحوں کے سامان مہنگائی، کھیلوں کے میدانوں کی کمی، بچوں کے تفریحی اداروں کلبوں اور مرکزوں کا فقدان، تفریح کی اہمیت سے متعلق اکثر والدین اور اساتذہ کی غفلت اور لاعلمی اس بات کی غمازی کرتے ہیں کہ ہم بچوں کی نشوونما کے اس اہم ترین پہلو کو کس قدر سنگدلی سے نظر انداز کیے ہوئے ہیں۔

بچوں کے لیے مناسب تفریحیں اور کھیل کود کے سامان مہیا کرنا کسی خاص فرد یا ادارہ ہی کی اجارہ داری نہیں ہے۔ تفریحی اہتمام کی ساری ذمہ داری، حکومت، والدین، اساتذہ، یا معاشرتی کارکنوں پر ہی عائد نہیں ہوتی ہے۔ بلکہ یہ ایک ایسا اہم ملی فریضہ ہے جس میں حساس شہری کو بڑھ چڑھ کر حصہ لینا چاہیے۔ ہر فرد اور ہر گروہ کو اپنی اپنی استطاعت کے مطابق تفریحوں اور کھیلوں کو عام کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کرنی چاہیے۔

بچوں کو جائز اور صحت مند تفریحوں اور کھیلوں میں مناسب شمولیت سے محروم کر دینا ایک ایسا سنگین معاشرتی گناہ ہے جو نہ صرف بچوں کی نشوونما پر ہی ناگوار اثر ڈالتا ہے۔ بلکہ اس سے سارے معاشرہ کو بھی طرح طرح کے خمیازے بھگتنے پڑتے ہیں۔ بچہ معاشرہ کی خشت اول ہے۔ اور خشت اول کی صحیح اور پائدار ساخت کے لیے تفریح اور کھیل کود لازمی ہے۔ تفریحوں اور کھیلوں کے اہتمام کے کام کو ایک ایسے ملی جہاد کی صورت دی جائے جس میں ہر فرد، ہر خاندان اور ہر ادارہ اپنا اپنا حصہ پوری فرض شناسی اور تعمیری سلیقہ سے ادا کرے۔

ذرّے
یعنی
ایٹم کی کہانی

عزیز احمد ——— مسلسل نمبر

ذرّے کی سیر

اب تک ذرّے کے متعلق کافی کچھ کہا جا چکا ہے۔ مادے کا یہ ٹکڑا اتنا چھوٹا ہے کہ دکھائی نہیں دے سکتا۔ آخر یہ کتنا چھوٹا ہے؟ اس کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ اگر کوئی شخص ۱۶ سے لے کر آج تک ذرّے گن گن کر ڈھیر لگاتا رہتا تو یہ سارا ڈھیر ایک پن کے سر پر سما جاتا۔

اتنی ننھی سی چیز کو چیر کر اس کے سینے کے اندر کا حال معلوم کرنا دیکھنے میں ناممکن تھا۔ فطرت نے اپنا ایک بہت بڑا بھید ذرّے کے سینے میں چھپا رکھا تھا۔ جب سے دنیا بنی ہے اس بھید کی کسی کو خبر نہ ہوئی تھی۔ انسان اب اس بات پر تلا بیٹھا تھا کہ فطرت کے اس سب سے بڑے بھید کے چہرے پر سے پردہ اٹھا کر رہے گا۔

ذرّے کے متعلق یہ پتہ چل گیا تھا کہ اس کا کچھ حصہ الیکٹرونز پر مشتمل ہے۔ سائنس دانوں نے بڑی محنت سے الیکٹرون کے حجم کی پیمائش کی۔ اس کا حجم اتنا چھوٹا نکلا کہ انسانی ذہن اسے آسانی سے سمجھ نہیں سکتا۔ تمام چیزوں میں سب سے ہلکا ذرّہ ہائیڈروجن کا ہے۔ الیکٹرون کا حجم ہائیڈروجن کے ذرّے سے بھی ۱۸۳۰ گنا چھوٹا ثابت ہوا!

غرض الیکٹرون کے متعلق یہ ثابت ہو گیا کہ مادے کا کوئی اس کے وجود سے خالی نہیں۔ یہ ننھی برقی قوت کا ایک بے حد چھوٹا قطرہ ہے۔ جب الیکٹرونز کی فوج کسی تاروں میں سے اڑتی ہوئی گذرتی ہے تو اسے بجلی کی رو پکارا جاتا ہے۔ ان کی رفتار کا یہ حال ہے کہ ۱۰۰ وولٹ کے بجلی کے لیمپ میں سے ہر سیکنڈ میں

کروڑوں کھرب الیکٹرون گذر جاتے ہیں۔

سائنس الیکٹرون کے متعلق کافی کچھ معلوم کر چکی تھی۔ اب وہ ذرّے کے دوسرے حصوں کا حال معلوم کرنا چاہتی تھی۔ ایک بات ظاہر تھی۔ وہ یہ کہ الیکٹرون منفی بجلی کے ایک ننھے قطرے کا نام ہے۔ مگر ذرہ برقی طور پر غیر جانبدار ہوتا ہے یعنی نہ منفی نہ مثبت۔ اس سے صاف پتہ چلتا تھا کہ کسی ذرّے میں جتنے الیکٹرون (منفی بجلی کے قطرے) ہوں گے اس میں اتنے ہی مثبت بجلی کے قطرے بھی موجود ہونے چاہئیں کیوں کہ منفی اور مثبت بجلی اگر برابر مقدار میں موجود ہو تو نتیجہ غیر جانبداری کی شکل میں نکلا کرتا ہے۔

اب ذرّے کے اندر مثبت بجلی کے حصہ کی تلاش شروع ہوئی۔ پہلے خیال یہ تھا کہ منفی بجلی کے قطروں یعنی الیکٹرونز کو چھوڑ کر ذرے کا باقی سارا حصہ مثبت بجلی کے قطروں سے بنا ہے۔ اس خیال کو غلط یا درست ثابت کرنے کی بظاہر کوئی صورت نہ تھی کیوں کہ ذرّے جیسی ننھی چیز کے اندر کون جھانک سکتا ہے۔ مگر آخر کار سائنس دانوں نے اس مشکل کا بھی حل ڈھونڈ نکالا۔

سائنس دانوں نے دیکھا کہ فطرت میں یورانیم ایک ایسا عنصر ہے جس میں سے ہر وقت روشنی کی شعاعیں نکلتی رہتی ہیں۔ یہ شعاعیں کئی طرح کی ہیں۔ ان میں سے ایک قسم الف (ا) شعاعوں کی ہے ان شعاعوں کی رفتار کا یہ حال ہے کہ جتنی دیر میں آپ یہ فقرہ ختم کریں اس سے پہلے وہ ساری دنیا کے گرد چکر لگا سکتی ہیں۔ ان عجیب و غریب شعاعوں سے ذرے کے مرکزی حصّے کو نشانہ بنایا گیا۔ تجربوں سے پتہ چلا کہ ذرّے کا بڑا حصّہ خالی پڑا ہے۔ اس کے عین درمیان میں مثبت بجلی کا ایک بے حد چھوٹا سا قطرہ موجود ہے۔ یہ فی الحقیقت ذرے کا جوہر تھا۔ سورج کی قوت ذرے کے اسی جوہر میں بند تھی۔

جوہر کی جسامت اتنی چھوٹی نکلی کہ انسانی ذہن کے لیے اس کا تصوّر کرنا بھی مشکل ہے، ذرّے کی ساری

جسامت کے مقابلے میں اس کے جوہر کی جسامت کروڑوں گنا چھوٹی ہے۔ اتنی چھوٹی کہ اگر ذرّے کو اڑھائی لاکھ مربع میل رقبے کا ایک ملک خیال کر لیا جائے تو جوہر کی جسامت صرف انگوروں کے ایک گچھے کے برابر ہو گی۔

جب سائنس نے آخر کار ذرّے کے سینے کو چیر کر دیکھا تو پتہ چلا کہ یہ بذات خود ایک دنیا ہے۔ اس کے درمیان میں جوہر ہے جس کے اندر سورج کی عجیب و غریب قوت بند ہے۔ جس طرح سورج کے گرد زمین اور دوسرے سیارے گھومتے ہیں بالکل اسی طرح الیکٹرون جوہر کے گرد گھومتے ہیں۔ ہر ذرّے کے جوہر میں مثبت بجلی کے اتنے ہی قطرے موجود ہیں جس قدر الیکٹرون اس کے گرد گھوم رہے ہوں بجلی کے مثبت قطروں کو پروٹونز کا نام دیا گیا۔

ہم پہلے دیکھ آئے ہیں کہ ہر مفرد کے ذرّے دوسرے ہر مفرد کے ذرّوں سے الگ قسم کے ہیں۔ فطرت میں کل ۹۲ مفردات پائے جاتے ہیں۔ اس لیے بنیادی ذروں کی بنیاد بھی ۹۲ ہے۔ یہ گویا ۹۲ قسم کی اینٹیں ہیں جن سے خدا نے دنیا کا کارخانہ تعمیر کیا ہے۔ بنیادی ذرّوں کا باہمی اختلاف پروٹونز کی تعداد کی وجہ سے ہے۔ مثلاً سیسے میں پروٹونز کی تعداد ۸۲ ہے اور سونے میں ۷۹ کیمیاگر صدیوں کی لگاتار کوشش سے اس قابل نہ ہو سکے کہ سیسے میں سے تین پروٹونز نکال کر اسے سونے میں بدل دیں۔

جوہر میں پروٹونز کے علاوہ ایک اور چیز بھی موجود ہوتی ہے یہ ہیں نیوٹرونز۔ مادے کے ان ننھے ریزوں کو یہ نام اس لیے دیا گیا ہے کہ وہ منفی بجلی رکھتے ہیں اور نہ مثبت بجلی، بلکہ بالکل غیر جانبدار ہیں۔

اب سائنس نے مختلف عناصر کو ان کے جوہر کی مناسبت سے نام دیے ہیں۔ جوہر میں مثبت بجلی کے جتنے قطرے یعنی پروٹون ہوں وہی ہندسہ اس مفرد کا نام ہے۔ مثلاً نائٹروجن کے جوہر میں سات پروٹون ہیں۔ اور آکسیجن کے جوہر میں آٹھ۔ ہائیڈروجن کا ذرہ باقی تمام ذروں سے ہلکا ہے۔ اس کا جوہر صرف ایک پروٹون پر مشتمل ہے اس لیے اس کے گرد صرف ایک الیکٹرون چکر کاٹتا ہے۔

ذرّے میں پروٹونز کے علاوہ اکثر اوقات نیوٹرونز بھی موجود ہوتے ہیں۔ پروٹونز اور نیوٹرونز کے ملانے سے جو ہندسہ حاصل ہوتا ہے وہ اس مفرد کا جوہری وزن کہلاتا ہے۔ ذیل میں چند مشہور مفردوں کے جوہری نام اور وزن دیے جاتے ہیں:

(صفحہ ۶۸۳ پر ملاحظہ ہو)

جوہری نام	مفرد	پروٹونز	نیوٹرونز	جوہری وزن
۸	آکسیجن	۸	۸	۱۶
۲۶	لوہا	۲۶	۳۰	۵۶
۷۹	سونا	۷۹	۱۱۸	۱۹۷
۹۲	یورانیم	۹۲	۱۴۶	۲۳۸

اس سلسلے میں ایک بڑی عجیب بات یہ ہے کہ بعض مفرد ایسے ہیں جن میں سے روشنی کی شعاعیں نکلتی رہتی ہیں۔ اس طرح روشنی خارج ہونے سے ان کے پروٹون آہستہ آہستہ گھس گھس کر تعداد میں کم ہو جاتے ہیں اور ان کی تعداد کم ہوتے ہی مفرد وہ پہلا مفرد نہیں رہتا۔ بلکہ ایک اور مفرد بن جاتا ہے مثلاً ۹۲ یورانیم شعاعیں خارج کرتے کرتے ہیں آخر کار ۸۸ ریڈیم بن جاتا ہے۔ اس پر بھی شعاعوں کا نکلنا بند نہیں ہوتا حتیٰ کہ ریڈیم ۸۲ سیسہ بن کر رہ جاتا ہے۔ اب اس میں سے شعاعیں نکلنا بند ہو جاتی ہیں اگر کسی طرح سے اس کے جوہر میں سے تین پروٹون اور کم ہو جاتے تو یہی سیسہ ۷۹ سونا بن جاتا۔

ان دلچسپ انکشافوں نے انسان کو یقین دلایا کہ فطرت کا سب سے بڑا بھید ذرّے کے سینے میں چھپا ہے۔ پس انسان اس بھید کے چہرے سے پردہ اٹھانے کے درپے ہو گیا اور آخر وہ اس مقصد میں کامیاب ہو گیا۔

جوہری قوت کا حال بیان کرنے سے پہلے یہ بتا دینا دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا کہ ذرّے کی دنیا پر قابو پا کر انسان کئی عجیب و غریب کرشمے پیدا کرنے کے قابل ہو گیا ہے۔ ۱۹۱۹ء میں ایک برطانوی سائنس داں نے ۷ نائٹروجن کے جوہر میں ایک اور پروٹون گاڑ کر اسے ۸ آکسیجن میں تبدیل کر دیا۔ اس کے کوئی بارہ تیرہ سال بعد امریکہ کے ایک سائنس داں نے ایک مفرد کے جوہر میں سے ایک پروٹون اڑا کر اسے ایک مختلف مفرد میں بدل دیا۔ ان کامیابیوں نے جدید انسان کو اس قابل بنا دیا ہے کہ وہ فطرت کے پیدا کئے ہوئے ۹۲ مفردوں میں نئے مفردوں کا اضافہ کرے۔ سائنس اب تک کچھ نئے مفرد بنا چکی ہے اور آئندہ بناتی رہے گی۔

ہم نے دیکھا کہ فطرت نے دنیا کا کارخانہ تعمیر کرنے کے لیے ۹۲ قسم کی خوردبینی اینٹوں سے کام لیا ہے۔ یہ عناصر یا مفردات کہلاتے ہیں۔ ان میں سے سب سے ہلکی اینٹیں ہائیڈروجن کی تعمیر میں صرف ہوئی ہیں کیوں کہ ہائیڈروجن کے جوہر میں صرف ایک پروٹون ہے جس کے گرد ایک الیکٹرون گھوم رہا ہے۔ اس کے مقابلے میں یورانیم ہے جس کا ذرہ سب سے زیادہ وزنی ہے۔ اس کے جوہر میں ۹۲ پروٹون ہوتے ہیں اور عموماً ۱۴۶ نیوٹرون۔ اس بھاری بھرکم جوہر کے گرد ۹۲ الیکٹرون چکر لگاتے ہیں۔ یورانیم کا ذرّہ فطرت کی سب سے بھاری اینٹ ہے۔

جوہری قوت کی ایک جھلک

۶ اگست ۱۹۴۵ء کی صبح کو جاپان کے بارونق شہر ہیروشیما کا چار میل مربع رقبہ بھک سے اڑ گیا اور چاروں طرف مٹی اور دھوئیں کے بادل ہزاروں فٹ اونچے ہوا میں اٹھے اور آسمان پر چھا گئے۔ یہ پہلا ایٹم بم تھا جس نے دنیا کو ایسی تباہی کا سماں دکھایا جس کی مثال انسان نے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔

اس ایٹم بم میں کیا بھرا تھا؟ یورونیم۔ بم کے پھٹنے پر ہوا یہ تھا کہ یورونیم کے ذرّے قوت میں تبدیل ہو گئے تھے۔ ان ذروں کے جوہروں میں سورج کی جو خوفناک قوت چھپی تھی وہ یکدم باہر نکل آئی تھی۔ ان ذروں کا مادہ تباہ ہو کر قیامت برپا کرنے والی قوت میں بدل گیا تھا۔ اس سے ہیروشیما پر دوزخ کے دروازے کھل گئے۔ اور پل کی پل میں یہ پُر رونق شہر ڈراؤنے اور جھلسے ہوئے گڑھوں کی شکل اختیار کر گیا۔

مگر یہ خیال نہ کریں کہ اس بم میں جتنا یورونیم تھا وہ سارے کا سارا قوت میں تبدیل ہو گیا تھا جوہری قوت کے ساتھ انسان کا یہ تجربہ نیا نیا تھا۔ اس لیے ہیروشیما میں پھٹنے والا بم بہت کامیاب بم نہیں تھا۔ اس میں جتنا یورونیم تھا وہ سارے کا سارا قوت میں تبدیل ہو گیا تھا۔ جوہری قوت کے ساتھ انسان کا یہ تجربہ نیا نیا تھا۔ اس لیے ہیروشیما میں پھٹنے والا بم بہت کامیاب بم نہیں تھا۔ اس میں جتنا یورونیم بھرا گیا تھا اس کا صرف ہزارواں حصہ فنا ہو کر قوت میں تبدیل ہوا تھا۔ اگر کہیں سارے کا سارا یورانیم قوت میں

تبدیل ہو جاتا تو بس پھر قیامت کا سماں بندھ جاتا اور کئی گنا زیادہ رقبہ دفعۃً جل کر بھسم ہو جاتا۔
سائنس دانوں نے حساب لگایا ہے کہ اگر آدھ سیر یورینیم یا اتنی ہی جسامت کی کسی اور چیز کو پورے طور پر قوت میں تبدیل کر دیا جائے تو اس سے اتنی قوت حاصل ہو سکتی ہے جتنی بیس کروڑ گیلن پٹرول جلانے سے۔ آپ دن رات دیا سلائی کی تیلیاں جلاتے ہیں۔ مگر یہ خیال نہ کریں کہ جل جانے سے تیلی پوری کی پوری تبدیل ہو گئی ہے۔ جب تیلی جلتی ہے تو اس کے ذرّوں کے صرف الیکٹرون ہی فنا ہوتے ہیں۔ ان کے جوہر جوں کے توں باقی رہتے ہیں۔ اگر ان جوہروں کو بھی فنا کیا جا سکے تو صرف ایک دیا سلائی جلانے سے اتنی گرمی پیدا ہو کہ ایلپس کی ساری برف پگھلائی جا سکے۔
انسان آج تک لکڑی، کوئلہ، تیل وغیرہ جلاتا چلا آیا تھا۔ ان ایندھنوں میں بھی سورج کی ہی قوت موجود ہے جسے انسان جب جی چاہے باہر نکال سکتا ہے۔ مگر انسان کو یہ خبر نہیں تھی کہ مادے کا ہر ذرہ اپنے سینے میں سورج کی قوت چھپائے ہوئے ہے۔ یہ بھید انسان پر اب کھلا ہے۔ انسان آج صرف اس بھید سے ہی واقف نہیں بلکہ وہ اس قابل بھی ہے کہ بعض ذروں کے سینے چیر کر ان میں سے سورج کی قوت باہر نکال لے۔ یہ جوہری قوت جو کچھ کر سکتی ہے اس کی پہلی جھلک دنیا نے ہیروشیما میں دیکھی تھی اس وقت سے لے کر آج تک سائنس جوہری قوت کو کئی گنا زیادہ ترقی دے چکی ہے۔ اب دنیا جوہری قوت کے دور میں داخل ہو چکی ہے۔

ذرّے کے سینے کو چیرا کیوں کر گیا؟

آپ کو اب تک اس بات پر حیرانی ہو گی کہ ذرّے جیسی خوردبینی چیز کا توڑنا پھوڑنا کس طرح ممکن ہو سکا ہے بے شک ذرّہ ایک نہایت چھوٹی چیز ہے۔ ایک عام ذرہ اس قدر چھوٹا ہے کہ اگر اسے بڑھا کر فٹ بال کے برابر کر دیا جائے تو فٹ بال کی جسامت کرۂ زمین کے برابر ہو جائے جس کا قطر پچیس ہزار میل ہے۔
ہم پیچھے دیکھ چکے ہیں کہ ذرہ چند برقیوں سے مل کر بنا ہے۔ اس کے مرکز میں جوہر واقع ہوتا ہے جس میں کچھ پروٹون اور عموماً کچھ نیوٹرون ہوتے ہیں۔ اس مرکز کے گرد الیکٹرون اس طرح

گھومتے ہیں جس طرح سورج کے گرد سیارے۔ ہر ذرہ گویا ایک ننھا سا نظام شمسی ہے، جس کے اندر بہت سی جگہ خالی پڑی ہے،

شاید آپ کو ذرے کا یہ تصور قبول کرنا مشکل نظر آئے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ جس کمرے میں آپ بیٹھے ہیں، اس کا فرش، دیواریں، دروازے وغیرہ سب کے سب بالکل ٹھوس ہیں۔ بھلا یہ کس طرح مانا جائے کہ ان چیزوں کے ذرّوں میں بہت سی جگہ خالی پڑی ہے؟ اگر ذروں کا بڑا حصہ خالی ہوتا تو ہمیں فرش میں، دیواروں میں یا دوسری چیزوں میں جگہ جگہ سوراخ کیوں نظر نہ آتے؟

اس کا جواب معلوم کرنے کے لیے ایک مثال پر غور کیجیے۔ اگر میز پر بجلی کا ایک پنکھا پڑا ہو تو آپ کو اس کے چکر میں جگہ جگہ کافی بڑے سوراخ نظر آتے ہیں۔ آپ ان سوراخوں میں بڑی آسانی سے ہاتھ ڈال سکتے ہیں۔ لیکن اگر پنکھا پوری رفتار پر گھوم رہا ہو تو پھر آپ اس کے کسی سوراخ میں ہاتھ نہیں ڈال سکتے۔ سوراخ اب بھی موجود ہیں۔ مگر اب وہ اتنے چھوٹے ہو چکے ہیں کہ تقریباً نظر نہیں آتے۔ اگر آپ ہوائی جہاز کے پنکھے کو گھومتا دیکھیں گے تو وہ آپ کو بالکل ٹھوس دھات کا چکر دکھائی دے گا۔ حالانکہ سوراخ اس میں بھی، مگر وہ ٹھوس اس لیے دکھائی دیتا ہے کہ بہت تیز رفتار سے چل رہا ہے۔ ذرّے کے اندر الیکٹرون جس رفتار سے جوہر کے گرد چکر لگاتے ہیں، وہ ہوائی جہاز کی رفتار سے کئی گنا زیادہ ہے نتیجہ یہ ہے کہ ہمیں مادہ بالکل ٹھوس نظر آتا ہے۔

یہاں فوراً ایک سوال پیدا ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ جب الیکٹرون ذرے کے جوہر کے گرد اس بلا کی تیزی کے ساتھ گھوم رہے ہیں تو پھر ذرّے کے سینے میں کوئی چیز داخل کس طرح ہو سکتی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر کوئی چیز اسی تیزی سے اڑ سکتی ہو جس طرح الیکٹرون تو وہ ان کے درمیانی سوراخوں میں سے ہو کر گذر سکتی ہے۔ اس کی مثال وہی ہے جیسے ایک گولی سائیکل کے تیز چلتے ہوئے پہیے کے سوراخ میں سے آسانی سے گذر جائے۔ وجہ یہ کہ گولی کی رفتار پہیے کی رفتار سے بھی بڑھ کر ہوتی ہے۔ اسی طرح اگر کوئی ایسی چیز موجود ہو جو الیکٹرون کی رفتار کے برابر یا اس سے زیادہ رفتار پر اڑ سکتی ہو تو وہ گھومتے ہوئے الیکٹرونوں کی دیواروں سے گذر کر ذرّے کے جوہر تک پہنچ سکتی ہے۔

خوش قسمتی سے سائنس کے پاس ایسی چیزیں موجود ہیں جو الیکٹرون کی رفتار کا مقابلہ کر سکتی ہیں (الف) شعاعوں کا ذکر پیچھے گذر چکا ہے۔ یہ وہ شعاعیں ہیں جو یورانیم اور دوسرے تابکار عناصر میں سے نکلتی رہتی ہیں۔ ان کی رفتار اتنی تیز ہے کہ جب تک آپ ایک فقرہ پڑھتے ہیں، کرۂ زمین کا ۲۵ ہزار میل چکر کاٹ کر واپس آجاتی ہیں۔ سائنس دانوں کے پاس یہ وہ گولیاں تھیں جن سے انھوں نے جوہر کے سینے کو نشانہ بنایا۔ اور اسے چیر کر فطرت کا وہ سب سے بڑا بھید نکال باہر کیا جو اس جگہ چھپا پڑا تھا۔

تابکار عناصر

۱۸۹۶ء میں ایک فرانسیسی سائنس دان کو اچانک فطرت کے ایک نئے کرشمے کا حال معلوم ہوا۔ اس نے دیکھا کہ یورونیم کے ہر مرکب میں سے ایک عجیب و غریب روشنی چاروں طرف پھیلتی تھی۔ ہر وہ چیز جس میں تھوڑا بہت یورانیم ملا تھا، اسی طرح شعاعیں پھیلاتی تھی۔ اس نے ان چیزوں کو ہر طرح آزما کر دیکھا، مگر یہ شعاعیں اسی طرح نظر آتی رہیں۔ یہ شعاعیں عام نگاہ کو نظر نہیں آتی تھیں۔ مگر سائنسی آلوں کی مدد سے انھیں صاف طور پر دیکھا جا سکتا تھا۔ دوسرے سائنس دانوں نے بھی یہ چیز آزمائی اور انھوں نے بھی یہی کرشمہ دیکھا۔

سائنس دان حیران تھے کہ یہ ماجرا کیا ہے۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ شعاعیں قوت کا ہی دوسرا نام ہے۔ مگر یہ قوت بغیر کسی چیز کے کس طرح پیدا ہو رہی ہے؟ اس سوال نے انھیں کافی دیر پریشان کیا۔ قوت پیدا کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ چیز چاہیے۔ مگر یورانیم خود بخود بغیر کسی چیز کے چاروں طرف قوت بکھیر رہا تھا۔ آخر اس کا سبب کیا تھا؟

اس سوال کا جواب معلوم کرنے کے لیے مشہور سائنس دان عورت مادام کیوری اور اس کے خاوند نے جان کی بازی لگا دی۔ آخر تین سال کی لگاتار محنت سے وہ اس معمے کا جواب معلوم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ یورانیم میں سے یہ شعاعیں اس لیے نکلتی تھیں کہ اس میں ایک اور عجیب و غریب عنصر کے ننھے ننھے ذرے ملے ہوئے تھے۔ انھوں نے اس نئے عنصر کو ریڈیم کا نام دیا۔ فطرت نے اس حیرت انگیز عنصر کو بے حد کمیاب بنایا ہے۔ ان تھک محنت کے بعد کیوری اور اس کا خاوند ریڈیم کی صرف ایک

چیں حاصل کر چکے۔ مگر اس عجیب و غریب عنصر کی بے پناہ قوت نے سائنس دانوں کو حیرانی میں غرق کر دیا۔ تابکاری کے معاملے میں یہ یورانیم سے پندرہ لاکھ گنا زیادہ طاقتور تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ کبھی نہ ختم ہونے والی قوت کا چشمہ ہے جس سے چاروں طرف شعاعوں کے بھرپور فوارے اُبل اُبل کر پھوٹتے ہیں، اور ان میں ذرا بھر کمی آتی دکھائی نہ دیتی تھی۔

اس دریافت نے سائنس دانوں کے لیے تلاش کا ایک نیا میدان کھول دیا۔ برطانوی سائنسدان روتھر فورڈ نے تابکاری کے مطالعہ کو خاص توجہ دی۔ اس نے یہ معلوم کرنا چاہا کہ یورانیم اور ریڈیم اور دوسرے تابکار مادوں سے کس قسم کی شعاعیں نکلتی ہیں۔ کئی تجربوں کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ یہ شعاعیں تین قسم کی ہیں۔ اس نے انھیں "ا" (الفا) "ب" (بیٹا) اور "ج" (گاما) کے نام دیے۔ اس نے یہ بھی ثابت کیا کہ شعاعوں کے لگاتار خارج ہونے سے تابکار مادے کے کچھ ریزے گھس گھس کر آخر ختم ہو جاتے ہیں۔ اس کا وزن پہلے سے گھٹ جاتا ہے اور وہ ایک نئے عنصر کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ ایک تابکار ذرے میں سے شعاعیں لگاتار نکل نکل کر اس کے جوہر کو کم کرتی رہتی ہیں۔ یہاں تک کہ اس کے دو عدد پروٹون گھس گھس کر ختم ہو جاتے ہیں۔ پروٹون کی تعداد بقدر دو گھٹ جانے سے یہ ذرہ ایک نئے عنصر کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ جس کا وزن پہلے عنصر کے مقابلے میں کم ہوتا ہے۔ ب شعاعوں کے نکلنے سے ذرے کا ایک عدد الیکٹرون آہستہ آہستہ گھس کر ختم ہو جاتا ہے۔ ا اور ب شعاعوں کے اس طرح نکلتے رہنے سے یورانیم پہلے ۸۸ ریڈیم میں تبدیل ہوتا ہے اور پھر ۸۲ سیسے کی شکل اختیار کر کے بالکل ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ تابکار مادہ وہ مادہ ہے جس کے بعض ریزے گھس گھس کر شعاعوں کی شکل اختیار کر رہے ہوں۔ یورانیم اور ریڈیم وغیرہ تابکار عناصر ہیں۔ سائنس کی زبان میں انھیں گرم کہا جاتا ہے کیوں کہ ان سے ہر وقت قوت کے فوارے پھوٹتے رہتے ہیں۔ لیکن جب ۹۲ یورونیم کے ریزے گھستے گھستے پہلے ۸۸ ریڈیم اور آخر کار ۸۲ سیسے کی شکل اختیار کر لیتے ہیں تو یہ ٹھنڈا ہو جاتا ہے یعنی اس میں سے قوت کے فوارے بہنے بند ہو جاتے ہیں۔ اب اس میں سے کوئی شعاعیں نہیں

نکلتیں۔ اگر کسی طرح سیسے کے ۸۲ پروٹون گھس گھس کر ۷۹ رہ جاتے تو سیسہ سونا بن جاتا۔ مگر سیسہ بالکل ٹھنڈا ہے۔ "وہ گرم" نہیں۔

تابکار مادے میں سے نکلنے والی شعاعوں نے سائنس دانوں کو ایک نیا ہتھیار عطا کر دیا۔ وہ عرصے سے اس کوشش میں تھے کہ کسی طرح ننھے ذرے کے سینے کو چیر کر دیکھیں کہ اس میں کیا ہے، مگر سوال یہ تھا کہ ذرے جیسی خورد بینی چیز کو چیرا کس نشتر کے ساتھ جائے۔ ذرے کی جسامت کا یہ حال ہے کہ اگر ہائیڈروجن کے ۵۰ کروڑ ذروں کو ایک دوسرے کے ساتھ ملا کر ایک قطار میں رکھا جائے تو ان کی لمبائی صرف ایک انچ ہو۔ اتنی خورد بین چیز کے اندر انسان جھانکے تو کیوں کر؟ لیکن تابکار مادے میں سے نکلنے والی شعاعوں نے آخر انسان کو تلوار سے تیز اور بجلی سے زیادہ تیز رفتار ہتھیار عطا کر دیا۔ یہ وہ توپ خانہ تھا جس سے ذرے کی خورد بینی دنیا پر بمباری کی جا سکتی تھی۔

برطانوی سائنس دان رودر فورڈ نے ذرے پر دھاوا بولنے کا فیصلہ کر لیا۔ جب سے دنیا بنی تھی ذرے کی خورد بینی انسان کی دستبرد سے بچی چلی آتی تھی لیکن آخر کار اس پر بھی گولیوں کی بوچھاڑ ہونے لگی۔ مگر یہ عجیب بمباری تھی کیوں کہ عام نگاہ کو نہ ذرے کی دنیا دکھائی دیتی تھی۔ نہ اس پر برسنے والی گولیاں۔ مگر اس نظر نہ آنے والے توپ خانہ کی تاثیر بے پناہ تھی۔ اس سے برسنے والے گولے اس تیزی سے اڑتے تھے کہ اگر ان کا راستہ نہ روکا جائے تو پل بھر میں ساری دنیا کا چکر ختم کر ڈالیں۔ ان کی تباہ کاری کا یہ حال کہ اگر ان میں سے ایک گولے کا وزن آدھ سیر کر دیا جائے تو اس سے اتنی ہی تباہی مچے جتنی ڈیڑھ لاکھ ٹن کے ایک عام گولے سے۔ رودر فورڈ نے ان شعاعوں کی بے پناہ بمباری سے مختلف عناصر کے ذروں کو نشانہ بنایا۔

اس بمباری سے ذرے کی خورد بینی دنیا کے متعلق عجیب و غریب حالات معلوم ہوئے۔ سائنس دانوں کو یہ پتہ تو تھا کہ ذرے کے ارد گرد الیکٹرون گھومتے ہیں۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ ایک الیکٹرون کا قطر ذرے کی نسبت چالیس ہزار گنا کم ہے۔ مگر اب تک عام خیال تھا کہ ذرے کے بیرونی حاشیے پر الیکٹرون گھومتے ہیں۔ اور اس کا باقی اندرونی حصہ سارے کا سارا ٹھوس پروٹونوں پر

مشتمل ہے۔ رو تھر فورڈ کی بمباری نے اس خیال کو غلط ثابت کر دیا۔ شعاعوں کی اکثر گولیاں ذرّے میں سے سنسناتے ہوئی گزر جاتی تھیں۔ اور کوئی چیز ان کا راستہ نہ روکتی تھی۔ لاکھوں گولیوں میں سے کوئی ایک آدھ کسی چیز سے ٹکرا کر اپنا رخ بدل لیتی تھی۔ یہ چیز ذرے کا دل یعنی اس کا جوہر تھا جس کے اندر سورج کی عجیب و غریب قوت چھپی تھی۔ انسان آخر کار ذرے کے دل تک پہونچنے میں کامیاب ہو گیا:

ان تجربوں نے سائنس کی دنیا میں ہل چل ڈال دی۔ اب یہ بات پوری طرح ثابت ہو گئی کہ ذرّہ ہرگز ٹھوس نہیں۔ بلکہ اس کا بڑا حصہ بالکل خالی ہے۔ اس کے مرکز میں اس کا دل یعنی جوہر واقع ہے مگر یہ جوہر جسامت میں الیکٹرون سے بھی چھوٹا ہے۔ اتنا چھوٹا کہ اگر جوہر کو بڑا کر کے ایک پن کے سرے کے برابر موٹا کر دیا جائے تو خورد بینی ذرّہ ایک تیس منزلہ اونچی عمارت کے برابر ہو جائے: جسامت میں جوہر سارے ذرّے سے دس لاکھ کروڑ گنا چھوٹا ہے۔ مگر دوسری طرف حالت یہ ہے کہ اگر سارے ذرّے کا وزن دو ہزار فرض کر لیا جائے تو اس میں سے ۱۹۹۹ حصے جوہر میں ہیں اور صرف ایک حصہ اس سے باہر۔

ان انکشافوں سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ذرّے کی خورد بینی دنیا میں جوہر کو بالکل وہی حیثیت حاصل ہے جو نظام شمسی میں سورج کو۔ نظام شمسی میں جس قدر جگہ سورج گھیرے ہوئے ہے تقریباً اتنی ہی جگہ ذرّے میں جوہر نے گھیر رکھی ہے۔ جس طرح سورج کے گرد، زہرہ۔ مریخ۔ زمین وغیرہ سیارے گھومتے ہیں بالکل اسی طرح جوہر کے گرد الیکٹرون گھومتے ہیں۔ جس طرح سورج اور سیاروں کے درمیان بڑے بڑے فاصلے حائل ہیں۔ بالکل اسی طرح ذرّے کا اکثر حصہ بالکل خالی پڑا ہے۔ یہ ہے اصل ساخت ان خورد بینی اینٹوں کی جن سے فطرت کا سارا کارخانہ تعمیر ہوا ہے

فتبارک اللہ احسن الخالقین ۰

مُطالعہ قدرت

محمد حسین

ہم عام طور پر دو قسم کے مضامین کی تعلیم دیتے ہیں۔ پہلی قسم کے مضامین تعلیم کے ذرائع ہوتے ہیں، جن کے سیکھے بغیر تعلیم حاصل کرنا ہی ممکن نہیں۔ جب تک پڑھنا لکھنا نہیں آئے گا اس وقت تک دوسرے تعلیمی مضامین نہیں سیکھے جا سکتے۔ جب تک ابتدائی گنتی و پہاڑے وغیرہ نہ آتے ہوں گے تب تک حساب کی اونچی تعلیم حاصل نہیں کی جا سکتی۔ دوسری قسم کے مضامین بذات خود تعلیم ہیں اور ان میں مطالعۂ قدرت بھی شامل ہے۔

مطالعہ قدرت کیا ہے : مطالعۂ قدرت سے مراد جاندار اشیاء کا ذاتی و عملی مطالعہ ہے جاندار چیزوں کی پیدائش و زندگی اور بالیدگی کا مشاہدہ کیا جاتا ہے۔ بلکہ زیر مشاہدہ جاندار اشیاء کی نگرانی اور حفاظت کا بھی پورا پورا خیال رکھا جاتا ہے۔ ان کی خوراک، آرام و آسائش، اٹھنے، بیٹھنے کی جگہ فراہم کرنا بھی اس مطالعے میں شامل ہے۔

مطالعہ قدرت کی اہمیت

نصاب میں اس مضمون کی حیثیت پر تو کافی زور دیا گیا ہے۔ لیکن سکولوں میں اسے کوئی اہمیت نہیں دی جاتی۔ کیوں کہ مطالعہ قدرت کے مختلف پہلوؤں کو جغرافیہ و سائنس کی تدریس کے دوران ہی پڑھا کر اکتفا کر لیا جاتا ہے۔ اس لیے اسے اختیاری مضمون جان کر ٹائم ٹیبل میں اس کے لیے گنجائش رکھنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی جاتی۔

ہمارے سکولوں میں اس مضمون کی تدریس کے بھی خاطر خواہ کوئی انتظام نہیں ہیں۔ اس کی موزوں تدریس کے لیے ہر سکول میں ایک بڑا قطعۂ اراضی ہونا چاہیے۔ جس میں باغیچہ وغیرہ لگا کر طلباء کو سہولت بہم پہنچائی جائے، اور عملی کام کرنے کے مواقع پیش کیے جائیں۔ ہم اس مضمون کو پوری اہمیت سے الگ

واقف نہیں ہوئے۔ اور اسے ایک آسان مضمون سمجھ کر غور کرنا بھی نہیں چاہتے۔ اس مضمون کی حقیقت اور اہمیت کو یوروپین ممالک ہی جانتے ہیں۔ جو سالوں کی عرق ریزی کی تفتیش، تحقیق اور مشاہدہ کی بنا پر اس میں عبور حاصل کر چکے ہیں۔ جب کہ ہم اسے سکول میں دوسرے اختیاری مضامین کے برابر بھی اہمیت نہیں دیتے۔ حالاں کہ کالج میں علم نباتات و علم الحیوانات باقاعدہ مکمل مضمون کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ سائنس و جغرافیہ کے ساتھ مماثلت اس کی جداگانہ نوعیت کو فنا نہیں کر سکتی۔ بلکہ جو مضمون دوسرے مضامین سے بھی وابستہ ہو اس کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔

مطالعہ قدرت کی تعلیم

ہم جانتے ہیں کہ مطالعۂ قدرت مسلسل صبر آزما تحقیق، تفتیش، تجسس، مشاہدہ اور دل چسپی پر مشتمل ہے۔ مطالعہ قدرت کی تدریس اس لحاظ سے کوئی آسان امر نہیں بلکہ اس کی تدریس کے لیے مخصوص علم کی ضرورت ہے جس کی معلومات اور شوق مخصوص ہوں جو طلباء کے اندر موجود شوق اور دل چسپی سے کام لینا جانتا ہو۔ بچے کبھی نچلے نہیں بیٹھتے۔ اپنے اردگرد کی چیزوں کی تحقیق و تفتیش میں لگے ہی رہتے ہیں ان کے گرد جان دار و بے جان چیزیں بکھری پڑی ہوتی ہیں۔ جن میں جان دار اشیا اپنی عجیب و غریب حرکات و سکنات اور پُر اسرار تغیرات کے باعث زیادہ دل کش اور قابل توجہ بن جاتی ہیں۔ ایک اچھا معلم طلبا کی اس جسمانی محنت و حرکت کی عادت سے ان کے شوق اور جستجو و تحقیق کے جذبے کو پورا کرتا ہے اور طالب علم بھی اس وقت تک اس مضمون سے پورا فائدہ حاصل نہیں کر سکتے۔ جب تک کہ ان کے اندر پیہم کوشش اور لگاتار انہماک و ہمت سے کام کرنے کی عادت نہ ہو۔ کام سے جی چرانے والے طلبہ اس مضمون میں کبھی کامیابی سے نہیں چل سکتے اور نہ ہی اس مضمون کی تعلیم دوسرے مضامین کی طرح کمرہ جماعت میں ہو سکتی ہے۔ بلکہ اس کے لیے ایک پُر فضا ماحول ہو جس میں طلباء نے اپنی کاشت کردہ چیزوں کی نمائش کی ہو اور ان کی زیرِ مشاہدہ جاندار و بے جان اشیا لیبل لگی ہوئی ہوں۔ مختلف چیزوں کی حالتوں میں تغیر کو ریکارڈ کی صورت میں ظاہر کیا ہو اور روزانہ مشاہدہ کرنے کی تاریخ دی ہوئی ہو۔ ان کوائف و معلومات کی تدریس میں کامیاب معلم وہی ہے جس نے خود اس مضمون کا مطالعہ

کیا ہو اور اس کا بے حد شائق ہو جس معلم نے اپنے گرد و نواح کی کسی جاندار چیز میں دل چسپی نہ لی ہو وہ طلبا میں بھی شوق کی عادت اور سبق سے دل چسپی پیدا کرنے میں ناکام رہتا ہے۔ حالاں کہ اس مضمون کے طالب علموں کے لیے باہر جاکر مختلف پرندوں کی حرکات و سکنات، ان کی پیدا کردہ مختلف سریلی و کرخت آوازوں کا ساز نہ کرنا۔ ننھے ننھے کیڑے مکوڑوں کی زندگی کا مطالعہ کرنا، ان کی لائی ہوئی مصیبتیں اور انسان کے دوست اور دشمن جانوروں میں تمیز کرنا۔ رنگ برنگی تتلیوں کی اڑان اور خوش نما و خوب صورت پھولوں اور پودوں کا مشاہدہ کرنا ہے۔ ذہین طالب علم اور معلم کسی ایک کا انتخاب کرکے اسے بنیاد مان لیتے ہیں اور اس کے تحت ہی دوسری چیزوں کے متعلق بھی معلومات فراہم ہوتی رہتی ہیں۔ کیوں کہ یہ کہیں بہتر اور مفید ہے کہ معلم اور طلبا اپنی ہمت اور استعداد کے مطابق کسی ایک قسم کا باقاعدہ اور لگاتار مطالعہ کریں۔ بجائے اس کے کہ وہ ہر فن مولا بننے کی کوشش میں ہر قسم ادھوری، ناکافی، اور نامکمل معلومات حاصل کریں۔ معلم طلبا کے درمیان ایک راہ نما کی حیثیت رکھتا ہے۔ جہاں طلباء میں خود کام کرنے کی صلاحیت دیکھے تو ان کا کام خود کرنے نہ بیٹھ جائے۔ بلکہ ان کے معلوم کیے ہوئے نتائج دوسرے شاگردوں کو پیش کرے اور طلبہ کی حوصلہ افزائی کرے اور نہ ہی سارا کام طلبا پر ان کی ہمت کے بھروسے پر چھوڑ دینا واجب ہے۔ بلکہ استاد کو شاگرد کے لیے وہ کام ہرگز نہ کرنا چاہیے جو طلبہ معمولی احتیاط سے خود حل کرنے کے قابل ہوں۔ لیکن دل چسپی ضرور لینی چاہیے۔

مطالعہ قدرت میں احتیاطیں

(۱) کتابی مضمون سمجھنا: مطالعہ قدرت کو محض کتابی مضمون نہ سمجھا جائے اور نہ ہی یہ خیال کیا جائے کہ کمرۂ جماعت میں بیٹھ کر کتاب پڑھ لینے سے مطالعہ قدرت آجاتا ہے۔ یا چند چند اشیاء کے نام رٹ لینے سے خیال کیا جائے کہ مطالعہ قدرت پر عبور حاصل ہو گیا ہے۔ اس میں کلام نہیں کہ اس مضمون میں بھی کتب مطبوعہ پڑھی جا سکتی ہیں، بلکہ بعد میں ان کا مطالعہ ضروری ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کی ابتدا کمرۂ جماعت سے باہر ہرے بھرے لہلہاتے ہوئے کھیتوں سے ہوتی ہے۔ جہاں انھیں مختلف پودوں، جانوروں اور کیڑے مکوڑوں کو بچشم خود دیکھنے کے مواقع میسر آتے ہیں۔

(۲) عملی کام : عام مضامین کی تدریس سے قطع نظر اس میں سب کام طلبا کو خود سرانجام دینا ہوتا ہے ۔ تاریخ یا زبان کے کسی مضمون کی طرح نقل کی ہوئی کاپیاں نہیں بنائی جاسکتیں۔ بلکہ ایک طالب علم اپنے مشاہدوں کو اس طرح درج کرتا ہے ۔

(ا) اُس کے کیڑے مکوڑے کس حالت میں پل رہے ہیں ؟

(ب) کیا وہ خاطر خواہ طریق پر پل رہے ہیں۔

(ج) انھیں مناسب خوراک بہم پہنچانے میں اسے کیا دقتیں پیش آئیں۔

(د) بعض کن وجوہ کی بنا پر مر گئے۔

(ہ) مختلف حالتیں بدلنے سے پہلے ان کی عادت میں کیا فرق رونما ہوتا ہے۔

(س) باغیچے میں لگائے گئے پودوں میں کن مراحل کے بعد پھول کھلنے لگے۔

(ص) پانی اور روشنی کی عدم موجودگی کا اثر پودوں پر کیا ہوتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

طلبا محض زبانی طور پر مختلف پرندوں، جانوروں اور پودوں کے نام یاد کرنے کی بجائے ان اشیا کا مطالعہ بنفسِ نفیس کرتے ہیں۔ اپنے ہاتھ میں لے کر ان کا امتحان کرتے ہیں۔ ہم میں سے کتنے ہی آدمی ایسے ہیں جو اپنے ماحول سے بے خبر رہتے ہیں۔ جو اشیائے قدرت کے درمیان چل پھر رہے ہوتے ہیں لیکن ان چیزوں کا مشاہدہ کرنے سے عاری ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ قدرت کی طرف سے عطا کردہ مقصد حیات کو نہیں سمجھ سکتے اور دنیا میں زندگی کے لطف سے بھی محروم رہتے ہیں۔ جب وہ اپنی آنکھوں کے سامنے محنت کرتے ہوئے کیڑوں، رقص کرتی ہوئی حسین تتلیوں اور خوشبو کے نشے میں سرشار سروں کو ہلاتے ہوئے خوبصورت پھولوں کی زندگی سے کچھ سبق حاصل نہیں کرسکتے تو انھیں اپنا آپ کیسے نظر آسکتا ہے۔ چناں چہ مطالعہ قدرت کی ایک اہم غرض یہ بھی ہے کہ طلبا کو اس خوشی اور لطف سے محروم نہ رکھا جائے۔

<u>دو غلط فہمیاں :</u>

(۱) پہلی غلط فہمی یہ ہے کہ مختلف اشیاء یا ان کے چھوٹے چھوٹے حصے جمع کرنے کو ہی مطالعہ قدرت سمجھ لیا جاتا ہے۔

(۲) بعض اوقات خوب صورت پھول اور پتوں کو کسی کاپی میں چسپاں کرنے کو اور لمبا اوقات رنگ برنگی، سنہری اور بہلی تتلیوں کو شیشے دار ڈھکنے والے بکس میں ترتیب سے ٹانکنے کو بھی مطالعہ قدرت کا صحیح مدعا کہا جاتا ہے۔ اس میں کلام نہیں کہ طلبا جمع کرنے کی جبلت کو کام میں لاکر بہت مفید اور نتیجہ خیز کام کر سکتے ہیں۔ لیکن اس کے لیے ابھی ایک خاص ترتیب کی ضرورت ہے۔ جب کہ ہمارے ہاں عملی امتحان کی ضرورت کے پیش نظر ان چیزوں کو اکٹھا کیا جاتا ہے۔ مطالعہ قدرت کا اصل مقصد تو یہ ہے کہ مختلف حیوانات، نباتات اور جمادات کا بغور مشاہدہ و مطالعہ کیا جائے۔ اس سلسلے میں پہلا ضروری امر یہ ہے کہ طلبہ کو مختلف ذی حیات اور نباتات کے نام بتلانے کی بجائے ان کی قوت مشاہدہ کو پختہ اور نتائج اخذ کرنے کے طریقہ کار کی مشق کرائی جائے۔ تاکہ طلبا اس کے خوگر ہو جائیں۔ مثلاً کسی پودے کے اُگنے کے دوران مختلف عملوں کا مشاہدہ اور پھر اُن سے نتیجہ نکالنا کہ اس قسم کے تمام پودوں کی پرورش کے دوران یہ عمل واقع ہوتے ہیں۔ ایسا کرنے سے طلبہ کو مختلف چیزوں کے نام خود بخود بغیر کسی ذہنی کوفت کے یاد ہو جائیں گے۔ بلکہ وہ ان کی نشو و نما کے متعلق ضروری کوائف بھی مرتب کرنے کے قابل ہو جائیں گے۔

مختلف کیڑے، مکوڑوں کی زندگی کے مراحل مثلاً مچھر، مکھی اور ایسے ہی دوسرے جانور کس طرح چار حالتیں بدل کر پورے اڑنے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ لیکن یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ٹائم ٹیبل اور نصاب کے مطابق اس طریقے سے تدریس بڑی سست ہو جائے گی۔ چناں چہ اس مشکل سے عہدہ برآ ہونے کے لیے معلم ایک عنوان کے مختلف مرحلوں کو طلبا میں تقسیم کر دے۔ ریشم کے کیڑے کی زندگی کا مطالعہ کرنا درکار ہے۔ اس میں طلبا ننھے کیڑے کو انڈوں سے نکلتے دیکھتے ہیں۔ انھیں اپنے سے پتے کھاتے دیکھتے ہیں اور مختلف تغیرات کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ اس میں طالب علم ایک مربوط اور مسلسل وار نظام دیکھتا ہے۔ اور ہر مرحلے پر اس کا شوقِ تجسس بڑھتا ہی رہتا ہے۔ یہ مشاہدہ صرف چند کیڑوں پہ کیا جائے بلکہ مختلف مدارج یا منازل کے کیڑے اس طرح ترتیب سے رکھے جائیں کہ ان کی زندگی اول تا آخر تھوڑے وقت میں اچھی طرح مشاہدہ میں آ جائے۔ اس مقصد کے لیے اس ترقی یافتہ دور میں مختلف ذی حیات کیڑوں کی زندگی کی فلموں سے بھی استفادہ اٹھانا چاہیے۔ چناں چہ طلبا

مشاہدہ کرکے ان چیزوں کو اکٹھا بھی کریں تو اس سے انھیں دگنا فائدہ ہوگا۔ ایک تو انھیں اپنے مطالعہ وتحقیق کو ترتیب دینا آ جائے گا۔ دوسرے اپنی جمع شدہ چیزوں کو خود دیکھ کر اور دوسروں کو دکھا کر خوشی محسوس کریں گے۔

مطالعہ قدرت کے فائدے: علاوہ ازیں کہ یہ مضمون طلبا میں دل چسپی، انہماک اور قوت مشاہدہ کو صیقل کرتا ہے۔ جبکہ ہمارے ہاں پرندوں کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی جاتی اور شکاری لوگ ان کی نسلوں کو ختم کرنے کے درپے ہیں۔ اچھے اور نفع بخش پرندوں کی حفاظت اور ان کی نسل کا تحفظ بھی نہایت اہم ہے۔ اگر مطالعہ قدرت کی طرف زیادہ طلبہ کی توجہ مبذول کرائی جائے تو ہمارے بہت سے قیمتی پرندے بچ سکتے ہیں اور ان کے سلسلے سے قوم وملک کو فائدہ پہنچایا جا سکتا ہے۔

انسان کے دوست و دشمن کیڑوں میں تمیز کرنا۔ دوست کیڑوں کی پرورش وحفاظت کرکے دشمن کیڑوں کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ اس کام کے لیے تحقیقاتی تجربہ گاہیں بنائی جائیں۔ جہاں سے عام کسانوں کی آگاہی کے لیے وقتاً فوقتاً چھوٹے سائز کے پمفلٹ ورسائل شائع کیے جائیں، اور مفت تقسیم کرنے کا انتظام ہو۔ تاکہ ملکی زراعت زیادہ کارآمد بنیادوں پر قائم ہو سکے۔

مطالعہ قدرت ہی سے ہم پر بعض حقیقتیں واضح ہوتی ہیں۔ اس کائنات میں غور وفکر کرنے کے لیے بہت کچھ موجود ہے۔ اگر ہم چاہیں تو اس کے معمولی مطالعہ سے ہی ہم میں یہ خاصیت پیدا ہو سکتی ہے کہ ہم اسے حصول روزگار کا ذریعہ بھی بنا سکتے ہیں۔ اس پر مبنی بہت سی گھریلو صنعتیں بڑی کامیابی کے ساتھ چلائی جا سکتی ہیں۔ ریشم کے کیڑے پالنا ایک مفید مشغلے کے علاوہ اچھی گھریلو صنعت بھی ہے۔ اسی طرح مختلف پودوں، جڑی بوٹیوں سے دوائیاں وغیرہ بھی تیار کی جا سکتی ہیں۔

مطالعہ قدرت کی تدریس سے انسان میں رحم کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ اگر اس کی تدریس صحیح اور لازمی طور پر ہمارے سکولوں میں رائج ہو جائے تو وہ صورت حال بدل جائے جس میں طلبا ودیگر آدمی جانداروں کو بے جا طور پر بے رحمی سے تنگ کرتے ہیں۔ کوئی کسی پرندے کے گھونسلے سے انڈے اٹھا کر ہی توڑ دیتے ہیں اپنی تسکین کے اسباب ڈھونڈتا ہے اور کوئی انڈوں سے

تازہ نکلے ہوئے بچوں کو زمین پر پٹخ دینے سے ہی اپنی خواہش پوری کرتا ہے۔ طلبا اور آوارہ گرد لڑکوں کی بے کار وقت میں غلیل بازی کی مشق کا نشانہ بے چارے پرندے ہی بنتے ہیں۔ طلبا کو شروع ہی سے اس کا سبق دیا جائے تو نہ صرف پرندوں سے ہمدردی پیدا ہو جائے گی، بلکہ ابنائے جنس سے بھی معقول سلوک کی توقع رکھی جا سکے گی۔

جمالیاتی ذوق کی تسکین کے لیے یہ مضمون اپنی افادیت کے لحاظ سے صفِ اول کے مضامین میں سے ہے۔ ننھی ننھی چڑیاں نورکے تڑکے اپنی پیاری زبان میں خالقِ حقیقی کی حمد و ثنا کرتے ہوئے ایک سہانا سماں باندھ دیتی ہیں۔ رنگا رنگ کے کھلے ہوئے پھولوں کے تختے، سرسبزی میں لہلہاتے ہوئے پودے ایک پرکیف کیفیت طاری کرتے ہیں۔ درختوں پہ دوڑتی ہوئی گلہریاں، کھٹ کھٹ کرتا ہوا، ہُدہُد اور دانہ دنکا لاتی ہوئی چیونٹیوں کی لمبی قطاریں سب انسان کے لیے تفریحِ طبع ہونے کے علاوہ ایک پوشیدہ سبق بھی زبانِ حال سے دہرا رہی ہوتی ہیں۔

یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ مطالعہ قدرت ہی ایک ایسا مضمون ہے جس کا روز مرہ زندگی سے نہ صرف تعلق ہے بلکہ تطابق ہے۔ دوسرے مضامین کے سلسلے میں ہمیں روزمرہ زندگی سے تعلق قائم کرنا پڑتا ہے اور اس طرح سے بہت سے دشوار مراحل بھی طے کرنا ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود بھی ہم اپنی توجہ مبذول نہ کریں تو کفرانِ نعمت کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے۔

مطالعہ قدرت سے ہمیں بہت سی نئی اور عجیب و غریب چیزوں سے واسطہ پڑتا ہے اور انھیں دیکھ کر قدرتی طور پر طلباء میں جمع کرنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔ چناں چہ اگر طلبا کی مناسب طور پر رہ نمائی کی جائے تو ان میں یہ شوق اس حد تک ترقی کر سکتا ہے کہ اگر ان کی جیبیں اور الماریاں چھوٹے چھوٹے عجائب گھر بن جائیں تو کوئی تعجب نہیں لیکن ان چیزوں کو جمع کرنے میں بھی خاص احتیاط کو مدِ نظر رکھنا ہوگا۔ چناں چہ مطالعہ قدرت کی اس ہمہ گیر حیثیت کے پیشِ نظر اس کے فروغ کے لیے مناسب اور ضروری اقدامات کی اشد ضرورت ہے۔ ٭

تعلیمی دنیا پر ایک نظر

دولت مشترکہ اور تعلیمی کانفرنس

گذشتہ سال جولائی میں آزاد اور خود مختار دولت مشترکہ ممالک اور پندرہ نو آبادیاتی علاقوں کے ڈیڑھ سو سے زائد مندوبین پر مشتمل سب سے بڑی دولت مشترکہ تعلیمی کانفرنس آکسفورڈ یونیورسٹی میں ہوئی۔ درحقیقت پہلی بار جدید دولت مشترکہ جس میں ایشیا اور افریقہ کے ممالک شامل ہیں۔ نیز نو آبادیات کے نمائندے یکجا ہوئے جس سے ان کا منشا تعلیمی ترقی کے ایک ایسے منصوبہ کی تفصیلات طے کرنا تھی جو پوری دولت مشترکہ کو محیط کیے ہوئے ہو۔

اس تصور کی ابتدا ۱۹۵۸ء کی مانٹریل معاشی کانفرنس میں ہوئی۔ جہاں سب اس بات پر متفق تھے کہ دولت مشترکہ معاشی اور سماجی ترقی کی لازمی بنیاد تعلیم اور فنی تربیت ہے۔ لیکن مانٹریل میں ہم نے اس چیلنج کے امکانات اور اس کی وسعت کی معمولی سی جھلک دیکھی تھی۔ آکسفورڈ میں اس کی نہ صرف ایک واضح تصویر سامنے آگئی۔ بلکہ عملاً شروعات بھی ہوئی۔ ویسے آکسفورڈ کانفرنس میں زیر غور آنے والے معاملات سے اس مسئلہ کی وسعت کا اندازہ ہو جاتا ہے چنانچہ دولت مشترکہ کے چار پرانے ممبروں یعنی کنیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ اور جنوبی افریقہ کے علاوہ دولت مشترکہ کے نئے خود مختار ممالک پاکستان، ہندوستان، سیلون، گھانا اور وفاقیہ ملایا نے اپنے اپنے نمائندے بھیجے۔ وفاقیہ رہوڈیشیا و نیاسا لینڈ کے نمائندوں نے بھی کانفرنس میں شرکت کی۔ ادھر برطانوی وفد میں تیس ممبروں پر مشتمل ایک حصہ بھی تھا جس کے ممبروں کو ان علاقوں کی نمائندگی کے لیے چنا گیا تھا جن میں وہ خدمات انجام دے رہے ہیں۔ غرضیکہ ان مندوبین نے کم و بیش ۶۵ کروڑ لوگوں کی نمائندگی کی۔

ان نئے ملکوں کو جن کی آبادی کافی ہے اور اس میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ چند شدید مسائل

درپیش ہیں۔ مثلاً وہ فنی تربیت اور سائنسی معلومات کو اپنے عوام کے سامنے کیوں کر پیش کریں تاکہ وہ اپنے اور ان قوموں کے درمیان معیار زندگی کے خلا کو پر کر سکیں۔ جن کے طریقے ترقی یافتہ ہیں نیز وہ جہالت و ناخواندگی جیسی رکاوٹوں کو اپنی راہ سے کیوں کر ہٹا سکتے ہیں۔

اس کے لیے جو مشترکہ کوشش کی جا رہی ہے اس کا ایک حوصلہ افزا پہلو دولت مشترکہ کے وظیفوں کا نیا منصوبہ ہے جس کے لیے دولت مشترکہ ممالک اپنے ذرائع و وسائل اور سہولتوں کے مطابق جگہیں مخصوص کریں گے۔ ویسے مانٹریال میں یہ تعداد ایک ہزار طے کی گئی تھی۔ لیکن اب ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ نہ صرف پوری ہوگی، بلکہ عین ممکن ہے کہ اس سے بھی تجاوز کر جائے۔ پھر یہ یقینی چیز ہے کہ وظیفے زیادہ تر پوسٹ گریجویٹ مطالعہ و تربیت کے لیے ہوں گے۔

نئے منصوبہ کے تحت برطانیہ پانچ سو وظیفے فراہم کرے گا۔ کنیڈا نے ڈھائی سو کی پیش کش کی ہے اور آسٹریلیا اور ہندوستان میں سے ہر ایک نے سو جگہیں باہمی دولت مشترکہ منصوبہ کے لیے رکھی ہیں۔ پاکستان نے تیس جگہوں کی ذمہ داری لی ہے۔ نیوزی لینڈ نے ۲۵، ملایا ۱۲، گھانا اور روڈیشیا و نیاسالینڈ نے دس دس، سیلون ۶، اور مشرقی افریقہ نے چار جگہوں کا وعدہ کیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس دولت مشترکہ منصوبہ کے لیے اور بھی حصوں کا اعلان بعد میں ہو۔ غرضیکہ ہم دولت مشترکہ کے تمام ممالک کے مستقبل کے رہنماؤں کو مواقع فراہم کر رہے ہیں۔ جو تمام میدانوں اور اعلیٰ سے اعلیٰ سطح پر ہوں گے ساتھ ہی تمام دولت مشترکہ ممالک کچھ دیں گے اور کچھ لیں گے۔

وظیفوں کے نئے منصوبہ کے مصارف آئندہ پانچ سال میں کم از کم ایک کروڑ پاؤنڈ ہوں گے اس میں سے برطانیہ ساٹھ لاکھ پونڈ کے لگ بھگ رقمیں دے گا جو مجموعی مصارف کا تقریباً ۱/۵ حصہ ہوں گی۔ رہے دولت مشترکہ کے دیگر ممالک تو ان کا چندہ چالیس لاکھ پونڈ ہوگا۔

میں یہاں یہ بات زور دے کر کہنا چاہتا ہوں کہ برطانیہ نے جن پانچسو جگہوں کی پیش کش کی ہے وہ نئی ہیں۔ پھر دولت مشترکہ اور نو آبادیات تعلیمی اور فنی تربیت کی ترقی و ترویج کے لیے برطانیہ پہلے ہی جو رقمیں دے رہا ہے وہ ان ساٹھ لاکھ پونڈ کے علاوہ ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس کوشش کی بہت

اندازہ عام طور پر نہیں لگایا گیا ہے۔

یہاں یہ ذکر بھی بے محل نہ ہوگا کہ ان دنوں چالیس ہزار سے زائد سمندر پار کے طلبا، برطانیہ میں مطالعہ کر رہے ہیں۔ ان میں سے دو تہائی یا ۲۷ ہزار طلبہ کا دولت مشترکہ یا نوآبادیات سے تعلق ہے اور ۲۷ ہزار طلبا، میں سے دو ہزار اسکاٹ لینڈ کی یونیورسٹیوں اور فنی تربیتی کالجوں میں ہیں۔ دولت مشترکہ کے متعدد طلبا، وظیفوں کے تحت جو ان کی اپنی حکومتوں یا تعلیمی اداروں نے دے رکھے ہیں برطانیہ میں زیر مطالعہ ہیں۔ تاہم یہ یاد رکھنا بھی ضروری ہے کہ کسی یونیورسٹی یا تربیتی کالج میں ہر نشست کی برطانیہ کے سرکاری خزانے سے کفالت ہوتی ہے۔ بعض یونیورسٹی کے سیدا قوں میں اس امداد میں برطانیہ عظمیٰ کی یونیورسٹیوں اور یونیورسٹی کالجوں کی مجموعی مستقل آمد نی بھی شامل ہوتی ہے۔ جو ۵۷-۱۹۵۶ء میں چار کروڑ ۱۰ لاکھ بچاس ہزار پونڈ تھی۔ اس میں سے تقریباً دو تہائی حصہ سرکاری خزانہ یا ٹیکس دہندہ سے پورا ہوا۔

ادھر برطانیہ نے مزید نشستوں اور ساٹھ لاکھ پونڈ کی رقم کی جو ذمہ داری لی ہے اس سے عہدہ برآہ ہونے میں زبردست قربانی اور سرتوڑ کوششوں کی ضرورت ہے، اس لیے کہ یونیورسٹیوں اور تربیتی کالجوں میں خود برطانوی طلباء کے لیے نشستوں کی بڑی مانگ ہے۔ ہمارے اعلیٰ تعلیمی اداروں میں اتنی نشستیں نہیں ہوتیں جتنی ہر سال انھیں درخواستیں موصول ہوتی ہیں۔ چنانچہ دولت مشترکہ اور نوآبادیات کی بھاری مانگ کو پورا کرنے کی غرض سے برطانوی طلباء کی تھوڑی بہت درخواستیں مسترد کرنا ہوتی ہیں۔

پھر نوآبادیات اور زیر حفاظت علاقوں میں تعلیمی ترقی کے معاملہ میں برطانیہ نے مالی طور پر جو حصہ لیا ہے وہ بھی قابل ذکر ہے۔ اس کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جا سکتا ہے کہ اپریل ۱۹۴۶ء سے مارچ ۱۹۵۸ء تک کے بارہ سال میں ۹ کروڑ چالیس لاکھ پونڈ کے عطیات اور قرضے نوآبادیاتی ترقیاتی و فلاح و بہبود قوانین کے تحت دیے گئے۔ اس رقم سے ساڑھے تین کروڑ پونڈ تعلیم کے لیے ایک کروڑ ساٹھ لاکھ پونڈ پرائمری اور ثانوی تعلیم، ساٹھ لاکھ پونڈ فنی اور پیشہ ورانہ تعلیم کے لیے مخصوص کیے گئے تھے۔

ظاہر ہے کہ اہل برطانیہ کی مالی امداد اور ہر قسم کی امداد و اعانت ہی کی بدولت نوآبادیات اور نئے

خود مختار ممالک دولت مشترکہ کے اعلیٰ تعلیمی شعبے۔ یونیورسٹی کالج، آرٹ، سائنس اور ٹیکنالوجی کالج معرض وجود میں آئے۔ لیکن برطانوی مالی امداد سے قطع نظر، جو بڑی فراخدلی کے ساتھ فراہم کی گئی ہے۔ اساتذہ کی تربیت اور سمندر پار کے علاقوں کو اساتذہ کی خدمات کی فراہمی میں برطانیہ نے کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔

ان کوششوں کا نتیجہ ہے کہ آج برطانیہ کے اساتذہ تربیتی اداروں میں ۹۰۰ طلبا ہیں جن میں سے ۴۰۸ اسکاٹ لینڈ میں مطالعہ کر رہے ہیں۔ یہ تعداد حقیقت میں اس سے کہیں زیادہ ہے اس لیے کہ حکومت ملایا نے برطانیہ کی وزارت تعلیم کی مدد سے لرپول کے نزدیک کرکبی میں اور وولور ہیپٹن کے مضافات برنسفورڈ لاج میں دو اساتذہ تربیتی کالج قائم کیے ہیں۔ ان میں سے ہر ادارہ میں تین سو ملایائی اور چینی طلبا تعلیم پاتے ہیں۔ ویسے دولت مشترکہ کے ترقی پذیر ممالک میں مزید اساتذہ کی تربیت کی جو ضرورت شدت سے محسوس کی جا رہی ہے اس پر آکسفورڈ کی دولت مشترکہ تعلیمی کانفرنس میں کافی سوچ بچار ہوا تھا۔ اس موقع پر یہ تسلیم کیا گیا کہ دولت مشترکہ کے ہر ملک کو ایک فرض کے طور پر دوسروں کی مدد کرنی چاہیے اس کے لیے اسے چاہے ذاتی مفاد ہی کیوں نہ قربان کرنا پڑیں۔ وقت کی اسی اہم ضرورت کے پیش نظر برطانیہ نے ۱۹۶۰ء-۱۹۶۱ء کے تعلیمی سال میں اساتذہ کی تربیت کی مزید پانچسو نشستوں کی پیشکش کی ہے۔ ڈھائی لاکھ پونڈ کے وہ سالانہ عطیات ان کے علاوہ ہیں جو یہ نشستیں حاصل کرنے والے طلباء کو دیے جائیں گے۔

اساتذہ کی خدمات : امید ہے کہ برطانیہ سنہ ۱۹۶۱ء میں مزید ۵۰۰ اساتذہ کی خدمات حاصل کر سکے گا، جو اوسطاً تین سال تک دولت مشترکہ میں خدمات انجام دیں گے۔ خیال ہے کہ اس تعداد میں ہر سال تقریباً ۲۰۰ کا اضافہ ہوگا جو تین سال تک جاری رہے گا۔ نیز ۱۹۶۳ء کے بعد کم و بیش چار سو مزید برطانوی اساتذہ دولت مشترکہ ممالک میں تدریسی خدمت سرانجام دینے لگیں گے۔

اس کے ساتھ ساتھ دولت مشترکہ ممالک کے زیادہ سے زیادہ اساتذہ باہمی تبادلہ کے منصوبوں کے تحت برطانیہ پہنچ رہے ہیں یا انھیں براہ راست برطانوی یونیورسٹیوں میں کوئی منصب سونپا جا رہا ہے۔ اس طریقہ سے دو طرفہ آمد و رفت ہو رہی ہے۔ لیکن اس کے باوجود درس و تدریس کے عملہ کی خدمات حاصل کرنے کے معاملہ میں دولت مشترکہ کی نگاہیں سالہا سال تک برطانیہ کی جانب لگی رہیں گی۔

پھر اس حقیقت کو بھی فراموش نہیں کیا جا سکتا کہ جدید مشینوں اور اعلیٰ فنی چابکدستی کے اس دور میں خصوصیت کے ساتھ ترقی پذیر ممالک دولت مشترکہ میں تربیت یافتہ فنی ماہرین اور صناعوں کی مانگ اصل ضرورت سے کہیں تجاوز کر چکی ہے۔

یہی چیز آکسفورڈ کانفرنس میں بھی زیر غور آئی اور بالآخر یہ طے پایا کہ "قدیم" دولت مشترکہ ممالک کے موجودہ فنی اداروں اور تربیتی کالجوں میں نسبتاً چھوٹے ملکوں کے طلبہ کے لیے زیادہ نشستیں رکھی جائیں۔ جہاں تک برطانیہ کا تعلق ہے تو وہ ۱۹۸۰ء تک اپنے فنی کالجوں میں دولت مشترکہ طلبا کے لیے مزید چار ہزار نشستیں قائم کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔

ویسے اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو خود مختار دولت مشترکہ میں فنی تعلیم کی ترقی کے لیے برطانیہ نے جس ذریعہ سے زیادہ تر امداد دی ہے اسے کولمبو منصوبہ سے منسوب کیا جاتا ہے۔ اس منصوبہ کی شروعات ۱۹۵۱ء کے آخر تک برطانوی حکومت نے کولمبو منصوبہ علاقہ کے تمام ملکوں کے دو ہزار چار امیدواروں کو سہولتیں بہم پہنچائیں۔ رہے یہ امیدوار تو انہیں ان کی حکومتوں نے نامزد کیا تھا ان میں سے ایک ہزار آٹھ سو تربیت یاب پاکستان، ہندوستان، سیلون اور ملاقیہ ملایا سے برطانیہ گئے۔

ان کے علاوہ بھی متعدد منصوبے ہیں جن کے تحت برطانوی صنعتوں میں عملی تربیت دی جاتی ہے مثال کے طور پر اتھلون فیلوشپ اسکیم کے تحت جس کی مالی کفالت حکومت برطانیہ کرتی ہے۔ ہر سال جو ۳۰ کنیڈی انجینئر دو سال کا پوسٹ گریجوایٹ کورس کرنے برطانیہ پہنچتے ہیں۔ ان میں سے اکثر صنعتوں میں اپنا خاصہ وقت صرف کرتے ہیں۔ برطانوی صنعتوں کا ادارہ اور بے شمار بڑی بڑی صنعتی فرمیں دولت مشترکہ کے فنی ماہرین اور صناعوں کی تربیت کی غرض سے وظیفوں کی اسکیمیں فراہم کرتی ہیں۔

اب برٹش کونسل کے مفید کاموں کا اندازہ لگائیے جس کا ذکر کیے بغیر برطانیہ کے اس عظیم کام کی تصویر مکمل نہیں ہوتی جو اس نے دولت مشترکہ اور نوآبادیات میں تعلیم کے میدان میں کیا ہے کونسل وظیفے دیتی ہے۔ نیز اسے سرکاری خزانہ سے مالی امداد ملتی ہے۔ تاکہ وہ حکومت برطانیہ کی

جانب سے برطانیہ آنے والے طلبار کے میزبانی کے فرائض انجام دے سکے۔

مزید براں برٹش کونسل متعلقہ دولت مشترکہ حکومتوں کی درخواست پر ان کے ممالک میں درس تدریس کے عملہ کی خدمات حاصل کرنے کی بھی ذمہ دار ہے۔ نیز وہ انگریزی کے مقامی اساتذہ کی تربیت کے سلسلہ میں ہاتھ بٹاتی ہے۔ کونسل کے ماہرین کی خدمات پاکستان کی ایک یونیورسٹی کو مستعار دی گئی ہیں۔ یہی نہیں بلکہ اس نے بطور ثانوی زبان انگریزی پڑھانے کے ممتاز برطانوی ماہرین کے دولت مشترکہ علاقوں کے دوروں کے انتظامات کرنے کے علاوہ ان دوروں کے تمام اخراجات بھی خود برداشت کیے۔ کونسل نے متعدد سمندر پار کے ماہرین کے برطانیہ کے دورے بھی ترتیب دیے تاکہ وہ مزید مطالعہ کر سکیں۔

حفظان صحت کا نیا ادارہ

ٹریڈ یونین کانگریس برطانیہ کے کارخانوں میں بہتر صحت کے لیے مہم شروع کرنے کی تیاری کر رہی ہے، قومی بیمہ اور صنعتی فلاح کے کام میں توسیع کے لیے بجٹ میں گنجائش رکھنے کا پہلے ہی فیصلہ کر لیا گیا ہے اس سلسلہ میں مزید عملہ کا تقرر کیا جائے گا جو طبی امور میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرے گا۔

اس کے دوہرے مقاصد ہیں۔ اوّلاً متعلقہ لوگوں کو طبی مشورہ اور معلومات بہم پہنچانا تاکہ انھیں اپنی تجارتوں اور صنعتوں میں صحت کے جن مسائل سے دوچار ہونا پڑ رہا ہے انھیں موثر طریقے سے نمٹا سکیں دوسرے اس موقف کو مضبوط بنانا جو ٹریڈ یونین کانگریس جامع صنعتی تندرستی ادارہ کی ترقی کے لیے عوام، صنعت اور ارباب اقتدار کو پیش کر رہی ہے

ٹریڈ یونین کانگریس کی یہ تحریک کوئی نئی چیز نہیں ہے بلکہ اس کا عزم صمیم اس شاہراہ پر مزید سنگ میل تعمیر کرنے کا ہے جو ایک صدی سے بھی زیادہ مدت سے زیر تعمیر ہے۔ پہلا ابتدائی سنگ میل اسّی سال پیشتر قائم ہوئے تھے۔ جبکہ خطرناک تجارتوں پر کنٹرول ہوا تھا۔ اور کچھ ستر سال قبل جبکہ کارخانوں کے نگران ادارہ کے پہلے طبی ناظر کا تقرر کیا تھا۔ اس نے سیسہ کے زہر کی روک تھام کے سلسلہ میں نمایاں کام کیا اور خون میں سیاقی اثر، سونتیا بند، صنعتی جلدی سرطان اور پارہ، سنکھیا اور فاسفورس کے زہر کے اثرات کی پہچان بین کی۔

یہ ایک ایسا کارنامہ تھا جس کی وجہ سے برطانیہ اور دنیا بھر میں ہزاروں لاکھوں مرد اور عورتیں صنعتی بیماریوں میں مبتلا ہونے کے خوف سے آزاد ہو گئے ۔

پھر ان لوگوں کو قوم کے سماجی بیمہ منصوبہ کے تحت خاص مراعات دی جاتی ہیں جو چالیس صنعتی بیماریوں یا صنعتی پھیپھڑے کی بیماریوں میں سے کسی ایک میں مبتلا ہوں، اس فائدہ کا مستحق ثابت کرنے کے لیے مزدور اپنی یونینوں سے ماہرانہ مشورہ اور امداد کی توقع رکھتے ہیں اور یونین دوسری بیماریوں کو فہرست میں شامل کرانے کے لیے جدوجہد کرتی رہتی ہیں۔ ان سب کا مطلب یہ ہے کہ معلومات جمع کرنے چھان بین جمع کرنے اور ان کو اچھی طرح پیش کرنے کے لیے ایک وسیع پروگرام بنانا پڑتا ہے جس میں نہ صرف یونین بلکہ ٹریڈ یونین کانگرس بھی شامل ہوتی ہے جس سے یونینیں امداد و اعانت چاہتی ہیں۔ معاوضہ اور بحالی کے منصوبوں کو لیاقت اور ہمدردی سے بروئے کار لانے اور ان سروسوں میں مزید ترقی کے مواقع تلاش کرنے کے علاوہ یونینوں نے حفظ ماتقدم اور علاج دونوں پر نگاہ رکھی ہے ۔

ان کی تشویش کا خاص سبب یہ ہے کہ حالیہ سالوں میں مزدوروں کی صحت کو بہت سے نئے خطرات لاحق ہو گئے ہیں ۔ ریڈیائی اور کیمیائی اشیا جو جنگ سے پہلے سائنسی تجربات کی حیثیت رکھتی تھیں اب کارخانوں میں تیز رفتاری کے ساتھ عام طور پر استعمال ہو رہی ہیں اور یونینیں بجا طور پر خائف ہیں کیوں کہ ان میں سے بعض ریڈیائی اور کیمیائی مادے تندرستی کے لیے بے حد مضر ہیں۔ نئے صنعتی طریقوں میں اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ گرد اور بودار دھوؤں پر قابو پانے کے لیے خاص احتیاط برتی جائے۔ کیوں کہ یہ زہریلے مادے پھیپھڑوں کو خراب کرنے کے علاوہ جلد اور آنکھوں پر بھی بری طرح اثرانداز ہوتے ہیں۔

ٹریڈ یونین کا اہم کام اپنی ان کوششوں میں اضافہ کرنا ہوگا جو وہ ایک خاص اعتقاد اور جذبہ کے ساتھ کر رہی ہے کہ قومی صحت کے منصوبہ میں جو خلا ہے، سے ملک گیر خاص ادارۂ صحت کے قیام سے پر کیا جائے۔ تاکہ اس سے مزدوروں کی صحت کی حفاظت ہو سکے ۔

شمارہ ۱۴] لاہور [مارچ

اس شمارہ میں

مدیران تحریر { پروفیسر سراج الدین / پروفیسر میاں نامدار خاں

معاونین { عبدالغفور چوھدری / فضل [illegible]

آموزش

لاہور

مارچ ۱۹۶۰ء	سالانہ چندہ
جلد ــــــ ۱۲	پاکستان کے لیے ۶ روپے
شمارہ ــــــ ۱۲	غیر ممالک کے لیے ۸ روپے

قیمت فی پرچہ دس ۱۰ آنے

پبلشر

یونی ورسٹی بک ایجنسی۔ لاہور

آر، ایچ، ڈی تھامس پرنٹر پبلشر نے دین محمدی پریس میں طبع کرا کے
[illegible] ۱۹۵۰ء میں شائع کیا

تعلیمی رپورٹ کا جائزہ

میاں نامدار خاں

قومی تعلیمی کمیشن کی پوری رپورٹ چھپ کر لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچ چکی ہے۔ ملک کے اہل الرائے اصحاب نے اس کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان سے پتہ چلتا ہے کہ یہ رپورٹ صحیح معنوں میں ملکی تاریخ میں سنگ میل کا درجہ رکھتی ہے۔ ایک ذمہ دار قومی راہنما نے بجا طور پر کہا ہے کہ یہ پہلی تعلیمی رپورٹ ہے جس میں اس چیز کے متعلق واضح اور معین سفارشیں کی گئی ہیں کہ تعلیم کی ہر منزل پر اصلاح و ترمیم کو کیا شکل اختیار کرنی چاہیے۔ اس سے پہلے مروجہ تعلیمی نظام کے متعلق یہ شکایت تو بار بار کی گئی تھی کہ یہ فرسودہ، از کار رفتہ اور دورِ غلامی کی یادگار ہے۔ مگر اسے از سر نو منظم کرنے اور درست شکل دینے کی کوئی قطعی راہیں تجویز نہ کی گئی تھیں۔ تعلیمی کمیشن نے اس اہم ضرورت کو پورا کر دیا ہے کمیشن کی پیش کردہ سفارشوں سے کسی کو تھوڑا بہت اختلاف ہو تو ہو مگر اس بات سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ اس نے تعلیمی نظام کو ایڑی سے لے کر چوٹی تک تبدیل کر دینے کے لیے ایک جامع خاکہ تیار کر دیا ہے۔

تعلیمی کمیشن کے اپنے الفاظ میں اس کی ساری سفارشوں کی بنیاد یہ یقین ہے کہ: "ہر قوم کے نظامِ تعلیم کے لیے لازم ہے کہ وہ لوگوں کی انفرادی اور اجتماعی آرزوؤں اور ضرورتوں کو پورا کرے۔ لہٰذا ہمارے نظامِ تعلیم کو چاہیے کہ جن مقاصد نے پاکستان کو جنم دیا تھا وہ انہیں زندہ رکھنے اور قومی وحدت پیدا کرنے میں ایک نمایاں کردار ادا کرے۔" اس بنیادی نقطۂ نگاہ سے کوئی شخص اختلاف نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ ملک کے دونوں بازوؤں میں اہل الرائے طبقہ نے کمیشن کی رپورٹ کا گرم جوشی سے استقبال کیا ہے۔ رپورٹ نے قومی نظامِ تعلیم کا جو تفصیلی خاکہ تیار کیا ہے وہ یقیناً ملکی سالمیت قومی وحدت اور انفرادی نشو و نما کے متوازن عناصر سے مل کر بنا ہے۔ پچھلے دس بارہ برس میں جو قومیں بحیثیت ... رہیں انھوں نے مختلف قومی عناصر کو ایک دوسرے سے اس حد تک محدود کر ...

کہ ان کے ایک ساتھ کام کرنے کی امیدیں تیزی سے ختم ہو رہی تھیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جن عناصر نے باہم مل کر پاکستان قائم کیا تھا وہ کسی لحظہ بکھر کر گر پڑیں گی اور یہ نیا ملک ایک بے معنی خواب ہو کر رہ جائے گا۔ اس افسوس ناک صورت حال کو علی الاجلد ختم کرنا ہماری پہلی قومی ضرورت تھی۔ یہ ضرورت تعلیم ہی کے ذریعے پوری کی جا سکتی تھی۔ الحمدللہ تعلیمی کمیشن نے اپنی اس ذمہ داری کو اچھی طرح پہچانا اور اسے انجام دینے کی ایک معقول اور قابل عمل صورت ملک کے سامنے رکھی ہے۔

کمیشن کی رپورٹ کا ایک اور نمایاں پہلو تشکیل کردار کو مناسب جگہ دینا ہے۔ کمیشن نے بجا طور پر اس بات پر زور دیا ہے کہ انسانی کوشش کی آخری منزل بنیادی اخلاقی اور روحانی قدریں ہی ہو سکتی ہیں۔ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ پاکستان بعض مخصوص ثقافتی اور روحانی قدروں کے تحفظ کے لیے قائم کیا گیا تھا۔ مگر اب تک ان قدروں کو مذہب کی محض رسمی شکل ہی دی جاتی رہی ہے۔ ہم نے من حیث القوم اب تک یہ نکتہ نہیں سمجھا کہ قرآن حکیم اور اسوۂ نبوی دونوں میں ابدی سچائی کے ایسے لافانی شاہکار موجود ہیں جو ہر زمانے میں انسانی ذہن اور انسانی روح کی فطری پیاس بجھانے کے لیے کافی ہیں۔ مذہب کو سختی سے رسمی شکل میں پیش کرنا اپنے اندر ایک حقیقی خطرہ رکھتا ہے۔ اس سے یہ امکان بڑھ جاتا ہے کہ نئی پود رسم پرستی سے بدک کر کہیں ہر اچھی چیز سے ہی متنفر نہ ہو جائے۔ اس خطرہ کا مؤثر علاج یہی ہے کہ مذہب کو لافانی اخلاقی اور روحانی قدروں کی شکل میں پیش کیا جائے۔ کمیشن کی اس سفارش کی معقولیت پوری طرح تسلیم کی گئی ہے۔

اس وقت ملک کے سامنے اہم کام تعلیمی رپورٹ کو عملی جامہ پہنانا ہے۔ کمیشن کی سفارشیں اپنی جگہ بہت اچھی ہیں مگر ان سے عملی فائدہ اٹھانے کے لیے لگاتار کام اور بہت سی قربانیوں کی ضرورت ہے۔ ایک نیم ترقی یافتہ ملک میں نظام تعلیم کو از سر نو تعمیر کرنے کے لیے بہت بھاری خرچ کی ضرورت ہے۔ پھر اکیلا خرچ کافی نہیں۔ تعلیم کا نیا نظام بھی اسی حد تک اچھا ثابت ہوگا جس حد تک اسے چلانے کے لیے اچھے آدمی دستیاب ہوں گے۔ یہ دونوں کام کافی مشکل اور صبر آزما ہیں۔ انہیں تسلی بخش طور پر انجام دینے کے لیے حکومت اور عوام دونوں کو سرگرم تعاون سے کام کرنا ہوگا۔ تعلیمی نظام کی از سر نو تعمیر آج ہمارے لیے ایک بہت بڑا چیلنج ہے۔

آواز اور شخصیت

فضل احمد

تدریس اور مؤثر شخصیت

اس بارے میں سب کو اتفاق ہے کہ کوئی شخص مؤثر شخصیت کا مالک بنے بغیر اچھا استاد نہیں بن سکتا. استاد کی بنیادی ذمہ داری ایک پختہ اور بالیدگی خیز شخصیت کی ضیا پاشی کرنا ہے. یہی وہ جادو ہے جس کے ذریعے وہ دوسرے دلوں کو جگاتا اور انھیں نشو ونما کی پسندیدہ راہوں پر لگاتا ہے. یہی وہ مقناطیس ہے جو طلبہ کے دل و دماغ میں چھپی صلاحیتوں کو کھینچ باہر نکالتا اور ان میں بڑھنے پھولنے کی تڑپ پیدا کرتا ہے. اگر استاد کی شخصیت میں یہ مقناطیسی کشش نہ ہو تو اس کا ہونا نہ ہونا برابر ہے کیوں کہ بنیادی مہارتیں حاصل کر لینے کے بعد بیشتر طلبہ اس قابل ہو سکتے ہیں کہ بہت سی باتیں خود کتابوں سے پڑھ کر یا ریڈیو سے سن کر سیکھ لیں. مگر کتابیں اور ریڈیائی نشریات کسی مقناطیسی شخصیت کی ضیا پاشی نہیں کر سکتیں. اسی طرح جہاں تک معلومات اور مہارتیں سکھانے کا تعلق ہے ہر استاد انھیں ایک بھلے طور پر طلبہ کے سامنے پیش کر سکتا ہے. مگر جہاں ایک استاد کا کام بے پناہ تاثیر پیدا کر سکتا ہے، دوسرے استاد کا کام نسبتاً بے نتیجہ رہ سکتا ہے. فرق ڈالنے والی چیز ان دونوں استادوں کی شخصیتوں کا اختلاف ہے. ایک کی شخصیت مؤثر اور پُرکشش ہے، دوسرے کی غیر مؤثر اور بے کشش.

تدریس ان چند پیشوں میں سے ہے جن میں شخصیت فیصلہ کن چیز ثابت ہوتی ہے. زندگی میں بیسیوں پیشے ایسے ہیں جن میں انسان شخصیت کے معاملے میں بڑی حد تک بے نیاز ہو سکتا ہے، مگر استاد اس قسم کی بے نیازی کی جرأت نہیں کر سکتا. ہر روز بیسیوں منتظر نگاہیں اس سے زندگی کی حرارت حاصل کرنے کے [illegible] بے چین رہتی ہیں. اگر یہ نگاہیں اپنی تلاش میں ناکام رہیں تو انھیں بے حد مایوسی ہوتی ہے [illegible]

امنگوں پر اوس پڑ جاتی ہے۔ وہ مدرسے سے اکتا جاتے ہیں اور استاد کے متعلق بھی کوئی اچھی رائے نہیں رکھتے۔

طلبہ خواہ سیانے ہوں یا کم عمر، وہ استاد کی شخصیت سے اثر قبول کیے بغیر نہیں رہتے۔ بعض استاد اس غلط فہمی میں رہتے ہیں کہ وہ چھوٹے بچوں کو جس طرح بھی چاہے گزار سکتے ہیں۔ چھوٹے بچوں میں اتنی پختگی ہی نہیں ہوتی کہ وہ استاد کی شخصیت کے متعلق کوئی رائے قائم کر سکیں۔ جو استاد اس قسم کی خود فریبی میں مبتلا رہتے ہیں انہیں چاہیے کہ کبھی اپنے متعلق اپنے معصوم شاگردوں کا تبصرہ بھی سن لیں۔ مدرسے سے واپسی پر بچے بھولے بھالے انداز میں جب ماں باپ اور بھائی بہنوں کو مدرسے کی دن بھر کی کہانی سناتے ہیں تو اس کا بڑا حصہ استاد پر معنی خیز تبصرہ ہوتا ہے۔ بہر حال کوئی استاد حقیقی طور پر مؤثر شخصیت کے بغیر طلبہ کو کبھی مطمئن نہیں کر سکتا، خواہ طلبہ کم عمر ہوں یا سیانے۔

شخصیت کیا ہے؟

یہاں فوراً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ شخصیت کن عناصر سے مل کر بنتی ہے؟ ایک سطحی نگاہ کے لیے شخصیت محض قد و قامت، لباس، اطوار وغیرہ کے مجموعے کا نام ہے۔ اس میں کلام نہیں کہ انسان کا سب سے پہلا تاثر اس کی ظاہری شکل و صورت اور لباس سے ہی پیدا ہوتا ہے۔ مگر یہ محض ایک نقطۂ آغاز ہے۔ شخصیت کے یہ ظاہری عناصر بلاشبہ انسان کو دوسروں سے اچھے انداز میں متعارف کرا دیتے ہیں۔ مگر کسی نئے آدمی کی قدر و قیمت کا اندازہ کرنے کے لیے ہم پورے طور پر ان الفاظ پر بھروسہ نہیں کرتے جو کسی تعارف کرانے والے نے اس کے متعلق کہے ہوں۔

فرض کیجیے آپ کا ایک دوست زید نامی شخص کا تعارف آپ سے اچھے الفاظ میں کراتا ہے آپ کو اپنے دوست پر بھروسہ ہے اس لیے آپ اس کے تعارفی الفاظ کو ذہنی قرار دیتے ہیں اور زید کو ایک اچھا آدمی سمجھنے لگتے ہیں۔ مگر بات یہاں ختم نہیں ہو جاتی۔ اب آپ کو زید سے ذاتی واسطہ پڑتا ہے۔ آپ کچھ عرصے تک اس کے ساتھ مل کر کام کرتے ہیں۔ یہ ذاتی واسطہ آپ کو اس بات کا موقع دیتا ہے کہ آپ زید کی زندگی کے ایسے ایسے گوشے بھی قریب سے دیکھیں جن کے متعلق تعارفی

الفاظ میں کچھ نہیں کہا گیا تھا۔ اگر آپ کے یہ قریبی تاثرات تعارفی الفاظ کی تائید کریں تو آپ کے دل میں زید کی
قدر و منزلت کئی گنا زیادہ ہو جاتی ہے لیکن اگر بد قسمتی سے یہ تاثرات تعارفی الفاظ کی تردید کر دیں تو آپ
زید کے متعلق نہایت گھٹیا رائے قائم کرتے ہیں۔ اچھے تعارفی الفاظ اِس رائے کو رائی بھر بہتر نہیں بنا سکتے۔

بالکل یہی حال انسان کی ظاہری شکل و صورت اور اس کے ذاتی جوہروں کا ہے: ظاہری شکل و صورت
انسان کا تعارف اچھے الفاظ میں ضرور کرا دیتی ہے۔ اس کے بعد اگر ذاتی جوہر اس تعارف کو مزید سہارا دیں
تو انسان کی شخصیت بہت اثر پیدا کرتی ہے۔ لیکن اگر ایسا نہ ہوا اور ذاتی جوہر ظاہری شکل و صورت اور لباس
سے پیدا ہونے والے تاثر کو جھٹلائیں تو ظواہر کا سارا اثر خاک میں مل جاتا ہے اور انسان اپنے جاننے
والوں کی نظروں سے گر جاتا ہے۔

اس سے ظاہر ہے کہ شخصیت کی اصل جان انسان کے ذاتی جوہر ہیں۔ اچھا اخلاق، پاکیزہ اطوار
متوازن جذبات، گہری نگاہ، حقیقی علمیت، شیریں کلامی، بیدار اور اس قسم کے دوسرے ذاتی جوہر ہی حقیقت
میں شخصیت کے اصل عناصر ہیں۔ اور انجام کار یہی جوہر دوسروں کی نگاہ میں آپ کا مقام متعین کرتے ہیں
آپ ظاہری شکل و صورت اور لباس کے بل پر شروع شروع میں اپنا اعتبار ضروری جما سکتے ہیں لیکن
جونہی دوسروں کو آپ سے ذرا گہرا واسطہ پڑے گا۔ یہ ابتدائی اعتبار کچھ زیادہ کام نہیں دے گا۔

شخصیت میں سب سے زیادہ تاثیر پیدا کرنے والی چیز وہ یقین اور ایمان ہے جو آپ کے دل اور
دماغ پر حکمران ہے۔ ایک برطانوی جرنیل کو نپولین سے پہلی بار ملنے کا اتفاق اس وقت ہوا جب وہ سینٹ
ہیلینا کے جزیرے میں قید کی زندگی گزار رہا تھا۔ بعد میں اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے اس جرنیل نے
کہا تھا کہ زندگی میں پہلی بار مجھے اس بات کا پتہ چلا کہ فوق العادت انسان کسے کہتے ہیں۔ مجھے اچھی طرح
معلوم تھا کہ نپولین اب ہمارا قیدی ہے۔ مگر جب اس سے آنکھیں دو چار ہوئیں تو مجھ پر ایک ایسی پُراسرار
کیفیت طاری ہوئی کہ اگر نپولین مجھے حکم دے دیتا کہ زمین پر لیٹ جاؤ میں تمہارے اوپر سے چلنا چاہتا ہوں
تو میں فوراً اس کے حکم کی تعمیل کرتا۔

یہ واقعہ بہت معنی خیز ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ شخصیت کو پُراثر بنانے میں یقین و ایمان کو

کلیدی درجہ حاصل ہے۔ جو شخص اپنی زندگی کی پوری قوت کسی ایک مقصد کے لیے وقف کر دے اس کی شخصیت میں ایک ایسی عجیب و غریب مقناطیسیت پیدا ہو جاتی ہے جو عام انسانوں کو نصیب نہیں ہوتی۔ وجہ بالکل ظاہر ہے جس انسان کی قوت ارادی طرح طرح کے مقاصد کے درمیان بٹی ہوئی ہو۔ اس کی آنکھوں میں یقین کی وہ چمک کبھی پیدا نہیں ہو سکتی جو اس انسان کی آنکھوں میں دکھائی دے گی جس کی قوت ارادی پورے طور پر صرف ایک ہی مقصد کے لیے وقف ہے۔

قرآن حکیم نے اس لطیف نکتے کی وضاحت ایک بڑی عام فہم مثال سے کی ہے۔ اس نے دو آدمیوں کی مثال پیش کی ہے۔ ان میں سے ایک صرف ایک ہی آقا رکھتا ہے اور دل و جان سے ہر وقت اس کی خدمت کے لیے حاضر رہتا ہے۔ اس کے مقابلے میں ایک اور آدمی ہے جس کے بیسیوں آقا ہیں اور وہ سب اسے بیک وقت مختلف سمتوں میں کھینچتے ہیں۔ اس کی جان ہر وقت عذاب میں رہتی ہے اور وہ کبھی قطعی طور پر یہ فیصلہ نہیں کر پاتا کہ اپنے متعدد آقاؤں کو کس طرح خوش رکھے۔ کیا یہ دونوں آدمی ایک سی شخصیت کے مالک ہو سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام انسانی وفاداریوں میں کسی قسم کی تقسیم کو جائز نہیں سمجھتا۔ عیسائیت کی طرح وہ اس بات کا قائل نہیں کہ خدا اور بادشاہ دونوں کے حقوق الگ الگ ہیں ان کو الگ الگ ادا کرو ان دونوں کا ایک دوسرے سے کچھ تعلق نہیں۔ اس کے برعکس اسلام دینی اور دنیاوی قیادت ایک ہی نقطے پر جمع کرتا ہے۔ وہ خلیفۂ وقت کو نہ صرف حکومت کا سربراہ بناتا ہے۔ بلکہ دین کا سربراہ بھی دینی اور دنیاوی قیادت کو ایک جگہ رکھنے میں مصلحت یہی ہے کہ انسانوں کی شخصیتیں ٹکڑوں میں بٹ کر بے اثر نہ بننے پائیں۔

آواز اور شخصیت

شخصیت کا اصل راز اگر ایمان و یقین میں ہے تو ایمان و یقین کی جڑیں انسانی جذبات میں گڑی ہوتی ہیں۔ بے شک پسندیدہ عقیدہ وہ ہے جس کی عمارت معقولیت پر کھڑی ہو لیکن کسی عقیدہ کو معقولیت سے واسطہ ہو یا نہ ہو، امتحان کی گھڑی میں اس کی قوت کا بھروسہ ان جذبات پر ہوا کرتا ہے جو اس کی تائید میں بھڑکیں۔ اس اعتبار سے ایمان اور جذبات میں گہرا تعلق ہے۔ طوفانی جذبات کے سہارے

جینے والا عقیدہ کبھی صحت مند نہیں ہو سکتا۔ کیوں کہ وہ اپنے حامل کو ذہنی صحت عطا کرنے سے عاجز ہوتا ہے۔

کسی انسان کے اندرونی جذبات کا ایک بہت اچھا آئینہ اس کی آواز ہے۔ یہ کوئی اتفاقی بات نہیں کہ خوف و ہراس کے عالم میں عموماً منہ سے بات نہیں نکلتی۔ غم کا ہجوم ہو تو آواز بھرا جاتی ہے۔ یہ اور دوسری جذباتی کیفیتیں انسان کی آواز پر واضح اثر ڈالتی ہیں۔ ان جذباتی طوفانوں سے قطع نظر ہر انسان کی آواز اس کی دلی کیفیت کی بہت اچھی آئینہ داری کرتی ہے۔ حال ہی میں ہونے والے نفسیاتی مطالعوں نے یہ بات اچھی طرح ثابت کر دی ہے کہ کسی انسان کی گفتار اس بات کی صاف نشان دہی کرتی ہے کہ آیا اس انسان کو اپنے جذبات پر قابو ہے یا نہیں۔ بہت لوگوں کو یہ بات بڑی عجیب معلوم ہو گی لیکن حقیقت یہی ہے کہ آواز اور شخصیت میں بہت گہرا تعلق ہے جو شخص اپنی آواز سے مناسب خدمات لینا چاہے اس کے لیے لازم ہے کہ پہلے اپنے جذبات کو قابو میں رکھنا سیکھے۔

حال ہی میں جو تجربے کیے گئے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ شخصیت کی نشان دہی استعمال کیے جانے والے الفاظ اس قدر نہیں کرتے جس قدر وہ لب و لہجہ جس میں یہ الفاظ بولے گئے ہوں۔ مثلاً ایک کتے کو نہایت میٹھے، محبت بھرے الفاظ میں بلایا گیا۔ مگر ان الفاظ کے ادا کرنے کا لہجہ بڑا تند و تیز تھا۔ کتے کا ردّ عمل وہی تھا جو ناراضگی کے الفاظ کے جواب میں ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف جب کتے کو غصہ ظاہر کرنے والے الفاظ مگر نرم لہجے میں مخاطب کیا گیا تو وہ جواب میں محبت سے دم ہلانے لگا۔

آواز اور جذباتی توازن کا باہمی تعلق معلوم کرنے کے لیے دو نفسیاتی معالجوں نے ایک دلچسپ تجربہ کیا۔ ایک نفسیاتی مریض ان کے زیر علاج تھا۔ یہ علاج بہت عرصہ تک جاری رہا۔ علاج کے مختلف مرحلوں پر مریض کے ساتھ جو بات چیت ہوتی رہی اسے ٹیپ ریکارڈ کر لیا گیا بعد میں دونوں ڈاکٹروں نے ان ریکارڈوں کے سننے میں کئی گھنٹے صرف کیے۔ اس تجربے نے جذبات اور آواز کے درمیان دلچسپ تعلقات ظاہر کیے۔ جب مریض غصے کی حالت میں بولتا تو

اس کی آواز اونچی، تیز اور تیکھی ہو جاتی۔ جب وہ پژمردگی کی حالت میں ہوتا تو اس کی آواز نیچی، آہستہ اور مدھم پڑ جاتی۔ فکر مندی کی حالت میں اس کی آواز میں گنگناہٹ پیدا ہو جاتی۔ یہ ریکارڈ خود مریض نے بھی سنے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ اپنی آواز اور اپنے جذبات کا باہم تعلق اچھی طرح سمجھ گیا اسے پتہ چل گیا کہ اگر وہ اپنی آواز کو متوازن رکھنا چاہتا ہے تو پہلے اسے اپنے جذبات میں توازن پیدا کرنا چاہیے۔

ٹیپ ریکارڈ کی صورت میں جدید سائنس نے محاسبۂ نفس کا ایک ایسا آسان آلہ مہیا کر دیا ہے جس سے بڑی آسانی سے کام لیا جا سکتا ہے۔ اس آلے کی مدد سے ہم اپنی بات چیت ریکارڈ کر سکتے ہیں اور اسے جب چاہیں اور جتنی بار چاہیں سن سکتے ہیں۔ اس سے انسان کو خود اپنی شخصیت کے متعلق جو علم حاصل ہوتا ہے وہ بسا اوقات چونکا دینے والا ثابت ہوتا ہے ہم میں سے اکثر اس غلط فہمی میں مبتلا رہتے ہیں کہ ہم بڑے تحمل مزاج اور خوش کلام ہیں لیکن ٹیپ ریکارڈ جب ہماری عام بات چیت کو من و عن ہمارے سامنے دہراتا ہے تو عام حالتوں میں ہمیں اپنے کانوں پر اعتبار نہیں آتا۔

حال ہی میں اس قسم کے کئی تجربے کیے گئے ہیں۔ مثلاً ایک مشہور امریکی ماہر تجارت کو خیال تھا کہ اس کی گفتگو نرمی اور مٹھاس کا نمونہ ہے۔ ایک روز اس کی معمول کی بات چیت کو ریکارڈ کر دیا گیا۔ جب اسے یہ ریکارڈ سنایا گیا تو اس کے لیے یہ یقین کرنا مشکل ہو گیا کہ بولنے والا وہ خود ہے کیوں کہ بات چیت میں جگہ جگہ تیز مزاجی اور بے صبری کی بو آتی تھی۔

- جذباتی توازن حاصل کرنے کی راہیں

ان تجربوں نے جذباتی توازن حاصل کرنے کے اچھے مؤثر طریق کی نشان دہی کی ہے اپنی عام بات چیت کو ٹیپ ریکارڈ کی صورت میں محفوظ کر لیجیے۔ اب اس ریکارڈ کو سنیے اس میں جو جو باتیں آپ کو ناپسند ہوں انھیں اچھی طرح نوٹ کریں۔ اس کے بعد اپنی تدریجی اصلاح کی طرف متوجہ ہوں۔ جذباتی عدم توازن سے باخبر ہو جانا عام حالتوں میں

جذباتی توازن کی طرف ایک لمبا قدم ثابت ہوتا ہے۔ یہ علم انسان کو اس قابل بنا دیتا ہے کہ ناپسندیدہ جذبات پر قابو پانا سیکھے۔ جوں جوں جذبات قابو میں آنے لگتے ہیں آواز میں از خود تبدیلی پیدا ہونے لگتی ہے۔

یہ طریق کار کئی لوگوں نے کامیابی کے ساتھ آزمایا ہے: ایک مشہور کاروباری آدمی نے اپنی گفتگو کا جائزہ لینے کے لیے اپنی ٹیلی فون کی بات چیت کو ٹیپ ریکارڈ کرایا۔ جب اس کے کانوں نے یہ ریکارڈ سنا تو وہ سناٹے میں آگیا۔ اسے یہ معلوم کر کے بڑی ندامت ہوئی کہ اس کے تیکھے اور ترچھی بات کہنے میں کتنی کرختگی تھی۔ چناں چہ اس نے اس کرختگی کو ملائمیت میں بدلنے کے لیے مشق شروع کی۔ اسے جلد ہی معلوم ہو گیا کہ یہ تبدیلی اس کے جذبات میں بھی تبدیلی چاہتا ہے۔ مشق کرنے سے اسے رفتہ رفتہ جذبات پر قابو حاصل ہوتا گیا اور آخر کار اس کی آواز میں مطلوبہ تبدیلی پیدا ہو گئی۔

ایک مشہور نفسیاتی معالج جس نے بہت سے مریضوں کی آواز کا تجزیہ کیا ہے اس معاملے پر رائے ظاہر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ جب تک کوئی شخص خود اپنی حقیقت کو نہ پہچان لے وہ اس وقت تک وہ اپنی قدرتی آواز سے کام نہیں لے سکتا۔ جن لوگوں کی آواز جذباتی تناؤ کی آئینہ داری کرتی ہے وہ فی الحقیقت ایک جھوٹی شخصیت کے حامل ہوتے ہیں۔ اس جھوٹی شخصیت کا خاتمہ کیے بغیر وہ اپنا قدرتی لب و لہجہ اختیار نہیں کر سکتے۔

آواز کے نقائص دور کرنے کے لیے اس ماہر نفسیات کا یہ مشورہ ہے کہ اپنے گھر والوں کے درمیان بیٹھ کر کوئی کتاب اونچی آواز سے اس طرح پڑھیے کہ کتاب کے مطالب ان پر واضح ہوتے جائیں۔ اس سے بہت جلد آپ کو اپنے لب و لہجہ کی کمیوں کا احساس ہونے لگے گا۔ آواز میں گہرائی، سکون اور ایک پُر وقار حسن پیدا ہونا شروع ہو گا اور ہوتے ہوتے آپ کی آواز میں وہ مٹھاس پیدا ہو جائے گی جو سننے والوں کو بھلی معلوم ہو۔

آواز کی خوبی گھٹانے یا بڑھانے میں اس کی بلندی کو بڑا دخل حاصل ہے۔ تیز آواز کسی کو بھلی معلوم نہیں ہوتی۔ اس لیے اگر آپ کی آواز تیکھی ہے تو اسے مدھم کیجیے، تاکہ اس میں رسیلا پن

پیدا ہو۔ بعض لوگ تنکیمی آواز کے اس حد تک عادی ہو جاتے ہیں کہ وہ نرم لہجہ اختیار ہی نہیں کر سکتے ایسے لوگوں کو چاہیے کہ مختلف بولیوں کے لب و لہجہ کی مشق کریں، اس سے لہجہ میں کشادگی پیدا ہوتی ہے اور انسان اس قابل ہو جاتا ہے کہ حسب ضرورت آواز کو اونچا نیچا کر لیا کرے۔

آواز کو بہتر بنانے کے لیے اور کئی تدبیریں بھی اختیار کی جا سکتی ہیں۔ جب انسان پر جذبات کا غلبہ ہو تو اُس وقت گنگنانا فائدہ مند ثابت ہوتا ہے۔ اس سے تنے ہوئے جذبات باہر نکل کر کچھ سکون پیدا کر دیتے ہیں اور انسان اس قابل ہو جاتا ہے کہ عام لہجے میں بات کر سکے۔

سانس کی آمد و رفت اور آواز کے درمیان بہت گہرا تعلق موجود ہے۔ جب انسان بولتا ہے تو وہ یہ ضرورت محسوس کرتا ہے کہ سانس باقاعدہ وقفوں کے بعد آ کر اسے تازہ دم کرتا رہے۔ اگر سانس کی آمد و رفت بے قاعدہ ہو جائے تو اس سے آلات صوت میں خلل پڑتا ہے۔ جو لوگ اپنی آواز کو بہتر بنانا چاہیں ان کے لیے ضروری ہے کہ سانس کی آمد و رفت کی طرف بھی توجہ دیں، اس کے باقاعدہ ہو جانے سے آواز میں نمایاں اصلاح نظر آنے لگتی ہے۔

جب آپ غصے میں ہوں تو بولنے سے پہلے ایک گہرا سانس اندر کھینچیں۔ غالب امکان یہ ہے کہ اس سانس کے باہر نکلنے کے ساتھ ہی آپ کا بہت سا غصہ بھی باہر نکل جائے گا۔ اس کے علاوہ تازہ ہوا بذاتِ خود ایک زبردست مفرح ہے۔ اس کی غیر معمولی مقدار اندر جا کر طبیعت میں غیر معمولی تازگی پیدا کرے گی اور یہ چیز غصے کو یقیناً کم کر دے گی۔

غرض آواز اور لب و لہجہ کو بہتر بنانا ہمیشہ ممکن رہتا ہے لیکن آواز کو بہتر بنانے کا خیال اسی صورت میں پیدا ہو سکتا ہے جب انسان یہ سمجھ لے کہ آواز کا اچھا ہونا اس کی شخصیت کے لیے ایک بہت بڑا سہارا ہے ــــ عام لوگ اپنی ظاہری شکل و صورت اور لباس کا بڑا خیال رکھتے ہیں، وجہ یہ کہ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ ظواہر ان کی شخصیت کو سہارا دیتے ہیں۔ یہ خیال غلط نہیں۔ مگر ہم دیکھ چکے ہیں کہ ظواہر کے مقابلے میں آواز کسی انسان کی حقیقی شخصیت کی کہیں زیادہ آئینہ دار ہے۔ آواز دلی حالت کا پتہ دیتی ہے لیکن جہاں ظاہری شکل و صورت کو بہتر بنانا مشکل نہیں وہاں آواز کو بہتر بنانا بہت زیادہ توجہ

اور صحت بیان تباہ ہے۔ کوئی انسان اپنی آواز اس وقت تک بہتر نہیں بنا سکتا جب تک وہ ذہنی صحت حاصل نہ کرلے۔ صحت مند آواز ایک صحت مند ذہن کی ہی پیداوار ہوسکتی ہے۔

اُستاد کے لیے آواز کی اہمیت

جیسا اس مضمون کے شروع میں کہا گیا ہے، استاد کے لیے یہ بات غیر معمولی اہمیت رکھتی ہے کہ اس کی آواز موزوں قسم کی ہو۔ استاد کے ذمہ یہ مشکل کام لگایا گیا ہوتا ہے کہ اپنے خیالات سے کم عمر طلبہ کو متاثر کرے۔ وہ یہ خدمت آواز کی مدد سے ہی انجام دیتا ہے۔ لیکن اگر بے قابو جذبات اس کی آواز کو دبوچے رکھتے ہوں تو اسے ایک ایسی مضحکہ خیز شخصیت کا تاثر پیدا ہوتا ہے جو کسی دل میں اچھا تاثر پیدا نہیں کرسکتی۔ بہت کم استاد کبھی یہ معلوم کرنے کی تکلیف اٹھاتے ہیں کہ ان کی آواز کس قسم کی شخصیت کا خاکہ کھینچتی ہے۔ یہ لاپرواہی بہت سے استادوں کو طلبہ کی دل لگی کا سامان بنائے رکھتی ہے فارغ اوقات میں جب چند طالب علم مل کر بیٹھتے اور مدرسے کے کام پر تبصرہ کرتے ہیں تو عام طور پر مختلف استادوں کے لب ولہجہ کی نقل اتاری جاتی ہے۔ یہ دل چسپ مشغلہ چھوٹے بڑے طلبہ کیلئے یکساں طور پر تفریح کا سامان مہیا کرتا ہے۔

بعض استاد اس غلط فہمی کا شکار رہتے ہیں کہ آواز ایک قدرتی چیز ہے اس میں کوئی تبدیلی نہیں کی جاسکتی یہ بہت بڑی بھول ہے۔ ہم پیچھے دیکھ آئے ہیں کہ کس طرح آواز کی اصلاح ہر وقت ممکن رہتی ہے۔ اچھی آواز سے مراد اونچی اور بارعب آواز نہیں۔ اچھی آواز وہ ہے جو آسانی سے سنائی دے اور بولنے والے کے دلی اطمینان کو ظاہر کرے۔ قرآن حکیم نے یہ نکتہ صدیوں پہلے نہایت بلیغ پیرائے میں سمجھا دیا تھا۔ "واقصد فی مشیک واغضض من صوتک - ان انکر الاصوات لصوت الحمیر"۔

ترجمہ: چلنے میں میانہ روی رکھو اور اپنی آواز کو دھیمی رکھو۔ سب سے زیادہ بری آواز گدھے کی چیخ ہے"۔

غرض چیخنا اور چلانا کسی سننے والے کو بھلا معلوم نہیں ہوتا۔ خواہ سننے والا طالب علم

پاکرنی اور۔ بعض نوآموز استاد اس بھول میں رہتے ہیں کہ اگر وہ چیخیں گے نہیں تو ان کی آواز کمرے کے آخری حصوں تک نہ پہنچے گی۔ یہ بالکل غلط ہے۔ آواز کا سنائی دینا، اس قدر اس کی بلندی پر موقوف نہیں جتنا اس کے سکون پر۔ جو بات سکون اور اعتماد کے ساتھ کی جائے وہ نسبتاً آسانی سے سنی جاتی ہے۔ اگر بفرض محال یہ آواز کچھ زیادہ مدھم بھی ہو تو سننے والے کانوں پر زور ڈال کر بھی اسے سن لیتے ہیں۔ لیکن کرخت قسم کی چیخ پکار کو کان پسند ہی نہیں کرتے۔ لہٰذا اس کی بلندی کے باوجود وہ اسے سننا نہیں چاہتے۔

ٹیپ ریکارڈ اب اس قدر عام چلنے لگا ہے کہ بہت سے استاد اپنی آواز بہتر بنانے کے لیے اس آلے سے کام لے سکتے ہیں۔ جو استاد اپنی شخصیت کی تاثیر بڑھانے کے لیے اپنی آواز پر قدرت حاصل کرنا چاہتا ہو اسے چاہیے کہ اپنے کسی ایک سبق کو ٹیپ ریکارڈ کرے اور بعد میں اسے اکیلا بیٹھ کر کئی بار سنے۔ یہ چیز اسے اپنی جذباتی کیفیتوں کی اس قدر صحیح خبر دے گی جو شاید کسی اور طریق سے حاصل نہ ہو اس طرح استاد کو پہلی بار یہ علم حاصل ہوگا کہ دوسروں کے لب و لہجہ میں وہ جن باتوں کو ناپسند کرتا ہے وہ عیب خود اس کی اپنی آواز میں موجود ہیں۔ وہ بچوں کے سوالوں کا جواب دیتے ہوئے محبت بھرے لہجے کی بجائے سخت اور طنزیہ لہجہ اختیار کرتا ہے۔ وہ طلبہ کے جوابوں پر تبصرہ کرتے وقت ایسا لب و لہجہ اختیار کرتا ہے جو ایک بازاری قسم کے آدمی کو ہی زیب دے سکتا ہے۔ ان باتوں کا علم استاد کے سامنے اصلاح نفس کا دروازہ کھول دے گا۔ وہ اپنے جذبات پر قابو پانے کی کوشش کرے گا اس طرح رفتہ رفتہ اس کی آواز میں بھی اصلاح ہونے لگے گی ✽

اقوام متحدہ کا تعلیمی، سائنسی اور تمدنی ادارہ

ڈاکٹر عبدالرؤف

بچوں کو آسان آسان مکالموں وغیرہ کی مدد سے اقوام متحدہ کے متعدد اداروں اور ان کے مفید مشاغل سے متعلق بنیادی کوائف نہایت کامیابی سے سمجھائے جا سکتے ہیں۔ ذیل میں اسی سلسلہ کی ایک کاوش پیش کی جا رہی ہے۔ جسے ڈاکٹر عبدالرؤف صاحب تحریر کیا ہے (مدیر)

سعید: ابا جان اخباروں میں آئے دن یونیسکو کا ذکر آتا رہتا ہے۔ یہ یونیسکو ہے کیا ؟

باپ: بیٹا یہ تو تمہیں معلوم ہی ہوگا کہ اقوام متحدہ کے تحت مختلف ادارے کام کرتے ہیں۔

سعید: جی ہاں۔ جنرل اسمبلی، سلامتی کونسل وغیرہ اقوام متحدہ ہی کے ادارے ہیں نا !

باپ: بس تو اسی طرح یونیسکو بھی اقوام متحدہ کا ایک ماتحت ادارہ ہے۔

سعید: مگر یہ لفظ "یونیسکو" بھی کچھ عجب سا ہے۔ کل سارا دن میں ڈکشنری میں اس کے معنی ڈھونڈتا رہا، مگر بے فائدہ۔

باپ: بیٹا ڈکشنری میں تمہیں اس لفظ کے معنی نہیں مل سکتے کیونکہ یہ ایک لفظ چھے الفاظ کا مخفف ہے۔

سعید: وہ چھے الفاظ کونسے ہیں ابا جان۔

باپ: یونائیٹڈ نیشنز ایجوکیشنل سائنٹفک اینڈ کلچرل آرگنائزیشن یعنی اقوام متحدہ کا تعلیمی سائنسی اور تمدنی ادارہ۔

سعید: تو گویا ان چھے الفاظ کے پہلے حروف کو ملا دیا جائے تو لفظ یونیسکو بن جاتا ہے۔

باپ: بالکل ٹھیک

سعید: ابا جان مجھے اقوام متحدہ کے دو ایک اداروں سے متعلق تو کافی کچھ معلوم ہے مگر یونیسکو کے بارے
میں میری معلومات بالکل صفر ہیں۔ مجھے یہ بتلائیے یہ ادارہ کیا کام کرتا ہے۔

باپ: یونیسکو دنیا بھر میں علم و ہنر، سائنسی معلومات اور تمدنی مشاغل کا چرچا کرتی ہے۔ اور اس طرح
بین الاقوامی تعلقات اور امن کو فروغ دیتی ہے۔

سعید: تعلیم کا چرچا کرنے کے لیے یہ ادارہ کیا کرتا ہے؟

باپ: یونیسکو کے تعلیمی کام کو دو بڑے حصوں میں بانٹا جا سکتا ہے۔

سعید: کون کون سے؟

باپ: (ا) بنیادی تعلیم کو فروغ دینے والے مشاغل اور
(ب) پرائمری تعلیم کو فروغ دینے والے مشاغل

سعید: ابا جان! یہ بنیادی تعلیم کیا ہوتی ہے؟

باپ: بیٹا! تم جانتے ہو کہ دنیا میں بے شمار ایسے بالغ لوگ بھی بستے ہیں جو لکھنا پڑھنا نہیں جانتے
ظاہر ہے کہ اَن پڑھ ہونے کی وجہ سے یہ لوگ اپنی روزمرہ زندگی میں بہت نقصان اٹھاتے ہیں۔

سعید: مگر یہ لوگ کالجوں اور سکولوں میں داخل ہو کر تعلیم حاصل کیوں نہیں کرتے؟

باپ: اس لیے کہ وہ ایسا نہیں کر سکتے۔

سعید: ایسا کیوں نہیں کر سکتے ابا جان۔

باپ: اس لیے کہ اس قسم کے لوگ عموماً غریب اور مزدور پیشہ ہوتے ہیں، ان کے پاس تعلیم
کے اخراجات برداشت کرنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ اس کے علاوہ اپنا پیٹ پالنے کی خاطر
وہ سارا دن محنت مزدوری کے کام میں لگے رہتے ہیں جس کی وجہ سے انھیں دن کے
وقت لکھائی پڑھائی کے لیے کوئی وقت میسر نہیں آتا۔

سعید: یونیسکو ایسے لوگوں کے لیے دنیا بھر میں تعلیمی مرکز کھولتی ہے۔ جہاں اَن پڑھ بالغوں
کو شام کے وقت تعلیم دی جاتی ہے۔

سعید: مگر ابا جان اَن پڑھ بالغوں کو فقط لکھنا پڑھنا ہی سیکھنے کی ضرورت تو نہیں ہوتی ۔ ہمارے محلے کے حلوائی کی مثال ہی لے لیجیے ۔ میرا تو خیال ہے کہ اسے دکان پر صفائی رکھنے کی اہمیت سمجھانا بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ لکھائی پڑھائی کے کام سے واقف کرانا ۔

پ : تمہارا خیال بجا ہے ۔ یونیسکو تعلیم کے اس پہلو کو ہمیشہ سامنے رکھتی ہے ۔

سعید: وہ کیسے ؟

پ : میں نے ابھی تمہیں بتایا ہے ناکہ یونیسکو ایسے لوگوں کے لیے تعلیمی مرکز کھولتی ہے ۔

سعید: جی ہاں ۔

پ : ان تعلیمی مرکزوں میں لکھائی پڑھائی سکھانے کے علاوہ ، ان پڑھ بالغوں کو حفظانِ صحت ، معلوماتِ عامّہ ، روزمرّہ سائنس ، معاشرتی تعلقات وغیرہ کے موٹے موٹے اصول بھی بتائے جاتے ہیں ۔ تاکہ اَن پڑھ بالغ بھی خواندہ ، سمجھدار اور مفید شہری بن کر اپنے وطن کی ترقی اور خوشحالی کا باعث بن سکیں ۔

سعید: یہ کام تو بہت مفید اور بنیادی ہے ۔

پ : کیوں نہیں اور اسی لیے تو یونیسکو کے ایسے مشاغل بنیادی تعلیمی مشاغل کہلاتے ہیں ۔

سعید: ابا جان ، بالغوں کی بنیادی تعلیم کا کام مشکل تو بہت ہوگا ؟

پ : ہے تو سہی ۔ مگر یونیسکو نے اس کام کو قدرے سہل بنا دیا ہے ۔

سعید: وہ کیسے ؟

پ : یونیسکو نے بنیادی تعلیم کے لیے خاص قسم کے آسان فہم قاعدے اور کتابیں تیار کروائی ہیں آسان ، دلچسپ اور مفید ہونے کی وجہ سے اَن پڑھ بالغ ان کی مدد سے لکھائی پڑھائی اور روزمرہ زندگی کی بنیادی باتیں بہت جلد سمجھنے کے قابل ہو جاتے ہیں ۔

سعید: بنیادی تعلیم کا پروگرام تو میری سمجھ میں آگیا ۔ اب آپ مجھے یہ بتلایئے کہ یونیسکو پرائمری تعلیم کی ترقی کے لیے کیا کچھ کرتی ہے ۔

باپ: دنیا کے کئی ملک ایسے ہیں جہاں اکثر بچے پرائمری تعلیم سے محروم رہ جاتے ہیں۔

سعید: گمراہ یا جان اگر والدین اپنے بچوں کو سکول داخل کروا دیا کریں تو بچوں کا پرائمری تعلیم سے محروم رہ جانے کا سوال ہی پیدا نہ ہو۔

باپ: مگر بہت سے ممالک ایسے ہیں جن کے مالی حالات اچھے نہیں ہیں۔ ایسے ملکوں میں پرائمری مدرسوں کی تعداد اتنی نہیں کہ تمام بچے ان میں داخل کرائے جاسکیں۔

سعید: یہ تو بہت افسوس ناک بات ہے۔

باپ: ہے تو سہی!

سعید: اچھا تو یونیسکو اس صورت کو بہتر بنانے کے لیے کیا کچھ کرتی ہے؟

باپ: ایسے ممالک کو یونیسکو زیادہ پرائمری سکول کھولنے، موجودہ مدرسوں اور اساتذہ سے زیادہ کام لینے اور پرائمری نظامِ تعلیم کو بہتر بنانے میں ہر طرح کی مدد دیتی ہے۔

سعید: تو گویا یونیسکو کے تعلیمی مشاغل بنیادی تعلیم اور پرائمری تعلیم کو فروغ دینا ہیں۔

باپ: ہاں، مگر یونیسکو کے تعلیمی ان دو کاموں تک ہی محدود نہیں۔ ان مشاغل کے علاوہ یونیسکو دنیا بھر میں تعلیم کے کئی اور معاملوں میں بھی بہت مفید کام کر رہا ہے۔

سعید: مثلاً؟

باپ: مثلاً یونیسکو نوجوان طلبہ کے لیے بین الاقوامی تفریحوں، مباحثوں، کانفرنسوں وغیرہ کا اہتمام کرتی ہے۔ اس کے علاوہ طلبہ، اساتذہ اور معاشرتی کارکنوں کو تعلیمی وظائف بھی دیے جاتے ہیں۔

سعید: یونیسکو کے اس کام سے بہت لوگوں کو فائدہ پہنچے گا؟

باپ: ہاں اب تک یونیسکو دنیا کے مختلف حصوں کے کوئی پندرہ سو سے زائد باشندوں کو مختلف علوم و فنون کی تربیت کے لیے وظائف دے چکی ہے۔

سعید: اس ادارے کے نام میں لفظ سائنٹیفک بھی شامل ہے۔ مجھے یہ بتائیے کہ یہ ادارہ

کیا سائنسی کام کرتا ہے۔

باپ: سائنسی مشاغل کا چرچا کرنے کے لیے یونیسکو جو کام کرتی ہے ان کا خلاصہ یہ ہے۔
مدرسوں میں سائنس پڑھانے کے لیے بہتر تجربوں اور طریقوں کی اشاعت کرنا۔ سائنس کے مختلف شعبوں کے متعلق معلومات بڑھانے والے رسالے اور کتابیں وغیرہ شائع کرنا۔
مختلف اہم سائنسی موضوعوں پر ٹھوس تحقیقوں کا انتظام کرنا وغیرہ۔
اس کام کو باقاعدگی سے کرنے کے لیے یونیسکو نے دنیا کے چند ملکوں میں سائنسی مرکز بھی کھول رکھے ہیں۔

سعید: سائنسی مرکز کا کیا مطلب ہوا؟

باپ: سائنسی مرکز یونیسکو کی ایک ایسی مجلس کا نام ہے جس میں اس ادارہ کی زیر نگرانی مختلف ملکوں کے سائنس داں اکٹھے ہوتے ہیں۔ اور وقت کے اہم سائنسی مسائل اور ضروریات کا جائزہ لیتے ہیں۔ مدرسوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں سائنس کو بہتر طریق سے پڑھانے کے طریقے سوچتے ہیں اور اعلیٰ قسم کی سائنسی تحقیق کرتے ہیں۔

سعید: یونسکو کے سائنسی مرکز تو پھر سائنس کی بہت ٹھوس خدمت کرتے ہیں۔

باپ: بالکل۔ تم جانتے ہو کہ کسی ملک کی ترقی اور خوشحالی کا بیشتر دارومدار اس کی سائنسی ترقی پر ہے جس کی وجہ سے عوام خوش حال ہو جاتے ہیں۔

سعید: کیا یونیسکو اس کے علاوہ کوئی اور کام بھی کرتی ہے؟

باپ: ہاں ہاں! ابھی تو میں نے یونیسکو کے تمدنی مشاغل کا ذکر ہی نہیں کیا۔ یونیسکو دنیا کی تمام قوموں کے درمیان مفاہمت، تعاون اور خوش گوار تعلقات پیدا کرنے کے لیے بھی بہت مفید اور عملی کام کرتی ہے۔

سعید: خوب

باپ: مثال کے طور پر یہ ادارہ دنیا کے مختلف حصوں میں نسلی تعصب، باہمی کشیدگی اور گھریلو

اور متعلق جھگڑوں کے موثر حل ڈھونڈنے کے لیے مفید تحقیقوں کا اہتمام کرتا ہے۔

سعید: یہ کام لگتا تو بہت مشکل ہے مگر ہوگا کافی دلچسپ!

باپ: کیوں نہیں! اور مفید بھی۔ لڑائی، جھگڑوں، دھڑے بندیوں اور باہمی کشیدگیوں سے خاندانوں، قوموں اور حکومتوں کو بے پناہ نقصان پہنچتا ہے۔ اگر عوام میں ان الجھنوں کو سمجھنے کا سلیقہ پیدا کر دیا جائے تو اس قسم کی ناخوش گوار باتوں میں بہت کمی ہو سکتی ہے۔

سعید: آپ بجا فرماتے ہیں جب انسان کے سامنے کسی حرکت کی برائیاں روشن کر دی جائیں تو پھر اس کے لیے اس حرکت سے باز رہنا بہت آسان ہو جاتا ہے۔

باپ: یونیسکو نے اس قسم کے معاملات پر تحقیق کے لیے پیرس میں ایک مرکز بھی کھول رکھا ہے جس کا نام "بین الاقوامی تحقیقی مرکز" ہے۔

سعید: یہ مرکز کیا کام کرتا ہے۔

باپ: جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس مرکز میں اس بات پر تحقیق ہوتی ہے کہ مختلف قوموں میں غلط فہمی اور کشیدگی کیوں اور کیسے پیدا ہوتی ہے؛ بین الاقوامی جھگڑوں کے اصل اسباب سمجھنے کے موثر طریقے کیا کیا ہیں۔ ان طریقوں پر عمل کرنے کے لیے کون کون سے ذرائع اختیار کیے جائیں؛ وغیرہ۔

سعید: ابا جان آپ نے مجھے یونیسکو کے تعلیمی، سائنسی اور تمدنی مشاغل کے متعلق بہت مفید اور کارآمد باتیں بتائی ہیں۔ مگر آپ یہ بتلانا تو بھول ہی گئے کہ یہ ادارہ کیسے چلتا ہے؟

باپ: یونیسکو کے نظم و نسق کو سمجھنے کے لیے اس کو تین بڑے حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

سعید: کون کون سے؟

باپ: (ا) جنرل کانفرنس

(ب) ایگزیکٹو بورڈ

(ج) سیکرٹریٹ

سعید: جنرل کانفرنس کے ذمے کیا فرائض ہیں؟

باپ: جنرل کانفرنس ایک ایسی انجمن ہے جس میں وہ تمام لوگ شامل ہیں جو مختلف ممالک کی طرف سے یونیسکو کے رکن نامزد ہوتے ہیں۔ جنرل کانفرنس یونیسکو کا سارا پروگرام مرتب کرتی ہے اور اس کا بجٹ پاس کرتی ہے۔

سعید: ایگزیکٹو بورڈ کیا کام کرتا ہے؟

باپ: یہ بورڈ یونیسکو کے ناظم اعلیٰ یعنی ڈائرکٹر جنرل کو مختلف امور کے بارے میں مشورے دیتا ہے بجٹ کا مرتب کرنا اور مختلف کاموں پر اخراجات تجویز کرنا بھی اسی بورڈ کا کام ہے۔ ایگزیکٹو بورڈ سال میں دو بار اپنے اجلاس منعقد کرتا ہے۔

سعید: اس بورڈ کے ارکان کتنے ہوتے ہیں؟

باپ: چوبیس ۲۴ ارکان ہوتے ہیں۔

سعید: کیا اس کا کوئی ممبر پاکستانی بھی ہے؟

باپ: بیٹے تم تو اخباروں کی خبریں بہت جلد بھول جاتے ہو۔ کچھ عرصہ ہوا خبر آئی تھی کہ ہمارے قومی تعلیمی کمیشن کے صدر یونیسکو کے ایگزیکٹو بورڈ کے رکن منتخب ہو گئے ہیں۔

سعید: ابا جان، یونیسکو کا سکرٹریٹ پیرس میں ہے نا؟

باپ: ہاں ہاں، مگر تمہیں کیسے پتہ چلا؟

سعید: میں نے ایک رسالے میں اس کی تصویر دیکھی ہے۔

باپ: اس سکرٹریٹ میں تقریباً ایک ہزار افسر کام کرتے ہیں، جو دنیا کے کم و بیش پچاس ملکوں سے منتخب کیے گئے ہیں۔ سکرٹریٹ کے اعلیٰ افسر کو ڈائرکٹر جنرل کہتے ہیں۔ جسے جنرل کانفرنس اس عہدے کے لیے کثرت رائے سے منتخب کرتی ہے۔

سعید: یونیسکو کے سکرٹریٹ اور ہمارے صوبائی سکرٹریٹ میں کیا فرق ہے؟

باپ: فرق صرف یہ ہے کہ ہمارا سکرٹریٹ قدرے چھوٹا ہے اور یونیسکو کا اس سے بڑا۔ ہمارے سکرٹریٹ کو حکومت مغربی پاکستان چلاتی ہے اور یونیسکو سکرٹریٹ کو جنرل کانفرنس۔ ہمارے

سیکرٹریٹ کی طرح یونیسکو سیکرٹریٹ بھی مختلف حصوں میں بٹا ہوا ہے۔ ہر حصہ یونیسکو کے کسی نہ کسی مخصوص کام کی نگرانی کرتا ہے۔

سعید: ابا جان یونیسکو کافی بڑا اور دلچسپ ادارہ معلوم ہوتا ہے۔ آپ اس کے متعلق کچھ اور باتیں بھی بتلائیے۔

باپ: موٹی موٹی باتیں تو میں نے تمہیں بتلا دی ہیں۔ اب اگر تم مزید معلومات حاصل کرنا چاہتے ہو تو اپنے مدرسہ کے کتب خانہ میں جا کر یونیسکو پر کوئی آسان سی کتاب یا پمفلٹ پڑھ لینا۔ اسی طرح تمہیں اس ادارہ سے متعلق کئی اور باتوں کا پتہ چل جائے گا۔

سعید: اور اگر وہاں اس قسم کا کوئی پمفلٹ یا کتاب نہ ہوئی تو پھر۔۔۔!

باپ: تو پھر! میں تمہیں کیا بتلاؤں۔ مگر ہاں دیکھو تو مجھے یاد آگیا۔ کراچی میں اقوام متحدہ کا ایک چھوٹا سا ماتحت دفتر موجود ہے۔ اگر تم اس دفتر کو ایک خط لکھ دو تو وہ تمہیں یونیسکو سے متعلق پڑھنے کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور بھیج دیں گے۔

سعید: میں آج سکول کا کام ختم کرتے ہی خط لکھ دوں گا۔

ریاست ہائے متحدہ امریکا کا نظامِ تعلیم

سیّد احمد مزمّل

پہلی عالمگیر لڑائی کے بعد دنیا دو گروہوں میں تقسیم ہو گئی۔ ایک طرف روس اور اشتراکی نظامِ حیات اور دوسری طرف امریکا اور جمہوریت۔ امریکا (یو۔ ایس۔ اے) اس وقت دنیا میں جمہوریت کا سب سے بڑا داعی ہے اور اس میں شک نہیں کہ جمہوری نظامِ زندگی کی بقا کے لیے اس وقت امریکا جو کچھ کر رہا ہے۔ اس سے نہ صرف یہ کہ جمہوریت پرستوں میں اس کی سیادت مسلّم ہو گئی ہے، بلکہ اس سے ایک ایسا توازن قائم ہو گیا ہے کہ چھوٹی چھوٹی قوموں کو بھی سانس لینے کا موقع مل گیا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے اس کے پاس توپ و تفنگ کی باڑھ میں دولت کی جھنکار بھی ہے اور موجودہ عالمی سیاست، امریکا میں اول الذکر سے کم اور مؤخرالذکر سے زیادہ کام لے رہا ہے۔

یہ جمہوریت جس کے لیے امریکا اس قدر اندیشہ ناک ہے کیا فی الواقع ایک ایسی نعمت ہے کہ اگر حاصل نہ ہوئی تو اس سے ترقی کی جملہ شاہراہیں مسدود ہو جائیں گی؟ دراصل جمہوریت جس نظامِ حیات اور جس تمدن اور معاشرت کی ضمانت کرتی ہے، وہ نسبتاً اس نظامِ حیات سے بہتر ہے جو ہمیں روس اور چین کے اشتراکی نظام میں ملتا ہے۔ جمہوریت فرد کا احترام کرتی ہے اور اشتراکیت فرد کو ریاست یا گروہ یا ریاست کے تابع کر دیتی ہے۔ اس میں فرد کی اپنی کوئی حیثیت باقی نہیں رہتی۔ اشتراکیت روحانیت سے خالی ہے لیکن اصولاً جمہوریت کی اساس افراد کی روحانی قدروں پر ہے۔

افراد کی ان روحانی قدروں کے احترام کا تعلق ایک ایسے معاشرے کی تخلیق ہے جو افراد کو ایک دوسرے کے احساسات اور جذبات کے سمجھنے اور سمجھانے کا موقع دے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب انھیں اپنے حقوق و فرائض کا صحیح ادراک ہو اور یہ ادراک صرف تعلیم پیدا کر سکتی ہے۔

اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ جمہوریت تعلیم کی رہین منت ہے جس کا امریکی نوآبادکاروں کو شروع ہی سے احساس رہا۔ چنانچہ مشرقی ساحل پر جب نیو انگلینڈ کی چھوٹی چھوٹی بستیاں آباد ہوئیں تو ہر بستی نے اپنی بساط کے مطابق تعلیم کا اہتمام کیا۔ میساچوسٹس کو ان سب پر فوقیت حاصل ہے کہ اس چھوٹی سی نوآبادی میں قومی امدادی مدرسوں کی ابتدا ۱۶۴۷ء میں ہوئی اور ایک مختصر سی مدت میں ایک لاطینی مدرسہ، ہارورڈ کالج اور عوامی تعلیم کا ایک نظام قائم ہو گیا۔

۱۷۸۵ء میں نارتھ ویسٹ آرڈی ننس میں یہ اعلان کیا گیا کہ مذہب اخلاق اور علم اچھی حکومت اور انسان کی خوشی کامیوں کے لیے نہایت ضروری ہیں۔ اس لیے مدرسوں کے قیام اور تعلیم کی ترویج کے لیے جملہ وسائل کو کام میں لانے کا اہتمام کیا جائے گا۔ اور امریکہ نے فی الواقع اپنے مدارس سے روشن ضمیر شہریوں کی تخلیق قومی اتحاد کی تعمیر امریکنائیت اور سماجی یک جہتی کا کام لیا۔ چنانچہ امریکی تعلیم کے مقاصد یہ ہیں۔

مقاصد

۱ - ہر امریکی بچے اور نوجوان کے لیے تعلیمی سہولتیں فراہم کرنا، قطع نظر اس سے کہ یہ کون ہے اور وہ کون
۲ - ایسے مرد اور ایسی عورتیں پیدا کرنا جن میں اپنے وقار کے احترام کا شدید احساس ہو۔
۳ - ہر شخص کے لیے اعلیٰ قسم کی مفت تعلیم کا اہتمام کرنا۔
۴ - یو۔ایس ملک میں رہنے والوں کو امریکی بنانا (امریکنائیت)
۵ - قومی اتحاد کا جذبہ پیدا کرنا۔
۶ - اچھا شہری بننے کی تربیت دینا۔
۷ - بین الاقوامی مفاہمت کا شعور بیدار کرنا۔
۸ - طلبہ میں اخلاقی اقدار پیدا کرنا۔
۹ - پیشہ ورانہ مہارت کا اہتمام کرنا۔
۱۰ - علم حاصل کرنا اور صحیح قسم کی عادات پیدا کرنا۔

غیر مرکزی نظام

برطانوی نظام تعلیم کی طرح امریکی نظام تعلیم بھی غیر مرکوزی ہے۔ بلکہ بعض حالات میں اتنا زیادہ غیر مرکوزی کہ اس سے طرح طرح کی انتظامی پیچیدگیاں پیدا ہو جاتی ہیں جن کا سلجھانا اکثر بہت ہی مشکل ہو جاتا ہے امریکی نظام تعلیم میں وفاقی حکومت کے اختیارات نہایت محدود ہیں۔

تعلیم کی ذمہ داری ہر ریاست کی اپنی ہوتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود ریاست کی حیثیت بجائے خود تعلیم کی توسیع و ترویج میں حرف آخر کی نہیں۔ ہر ریاست میں مختلف چھوٹے چھوٹے ادارے اور انجمنیں اور بورڈ یا کونسل ہیں جو تعلیم کی اس کل کو چلاتے ہیں جب ذیل خاکے سے اس کی قدرے وضاحت ہو جائے گی۔

عوام
(چنتے ہیں)

- لوکل بورڈ آف ایجوکیشن — مقرر کرتا ہے — سپرنٹنڈنٹ آف اسکولز — سفارش کرتا ہے — اساتذہ — پڑھاتے ہیں — طلبہ
- کاؤنٹی بورڈ آف ایجوکیشن — مقرر کرتا ہے — کاؤنٹی سپرنٹنڈنٹ
- گورنر — مقرر کرتا ہے — اسٹیٹ بورڈ آف ایجوکیشن — مقرر کرتا ہے — اسٹیٹ کمشنر آف ایجوکیشن
- صدر — مقرر کرتا ہے — نیشنل بورڈ آف ایجوکیشن — مقرر کرتا ہے — کمشنر آف ایجوکیشن
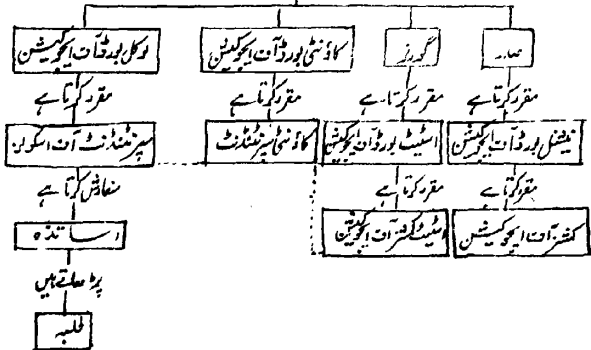
اس خاکے سے نظام تعلیم کی ایک عمومی تصویر سامنے آجاتی ہے۔ اس کی تفصیلات میں خاصی پیچیدگیاں ہیں۔ اس سے صرف اتنی وضاحت ضرور ہو جاتی ہے کہ مرکزی اور صوبائی حکومت اور مقامی تعلیمی حکومتوں کا آپس میں کیا تعلق اور کس حد تک وہ ایک دوسرے سے تعاون کرتی ہیں۔ انتظامی لحاظ سے شاخ در شاخ یہ سلسلہ خاصہ طویل ہے جس کی تفصیل بعد میں آئے گی۔

اس غیر مرکزی نظامِ تعلیم میں جہاں یہ فائدہ ہے کہ ہیڈ ماسٹر اور مدرسین مقامی حالات اور بچوں کے میلانات کے مطابق نصابِ تعلیم کی تعین کرتے ہیں، یا یہ کہ ایک گروہ اپنی مخصوص ضروریات کے تابع اپنے بچوں کی تعلیم کا اہتمام کرتا ہے۔ اس میں یہ قباحت ضرور ہے کہ قومی لحاظ سے تعلیم ایک مربوط کل نہیں ہوتی بلکہ اس کے اجزاء کچھ اس طرح منتشر رہتے ہیں کہ انھیں آپس میں جوڑنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ یو۔ایس۔اے کا نظامِ تعلیم چوں کہ ضرورت سے زیادہ غیر مرکزی تھا، اس لیے وقتاً فوقتاً اسے مرکزی بنانے کی ضرورت محسوس ہوتی رہی۔ سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی نے اس ضرورت کو اور زیادہ شدید بنا دیا اور اب یہ سوچا جانے لگا کہ مرکزی حکومت کو بھی تعلیم کی ترویج و ترقی میں حصہ لینا چاہیے۔ اور اگرچہ امریکی دستور کے مطابق وفاقی حکومت کا تعلیم سے کوئی تعلق نہیں لیکن رفتہ رفتہ وفاقی حکومت کی مداخلت کا راستہ ہموار ہو گیا۔ اس کے اسباب درج ذیل ہیں۔

۱ . تعلیم کے بنیادی اصولوں کے نفاذ کے لیے
۲ . نوآبادکاروں کو امریکی بنانے کے لیے .
۳ . وفاقی محکموں کے تعلیمی ماحول کو مربوط کرنے کے لیے .
۴ . دنیا کے دوسرے ملکوں کے ساتھ تعلیمی کاموں میں اشتراک کرنے کے لیے .
۵ . انتقالِ آبادی کی وجہ سے جو تعلیمی مسائل پیدا ہو رہے ہیں ان کا حل تجویز کرنے کے لیے

ان اسباب کے پیشِ نظر وفاقی حکومت کا تعلیمی ترویج و ترقی میں حصہ لینا ضروری سمجھا گیا چناں چہ آج تعلیم کے چند شعبے ایسے ہیں جن کے انتظام و انصرام کی ذمہ داری وفاقی حکومت پر عائد ہوتی ہے۔ مثلاً دفاعی تعلیم جس کے مختلف شعبے یہ ہیں

(۱) بری فوج کی تعلیم (۲) بحری فوج کی تعلیم (۳) ہوائی فوج کی تعلیم اور (۴) مخصوص قسم کے تربیتی پروگرام

ان میں بری فوج کی تعلیم کے لیے یو۔ایس۔ ملٹری اکادمی ۱۸۰۲ء میں قائم ہوئی، بحری فوج کی تعلیم کے لیے یو۔ایس نیول اکادمی ۱۸۵۰ء میں اور ہوائی فوج کی تعلیم کے لیے یو۔ایس

ایئر فورس اکادمی سنہ ۱۹۵۴ء میں قائم ہوئیں۔

(۱) یو۔ ایس۔ ملٹری اکادمی: سب سے پہلا تعلیمی ادارہ جو وفاقی حکومت کی نگرانی میں قائم ہوا، وہ یو۔ ایس ملٹری اکادمی ہے۔ وفاقی حکومت اس کے اخراجات کی کفیل ہے اور اس ادارے میں محکمۂ جنگ کی زیر نگرانی فوجی افسروں کی نظری اور عملی تربیت کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ اس اکادمی میں داخلے کی شرائط بہت ہی سخت ہیں، اور جن لوگوں کو داخلہ مل جاتا ہے وہ چار سال تک مختلف قسم کی حربی تعلیم حاصل کر کے فوج میں ملازم ہو جاتے ہیں۔

(۲) یو۔ ایس۔ نیول اکادمی: یو۔ ایس نیول اکادمی سنہ ۱۸۴۵ء میں قائم ہوئی، اور اس وقت سے لے کر اس وقت تک ملک کی دفاعی خدمات سر انجام دے رہی ہے۔ یہ اکادمی بیورو آف نیول انوسٹی گیشن (BUREAU OF NATIONAL INVESTIGATION) کے زیر اہتمام تمام و کمال وفاقی زر امداد پر چلتی ہے۔ اس اکادمی کا کورس بھی چار سال کا ہے۔ فارغ التحصیل طلبہ کا انتخاب کرتی ہے کامیاب طلبہ کو بائووے پلان کے تحت وظیفہ بھی ملتا ہے۔ نیول اکادمی کی چند شاخیں ہیں جن میں سب سے اہم مرچنٹ نیول ہے۔ اس شاخ کا حربی شاخ سے براہ راست تعلق رہا ہے اور اب بھی ان دونوں میں خاصہ اشتراک عمل ہے۔

(۳) یو۔ ایس۔ ایئر اکادمی: سنہ ۱۹۴۷ء میں پہلی مرتبہ فضائیہ کا علاحدہ شعبہ قائم کیا گیا۔ اس سے پہلے ہوائی فوج کی تربیت بری اور بحری فوج کی تعلیم و تربیت کا ایک جزو تھی۔ اب اسے ان دونوں سے علیحدہ کر کے ایک مستقل حیثیت دے دی گئی ہے اور اس اکادمی میں فضائیہ میں کام کرنے والوں کی تعلیم و تربیت کا اہتمام اس انداز میں کیا گیا ہے کہ نہ صرف یہ کہ انھیں ابتدائی تربیت ہی کے زمانے میں تعلیم و تربیت کی سہولتیں بہم پہنچائی جائیں گی، بلکہ اس کے بعد بھی جب تک وہ اس محکمے میں کام کریں گے انھیں فضائی سائنس کی جدید ترین معلومات حاصل کرنے کا موقع ملتا رہے گا۔

(۴) مخصوص قسم کے تربیتی پروگرام: بریہ، بحریہ اور فضائیہ کی تعلیم و تربیت کے اہتمام کے علاوہ وفاقی حکومت بعض ایسے کورسوں کا بھی اہتمام کرتی ہے جو ان کے احاطۂ کار میں نہیں آتے۔ مثلاً

ARMY'S-

وی۔ ۱۲ (V-12) پروگرام۔ اے۔ ایس۔ ٹی۔ پی (SPECIALIZED TRAINING PROGRAMME)

ڈبلیو۔ اے۔ سی۔، ڈبلیو۔ اے۔ وی۔ ای۔ ایس اور ایس۔ پی۔ اے۔ آر۔ وغیرہ

وفاقی زیرِ امداد —— غیر پیشہ ورانہ

(۱) امداد بصورتِ زمین: ۱۸۰۲ء میں جب ریاست اوہایو (Ohio) ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں شامل ہوئی تو پہلی مرتبہ وفاقی حکومت نے ہر ٹاؤن شپ میں ایک میل مربع زمین تعلیمی ادارے کی تعلیم کے لیے دینا منظور کیا۔ اس کے بعد سے یہ سلسلہ جاری رہا۔ اس وقت جو زمینیں تعلیمی اداروں کے لیے وقف ہیں ان کے رقبے کا تخمینہ ڈیڑھ لاکھ مربع میل ہے۔ اس سے جو رقم موصول ہوتی ہے وہ مختلف اسکول بورڈوں کی مستقل آمدنی ہے۔

ان زمینوں کے علاوہ وفاقی حکومت وقتاً فوقتاً نارمل اسکولوں اور یونیورسٹیوں اور دوسری قسم کے تعلیمی اداروں کو گرانٹ دیتی رہتی ہے۔ مثلاً لینڈ گرانٹ کالج آف اگریکلچر اور میکینیکل آرٹ۔ ان کی کفالت انھیں زمینی اوقاف سے ہوتی ہے۔

(۲) نقدی امداد: وفاقی حکومت نے عوامی مدارس کی امداد میں زمین کے علاوہ مختلف اوقات میں روپیہ بھی دیا۔ یہ رقم جو مختلف وسائل سے تعلیم کے لیے جمع ہوتی رہتی ہے وفاقی حکومت ضرورت کے مطابق ضرورت مند غیر پیشہ ورانہ اداروں کو دیتی رہتی ہے بلکہ ۱۹۲۲ء میں اس فنڈ کو ایک مستقل حیثیت دے دی گئی۔

وفاقی زیرِ امداد —— پیشہ ورانہ

۱۔ لینڈ گرانٹ کالج اور یونیورسٹی: فرسٹ مارل ایکٹ (FIRST MORRILL ACT 1862) کے مطابق ہر ریاست کو تیس ہزار ایکڑ زمین فی سینیٹر اور کانگریس کے نمائندے کے لیے دی جاتی تھی یہ زمینیں فروخت کر کے ۵ فی صدی سالانہ کی شرح پر اس رقم کو کاروبار پر لگا دیا جاتا ہے اور اس سے جو منافع ہوتا ہے اسے تعلیم پر صرف کیا جاتا ہے۔ بالخصوص ایک ایسے ادارے پر جس میں زراعت اور میکانکل آرٹ کی تعلیم دی جاتی ہے۔

۲۔ زراعتی تجرباتی مراکز: ۱۸۸۷ء میں وفاقی حکومت نے ہر زراعتی کالج کو پندرہ ہزار ڈالر

سالانہ زرِ امداد دینا قبول کیا۔ اس زرِ امداد کا مقصد زراعت کی سائنٹفک تحقیق و تدقیق تھی۔ اگرچہ حکومت نے مختلف تجرباتی مراکز قائم کر دیے لیکن بیسویں صدی کے اوائل ہی میں یہ محسوس کیا جانے لگا کہ اس سے کسانوں کو معتد بہ فائدہ نہیں پہنچتا۔ چنانچہ ۱۹۱۴ء میں وفاقی حکومت نے یہ فیصلہ کیا کہ سالانہ امداد کی آمدنی کو کسان فرزندوں، مجلسوں اور سفری توضیحات پر صرف کیا جائے۔ اس کے علاوہ ایسے تربیت یافتہ مرد اور عورتیں ملازم رکھے جائیں جو دیہاتی علاقوں میں سفر کرکے نئے تجربات کی اشاعت کریں۔

زراعتی تحقیقات کے سلسلے میں حکومت وقتاً فوقتاً مختلف قسم کی امداد بہم پہنچاتی رہتی ہے۔

۳۔ ثانوی مدارس میں پیشہ ورانہ تعلیم: ۱۹۱۷ء میں پہلی مرتبہ وفاقی حکومت نے ثانوی مدارس میں پیشہ ورانہ تعلیم کے نظام کے لیے یہ رقم دینا منظور کیا۔ یہ رقم زراعت، گھریلو معاشیات، تجارت اور صنعتی مضامین کے اساتذہ اور نگران پر صرف کی جاتی تھی۔ اب حکومت اس کی توسیع و ترقی میں اور زیادہ حصہ لے رہی ہے۔ اور اپاہج، مجبور اور ایسے افراد کی تعلیم کا انتظام کر رہی ہے جو وفاقی حکومت کی توجہ کے محتاج ہیں۔

ریاست ہائے متحدہ امریکا کا دفتر معارف

یہ دفتر پہلی مرتبہ ۱۸۶۷ء میں قائم ہوا۔ اس وقت وفاقی حکومت براہِ راست تعلیم میں حصہ لینے کی مجاز نہ تھی۔ اس لیے اس دفتر کے قیام کا مقصد دفتر معارف کے انتظامی اخراجات اور وفاقی تعلیمی نظم و نسق کے مصارف کی نگرانی کرنا اور وفاقی حکومت مختلف ریاستوں کے مابین جو زرِ امداد تقسیم کرنا چاہے، اس کا اہتمام کرنا تھا۔ کم و بیش سو برس ہونے کو آئے دفتر معارف کے ان بنیادی کاموں میں کوئی فرق پیدا نہیں ہوا اگرچہ یہ صحیح ہے کہ اب اس میں اتنی توسیع ہو گئی ہے کہ اس کا کام محض تقسیم زرِ امداد اور نگرانی نہیں رہ گیا۔

شماریات: اس کا سب سے اہم کام شماریات کی ترتیب و تدوین ہے۔ امریکی نظامِ تعلیم ایسا غیر مرکزی اور اتنا کثیر الانواع ہے کہ مختلف قسم کے تعلیمی اعداد و شمار کا جمع کرنا اور انھیں ترتیب دینے میں خاصی دشواری ہوتی ہے لیکن ان دشواریوں کے باوجود دفتر اس کام کو بڑی ذمہ داری کے ساتھ انجام دیتا ہے۔

فراہمی اطلاعات: دفتر کا دوسرا کام مختلف قسم کی تعلیمی اطلاعات کا فراہم کرنا اور انھیں ملک کے طول و عرض میں نشر کرنا ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے دفتر کے زیرِ اہتمام مختلف تعلیمی کانفرنسیں کی

کی جاتی ہیں، کتابیں چھاپی جاتی ہیں، چیزوں کی نمائش کی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی ہوتا ہے کہ جو لوگ اپنی تعلیمی معلومات میں اضافہ کرنے کے لیے خط لکھتے ہیں ان کے جواب بھی اسی دفتر میں لکھے جاتے ہیں۔ سربراہان دفتر کے نمائندے اکثر بعض تعلیمی موضوعات پر توضیحی تقریریں کرتے ہیں اور اس سلسلے میں ریڈیائی نشریات اور معیاری کتب سے زیادہ سے زیادہ کام لیا جاتا ہے۔

تعلیمی توسیع : دفتر معارف کا ایک کام پیشہ ورانہ تعلیم کی توسیع و ترقی بھی ہے۔ دفتر ہی سے متعلق ایک ایسا ادارۂ تحقیق ہے جس کا کام مختلف تعلیمی مسائل پر تحقیق کرنا اور پھر ان تحقیقات کے نتائج سے دوسروں کو آگاہ کرنا ہے۔

دفتر تعلیم کے زیر اہتمام ایک نہایت عمدہ کتب خانہ اور اس کے ساتھ ساتھ ایک قومی مرکز اطلاعات ہے۔ یہ دونوں ادارے امریکی تعلیم کے ہر پہلو کا ایک مفصل جائزہ ہیں۔ کتب خانے میں آپ کو ہر موضوع پر اچھی کتابیں مل جائیں گی اور قومی مرکز اطلاعات ضروری تعلیمی اطلاعات کی اشاعت کرتا رہتا ہے۔ بعض اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک ریاست یا کاؤنٹی یا اسکول ڈسٹرکٹ اپنے علاقے میں ایک مخصوص قسم کے تعلیمی سروے کا اہتمام کرتا ہے تو وفاقی حکومت اس سروے میں کام کرنے والوں کو امداد دیتی ہے

دفتر معارف کا ایک اور اہم کام ان رقوم کا انتظام بالالتزام ہے جو وقتاً فوقتاً کانگریس منظور کرتی رہتی ہے۔ اس کے علاوہ عوامی مباحث کے اہتمام اور اپنے اپنے علاقوں میں مقامی تعلیمی وحدوں کے سروے کے انتظام کے لیے ریاستوں کی امداد کرنا بھی دفتر کے فرائض میں شامل ہے

مخصوص گروہوں کی تعلیم

(۱) ریڈ انڈین کی تعلیم : یو۔ ایس۔ اے کے اصلی باشندے سفید فام آباد کاروں کی آمد کے بعد ایک معمولی سی اقلیت میں رہ گئے، اور اگرچہ اپنی مدافعت کے لیے انھوں نے تلوار بھی اٹھائی لیکن اکثریت، اقلیت پر غالب آئی۔ اور مدتوں امریکی حکومت اور امریکی عوام، ریڈ انڈین آبادی کو ختم کرنے کے درپے رہے۔ لیکن یہ لوگ بالکل ختم نہ ہو سکے۔ سنہ ۱۹۲۴ء میں وفاقی حکومت نے انھیں امریکی شہری بنانے کا فیصلہ کیا۔ اور اس طرح اب ہر امریکی انڈین، امریکی شہری بن گیا۔ اس وقت

ان کی آبادی تقریباً ساڑھے تین لاکھ ہے۔

۱۸۷۰ء امریکی حکومت اور عوام نے ان کی تعلیم پر صرف اسّی لاکھ ڈالر خرچ کیے اور انھیں تباہ کرنے پر پچاس کروڑ ڈالر لیکن اب حالات بدل چکے ہیں۔ وفاقی حکومت ان کی تعلیم و تربیت کی طرف بالخصوص توجہ دے رہی ہے۔

(۲) حبشیوں کی تعلیم : یو۔ایس۔اے میں حبشیوں کی تعلیم اور ان کی شہری حیثیت کا تسلیم کیا جانا ایک مسئلہ ہے۔ پندرھویں اور سولھویں صدی عیسوی میں افریقہ سے حبشی غلاموں کی جو کھیپ امریکہ پہنچی صدیوں وہ اپنے سفید فام آقاؤں کی خدمت کرتی رہی اور ان کے مظالم سہتی رہی۔ ابراہم لنکن نے انھیں غلام سے شہری بنا دیا۔ اور اب ان آزاد اور حقوق یافتہ حبشیوں کی اولاد اتنی پھیل چکی ہے کہ آج ہر دسواں امریکن حبشی ہے۔ یعنی امریکا کی کل آبادی کا دس فی صدی حصہ حبشیوں پر مشتمل ہے۔

اگرچہ امریکی حبشیوں کو اس ملک کا شہری بنے ہوئے سو برس سے اوپر ہو چکے ہیں لیکن امریکا میں ہنوز انھیں مکمل حقوق شہریت حاصل نہیں ہیں۔ شمالی علاقے سے قطع نظر جنوبی علاقوں میں بالخصوص انھیں اچھوت سمجھا جاتا ہے۔ ان کے اسکول علاحدہ ان کے ہوٹل علاحدہ اور بس میں سفر کرتے وقت ان کی نشستیں مخصوص۔ اس صورت حالات کے خلاف وفاقی حکومت جد و جہد کر رہی ہے لیکن حبشیوں کو مکمل شہری حقوق ملنے میں ابھی کافی وقت لگے گا۔

سترہ ریاستوں اور واشنگٹن ڈی سی میں ان کے تعلیمی ادارے سفید فام فرنگی کے تعلیمی اداروں سے مختلف اور کم درجے کے ہیں۔

ریاستوں کا نظام تعلیم

سٹیٹ بورڈ آف ایجوکیشن

یو۔ایس۔اے کی مختلف ریاستوں کا نظام تعلیم مختلف ہے۔ لیکن انتظامی لحاظ سے ان کی وضع اور ہئیت ایک دوسرے سے اتنی مختلف نہیں۔ ہر ریاست کا تعلیمی پروگرام اسٹیٹ بورڈ آف ایجوکیشن کے ماتحت عمل میں آتا ہے۔ یہ بورڈ براہِ راست تعلیمی نظم و نسق کے ذمہ دار نہیں ہوتے، بلکہ ان کا کام

تعلیمی پروگرام اور پالیسی مرتب کرنا ہوتا ہے۔ اس کے فرائض میں مختلف تعلیمی کام شامل ہیں۔ درج ذیل خاکے سے اس کی تشریح ہو جائے گی۔

اسٹیٹ بورڈ آف ایجوکیشن

ابتدائی تعلیم	ثانوی تعلیم	پیشہ ورانہ تعلیم	ریسرچ	تربیت اساتذہ	اسکول ڈسٹرکٹ کی تنظیم نو	مالیات	قانون اسکول	بحالیات	اعلیٰ تعلیم	متفرقات

یو، ایس، اے کی بعض ریاستوں میں ابھی اس قسم کے بورڈ قائم نہیں ہو سکے جو تعلیم کے ہر شعبے کا نگرانی کے فرائض انجام دے رہے ہوں۔ لیکن امریکی ماہرین تعلیم کا مدعا یہی ہے کہ ہر ریاست اپنے علاقے میں تعلیم کی تنظیم نو اسی نہج پر کرے۔

ہر اسٹیٹ بورڈ آف ایجوکیشن اپنی ریاست میں تعلیم کی دیکھ بھال اور نگرانی کے لیے اسٹیٹ سپرنٹنڈنٹ آف ایجوکیشن مقرر کرتا ہے۔ جس کے کام کی نوعیت مختلف حالات پر مختلف ہوتی ہے۔

(۱) وہ اپنے حلقے میں تعلیم کے متعلق مختلف اعداد و شمار جمع کرتا ہے اور ان کی اشاعت کرتا
(۲) اس کی حیثیت ایک مشیر اور منصف کی ہوتی ہے۔ وہ اپنے حلقے کے تعلیمی اداروں کو مشورہ بھی دیتا ہے، اور تنازع کی صورت میں منصف کے فرائض بھی انجام دیتا ہے۔
(۳) وہ اپنے حلقے کے اسکولوں کے تعلیمی کام کی نگرانی بھی کرتا ہے۔
(۴) جو رقم ریاست تعلیم کے لیے مخصوص کرتی ہے اس کی تقسیم کا کام بھی اس کے سپرد ہوتا ہے وہ اس کی تقسیم اور نگرانی کا ذمہ دار ہوتا ہے۔
(۵) وہ اپنے علاقے کے اسکولوں کو ایک واحدے میں لانے کا کام بھی کرتا رہتا ہے۔

مقامی تعلیمی واحدے

ہر ریاست میں نظم و نسق کے لحاظ سے تین قسم کے تعلیمی واحدے ہوتے ہیں۔

(۱) کاؤنٹی سکول یونٹ
(۲) ٹاؤن شپ
(۳) ٹاؤن
(۴) لوکل سکول ڈسٹرکٹ

۱۔ کاؤنٹی اسکول یونٹ

یو۔ایس۔اے میں اس وقت تین ہزار کاؤنٹی اسکول یونٹ ہیں۔ ان میں سب سے چھوٹا نیویارک کاؤنٹی کا ہے جس کا کل رقبہ ۲۲ مربع میل ہے اور سب سے بڑا واحدہ سان برنارڈینو (کیلی فورنیا) کا ہے جس کا مجموعی رقبہ ۲۰۱۱۷۵ مربع میل ہے۔

تعلیمی نظم و نسق کے لحاظ سے کاؤنٹی اسکول یونٹ تین قسم کے ہیں اور مختلف ریاستوں میں ان کی قانونی اور انتظامی حیثیت مختلف ہے۔

پہلی قسم :- بعض ریاستیں ایسی ہیں جن میں کاؤنٹی تعلیمی نظم و نسق کی مجاز نہیں۔ تعلیم کا انتظام و انصرام بعض چھوٹی چھوٹی تنظیموں کے سپرد رہتا ہے۔

دوسری قسم :- بعض ریاستوں میں اگرچہ ٹاؤن، ٹاؤن شپ یا لوکل اسکول ڈسٹرکٹ ہی کو تعلیمی نظم و نسق کا کل اختیار ہوتا ہے لیکن کچھ اختیار کاؤنٹی کو بھی دیدیا جاتا ہے۔ کہ وہ مختلف حلقے کے کاموں میں یک جہتی پیدا کر سکے۔

تیسری قسم : ریاستوں کی تیسری قسم ایسی ہے جن میں کاؤنٹی ہی تعلیم کے انتظام و انصرام کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔

۲۔ ٹاؤن شپ

امریکا میں اس وقت بیس ہزار سول ٹاؤن شپ ہیں۔ ٹاؤن شپ کا حلقہ کاؤنٹی سے چھوٹا اور ٹاؤن سے بالعموم بڑا ہوتا ہے۔ اس کا رقبہ اس وقت ۳۶ میل مربع یا بعض حالات میں اس سے زیادہ ہوتا ہے۔ ۱۶۴۷ء میں صرف پچاس گھروں پر مشتمل ہوتا تھا۔

۳۔ ٹاؤن | ٹاؤن اسکول ڈسٹرکٹ کا نظام صرف نیو انگلینڈ کی آبادیوں سے مختص ہے۔ نیو انگلینڈ کے اکثر

شہر جغرافیائی لحاظ سے ایک دوسرے سے بالکل الگ ہوتے ہیں اور ان کی اپنی جغرافیائی وحدت ہوتی ہے۔ بعض حالات میں مختلف شہروں کو ملا کر ایک ٹاؤن اسکول ڈسٹرکٹ قائم کر دیا جاتا ہے۔ مثلاً ساچوسٹس کے پانچ شہروں کا ایک مشترکہ ٹاؤن اسکول ڈسٹرکٹ ہے۔ اس میں بولٹن، کارلائل، ہاروڈ، ٹل ٹن اور اسٹو شامل ہیں۔

۴۔ لوکل اسکول ڈسٹرکٹ

بعض حالات میں اس کا رقبہ بہت ہی مختصر اور بعض حالات میں بہت ہی طویل ہوتا ہے۔ آبادی کے لحاظ سے اس کی تقسیم اس طرح کی جا سکتی ہے۔

(۱) ڈھائی ہزار سے کم
(۲) ڈھائی ہزار سے پانچ ہزار
(۳) پانچ ہزار سے دس ہزار
(۴) دس ہزار سے تیس ہزار
(۵) تیس ہزار سے ایک لاکھ
(۶) ایک لاکھ سے زیادہ

ہر آبادی کا اپنا لوکل اسکول ڈسٹرکٹ ہوتا ہے۔ اور اس میں بھی بعض اوقات مختلف عقائد کے لوگوں کے مختلف اسکول ڈسٹرکٹ بن جاتے ہیں۔ سب سے چھوٹا لوکل اسکول ڈسٹرکٹ ایک مدرس کا مدرسہ ہے۔ ان میں کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ پڑھنے والا صرف ایک ہی طالب علم ہوتا ہے۔

الحاقی استحکام

ایک ہی ریاست اور ایک ہی حلقے میں مختلف قسم کے اسکول اور ان کی انتظامی پیچیدگیاں تعلیمی ترقی و توسیع کی راہ میں حائل نظر آئیں تو امریکی ماہرین تعلیم نے الحاقی استحکام CONSOLIDATION کا فیصلہ کیا۔ یعنی مختلف چھوٹے چھوٹے تعلیمی مراکز کو ایک بڑے وحدے میں مدغم کر دیا جائے۔ اس طرح ایک قسم کا تعلیمی استحکام پیدا ہو جائے گا۔ اور نہ صرف یہ کہ مالی لحاظ سے فائدہ ہوگا، تعلیمی لحاظ سے بھی

زیادہ سہولتیں میسر آئیں گی۔

الحاقِ استحکام کا فیصلہ تو آسان تھا۔ لیکن اس فیصلے کو بروئے کار لانا مشکل تھا۔ بعض اسکول ڈسٹرکٹ اس کے حق میں اس لیے نہیں کہ اس سے ان کی اہمیت انادی سلب ہو جاتی ہے۔ یا ان کی سماجی روایات پر حرف آتا ہے۔ یا ان کی دینی تعلیم معرضِ وجود میں آجاتی ہے کیتھولک اسکول ڈسٹرکٹ اس وقت تک الحاقِ استحکام کے مخالف ہیں۔ اس کے باوصف الحاقِ استحکام کا کام جاری ہے اور اس میں خاصی کامیابی ہو رہی ہے۔ اس کے حصول کی تین صورتیں یہ ہیں۔

(۱) ایک اسکول ڈسٹرکٹ کا دوسرے اسکول ڈسٹرکٹ یا دو سے زیادہ اسکول ڈسٹرکٹ کا رفقا کار اشتراک۔

(۲) قانونی طور پر مختلف علاقوں کو ایک واحدے میں مدغم کرنا۔

(۳) اسٹیٹ بورڈ آف ایجوکیشن کے تحت اسکول ڈسٹرکٹ کو ایک نظام کے ماتحت لانا۔

اس الحاقِ استحکام کی مہم کے باوجود ابھی امریکہ میں نوسے ہزار اسکول ڈسٹرکٹ موجود ہیں۔ اس وقت تک اس الحاق کی جو کوشش کی گئی ہے اس کی دو صورتیں ہیں۔ ایک تو اشتراک عمل: جہاں یہ اشتراک عمل ممکن ہوا۔ کیمونٹی اسکول (COMMUNITY SCHOOL) قائم کر دیے گئے۔ اور بعض علاقوں میں بورڈ آف ایجوکیشن کے تحت علقہ بندی اسکول (REGIONAL CHOOL) قائم کر دیے گئے ہیں۔ ان دو قسم کے اسکولوں کے مزید استحکام کے لیے تعلیم کے ارباب انتظام بچوں کو ان کے گھر سے اسکول اور اسکول سے گھر پہنچانے کا انتظام کر رہے ہیں ؛

ذرّے
یعنی
ایٹم کی کہانی

عزیز احمد

مسلسل نمبر ۳

جوہر کی ساخت

اگر آپ اپنے فونٹین پن کے سرے کو اپنے گرم کوٹ کی آستین پر رگڑیں اور کاغذ کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے اس کے پاس لے جائیں تو وہ ان پرزوں کو اپنی طرف کھینچ لے گا۔ دیکھیں؛ اس لیے کہ پن کے سرے پر بجلی پیدا ہو چکی ہے۔ یہ منفی قسم کی بجلی ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی کوٹ کی آستین پر مثبت قسم کی بجلی بھی پیدا ہو چکی ہے۔ منفی اور مثبت قسم کی بجلیاں آپس میں مل کر ایک دوسرے کو بے اثر بنا دیتی ہیں۔

ہمارے اردگرد جتنی چیزیں ہیں۔ مثلاً کتابیں، میز، کرسی، کپڑے، خود ہمارا جسم، ان سب میں کوئی بجلی نہیں نہ مثبت نہ منفی۔ مگر سائنس دان دیر سے معلوم کر چکے تھے کہ ذرّے کا ایک ریزہ الیکٹرون ہے جو منفی بجلی کا ایک کرچ ہے۔ اگر تمام ذرّوں کے اندر بجلی موجود ہے تو پھر ان چیزوں میں بجلی کا نشان کیوں نہیں جو ان ذرّوں سے بنی ہیں؟ اس سوال کا جواب ایک ہی ہو سکتا تھا۔ وہ یہ کہ ہر ذرّے کے اندر منفی بجلی کی جتنی کرچیں موجود ہیں اتنی ہی کرچیں مثبت بجلی کی بھی ہوں گی۔ مگر یہ قیاس ہی قیاس تھا۔ ابھی اس کا ثبوت نہ ملا تھا۔

رودرفورڈ کی بم باری نے یہ ثبوت ہم پہنچا دیا۔ جب نائٹروجن کے ذرّوں پر بمباری ہوئی تو ان کے جوہروں میں سے کیا نکلا؟ نائٹروجن نہیں بلکہ ہائیڈروجن کے ننھے ریزے جو مثبت بجلی لیے ہوئے تھے۔ دوسرے عناصر کے ذرّوں پر بھی اسی طرح بمباری کی گئی اور ان کے جوہروں میں سے بھی ہائیڈروجن کے ننھے ریزے باہر نکلے جن پر مثبت بجلی تھی۔ ہائیڈروجن کے ذرّے پر سے اگر اس کا اکیلا الیکٹرون چھیل کر اتار دیا جائے تو پیچھے صرف مثبت بجلی کی ایک کرچ رہ جاتی ہے۔ طرح طرح کے ذرّوں پر بمباری کرنے سے ان کے جوہروں میں سے مثبت بجلی کی بھی کرچیں باہر نکلیں۔ انسان کو آخر اس سوال کا جواب معلوم ہو گیا جس کے

پیچھے وہ مدتوں سے سرگرداں تھا. کائنات کا عظیم الشان کارخانہ جن اینٹوں سے بنا ہے ان کے اندر مثبت بجلی کی وہی کرچ استعمال ہوئی جو ہائیڈروجن کے ذرّے میں موجود ہے. مثبت بجلی کی اس کرچ کو پروٹون کا نام دیا گیا.

اب اگلا سوال یہ تھا کہ مثبت بجلی کی کرچوں کو ذرّے میں کیا ترتیب دی گئی ہے؟ تجربوں نے ثابت کیا کہ ہر ذرّے میں مثبت بجلی کی کرچوں یعنی پروٹونوں کی تعداد بالکل اتنی ہی ہے جتنی الیکٹرونوں کی مثلاً ہائیڈروجن کے ذرّے میں صرف ایک الیکٹرون ہے. اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے اندر منفی بجلی کی صرف ایک کرچ ہے. اس کے جوہر میں صرف ایک پروٹون ہے. مخالف بجلیوں کی یہ دونوں کرچیں ایک دوسرے کے اثر کو زائل کر دیتی ہیں. اس لیے ہمیں ہائیڈروجن گیس میں کسی قسم کی بجلی محسوس نہیں ہوتی.

ذرّے کے جوہر میں جتنی کرچیں موجود ہوں وہ ہندسہ اس عنصر کا جوہری وزن کہلاتا ہے. مثلاً ہائیڈروجن کا جوہری وزن ایک ہے. کیوں کہ اس کے جوہر میں صرف ایک ہی کرچ ہے. اس بارے میں سائنسدانوں کو بہت جلد ایک مشکل پیش آنے لگی. انھوں نے ایسے نازک آلے پیدا کر لیے تھے جو ہر ذرّے کا وزن بالکل درست بتا سکتے تھے. جب ہیلیم گیس کا ذرّہ تولا گیا تو اس کا جوہری وزن چار نکلا. مگر اس کے جوہر میں مثبت بجلی کی صرف دو کرچیں تھیں. اس لحاظ سے اس کا وزن چار نہیں بلکہ دو ہونا چاہیے تھا. بالکل یہی حال دوسرے ذرّوں کا تھا. اس کی شرح صرف ایک ہی ہو سکتی تھی. وہ یہ کہ اگر ہیلیم کا وزن چار اور اس کے جوہروں میں پروٹونوں کی تعداد دو ہے تو یقیناً اس کے جوہر میں دو اور کرچیں بھی موجود ہیں. ان میں سے ہر کرچ وزن میں پروٹون کے برابر ہے مگر وہ ہر قسم کی بجلی سے خالی ہے. یہ قیاس آرائی دیر تک جاری رہی. آخر ۱۹۳۲ء میں ایک برطانوی سائنسدان نے جوہر کی اس کرچ کا کھوج بھی نکال لیا. اسے نیوٹرون کا نام دیا گیا. فطرت نے جوہر کو جن اینٹوں سے بنایا ہے وہ پروٹون اور نیوٹرون ہیں. ان میں سے پروٹون مثبت بجلی لیے ہوئے ہے مگر نیوٹرون ہر قسم کی بجلی سے خالی ہے.

نیوٹرون کی دریافت نے ایک اور دلچسپ سوال پر بھی روشنی ڈالی. وہ یہ کہ اگر کسی ذرّے کے جوہر میں سے کوئی نیوٹرون نکال دیا جائے یا اس میں ایک نیا نیوٹرون داخل کر دیا جائے تو اس سے اس کے

بجلی کے توازن میں کچھ فرق نہیں پڑتا یعنی اس کی ماہیت نہیں بدلتی، اگرچہ اس کا وزن ضرور بدل جاتا ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایک ہی عنصر کے ذرّے مختلف وزنوں کے ہو سکتے ہیں۔ اس وقت تک سائنس دان یہ دیکھ چکے تھے کہ فطرت میں اس قسم کی کئی مثالیں موجود ہیں۔ سائنس دان دیر سے یہ جانتے تھے کہ آکسیجن میں آٹھ پروٹون ہیں اور اس کا جوہری وزن ۱۶ ہے۔ ایک عرصے تک ان کا یہ خیال رہا کہ آکسیجن کے تمام ذرّے بالکل ایک سا وزن رکھتے ہیں۔ مگر بعد میں پتہ چلا کہ آکسیجن کے بعض ذرّے ایسے بھی ہیں جن کا وزن ۱۷ ہے اور کبھی کبھار کوئی ایسا ذرّہ بھی مل جاتا ہے جس کا وزن ۱۸ ہو۔ مگر یہ سب کے سب ہیں آکسیجن ہی کے ذرّے کیوں کہ ان سب کے جوہر میں آٹھ پروٹون ہیں جن کے گرد آٹھ الیکٹرون گھوم رہے ہیں۔ البتہ کسی کسی ذرّے کے جوہر میں آٹھ کی بجائے نو نیوٹرون مل جاتے ہیں اور کبھی کبھار کوئی ایسا ذرّہ بھی مل جاتا ہے جس میں آٹھ کی بجائے دس نیوٹرون ہوں۔ تاہم ان تمام ذروں کی کیمیائی خاصیت بالکل ایک سی ہے۔ کیونکہ کیمیائی خاصیت کا مدار پروٹون اور الیکٹرونوں کی تعداد پر ہے۔ اور یہ تعداد آکسیجن کے ہر ذرّے میں ایک سی ہے۔

جب کسی عنصر کے ذرّے مختلف وزن رکھتے ہوں تو وہ اس عنصر کے آئسوٹوپ کہلاتے ہیں مثلاً یورانیم کے دو آئسوٹوپ ہیں۔ ان میں سے ایک کا جوہری وزن ۲۳۵ ہے اور دوسرے کا ۲۳۸۔ ان میں سے پہلی قسم کا یورانیم دوسری قسم کے مقابلے میں بہت کم ملتا ہے۔ مگر جوہری توانائی پیدا کرنے میں زیادہ مفید پہلی قسم ہے۔

نیوٹرون کی دریافت نے سائنس دانوں کے ہاتھ میں ایک نیا اعلا قسم کا ہتھیار دے دیا۔ وہ جوہر کو نشانہ بنانے کے لیے اب تک ذرّے شعاعوں سے کام لے رہے تھے۔ اس بمباری کے لیے نیوٹرون کہیں زیادہ مفید ثابت ہوا۔ وہ وزن میں کہیں زیادہ بھاری تھا۔ پھر ہر قسم کی بجلی سے خالی ہونے کے سبب اس کے لیے جوہر کی مثبت بجلی کی رکاوٹوں کو عبور کرنا نسبتاً آسان تھا۔ مگر اس سے کام لینے کی راہ میں مشکلیں بھی تھیں۔ مادے کی جو خود بخود کم از کم ہر قسم کی بجلی سے خالی ہوا سے کس طرح پکڑا جائے؟ اس کی صرف ایک ہی صورت تھی وہ یہ کہ نیوٹرون رکھنے والے کسی بھاری جوہر کو ذرّے شعاعوں سے توڑا جائے۔ اس میں سے جو نیوٹرون باہر نکلیں وہ خود بخود دوسرے ذرّوں کے جوہروں کو نشانہ بنائیں

اس طرح ایک ایسا خود کار عمل شروع ہو جائے جو ہر لحظہ تیز سے تیز ہوتا جائے۔ یہ وہ مشہور زنجیری ردِعمل ہے جو جوہری بم میں پیدا ہوتا ہے۔

توڑنے پھوڑنے کے لیے قدرتی طور پر ایسے ذرے چنے جاتے ہیں جن کے جوہر بہت بھاری بھرکم ہوں۔ اس لحاظ سے یورانیم سب سے زیادہ موزوں ہے کیوں کہ اس کا ذرہ ہر دوسرے ذرے سے زیادہ بھاری ہے۔ یہی نہیں بلکہ جیسا ہم دیکھ چکے ہیں اس کا جوہر خود بخود گھٹتا رہتا ہے۔ اس قسم کے نرم جوہر کی توڑ پھوڑ نسبتاً زیادہ آسان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جوہری توانائی پیدا کرنے کے لیے یورانیم ہی چنا گیا ہے۔

کیمیائی تبدیلی

ہم نے پیچھے کہا ہے کہ جن ذروں کے جوہر میں پروٹونوں کی تعداد ایک سی ہو وہ ایک عنصر کے ذرے کہلاتے ہیں۔ خواہ ان میں نیوٹرون کی تعداد مختلف ہی کیوں نہ ہو۔ وجہ یہ کہ کسی جوہر میں جتنے پروٹون ہوں گے اتنے ہی الیکٹرون اس کے گرد گھومتے رہے ہوں گے اور کسی عنصر کی کیمیائی خاصیت کا انحصار اس کے الیکٹرونوں پر ہے۔ کیمیائی تبدیلی الیکٹرونوں کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ پروٹون اور نیوٹرون اس میں کچھ دخل نہیں دیتے۔

اس جگہ کیمیائی تبدیلی کے متعلق کھول کر بیان کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اس مطلب کے لیے ہم آگ کی مثال لیں گے۔ کیوں کہ یہ وہ کیمیائی عمل ہے جس سے ہر شخص اچھی طرح واقف ہے۔ ہم عام طور پر لکڑی یا کوئلہ جلاتے ہیں۔ لکڑی اور کوئلہ دونوں زیادہ تر کاربن سے بنتے ہیں۔ کاربن کے ذرے کا جوہری وزن ۱۲ ہوتا ہے۔ اس کا جوہر چھ پروٹونوں اور چھ نیوٹرونوں سے مل کر بنا ہے۔ اس جوہر کے گرد چھ الیکٹرون چکر لگاتے ہیں۔

ہم جانتے ہیں کہ چیزیں جلانے کے لیے آکسیجن کا ہونا ضروری ہے۔ جس ہوا میں آکسیجن موجود نہ ہو تو کوئی چیز جل نہیں سکتی۔ آکسیجن کے ذرے میں آٹھ پروٹون اور آٹھ نیوٹرون ہوتے ہیں اور اس کے جوہر کے گرد آٹھ الیکٹرون گھومتے ہیں۔ جب ہم لکڑی یا کوئلہ جلاتے ہیں تو ہوتا یہ ہے کہ لکڑی یا کوئلے کی کاربن

ایک ذرہ ہوا میں موجود آکسیجن کے دو ذروں کے ساتھ مل کر ایک سالمے (   ) کی شکل اختیار کرلیتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ان تینوں ذروں کے جوہر اپنی اپنی جگہ جوں کے توں موجود رہتے ہیں۔ مگر جو الیکٹرون پہلے ان میں سے ہر ایک کے جوہر کے گرد الگ الگ گھومتے تھے۔ وہ اب ان تینوں جوہروں کے گرد ایک پیچیدہ جالا تن دیتے ہیں۔ اس کی مثال بالکل وہی ہے جیسے تین کتابیں ایک رسّی سے باندھ کر ان کا ایک بنڈل بنالیا جائے۔ ان میں سے اب بھی ہر کتاب کے صفحے الگ الگ موجود ہیں۔ مگر رسّی نے ان تینوں کو ایک ساتھ جکڑ دیا ہے۔ کاربن کے ایک ذرّے اور آکسیجن کے دو ذرّوں کو جس رسی نے آپس میں باندھا ہے وہ ان کے الیکٹرون ہیں۔ اس رسّی میں جکڑے جانے سے اب یہ کاربن ڈائی آکسائڈ کا سالمہ بن گیا ہے۔ یہ سالمہ بالکل کتابوں کے بنڈل کی طرح ہے۔ تینوں ذرّوں کے جوہر یعنی پروٹون اور نیوٹرون پہلے کی طرح اپنا اپنی جگہ موجود ہیں۔ یہ بات نیچے دی ہوئی شکل سے زیادہ اچھی طرح سمجھ میں آجائے گی۔

آکسیجن کا ذرہ   کاربن کا ذرّہ   آکسیجن کا ذرہ

نیوٹرون ●   پروٹون ⊕   الیکٹرون ⊖
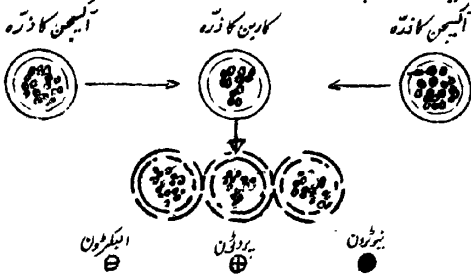
مگر اس سلسلے میں اہم سوال یہ ہے کہ آگ جلانے سے جو کیمیائی تبدیلی وجود میں آئی اس کی وجہ سے گرمی کیوں کر پیدا ہوگئی؟ آگ جلاتے وقت ہماری دل چسپی کاربن ڈائی آکسائڈ میں نہیں بلکہ اس حرارت میں ہوتی ہے جو اس سے پیدا ہوتی ہے۔ اس سوال کا جواب سمجھنے کے لیے ہمیں پہلے یہ بات ذہن نشین کرلینی چاہیے کہ مادے کے ہر ذرے میں قوت کی ایک مقررہ مقدار موجود ہوتی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ قوت کئی شکلیں اختیار کرسکتی ہے۔ حرکت، بجلی، حرارت، یہ سب قوت کی مختلف شکلیں ہیں۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ ذرّے کے مختلف ریزے منفی اور مثبت بجلی لیے ہوتے ہیں۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ الیکٹرون جو [illegible] کے

جوہر کے گرد بے تحاشا تیزی سے گھومتے ہیں۔ ان ساری قوتوں کو جمع کرنے سے کسی ذرے کی مجموعی قوت حاصل کی جا سکتی ہے۔

مگر اس بحث میں زیادہ اہم اور زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ جب کاربن کا ایک ذرہ اور آکسیجن کے ذرے آپس میں مل کر کاربن ڈائی آکسائڈ کا سالمہ بناتے ہیں تو اس سالمے کی مجموعی قوت ان تینوں ذروں کی قوت کے مجموعے سے کم رہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ باقی قوت یونہی ضائع نہیں ہو سکتی۔ وہ حرارت کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اس سے دو باتیں بالکل واضح ہو جاتی ہیں۔

(۱) کیمیائی تبدیلی ذروں کے جوہر پر کوئی اثر نہیں ڈالتی وہ اپنی اصلی حالت میں قائم رہتے ہیں۔

(۲) جب ہم لکڑی وغیرہ جلاتے ہیں تو اس کا بے حد تھوڑا سا حصہ قوت میں تبدیل ہوتا ہے اگر اس کے سارے ذرے پورے طور پر قوت میں تبدیل کیے جا سکتے تو پیدا ہونے والی گرمی قیامت خیز ہوتی۔

اس لیے ہم نے کہیں پیچھے کہا تھا کہ اگر ایک دیا سلائی کے ذروں کو پورے طور پر قوت میں بدلا جا سکے تو ان سے اتنی گرمی پیدا ہو جو کہ ایلپس کی ساری برف پگھلانے کے لیے کافی ہو۔

زنجیری ردِ عمل

<u>ذروں کی توڑ پھوڑ</u> : ہم دیکھ چکے ہیں کہ نظامِ فطرت میں اب تک ۹۲ قسم کے عناصر معلوم ہو چکے ہیں ان میں سے ہر عنصر کے ذرے الگ قسم کے ہیں یعنی ان ذروں میں پروٹونوں کی تعداد مختلف ہے۔ یہ وہ ۹۲ قسم کی اینٹیں ہیں جن سے خالق اکبر نے کائنات کا کارخانہ تعمیر کیا ہے۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ ہر ذرے کے جوہر میں سورج کی حیرت انگیز قوت بند ہے اور اگر کسی طرح اس قوت کو باہر نکالا جا سکے تو انسان کے پاس قوت کی بہتات پیدا ہو جائے۔ اور وہ کوئلے، تیل، بجلی وغیرہ کی ضرورت سے بے نیاز ہو جائے۔

یوں تو ہم اپنے اردگرد جتنی چیزیں دیکھتے ہیں خواہ وہ مٹی ہو یا پتھر، لکڑی ہو یا لوہا۔ یا کوئی اور شے یہ سب کی سب ذروں سے بنی ہیں۔ ان تمام ذروں کے اندر سورج کی قوت مقفل پڑی ہے۔ اگر ان ذروں کو توڑا پھوڑا جا سکے۔ یعنی ان کے جوہروں کو چور چور کیا جا سکے تو ان کے اندر سے قوت کا ایک بے پناہ

سمندر بن نکلے۔ مگر مشکل یہ ہے کہ ذروں کے جوہروں کی توڑ پھوڑ کی جائے تو کس طرح؟ بے شک اشعاعیں اور نیوٹرون وہ طاقتور توپ خانے ہیں جو ذرّوں کے جوہر پر دھنا دھن بمباری کر سکتے ہیں مگر یہ جوہر بھی اس بلا کے سخت جان ہیں کہ ان میں سے بہتوں پر کسی بمباری کا کچھ اثر نہیں ہوتا۔

جیسا پہلے بھی اشارہ گذر چکا ہے۔ فطرت میں طرح طرح کے جو ذرے پائے جاتے ہیں ان میں سے ۲۳۵ یورانیم ہی ایسا ہے جس کے جوہر کو آسانی سے توڑنا ممکن ہے۔ اس ذرّے کے جوہر میں ۹۲ پروٹون اور ۱۴۳ نیوٹرون ہوتے ہیں۔ یہ بہت بڑا اور پیچیدہ قسم کا جوہر ہے۔ اور اس کے ۲۳۵ ذرے آپس میں ایسی سختی سے جڑے نہیں ہوتے جتنے دوسرے عناصر کے جوہروں کے۔ تاہم اس کے گرد ۹۲ الیکٹرون ہوش ربا تیزی سے گھوم رہے ہوتے ہیں۔ کسی گولی کا اس الیکٹرونی دیوار میں سے گذر کر اندر جوہر تک پہنچنا کچھ زیادہ آسان نہیں۔ تاہم اگر کوئی نیوٹرون اس حفاظتی دیوار کو چیر کر ذرّے کے جوہر میں جا لگے تو یہ جوہر فوراً ٹوٹ کر دو ٹکڑے ہو جاتا ہے۔ یہ دونوں ٹکڑے "توڑ پھوڑ کی پیداوار" کہلاتے ہیں۔ ان دونوں ٹکڑوں کی مجموعی قوت اصل جوہر کی مجموعی قوت سے کم ہوتی ہے۔ جو قوت بچ جاتی ہے وہ فوراً بے پناہ گرمی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ گرمی کی یہ شدت دونوں ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں کو خوفناک رفتار پر مخالف سمتوں میں دھکیل دیتی ہے۔ وہ دوسرے ذروں سے ٹکر کھا کر رک جاتے ہیں اور اس ٹکر سے مزید گرمی پیدا ہوتی ہے۔

جوہر کے دو حصّوں میں ٹوٹنے سے ایک اور اہم نتیجہ بھی نکلتا ہے۔ جوہر میں ۹۲ پروٹونوں کے علاوہ ۱۴۳ نیوٹرون بھی ہوتے ہیں۔ جب جوہر پھٹ کر دو ہوتا ہے تو اس میں سے کچھ نیوٹرون بھی باہر نکل آتے ہیں۔ کبھی ایک نیوٹرون باہر نکلتا ہے، کبھی دو اور کبھی تین۔ اوسطاً ہر جوہر کے پھٹنے سے ۲ نیوٹرون باہر نکل آتے ہیں۔ نیچے دی گئی شکل میں یورانیم ۲۳۵ کے ایک ذرّے کے پھٹنے کی کیفیت ظاہر کی گئی ہے۔

نیوٹرون کی گولی سنسناتی جا رہی ہے

اس سلسلے میں یاد رکھنے والی بات یہ ہے کہ شروع میں یورانیم ۲۳۵ کے ایک ذرّے پر نیوٹرون کی طرف ایک گولی سے حملہ کیا گیا تھا۔ جب یہ گولی اس کے جوہر میں جاکر لگی تو اس نے نہ صرف اسے دو ٹکڑے کر کے بے تحاشہ گرمی پیدا کر دی بلکہ ساتھ ہی دو تین نئے نیوٹرون بھی مار باہر نکال ڈالے۔ اس طرح یہ دو تین گولیاں مفت میں ہاتھ لگ گئیں۔ یہ گولیاں سنسناتی ہوئی آگے بڑھتی ہیں اور نئے ذرّوں کے جوہروں کو پھاڑ کر دو دو ٹکڑے کر دیتی ہیں۔ اس سے نہ صرف مزید حرارت پیدا ہوتی ہے بلکہ اور نئے نیوٹرون باہر نکل کھڑے ہوتے ہیں جو آگے مزید ذرّوں کے جوہروں کو نشانہ بناتے ہیں۔ یہ وہ مشہور زنجیری ردّ عمل ہے جس کے طفیل یورانیم ۲۳۵ کا ایک ٹکڑا ایک سیکنڈ کے ایک تھوڑے سے حصے میں اس قدر قیامت خیز قوت میں بدل جاتا ہے کہ یہ قوت لرزا دینے والے دھماکے سے پھٹتی ہے اور زمین پر دوزخ کا دروازہ کھول دیتی ہے۔ اسی کا نام ایٹم بم ہے۔

زنجیری ردّ عمل کو زیادہ اچھی طرح ذہن نشین کرنے کے لیے دیا سلائی کا ایک ڈبہ لیں اور اس کی تیلیوں کو اس طرح ترتیب دیں کہ ہر تیلی آگے دو تیلیوں کو بھڑکا دے۔ اب پہلی تیلی کو آگ لگا دیں۔ آپ دیکھیں گے کہ فوراً شعلوں کا ایک الاؤ تیار ہو جائے گا۔ نیچے دی گئی شکل ملاحظہ ہو۔
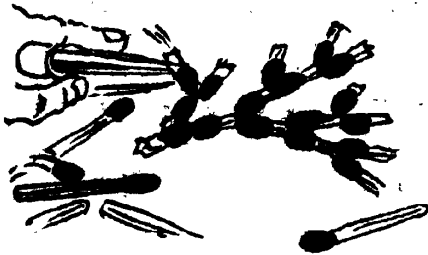
یورانیم ۲۳۵ کے ایک ڈھیلے میں جب زنجیری ردّ عمل شروع ہوتا ہے تو اس کی رفتار کا یہ حال ہے کہ ایک سیکنڈ میں بیس لاکھ ذرّے پھٹ جاتے ہیں۔ اس کے ۱/۱۰۰۰۰۰۰ سیکنڈ بعد ۸۰ ملین سے ذرّے پھٹ پڑتے ہیں اور آنکھ جھپکنے سے پہلے پہلے ۱۰ ٹریلین اور نئے ذرّے پھٹ پڑتے ہیں

یہ نقاط اسی طرح تیز سے تیز ہوتی جاتی ہے۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ یورانیم کے ذرّے دو قسم کے ہیں۔ یورانیم ۲۳۸ اور یورانیم ۲۳۵۔ دونوں کے جوہر میں ۹۲ پروٹون ہیں۔ اس لیے دونوں کے گرد ۹۲ الیکٹرون گھومتے ہیں۔ مگر جہاں ایک کے جوہر میں ۱۴۶ نیوٹرون ہیں وہاں دوسرے کے جوہر میں ۱۴۳ نیوٹرون ہیں۔ ہم نے ابھی دیکھا ہے زنجیری رد عمل پیدا کرنے کے لیے دوسری قسم کا یورانیم یعنی یورانیم ۲۳۵ کام دیتا ہے۔

مگر فطرت میں یورانیم ۲۳۵ اور یورانیم ۲۳۸ الگ الگ نہیں ملتے۔ دھات کے ایک ہی ڈھیلے کے بعض ذرّے ۲۳۵ ہوں گے اور زیادہ تر ۲۳۸۔ حقیقت یہ ہے کہ یورانیم ۲۳۵ بہت کم پایا جاتا ہے۔ یورانیم ۲۳۸ کے ۱۴۰ ذرّوں کے مقابلے میں یورانیم ۲۳۵ کا صرف ایک ذرّہ ہاتھ لگتا ہے۔

تاہم یورانیم ۲۳۸ بے کار نہیں جاتا۔ ہم نے دیکھا ہے کہ جب ایک نیوٹرون یورانیم ۲۳۵ کے جوہر سے ٹکراتا ہے تو یہ اسے چیر کر دو ٹکڑے کر دیتا ہے مگر یورانیم ۲۳۸ پر اس کا اثر مختلف قسم کا ہوتا ہے۔ اس کا جوہر نیوٹرون کو اپنے اندر جذب کر لیتا ہے۔ اس طرح ایک نیا عنصر پیدا ہو جاتا ہے جسے پلوٹونیم کا نام دیا گیا ہے۔ پلوٹونیم کو یورانیم ۲۳۵ کی طرح توڑا جا سکتا ہے۔ لہٰذا پلوٹونیم کے ذرّے بھی زنجیری عمل کے لیے ایندھن بن جاتے ہیں۔

تاہم جوہری قوت پیدا کرنے والے اس بات کو زیادہ پسند نہیں کرتے کہ نیوٹرونوں کی جو گولیاں ہاتھ لگی ہیں وہ یورانیم ۲۳۸ کے ذرّوں میں جذب ہو کر رہ جائیں بلکہ ان کی پہلی پسند قدرتی طور پر یہ ہوتی ہے کہ یہ گولیاں یورانیم ۲۳۵ کے ذرّوں سے ٹکرائیں اور انھیں ٹکڑے ٹکڑے کر دیں۔ مگر ہم دیکھ چکے ہیں کہ یورانیم کی ایک ڈلی میں یورانیم ۲۳۸ کے ذرّے یورانیم ۲۳۵ کے مقابلے میں ۱۴۰ گنا زیادہ ہوتے ہیں۔ اس لیے یورانیم ۲۳۵ کو الگ نہیں کیا جا سکتا۔ ہاں اگر کوئی ایسی تدبیر ہاتھ لگ جائے کہ نئے پیدا ہونے والے نیوٹرون صرف یورانیم ۲۳۵ کے ذرّوں سے ٹکرائیں تو یہ تدبیر بہت کام دے سکتی ہے۔ خوش قسمتی سے سائنس دان اس قسم کی ایک تدبیر نکالنے میں کامیاب ہو چکے ہیں۔ جوہر کے دو حصوں میں پھٹنے سے جو نیوٹرون باہر نکلتے ہیں وہ بے پناہ رفتار سے اڑتے ہیں۔ اگر ان کی رفتار کم کر دی جائے تو پھر وہ یورانیم ۲۳۸ کے پیٹ میں

جذب ہونے کی بجائے یورانیم ۲۳۵ سے ٹکراتے ہیں۔ ان کی رفتار کم کرنے کی صورت یہ ہے کہ پہلے انہیں کسی اور مادے کے ذرّوں کے ساتھ ٹکرایا جاتا ہے۔ یہ مادہ "اعتدال آور" کہلاتا ہے۔ اعتدال آور کے طور پر کئی قسم کے مادے کو استعمال کیا جا سکتا ہے۔ مگر عام استعمال کاربن کا ہے۔ جوہری بھٹی میں یورانیم کے ڈھیلوں کو کاربن کی تہ پر تھوڑے تھوڑے فاصلے پر رکھ دیا جاتا ہے۔ جب نئے نیوٹرون پیدا ہوتے ہیں تو پہلے وہ بے تحاشہ رفتار سے بھاگتے ہوئے کاربن کے ذرّوں سے ٹکراتے ہیں۔ اس سے ان کی رفتار مدھم پڑ جاتی ہے اور وہ اس قابل ہو جاتے ہیں کہ یورانیم ۲۳۵ کے ذرّوں سے ٹکرائیں۔

ذرّوں کا ملاپ

ہائیڈروجن بم: ہم نے اب تک اس جوہری قوت کا ذکر کیا ہے جو جوہروں کے پھٹنے سے پیدا ہوتی ہے۔ مگر جوہری قوت وہ جوہروں کے آپس میں مل کر ایک ہو جانے سے بھی پیدا ہوتی ہے۔ شدت کے لحاظ سے یہ قوت جوہروں کے پھٹنے سے پیدا ہونے والی قوت سے بھی بڑھ جاتی ہے۔ یہ بات دیکھنے میں بڑی عجیب معلوم ہوتی ہے۔ مگر حقیقت یہی ہے۔ لیجیے اب حقیقت کی تشریح سنئے۔

فطرت کا کارخانہ جن بنیادی اینٹوں سے بنا ہے ان میں سب سے ہلکی اینٹ ہائیڈروجن کا ذرّہ ہے۔ اس کے جوہر میں صرف ایک پروٹون ہوتا ہے جس کے گرد ایک اکیلا الیکٹرون گھومتا ہے۔ ہائیڈروجن ان عناصر میں سے ہے جو ایک سے زیادہ قسم کے ذرّے رکھتے ہیں۔ اس کے عام ذرّے تو ایک پروٹون اور ایک الیکٹرون پر مشتمل ہوتے ہیں۔ مگر ہائیڈروجن کے ہر چھ ہزار ذرّوں میں سے ایک ذرّہ ایسا بھی ہوتا ہے جس کے جوہر میں ایک پروٹون اور ایک نیوٹرون ہوتا ہے۔ یہ ہائیڈروجن کا بھاری ذرّہ کہلاتا ہے۔ اسے ڈیوٹیریم کا نام بھی دیا جاتا ہے۔ کیمیائی لحاظ سے بھاری ذرّے اور ایک عام ذرّے میں کچھ فرق نہیں ہوتا۔ مگر جوہری قوت پیدا کرنے کے معاملے میں بھاری ذرّہ بے حد قیمتی ہے۔

کیمیائی تبدیلی کے ذکر میں ہم نے دیکھا تھا کہ دو یا دو سے زیادہ ذرّے آپس میں اس طرح جڑ جاتے ہیں کہ ان کے جوہر تو اپنی اپنی جگہ قائم رہتے ہیں۔ مگر ان کے الیکٹرون ان کے گرد ایک ہالہ تان دیتے ہیں۔ اس طرح ایک سالمہ وجود میں آ جاتا ہے۔ سالمہ کی مجموعی قوت دونوں ذرّوں کی الگ الگ قوتوں

کے مجموعے سے کم ہوتی ہے جو قوت بچ رہتی ہے وہ گرمی پیدا کرنے میں صرف ہو جاتی ہے۔

ذرّوں کے باہمی ملاپ کی ایک اور صورت بھی ہو سکتی ہے۔ وہ یہ کہ ان کے جوہر آپس میں مل کر ایک ہو جائیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ذرّے بے پناہ رفتار سے ایک دوسرے کے ساتھ ٹکرائیں۔ باہمی ملاپ کا یہ عمل صرف ہائیڈروجن کے بھاری ذرّوں پر ہی کامیاب ہو سکتا ہے۔ یہ بھاری ذرّے جب بے پناہ رفتار پر اڑتے ہوئے ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں تو ان کے جوہر سیکنڈ کے ایک تھوڑے سے حصے کے لیے مل کر ایک ہو جاتے ہیں اور پھر جھٹ الگ الگ ہو جاتے ہیں۔ ہائیڈروجن کے دو بھاری ذرّے جب بے تحاشہ دوڑتے ہوئے آپس میں ٹکراتے ہیں تو ان کے جوہر مل کر ایک جوہر کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ اس نئے جوہر میں دو پروٹون اور صرف ایک نیوٹرون ہوتا ہے۔ دوسرا نیوٹرون باہر نکل جاتا ہے۔ اس طرح جو نیا ذرّہ بنتا ہے وہ ہائیڈروجن کا ذرّہ نہیں بلکہ ہیلیم کا ذرّہ ہوتا ہے کیوں کہ ہیلیم کے جوہر میں دو پروٹون اور ایک نیوٹرون ہوتا ہے۔

بھاری ہائیڈروجن کے دو ذرّوں کو کیمیائی عمل کے ذریعے بھی آپس میں جوڑا جا سکتا ہے۔ اس سے ہائیڈروجن کا ایک سالمہ پیدا ہو جاتا ہے اور ساتھ ہی حرارت بھی پیدا ہوتی ہے وجہ یہ کہ سالمے کی مجموعی قوت الگ الگ ذرّوں کی مجموعی قوت سے کم ہوتی ہے۔ مگر ان دو ذرّوں کے جوہروں کے ایک ساتھ مل جانے سے ہیلیم کا جو ذرہ پیدا ہوتا ہے اس کی مجموعی قوت سالمے کے مقابلے میں بہت کم ہوتی ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ فالتو قوت سے پیدا ہونے والی گرمی کیمیائی عمل سے پانچ کروڑ گنا زیادہ ہوتی ہے۔ کیمیائی اور جوہری ردّ عمل میں یہ فرق ہر جگہ نظر آتا ہے۔ جوہری ردِ عمل سے پیدا ہونے والی گرمی ہر صورت میں کیمیائی ردّ عمل سے پیدا ہونے والی گرمی سے لاکھوں کروڑوں گنا زیادہ ہوتی ہے نیچے دی ہوئی شکل ہائیڈروجن کے دو بھاری ذرّوں کے کیمیائی اور جوہری ملاپ کی وضاحت کرتی ہے

کیمیائی اور جوہری ردّ عمل کا فرق

ہائیڈروجن کے بھاری ذرّوں سے قوت حاصل کرنا اتنا آسان کام نہیں جتنا شاید یہ نظر آتا ہے وجہ یہ کہ ان کے جوہروں کو آپس میں ملانے کے لیے ضروری ہے کہ یہ ذرّے بے پناہ رفتار پر دوڑتے ہوئے باہم ٹکرائیں۔ ان کی رفتار تیز کرنے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ انھیں بے حد گرم کیا جائے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ لکڑی اور کوئلہ بھی اس وقت تک نہیں جلتے جب تک وہ گرم نہ ہو جائیں۔ مگر جلنے کا کیمیاوی عمل چند سو درجے سنٹی گریڈ پر ہی شروع ہو جاتا ہے۔ مگر جوہروں کے باہم ملنے کا جوہری عمل شروع کرنے کے لیے ذرّوں کے درجۂ حرارت کو لاکھوں درجے سنٹی گریڈ تک پہنچانا پڑتا ہے ——— پھر جب یہ درجہ حرارت حاصل ہو جائے اور جوہری عمل چل پڑے تو اس عمل کو قابو میں رکھنا آسان نہیں۔ بے قابو ہونے کی شکل میں ہائیڈروجن بم کا اس کا قیامت خیز دھماکہ اور ہمہ گیر تباہی کے سوا کچھ اور پیدا نہیں ہو سکتا۔

ذرّوں کے باہمی ملاپ سے جوہری قوت پیدا کرنے کا کام ابھی بہت کچھ تجرباتی منزل پر ہے ان تجربوں میں خاصی کامیابی ہوئی ہے۔ لیکن ابھی سائنس ذرّوں کو ملانے کے کام سے وہ خدمت نہیں لے سکی جو وہ ذرّوں کی توڑ پھوڑ سے لے رہی ہے۔ تاہم اس میں شک نہیں کہ جلد یا بدیر انسان بہت جلد اس قابل بھی ہو جائے گا کہ ذرّوں کے ملاپ سے پیدا ہونے والی جوہری قوت سے بھی تعمیری خدمت لے۔

نام میں کیا رکھا ہے؟

شاہد اشرف

نفسیاتی پہلو

مشہور انگریزی ادیب شیکسپیئر کا قول ہے کہ "نام میں کیا رکھا ہے، گلاب کا نام خواہ کچھ بھی رکھ دو، اس کی خوشبو اسی طرح رہے گی۔"

اس قول میں ایک حد تک سچائی موجود ہے۔ گلاب پھولوں کی دنیا کا بادشاہ ہے۔ خوبصورتی اور میٹھی خوشبو میں کوئی دوسرا پھول اس کی برابری نہیں کر سکتا۔ لیکن اس کا یہ حسن اور اس کی یہ خوشبو اس لیے نہیں کہ اس کا نام گلاب ہے۔ یہ نام محض ایک اتفاق ہے۔ اگر اس پھول کا نام گلاب کی جگہ کچھ اور پڑ جاتا تو پھر بھی اس کے حسن اور اس کی خوشبو کا یہی حال رہتا جو اب ہے۔

مگر یہ معاملے کا صرف ایک پہلو ہے۔ معاملے کا دوسرا پہلو بہت مختلف ہے۔ زیادہ دنوں کی بات نہیں کہ ایک چھوٹی لڑکی جس کا نام نیلوفر ہے۔ روتی ہوئی اپنی ماں کے پاس آئی اور منہ بسور کر کہنے لگی! "امی میرا نام بدل دیجیے۔ مجھے یہ نام ہرگز پسند نہیں"

ماں نے پچکارتے ہوئے کہا "کیوں بیٹی! نیلوفر کتنا پیارا نام ہے! نیلوفر کا پھول کتنا بھلا معلوم ہوتا ہے"

"نہیں نہیں" بچی نے بگڑ کر کہا "نیلوفر آپ کو بھلا معلوم ہوتا ہوگا مجھے بالکل اچھا نہیں لگتا"

"کیوں بیٹی" ماں نے کہا۔ "آخر اس نام میں کیا خرابی ہے؟"

بچی بولی "گلی میں سب بچے مجھے "نیلا پیلا رنگ" کہہ کر پکارتے ہیں۔ اس سے بڑی خرابی اور کیا ہوگی؟ میں یہ نام بدل کر رہوں گی"

ظاہر ہے کہ اس بچی کو نیلوفر کے پھول کی خوب صورتی سے کچھ بحث نہ تھی۔ اس کے لیے

بڑی خرابی اور کیا ہوگی؛ میں یہ نام بدل کر رہوں گی"

ظاہر ہے کہ اس بچی کو نیلوفر کے پھول کی خوبصورتی سے کچھ بحث نہ تھی۔ اس کے لیے اہم چیز وہ نفسیاتی ردِ عمل تھا جو دوسرے بچوں کے طعنوں سے اس کے اپنے دل میں پیدا ہوتا تھا۔ اس کے معصوم ذہن کو یہ یقین تھا کہ اگر اس کا نام نیلوفر کی بجائے کچھ اور رکھ دیا جائے تو کوئی اس کے نام کو بگاڑ کر اسے "نیلا پیلا" نہیں کہہ سکے گا۔

نام کا یہ نفسیاتی پہلو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ایسے بچوں بلکہ بالغ لوگوں کی بھی کمی نہیں جنھیں کسی نہ کسی وجہ سے اپنا نام اگر سخت ناپسند نہیں تو کم از کم زیادہ پسند بھی نہیں ہوتا۔ ہمارے یہاں مغربی ملکوں کی طرح خاندانی نام نہیں چلتے۔ ہر بچے کو پیدائش پر ایک نام مل جاتا ہے۔ یہ نام کلی طور پر والدین کی وقتی ترنگ پر موقوف ہوتا ہے۔ ممکن ہے سیانے ہونے پر بچہ محسوس کرنے لگے کہ اس کا نام مروجہ فیشن کے مطابق نہیں یا ایک ایسے ماحول کی غمازی کرتا ہے جس سے وہ متنفر ہو چکا ہے۔ شدید تنفر کی صورت میں نام تبدیل کر دیا جاتا ہے۔ مگر عام صورتوں میں یہ انتہائی قدم نہیں اٹھایا جاتا ماں باپ کا دیا ہوا نام باقی رکھا جاتا ہے۔ لیکن اگر یہ نام ہلکا سا ناخوش گوار نفسیاتی ردعمل بھی پیدا کرتا ہو تو یہ خلش کم و بیش عمر بھر باقی رہتی ہے۔

یہ اسی نفسیاتی حقیقت کا احساس تھا جس نے مسلم معاشرے میں اس دستور کو رواج دیا تھا کہ بچوں کے نام اچھے معانی دینے والے الفاظ پر مشتمل ہوں۔ ایسے الفاظ جو ذہن میں ایک خوش گوار ردِ عمل پیدا کریں۔ وجہ یہ کہ اس قسم کا ردِ عمل فرد کی شخصیت کو حقیقی معنوں میں سہارا دیتا ہے۔

مغربی ملکوں میں لوگوں کے خاندانی نام چلتے ہیں، اس رواج کے اور خواہ کچھ بھی فوائد ہوں اس کی ایک بدیہی خرابی یہ ہے کہ اکثر خاندانی نام بے حد بھونڈے قسم کے ہوتے ہیں۔ مگر خاندان میں پیدا ہونیوالا ہر فرد یہ نام اپنے اوپر چپکانے پر مجبور ہوتا ہے۔ وہ اسے کسی طرح بدل نہیں سکتا۔ اس دستور کی دوسری بڑی خرابی اس کی غیر جمہوری روح ہے۔ معاشرے کے بعض خاندان دولت یا اقتدار کے لیے نام پیدا کر لیتے ہیں۔ ان خاندانوں کا ہر فرد خواہ وہ فطری صلاحیتوں کے معاملے میں کسی پائے کا ہو، خاندانی نام کے

سہارے اپنی معتبری جمائے رکھتا ہے اور دوسرے خاندانوں کے افراد خواہ وہ فطری صلاحیتوں کے معاملے میں اس شخص سے کتنے ہی اچھے ہوں، اپنے آپ کو اس کے مقابلے میں فروتر سمجھنے پر مجبور رہتے ہیں۔ خاندانی ناموں کا دستور اس لحاظ سے ایک قسم کا ذات پات کا نظام بن کر رہ جاتا ہے۔

ان باتوں کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا درست نہیں کہ نام میں کیا رکھا ہے؛ نام میں بہت کچھ ہوتا ہے، بے شک "گلاب" کا نام "نا" رکھ دینے سے اس کے قدرتی حسن اور اس کی خوشبو میں کچھ فرق نہیں آئے گا۔ لیکن ایک عرصے تک اس کا نیا نام ذہنوں میں ایک ناخوش گوار ردِّ عمل پیدا کرتا رہے گا۔ انسانی نقطۂ نگاہ سے اس ذہنی ردِّ عمل کی اذیت بھی بالکل ایسی ہی حقیقی ہے جتنی گلاب کی قدرتی لطافت۔

نام اور تحت الشعور

چند سال گزرے راقم کے ایک جاننے والے نے اپنے لڑکے کے نام میں "پرویز" کا لفظ شامل کرنا چاہا، اس کے بھائی نے اسے یہ کہہ کر روک دیا کہ ہم اپنے بچے کے نام میں یہ منحوس لفظ شامل نہیں کریں گے "پرویز" ایران کا وہ ملعون حکمران تھا جس نے نہ صرف رحمۃ اللعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک خط کو پھاڑ ڈالا تھا، بلکہ اس نے اپنے یمن کے گورنر کو یہ حکم بھی بھیجا تھا کہ حضورؐ کو گرفتار کرکے پیش کرے۔ ان ناشائستہ حرکات کے چند ہی دنوں بعد خسرو پرویز اپنے بیٹے کے ہاتھوں قتل ہو گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کی لمبی چوڑی سلطنت جس نے اس کا سر پھیر رکھا تھا، مسلمانوں کے ہاتھوں پاش پاش ہو کر رہ گئی۔

بہرحال اگر اس بچے کا نام "پرویز" رکھ بھی دیا جاتا تو اس میں بچے کا کوئی قصور نہ ہوتا۔ اغلب تھا کہ وہ سیانا ہونے پر بھی اپنا یہ نام باقی رکھتا۔ مگر یہ چیز اس کی اپنی ذہنی کیفیت کے متعلق کچھ زیادہ خبر نہ دیتی۔

تاہم اپنی پسند سے رکھے ہوئے ناموں کا معاملہ اس سے سراسر مختلف ہے۔ ہمارے ہاں بعض پڑھے لکھے لوگ سیانے ہونے پر اپنے نام کے ساتھ کسی تخلص کا اضافہ کر لیتے ہیں قطع نظر

اس سے کہ وہ شعر کہتے ہیں یا نہیں۔ اس قسم کا جو دُم چھلا نام کے ساتھ بڑھایا جائے وہ یقینی طور پر انسان کے تحت الشعور کی ایک قابلِ اعتماد جھلک پیش کرتا ہے۔ مثلاً جس آدمی نے اپنے نام کے ساتھ "حسرت" کا اضافہ کر رکھا ہو، اس کے متعلق یہ بات خاصے یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ اس کا دل کسی بہت بڑی تمنا کا مدفن ہے۔ اسی طرح جس شخص نے اپنے نام کے ساتھ "آزاد" کا لفظ بڑھا رکھا ہو اس کے متعلق یہ قیافہ لگانا غلط نہیں کہ وہ پرانی لکیروں کا دلدادہ نہیں۔

اس ضمن میں ایک دلچسپ واقعہ کا ذکر کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ ایک صاحب راقم کے ایک دوست کے پاس جناب غلام احمد پرویز کا کچھ لٹریچر لائے اور تقاضہ کیا کہ وہ اسے ضرور پڑھیں۔ دوست نے ان کتابچوں پر ایک سرسری سی نگاہ ڈالی اور پھر معذرت خواہانہ انداز میں کہا: "شاید میں انھیں پڑھنے کے لیے وقت نہ نکال سکوں۔"

"اچھا سبھی نہ سہی۔ پرویز صاحب کی تقریروں کے یہ اقتباسات پڑھ لیجیے گا۔ صرف چند اوراق ہیں۔ ان کے مطالعہ سے پرویز صاحب کے نقطۂ نگاہ کی اچھی طرح وضاحت ہو جائے گی۔"

"میں ان کا ایک لفظ پڑھے یا سنے بغیر ان کے متعلق ایک رائے قائم کر چکا ہوں جسے شاید ان کی ساری تقریریں تبدیل نہ کر سکیں۔"

"یہ سراسر زیادتی ہے! آخر وہ رائے کیا ہے اور کس چیز پر مبنی ہے؟"

"وہ رائے یہ ہے کہ پرویز صاحب کا تحت الشعور اُسوۂ حسنہ سے پوری طرح مطمئن نہیں وہ اس میں ردوبدل جائز سمجھتے ہیں۔ ان کا اختیار کردہ نام "پرویز" ان کی اس تحت الشعوری کیفیت کی صاف غمازی کر رہا ہے۔ پرویز کا نام انھیں غالباً والدین کی طرف سے نہیں ملا، بلکہ ان کی اپنی پسند ہے اور اس کے نفسیاتی مضمرات بالکل واضح ہیں۔"

دوسرے آدمی نے اس استدلال کے توڑ میں بہت کچھ کہا۔ مگر اس کی باتیں نہ میرے دوست کو قائل کر سکیں نہ مجھے۔

معلومات عامہ

افریقی ممالک حکومت خود اختیاری کی راہ پر

نائیجیریا اس سال اکتوبر میں آزادی حاصل کر رہا ہے اور اس طرح جنگ عظیم کے بعد برطانوی پالیسی کے نتیجہ میں آزاد ہونے والی اقوام کی تعداد بارہ تک پہنچ جائے گی۔ اب اس سال افریقہ کے تمام دیگر برطانوی علاقوں کی آئینی ترقی پر نظر ثانی کی جائے گی۔

ان علاقوں میں برطانیہ کا جو مقصد ہے وہ ڈھکا چھپا نہیں۔ وہ ایسے حالات پیدا کرنا چاہتا ہے جو جمہوری بنیادوں پر حکومت خود اختیاری کی نشو و نما کو ممکن بنائیں۔ ویسے اس وقت تک بیس پچاس علاقے جن کی آبادی سات کروڑ پچاس لاکھ نفوس پر مشتمل ہے، ایسے ہیں جن کے نظم و نسق کی ذمہ داری ابھی تک برطانیہ پر عائد ہے۔ سوال یہ ہے کہ ان کو فوراً آزادی کیوں نہیں دے دی جاتی۔

دراصل اس کی کئی وجوہ ہیں۔ ایک مسئلہ تو ان کے وسائل کا ہے۔ دوسری مشکل یہ ہے کہ بعض علاقے بہت چھوٹے اور ان کے ذرائع بہت محدود ہیں۔ کچھ علاقے نسلی مشکلات سے بھی دو چار ہیں۔ ایک اور سبب جس کا اطلاق متعدد علاقوں پر ہوتا ہے، یہ ہے کہ مقامی تربیت یافتہ لوگوں کی کمی ہے۔ متعدد افریقی لیڈروں نے افریقی ملکوں کی اس کمی کو تسلیم کیا ہے۔ یہ کمی نہ صرف پالیسی وضع کرنے والی یا وزارتی سطح پر بلکہ تمام انتظامی اور ٹیکنیکل سروسوں میں بھی پائی جاتی ہے۔ ہر کوئی جانتا ہے کہ جنگ کے بعد آزاد ہونے والے متعدد ملکوں کو اس کی وجہ سے شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہے۔

ادھر برطانیہ اپنے طور پر تہیہ کیے ہوئے ہے کہ وہ افریقہ میں پبلک سروس کے معیار کو بلند کرے گا۔ اس معاملہ میں سب سے بڑی مشکل اعلیٰ عہدوں کی ہے۔ جہاں تک ماتحت علاقوں کی انتظامی سروسوں کی متوسط اور چھوٹے درجہ کی ملازمتوں کا تعلق ہے تو وہ تقریباً سب کی سب پہلے ہی سے مقامی لوگوں کے ہاتھ میں ہیں۔ چناں اس مشکل کا کوئی سیدھا اور آسان حل نظر نہیں آتا۔

جیسا کہ گورنر نیاسالینڈ، سر رابرٹ آرمیٹج نے اس علاقہ کے متعلق کہا ہے کہ جدید مملکت کی تجارتی، صنعتی اور دیگر غیر سرکاری سرگرمیوں کا انتظام کرنے والوں کی بات تو الگ رہی، ملک میں ایسے لوگوں کی تعداد بھی کافی نہیں جو سرکاری سروسوں کو چلانے کی تعلیمی پیشہ ورانہ اور ذہنی قابلیت اور صلاحیت رکھتے ہوں۔ حکومت اس بات کی کوشش کر رہی ہے کہ افریقی باشندوں کو تربیت کے ذرائع مہیا کیے جائیں۔ لیکن ملک میں جب مشکل تیس چالیس گریجوایٹ ہوں تو اہل افریقہ کو اس قسم کی تربیت دینے میں لازمی طور پر کئی سال لگ جائیں گے۔

بہرحال نیاسالینڈ اور دیگر افریقی علاقوں میں تربیت دینے کا آغاز ہو چکا ہے۔ نیاسالینڈ کی سول سروس میں لگ بھگ چالیس افریقی باشندے اعلیٰ عہدوں پر مامور ہیں۔ دسمبر میں یہاں پہلے تین افریقی نائب ضلع کمشنر مقرر ہوئے۔ ان کو وہی اختیارات حاصل ہیں جو ان کے یورپی رفقاء کو حاصل ہیں۔

مشرقی افریقہ میں بھی مقامی لوگوں کو سرکاری ملازمت دینے کی مہم پُرزور طریقے سے جاری ہے۔ ٹانگا نیکا سے متعلق ایک رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ جتنی جلدی ممکن ہوا۔ وہاں مقامی لوگوں کو سول سروس کے عہدے دیئے جائیں گے۔

یوگنڈا نے اس سلسلہ میں ایک پانچ سالہ منصوبہ تیار کر رکھا ہے جس کی رو سے سول سروس کے دو اعلیٰ ترین درجوں کی تمام ملازمتوں کی ایک چوتھائی اور ان کے بعد کے درجے کی ملازمتوں کی اس سے زائد تعداد مقامی امیدواروں کے ذریعہ پُر کی جائے گی۔ ویسے ان دنوں وہ اپنے منصوبے کے دوسرے سال میں داخل ہوا ہے۔ یہ ایک عملی منصوبہ ہے جس کی بنیاد اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والے مقامی طلباء کی تعداد پر رکھی گئی ہے۔

سچ پوچھیے تو سب سے بڑا مسئلہ تعلیم ہی کا ہے، جیسا کہ وزیر مملکت برائے نوآبادیات لارڈ پرتھ نے کینیا کے بارے میں کہا ہے کہ حکومت کینیا کا یہ فیصلہ ہے کہ وہ سول سروس میں زیادہ سے زیادہ مقامی لوگوں کو بھرتی کرے گی۔ ہم اس وقت تک یقین کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتے

کہ حکومتِ خود اختیاری کا وقت آگیا ہے۔ تا وقتیکہ اس بات کا معقول حد تک یقین نہ ہو جائے کہ سول سروس میں مقامی لوگوں کی تعداد کافی ہو گئی ہے۔

پٹ سن کے بارے میں پاکستان کا فیصلہ

پاکستان نے پٹ سن بونے پر سے پابندیاں اٹھانے کا جو فیصلہ کیا ہے اس کو جیوٹ انڈسٹریز لمیٹڈ کے چیئرمین اور جوائنٹ منیجنگ ڈائرکٹر سر ولیم جی۔ این واکر نے سراہا ہے۔ کمپنی کے سالانہ اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ مجھے یقین ہے کہ کچھ مدت کے بعد عالمی منڈیوں میں کافی خام پٹ سن کی رسد ہمارے اور پاکستان کے لیے نفع بخش ہو گی۔ اور مجھے یہ بھی توقع ہے کہ آئندہ قیمتوں میں بھی زیادہ سے زیادہ استحکام پیدا ہو جائے گا۔

برطانوی صنعت کی فرمائش پر پاکستان سے ایک وفد اگلے ماہ کے شروع میں یہاں آرہا ہے اس وفد کے ممبر پاکستان پٹ سن تحقیقاتی کمیشن کے اراکین کی حیثیت سے گذشتہ سال سے وسطِ پاکستان میں خام پٹ سن کی صنعت کے بارے میں مطالعہ کر رہے ہیں اور آئندہ اپنی سفارشات حکومت پاکستان کو پیش کریں گے۔ ہمیں امید ہے کہ سمندر پار ملکوں سے خام پٹ سن کی تجارت کے موجودہ طریقوں میں کوئی مداخلت نہ ہو گی۔

اس سے قبل سر ولیم نے اپنی رپورٹ میں کہا کہ جیوٹ انڈسٹریز لمیٹڈ کے پٹ سن کاتنے اور اسے بننے کے شعبے پوری طرح سرگرم عمل ہیں جس کی وجہ برطانیہ اور سمندر پار میں دریاں اور چٹائیاں وغیرہ کی روز افزوں مانگ ہے۔ بالخصوص نمدوں اور دریوں کی صنعتوں میں ہماری خاص مصنوعات کی زیادہ کھپت ہے۔ نیز تمام دنیا میں معیار زندگی بلند ہونے سے جو مانگ بڑھ رہی ہے اس سے فائدہ اٹھا رہی ہیں۔

سر ولیم نے مزید کہا کہ اس کے علاوہ اعلیٰ درجہ کے پٹ سن کے کپڑے کی بھی مانگ بڑھ رہی ہے۔ برطانیہ اور بیرونی ممالک کی ان ضروریات کو بمشکل پورا کر رہے ہیں۔ چنانچہ ہم پٹ سن بننے کی صنعت کو ترقی دینے کی غرض سے دس لاکھ پونڈ خرچ کر چکے ہیں یا اس خرچ کی ذمہ داری لے چکے ہیں۔

بہتر اور زیادہ سبزیوں کی کاشت

پانچسو پچیس ایکڑ بہتر زمین برطانیہ میں ایک سو سڑسٹھ سائنسدانوں اور ان کے معتمدین کی ایک جماعت کے لیے مخصوص ہے۔ یہ سائنس دان آجکل ترکاریوں کے بارے میں مطالعہ اور تجربہ کر رہے ہیں وزارت زراعت شعبۂ سائنس و صنعتی تحقیقات اور متعدد انجمنوں اور یونیورسٹیوں کے نامور افسروں کی زیر نگرانی یہ تمام سرگرمیاں جاری ہیں۔ روزمرہ غذا کی ان معمولی چیزوں کی اہمیت کا اندازہ اسی سے کیا جا سکتا ہے کہ خود ڈیوک آف ایڈنبرا نے قومی ترکاریوں کے تحقیقاتی مرکز واقع ویلیز بورن، وارویکشائر میں ایک نئی تجربہ گاہ کا سرکاری طور پر افتتاح کیا تھا۔ لندن کے نامہ نگار مائیکل کوننگھم نے ذیل کے مضمون میں اسی موضوع پر روشنی ڈالی ہے۔

"بہتر معیار زندگی کس طرح قائم کیا جا سکتا ہے؟" اس سوال کا مختصر اور ظاہرا جواب ہے: "زیادہ سے زیادہ روپیہ صرف کر کے" لیکن یہ جواب مکمل نہیں ہے۔ مثال کے طور پر وہ کسان جو سرک کے طور پر ایک ویران جزیرہ میں رہتے ہیں اوسط درجہ کی اجرتیں پانے والے شہریوں کے مقابلہ میں کہیں پست معیار زندگی رکھتے ہیں۔ شہریوں کی آمدنی بے شک کم ہوتی ہے۔ لیکن انھیں صحت افزا مکانات، مفت طبی امداد اور قوم کی غذا کو ترقی دینے والے اداروں کے مشورے حاصل ہو سکتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ بلند معیار زندگی ان ہی ملکوں میں پایا جاتا ہے جہاں زندگی کو بہتر اور صحت مند بنانے کے لیے تحقیقاتی کام پر زیادہ سے زیادہ وقت، طاقت اور تخلیقی قوت صرف کی جاتی ہے یہ تحقیقاتی کام سائنسی تحقیقات، طبی تحقیقات اور روزمرہ کے استعمال کی چیزوں مثلاً غذا کی تحقیقات سے متعلق ہے۔

یہ بات کوئی ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ دنیا کی آبادی اس قدر تیزی سے بڑھ رہی ہے کہ وافر مقدار میں غذا کی پیداوار وقت کا سب سے اہم مسئلہ بنتا جا رہا ہے۔ غذائی پیداوار ایک عالمی مسئلہ ہے اور غذائی پیداوار کو بڑھانے کے سلسلہ میں جو بھی قدم اٹھایا جائے گا قابل تحسین ہوگا برطانوی قومی ترکاریوں کے تحقیقاتی مرکز کے قیام کا ایک خاص مقصد یہ بھی ہے جس کے

بارے میں کچھ بتانا چاہتا ہوں۔ ویلزبورن کی تجربہ گاہ میں اچھی ترکاریاں پیدا کرنے اور انھیں بیماریوں اور کیڑے مکوڑوں سے محفوظ رکھنے کے سلسلے میں تجربات کیے جارہے ہیں۔ اس کے علاوہ پنگلشم، اسیکس میں ایک ذیلی مرکز ہے۔ جہاں ویلزبورن کے پودوں کے بیج بوئے جاتے ہیں۔ یہ بیج عام تجارتی ذرائع سے تقسیم کیے جاتے ہیں۔ تاکہ ہر جگہ کے ترکاریوں کے بونے والے انھیں آسانی سے خرید سکیں۔

ویلزبورن میں جو تجربات کیے جارہے ہیں وہ دنیا بھر میں استعمال ہونے والی ترکاریوں مثلاً آلو، گاجر، بند گوبھی، پھول گوبھی، مٹر اور سیم وغیرہ پر حاوی ہیں اور یہ تحقیقاتی مرکز ڈاکٹر جیمس ملپ کی زیر نگرانی کام کر رہا ہے۔ جنھیں پودوں کی غور و پرداخت کے سلسلہ میں گہرا تجربہ حاصل ہے۔ موصوف اسکاٹ لینڈ کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ گلاسگو یونیورسٹی سے بی اے کیا اور ۱۹۳۳ء میں مصری وزارت زراعت میں غلہ اور دوسری فصلوں کی پیداوار کے انچارج مقرر ہوئے۔ آٹھ سال بعد مٹھاڑ کی تحقیقات کرنے کے لیے جنوبی افریقی محکمۂ جنگلات میں شامل ہو گئے۔ اس کی چھال چمڑہ رنگنے کے کام میں آتی ہے اور تجارتی طور پر قابل قدر ہے۔ چناں چہ ڈاکٹر ملپ نے پیٹرمیرٹسبرا میں مٹھاڑ کا تحقیقاتی ادارہ قائم کیا۔

لیکن اسکاٹ لینڈ کے اس سائنسدان نے کھانے کی ترکاریوں میں بھی دل چسپی کم کی اور ۱۹۴۹ء میں وہ برطانوی قومی ترکاریوں کے تحقیقاتی مرکز، ویلزبورن کے ڈائرکٹر مقرر ہو گئے۔ اس مرکز میں ایک لائبریری، تقریر کا کمرہ اور ایک تہ خانہ شامل ہے۔ جہاں اُگی ہوئی ترکاریاں ایک خاص ماحول میں رکھی جا سکتی ہیں۔ عمارت علیحدہ پلاسٹک کی بیرونی دیواروں اور تانبے کی چھت سے محفوظ ہے۔ ان حالات میں ڈاکٹر ملپ اور سائنسدانوں پر مشتمل ان کا عملہ مختلف قسم کی ترکاریوں کی پیداوار کے سلسلہ میں مطلوبہ حالات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

دراصل زیادہ سے زیادہ تنومند اور بارآور ترکاری کے پودے لگانا اس تحقیقات کا واحد مقصد ہے۔ برسلز کے کرم کلے کی ایک نئی پیوندی نسل کی نشو و نما کی گئی ہے۔ ان پیوندی نسل کے بعض

پودوں پر سے پہلے کے مقابلے میں چالیس فی صدی زیادہ پھل اترا ہے۔ بے موسم کے مٹر پیدا کرنے کے بھی تجربات ہو رہے ہیں۔ یہ مٹر سال کے بیشتر حصے تک موجود رہتی ہے۔ پھول گو بھی اور پیوندی پپیا نہ کے پیدا کرنے کے بھی تجربات کیے جا رہے ہیں۔

ڈاکٹر طلب کا عملہ مختلف قسم کے ماہرین پر مشتمل ہے۔ ان کے عملے سے متعلق ماہرین حشریات ان کیڑے مکوڑوں کی تحقیقات کر رہے ہیں جو ترکاریوں اور فصلوں کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ ویسے کیڑے مارنے کی دوائیں مؤثر ضرور ہیں۔ لیکن ان کے احتیاط سے استعمال کی ضرورت ہے۔ ویلیز بورن میں تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ بند گوبھی مکھی کو مارنے کے لیے پودوں پر دوا چھڑکنا فائدہ سے زیادہ نقصان پہنچاتا ہے۔ اس دوا کو بند گوبھی کی جڑ کے چاروں طرف چھڑکنے سے یہ مکھی مر جاتی ہے اور گوبھی کو بھی نقصان نہیں پہنچتا۔

کیڑے مار دواؤں کا ایک نقص یہ بھی ہے کہ بعض دوائیں ترکاریوں پر داغ ڈال دیتی ہیں مثال کے طور پر گاجروں پر ان دواؤں سے بڑی جلدی بدنما داغ پڑ جاتے ہیں۔ چناں چہ ڈاکٹر طلب نے سبزیوں کے ذائقہ کا اندازہ لگانے کے لیے ایک جماعت تشکیل دی۔ اس کے ممبر اندھیرے میں بیٹھتے ہیں اور ترکاریاں کھا کر یہ معلوم کرتے ہیں کہ کیڑے مار دوا کا کونسا خاص جز و ضرر رساں ہے اور پھر وہ اس دوا کی ترکیب بدل دیتے ہیں۔

ویلیز بورن کے ماہرین مرضیات ان بیماریوں کا کھوج لگانے کی فکر میں ہیں، جو ہر قسم کی فصلوں پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ انھوں نے معلوم کیا ہے کہ ایک بیماری جو چقندر کی فصل کو نقصان پہنچاتی ہے اسٹریپٹو مائی سین سے قابو میں آ سکتی ہے۔ جیسے یہ دوا اس سے قبل صرف انسانی بیماریوں میں استعمال ہوتی تھی۔

ایک دوسرا مسئلہ آبپاشی کا ہے جس پر ویلیز بورن نے خاص طور پر توجہ دی ہے۔ اچھی اور بڑی ہلوں کا دار و مدار آبپاشی پر ہے۔ لیکن کیڑے مار دواؤں کی طرح آبپاشی پر بھی نگرانی کی ضرورت ہے۔ یہ بتانا کہ پانی کی کمی کس وقت فصلوں پر زیادہ اثر انداز ہوتی ہے بے حد اہم ہے۔ ان مقامات پر جہاں بارش زیادہ نہ ہو اور پانی کی فراہمی محدود ہے۔ اس کا علم بے حد اہم ہے۔ ویلیز بورن کے شعبۂ آبپاشی نے

ایک پیمانہ ایجاد کیا ہے جس سے زمین میں پانی کی کمی کا اندازہ ہر منزل پر کیا جا سکتا ہے۔

یہاں ایک شعبہ نامیات بھی ہے جو ترکاریاں پیدا کرنے کے طریقوں پر طویل المیعاد تجربات کر رہا ہے۔ ان تجربات سے اندازہ ہوتا ہے کہ وسیع تر علاقے زیر کاشت لائے جا سکتے ہیں۔

ان تمام سرگرمیوں میں عالمگیر دلچسپی موجود ہے۔ صرف گذشتہ سال سات سو سے زیادہ سیاح ویلز بورن آئے۔ یہ سیاح بیس ملکوں کے تھے۔ اور ان ملکوں میں چلی اور انڈونیشیا جیسے دور دراز علاقے بھی شامل ہیں۔ نئی تجربہ گاہ کے بروئے کار آنے کے بعد قومی ترکاریوں کے تحقیقاتی مرکز کی ترقی کا ایک بڑا حصہ مکمل ہو گیا۔ اور ڈاکٹر ٹلپ اور ان کے ساتھی ترکاریوں کی پیداوار بڑھانے میں مصروف کار ہیں اور اس طرح عالمی غذائی مسئلہ کا حل تلاش کر رہے ہیں۔

زرعی پیداوار بڑھانے کے لیے ماہرین کی جدید تحقیقات

آپ یہ جان کر حیران ہوں گے کہ موجودہ زمانے میں برطانوی کھوج لگانے والوں کے لیے اہم کام ان کا منتظر ہے۔ یہ کام خلا میں قطبین کے علاقوں کی دریافت کا نہیں ہے۔ اس کام کی نوعیت اور برطانوی سائنس دانوں کی ایک ماہروں کی جماعت کس طرح اسے سرانجام دے رہی ہے۔ اس کا حال لندن کی شیلا اور کیتھگن ذیل کی رپورٹ میں بیان کر رہی ہیں۔

دنیا میں ابھی کتنی زمین باقی ہے جس کو زیر کاشت یا کسی اور طور سے زیر استعمال لایا جا سکتا ہے؟ کس قدر ایسی زمین ہے جو کبھی زیر کاشت تھی لیکن اب ناقابل کاشت ہے، اور اسے دوبارہ قابل کاشت بنایا جا سکتا ہے؟ کونسی فصلیں اگائی جاتی ہیں؟ کون کون سے مویشی پالے جا سکتے ہیں اور کس طریقے؟ یہ ایسے سوالات ہیں جن پر عام آدمی کبھی غور نہیں کرتا۔ لیکن ہر سال ان کی اہمیت بڑھتی ہے۔ ان کے جوابات معلوم کرنا نئی قسم کا کھوج لگانے والے ماہرین کا کام ہے۔ ان جوابات کا تعلق [illegible] لاکھوں انسانوں کے لیے دیہات اور ضرورت کا فرق ملحوظ رکھتے ہوئے [illegible]

[illegible] چاہیے۔ [illegible] آبادی کا اضافہ ہے اس صدی کے آ[illegible]

یہ تعداد دوگنی ہو جائے گی۔ اور اس طرح جو زیادہ مانگ بڑھے گی اس کو پورا کرنے کے لیے زمین کے اور وسائل تلاش کرنے ہوں گے۔

اس سلسلہ میں پہلا قدم ناقابل کاشت زمین کا جائزہ اس کی درجہ بندی اور پیداوار کے امکانات کا جائزہ لینا ہوگا۔ سادہ الفاظ میں یہ ایک طویل کام ہے۔ لیکن ان لوگوں کے لیے اتنا طویل نہیں جو مشکلات پر قابو پانے میں مسرت محسوس کرتے ہیں ایسے لوگ ناممکن کو ممکن کرنا جانتے ہیں یہ لوگ ماہرانہ سائنس، فنی مہارت، اور ایسے آلات جو زرعی اور ارضیاتی کھوج لگانے کے کام آسکیں تھوڑی مدت کی اطلاع پر کہیں بھی جمع کر کے ان سے مربوط کارکن جماعتیں کام پر لگا سکتے ہیں۔

تھوڑی مدت کی اطلاع کا یہ مطلب نہیں کہ تمام ماہرین مثلاً سروئیر، ماہرین ارضیات، انجینیروں فوٹوگرافروں اور دیگر ایسے لوگ ہر وقت موجود رہیں اور ہر کھوج لگانے کی مہم کے لیے انھیں علیحدہ علیحدہ انتخاب کرنا پڑے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ انھیں ایسے علاقوں میں جہاں تک پہنچنا ممکن نہیں ہیلی کاپٹر مہیا کیے جائیں۔ تاکہ وہ کام کرنے والی جماعتوں اور ضروری سامان کے ساتھ وہاں تک پرواز کر سکیں۔

برطانوی نوآبادیات زمین کی نشوونما کے لیے ان مشترکہ طریقہ ہائے عمل سے مستفید ہونے میں سب پیش پیش ہیں۔ لیکن دوسری حکومتیں بھی ایسی ہی ماہرانہ سہولتوں میں فائدہ حاصل کرنے میں پیچھے نہیں ہیں۔

ان جماعتوں کی ترتیب و تشکیل میں سب سے پہلے انگلستان کی فضائی سروے کمپنیوں کے ہنٹنگ گروپ نے قدم اٹھایا۔ ان کا صدر دفتر لندن سے باہر ہے۔ جہاں ۱۹۵۰ء میں ڈیوک آف ایڈنبرا نے ان کی نئی لیبارٹریوں کا افتتاح کیا تھا۔ ان کی طرف سے زمین کے استعمال اور ارضیاتی جائزے کے سلسلے میں سوڈان کی بارہ ہزار مربع میل زمین نیاسالینڈ کی دلدلوں، میسوپوٹیمیا کے لق ودق صحراؤں اور برما کے بھاپ دار جنگلوں کا معائنہ کیا گیا۔ ایک علیحدہ کمپنی جس کا نام ہنٹنگ جیوفزکس ہے ارضی معدنیات کی دریافت میں ماہرانہ حیثیت رکھتی ہے۔ ایسے ہوائی جہاز استعمال کرتی ہے جن کے [illegible]

فضائیمیں آلات لگے ہوتے ہیں اور ایک منو فشاں گردنا ہوتا ہے۔ اور جہاں کہیں معدنیات کے ذخیرے ہوں یہ آلہ حساس کی طرح ردّ عمل کرتا ہے۔ جسے جہاز کے اندر ریکارڈ کر لیا جاتا ہے۔ پرواز کے دوران میں ایک خودکار کیمرہ سارے علاقے کی تصویریں اتارتا جاتا ہے۔ ان تصاویر پر بھی اس ردّ عمل کا اثر ہوتا ہے جس سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ ذخیرے کہاں کہاں ہیں۔

اعلیٰ پیمانہ پر جب زمین کا جائزہ لیا جاتا ہے تو فضائی تصویر کشی اس زمین کی درجہ بندی میں رہنما کا کام دیتی ہے۔ ایسے جائزہ میں عموماً انفرا ریڈ فلم استعمال کی جاتی ہے۔ کیوں کہ اس کے ذریعے زمین کی نمی کی تفصیل اور اختلاف زیادہ نمایاں ہوتا ہے۔ ان تصاویر کو جوڑ کر نقشے تیار کیے جاتے ہیں اور پھر زمین کی قسم اور مٹی کے امکانی اختلافات کا اندازہ سبزے کی موجودگی یا عدم موجودگی سے لگایا جاتا ہے۔ پھر اس کے مطابق نقشے میں رنگ بھرے جاتے ہیں۔

نقشے کو زیادہ صحیح بنانے کے لیے دوسرا قدم یہ اٹھایا جاتا ہے کہ ایک باقاعدہ طریقہ کے تحت نصف یا چوتھائی میل کا فاصلہ چھوڑ کر برمے کے ذریعے زمین میں گہرا سوراخ کر کے وہاں سے مٹی نکالی جاتی ہے۔ پھر اس سے یہ اندازہ لگایا جاتا ہے کہ آیا زمین بخارسے پٹی ہوئی دلدل تو نہیں ہے۔ یا دس فٹ گہرائی تک سیم زدہ ہے۔ اور پندرہ فٹ یا اس سے زیادہ گہرائی میں سرکنڈوں کے جنگل ہیں۔

یہ حالات افریقہ میں کھوج لگانے کے سلسلہ میں وہاں کی روایات کے عین مطابق ہیں یہ حالات شائر وادی کے ایلی فنٹ مارش، نیاسالینڈ میں موجود ہیں اور ڈیوڈ لونگسٹون کے زمانہ حال کے جانشین ان سے عہدہ برا ہو رہے ہیں۔ انھوں نے سرکنڈوں کو کاٹ کر ان میں سے تنگ نہروں کا ایک جال بچھا دیا ہے۔ تاکہ ان میں سے ان کی کشتیاں (جو دیسی ساخت کی ہوتی ہیں) جن پر مٹی کے نمونے اکٹھے کرنے کا سامان لدا ہوتا ہے، گذر سکیں۔ لیکن بعض اوقات جہاں پانی کم گہرا ہو انھیں پیدل ہی گزرنا پڑتا ہے اور "خوطہ خوری" کا لباس کہنیوں تک پہننا پڑتا ہے۔ تاکہ مقامی کیڑے مکوڑوں سے محفوظ رہ سکیں۔

گرم موسم میں فراگ مینؒ لباس پہن کر پیدل چلنے سے آدمی بہت تھک جاتا ہے۔ دریا کے اوپر ایک عارضی بند تعمیر کرنے کے دوران میں انھوں نے یہ دریافت کیا۔ اس سے دلدل کے پانی کی سطح بہت زیادہ حد تک کم ہو گئی۔ اگر ان کے مشورہ پر عمل کیا جائے تو ان دنوں ایلی فنٹ مارش میں چاول، گنا اور کپاس اُگ رہی ہو گی۔

زمین کی نوعیت کے باعث اس خاص کام کی تکمیل میں نو ماہ صرف ہوئے۔ لیکن کسی اور علاقہ میں مثلاً سوڈان میں اس سے زیادہ علاقہ کا جائزہ، اور اس کی رپورٹ اس سے نصف وقت میں مکمل ہو جاتی۔ وادی دجلہ جو کبھی بہت زرخیز تھی، اب اس کا وسیع علاقہ صدیوں سے بنجر پڑا ہے اس علاقہ میں ۱۹۵۰ء سے برطانیہ کے سر دیڑا ور زرعی ماہرین اپنی تحقیقات کر رہے ہیں اس سلسلہ میں جو نتائج اخذ کیے گئے ہیں اس علاقہ کی زمین کی سطح کی مٹی تجزیہ کے لیے انگلستان بھیجی گئی۔ چناں چہ وہاں سے رپورٹ آنے کے بعد مصنوعی کھاد کا استعمال کیا گیا۔

نئے کھوج لگانے والے اگر باعمل نہیں تو وہ کچھ بھی نہیں۔ بے کار زمین کو قابل کاشت بنانے کے منصوبوں میں انفرادی فارموں کے بیزانیہ کو بھی شامل کر لیا گیا ہے کہ آبادکار اور اس کے کنبے کے لیے کس قدر زمین کی ضرورت ہو گی۔ تاکہ وہ معقول طور سے زندگی بسر کر سکے۔ زمین کو بہتر بنانے کے منصوبوں کی تکمیل کے علاوہ اور بہت سے کام ہیں۔ جن میں سے جنگل لگانا، شمالی فارموں میں باری باری اچھی فصلیں اگانے کا طریق کار وغیرہ طویل المدت منصوبہ بھی ہے جس کا انحصار آبپاشی کے نئے وسیع نظام پر ہے۔

مٹی کا جائزہ لینے والے کا پہلا کام یہ ہے کہ وہ اس کا فیصلہ کرے کہ کونسا ویران علاقہ آبپاشی سے مستفید ہو سکتا ہے۔ لندن کے مشاورتی انجینئروں کی ایک ایسی فرم کے اشتراک سے یہ کام کیا جاتا ہے جو آبپاشی کے منصوبوں کی انچارج ہے۔ ان کا پہلا کام یہ ہے کہ وہ اس بات کا فیصلہ کریں کہ کونسا ویران علاقہ آبپاشی سے مستفید ہو سکتا ہے۔ غرضیکہ انسان دوستی اور بھلائی کا یہ کام بڑی کھوج لگانے والوں کی نئی نسل سرانجام دے رہی ہے۔

شریف خادمہ لیکن جابر ملکہ

بہت سی زبانوں میں ایک پرانی کہاوت چلی آتی ہے کہ آگ ایک اچھی خادمہ ہے لیکن بری مالکہ۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ آگ لگنے پر اسے مؤثر طریقہ سے کس طرح روکا جا سکتا ہے۔ شیلا ادکینگھن نے بری، بحری اور فضائی مقامات پر آگ کے خطرہ سے بچنے کے سلسلے میں حال ہی میں برطانوی طریقوں کا جائزہ لیا تھا۔ ذیل کے مضمون میں انھوں نے آگ کی روک تھام کے متعلق بعض جدید ترین طریقوں کی بحث کی ہے۔

جب کہاوتوں کی بات چھڑی ہے تو ایک کہاوت اور سن لیجیے۔ برطانیہ میں مثل مشہور ہے کہ "تم کسی اچھی چیز کو محض اپنے تک محدود نہیں رکھ سکتے" ایک عرصہ سے ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ اس خیال کو عملی شکل اس طرح دی جا رہی ہے کہ برطانیہ میں آگ بجھانے کے ساز و سامان اور روک تھام کے جو طریقے بروئے کار لائے جا رہے ہیں وہ تمام دنیا میں پھیل رہے ہیں۔ پھر برطانیہ ان کو صرف اپنے تک محدود نہیں رکھ رہا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس تمام جدو جہد میں ذاتی منافع کو بھی تھوڑا بہت دخل ہے۔ کیونکہ آگ بجھانے کے ساز و سامان کی تکمیل اور روک تھام کے طریقوں کی ترتیب و تنظیم میں برطانوی بیمہ کمپنیاں سب سے زیادہ مستعد رہی ہیں۔ اس میں ذاتی منافع سے زیادہ ہمدردی کا جذبہ کار فرما ہے ایک عام انسانی ہمدردی کیونکہ تمام آفتوں میں آگ سب سے زیادہ خوفناک اور بھیانک ہے۔ جو آناً فاناً ہر شے کو جو اس کی لپیٹ میں آجاتی ہے، تہس نہس کر دیتی ہے

دس سال پیشتر لندن میں آگ سے محفوظ رہنے کی انجمن قائم ہوئی تھی۔ یہ باا ختیار ادارہ جان و مال کی حفاظت کے سلسلہ میں عوام کو صلاح و مشورہ دینے، فائر مین اور انجمن سے لے کر سرکاری تحقیقاتی سائنسدانوں اور آگ بجھانے کا ساز و سامان تیار کرنے والوں تک عملی ماہرین کے تجربات سے استفادہ کرنے کے لیے قائم کیا گیا تھا۔ اور یہ نئی انجمن ایک قومی ادارہ کے علاوہ اور کچھ نہ تھی۔

آج کل آگ سے محفوظ رہنے کی انجمن کے ساڑھے تین ہزار ممبر ہیں، جن میں سات سو پچاس سمندر پار ممالک کے ممبر بھی شامل ہیں۔ اور اس کی پہلی بین الاقوامی کانفرنس اس ماہ لندن میں ہو رہی

ضمناً انجمن کے بیشتر ممبر اجتماعی حیثیت رکھتے ہیں جو صنعتی اور عوامی عمارتوں، بیرکوں، اسکولوں، ہسپتالوں، کالوں، جہازوں، اور طیاروں میں آگ کے خطروں کی روک تھام کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ حال ہی میں لندن کی انجمن سے کچھ استفسارات کیے گئے ہیں۔ مثلاً ویلنگٹن (نیوزی لینڈ) نے آگ سے بچنے کی پالش کے بارے میں معلوم کیا ہے۔ روٹرڈم، ہالینڈ، انفراریڈ کے خطرات کے بارے میں جاننے کا خواہشمند ہے سڈنی، آسٹریلیا نے آگ بجھانے والے ایسے نئے مرکبات کے متعلق استفسار کیا ہے جو لکڑی کے لیے خاص طور پر موزوں ہوں۔ گھانا نے اپنی نئی بندرگاہ ٹیما کو آگ سے محفوظ رکھنے کے لیے مشورہ طلب کیا ہے

اس قدر عالمگیر اعتماد بغیر کسی سبب کے پیدا نہیں ہوتا۔ آگ بجھانے اور آگ سے محفوظ رہنے کے برطانوی ساز و سامان کے تصدیق شدہ برآمداتی اعداد و شمار سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے۔ مثال کے طور پر ۱۹۵۸ء میں اڑھائی کروڑ پونڈ کی مالیت کا ساز و سامان برآمد کیا گیا۔ جبکہ سنہ ۱۹۴۹ء میں ایک کروڑ پونڈ سے کچھ زیادہ کی مالیت کا سامان برآمد کیا گیا۔ سنہ ۱۹۵۷ء میں صرف کنیڈا کے ایک آرڈر پر ایک کروڑ پچاس لاکھ کنیڈی ڈالر کی آمدنی ہوئی۔ کنیڈا کا یہ آرڈر اپنی نوعیت کا سب سے بڑا آرڈر ہے۔

برطانیہ کی بہت سی دوسری صنعتوں کی طرح ایک طویل روایت آگ بجھانے کے ساز و سامان سے بھی وابستہ ہے۔ گرین وچ (لندن) کے میری دیدر اینڈ سنز نے آگ بجھانے کے چمڑے کے ڈولوں سے سترھویں صدی کے آخر میں اپنے کاروبار کا آغاز کیا تھا۔ ویسے ان کو برقی سیڑھیوں اور میرین پمپنگ سیٹ کی تیاری میں عالمی شہرت حاصل ہے اور یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ سنہ ۱۶۶۶ء میں لندن کی عظیم آتشزدگی فائر انشورنس کی ترویج کا باعث ہوئی۔

موجودہ زمانے کا آگ بجھانے کا ساز و سامان دوسرے میدانوں میں نئی اختراعات اور تکنیک سے بے حد متاثر ہوا ہے۔ چنانچہ چھوٹی سفری آگ بجھانے کی کلوں میں پولی تھین کا استر لگا ہوتا ہے جس کی وجہ سے یہ کلیں پانی یا پانی کے محلول سے بھر جانے کے باوجود زنگ لگنے سے محفوظ رہتی ہیں آجکل بعض آگ بجھانے کی کلوں میں پلاسٹک کا دوسرا سامان استعمال ہو رہا ہے۔ بڑی بڑی آتشزدگیوں کے سلسلہ میں پلاسٹک کے نلکے کنوئیں کے نلکوں کے بدلے کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔

مانچسٹر کی انجینیری کی فرم مائرپلیٹ لمیٹیڈ نے اس بات کا عملی مظاہرہ کرکے بتایا ہے کہ سادہ پانی ایک خاص طریقہ سے چلتے ہوئے تیل یا کسی دوسرے بھڑکنے والے سیال میں ملایا جا سکتا ہے جس میں تیل کی آمیزش ہو۔ اس سے سیال ایک ایسے مادہ میں بدل جاتا ہے جو حل نہیں ہو سکتا۔ ایک مظاہرہ میں چھ ہزار گیلن تیل اور چھ سو مربع فٹ سطح کی ایک ٹنکی کی آگ پر دو سیکنڈ کے اندر قابو پالیا گیا تھا۔ آگ بجھانے کا یہ ایک نیا نظام ہے جو دنیا بھر میں ہر قسم کے بڑے بڑے تیل کے ذخیروں، ربڑ کے کارخانوں اور پینٹ اور وارنش کے کارخانوں میں استعمال ہو رہا ہے۔

آگ بجھانے اور زخمیوں کو بچانے کے سلسلہ میں جو برطانوی سازوسامان استعمال ہوتا ہے اس کے ساتھ ہمیشہ دو حفاظتی فہرستیں تیار کی جاتی ہیں۔ ایک فہرست برٹش اسٹینڈرڈز انسٹی ٹیوشن جاری کرتا ہے اس میں کم از کم ضروریات تحریر ہوتی ہیں۔ فائر آفس کمیٹی کی بھی سامان کی ایک فہرست ہوتی ہے جو بیمہ کے مقاصد کے لیے منظور شدہ ہوتی ہے۔ شعبۂ سائنسی و صنعتی تحقیقات و مشترکہ ادارۂ تحقیقات آتشزدگی کا بورہم وڈ۔ ان ہرٹ فورڈشائر آتشزدگی سے متعلق ایک تحقیقاتی تجربہ گاہ ہے۔ جو دنیا کی بہترین تجربہ گاہوں میں شمار ہوتی ہے۔ اس تجربہ گاہ کی کارکردگی اور نت نئی ایجادوں نے آگ بجھانے سے متعلق برطانوی سازوسامان کو عالمی شہرت دینے میں بڑی حد تک مدد کی ہے۔

مذکورہ بالا شعبہ اور آگ سے محفوظ رہنے کی انجمن باہمی رابطہ کے ساتھ کام کرتے ہیں اول الذکر شعبہ تحقیقاتی اور آزمائشی کام کرتا ہے۔ جبکہ انجمن مذکورہ معلومات جمع کرتی، سفارشات شائع کرتی اور استفسار کنندگان کو صلاح مشورہ دینے کے لیے ہر وقت تیار رہتی ہے۔ انجمن کے متعلق مزید معلومات ذیل کے پتہ سے حاصل کی جا سکتی ہیں۔ دی فائر پروٹیکشن ایسوسی ایشن ۱۳۱۔ گریشم اسٹریٹ لندن ای سی ۲۔ ❖